وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۫ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر: ۲۲)

تفسیرِ کبیر

مصنفہ

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ

جلد ششم

سورۃ النحل، سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ الکہف

تفسیرِ کبیر

از حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ

(جلد ششم۔ مشتمل بر سورۃ النحل، سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ الکہف)

Tafsir-e-Kabir (**The Grand Exegesis**)

by Hazrat Mirza Bashir-ud-Deen Mahmood Ahmad,
Khalifatul-Masih II, al-Muslih al-Mauood (1889-1965),
may Allah be pleased with him.
Volume 6
(Sūrah an-Naḥl, Banī Isrā'īl, al-Kahf)

(Complete Set – Volumes 1-15)

© Islam International Publications Ltd.

First published in India and Pakistan between 1940-1962 (11 Volume Set)
Second edition printed in Pakistan and the UK between 1986-1994 (10 Volume Set)
Reprinted in Qadian, 2004 (5 Volume Set)
Reprinted in Qadian, 2010 (10 Volume Set)
Digitally typeset edition published in UK, 2023 (15 Volume Set)

Published by:
Islam International Publications Limited
Unit 3, Bourne Mill Business Park,
Guildford Road, Farnham, Surrey UK, GU9 9PS

Printed in the UK at:

No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronic or mechanical, including photocopy, recording or any information storage and retrieval system, without prior written permission from the Publisher.

For further information, please visit www.alislam.org

ISBN: 978-1-84880-274-2 (Set Vol. 1-15)
10 9 8 7 6 5 4 3 2 1

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم وعلیٰ عبدہ المسیح الموعود

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے مامور حضرت اقدس مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود و مہدی معہود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عظیم الشان رحمت کے نشان کے طور پر پسر موعود کی بشارت عطا فرمائی جو حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ کے وجود میں پوری ہوئی اور کلمات الہامیہ آپ کے وجود مسعود میں جلوہ گر ہوئے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ 'اسے علوم ظاہری و باطنی سے پُر کیا جائے گا۔' قرآن مجید فرقانِ حمید کے وہ علوم و معارف بھی آپ کو سکھائے گئے جو اس سے پہلے منکشف نہ تھے۔ چنانچہ آپؓ نے تحریر فرمایا ہے کہ 'اس تفسیر کا بہت سا مضمون غور کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔' آپؓ نے قرآن کریم کی تفسیر تحریر فرمائی اور اس کے مطالب و معانی اور نکاتِ عجیبہ کو ظاہر و باطن میں پھر زندہ فرمادیا۔ یہ تصنیف لطیف موسوم بہ تفسیرِ کبیر اس مذکورہ بالا بشارت کی صداقت کا ایک زندہ ثبوت اور شاہد ناطق ہے اور لاریب قرآنی علوم و معارف کا ایک بیش بہا خزانہ ہے جو خدا تعالیٰ نے موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے موافق ظاہر فرمایا ہے۔

تفسیر کبیر کی پہلی جلد ۱۹۴۰ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ بعدہٗ مختلف وقتوں میں اس کی کل ۱۱ جلدیں شائع ہوئی تھیں۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اوائل خلافت میں ہی ارشاد فرمایا کہ تفسیر کبیر کی صد سالہ جوبلی کے تحت دوبارہ اشاعت کی جائے۔ چنانچہ اس کے پازیٹو بنوا کر گیارہ کی بجائے دس جلدوں میں شائع کیا گیا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے اس علمی خزینہ کی اشاعت کا تازہ ایڈیشن طبع کروانے کی ہدایت فرمائی ہے۔ پہلی طباعت کتابت ہو کر شائع ہوئی تھی اور باریک قلم سے لکھائی کی وجہ سے پڑھنے میں دقت محسوس ہوتی تھی۔ ہر صفحہ پر دو کالم تھے۔ چنانچہ یہ نیا ایڈیشن حسب ارشاد حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کمپوز کروایا گیا ہے، اس کا فونٹ سائز ۱۴ مقرر کیا گیا ہے اور دو کالموں کی بجائے عبارت کو ایک ہی سطر میں مسلسل کر دیا گیا ہے۔ نیز حضور انور کی ہدایت تھی کہ جلدوں کی ضخامت کو بھی متوازن اور ہلکا

رکھا جائے تاکہ پڑھتے ہوئے ہاتھوں میں پکڑ کر سنبھالنے میں دقت نہ ہو۔ اس ہدایت پر عملدرآمد کے نتیجہ میں تفسیر کبیر کی جلدوں کی تعداد دس سے بڑھ کر پندرہ ہوگئی ہے۔ اس وجہ سے حلِ لغات کے مقامات میں بھی ادل بدل کرنا پڑا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی ہدایت کے مطابق تفسیرِ کبیر عربی ایڈیشن کی طرز پر حوالہ جات کی تخریج کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں تفسیرِ کبیر عربی ترجمہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ عربی عبارات بالخصوص حلِ لغات کے مواقع پر عربی عبارات جہاں اعراب کا اہتمام نہ تھا وہاں اعراب لگائے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزانہ دعا ہے کہ اس تفسیر کی اشاعت کو 'دینِ اسلام کا شرف اور کلام اللہ کا مرتبہ لوگوں پر ظاہر کرنے کا موجب بنائے۔'

اس ترتیب وطباعت کے مختلف مراحل پر جن احباب کو خدمت قرآن کا موقع نصیب ہوا، ان کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی توفیق میں برکت بخشے۔ آمین

خاکسار

منیر الدین شمس

ایڈیشنل وکیل التصنیف

اپریل ۲۰۲۳ء

سُوْرَۃُ النَّحْلِ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ نحل۔ یہ سورۃ مکی ہے

وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ مِائَةٌ وَّتِسْعٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَسِتَّةَ عَشَرَ رَكُوْعًا

اور بسم اللہ سمیت اس کی ایک سو انتیس آیتیں ہیں اور سولہ رکوع ہیں۔

یہ سورۃ مکی ہے اس سورۃ کے متعلق مفسرین کا قول ہے هٰذِهِ السُّوْرَةُ مَكِّيَّةٌ كُلُّهَا قَالَهُ الْحَسَنُ وَالْعَطَاءُ وَعِكْرَمَةُ وَجَابِرٌ یعنی یہ سورۃ سب کی سب مکی ہے۔ حسن عطاء اور عکرمہ اور جابر نے اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ اِلَّا ثَلَاثَ اٰيَاتٍ مِنْهَا وَهِيَ مِنْ قَوْلِه تَعَالٰى۔ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِلٰى قَوْلِهٖ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (النحل: ۹۶ تا ۹۸)۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ یہ سورۃ سب مکی ہے سوائے تین آیتوں کے۔ جو وَ لَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ سے شروع ہو کر لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ پر ختم ہوتی ہیں بعض دوسرے کہتے ہیں کہ بیشک تین آیتیں غیر مکی ہیں۔ مگر وہ اس سورۃ کے آخر میں وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ سے لے کر وَ الَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ تک ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ مندرجہ ذیل تین آیات مدنی ہیں (۱) وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ والی آیت نَزَلَتْ فِي الْمَدِيْنَةِ فِيْ شَأْنِ التَّمْثِيْلِ بِحَمْزَةَ وَقَتْلٰى اُحُدٍ۔ یعنی یہ آیت حضرت حمزہؓ اور دیگر شہیدانِ اُحد کے مُثلہ کرنے کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ (۲) وَ اصْبِرْ وَ مَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ والی آیت (۳) ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا والی آیت۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سورۃ کے ابتداء سے پہلی تین آیات تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ تک مدنی ہیں۔ اور باقی تمام سورۃ مکی ہے۔ قتادہ نے اس کے بالکل برعکس کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں پہلی تین آیتیں مکی ہیں۔ اور باقی سورۃ مدنی ہے۔ (البحر المحیط زیر آیت اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ۔۔۔) یورپین مصنفین میں سے ویریؔ نے ساری سورۃ کو آخری زمانہ کی مکی سورتوں میں سے قرار دیا ہے۔ نولڈک نے سوائے آیات ۴۴، ۱۱۲، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۶ کے باقی سب سورۃ کو مکی قرار دیا ہے۔ (چونکہ اس نسخہ قرآن کریم میں بسم اللہ کو آیت شمار کیا گیا ہے اس لئے ایک ایک عدد بڑھا دیا گیا ہے۔ نولڈک نے ۴۳، ۱۱۱، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۵ لکھا ہے) سیلؔ نے آخری تین آیات کو مدنی قرار دیا ہے اور باقی تمام سورۃ کو مکی۔ وائل (Weil) نے بڑے زور سے سیل کی بات کو رد کیا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بھی مکی ہی ہیں (وہیریز کمنٹری آن قرآن جلد ۳)

وجہ تسمیہ اس سورۃ کا نام نحل رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں نحل کی وحی کا ذکر کے بتایا گیا ہے کہ تمام کارخانۂ عالم وحی

پر چل رہا ہے۔اور یہی مضمون اس سورۃ کا محوری نقطہ ہے۔

دوسرے اس میں جہاد کا پہلی دفعہ ذکر ہے۔ چونکہ اس پر اعتراض ہونا تھا نحل کی مثال سے اشارہ کیا کہ اس میں شہد بھی ہے اور ڈنک بھی۔مگر ڈنک کم اور شہد زیادہ۔اسی اصول پر جہاد کا قیام ہے۔جس کی غرض صرف روحانی شہد کی حفاظت ہے۔

سورۃ کے مضامین میرے بتائے ہوئے قاعدہ کے مطابق کہ سورتوں کے مضامین حروف مقطّعات کے تابع ہوتے ہیں۔اور جن سورتوں کے شروع میں مقطعات نہیں ہوتے۔وہ اپنے سے پہلی سورۃ کے جس کے پہلے مقطعات ہوں۔مضمون کے لحاظ سے تابع ہوتی ہیں اور اس میں اُسی سورۃ کے مضامین کا تسلسل ہوتا ہے یہ سورۃ سورۂ حجر کے مضمون کے تسلسل میں ہے۔اور اسی کے مضمون کو نئے پیرایہ میں جاری رکھا گیا ہے۔

یہ سورۃ سورۃ حجر کے مقطعات کے ماتحت ہے سورۃ حجر کے شروع میں الٓرٰ کے حروف ہیں جس کا مفہوم اَنَا اللّٰہُ اَرٰی ہے یعنی میں اللہ دیکھ رہا ہوں۔اس سورۃ میں انہی صفت کے مضمون کو نئے پیرایہ میں اور نئے اسلوب سے بیان کیا گیا ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ کلام الٰہی کیا شان رکھتا ہے اور اس کی کیا ضرورت ہے۔اور اس کے اندر کیا قوتِ جاذبہ ہوتی ہے۔اور ثابت کیا ہے کہ قرآن کریم جو تمام کتب سے کامل کتاب ہے۔اس کی قوت جذب اور قوت قدسی کی تو حد ہی نہیں۔پھر مسلمانوں کی کامیابی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

پچھلی سورۃ کے ساتھ اس کا مزید جوڑ یہ بھی ہے کہ پہلی سورۃ کے آخر میں ''اِنَّ السَّاعَۃَ لَاٰتِیَۃٌ'' اور ''فَوَرَبِّکَ لَنَسْـَٔلَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ'' کہہ کر کفار سے عذاب کا وعدہ کیا تھا۔اب اس سورۃ میں اَتٰٓی اَمْرُ اللّٰہِ کہہ کر یہ بتایا ہے کہ وہ موعود وقت اب آ ہی گیا ہے۔پہلی سورۃ کے آخر میں تو اٰتِیَۃٌ فرمایا تھا کہ عذاب کو آیا ہی سمجھو اور اس سورۃ کو اَتٰی سے شروع کیا ہے کہ وہ آ ہی گیا ہے۔یہ قرآن کریم کا محاورہ ہے کہ وہ کسی امر کے قطعی ہونے پر ماضی کے صیغہ سے دلالت کرتا ہے۔اسی طرح جلد ظاہر ہونے والے امور کو بھی ماضی کے صیغہ سے ظاہر کرتا ہے۔کیونکہ جو بات ہو چکی ہو۔اس کے متعلق کوئی شک باقی نہیں رہتا۔اسی طرح ماضی کے لفظ سے اس امر پر بھی زور دیا جاتا ہے کہ وہ اس قدر قریب ہے کہ اُسے ہو چکا ہوا ہی جانو۔اردو میں بھی کہتے ہیں کہ بس اُسے آیا ہوا ہی سمجھو۔یعنی اس کی آمد نہایت قریب ہے ان الفاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ بالکل ہجرت کے قریب نازل ہوئی ہے۔

خلاصہ مضمون اس سورۃ کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ جو کچھ تمہیں بتایا جا چکا ہے۔اس کی سچائی کے ظاہر ہونے کا وقت بالکل قریب آ گیا ہے۔یہ سوال کہ یہ کلام کس پر نازل ہوا ہے۔بالکل بے حقیقت ہے۔معترض اتنا تو دیکھے

کہ انسان کی جسمانی پیدائش کیسی حقیر ہے۔ پھر اُسے ترقی دے کر اللہ تعالیٰ نے کس قدر انعامات کا وارث کر دیا ہے۔ اسی طرح اگر خدا تعالیٰ روحانی عالم میں کسی آدمی کو جو بظاہر بے حقیقت نظر آتا ہو بڑھا دے اور ترقی دے دے۔ تو یہ کیوں خیال نہیں کرتے کہ اس کے اندر بھی کوئی مخفی قابلیتیں ہوں گی۔

جس خدا نے دنیا کے عارضی سفروں کی ضروریات بہم پہنچائی ہیں۔ وہ دائمی سفر کی ضروریات کو کیونکر نظر انداز کر دے گا۔ اللہ کے سوا اس ضرورت کو نہ لوگ خود پورا کر سکتے ہیں اور نہ اُن کے معبود۔ پس خدا تعالیٰ کو پانے کا صحیح اور قریب تر راستہ اور اس راستہ پر چلنے کو سہل کر دینے والے اسباب خدا تعالیٰ ہی بتا سکتا ہے۔ اور وہی بتاتا ہے۔ آگے انسان اس میں دخل دے کر اگر اپنے لئے مشکلات پیدا کر لے۔ تو اس کی ذمہ داری اس پر ہے۔

پھر بتایا ہے کہ جو اس راستہ پر چلتے ہیں۔ ان سے کیا سلوک ہوتا ہے۔ اور جو اس پر نہیں چلتے۔ ان کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اور اس سوال پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ انسان کی جزاء اس کے انجام پر مترتب ہوتی ہے۔

اس لئے یہ کہنا کہ نبی کی بات کو سب لوگ فوراً نہیں مان لیتے۔ پھر جو پہلے انکار کر کے بعد میں ایمان لائے ہیں۔ ان کا کیا حال ہوگا۔ معقول اعتراض نہیں۔ ماننے والے اور نہ ماننے والے اپنے انجام کے مطابق پوچھے جائیں گے کیونکہ اگلے جہان کا راستہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں وہ موت کے وقت ختم ہوتا ہے۔

پھر اس سوال کا جواب دیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی آتے ہیں تو اس کے پیغامبر کی بات کو کوئی ردّ کس طرح کر سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ تو قادر ہے۔ پس جسے اللہ تعالیٰ بھیجے گا اس کی بات سب سے منوالے گا اور عقلی جواب کے علاوہ نقلی جواب بھی دیا کہ بعض نبیوں کو تم بھی مانتے ہو۔ کیا ان کی باتوں کو سب نے مان لیا تھا۔ یا پہلے دن سے مان لیا تھا۔ پھر مومنوں کو توجہ دلائی کہ اگر تم خواہش رکھتے ہو کہ تمہارے عزیز اس کلام کو مان لیں تو اس کا علاج یہی ہے کہ اُن کے دلوں کو صاف کرو۔ اللہ تعالیٰ جبر سے انہیں ہدایت نہ دے گا۔ کیونکہ جس کے دل میں گمراہی ہو اسے ہدایت دینا مومنوں پر ظلم ہے۔ کیونکہ بعث بعد الموت کی حکمت باطل ہو جاتی ہے۔ اس پر کفار کا انکار دہرایا کہ بعث بعد الموت کیا ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اور اس کی دلیل یہ دی کہ وہ ایک ضروری شے ہے اور جس امر کی ضرورت ظاہر ہو۔ الٰہی قاعدہ کے مطابق اس کا وجود ضروری ہے۔

پھر بعث بعد الموت کا اس دنیا میں ہونے والے بعض امور سے ثبوت دیا کہ اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ قوموں کا بعث کرتا ہے۔ اور ہجرت سے اس بعث کا آغاز ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس نبی کی جماعت سے ہوگا۔ مومنوں اور کافروں کو جدا کرنا کامل ترقی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ پھر جو سب سے اعلیٰ کمال ہے اس کے لئے کیوں اللہ تعالیٰ

مومن اور کافر کو الگ نہ کرے گا کہ ہر ایک اپنے راستہ پر بلا روک ٹوک چل سکے۔ اس ضرورت کے پورا کرنے کے لئے روحانی ہجرت کی ضرورت ہے جو موت کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ اس ہجرت کے بعد مومن اور کافر الگ الگ راستہ پر چل پڑتے ہیں۔ اور مومن بلا روک ٹوک اپنے خالص انتظام کے ماتحت جنت میں روحانی ترقیات کو حاصل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مسلمانوں کو دنیوی ہجرت کے بعد جو ترقی ہو گی۔ اُسے کفار دیکھ ہی لیں گے۔ وہ اسی سے قیاس کر سکتے ہیں کہ مومن روحوں کا کافروں سے الگ کر کے رکھنا ان کی پیدائش کی غرض کے پورا کرنے کے لئے کیسا ضروری ہے۔

پھر ہجرت دنیوی کے نتائج کی طرف اشارہ کیا کہ کس کس طرح اس سے کفار پر عذاب آئیں گے اور کس طرح مومنوں کو ترقی حاصل ہو گی۔ اور اس کی وجہ کوئی دنیوی ذرائع نہیں ہوں گے۔ بلکہ محض توحید پر قیام اس کا باعث ہو گا۔

پھر بتایا کہ آخرت پر ایمان نہ لانے سے انسانی اعمال میں نقص آ جاتا ہے۔ یہ بھی یوم البعث کی ضرورت کا ثبوت ہے۔

پھر بتایا کہ ڈھیل کا ملنا اس امر کی علامت نہیں کہ خدا تعالیٰ دین کو قائم نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ انسانی نجات کی اہمیت کو ثابت کرتا ہے۔ دنیا میں ڈھیل کا قانون طبعی عالم میں بھی پایا جاتا ہے۔ پھر کیوں دین کے بارہ میں نہ ہو۔ خصوصاً جبکہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو نجات دینے کی غرض سے ڈھیل دے کر انہیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں نجات دینا چاہتا ہے۔

پھر جبر کا رد اس طرح کیا کہ بدی کو خوبصورت کر کے دکھانا شیطان کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔ خدا تعالیٰ کا کام تو صرف ہدایت کو بیان کرنا ہے۔ ہاں وہ اپنے عظیم الشان رحم سے ہدایت کے مزید سامان اس طرح پیدا کر دیتا ہے کہ کلام الٰہی ہمیشہ مومنوں کے لئے رحمت ثابت ہوتا ہے اور اس طرح عقلمندوں پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس راہ کو پسند کرتا ہے۔

پھر بتایا کہ ان کا یہ اعتراض ہے کہ اگر یہ سچا ہے تو پہلی تعلیموں کی مخالفت کیوں کرتا ہے۔ اور بتایا کہ پہلے نبیوں کو کافر قرار دینا اور بات ہے اور رائج الوقت باتیں جو ان کی طرف منسوب ہیں ان کو ماننا اور بات ہے۔ نبی تو آتا ہی تب ہے جب لوگ پہلی تعلیموں کو جو سچی تھیں مسخ کر دیتے ہیں اور جب وہ الٰہی حفاظت سے باہر ہو جاتی ہیں۔

پھر ایک لطیف مثال دی کہ ہدایت دینا اللہ تعالیٰ ہی کے شایان شان ہے۔ جانور کو دیکھو گھاس کھاتا ہے

اور دودھ دیتا ہے اور یہ خدا تعالیٰ ہی کی بنائی ہوئی مشین کا کام ہے۔ اسی طرح انسانی اخلاق جو بہیمیت کے تابع ہوتے ہیں گھاس کی طرح ہوتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ انہی بہیمی اخلاق کو اپنے الٰہی قانون کے ماتحت لا کر اعلیٰ اخلاق بنا دیتا ہے۔

پھر نحل کی مثال دی کہ اس کے کاموں کو دیکھو کہ وہ بھی تو ایک وحی کے ماتحت عمل کرتی ہے اور معمولی نباتی اجزاء سے شہد تیار کرتی ہے۔ اس سے سمجھ لو کہ دنیا کے سب کام ایک وحی خفی کے ماتحت چل رہے ہیں۔ پھر کیوں نہ انسان کے اخلاق کو اعلیٰ بنانے کے لئے کسی وحی کا نزول ہو اور کیوں نہ اس وحی کے نتائج اسی طرح شفا کی صورت میں پیدا ہوں۔ جس طرح شہد کی مکھی کے عمل کا نتیجہ شفا ہوتی ہے ہاں جس طرح شہد کی مکھیوں کی اقسام ہیں اور شہد کے مدارج ہیں اسی طرح انسانوں کے مدارج ہیں۔ اور گو سب مومن وحی کے تابع ہیں مگر ہر ایک اپنے ظرف کے مطابق روحانی شہد تیار کرتا ہے۔

پھر ایک اور طرح وحی الٰہی کی ضرورت بتائی اور فرمایا جب بھی اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ترقی دیتا ہے کچھ عرصہ کے بعد اس کی حاصل کردہ ترقیاں ایک خاص گروہ کے قبضہ میں آ جاتی ہیں۔ اور دوسرے لوگوں کے لئے ترقی کا راستہ مسدود ہو جاتا ہے۔ کیونکہ قوم پر قابض لوگ انہیں باوجود قابلیت کے آگے نہیں آنے دیتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے سب کو اپنے فضل کا وارث بنایا ہے۔ ان حالات کو سوائے وحی کے کس طرح بدلا جا سکتا ہے۔ یقیناً اس زمانہ کے بڑے لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم قابل ہیں اس لئے قوم کی باگ پر قابض ہیں۔ اور ان کے دعویٰ کے رد کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک نئے امتحان کا انتظام کیا جائے۔ پس اس غرض کو پورا کرنے کے لئے نبی کا آنا ضروری ہوتا ہے جب وہ آتا ہے تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ جو لوگ قوم پر حکومت کر رہے تھے وہ قابل نہ تھے کیونکہ وہ الٰہی کلام کو ماننے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اور جو لوگ ادنیٰ سمجھے جاتے تھے وہ مان جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قابلیت والے اور لوگ تھے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ انسانی حقوق کی پھر سے حفاظت کر دیتا ہے۔ اور پھر سے ہر انسان اپنی قابلیت کے مطابق ترقی کرنے لگ جاتا ہے۔ اور نسلی امتیاز کے نظام کو توڑ دیا جاتا ہے۔

اس امر کی تائید میں ایک اور دلیل دی اور فرمایا کہ جب قومیں اللہ تعالیٰ سے دور ہو جاتی ہیں۔ تو شرک کرنے لگتی ہیں۔ اور اس طرح ایسے وجودوں سے متعلق ہو جاتی ہیں۔ جو خیر و شر کے مالک نہیں۔ اور اس طرح ترقی کے حقیقی سامانوں سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اگر اس حالت کو نہ بدلا جائے۔ تو سب دنیا ترقی سے محروم ہو جائے۔

پھر فرمایا کہ ایک نقص تو وحی سے بُعد کا یہ ہوتا ہے کہ بعض لوگ جبراً قوم کی باگ لے لیتے ہیں اور لوگوں کو

قابلیت کے اظہار کا موقعہ ہی نہیں دیتے۔ایک اور نقص بھی پیدا ہوجاتا ہے اور وہ یہ کہ شرک کی وجہ سے اکثروں کی قابلیتیں مر ہی جاتی ہیں۔ پھر خدائے رحیم اس حالت کو کس طرح برداشت کرے اس طرح تو وہ اپنے عمل کو خود باطل کرے گا یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ پہلے قابلیت دے پھر اس قابلیت کو مرنے دے یا ظالموں کو موقعہ دے کہ اس قابلیت کو ظاہر ہونے سے روک دیں۔

غرض کفار کے دعاوی باطل ہیں اور خدا تعالیٰ کی حکمت چاہتی ہے کہ جو ان ظلموں کے بانی ہیں ان کو تباہ کردے۔پس جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی ظاہری حفاظت کے سامانوں سے سبق حاصل نہیں کیا انہیں ظاہری حفاظت سے بھی محروم کردیا جائے گا۔اور اس دنیا میں بھی اور اگلے جہان میں بھی وہ جھوٹی حفاظت جو شرک کے رنگ میں انہوں نے اپنے لئے تجویز کی تھی ان کی ذلت کا موجب ہوگی۔

لیکن بتایا کہ ظالموں میں بھی ہم فرق کریں گے۔جو گمراہ کرنے والے ہیں زیادہ سزا پائیں گے اور جو جہالت سے ان کے تابع ہوئے کم سزا پائیں گے۔

پھر فرمایا کہ یہ دیکھتے نہیں کہ جن تغیرات کا ہم نے ذکر کیا ہے اس کے سامان کیسے واضح ہیں اول قرآن کریم میں اندرونی شہادت موجود ہے کہ وہ ایک مکمل تعلیم پر مشتمل ہے پھر اس کی تعلیم ترقی کی طرف لے جانے والی ہے۔ پھر عملاً اس پر چلنے والے برکتیں پاتے ہیں۔

اس کے بعد کامل تعلیم کی بعض مثالیں بیان کیں۔اس پر کفار کا اعتراض پھر دہرایا کہ یہ تعلیمیں تو پہلی کتب کے خلاف ہیں۔اور فرمایا کہ یہ اختلاف سطحی ہے۔ ہر زمانہ کے مطابق کلام اترتا ہے۔

پھر بتایا کہ اس جواب کو سن کر کفار پینترہ بدلتے ہیں۔اور کہتے ہیں یہ پہلی کتب کی نقل ہے۔اس کا جواب دیا اور ثابت کیا کہ نقل کا اعتراض بالکل خلاف عقل ہے۔

پھر ہدایت کے سلسلہ میں بتایا کہ بے شک بعض لوگ اس مذہب سے مرتد بھی ہوتے ہیں۔لیکن ان کا مرتد ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ قرآن کریم نے یقین کامل پیدا نہیں کیا۔کیونکہ یہ امر تب ثابت ہوتا اگر ایسے لوگوں کا ارتداد کسی دلیل کی بناء پر ہو۔جبکہ دنیوی غرض سے انحراف ہو تو ارتداد مرتد کا گند ثابت کرتا ہے نہ کہ تعلیم کی کمزوری۔

پھر بتایا کہ مؤمنوں کے لئے اب حکومت کرنے کا وقت آ گیا ہے اور قرآنی بشارات اب ان کے حق میں پوری ہونے کو ہیں۔ایک زبردست جنگ کفر و اسلام میں ہونے والی ہے۔اس میں ہر ایک کو اس کے ایمان کے مطابق

بدلا مل جائے گا۔

پھر صاف لفظوں میں مکہ والوں کی تباہی کی خبر دی اور بتایا کہ مکہ والوں کی حکومت جاتی رہے گی۔

پھر رحمت کے مضمون کو الگ کر کے بیان فرمایا کہ قرآن کریم کس طرح بنی نوع انسان کے لئے ظاہری رحمت بھی ہے کہ خلاف عقل رسوم سے انہیں بچاتا ہے۔

پھر حضرت ابراہیم جو مکہ والوں کے جد امجد تھے۔ان کی یاد دلائی کہ دیکھو وہ خدا تعالیٰ کا فرمانبردار تھا تم بھی اسی کے نقش قدم پر چلو اور اس کی پیروی کرو جو ابراہیمی سنت پر ہے۔

پھر یہود و مسیحی لوگوں کو مخاطب کیا اور فرمایا کہ تم نے بھی دین کو بدل دیا ہے۔تم بھی اپنی اصلاح کرو اور جو آرام کے سامان خدا تعالیٰ نے دیئے ہیں ان سے گمراہی میں ترقی نہ کرو۔

آخر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو توجہ دلائی کہ اب تیری تبلیغ کا دائرہ وسیع ہو کر یہود و نصاریٰ کو بھی گھیرنے والا ہے اس کے بارہ میں ہم کچھ ہدایات ابھی سے دے دیتے ہیں۔

پھر بتایا کہ اب تک تو مکہ والے ظلم کرتے تھے۔آئندہ یہود و نصاریٰ بھی ظلم شروع کریں گے۔اس وقت بھی رحم کرنا اور صبر سے کام لینا۔ہاں جب خدا تعالیٰ سزا دینا چاہے تو ان کی تباہی پر غم بھی نہ کرنا اور ساتھ ہی یہ خبر بھی دے دی کہ یہود و نصاریٰ سے جو مقابلہ ہو گا اس میں بھی اللہ تعالیٰ تم کو فتح دے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۱

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر (شروع کرتا ہوں) جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۲

(اے منکرو) اللہ (تعالیٰ) کا حکم آ گیا ہے اس لئے (اب) تم اس کے جلد آنے کا مطالبہ نہ کرو وہ پاک (ذات) ہے اور جن چیزوں کو وہ (لوگ) شریک قرار دیتے ہیں اس سے بہت بالا ہے۔

حلّ لغات۔فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ اِسْتَعْجَلَهٗ کے معنے ہیں طَلَبَ عَجَلَتَهٗ وَلَمْ يَصْبِرْ اِلٰى وَقْتِهٖ۔کسی

کام کے لئے خواہش کی کہ وہ وقت سے پہلے ہو جائے۔ اِسْتَعْجَلَ فُلَانًا: سَبَقَهٗ وَتَقَدَّمَهٗ۔ فلاں شخص سے آگے نکل گیا۔ مَرَّ فُلَانٌ يَسْتَعْجِلُ اَیْ يُكَلِّفُ نَفْسَهُ العجلةَ۔ یعنی اپنی طبیعت پر زور ڈال کر تیزی سے چلا۔ (اقرب) مزید تشریح کے لئے دیکھو یونس آیت ۱۲۔

اِسْتَعْجَلَهٗ حَثَّهٗ۔ اسے کام پر آمادہ کیا۔ اَمَرَهٗ اَنْ يُعَجِّلَ۔ اسے جلدی کرنے کے لئے کہا۔

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ کے معنے ہوں گے کہ اللہ کے عذاب کے جلد آنے کا مطالبہ نہ کرو۔

سُبْحٰنَهٗ اور يُشْرِكُوْنَ کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۱۹۔

سُبْحَانَ اللهِ اَیْ اُبَرِّئُ اللهَ مِنَ السُّوْءِ بَرَاءَةً۔ سبحان کے معنی عیوب سے پاک سمجھنے اور پاک کرنے کے ہیں (اقرب)

يُشْرِكُوْنَ اَشْرَكَ کا فعل مضارع ہے جس کے معنی ہیں جَعَلَ لَهٗ شَرِيْكًا۔ کسی کو کسی کا شریک قرار دیا اور حصہ دار ٹھہرایا۔ (اقرب)

تفسیر ۔ پہلی سورۃ میں کہا تھا کہ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ۔ اب فرمایا کہ اب تو اس ساعت کو آیا ہوا ہی سمجھو۔ یعنی وہ اب دروازے پر ہے۔ قرآن کے محاورہ کے مطابق ماضی یقین اور قربِ وقوع کے اظہار کے لئے بھی آتی ہے اور اس جگہ یہی مراد ہے۔

اَمْرُ اللّٰهِ کے دو معنے اَمْرُ اللّٰهِ۔ امر اللہ کے دو معنے ہو سکتے ہیں۔ (۱) وہ وعید جس کا پچھلی سورتوں میں ذکر تھا۔ (۲) وہ وعدہ جس کی طرف وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ میں اشارہ کیا گیا تھا۔ اس جگہ دونوں معنے چسپاں ہوتے ہیں۔ اور بتایا گیا ہے کہ کفار کی سزا اور مومنوں کی کامل اور آزاد تربیت کرنے کا وقت آ گیا ہے۔

فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ میں دو امور کی طرف اشارہ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ۔ اس میں بھی دونوں امور کی طرف اشارہ ہے۔

(۱) عذاب مانگنے میں اب جلدی نہ کرو۔ وہ تو اب تمہارے دروازوں پر ہے۔ (۲) تم مسلمانوں کے نئے نظام کا بار بار مطالبہ کرتے تھے لو وہ اب آ پہنچا۔ اب اس کی نسبت جلد آنے کا مطالبہ نہ کرو کہ وہ مطالبہ پورا ہونے لگا ہے۔

ترتیب سور مضامین کے لحاظ سے ہے اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ سورۃ سورۂ حجر کی پیشگوئی کی وضاحت کرتی ہے اور اس کا مضمون اس کے مضمون کے تسلسل میں ہے اور اس کا اس مقام پر رکھا جانا بتاتا ہے کہ قرآن کریم کی سورتیں مضمون کے لحاظ سے آگے پیچھے رکھی گئی ہیں نہ کہ لمبائی اور چھوٹائی کے لحاظ سے۔ جیسا کہ بعض

ناواقف خیال کرتے ہیں۔

(Everyman's Encyclopedia fourth edition under the word Koran J.M Dent and Sons Ltd London)

اس سورۃ میں ہجرت مدینہ کی طرف اشارہ ہے یہ سورۃ مکی زندگی کے آخر میں نازل ہوئی ہے۔اور ایسے وقت میں جبکہ مسلمان کفار کے جوروستم سے تنگ آ کر مکہ چھوڑ رہے تھے اور ہجرت شروع ہو چکی تھی چنانچہ اس میں ہجرت کا ذکر صاف لفظوں میں آتا ہے۔یہ ہجرت کون سی تھی۔اس کے متعلق اختلاف ہے۔بعض مفسرین نے اس سورۃ میں مذکورہ ہجرت سے حبشہ کی ہجرت مراد لی ہے۔بعض نے مدینہ کی وہ ہجرت مراد لی ہے۔جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو مدینہ بھجوادیا تھا۔اور بعض نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ہجرت بھی مراد لی ہے۔

میرے نزدیک حبشہ والی ہجرت مراد نہیں ہوسکتی۔کیونکہ وہ کئی سال پہلے شروع ہو چکی تھی اور وہ اَتٰۤی اَمْرُ اللّٰهِ کی قائم مقام بھی نہیں کہلاسکتی۔کیونکہ اس ہجرت کے نتیجہ میں کافروں کے خلاف خدائی جلال ظاہر نہیں ہوا۔نیز سورۃ حجر میں جو اعتراض بیان ہوئے ہیں اَتٰۤی اَمْرُ اللّٰهِ کے الفاظ ان کے جواب میں آئے ہیں اور ان میں سے کئی ہجرت حبشہ کے بعد پیدا ہوئے تھے۔پس اگر اس ہجرت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی پیشگوئی مراد نہیں۔تو یہ بعض صحابہؓ کے مدینہ جانے کی طرف اشارہ ہے۔جبکہ مدینہ کی ہجرت کی بنیاد مضبوطی سے قائم ہوگئی تھی۔ گویا پچھلی سورۃ میں کلام الٰہی کے جس اثر کا ذکر کیا گیا تھا اَتٰۤی اَمْرُ اللّٰهِ کہہ کر یہ بتایا کہ وہ تاثرات اب جلد ظاہر ہونے والے ہیں۔

سُبْحٰنَهٗ کہہ کر پہلی سورۃ کے حکم کی طرف اشارہ سُبْحٰنَهٗ کہہ کر بتایا ہے کہ ہم پہلی سورۃ کے آخری حصہ میں فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ کہہ کر تسبیح کا حکم دے چکے ہیں اور کہہ چکے ہیں کہ عام مباحثات کو چھوڑ کر اب تم خدا تعالیٰ کی تسبیح میں لگ جاؤ۔اور مؤمنوں پر خدا تعالیٰ کی سُبُوحیّت کو ظاہر کرو۔اب تم کو بتاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی سبوحیت کے ظاہر ہونے کا وقت آ گیا ہے۔

پہلی سورۃ کے آخر میں سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ کے الفاظ آئے تھے۔اس سورۃ کے شروع میں سُبْحَانَ کے الفاظ ہیں۔یہ بھی اس امر کا مزید ثبوت ہے کہ قرآنی مطالب میں ترتیب پائی جاتی ہے۔ایک طرف پہلی سورۃ کے الفاظ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ کے جواب میں اس سورۃ میں اَتٰۤی اَمْرُ اللّٰهِ فرمایا اور وعدہ الٰہی کے قریب ہی میں پورا ہونے کی خبر دی۔دوسری طرف سورۃ حجر کے آخر میں سَبِّحْ کہہ کر جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا تھا۔اس سورۃ میں

سُبۡحٰنَہٗ کہہ کر اس حکم پر کامیاب طور پر عمل ہوجانے کی خبر دی۔ کیونکہ ان الفاظ میں بتایا گیا ہے۔ کہ ہم نے جو کہا تھا کہ خدا تعالیٰ کی پاکیزگی کو اب ظاہر کرو۔ اب تجھے یہ بتاتے ہیں کہ تیری یہ کوشش ناکام نہ رہے گی۔ بلکہ عنقریب تیرے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی سبوحیت یعنی اس کا سب اعتراضات سے پاک ہونا ثابت ہوجائے گا۔ گویا اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ کہہ کر خدا تعالیٰ پر جو اِنَّ السَّاعَۃَ لَاٰتِیَۃٌ کے وعدہ کے پورا نہ ہونے کی صورت میں اعتراض ہوسکتا تھا اُسے دور کیا اور سُبۡحَانَہٗ کہہ کر اس اعتراض کو دور کیا جو سَبِّحۡ کے حکم کے پورا نہ ہونے کی صورت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑ سکتا تھا۔

وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ۔ یعنی ان کے شرک سے اللہ تعالیٰ بالا ہے۔ ان کا شرک اس کی تدابیر میں روک نہیں بن سکتا اور ان کے معبود اس کے فیصلہ کو نہیں مٹا سکتے۔

خدائی کلام اور بندے کے افتراء میں فرق اس آیت سے خدائی کلام اور بندے کے افتراء میں خوب فرق معلوم ہوجاتا ہے۔ دنیا کے لوگ جتھے پر زور دیا کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ ہم اپنے جتھے کو بلائیں گے۔ اور اکیلے ہوں تو اس کی شکایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کیا کریں اکیلے ہیں کوئی ساتھی نہیں ورنہ بتا دیتے۔ بہاء اللہ نے بھی جو الوہیت کا مدعی تھا اپنے فرید ہونے کا رونا رو کر اپنی کمزوری کا اقرار کیا ہے۔ (المبین از بہاء اللہ ص ۲۰۶)

اس کے مقابلہ میں سچا خدا ہمیشہ اپنے ایک ہونے پر زور دیتا ہے۔ اور خدا کے لئے جتھا قرار دینے والوں پر ناراض ہوتا ہے۔ بیٹا بیٹیوں یا درباریوں کے ماننے یا درباری کہنے والوں پر اظہار غضب فرماتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جو حقیقی اور اصلی طاقت و شوکت کا مقام ہے۔ جھوٹے مدعی اپنے اکیلا ہونے کا ماتم کرتے ہیں سچا خدا اپنے اکیلے ہونے کو اپنی بڑائی کے ثبوت میں پیش کرتا ہے۔

یُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ

وہ فرشتوں کو اپنے ان بندوں پر جنہیں وہ پسند کرتا ہے (اپنی) خاص وحی یعنی یہ حکم دے کر اتارتا ہے کہ (لوگوں کو)

عِبَادِہٖۤ اَنۡ اَنۡذِرُوۡۤا اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ

آگاہ کرو کہ بات یہی (درست) ہے کہ میرے سوا کوئی بھی (سچا) معبود نہیں ہے اس لئے تم مجھے (ہی) اپنے

اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝۳

بچاؤ کا ذریعہ بناؤ۔

حل لغات۔ اَلرُّوْحُ اَلرُّوْحُ کے لئے دیکھو حجر آیت نمبر ۳۰۔

اَلرُّوْحُ مَابِهٖ حَيَاةُ الْاَنْفُسِ ۔ وہ چیز جس کے ذریعہ نفوس زندہ رہتے ہیں۔ یعنی جس کو زندگی کہتے ہیں۔ اَلْوَحْیُ الہام ۔ جِبْرِيْلُ جبرائیل ۔ اَلنَّفْخُ پھونک ۔ اَمْرُ النُّبُوَّةِ امر نبوت ۔ وَحُكْمُ اللهِ وَاَمْرُهٗ ۔ خدا تعالیٰ کا فیصلہ اور اس کا حکم ۔ تُطْلَقُ الْاَرْوَاحُ عَلٰى مَايُقَابِلُ الْاَجْسَادَ جسم کے مقابل چیز کو بھی روح کہتے ہیں ۔ (جو انسان میں جسم کے علاوہ موجود ہے) وَعِنْدَ اَصْحَابِ الْكِيْمِيَا عَلَى الْمِيَاهِ الْمُقَطَّرَةِ مِنَ الْاَدْوِيَةِ ۔ کیمیا والوں کے نزدیک دوائیوں کے عرق کو بھی روح کہتے ہیں ۔ (لیکن یہ فن کی ناواقفی کی وجہ سے لکھا ہے کیمسٹری والے عرق کو روح نہیں کہتے ۔ بلکہ یا تو تیل والی ادویہ کا وہ حصہ جو عرق پر آ جاتا ہے اسے روح کہتے ہیں جیسے روح گلاب یا پھر عرق کو بار بار کشید کر کے اس کی تیز خوشبو کو عرق سے الگ کر لینے پر اسے روح کہتے ہیں جیسے روح کیوڑہ) (اقرب) جبرائیل کو جو صاحب اقرب الموارد نے روح لکھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جبرائیل کو روح کہا گیا ہے اس لئے انہوں نے روح کے معنے جبرائیل قرار دے دیئے۔

جبرائیل کو روح کے نام سے پکارے جانے کی وجہ حالانکہ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ بعض دفعہ مسبب کا نام سبب کو دے دیا جاتا ہے اور اسی لحاظ سے جبرائیل کو روح کہا گیا ہے ۔ کیونکہ وہ روح یعنی کلام الٰہی کو لاتا ہے۔ غرض روح کے معنے جبریل نہیں بلکہ استعارۃً وحی لانے والے فرشتے کو کہتے ہیں ۔ اصل میں روح وہ چیز ہے جس کے ذریعہ کسی کو حیات ممتاز ملے ۔ پس وہ روح جو حیوان کو باقی چیزوں سے ممتاز کر رہی ہے ۔ اور وہ روح جس کے ساتھ انسان باقی حیوانوں سے ممتاز ہوتا ہے ان دونوں پر لفظ روح کا اطلاق ہوتا ہے ۔ یا وہ روح جو انسان کو باخدا بنا دیتی ہے پس کلام الٰہی بھی ایک روح ہے جو انسان کو نئی زندگی بخشتا ہے۔

اَنْذِرُوْا اَنْذِرُوْا اَنْذَرَ سے امر کا جمع کا صیغہ ہے۔ اَنْذَرَ کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۳۔

اَنْذِرْ اَنْذَرَ کا صیغۂ امر ہے۔ اس کی مصدر اِنْذَارٌ ہے اور الفاظ نَذْرٌ، نُذْرٌ، نُذُرٌ اور نَذِيْرٌ بھی اس معنی میں آتے ہیں ۔ کہتے ہیں اَنْذَرَهٗ بِالْاَمْرِ ۔ اَعْلَمَهٗ وَحَذَّرَهٗ مِنْ عَوَاقِبِهٖ قَبْلَ حُلُوْلِهٖ یعنی کسی امر کی حقیقت سے اسے آگاہ کیا۔ اور اس امر کے نتائج کے ظاہر ہونے سے پہلے اسے ہوشیار کر دیا اور کہتے ہیں اَنْذَرَهٗ: خَوَّفَهٗ فِيْ اِبْلَاغِهٖ

یُقَالُ اَنْذَرْتُ الْقَوْمَ سَیْرَ الْعَدُوِّ اِلَیْھِمْ فَنَذِرُوْا یعنی اَنْذَرَہٗ کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ خبر پہنچاتے ہوئے خوب ہوشیار کیا چنانچہ جب کہتے ہیں اَنْذَرْتُ الْقَوْمَ سَیْرَ الْعَدُوِّ تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ میں نے قوم کو دشمن کی پیش قدمی سے خوب ہوشیار کیا۔ اوراس کا فعل لازم یا مطاوع نذر ہے جس کے معنی ہیں وہ ہوشیار ہو گیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ روح سے مراد دنیا کو زندہ کرنے والا کلام اور امر نبوت بِالرُّوْحِ۔ روح سے مراد دنیا کو زندہ کرنے والا کلام ہے۔ امر نبوت کو بھی روح کہتے ہیں۔

نبیوں اور ماموروں کا کلام چونکہ دنیا کے لئے زندگی بخش ہوتا ہے اس لئے اُسے روح قرار دیا جاتا ہے۔ اَنْ اَنْذِرُوْا میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اس آیت میں وحی نبوت کا ذکر ہے۔

وحی کی دو قسمیں وحی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک صرف انسان کے اپنے نفس کے لئے۔ اس وحی کو ظاہر کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا۔ گو اجازت ہوتی ہے کہ انسان اس کا اظہار کر دے۔ دوسری وحی بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے ہوتی ہے اور پھیلانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ بلکہ اس کے نہ پھیلانے کو جرم قرار دیا جاتا ہے یہ دوسری قسم کی وحی نبیوں کی وحی ہوتی ہے۔ اس جگہ اَنْذِرُوْا کہہ کر اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہم جس وحی کا اس جگہ ذکر کر رہے ہیں۔ وہ وحی نبوت ہے۔

مِنْ اَمْرِہٖ میں چار باتوں کی طرف اشارہ مِنْ اَمْرِہٖ۔ ان الفاظ سے ایک تو یہ بتایا ہے کہ ملائکہ خود کلام نازل نہیں کر سکتے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نازل ہوتے ہیں۔ اور اسی کا بھیجا ہوا کلام لاتے ہیں۔

دوسرے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس جگہ اس روح یعنی کلام الٰہی کا ذکر ہے جو مِن اَمرِ اللہ ہوتا ہے۔ یعنی اس میں خدا تعالیٰ کے اوامر و نواہی کا ذکر ہوتا ہے ان معنوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس جگہ وحی نبوت کا ذکر ہے۔

مِنْ اَمْرِہٖ سے اَتٰۤی اَمْرُ اللّٰہِ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ یہ جو ہم نے کہا ہے اَتٰۤی اَمْرُ اللّٰہِ۔ یہ سنت ہماری سب نبیوں کے متعلق ہے۔ ہم ان میں سے ہر اک کی طرف فرشتوں کو وحی دے کر بھیجتے ہیں۔ اور اس میں ہمارے امر کا بیان ہوتا ہے یعنی کفار کی ہلاکت اور مؤمنوں کی ترقی کا۔ گویا کوئی نبی نہیں آتا کہ اس کے ذریعہ سے ایک قوم کی ہلاکت اور دوسری قوم کی ترقی کی خبر نہ دی گئی ہو۔

مِنْ اَمْرِہٖ میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ہر نبی کا ماننا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ وحی نبوت امر الٰہی پر مشتمل ہوتی ہے پس ہر رسول کا انکار اس کا ہی انکار نہیں۔ بلکہ خدا تعالیٰ کا انکار ہوتا ہے جس نے اس پر وحی کی۔

مِنْ عِبَادِہٖ سے مراد عابد بندے ہیں عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ میں عِبَادِہٖ سے مراد اللہ تعالیٰ کے

عابد بندے ہیں نہ کہ ہر انسان۔ اور اس طرف اشارہ ہے کہ گو نبوت وہبی ہے۔ مگر اس کا نزول عباداللہ پر ہی ہوتا ہے۔ گویا یہ وہب ایک کسب کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور یہ وہب مشروط ہے عبد ہونے کے ساتھ۔ اِن موہبتوں میں سے نہیں جو بلا قید ہر ایک کو مل سکتی ہیں۔

مِنْ عِبَادِهٖ کہنے سے تین باتوں کی طرف اشارہ مِنْ عِبَادِهٖ سے اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ وحی نبوت صرف موحد بندوں پر نازل ہوتی رہی ہے جو توحید کی دلیل ہے۔ اگر شرک بھی جائز ہوتا۔ تو کیوں نہ کوئی نبی ایسا بھی پایا جاتا جو خالص اللہ تعالیٰ کا عبد نہ ہوتا۔ بلکہ دوسرے معبودوں کی عبادت بھی کر لیا کرتا۔ توحید کا یہ ایک بہت بڑا ثبوت ہے کہ آج تک ایک بھی نبی نہیں ہوا جو مشرک ہو۔ پھر نہ معلوم مشرک اپنے عقیدہ کی بنیاد کس دلیل پر رکھتے ہیں۔

عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ نبی کا انتخاب اللہ تعالیٰ بندوں کی مرضی کے مطابق نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی مرضی کے مطابق کرتا ہے۔ اس لئے بندوں کا اس سے مختلف الخیال ہونا ضروری ہے۔ اور جب نبی خدا کا منتخب کیا ہوا ہوتا ہے۔ تو کفار کا یہ اعتراض کہ اس کے خیال قومی خیالات سے مختلف کیوں ہیں کم عقلی کی علامت ہے۔

کلام الٰہی ہمیشہ آہستہ آہستہ اترتا ہے یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَةَ۔ تنزیل کے ایک معنے آہستہ آہستہ اُتارنے کے ہوتے ہیں۔ اس جگہ یہی معنے مراد ہیں اور بتایا ہے کہ کلام الٰہی ہمیشہ اور ہر نبی پر آہستہ آہستہ اترتا ہے۔

مسیحیوں کے اعتراض کا ردّ پس یہ اعتراض جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض لوگوں کی طرف سے خصوصاً مسیحیوں کی طرف سے کیا جاتا ہے کہ اس کا تھوڑا تھوڑا کر کے اُترنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ انسانی کلام ہے اور ضرورت کے مطابق تصنیف کر لیا جاتا تھا۔ ان کی سنّت الٰہیہ سے ناواقفیت کی علامت ہے۔ کیونکہ کون سا نبی ہے جس نے ایک وقت میں ہی ساری کتاب لا کر دنیا کو دے دی ہے۔ موسیٰ کے صحف۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات سب اس امر پر شاہد ہیں کہ تعلیم آہستہ آہستہ ایک لمبے عرصہ میں دنیا کو دی گئی۔ اگر اس طرح تعلیم کا دنیا کے سامنے پیش کرنا قابل اعتراض ہے تو یہ اعتراض حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر بھی وارد ہوتا ہے۔

لیکن حق یہ ہے کہ یہ اعتراض ہی غلط ہے۔ جو تعلیم دنیا کے رائج الوقت خیال کے خلاف ہو اور اس کو مٹا کر اوامر الٰہی کو رائج کرنے کے لئے آئے۔ اس کا آہستہ آہستہ اترنا ضروری ہے۔ تا لوگ اس پر اچھی طرح عمل کر سکیں اور تا وہ ان کے دماغوں میں راسخ ہو جائے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے سورۃ فرقان کی اس آیت میں کہ وَ قَالَ الَّذِیْنَ

کَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَیْہِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَۃً وَّاحِدَۃً ۚ کَذٰلِکَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِہٖ فُؤَادَکَ (الفرقان: ۳۳) یعنی کافر کہتے ہیں کہ کیوں سب قرآن اس پر ایک ہی دفعہ نہیں اترا۔ یعنی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدا کا کلام نہیں ۔ بلکہ محمدؐ رسول اللہ حسب موقعہ اسے تصنیف کر لیتے ہیں۔

قرآن کریم کو آہستہ آہستہ اتارنے کی حکمت فرماتا ہے یہ ٹھیک ہے کہ یہ قرآن ایک ہی دفعہ نہیں اُترا۔ مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس طرح تیرے دل کو ثبات اور ایمان بخشنا چاہتے ہیں۔ یعنی تو اور تیرے مؤمن اس کے مطالب کو عملی جامہ پہنا کر اس کے معانی سے خوب آگاہ ہوتے جاؤ اور اس لئے بھی کہ اگر پہلے ایک پیشگوئی بیان کی جائے۔ پھر جب وہ پوری ہو جائے اور اس کا ذکر بعد کی وحی میں کیا جائے تو ایمان بہت زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ اور یہ طریق بیان بعد میں آنے والے لوگوں کے ایمان کی زیادتی کا بھی موجب ہوتا ہے۔ لیکن اگر کلام الٰہی میں پیشگوئیوں کا تو ذکر ہو۔ لیکن ان کے پورا ہونے کی طرف کوئی اشارہ نہ ہو۔ تو اس وقت کے لوگ بھی اتنا فائدہ نہیں اٹھاتے ۔ اور بعد کے لوگوں کے لئے بھی وہ کلام کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ دوسری کتب کے وہ محتاج رہتے ہیں۔

مِنْ اَمْرِہٖ میں مِن تبعیضیہ کے لحاظ سے معنی مِنْ اَمْرِہٖ میں مِنْ تبعیضیہ بھی ہو سکتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے سارے حکم ایک ہی وقت میں کسی ایک نبی پر نازل نہیں کئے ۔ بلکہ ہر زمانہ میں ضرورت کے مطابق اپنے احکام مختلف انبیاء کی معرفت نازل کئے ہیں۔ پس یہ اعتراض کہ پہلے نبیوں کے بعد اس کی کیا ضرورت ہے غلط ہے۔ جس طرح پہلے نبی کے بعد دوسرے نبی کی ضرورت تھی۔ اسی طرح سابق نبیوں کے بعد اس نبی کی ضرورت ہے۔

لا الٰہ الّا اللہ دینی تعلیمات کا خلاصہ ہے اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ۔ یہ تمام دینی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ نبیوں کی تعلیم جزئیات میں مختلف رہی ہے۔ مگر ایک ہی اصل سب کی تعلیم میں کارفرما تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور دین کا خلاصہ یہی تعلیم ہے۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے فرمایا کہ جاجو ملے اُس سے کہہ دے مَنْ قَالَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ۔ جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا داخل جنت ہو گیا۔ (مسلم کتاب الایمان باب الدلیل علی انہ من مات علی التوحید دخل الجنۃ) انہیں سب سے پہلے حضرت عمرؓ ملے اور انہوں نے انہیں روکا اور آنحضرت صلعم کی خدمت میں لائے۔ اور آپ سے پوچھا کہ کیا ابو ہریرہ جو کہتے ہیں وہ درست ہے؟ آپؐ نے فرمایا۔ ہاں درست ہے۔ آپ نے فرمایا۔ یا رسول اللہ اگر اس طرح اعلان ہوا تو فَاِنِّیْٓ اَخْشٰی اَنْ یَّتَّکِلَ النَّاسُ عَلَیْھَا یعنی لوگ یہ کہنے لگ جائیں گے کہ بس لا الٰہ الا اللہ کہہ لیا اب کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہت اچھا رہنے دو۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ آپؐ نے اس

کوضروری نہ سمجھا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو اعلان کرنا تھا ہو چکا۔ جو اس کا مفہوم سمجھتے تھے ان کو معلوم ہو گیا۔ نا اہلوں تک پہنچانے کی ضرورت نہیں۔ اس حکم کے اہل جو سمجھتے ہیں کہ لا الہ الا اللہ میں سب احکام شامل ہیں وہ خود اس کی مناسب تشریح کے ساتھ سب کو پہنچا دیں گے۔

اتَّقٰی کے معنے اِتَّقُوْنِ وَقٰی یَقِیْ سے باب افتعال کا صیغہ ہے اور اس کے معنے ہیں۔ اپنی حفاظت کا ذریعہ کسی کو بنانا۔ پس اِتَّقُوْنِ کے معنے ہیں۔ کہ مجھے ہی اپنی حفاظت اور بچاؤ کا ذریعہ بناؤ۔ یہ مطلب نہیں کہ مجھ سے اس طرح ڈرو جس طرح نقصان رساں چیزوں سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ تو خود اپنے بندوں کو اپنی طرف بلاتا ہے اور ان سے محبت کرتا ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰی

اس نے آسمانوں اور زمین کو حق (وحکمت) کے ساتھ پیدا کیا ہے اور جن چیزوں کو (یہ لوگ اس کا) شریک

عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۴﴾

ٹھہراتے ہیں وہ اس سے بہت بالا ہے۔

حلّ لُغَات۔ اَلْحَقُّ کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۱۵۔

اَلْحَقُّ حَقٌّ کا مصدر ہے۔ اور حَقَّهٗ حَقًّا کے معنے ہیں غَلَبَهٗ عَلَی الْحَقِّ۔ حق کی وجہ سے اس پر غالب آیا۔ وَالْاَمْرَ: اَثْبَتَهٗ وَاَوْجَبَهٗ۔ کسی امر کو ثابت کیا اور واجب کیا۔ کَانَ عَلٰی یَقِیْنٍ مِنْهُ۔ کسی معاملہ پر یقین سے قائم تھا۔ اَلْخَبَرَ: وَقَفَ عَلٰی حَقِیْقَتِهٖ اور حَقَّ الْخَبَرَ کے معنے ہوں گے اس کی حقیقت سے آگاہ ہوا اور اَلْحَقُّ کے معنے ہیں ضِدُّ الْبَاطِلِ سچ۔ اَلْاَمْرُ الْمَقْضِیُّ فیصلہ شدہ بات۔ اَلْعَدْلُ۔ عدل۔ اَلْمِلْكُ۔ ملکیت۔ الْمَوْجُوْدُ الثَّابِتُ۔ موجود وقائم۔ اَلْیَقِیْنُ بَعْدَ الشَّكِّ۔ یقین۔ اَلْمَوْتُ۔ موت اَلْحَزْمُ دانائی۔ (اقرب)

تفسیر۔ حق کے دو معنی بِالْحَقِّ (۱) ہر اک کا حق مقرر کر دیا ہے یعنی کچھ کام کا حصہ آسمان کے سپرد کر دیا اور کچھ زمین کے سپرد کر دیا۔ دونوں مل کر نتائج پیدا کرتے ہیں۔

(۲) یعنی دونوں کو حکمت کے ماتحت اس لئے پیدا کیا تا انسان کی توجہ خدا کی طرف پھرے۔ اور انسان سمجھے کہ سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی فی ذاتہٖ کامل نہیں۔ آسمان اپنے کام کی تکمیل میں زمین کا محتاج ہے اور زمین آسمان کی

دست نگر۔صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب سے کام لے رہا ہے۔

تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ۔فرمایا کہ جو انسان آسمان اور زمین کو بِالْحَقِّ نہیں مانتا۔وہ لازماً مشرک بنتا ہے۔کیونکہ کوئی عقلمند یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس جہان کو خدا نے بنایا ہے مگر اس میں مقصد کوئی مقرر نہیں کیا۔کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے بنایا ہے تو ضرور اس کا کوئی مقصد ہے۔اور اگر اس کا کوئی مقصد نہیں تو یقیناً خدا نے نہیں بنایا۔بلکہ یہ خود بخود ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ ذرّہ ذرّہ خدا کا شریک ہے۔دوسرے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ زمین و آسمان کا بنانا حق کے ساتھ ہے۔یعنی ان کا مادہ ہمارا پیدا کردہ ہے۔اس لئے اس میں تصرف کا ہم کو حق حاصل ہے۔اس میں ان لوگوں کا ردّ ہے جو ایک طرف خدا تعالیٰ کو مادہ کا خالق نہیں سمجھتے۔دوسری طرف اس کی ترکیب کا فاعل خدا تعالیٰ کو قرار دیتے ہیں۔(ستیارتھ پرکاش از سوامی دیانند اردو ترجمہ کوریمل داس جی باب ۸ ص ۲۷۴) حالانکہ جو خالق نہیں اُسے کیا حق حاصل ہے کہ اس میں تصرف کرے اور ایک موجود بالذات کو اپنے حکم کے نیچے لائے یہ تو ظلم ہوجاتا ہے۔اور نیز یہ عقیدہ مشرکانہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ان گنت وجودوں کو ازلی قرار دیا گیا ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵﴾

اس نے انسان کو ایک حقیر نطفہ سے پیدا کیا ہے پھر (اس کے باوجود) وہ اچانک کھلم کھلا جھگڑنے والا بن جاتا ہے۔

حلّ لُغَات۔نُطْفَةٌ النُّطْفَةُ کے معنے ہیں۔اَلْمَاءُ الصَّافِيْ قَلَّ اَوْ كَثُرَ۔صاف وشفاف پانی خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔یُقَالُ سَقَانِيْ نُطْفَةً عَذْبَةً چنانچہ سَقَانِيْ نُطْفَةً عَذْبَةً کا محاورہ بول کر یہ مراد لیتے ہیں کہ اس نے مجھے صاف شیریں پانی پلایا۔وَقِيْلَ قَلِيْلُ مَاءٍ يَبْقٰى فِي دَلْوٍ اَوْ قِرْبَةٍ۔بعض نے نطفہ کے معنے اس تھوڑے سے پانی کے کئے ہیں جو ڈول یا مشکیزہ کو خالی کرتے وقت باقی رہ جاتا ہے۔مَاءُ الرَّجُلِ وَالْمَرْاَةِ۔مرد یا عورت کی منی۔اَلْبَحْرُ۔نطفہ کے ایک معنے سمندر کے بھی ہیں۔اس کی جمع نِطَافٌ اور نُطَفٌ آتی ہے۔(اقرب)

خَصِيْمٌ خَصِيْمٌ خَصَمَ (يَخْصِمُ خَصْمًا) سے صفت مشبّہ ہے اور خَصَمَهُ کے معنے ہیں غَلَبَهُ فِي الْخُصُوْمَةِ۔اس پر جھگڑے میں غالب آیا۔اَلْخَصِيْمُ۔اَلْمُخَاصِمُ۔خصیم کے معنے ہیں۔جھگڑنے والا۔اس کی جمع خُصَمَاءُ آتی ہے (اقرب)

تفسیر۔ آیت خَلَقَ الْاِنْسَانَ الخ میں تین باتوں کی طرف اشارہ اس آیت میں یہ بتایا

ہے کہ زمین و آسمان کو ایک خاص نظام کے ماتحت پیدا کر کے ہم نے انسان کو بنایا۔ اور اپنے حق کی بناء پر اس کے لئے ہدایت نامے نازل کئے۔ مگر باوجود اس کے کہ ہم نے اُسے ایک حقیر مادہ سے پیدا کر کے اعلیٰ سے اعلیٰ قابلیت عطا کی۔ وہ اُلٹا ہمارے حقوق کے متعلق بحث کرنے لگتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے عدم سے وجود کس طرح پیدا کیا اس لئے دنیا خود بخود بنی ہے۔ کوئی کہتا ہے خدا نے مادہ نہیں بنایا۔ بلکہ یونہی جبراً اس پر تصرف کر لیا ہے کوئی کہتا ہے کہ خدا کو کیا حق حاصل ہے کہ میرے لئے ہدایت نامہ جاری کرے۔ میں آزاد ہوں۔ میں اپنے لئے خود قانون بناؤں گا۔ غرض اس کے احسان کا انکار کرنے لگتا ہے اور اپنے آپ کو آزاد بتاتا ہے۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ خود تو ایک حقیر مادہ سے پیدا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اتنا بڑا سمجھنے لگتا ہے کہ خدا تعالیٰ سے بھی بحث کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسری طرف نبیوں پر اعتراض کرتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ جس خدا نے ایک حقیر نطفہ سے پیدا کر کے ایک سمجھدار انسان بنا دیا جو الٹا نافرمان ہو گیا۔ کیا وہ ایک بظاہر حقیر نظر آنے والے انسان کو آگے ترقی دے کر انسان کامل نہیں بنا سکتا کہ تا وہ اس کی فرمانبرداری کرے اور دوسروں سے کرائے۔

اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ خلق زمین و آسمان سے یہ غرض تو نہ ہو سکتی تھی کہ ایک نافرمان انسان پیدا ہو۔ یقیناً خلق کا مقصد اس سے بالا ہونا چاہیے تھا۔ پھر جب اس مقصد کو پورا کرنے والا انسان دنیا میں آتا ہے تو لوگوں کو تعجب کیوں ہوتا ہے۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنْهَا

اور (نیز) چار پایوں کو (پیدا کیا ہے اور) انہیں اس نے ایسا بنایا ہے کہ ان میں تمہارے لئے گرمی کا سامان

تَاْكُلُوْنَ ۙ۝۶

اور (اور بھی) کئی نفعے ہیں اور تم ان (کے گوشت) کا کچھ حصہ کھاتے ہو۔

حَلّ لُغَات ۔ دِفْءٌ دَفِیءَ (یَدْفَأُ۔ دَفَأً و دَفُؤَ۔ یَدْفُؤُ۔ دَفَاءَۃً) مِنَ الْبَرَدِ کے معنے ہیں۔ تَسَخَّنَ وَوَجَدَ الْحَرَّ۔ گرم ہوا اور گرمی کو محسوس کیا۔ اَلدِّفْءُ۔ نَقِیْضُ حِدَّۃِ الْبَرْدِ۔ گرمی۔ اَلدِّفْءُ مِنَ الْحَائِطِ کِنُّہٗ۔ دیوار کی پناہ۔ یُقَالُ ''اُقْعُدْ فِیْ دِفْءِ ھٰذَا الْحَائِطِ'' اَیْ کِنِّہٖ۔ چنانچہ اُقْعُدْ فی دِفْءِ

هٰذَا الْحَائِطِ کہہ کر یہ معنے لیتے ہیں کہ اس دیوار کی پناہ اور اوٹ میں بیٹھ۔ مَا اَدْفَأَمِنَ الْاَصْوَافِ وَالْاَوْبَارِ۔ گرم کپڑے۔ (اقرب)

مَنَافِعُ۔ مَنَافِعُ مَنْفَعَةٌ کی جمع ہے اور مَنْفَعَةٌ کے معنے ہیں۔ اَلنَّفْعُ۔ نفع۔ و کُلُّ شَیْءٍ یُنْتَفَعُ بِہٖ۔ ہر وہ چیز جس سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ (اقرب)

تفسیر۔ **آیت وَ الْاَنْعَامَ میں انسانی خصومت کا جواب** اس آیت میں نہایت لطیف پیرایہ میں انسان کی خصومت کا جواب دیا ہے۔ فرماتا ہے ہم نے تم کو پیدا کیا۔ لیکن تم کو آزادی کا دعویٰ ہے۔ حالانکہ خود تم ان چیزوں پر تصرف کرتے ہو جن کو تم نے پیدا نہیں کیا اور ان سے خوب فائدہ اُٹھاتے ہو۔ حتٰی کہ ان کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور کہتے ہو کہ انسان اعلیٰ ہے اس لئے اس کی خاطر دوسرے جانوروں کو ذبح کرنا تک درست ہے۔ اگر یہ درست ہے کہ اعلیٰ کے لئے ادنیٰ قربان کیا جا سکتا ہے اور اعلیٰ کو ادنیٰ سے کام لینا جائز ہے تو ہماری حکومت پر یا رسول کی حکومت پر تم کو کیا اعتراض ہے۔ وہی قانون جو تم ان کے لئے جاری کرتے ہو۔ اپنے متعلق جاری کرنے کے لئے کیوں تیار نہیں ہوتے۔

دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ ایک پہلی آیت یعنی عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ پر جو کفار اعتراض کرتے تھے کہ خدا تعالیٰ نے اس حقیر بندہ پر کس طرح کلام نازل کیا۔ اس کا جواب یہ کہہ کر دیا تھا کہ کیا تم کو ہم نے ایک حقیر نطفہ سے پیدا کر کے اعلیٰ مرتبہ تک نہیں پہنچایا۔ پھر اگر بعض لوگوں کو جن کو تم حقیر سمجھتے ہو اگر نبی بنا کر عزت دی۔ تو اس پر تمہارا اعتراض کیونکر درست ہو سکتا ہے۔ اب اس آیت میں ان کے دوسرے اعتراض کا جواب دیا جو اَنْ اَنْذِرُوْٓا سے پیدا ہو سکتا تھا۔ یعنی یہ کہ ہم تو گندے اور کمزور انسان ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری طرف توجہ کس طرح کر سکتا ہے۔ اور فرمایا کہ خدا تعالیٰ تمہارے کھانے پینے کی فکر تو کر سکتا ہے۔ اس میں اس کی شان میں فرق نہیں آتا۔ لیکن جب وہ تمہاری روحانی غذا کی طرف توجہ کرے تو تم کو یہ اعتراض سوجھتا ہے کہ انسان جیسے حقیر وجود کی طرف خدا تعالیٰ کو کلام بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔

تعجب ہے کہ ہمیشہ سے یہ متضاد اعتراض نبیوں اور نبوت پر ہوتے چلے آئے ہیں۔ نبیوں کے دشمن ایک طرف تو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اُن حقیر لوگوں کو خدا تعالیٰ کیوں چن سکتا تھا۔ اگر چننا تو کسی بڑے آدمی کو چننا۔ دوسری طرف یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی شان بلند ہے اس کی نسبت یہ خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حقیر انسان کی طرف توجہ کرے گا اور اس کے لئے الہام بھیجے گا۔ فلاسفر خصوصاً یہ اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ

دونوں اعتراض غلط ہیں اور متضاد بھی۔ کیونکہ ایک اعتراض سے تو اپنا بڑا ہونا اور نبیوں کا حقیر ہونا ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور دوسرے اعتراض میں اپنے حقیر ہونے کا اقرار ہوتا ہے۔ پس اصل بات یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی بہانہ سے الہام کے جوئے سے بچنا چاہتے ہیں۔

آیت مِنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ میں مِنۡهَا کو پہلے رکھنے کی وجہ یہ جو فرمایا مِنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ اس میں مِنۡهَا کو پہلے رکھا گیا ہے جو تخصیص کے معنے دیتا ہے۔ اس پر یہ اعتراض پڑ سکتا ہے کہ کیا انسان اَنعام کے سوا دوسری چیزوں کے گوشت نہیں کھاتے یا سبزیاں نہیں کھاتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تخصیص کبھی حصر کے مضمون کے اظہار کے لئے آتی ہے اور کبھی یہ بتانے کے لئے کہ اس قسم کی چیزوں میں سے یہ اہم ہے اور اس جگہ پر اس کے یہی معنے ہیں۔ اور مراد یہ ہے کہ تمہاری بڑی غذا انعام کا گوشت یا دودھ گھی ہے۔ بے شک مرغی شکار وغیرہ بھی انسان کھاتے ہیں۔ لیکن اہم غذا انعام کا گوشت یا دودھ گھی ہے۔ یا جو بمنزلہ انعام کے ہیں۔ جیسے نیل گائے یا ہرن وغیرہ۔ یہ چیزیں انسانی غذا کا اہم جزو ہیں۔ اور دوسری اشیاء ان سے اُتر کر ہیں۔ اس آیت میں انعام کے دو استعمال تو کھول کر بیان فرما دیئے اول گرمی سردی کے اثرات سے بچاتے ہیں۔ یعنی ان کی کھالیں اور اُون وغیرہ کو تم استعمال کرتے ہو۔ دوسرے یہ کہ تم ان کا گوشت کھاتے اور دودھ پیتے ہو۔ تیسرا لفظ منافع کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے مراد جانوروں کی تجارت بھی ہوسکتی ہے اور نسل کشی بھی۔

وَ لَكُمۡ فِيۡهَا جَمَالٌ حِيۡنَ تُرِيۡحُوۡنَ

اور (اس کے علاوہ) تمہارے لئے ان میں ایک (قسم کا) زینت (کا سامان بھی) ہے جب تم (انہیں) چرا کر شام کو

وَ حِيۡنَ تَسۡرَحُوۡنَ ۝۷

(ان کے تھانوں کی طرف) واپس لاتے ہو اور جب تم (انہیں صبح کو) چرنے کے لئے چھوڑتے ہو۔

حلّ لُغات۔ اَلۡجَمَالُ اَلۡحُسۡنُ فِي الۡخَلۡقِ وَ الۡخُلُقِ۔ جمال ظاہری و باطنی خوبی کو کہتے ہیں (اقرب) اس جگہ جمال سے مراد جمال معنوی ہے یعنی عزت۔ کیونکہ جس شخص کا گلّہ صبح و شام آتا جاتا ہے وہ لوگوں میں معزز ہوتا ہے۔

تُرِيْحُوْنَ تُرِيْحُوْنَ اَرَاحَ سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور اَرَاحَ الرَّجُلُ (اِرَاحَةً واَرَاحًا) کے معنے ہیں رَاحَتْ عَلَيْهِ اِبِلُهُ وغَنَمُهُ وَمَالُه وَلَا يَكُوْنُ ذَالِكَ اِلَّا بَعْدَ الزَّوَالِ۔ اس کے جانور (اونٹ۔ بکریاں وغیرہ) شام کو چر کر آ گئے۔ اور اَرَاحَ الْاِبِلَ والغَنَمَ کے معنے رَدَّهَا اِلَى الْمُرَاحِ کے بھی ہیں۔ یعنی انہیں ان کے تھانوں کی طرف واپس لوٹایا (اقرب) پس تُرِيْحُوْنَ کے معنے ہوں گے کہ تمہارے پاس تمہارے جانور شام کو چر کر آتے ہیں یا تم شام کو جانور چرا کر واپس لاتے ہو۔

تَسْرَحُوْنَ تَسْرَحُوْنَ۔ سَرَحَ (يَسْرَحُ سَرْحًا) سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور سَرَحَ الرَّاعِي الْمَوَاشِيَ کے معنے ہیں۔ اَسَامَهَا اَيْ اَرْسَلَهَا تَرْعٰى۔ جانور کو چرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ (اقرب) پس تَسْرَحُوْنَ کے معنے ہوں گے تم جانوروں کو چرنے کے لئے چھوڑتے ہو۔

تفسیر ۔ یعنی یہ جانور تمہاری عزت اور بڑائی کا موجب بھی ہوتے ہیں۔ تم فخر کرتے ہو کہ میرے پاس اس قدر بھینسیں ہیں۔ اس قدر گائیں گھوڑے اونٹ بکریاں ہیں۔ غرض ان کو اپنی عزت کا ذریعہ بناتے ہو۔ پھر سوچو تو سہی کہ تم اپنی چیزوں کو جو تمہاری مخلوق بھی نہیں اپنے لئے جمال کا موجب بناتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ خیال کرتے ہو کہ انسان کو پیدا کر کے وہ اسے یوں ہی چھوڑ دے۔ حتّٰی کہ وہ اس کی سبوحیت کی بجائے اس پر اعتراض کرے اور بجائے اس کے کہ اس کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی اعلیٰ شان ظاہر ہو اس کی پیدائش موجب اعتراض بن جائے۔ تم کیوں خیال نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ جو خالق ہے وہ بھی یہی چاہے گا کہ اس کی مخلوق اس کے لئے جمال کا موجب ہو یعنی اعلیٰ اخلاق اور دین والی ہو۔ جس کو دیکھ کر انسان محسوس کرے کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی اعلیٰ مخلوق پیدا کی ہے۔

آیت میں شام کو جانوروں کے آنے کا ذکر ان کو صبح چرنے کے لئے چھوڑنے سے پہلے کرنے کی وجہ

یہاں تُرِيْحُوْنَ یعنی شام کو جانوروں کے آنے کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور تَسْرَحُوْنَ یعنی صبح کو انہیں چرنے کے لئے بھیجنے کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے۔ حالانکہ جانور پہلے گھر سے جاتا ہے اور پھر شام کو واپس آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جگہ جمال کا ذکر ہے اور جانوروں کے صبح گھر سے نکلنے کی نسبت شام کو گھر آنے کی حالت میں جمال زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ شام کو کھلا پھرنے اور پیٹ بھر کر گھاس کھا لینے کے بعد وہ تروتازہ نظر آتے ہیں۔ نیز اس لئے بھی کہ صبح جب جانور جاتے ہیں تو انسان کے دل میں خطرہ ہوتا ہے کہ کوئی جانور کھو یا نہ جائے۔ یا کوئی درندہ اُسے نہ پھاڑ کھائے۔ مگر جب شام کو جانور صحیح سلامت گھر کی طرف لوٹتے ہیں تو انسان کا دل مطمئن ہو جاتا ہے اور وہ ان کو دیکھ کر

اپنے اندر فخر محسوس کرتا ہے۔

وَ تَحۡمِلُ اَثۡقَالَکُمۡ اِلٰی بَلَدٍ لَّمۡ تَکُوۡنُوۡا بٰلِغِیۡهِ اِلَّا بِشِقِّ

اور وہ تمہارے بوجھ اُٹھا کر اس (دور کے) شہر تک بھی لے جاتے ہیں جہاں تک تم اپنی جانوں کو مشقت میں ڈالے

الۡاَنۡفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّکُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ۙ﴿۸﴾

بغیر نہیں لے جا سکتے۔ تمہارا رب یقیناً (تم پر) نہایت شفقت کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

حلّ لُغات۔ شِقٌّ شِقٌّ کے معنے ہیں اَلۡمَشَقَّةُ۔ مشقت۔ (اقرب)

رَءُوۡفٌ رَءُوۡفٌ رَأَفَ (یَرۡأَفُ وَرَإِفَ یَرۡأَفُ رَأۡفَةً) سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور رَأَفَ اللّٰہُ بِكَ کے معنے ہیں رَحِمَ اَشَدَّ الرَّحۡمَةِ۔ کہ اللہ نے تجھ پر بہت رحمت کی (اقرب) رأفت کے معنے رحم کے ہوتے ہیں۔ اس کے استعمال کو دیکھنے سے پتہ لگتا ہے کہ رأفت محبت والے جذبہ کو کہتے ہیں۔ رحم کے موجبات کئی ہوا کرتے ہیں۔ لیکن کسی کی تکلیف اور دکھ کو دیکھ کر دل میں جو ہمدردی اور محبت پیدا ہوتی ہے۔ اُسے رأفة کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے لئے رءوف کے لفظ کے استعمال کا مطلب پس خدا تعالیٰ کے رءوف ہونے کے یہ معنے ہیں کہ وہ دکھوں کو نہیں دیکھ سکتا۔ اس لئے اس نے مخلوق کو تکلیف سے بچانے کے لئے ہر قسم کی آرام دہ چیزیں بنا دی ہیں۔

تفسیر۔ **جسمانی سفر کا ذکر کر کے روحانی سفر کی طرف اشارہ** یہ جانور تمہارے بوجھ اٹھاتے ہیں اور وہاں لے جاتے ہیں جہاں تم بغیر تکلیف کے نہیں پہنچ سکتے تھے۔ یعنی یہ نہ ہوتے تو بوجھ اٹھا کر چلنا پڑتا اور تکلیف میں پڑتے۔ پھر سوچو کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہارے جسمانی سفر کے لئے اس قدر سامان سہولت پیدا کئے ہیں۔ تو کیوں وہ روحانی سفر کے لئے سامان پیدا نہ کرے گا۔ اور تم ان روحانی سامانوں کو دیکھ کر کیوں یہ کہنے لگ جاتے ہو کہ انسان جیسے حقیر وجود کے لئے خدا تعالیٰ یہ کام کس طرح کر سکتا تھا۔ تم خدا تعالیٰ کی بڑائی کا راگ اس موقعہ پر محض بہانہ سازی سے الاپتے ہو۔ لیکن یہ بھول جاتے ہو کہ وہ بڑی شان والا بھی ہے مگر ساتھ رؤوف اور رحیم بھی تو ہے۔ علو شان والے وجود جب رءوف و رحیم بھی ہوں تو کمزوروں کے بوجھ اٹھاتے ہیں اور اس میں ان کی ہتک نہیں ہوتی بلکہ ان کی شان کا اظہار ہوتا ہے۔

وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۭ وَ

اور (اس نے) گھوڑوں اور خچروں اور گدھوں کو (بھی) تمہاری سواری کے لئے اور (نیز) زینت (وشان) کے لئے

يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ⑨

(پیدا کیا ہے) اور (آئندہ بھی) وہ (تمہارے لئے سواری وغیرہ کا مزید سامان) جسے تم (ابھی) نہیں جانتے پیدا کریگا۔

حلّ لُغات۔ اَلْخَیْلُ اَلْخَیْلُ جَمَاعَۃُ الْاَفْرَاسِ۔ گھوڑے۔ خیل کا لفظ جمع ہی استعمال ہوتا ہے۔ اس کا مفرد نہیں آتا۔ (اقرب)

البِغَال اَلْبِغَالُ اَلْبَغْلُ کی جمع ہے اور اَلْبَغْلُ کے معنے ہیں حَیَوَانٌ اَھْلِیٌّ لِلرُّکُوْبِ وَالْحَمْلِ اَبُوْہُ حِمَارٌ وَاُمُّہٗ فَرَسٌ۔ خچر۔ وَیَتَوَسَّعُ فِیْہِ فَیُطْلَقُ عَلٰی کُلِّ حَیَوَانٍ اَبُوْہُ مِنْ جِنْسٍ وَاُمُّہٗ مِنْ اٰخَرَ۔ اس جانور پر بھی یہ لفظ اطلاق پاتا ہے جس کے ماں اور باپ دو مختلف جنسوں سے ہوں یعنی دوغلا۔ (اقرب)

الحَمِیْر اَلْحَمِیْرُ حِمَارٌ کی جمع ہے اس کے معنے ہیں گدھے۔ اس کے علاوہ حِمَارٌ کی جمع اَحْمِرَۃٌ وَحُمُرٌ بھی آتی ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ زِیْنَۃً۔ زینت سے یہاں مراد خالی زینت نہیں۔ کیونکہ پہلے وَلَکُمْ فِیْھَا جَمَالٌ فرما چکا ہے۔ اس سے وہ زینت مراد ہے جو لِتَرْکَبُوْھَا کے ساتھ تعلق رکھتی ہے یعنی طاقت۔ قوت۔ شوکت اور دبدبہ کا اظہار۔

گھوڑے۔ خچریں اور گدھے جنگی قوموں کو طاقت کا مظاہرہ کرنے میں مدد دیتے ہیں اور یہاں زینت سے یہی مراد ہے۔ زِیْنَۃً پر نصب اس لئے آئی ہے۔ کہ یہ خَلَقَ کا مفعول لہٗ ہے۔

انسانوں کے نفع کے لئے دو قسم کی چیزوں کی پیدائش کا ذکر فرمایا دو قسم کی چیزیں تمہارے واسطے پیدا کی ہیں۔

(۱) وہ جن سے تم کو غذا ملتی ہے تم ان کا گوشت کھاتے اور دودھ پیتے ہو۔ ان سے گرمی سردی سے بچاؤ کا سامان حاصل کرتے ہو اور وہ تمہارے لئے لوگوں میں عزت وفخر کا موجب ہوتے ہیں۔ اور پھر وہ تمہارے بوجھ اٹھا کر دوسرے شہروں تک پہنچاتے ہیں جیسے اونٹ گائے وغیرہ یہ جانور اہلی زندگی میں کام آنے والے ہیں۔

(۲) دوسری وہ چیزیں ہیں جو تمہاری جنگی اور سیاسی زندگی میں کام آتی ہیں۔ کیونکہ ان سے جنگ وغیرہ میں

کام لیا جاتا ہے۔

دونو قسم کی اشیاء کی پیدائش کی چھ غرضیں یہ تمام چیزیں چھ غرضوں کے لئے بنائی گئی ہیں۔

۱۔ موسموں کے اثرات سے حفاظت کے لئے۔

۲۔ غذا کے مہیا کرنے کے لئے۔

۳۔ عزت و فخر کے لئے۔

۴۔ بوجھ اٹھانے کے لئے۔

۵۔ سفر میں سواری کے کام آنے کے لئے۔

۶۔ طاقت اور قوت کا موجب بننے کے لئے۔

جب ان چھ دنیوی اور مادی ضرورتوں کو اللہ تعالیٰ نے پورا کیا ہے۔ تو تم کس طرح خیال کرتے ہو کہ اسی قسم کی چھ روحانی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے سامان نہ پیدا کئے ہوں گے۔

دوسرے ان آیات میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ تم دوسری مخلوق سے باوجود اس کے خالق نہ ہونے کے ہر طرح کے کام لیتے ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ جو تمہارا محتاج نہیں اور تم سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا۔ اُسے یہ حق بھی نہیں دیتے کہ تمہاری اصلاح کر کے تم کو ایسا بنائے کہ تم اس کی سبوحیّت اور قدوسیّت کی دلیل اور اس کی بڑائی کے اظہار کا ذریعہ بنو۔

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ؕ وَلَوْ شَآءَ

اور (تمہیں) سیدھی راہ (کا بتانا بھی) اللہ (تعالیٰ) ہی کے ذمہ ہے۔ اور (اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ) ان

لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۰﴾ ع

میں سے بعض (راستے) ٹیڑھے (ہوتے) ہیں اور اگر وہ اپنی (ہی) مشیت نافذ کرتا تو تم سب کو ہدایت (ہی) دیتا۔

حلّ لُغَات۔ اَلْقَصْدُ اَلْقَصْدُ قَصَدَ کا مصدر ہے اور قَصَدَہٗ (وَلَہٗ وَاِلَیْہِ) کے معنے ہیں۔ اِعْتَزَمَ عَلَیْہِ وَتَوَجَّہَ اِلَیْہِ۔ کسی چیز کا ارادہ کر لیا اور اس کی طرف گیا۔ قَصَدَ اِلَیْہِ۔ اِعْتَمَدَہٗ۔ اس پر اعتماد کیا۔ قَصَدَ فِی الْاَمْرِ۔ ضِدُّ اَفْرَطَ۔ کسی معاملہ میں میانہ روی اختیار کی۔ اَلْقَصْدُ: اِسْتِقَامَۃُ الطَّرِیْقِ۔ راستہ کا سیدھا ہونا۔

نَقِیْضُ الْاِفْرَاطِ۔میانہ روی ۔وَعَلَی اللّٰہِ قَصْدُ السَّبِیْلِ اَیْ بَیَانُ الطَّرِیْقِ الْمُسْتَقِیْمِ الْمُوْصِلِ اِلَی الْحَقِّ۔اور عَلَی اللّٰہِ قَصْدُ السَّبِیْلِ کے معنے ہیں حق تک پہنچانے والے سیدھے رستے کا بیان کرنا اللہ کے ذمہ ہے۔(اقرب)

جَائِرٌ۔جَائِرٌ جَارَ (یَجُوْرُ جَوْرًا) سے اسم فاعل ہے اور اَلْجَائِرُ کے معنے ہیں۔اَلْحَائِدُ عَنِ الْقَصْدِ راستہ کی سیدھ سے ایک طرف ہونے والا۔الزَّائِغُ عَنِ الطَّرِیْقِ۔کج رَو۔اَلظَّالِمُ۔ظالم۔(اقرب)

تفسیر ۔وَعَلَی اللّٰہِ قَصْدُ السَّبِیْلِ کے معنے ہیں۔خدا تعالیٰ پر سیدھے راستے کا بتانا واجب ہے۔یعنی حقٌّ علی اللّٰہِ بَیَانُ قَصدِ السَّبِیْلِ۔یہی مضمون دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی (اللّیل:۱۳) یعنی ہدایت کا بیان کرنا ہمارا ہی کام ہے۔اور ہم ہی پر واجب ہے۔قَصْدُ السَّبِیْلِ سے بتایا کہ سیدھا راستہ یا افراط وتفریط سے محفوظ راستہ اللہ تعالیٰ ہی بتا سکتا ہے۔ورنہ انسان جب بھی دنیا کے لئے کوئی راستہ تجویز کرتا ہے اس میں افراط وتفریط سے کام لیتا ہے۔

اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ کوئی انسان بھی ایسا نہیں (سوائے اس کے جو خدا تعالیٰ کی نگرانی میں ہو) جو جنبہ دار نہ ہو۔کسی سے اُسے عداوت ہوتی ہے کسی سے محبت۔کسی کو اپنا سمجھتا ہے اور کسی کو غیر۔اس لئے انسانی قوانین میں ہمیشہ یہ نقص ہوتا ہے کہ بعض کے حقوق تلف کئے جاتے ہیں اور بعض کو زیادہ دیا جاتا ہے۔پس وہ قانون جس میں سب کے حقوق کا خیال رکھا جائے۔نہ کسی کے حق میں کمی کی جائے۔نہ کسی کا حق لے کر دوسرے کو دیا جائے صرف اللہ تعالیٰ بنا سکتا ہے۔جو مخلوق کی مدد کا محتاج نہیں۔اور سب ہی اس کے بندے ہیں۔

یہ کیسی زبردست سچائی ہے۔ہزاروں سالوں سے انسان قانون بنا رہا ہے۔مگر کس طرح اس میں کسی کی حق تلفی کی جاتی ہے اور کسی کو حق سے زیادہ دیا جاتا ہے۔آج کل کے سیاسی اختلافات کو ہی دیکھو۔کوئی حکومت مزدوروں کے حق کو دبا رہی ہے تو کوئی انہی کو سب کچھ دے کر دوسروں کو حقوق انسانیت سے ہی محروم کر رہی ہے۔

اسی طرح انسان چونکہ جذبات کا غلام ہوتا ہے۔جو قانون بناتا ہے وہ اپنے جذبات کو نمایاں کر دیتا ہے۔ساری دنیا کے جذبات کا خیال نہ رکھتا ہے نہ رکھ سکتا ہے۔اگر رہبانیت کی طرف میلان رکھنے والا دنیا ترک کر دینے کا نام ہی نیکی رکھتا ہے تو دنیا کا حریص دنیوی ترقیات کا نام ہی نیکی رکھتا ہے۔اس نقص سے وہی تعلیم پاک ہو سکتی ہے جو انسان کے پیدا کرنے والے کی طرف سے ہو۔جو سب انسانوں کے جذبات سے واقف ہو اور سب کے جذبات کو مناسب حد تک ابھارنے کا خیال رکھے۔

روحانی کلام میں چھ باتوں کا پایا جانا اس اسلوب بیان سے ظاہر ہے کہ ہر روحانی کلام میں بھی ان چھ باتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

(۱) سردی گرمی کے اثرات سے بچاوے۔ یعنی افراط وتفریط سے محفوظ رکھے۔ محبت الٰہی کی کمی کا نام سردی ہے اور مذہب کے معاملہ میں غلو سے کام لیتے ہوئے لوگوں پر ظلم و زیادتی کرنا اور انہیں مجبور کرنا کہ وہ اس مذہب کو قبول کریں گرمی ہے۔ کلام الٰہی کا کام یہ ہے کہ ایک طرف محبت الٰہی پیدا کرے اور دوسری طرف اپنے پیروؤں کو میانہ روی سے زندگی بسر کرنے کی تلقین کرے۔

(۲) وہ غذا کا کام دے۔ یعنی وہ روحانی طاقتوں کا ضروری مجموعہ ہو۔ اس میں وہ باتیں بتائی گئی ہوں جس سے بدی کی رغبت سرد پڑتی ہو۔ اور ایسے عقائد کی تلقین کی گئی ہو جن سے اصلاح ہو کر روحانی طاقت وقوت پیدا ہو۔

(۳) وہ جمال کا موجب ہو۔ یعنی جو لوگ اس تعلیم پر عمل کریں وہ خوبصورت نظر آئیں۔ یعنی اچھے معلوم ہوں۔ دنیا ان کو دیکھ کر محسوس کرنے لگ جائے کہ اس کلام نے ان لوگوں کے اندر تبدیلی پیدا کر دی ہے۔

(۴) وہ سواری کا کام دے۔ یعنی انسان کی ذات کو عرفان الٰہی کے ذریعہ سے جلد سے جلد خدا تعالیٰ تک پہنچا دے۔ اور ایک روحانی سفر کو غیر معمولی طوالت سے بچائے۔

(۵) وہ انسان کے بوجھوں کو اٹھانے والا ہو۔ یعنی انسان کو اس کی ذمہ داریوں کا احساس کرائے اور اسے رسوم وعادات کی تکلیف دہ زنجیروں سے آزاد کر کے حریت سے کام کرنے کے قابل بنائے۔

(۶) طاقت وقوت دینے والا ہو۔ یعنی اس پر عمل کرنے سے دین اور دنیا میں عزت حاصل ہو۔ قوم کا نظام مضبوط ہو اور وہ دنیا میں باوقار زندگی بسر کرنے والی ہو۔ اور آخرت میں عزت پائے جس کلام میں یہ چھ باتیں نہ ہوں وہ کلام الٰہی کہلانے کا مستحق نہیں۔

مِنۡهَا جَآئِرٌ کا مطلب وَ مِنۡهَا جَآئِرٌ۔ لوگ کہہ سکتے تھے کہ انسان کے خدا تک پہنچنے میں الہام الٰہی کی کیا ضرورت تھی۔ انسان خود ہی پہنچ جاتا اور خود ہی راستہ تلاش کر لیتا۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ وَ مِنۡهَا جَآئِرٌ۔ خود تم بھی تسلیم کرتے ہو کہ بعض راستے غلط ہوتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ سیدھا راستہ نہ بتائے تو بہت سے انسان غلط راستوں پر چل پڑیں گے اور تباہ ہو جائیں گے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہر انسان تسلیم کرتا ہے کہ بعض طور اور طریق ناپسندیدہ ہوتے ہیں اور باوجود اس کے بعض لوگ انہیں اختیار کر لیتے ہیں مگر باوجود اس اقرار کے بعض لوگ اس کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت آئے۔

مِنْهَا کی ضمیر السَّبِیْلِ کی طرف جاتی ہے۔سبیل مذکر اور مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے

مِنْهَا کی ضمیر السَّبِیْلِ کی طرف جاتی ہے۔کیونکہ وہ مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔مذکر کی مثال قرآن کریم کی یہ آیت ہے وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا۔وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا (الاعراف:۱۴۷) اور مؤنث کی مثال یہ آیت ہے قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِیْرَةٍ(یوسف:۱۰۹) تاج العروس میں بعض ادباء کا قول ہے کہ سبیل مذکر ہی ہے۔اس کی طرف مؤنث کی ضمیر بالمعنیٰ پھرائی جاتی ہے۔ اور سبیل کے معنے مُحَجَّةٌ کے لئے جاتے ہیں۔مگر یہ امتیاز صرف علمی ہے۔اصل مضمون پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

ضمیر کو السَّبِیْلِ کی طرف راجع کرنے میں ایک نکتہ

یہاں ضمیر کو السَّبِیْلِ کی طرف راجع کر کے ایک عجیب نکتہ بیان فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ انبیاء کے ذریعہ سے قَصْدُ السَّبِیْلِ (صراط مستقیم) بتاتا ہے۔ پھر اس سیدھے راستے سے بگڑ کر ٹیڑھے راستے نکل آتے ہیں۔پس ایک الہام کے نزول کے بعد دوسرے الہام کے نزول کی ضرورت باقی رہتی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب کے نازل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔کیونکہ جب لوگ قَصْدُ السَّبِیْلِ کو کاٹ کر اس میں سے جَآىِٕرٌ راستے نکال لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے لئے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ پھر ایک اور نبی کی معرفت سیدھا راستہ لوگوں کو بتا دے۔

صرف ضمیر کے مرجع سے اس وسیع مضمون کی طرف توجہ دلا دی گئی ہے کہ سچے دین آخر بگڑ کر گمراہی کا موجب ہو جاتے ہیں اور یہ کہ جَآىِٕرٌ راستے بھی قَصْدُ السَّبِیْلِ کے بگڑنے سے پیدا ہوتے ہیں۔پس کسی مذہب کا ابتدائے نزول میں سچا ہونا اُسے ہر وقت کے لئے قابل عمل ثابت نہیں کرتا۔

وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِیْنَ۔اس میں فرمایا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہدایت کا کام اپنے ہاتھ میں نہ رکھتا تو اس کا ایک ہی منصفانہ طریق ہو سکتا تھا کہ انسانی فطرت کو ایسا بنا دیا جاتا کہ وہ غلطی کی طرف جا ہی نہ سکتی۔مگر اس نے ایسا نہیں کیا کیونکہ یہ حکمت کے خلاف تھا اور جب اس نے ایسا نہیں کیا اور انسان کو مقدرت دی ہے کہ وہ غلط راستہ بھی اختیار کر سکتا ہے یا صحیح راستہ کو غلط بنا سکتا ہے۔تو پھر اس کے سوا اور کون سا منصفانہ طریق رہ جاتا ہے کہ وہ ہدایت نازل کر کے انسان کو گمراہی سے بچنے اور روحانی ترقی کرنے کا موقعہ دیتا رہے۔

هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّ

وہ، وہ (پاک) ذات ہے جس نے بادلوں سے پانی اتارا ہے اسی میں سے تمہارے پینے کا (پانی جمع کیا جاتا) ہے

مِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ ﴿۱۱﴾

اور اسی سے وہ درخت (تیار) ہوتے ہیں جن میں تم (مویشیوں کو) چراتے ہو

حلّ لُغَات - اَلسَّمَاء اَلسَّمَاءُ کے معنے ہیں آسمان - كُلُّ مَاعَلَاكَ فَاَظَلَّكَ - ہر اوپر سے سایہ ڈالنے والی چیز - سَقْفُ كُلِّ شَیْءٍ وَ كُلِّ بَیْتٍ - چھت - رُوَاقُ الْبَیْتِ - برآمدہ - ظَهْرُ الْفَرَسِ - گھوڑے کی پیٹھ - اَلسَّحَابُ - بادل - اَلْمَطَرُ - بارش - اَلْمَطَرَةُ الْجَیِّدَةُ ایک دفعہ کی برسی ہوئی عمدہ بارش - اَلْعُشْبُ - سبزہ وگیاہ - (اقرب)

تُسِیْمُوْنَ تُسِیْمُوْنَ اَسَامَ (جس کا مجرد سَامَ ہے) سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور اَسَامَ الْاِبِلَ اِسَامَةً کے معنے ہیں - اَرْعَاهَا - اونٹوں کو چرایا - وَقِیْلَ اَخْرَجَهَا اِلَی الْمَرْعٰی - اور بعض نے اَسَامَ الْاِبِلَ کے معنے یہ کئے ہیں کہ اونٹوں کو چراگاہ کی طرف نکالا (اقرب) وَ مِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ کے معنے ہوں گے کہ اسی پانی سے وہ درخت تیار ہوتے ہیں جن میں تم مویشیوں کو چراتے ہو۔

تفسیر - **اَلسَّمَآءِ کے معنے بادل** سماء کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے۔ بادل کے بھی ہوتے ہیں اور اس جگہ جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے۔ بادل کے معنے ہی ہیں۔ فرماتا ہے وہ بادل جن سے تم کو پینے کا پانی ملتا ہے اور جن کے ذریعہ سے وہ درخت اور پودے اُگتے ہیں جن سے تمہارے گلّوں کو چارہ ملتا ہے خدا تعالیٰ نے ہی تو اتارا ہے۔

عرب میں پانی کی قلت قرآن کریم کے پہلے مخاطب عرب تھے۔ جن کے ملک میں کنویں کم ہیں۔ زیادہ حصہ ملک کا باولیوں سے پانی پیتا ہے۔ جن میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے۔ اگر وہ پانی جمع نہ کیا جائے۔ تو وہ پیاسے مر جائیں۔ مکہ مکرمہ میں بھی صرف ایک چشمہ زمزم کا ہے جس کا پانی سخت کھارا ہوتا ہے۔ اور نہر زبیدہ کے نکلنے سے پہلے وہاں پینے کا پانی باوَلیوں سے ہی مہیا ہوتا تھا۔ بلکہ اب تک بھی نہر زبیدہ کے نکلنے کے باوجود پانی کا کچھ حصہ باولیوں سے ہی مہیا کیا جاتا ہے۔ جو پیپوں میں ڈال کر لوگ فروخت کرنے کے لئے مکہ میں لاتے رہتے ہیں۔ باقی

ملک کا اکثر حصہ بھی ایسے ہی پانیوں پر گذارہ کرتا ہے۔اور چونکہ عرب کا اکثر حصہ اونٹوں اور بکریوں بھیڑوں کے گلّوں پر گذارہ کرتا ہے ان کا چارہ یعنی درخت بھی اسی پانی سے پلتے ہیں۔

ظاہری سہولتوں کے پیدا کرنے سے روحانی سہولتوں کی طرف اشارہ اس آیت میں بھی اسی پہلے مضمون کی طرف اشارہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے کاموں کی سہولت کے لئے قانون قدرت میں ہزاروں اشیاء پیدا کی ہیں جن سے تم فائدہ اٹھاتے ہو۔ پھر کیوں نہیں سمجھتے کہ تمہاری روحانی آسائش کا سامان بھی وہ ضرور کرے گا۔اور جب کہ دنیوی سامانوں کو تم شوق سے قبول کرتے ہو۔کیوں اس کے بنائے ہوئے روحانی سامانوں کو قبول نہیں کرتے۔اور جب کہ تم یہ مانتے ہو کہ خدا تعالیٰ کا تمہاری جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنا اس کی شان کے خلاف نہیں۔تو یہ کیوں سمجھتے ہو کہ خدا تعالیٰ کا روحانی سامان پیدا کرنا اس کی شان کے خلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ کو خالق ماننے والے کا حق نہیں کہ وہ نبیوں کا انکار کرے حق یہ ہے کہ جو خدا تعالیٰ کے وجود کا ہی انکار کرتا ہو اور مادی سامانوں کو آپ ہی آپ سمجھتا ہو۔وہ تو یہ کہہ بھی سکتا ہے کہ نہ کوئی خدا ہے نہ وہ کوئی سامان پیدا کرتا ہے۔لیکن جو خدا تعالیٰ کے وجود کو مانتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ خدا تعالیٰ نے اس دنیا کے سامانوں کو پیدا کیا ہے اسے تو اس بات کے کہنے کا ہرگز کوئی حق نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو کیا پڑی ہے یا اسے کیا حق ہے کہ انسانوں کی ہدایت کے لئے نبی بھیجے اور کتابیں اتارے۔ کیونکہ اس کا ایک عقیدہ دوسرے عقیدہ کو ردّ کرتا ہے۔اور اسے اپنی غلطی معلوم کرنے کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔

قانون قدرت سے پیدا شدہ سب سامان انسان ہی کے کام آتے ہیں اس آیت میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ قانون قدرت جس قدر سامان پیدا کرتا ہے وہ حقیقتاً انسان ہی کے کام آتے ہیں۔ پانی بھی اترتا ہے تو اس کے لئے۔ کیونکہ جانور اور درخت اگر اس سے پلتے ہیں تو ان کو بھی تو انسان ہی استعمال کرتا ہے۔پس آخری نقطہ کائنات کا انسان ہی ہے۔اور اس کی روحانی ترقی کے سامان پیدا کرنا خدا تعالیٰ کی شان کے خلاف نہیں۔ بلکہ پیدا نہ کرنا اس کی شان کے خلاف ہے کہ ایک ایسی مخلوق پیدا کی جس کے فائدہ کے لئے ایک حیرت انگیز وسیع نظام بنایا۔لیکن اس کی پیدائش کا کوئی اعلیٰ مقصد نہ قرار دیا۔

پہلی آیات میں حیوانات کی پیدائش کا ذکر تھا اور حیوانی غذا کا۔اس آیت میں پانی کا ذکر کیا اور نباتی غذا کا۔ اسی مضمون کو اگلی آیت میں اور وسیع کیا گیا ہے۔

يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ

وہ اس کے ذریعہ سے تمہارے لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور کے درخت اور انگور اور (دوسرے) ہر قسم کے پھل

وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ⑫

(بھی) پیدا کرتا ہے۔ان لوگوں کے لئے جو فکر سے کام لیتے ہیں اس میں یقیناً ایک نشان (پایا جاتا) ہے۔

تفسیر ۔پہلی آیت میں پانی کا ذکر کیا گیا تھا جسے انسان پیتے ہیں۔اور ایسے درختوں کی پیدائش کا ذکر کیا تھا جن سے جانور پلتے ہیں۔اور پھر ان جانوروں سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔اب ایسی نباتی غذاؤں کا ذکر فرماتا ہے جن کو براہ راست انسان استعمال کرتا ہے۔اور فرماتا ہے اس پانی سے کچھ اور نباتات بھی اُگتی ہیں جن کو انسان براہ راست استعمال کرتا ہے۔ان میں سے کچھ تو کھیتیاں ہیں جن سے انسانی غذا کے لئے غلّہ پیدا ہوتا ہے۔کچھ درخت ہیں جن سے انسان کے کھانے کے لئے پھل اترتا ہے۔جیسے زیتون اور کھجور اور انگور اور ان کے علاوہ اور بھی کئی اقسام کے میوے اور پھل۔پھر کیا تم اس امر پر غور نہیں کرتے کہ جس طرح انسان کے سوا دوسرے حیوانات انسان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔اسی طرح نباتات بھی اس کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

جس طرح زمین اگانے کے لئے پانی کی محتاج ہے اسی طرح عقل جوہر دکھانے کے لئے پانی کی محتاج ہے اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ زمین میں اُگانے کی خواہ کس قدر بھی طاقت ہو وہ آسمانی پانی کے بغیر کچھ نہیں اُگا سکتی۔اسی طرح انسانی فطرت کا حال ہے کہ انسانی ذہن اور انسانی عقل خواہ کس قدر اعلیٰ ہو وہ اپنے جوہر دکھانے کے لئے آسمانی پانی کی محتاج ہے۔اور اس پانی کے بغیر انسانی عقل کی تکمیل نہیں ہوتی۔پس صرف اپنی عقل پر اپنی روحانی ترقیات کا انحصار رکھنے والا ایسا ہی ہے جیسے کہ وہ شخص جو بغیر پانی کے کھیتی اُگانے کی کوشش کرے۔بے شک کھیتی بعض دفعہ اُگ تو آئے گی مگر وہ اپنی پوری شان ظاہر نہیں کرے گی۔

الہام کے بغیر فطرت کو نشوونما نہیں ہوتا بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ نبی کون سی نئی چیز دنیا میں لاتے ہیں۔سب باتیں جو وہ کہتے ہیں پہلے سے ہی انسانی فطرت میں موجود ہیں۔ان کا بھی اس آیت میں جواب دیا گیا ہے اور پانی کی مثال سے بتایا ہے کہ کسی چیز کا موجود ہونا اور بات ہے اور اس کا نشوونما پانا اور بات ہے۔گو سب کچھ جو نبی بتاتے ہیں فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔لیکن الہام کے بغیر فطرت کو نشوونما نہیں حاصل ہوتا۔جس طرح پانی

کے بغیر زمینی طاقتیں اُبھرتی نہیں۔کوئی نہیں کہتا کہ جب بیج اور نشوونما کی طاقت زمین میں موجود ہے تو پانی کی کیا ضرورت ہے۔پانی نہ بیج لاتا ہے اور نہ زمین میں نشوونما کی طاقت پیدا کرتا ہے۔مگر ہر اک جانتا ہے کہ پانی بیج اور نشوونما کی طاقت لاتا تو نہیں۔پر وہ نشوونما کی طاقت کو اُبھارتا ضرور ہے۔اور اس کے بغیر وہ طاقت بالفعل اپنا اظہار یا کرتی ہی نہیں یا بہت کم کرتی ہے۔یہی حال الہام کا ہے کہ وہ نئی فطرت نہیں بناتا۔لیکن فطرت کی خوابیدہ طاقتوں کو اُبھارتا ہے۔

نباتات کا ذکر ان کے فوائد کے لحاظ سے کیا گیا ہے جس طرح حیوانی فوائد کے بیان میں ترتیب کو مدنظر رکھا گیا تھا کہ پہلے حیوانی غذا کا ذکر کیا تھا جو انسان کے لئے نہایت ضروری ہے اور پھر حیوانات کے دوسرے فوائد بیان کئے تھے۔جو گو ویسے ضروری نہیں لیکن انسانی شان کے بڑھانے والے ہیں۔نباتات کے ذکر میں بھی پہلے کھیتی کا ذکر کیا ہے جو عام انسانی غذا پیدا کرتی ہے۔پھر زیتون کا جو روٹی کے ساتھ سالن کا کام دیتا ہے اور پھر کھجور کا جو غذا بھی ہے اور میوہ بھی۔اور پھر انگور اور دوسرے پھلوں کا جو ضروری غذا تو نہیں۔لیکن انسانی صحت اور دماغی طاقتوں کے بڑھانے کا موجب ہوتے ہیں۔

غذا کے حیوانی ہونے کے متعلق ایک اعتراض اور اس کا جواب شاید کوئی اعتراض کرے کہ انسان کی مقدم غذا حیوانی نہیں کیونکہ ایک خاصہ طبقہ دنیا کا صرف نباتی غذا استعمال کرتا ہے مگر یہ اعتراض قلّتِ تدبر کا نتیجہ ہوگا۔کیونکہ جو حیوانی غذا استعمال نہ کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ بے شک گوشت تو نہیں کھاتے۔مگر ان کی اہم غذا بھی حیوانی ہوتی ہے۔ماں کا دودھ پیئے بغیر کتنے بچے پلتے ہیں۔پھر کیا ماں کا دودھ حیوانی غذا نہیں؟ اور جو ماں کا دودھ نہیں پیتے وہ جانوروں کا دودھ پیتے ہیں اور وہ بھی حیوانی غذا ہے۔اور جو لوگ حیوانی غذا کے استعمال سے بظاہر انکار کرتے ہیں وہ بڑی عمر میں بھی گھی دودھ استعمال کرتے ہیں جو حیوانی غذائیں ہیں۔پس ایسا آدمی کوئی بھی نہیں جس کی اہم ترین غذا حیوانی نہ ہو اور جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ حیوانی غذا استعمال نہیں کرتے۔وہ یا تو خود فریب میں مبتلا ہوتے ہیں یا جان بوجھ کر دوسروں کو فریب دیتے ہیں۔وہ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم گوشت نہیں کھاتے مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کوئی حیوانی غذا بھی استعمال نہیں کرتے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ غذاؤں کے ذکر کے آخر میں فرمایا کہ اس میں فکر کرنے والوں اور سوچنے والوں کے لئے نشان ہے۔اس سے ایک تو اس طرف اشارہ کیا کہ انسانی دماغ غذا سے نشوونما پاتا ہے۔اسی طرح روحانیات سے تعلق رکھنے والا دماغ روحانی غذاؤں سے نشوونما پاتا ہے۔دوسرے اس طرف اشارہ کیا کہ فطرۃ کے

اندر افکار تو موجود ہوتے ہیں۔ مگر ان کے ابھارنے کے لئے عمدہ غذا کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح روحانی افکار بھی انسان کے اندر موجود تو ہوتے ہیں مگر ان کے ابھارنے کے لئے بھی روحانی غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ سب انسان ایک ہی قسم کے ہیں۔ مگر ایک اعلیٰ درجہ کی قوت فکر یہ رکھتا ہے دوسرا نہیں۔ اور اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ایک کو مناسب غذا ملتی ہے دوسرے کو نہیں۔ یہی حال روحانی عالم کا ہے۔ سب ہی انسانوں کے اندر اللہ تعالیٰ کی محبت کا جذبہ ہے لیکن ایک آدمی جو روحانی غذائیں کھاتا ہے۔ اس کی قوت فکر یہ کو جلا اور روشنی مل جاتی ہے دوسرے کو نہیں۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ۙ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ

اور اس نے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو تمہارے لئے بے اُجرت خدمت پر لگا رکھا ہے

وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

اور (دوسرے) تمام (سیارے اور) ستارے (بھی) اس کے حکم سے بلا اجرت (تمہاری) خدمت پر متعین ہیں

يَّعْقِلُوْنَ ۙ﴿۱۳﴾

جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لئے اس میں یقیناً کئی نشان (پائے جاتے) ہیں۔

حلّ لُغَات۔ سَخَّرَ سَخَّرَ کے لئے دیکھو سورۃ رعد آیت نمبر ۳۔

سَخَّرَهٗ۔ كَلَّفَهٗ عَمَلًا بِلَا اُجْرَةٍ. سَخَّرَهٗ کے معنے ہیں کہ اس کو بغیر اجرت یا بدلہ کے کسی کام پر لگا دیا۔ ذَلَّلَهٗ اس کو مطیع کر دیا۔ وَ كُلُّ مَقْهُوْرٍ لَا يَمْلِكُ لِنَفْسِهٖ مَا يُخَلِّصُهٗ مِنَ الْقَهْرِ فَذٰلِكَ مُسَخَّرٌ۔ اور ہر وہ شخص جو کسی کے قبضہ میں ہو اور آزاد رہنے کی طاقت نہ رکھتا ہو اسے مسخر کہتے ہیں۔ (اقرب)

يَعْقِلُوْنَ۔ يَعْقِلُوْنَ عَقَلَ (يَعْقِلُ عَقْلًا) سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور عَقَلَ الْغُلَامُ کے معنے ہیں۔ اَدْرَكَ۔ لڑکا بالغ ہو گیا۔ عَقَلَ الشَّيْءَ عَقْلًا کے معنے ہیں۔ فَهِمَهٗ وَ تَدَبَّرَهٗ کسی چیز کو سمجھا اور اس پر غور کیا۔ عَقَلَ الْبَعِيْرَ: ثَنٰى وَظِيْفَهٗ مَعَ ذِرَاعِهٖ فَشَدَّهُمَا مَعًا بِحَبْلٍ۔ اونٹ کی پنڈلی کو اس کی ران کے ساتھ ملا کر باندھ دیا۔ اور عِقَالٌ اس رسی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ اونٹ کی پنڈلی باندھی جاتی ہے۔ (اقرب) پس اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ کے معنے ہوں گے کہ جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں یعنی بات کو سمجھتے اور اس پر تدبر

کرتے ہیں۔ان کے لئے اس میں کئی نشان پائے جاتے ہیں۔

تفسیر۔ جمادات سے تعلق رکھنے والی نعمتوں کا ذکر اب ایک اور قسم کی نعمتوں کا ذکر کیا جو جمادات سے تعلق رکھتی ہیں۔اوران میں سے بھی انہی کا انتخاب کیا ہے جوانسانی دماغ کےنشوونما پر خاص طور پر اثر انداز ہوتی ہیں۔بے شک انسان لوہے۔لکڑی۔سونے۔چاندی۔پیتل سے بھی فائدہ اٹھاتا ہےلیکن ان اشیاء سے وہ بڑا فائدہ بیرونی آرام کی قسم کا حاصل کرتا ہے۔برتن بناتا ہے۔مکان بناتا ہے۔آلات بناتا ہے۔براہ راست ان اشیاء کا اثر انسانی دماغ پر نہیں پڑتا۔لیکن چونکہ اس جگہ انسانی دماغ کےنشوونما کے ذکر پر زور دینا مقصود ہے۔اس لئے جمادات کی مذکورہ بالا اقسام کی بجائے رات اور دن، سورج، چانداور ستاروں کا ذکر کیا گیا۔

رات اور دن درحقیقت جمادی اثرات میں ہی شامل ہونے کے مستحق ہیں کہا جاسکتا ہے کہ رات اور دن تو جمادات میں سے نہیں۔اور یہ درست بھی ہے۔لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ رات اور دن کے فوائد سورج اور چانداور ستاروں کے اثرات سے وابستہ ہیں۔اور وہ اجرام فلکی ان کے ذریعہ سے اپنی تاثیرات ظاہر کرتے ہیں۔یعنی اپنی شعاعوں کو نازل کر کے یاان کو روک کر۔اس لئے رات اور دن بھی درحقیقت جمادی اثرات میں ہی شامل ہونے کے مستحق ہیں۔

رات اور دن کے علاوہ سورج چاند وغیرہ کے نام کی ضرورت اگر کہا جائے کہ رات اور دن جب سورج اور چانداور ستاروں کے ظہور اور فوائد پر دلالت کرتے ہیں۔تو پھر سورج چاند وغیرہ کا الگ نام لینے کی کیا ضرورت تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ گو رات اور دن ان اجرام فلکی کی تاثیرات کے ظہور کا نام ہیں۔لیکن ان کے علاوہ بھی سورج اور چانداور ستاروں کے اثرات ہیں اوران سے ایسی تاثیرات بھی دنیا پر پڑتی ہیں جو آنکھوں سے نظر آنے والی شعاعوں کے علاوہ دوسرے ذرائع سے انسان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔جیسے برقی یا مقناطیسی اثرات۔اوران کے سوااور کئی قسم کی تاثیرات ہیں۔جو سائنس روز بروز دریافت کر رہی ہے۔اور کئی وہ شائد کبھی بھی دریافت نہ کر سکے۔(The Heavens vol:1 page: 82) پس باوجود اس کے کہ رات اور دن اجرام فلکی کے تاثیرات کے ظہور کا ذریعہ ہیں۔ان کے علاوہ بھی سورج اور چاند ستاروں کا نام لینے کی ضرورت تھی۔تا ان دوسری تاثیرات کا ذکر کیا جائے جن سے انسانی دماغ فائدہ اٹھا رہا ہے۔

اس جگہ یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اگر یہ بات ہے۔تو پھر رات اور دن کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔سورج چاند اور ستاروں کا ذکر کافی تھا۔اس کا جواب یہ ہے کہ سورج چانداور ستاروں کی دوسری تاثیرات سے تو عرب کے لوگ

ابھی واقف نہ تھے۔ صرف رات اور دن کی تاثیرات سے ان کو آگاہی تھی۔ اور اب بھی علمی طبقہ کے علاوہ باقی لوگ رات اور دن کی تاثیرات اور ان کے فوائد سے تو آگاہ ہیں۔ لیکن سورج چاند اور ستاروں کی دوسری تاثیرات سے واقف نہیں ہیں۔ پس فائدہ کو وسیع کرنے کے لئے اور قرآن کریم کے پہلے مخاطبوں کے ذہنوں سے مضمون کو قریب الفہم بنانے کے لئے ضروری تھا کہ دن اور رات کو الگ بھی بیان کر دیا جاتا تاکہ ان کا دماغ بسہولت آیت کے مضمون کی طرف منتقل ہو سکتا۔

شعاعوں کی تاثیر کے متعلق سائنس کی تحقیقات یاد رہے کہ سائنس کی موجودہ تحقیق نے سپکٹرم کے ذریعہ سے جو ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعہ سے روشنی کی شعاعوں کو پھاڑ کر الگ الگ کر لیا جاتا ہے (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Spectroscopy)۔ یہ معلومات حاصل کی ہیں کہ فلاں ستارے میں فلاں قسم کی دھاتیں ہیں اور فلاں میں فلاں قسم کی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف روشنی ہی نہیں بلکہ روشنی کے ساتھ مختلف دھاتوں کی تاثیرات بھی دنیا پر اُترتی رہتی ہیں اور ان سے اہل دنیا کے دماغ اور قویٰ پر مختلف اثرات نازل ہوتے رہتے ہیں۔

چاند کی شعاعوں کی تاثیر چاند کی شعاعوں کی تاثیرات تو کئی رنگ میں دنیا پر ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔

چاند گرہن کا اثر عام طور پر ہمارے ملک میں مشہور ہے کہ چاند گرہن جب مکمل ہو تو حاملہ عورتوں پر اس کا برا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ ایسے وقت میں حاملہ عورتیں کمروں سے باہر نہیں نکلتیں۔ گو عام طور پر اسے وہم سمجھا جاتا ہے مگر میں نے اس سوال پر خاص طور پر غور کیا ہے اور معلوم کیا ہے کہ جب چاند گرہن مکمل ہو تو اس کے بعد بہت سی عورتوں کی زچگی سخت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اور ان میں بکثرت موتیں ہوتی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ تکلیف اٹھانے والی عورتیں وہ ہوتی ہیں جو ایسے وقت میں چاند کو دیکھتی ہیں۔ یا اس کے بغیر بھی ان پر یہ تاثیر عمل کرتی ہے۔ مگر بہرحال میں نے کئی دفعہ اس کا تجربہ کیا ہے اور دوسروں کو بھی بتایا ہے۔ جنہوں نے اپنے تجربہ سے اس کی تصدیق کی ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تاثیر ہمیشہ ہوتی ہے یا اس کا ظہور بعض اور ستاروں کی نسبت سے ہوتا ہے۔ یعنی چاند دوسرے ستاروں سے ایک خاص زاویہ پر ہو تو اس وقت اس کی یہ تاثیر ظاہر ہوتی ہے یا آزادانہ ہوتی ہے۔ یہ منجم ہی بتا سکتے ہیں۔ میں نے تو بعض توہمات کی تحقیق کرتے ہوئے جو چاند گرہن کی حاملہ عورتوں پر تاثیر کے متعلق ہمارے ملک میں پائے جاتے ہیں یہ امور مشاہدہ کئے ہیں۔ ان کو معیّن اور علمی صورت دینا ستاروں کے علماء کا کام ہے۔

جمادات کی روشنیاں، شعاعیں، مقناطیسی تاثیرات انسانی نشوونما پر خاص اثر ڈالتی ہیں خلاصہ یہ کہ جمادات کی روشنیاں اور شعاعیں اور مقناطیسی تاثیرات بھی انسانی نشوونما پر خاص اثر ڈالتی ہیں جن میں سے

بعض ظاہر ہوتے ہیں بعض مخفی۔اور بعض بلا واسطہ ہوتے ہیں اور بعض بالواسطہ۔بالواسطہ سے میری مراد اُن تاثیرات سے ہے جو نباتات یا حیوانات پر وارد ہوتی ہیں۔اور پھر ان حیوانات اور نباتات کو انسان استعمال کرتا ہے۔

سورج اور چاند کی روشنی کی تاثیر سورج اور چاند کی موٹی تاثیرات سے مراد وہ تاثیرات ہیں جو صحت پر پڑتی ہیں۔دن کی روشنی کئی قسم کی بیماریوں کو دور کرتی ہے اور انسانی جسم میں صحت کا مادہ بڑھاتی ہے۔چنانچہ جو لوگ دن رات بند کمروں میں رہتے ہیں ان کی صحت خراب ہو جاتی ہے۔

(The Vitamins by H.C Sherman and S.L Smith 2nd edition 1931 .pg.296,298)

اسی طرح رات کی تاریکی اعصاب پر تسکین دہ اثر ڈالتی ہے۔اسی وجہ سے رات کی نیند بہت آرام دہ ہوتی ہے بہ نسبت دن کی نیند کے۔خصوصاً دوپہر کی نیند کے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ آرام کم ملتا ہے بلکہ بعض دفعہ اس سے نزلہ وغیرہ کی قسم کی بیماریاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔غرض دن کام کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہے اور رات آرام کے لحاظ سے پھر بعض قسم کی سبزیوں پر دن کی روشنی کی مبارک تاثیر پڑتی ہے اور بعض پر رات کی روشنی کی جو چاند اور ستاروں سے آتی ہے۔چنانچہ ککڑی رات کو اس سرعت سے بڑھتی ہے کہ دیکھ کر حیرت آتی ہے۔بعض دفعہ کھیت کے پاس بیٹھو تو یوں آواز پیدا ہوتی ہے گویا کہ ککڑی پتوں میں پھیل رہی ہے۔اسی طرح بعض پھول چاندنی راتوں میں کھلتے ہیں بعض اندھیری راتوں میں۔اور یہ سب امور اس امر کی شہادت ہیں کہ رات اور دن اور اجرام فلکی کی تاثیرات اہل دنیا کے نشوونما پر خاص اثر ڈال رہے ہیں۔اور ان کا وجود صرف آنکھوں کے لئے روشنی مہیا کرنا نہیں۔ یا اعصاب کے آرام کے لئے تاریکی دینا ہی نہیں۔بلکہ ان کے علاوہ بھی ان کی وسیع تاثیرات ہیں۔جن لوگوں کو چاند کی روشنی میں سیر کرنے کا موقع ملا ہے۔انہوں نے اس کا مشاہدہ کیا ہوگا کہ اس وقت خیالات میں ایک عجیب قسم کا ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اور قوتِ فکریہ میں ایک تلاطم پیدا ہو جاتا ہے۔اسی طرح رات اور دن اور سورج اور چاند اور ستاروں کا تعلق راستہ دکھانے سے بھی ہے۔دن کو سورج کی روشنی اگر سب فضا کو روشن کر کے راستہ دکھانے میں مدد ہوتی ہے اور جہات اربعہ یعنی مشرق مغرب شمال جنوب کو بتا کر راگیروں کی راہنمائی کرتی ہے۔تو رات کو چاند اپنی روشنی سے سورج کا سا کام کرتا ہے اور ستارے اپنے مقامات سے ہدایت کا موجب ہوتے ہیں۔چنانچہ سمندروں میں جہازوں کے چلنے میں ستاروں کے مقامات خاص طور پر مدد کرتے ہیں۔

حیوانی اور نباتاتی غذا کے بعد مخفی غذا کی طرف اشارہ خلاصہ یہ کہ رات اور دن اور سورج چاند اور ستارے انسانی دماغ کو نشوونما دینے میں اور اس کے کاموں میں سہولت پیدا کرنے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

اور یہ جمادات میں سے ہیں جو انسان سے بہت دور کا تعلق رکھتے ہیں۔اوران کی ذاتی نشوونما کی طاقت ایسی مخفی ہے کہ اس کا اندازہ ظاہری نگاہ سے نہیں کیا جا سکتا۔لیکن باوجود اس کے وہ اپنی تاثیرات سے نباتات اور حیوانات کے نشوونما پر ان کے ذریعہ سے بھی اور براہ راست بھی انسان کے نشوونما پر خاص اثر ڈالتے ہیں۔پس حیوانی غذا اور نباتی غذا کے بعد اس مخفی غذا کی طرف اشارہ کیا جو انسان جمادات سے اور خصوصاً ان بڑے جمادی اجرام سے جو آسمان پر ہیں حاصل کر رہا ہے۔

حیوانوں اور نباتات کے متعلق پیدا کرنے کے الفاظ اور سورج اور چاند کے لئے سَخَّرَ کا لفظ استعمال کرنے کی وجہ

اس جگہ ایک اور لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حیوانوں اور نباتات کے بارہ میں توصرف یہ فرمایا تھا کہ ہم نے ان کو تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔لیکن رات اوردن اور سورج، چاند، ستاروں کے ذکر میں سَخَّرَ کا لفظ فرمایا ہے۔جس کے معنے ہیں بغیر اجرت کے کام پر لگا رکھا ہے۔یہ فرق اس لئے کیا کہ حیوانوں اور نباتات سے انسان جو فائدہ اٹھاتا ہے۔اس کے متعلق وہ سمجھتا ہے کہ میں نے اپنے زور سے یہ فائدہ اٹھایا ہے گو یہ ہے غلط۔کیونکہ خدا تعالیٰ ان کو پیدا نہ کرتا تو وہ فائدہ کہاں سے اٹھاتا۔مگر پھر بھی چونکہ بظاہر اس میں انسانی اختیار کا دخل ہے۔وہاں صرف پیدائش کی طرف اشارہ کیا ہے۔مگر اس آیت میں جو فوائد بیان ہوئے ہیں۔ان کے حصول میں انسانی تصرف کا کوئی دخل نہیں۔اس لئے اس جگہ سَخَّرَ کا لفظ استعمال کر کے بتایا کہ کم سے کم ان اشیاء کی نسبت تو تم کو ماننا پڑے گا کہ وہ جو انسانی خدمت کر رہی ہیں ان کا موجب حکم الٰہی ہے۔کیونکہ ان پر تم کو کوئی تصرف حاصل نہیں ہے۔

اس آیت کے آخر میں یہ فرمایا کہ یہ امور عقل مندوں کے لئے نشان ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ قوت فکر یہ نزدیک کی اشیاء کا حال معلوم کرتی ہے اور قوت عقل دور کی چیزوں سے بھی تعلق رکھتی ہے۔چونکہ پہلی آیات کی اشیاء خوراک سے تعلق رکھتی تھیں اور انسان ان کے اثر کو اپنے اندر محسوس کرتا ہے اس لئے وہاں فکر کا لفظ رکھا ہے۔اوران چیزوں کی تاثیر بیرونی ہے اوران سے فائدہ اٹھانا دانش سے تعلق رکھتا ہے اس لئے لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ فرمایا۔

وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

اور جو کچھ اس نے تمہارے لئے زمین میں پیدا کیا ہے جس کی مختلف قسمیں ہیں (وہ بھی تمہارے کام آ رہا ہے) اس

لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝۱۴

میں (بھی) ان لوگوں کے لئے جو نصیحت حاصل کرتے ہیں یقیناً ایک نشان (پایا جاتا) ہے۔

حلّ لُغَات ۔ذَرَاَ ذَرَأَ اللّٰهُ الْخَلْقَ کے معنے ہیں خَلَقَهُمْ ۔اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا ۔ذَرَأَ الشَّيْءَ ۔ كَثَّرَهٗ۔ کسی چیز کو زیادہ کیا۔ ذَرَأَ الْاَرْضَ: بَذَرَهَا، زمین میں بیج بویا۔ (اقرب)

اَلْوَانٌ اَلْوَانٌ لَوْنٌ کی جمع ہے ۔اور اَللَّوْنُ کے معنے ہیں مَافَصَلَ بَيْنَ الشَّيْءِ وَبَيْنَ غَيْرِهٖ ۔یعنی لون اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے ایک چیز دوسری چیز سے ممتاز نظر آتی ہے ۔اَللَّوْنُ: النَّوْعُ ۔قسم ۔اَللَّوْنُ: صِفَةُ الْجِسْمِ وَهَيْئَتُهٗ مِنَ الْبَيَاضِ وَالسَّوَادِ وَالْحُمْرَةِ ۔کسی جسم کا سیاہ، سفید سرخ رنگ ۔(اقرب)

تفسیر ۔**ذَرَاَ کے لفظ سے سب اشیاء کی پیدائش کا ذکر** ذَرَاَ کے معنے پیدا کرنے کے ہیں ۔ پس اس جگہ ان سب اشیاء کا ذکر ہے جو دنیا میں موجود ہیں ۔خواہ حیوانات کی قسم کی ہوں ، خواہ نباتات کی قسم کی خواہ جمادات کی قسم کی ۔

رنگوں کے اختلاف اور تاثیر کا ذکر ان کی علمی دریافت سے پہلے اس آیت سے ایک نئے مضمون کو شروع کیا اور رنگوں کے اختلاف کو پیش کیا کہ وہ بھی تاثیرات رکھتے ہیں اور انسان ان سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے ۔ قرآن کریم کیسا عظیم الشان کلام ہے جو ان حکیمانہ امور کو اس زمانہ میں بیان فرماتا ہے جبکہ دنیا ان سے کلی طور پر ناواقف تھی ۔رنگوں کی تاثیرات کی دریافت علمی طور پر موجودہ زمانہ میں ہوئی ہے ۔حتیٰ کہ بنفشی شعاعوں اور ماوراء بنفشی شعاعوں اور کئی قسم کی دوسری شعاعوں کی دریافت سے بیماریوں کے علاج میں غیر معمولی مدد ملی ہے ۔اور طب میں بھی ایک نیا باب علاج باللّون کا کھل گیا ہے ۔یعنی مختلف رنگوں کی بوتلوں میں پانی رکھ کر اور سورج کی شعاعوں کے مقابل پر رکھ کر خالی پانی کو دوا کی صورت میں بدل دیا جاتا ہے ۔گو یہ طریق علاج اب تک علمی حد تک نہیں پہنچا۔ مگر اس کے بعض فوائد ناقابل انکار ہیں ۔

ایک ہی قسم کی اشیاء کا رنگوں کے اختلاف کی وجہ سے مختلف تاثیرات کا ظاہر کرنا ان کے علاوہ یہ

امر تجربہ شدہ ہے کہ ایک ہی قسم کی اشیاء رنگ کے اختلاف کی وجہ سے مختلف تاثیرات ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً توت ہے۔ اس میں سے سفید گلے میں خراش پیدا کرتا ہے اور سیاہ توت خناق جیسی مرض میں مفید ہوتا ہے۔ صندل سفید اور سرخ تاثیرات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بعض امور میں قوی یا ضعیف ہوتے ہیں (خزائن الادویہ مصنفہ حکیم محمد نجم الغنی رامپوری مطبوعہ خادم التعلیم برقی پریس پیسہ اخبار لاہور ۱۹۲۶ء جلد ۵ ص ۹۲)۔ یہی حال اَور سینکڑوں اشیاء کا ہے کہ چیز ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن رنگ کے تغیر سے اس کے فوائد میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ بہت سی چیزوں کے فوائد معلوم ہو گئے ہیں اور بہت سی کے ابھی مخفی ہیں۔ مگر اس حد تک اس علم کا انکشاف ہو چکا ہے کہ رنگوں کی تاثیرات کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

طب میں مختلف رنگوں سے بیماریوں کا علاج موجودہ طب میں تو مختلف رنگوں سے بعض شدید بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ اگر زرد رنگ کی اکری فلیوین بیرونی زخموں کے لئے مفید ہے تو مرکیورو کروم اندرونی زخموں کے لئے مفید ہے۔ اسی طرح اور کئی رنگ ہیں۔ میں نے ایک دفعہ اکری فلیوین کو دیکھ کر خیال کیا کہ معلوم ہوتا ہے زرد رنگ کی تاثیر زخموں کے لئے اچھی ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے پرانے زمانہ میں زخموں کے علاج کے لئے ہلدی کو بکثرت استعمال کیا جاتا تھا۔ اس خیال سے میں نے ہلدی کا رنگ نکال کر زخموں کے لئے ایک ڈاکٹر کو دیا۔ انہوں نے تجربہ کر کے بتایا کہ گو اکری فلیوین جیسی تاثیر تو نہیں۔ مگر اس کے ساتھ ملتی ہوئی تاثیر آپ کی دوا میں ضرور تھی۔ اس فرق کی وجہ میں نے یہ سمجھی کہ اس حد تک میں اس کا جوہر نہیں نکال سکا جس حد تک کہ جرمنوں نے نکال لیا ہے ورنہ بات وہی ہے۔ غرض رنگوں کی تاثیرات ایک ثابت شدہ حقیقت ہیں۔ گو اب تک یہ علم مکمل نہیں ہوا۔ قرآن کریم اس کی طرف اشارہ فرماتا ہے اور توجہ دلاتا ہے کہ اجرام تو الگ رہے ان کے رنگ تک تمہارے فائدہ میں لگے ہوئے ہیں۔ اور کیسی کیسی باریک راہوں سے اللہ تعالیٰ نے تمہاری جسمانی ترقی کے سامان پیدا کئے ہیں۔ مگر تم اب بھی نہیں سمجھتے کہ روحانی ترقی کے لئے بھی ویسے ہی وسیع بلکہ ان سے بھی زیادہ وسیع سامان پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

رنگوں کے ذریعہ سے ایک ہی جنس کی دو چیزوں میں امتیاز علاوہ ازیں اس رنگوں کے تغیر سے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ ایک ہی چیز کے کئی رنگ ہوتے ہیں۔ اور اگر ایک طرح اسے اپنی قسم کی دوسری چیزوں سے اتحاد ہوتا ہے تو دوسری طرح ان سے وہ مختلف بھی ہوتی ہے سب انسان انسان ہیں مگر کوئی دو آدمی ظاہری شکل یا باطنی قوتوں میں یکساں نہیں ملتے۔ سب اونٹ اونٹ ہیں مگر پھر ہر اونٹ کی شکل اور عقل دوسرے اونٹ سے مختلف ہوتی

ہے۔ گویا ایک طرف شدید اتحاد ہے تو دوسری طرف شدید اختلاف۔ یہی حال نباتات کا ہے سب آموں کے درخت آموں کے ہی درخت ہیں مگر ہر درخت دوسرے سے الگ پہچانا جاتا ہے اور ایسا ہی حال ان کے پھلوں کا ہے۔غرض دنیا میں ہر جنس کے افراد دوسرے افراد سے مشابہت رکھتے ہیں مگر پھر ان سے مختلف بھی ہوتے ہیں اگر رنگوں کا یہ فرق نہ ہوتا تو ایک کو دوسرے سے پہچاننا ناممکن ہوجاتا۔اب تو ہر ماں باپ اپنے بچے کو ہر بیٹا اپنے ماں باپ کو ہر خاوند بیوی کو بیوی خاوند کو بھائی بھائی کو پہچانتا ہے۔اگر امتیازی نشان نہ ہوتے تو پہچاننا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے کس قدر وسیع فرق ہر شے میں رکھا ہے۔سفید رنگ ہے تو اس کے اس قدر مدارج ہیں کہ انسان ان کے نام نہیں رکھ سکتا۔سیاہ رنگ ہے تو اس کے اس قدر مدارج ہیں کہ ان کی گنتی نہیں کی جاسکتی۔صرف آنکھ اس فرق کو پہچانتی ہے اور اس فرق کی وجہ سے فوراً دو چیزوں میں امتیاز کر لیتی ہے۔مگر زبان اس فرق کو اکثر نہیں بتا سکتی۔

اللہ تعالیٰ اسی امتیاز کے روحانی پہلو کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ دیکھو جس طرح اشیاء کے مادی رنگ مختلف ہیں اسی طرح ان کے باطنی رنگ بھی مختلف ہیں۔پھر جس طرح انسان کے جسم کی ضروریات مختلف ہیں اس کے مقابل پر مختلف رنگ کی اشیاء بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں۔نہ انسان کے جسم کی ضرورتوں کو کلی طور پر کوئی سمجھ سکتا ہے نہ ان کے پورا کرنے کے سامان کوئی پیدا کر سکتا ہے۔کیونکہ ہر انسان کا ذوق الگ ہوتا ہے اور اس کے جسم کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں کسی کو میٹھا مفید ہے کسی کو کھٹا۔کسی کو کدو پسند ہے کسی کو بینگن۔ایک کیلے پر جان دیتا ہے دوسرا اس کے چکھنے کی برداشت نہیں رکھتا۔غرض انسانی طبائع ایسے مختلف انواع کی ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔کیا بلحاظ قوت ذائقہ کے اور کیا بلحاظ مختلف تاثیرات سے مناسبت رکھنے کے ان میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔اور ہر اک کی ضرورت اللہ تعالیٰ نے بیرونی اشیاء میں پوری کر چھوڑی ہے۔انسان تو ان اختلافات کی اقسام گن تک نہیں سکتا۔ وہ ان کے مطالبات کو پورا کرنے کی طاقت کہاں رکھ سکتا تھا۔اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے مختلف رنگوں اور مختلف ذوقوں اور مختلف مزاجوں کے لوگوں کو پیدا کیا۔اور پھر ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ویسی ہی مختلف الانواع چیزیں بھی پیدا کر دیں۔

لون کے معنے مختلف انواع کے ان معنوں کے رو سے لون کے معنے نہ صرف رنگ کے لئے جائیں گے بلکہ نوع کے بھی۔اور جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے۔لون کے معنے نوع کے بھی ہوتے ہیں۔

اس مضمون سے اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ دیکھو دنیا میں مختلف رنگوں اور مختلف انواع کی چیزیں اس نے پیدا کی ہیں تاکہ تمہاری مختلف ضرورتوں اور تمہارے مختلف میلانوں کو پورا کرے۔تم خود یہ کام نہیں

کر سکتے۔ پھر تم کس طرح سمجھ سکتے ہو کہ تمہاری اخلاقی قوتوں کے فرق اور اختلاف کے باوجود کوئی انسانی تعلیم سب انسانوں کے لئے یکساں مفید ہو سکتی ہے۔ یہ ضرورت بھی اللہ تعالیٰ ہی پوری کر سکتا تھا۔ جو انسان کی طبیعت اور اس کے اختلافات کا پیدا کرنے والا ہے۔ اور اسے جانتا ہے ورنہ جو انسان قانون بنائے گا اپنے ذوق اور اپنے میلان کے مطابق قانون بنالے گا۔ اور اگر جماعت بنائے گی تو اس جماعت کے میلانوں تک وہ تعلیم محدود رہے گی۔ صرف اللہ ہی کی دی ہوئی تعلیم ہوگی جس میں ہر طبیعت کے میلان اور ہر فطرت کے تقاضے کا خیال رکھا گیا ہوگا۔ اور ہر مخفی ضرورت کو پورا کیا گیا ہوگا۔ پس الہام کا آنا انسان کی روحانی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ ورنہ اول تو انسان اپنی عقل سے روحانی ضرورتوں کو پورا کر ہی نہ سکے گا۔ اور اگر ایک حد تک ضرورت پورا کرنے کا سامان کرے گا بھی تو وہ محدود ہوگا۔ اور وہ نہ تو کسی انسان کی سب ضرورتوں کو پورا کر سکے گا اور نہ تمام انسانوں کی بعض ضرورتوں کو پورا کر سکے گا۔

اس آیت کے آخر میں فرمایا کہ اس میں ان لوگوں کے لئے نشان ہیں جو نصیحت حاصل کرتے ہیں یہ لفظ اس جگہ اس لئے استعمال فرمایا کہ مختلف الوان کی ضرورت پورا کرنے کا سوال خالص اخلاقی سوال ہو جاتا ہے اور اس کا براہ راست نصیحت سے تعلق ہے۔

فکر، عقل اور تذکر کو مضمون کے ساتھ مناسبت یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فکر، عقل اور تذکر کو ہر آیت کے مضمون کی مناسبت سے نہیں بلکہ سارے مضمون کی مناسبت سے رکھا گیا ہے اور درحقیقت تینوں لفظوں کا تعلق سارے ہی مضمون سے ہے صرف ان کو ان کے درجہ کے مطابق پھیلا کر سارے مضمون میں رکھ دیا گیا ہے۔ پہلے فکر کو رکھا ہے۔ کیونکہ یہ پہلا ذریعہ اصلاح کا ہے۔ کیونکہ جب انسان نیک یا بد تغیر کی طرف جھکنے لگتا ہے۔ تو پہلے فکر پیدا ہوتا ہے پھر جب فکر کامل ہو جائے تو عقل پیدا ہوتی ہے۔ یعنی انسان بدی سے رکنے لگتا ہے۔ اور اس کے عمل میں اصلاح شروع ہوتی ہے۔ جب یہ عملی اصلاح ہو جاتی ہے تو تیسرا درجہ تذکر کا شروع ہوتا ہے یعنی نیکی راسخ ہو جاتی ہے اور ہر قدم پر انسان کو اس کا فرض یاد آتا رہتا ہے۔ اور عقل کے مقام پر جس طرح اسے اپنے نفس کو روکنا پڑتا تھا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ نفس خود ہی نیکی کے اصول کو یاد رکھتا ہے اور نیکی اس کی طبیعت ثانیہ ہو جاتی ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ

اور وہ، وہ (پاک) ذات ہے جس نے سمندر کو (بھی تمہاری) بے اجرت کی خدمت پر لگا رکھا ہے تا کہ تم اس میں سے

تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَ تَرَى الْفُلْكَ

(مچھلی وغیرہ کا) تازہ گوشت کھاؤ۔ اور اس سے زیور (کا سامان) نکالو جسے تم (لوگ) پہنتے ہو۔ اور (اے مخاطب)

مَوَاخِرَ فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ

تو اس میں کشتیوں کو پانی پھاڑتے (اور زور سے چلتے) ہوئے دیکھتا ہے (جو اس لئے چلتی ہیں کہ تم سمندری سفر طے

تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۵﴾

کرو) اور تا کہ تم اس کے بعض اور فضل (بھی) تلاش کرو اور تا کہ تم (اس کا) شکر ادا کرو۔

حلّ لُغَات۔ اَلطَّرِیُّ طَرِیَ الْغُصْنُ واللَّحْمُ وَالثَّوْبُ (یَطْرٰی وَطَرُوَ یَطْرُوْ، طَرَاوَةً وطَرَاءَةً وَطَرَاءً) کَانَ طَرِیًّا۔ ہر چیز جو نئی ہو اور بناوٹ کے لحاظ سے تر و تازہ ہو اُسے طَرِیٌّ کہتے ہیں۔ جیسے نیا کپڑا۔ گوشت جو تازہ ہو۔ اسی طرح درخت کی شاخ جو تازہ ہو (اقرب) پس لَحْمٌ طَرِیٌّ کے معنے ہوں گے تازہ گوشت۔

اَلْحِلْیَةُ مَا یُزَیَّنُ بِہٖ مِنْ مَصُوْغِ الْمَعْدِنِیَّاتِ اَوِ الْحِجَارَةِ الْکَرِیْمَةِ۔ معدنیات اور قیمتی پتھروں سے بنے ہوئے زیورات جو زینت کے لئے پہنے جاتے ہیں۔ اس کی جمع حُلِیٌّ آتی ہے۔ (اقرب)

اَلْفُلْكُ اَلسَّفِیْنَةُ۔ کشتی۔ یُذَكَّرُ وَیُؤَنَّثُ یہ لفظ مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ (اقرب)

مَوَاخِر مَوَاخِرُ مَاخِرَةٌ کی جمع ہے۔ اور مَاخِرَةٌ مَخَرَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے مَخَرَتِ السَّفِیْنَةُ کے معنے ہیں جَرَتْ تَشُقُّ الْمَاءَ مَعَ صَوْتٍ۔ کشتی پانی کو چیرتی ہوئی چلی گئی اور اس کی آواز نکلتی تھی۔ وَقِیْلَ اِسْتَقْبَلَتِ الرِّیْحَ فِیْ جَرْیَتِهَا۔ اور بعض نے یہ معنے کئے ہیں کہ کشتی ہوا کے رخ پر چلی۔ مَخَرَ السَّابِحُ کے معنے ہیں شَقَّ الْمَاءَ بِیَدَیْهِ تیرنے والا اپنے دونوں ہاتھوں سے پانی کو چیرتا ہوا تیرا۔ اَلْفُلْكُ الْمَوَاخِرُ الَّتِیْ تَشُقُّ الْمَاءَ مَعَ صَوْتٍ۔ وہ کشتیاں جو پانی کو اس طور پر چیرتی ہوئی چلتی ہیں کہ اُن سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ خشکی کی چیزوں کے مقابل تری کی چیزوں کا ذکر پہلی آیات میں خشکی کی چیزوں کا

ذکر کیا تھا یا ان چیزوں کا جن سے انسان خشکی پر بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اب تری کا ذکر کیا اور سمندر کے مسخر ہونے کا ذکر فرمایا۔ سمندر کے لفظ کو بھی تسخیر کے لفظ سے شروع کیا۔ کیونکہ سمندر بھی انسان کے تصرف میں نہیں ہوتا۔ بلکہ انسان محض اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ مگر رات، دن، سورج، چاند، ستاروں کی تسخیر کے ذکر میں مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ فرمایا تھا۔

سمندر کے سوا ستاروں کی تسخیر کے ساتھ بامرہ کا لفظ لگانے کا مطلب سمندر کے ذکر میں بِاَمْرِهٖ نہیں فرمایا۔ اس لئے نہیں کہ اس کی تسخیر اللہ تعالیٰ کے حکم سے نہیں ہوتی۔ بلکہ اس وجہ سے کہ اجرام فلکی سے فائدہ اٹھانے کے لئے انسان کچھ بھی کام نہیں کرتا۔ پس ان کی تسخیر کامل طور پر بِاَمْرِهٖ ہوتی ہے مگر سمندر سے فائدہ اٹھانے میں کشتی، جال وغیرہ انسان بناتا ہے اس لئے وہاں امر کا لفظ نہ رکھا۔ ورنہ یوں تو ہر کام بِاَمْرِهٖ ہی ہوتا ہے۔

سمندر کی تسخیر کے ذکر کی وجہ سمندر کی تخلیق بھی انسانی ضرورتوں کے پورا کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس میں بہت سے خزانے محفوظ رہتے ہیں۔ جو اس کے بغیر محفوظ نہ رہ سکتے تھے۔ مثلاً وہ پانی کا ذخیرہ جمع رکھتا ہے۔ جہاں سے پھر سورج اس کو اُٹھا کر لاتا ہے۔ پھر اس کے ذریعہ سے سفروں میں سہولت ہوتی ہے۔ خشکی کے سفر سے وہ بہت زیادہ سستا ہوتا ہے۔ جو ملک سمندر کے کنارہ پر ہوتے ہیں وہ بہت زیادہ تجارتی اور سیاسی ترقی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ سمندر کسی کے قبضہ میں اس طرح نہیں آسکتا جس طرح خشکی قبضہ میں ہوتی ہے۔

سمندر حریت کے قائم رکھنے کا ایک ذریعہ ہے اس طرح سمندر گویا حریت کے محفوظ رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ پس سمندر کی مثال دی کہ سمندر بھی تمہاری ضرورت کو پورا کرنے کے لئے بنایا ہے۔ اور اس میں بھی دیکھو کہ تمہاری غذا کا سامان رکھا ہے۔ مچھلی وغیرہ کا تازہ گوشت تم کو مل جاتا ہے۔ اب کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ خدا تعالیٰ تمہارے جسم کے لئے تو خشکی تری میں سفر کی سہولتیں بہم پہنچائے مگر دین کے لئے وہ کچھ بھی نہ کرے۔ اور کیا پھر یہ اس سے بھی عجیب بات نہیں کہ تم دنیاوی سامانوں کو تو شوق سے قبول کرو لیکن روحانی سامانوں کے وقت کہو کہ خدا تعالیٰ کو اس کی کیا ضرورت ہے کہ وہ ہمارے لئے روحانی ترقی کا کوئی سامان پیدا کرے۔

صداقتیں اسی وقت فائدہ مند ہو سکتی ہیں جب وہ صاف کر کے استعمال کے قابل بنا دی جائیں

اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انسانی ضرورتوں کو پانی پورا کرتا ہے اور یہ پانی زمین میں سمندر کی صورت میں موجود بھی ہے۔ لیکن باوجود اس کے اس پانی سے انسان پینے کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ کھیتوں کو سیراب کرنے کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ مگر اللہ تعالیٰ اس پانی سے مچھلی جیسی اعلیٰ غذا پیدا کرتا ہے اور اس پانی کو سورج کے ذریعہ سے اٹھا کر

پینے کے قابل بنا دیتا ہے۔پس صداقتوں کا دنیا میں موجود ہونا کافی نہیں۔وہ اسی وقت مفید ہوتی ہیں جب ان کو صاف کر کے اللہ تعالیٰ انسانی روح کے استعمال کے قابل بنا دے۔

وَتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً۔یعنی موتی وغیرہ اسی نا قابل استعمال چیز سے ہی پیدا ہوتے ہیں جن سے تم زیور بناتے ہو۔اسی طرح اس میں کشتیاں چلتی ہیں جن سے سفر کی سہولت بھی حاصل ہوتی ہے اور تجارت بھی ترقی کرتی ہے۔جس طرح جانوروں کے متعلق فرمایا تھا کہ تم کو بھی لے جاتے ہیں اور تمہارے اسباب اور سامان بھی ۔وہی کشتیوں کے متعلق فرمایا کہ تمہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتی ہیں اور تمہارے تجارتی سامان بھی لے جاتی ہیں۔تجارتی سامان جس طرح ارزاں طور پر سمندر میں لے جایا جاسکتا ہے خشکی میں نہیں۔اسی وجہ سے سمندری کناروں کے لوگوں کی تجارت زیادہ چمک جاتی ہے۔

وَ اَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَ اَنْهٰرًا وَّ

اور اس نے زمین میں (بہت سے) محکم پہاڑ (گاڑ) رکھے ہیں تا کہ وہ تمہیں چکر میں نہ ڈالے اور (اس نے

سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾

تمہارے لئے) کئی دریا (چلائے ہیں) اور کئی (خشکی کے) راستے (بھی بنائے) ہیں تا کہ تم (آسانی سے اپنی منزل مقصود تک) راہ پا سکو۔

حلّ لُغَات۔اَلْقٰى اَلْقَاهُ اِلَى الْاَرْضِ کے معنے ہیں طَرَحَهٗ۔اس کو زمین کی طرف پھینکا۔اَلْقٰى اِلَيْهِ الْقَوْلَ وَبِالْقَوْلِ: اَبْلَغَهُ اِيَّاهُ۔کوئی بات اُسے پہنچائی۔اَلْقَى الْمَتَاعَ عَلَى الدَّابَّةِ: وَضَعَهٗ۔سامان کو جانور پر لادا۔اَلْقٰى فِيْهِ الشَّيْءَ :وَضَعَهٗ۔کسی چیز کو کسی جگہ رکھا۔اَلْقٰى اِلَيْهِ السَّمْعَ: اَصْغٰى۔اس کی بات سننے کے لئے پوری توجہ کی۔(اقرب)

رَوَاسِىَ رَوَاسِىَ کے لئے دیکھو سورۃ رعد آیت ۴۔

الرَّوَاسِىَ اَلْجِبَالُ الثَّوَابِتُ الرَّوَاسِخُ (اقرب) مضبوط پہاڑ۔ان معنوں کے لحاظ سے رَوَاسِىَ کا مفرد نہیں آتا۔

اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ تَمِيْدُ مَادَ سے مضارع مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔اور مَادَ الشَّيْءُ کے معنے ہیں۔

تَحَرَّكَ وَ زَاغَ۔کسی چیز نے حرکت کی اور ایک طرف پر مائل ہوگئی ۔یُقَالُ مَادَتْ بِهِ الْاَرْضُ: دَارَتْ اور مَادَتْ بِهِ الْاَرْضُ کا محاورہ بول کر یہ معنی مراد لیتے ہیں کہ زمین نے اپنے چکر کھانے کے ساتھ اسے بھی چکر دیا۔ السَّرَابُ:اضْطَرَبَ سراب نے حرکت کی ۔(اقرب) پس اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ کے معنے ہوں گے کہ اس ڈر سے کہ زمین متحرک ہوتے ہوئے تمہیں چکر میں نہ ڈالے ۔اس ڈر سے کہ تم کو اضطراب میں نہ ڈالے۔ ہماری زبان اورعربی زبان میں فرق ہے ہم کہتے ہیں کہ اس ڈر سے کہ فلاں کام نہ ہوجائے۔اور عرب کہتے ہیں اس ڈر سے کہ ایسا ہوجائے۔ گویا وہ 'نہ' کو محذوف کر دیتے ہیں۔

تفسیر ۔انہار، سبل اور رواسی کے ساتھ القی کے لفظ کا استعمال اس آیت میں اَلْقٰی کا لفظ استعمال کر کے اس کے بعد رَوَاسِیَ، اَنْهَارًا اور سُبُلًا تین چیزوں کو بیان فرمایا ہے۔گویا سب کا عامل اَلْقٰی کا لفظ ہے۔ اَلْقٰی کے عام معنے پھینکنے کے ہوتے ہیں ۔اگر ان معنوں کو مدنظر رکھا جائے تو آیت کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ زمین میں پہاڑ دریا اور راستے پھینکے۔

اَلْقٰی کے عام معنوں کے مدنظر اس پر ایک اعتراض اور اس پر اعتراض ہوتا ہے کہ پہاڑ تو زمین میں سے نکلے ہیں اور دریا ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پانی لے جاتے ہیں اور راستے چلنے کی جگہ کا نام ہے۔پھر ان کے پھینکنے کے کیا معنے ہوئے ۔بعض نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اَلْقٰی کا لفظ صرف رَوَاسِیَ کے ساتھ لگتا ہے ۔باقی دولفظوں سے پہلے **جعل** کا لفظ محذوف مانا جائے گا۔اور اس کے یہ معنے ہوں گے کہ پہاڑ پھینکے اور دریا اور راستے بنائے۔

دونوں اشیاء کی مشارکت کی وجہ سے دونوں کا ایک ہی فعل کا عامل ہونا اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ جب دو اشیاء ایک ساتھ بیان ہوتی ہیں ۔تو مشارکت کی وجہ سے ایک ہی فعل کو دونوں کا عامل بنا دیا جاتا ہے اور دوسرا فعل محذوف سمجھا جاتا ہے۔(فتح البیان زیر آیت ھذا) جیسے کہ ایک عرب شاعر کا شعر ہے

قَالُوْا اقْتَرِحْ شَيْئًا نُجِدْ لَكَ طَبْخَهٗ

قُلْتُ اطْبُخُوْا لِيْ جُبَّةً وَّ قَمِيْصًا

(کلیات ابو البقاء فصل المیم)

یعنی کہنے والوں نے کہا کہ آپ ہم سے کچھ خواہش کریں ۔تو ہم آپ کے لئے کوئی کھانا اچھی طرح تیار کریں گے۔میں نے کہا کہ ہاں کھانا بھی پکاؤ اور جُبّہ اور قمیص بھی پکاؤ۔اس جگہ پکاؤ کا لفظ ہی جُبّہ اور قمیص کے ساتھ لگا دیا گیا

ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ تم نے کچھ پکانے کی خواہش کی ہے۔ تو پھر میری خواہش یہ ہے کہ میرے لئے جُبّہ اور قمیص پکادو۔ گویا جو لفظ پکانے کا میز بانوں نے کھانے کے متعلق استعمال کیا تھا۔ وہی اس نے جُبّہ اور قمیص کے متعلق بھی استعمال کردیا۔

انہار، سبل رواسی کے لئے قرآن مجید میں جَعَلَ کا استعمال پس اسی قاعدہ کے ماتحت اگر اس آیت کی تشریح کی جائے اور سمجھا جائے کہ اَلْقٰی صرف رَوَاسِیَ کے لئے ہے اور باقی دونوں اسموں کا عامل جَعَلَ ہے جو محذوف ہے اور آیت کے معنے یہ ہیں کہ پہاڑ زمین میں ڈالے اور دریا اور راستے بنائے۔ تو یہ عربی کے قواعد کے مطابق بالکل درست ہوگا۔ لیکن یہ مشکل پھر بھی رہ جائے گی کہ کیا پہاڑ زمین پر پھینکے گئے ہیں۔ جہاں تک جیالوجی یعنی علم پیدائش عالم کا تعلق ہے۔ یہ امر ثابت ہے کہ پہاڑوں کا مادہ زمین سے نکلا ہے نہ کہ باہر سے لاکر ڈالا گیا ہے۔ (Lake and Rastall's Text Book of Geology by R.H Rastall.S.c D.F.G.S X printed by Butter and Tamer 1943.1945 London pg: 11,12.5th edition)

پس جو مشکل جَعَلَ محذوف مان کر اَنْهٰرًا اور سُبُلًا سے دور کی گئی تھی۔ پہاڑوں کے بارہ میں پھر بھی قائم رہتی ہے۔ پس یہ جواب پیش آمدہ مشکل کو حل نہیں کرتا۔

اعتراض کے مختلف جواب اور اس کا اصل حل۔ اس وجہ سے میرا یہ خیال ہے کہ انہار اور سُبُل سے پہلے کسی اور فعل کے محذوف نکالنے کی ضرورت نہیں۔ جو توجیہ اَلْقٰی کی رَوَاسِیَ کے متعلق کی جاسکتی ہے۔ وہی انہار اور سبل کے متعلق بھی کی جاسکتی ہے اور میرے نزدیک قرآن کریم میں اس کا جواب موجود ہے۔ اس آیت میں تین چیزوں کے بارہ میں اَلْقٰی کا لفظ استعمال ہوا ہے (۱) رواسی (۲) انہار (۳) سبل۔ انہی تین چیزوں کے لئے دوسری جگہ جَعَلَ کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ نمل میں ہے۔ جَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا (النمل: ۶۲) یعنی زمین کے نشیبوں میں ہم نے دریا بنائے ہیں۔ پہاڑوں کے متعلق آتا ہے۔ وَجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ (المرسلات: ۲۸) زمین میں ہم نے پہاڑ بنائے ہیں۔ اور راستوں کے متعلق آتا ہے۔ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا (الانبیاء: ۳۲) ہم نے زمین میں راستے پیدا کئے ہیں۔ پس وہ تینوں چیزیں جن کی نسبت اَلْقٰی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ان تینوں کے بارہ میں دوسری جگہ **جعل** کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اَلْقٰی کے یہ معنے تو نہیں کہ باہر سے لاکر کوئی چیز پھینک دی۔ کیونکہ دوسری آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تینوں چیزیں زمین میں ہی بنی ہیں۔

اَلْقٰی کے لفظ کا استعمال مجازی معنوں میں ہے پس جب یہ امر دوسری آیات سے ثابت ہوگیا۔ تو ماننا

پڑے گا کہ اَلْقٰی کے اس آیت میں کوئی اور معنے ہیں۔اب دوسرے معنے یا تو لغوی ہو سکتے ہیں یا مجازی جہاں تک میں نے دیکھا ہے دوسرے لغوی معنوں میں سے کوئی بھی یہاں چسپاں نہیں ہوتے۔ وَضَعَ کے معنے بھی نہیں کیونکہ اس کے معنے ہیں۔کوئی چیز ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دی۔ پہنچانے کے معنے بھی نہیں لگ سکتے۔سنانے کے معنے بھی نہیں۔لکھوانے کے معنے بھی نہیں اور حسن سلوک کے معنے بھی نہیں لگ سکتے۔پس ایک ہی بات رہ جاتی ہے کہ اس لفظ کو مجازی معنوں میں مستعمل سمجھا جائے اور میرے نزدیک یہی حقیقت ہے۔

جَعَلَ کو چھوڑ کر اَلْقٰی کے استعمال کی وجہ ہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ یہ طریق کسی مزید فائدہ کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔وہ کیا فائدہ تھا جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے بعض جگہ جَعَلَ کا لفظ چھوڑ کر اَلْقٰی کا لفظ استعمال فرمایا۔سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ درست ہے کہ یہ طریق کلام کسی زائد فائدہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔اور اس آیت میں بھی یہی وجہ ہے۔اور وہ یہ کہ اَلْقٰی کے اصل معنے پھینک دینے کے ہوتے ہیں۔اور رکھنے اور پھینکنے میں یہ فرق ہوتا ہے کہ رکھی چیز محدود جگہ میں جاتی ہے اور پھینکی ہوئی چیز ادھر ادھر بکھر جاتی ہے۔

اَلْقٰی کے لفظ کے استعمال کے ساتھ نئے معنے پیدا کر دیئے گئے ہیں اگر کسی چیز کی نسبت ہم یہ بیان کرنا چاہیں کہ وہ کثرت سے پائی جاتی ہے تو ہم بعض دفعہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ اس کا تو وہاں چھڑکاؤ ہوا ہوا ہے۔یا کہتے ہیں کہ وہ سب جگہ بکھری ہوئی ہے۔یہی معنے اَلْقٰی کے لفظ سے اس جگہ پیدا کئے گئے ہیں۔اگر خالی جَعَلَ کا لفظ ہوتا۔تو اس سے صرف یہ نتیجہ نکلتا کہ زمین کے بعض حصوں میں پہاڑ ہیں یا بعض حصوں میں دریا ہیں یا بعض حصوں میں راستے ہیں۔

یہاں اَلْقٰی کے الفاظ ہی رکھے جانے مناسب تھے لیکن یہ بتانے کے لئے کہ دنیا کے ہر حصہ اور ملک میں پہاڑ، دریا اور راستے اللہ تعالیٰ نے بنائے ہیں۔اَلْقٰی کے الفاظ ہی مناسب تھے۔اور یہ حقیقت اس مجاز سے ہی ظاہر ہو سکتی تھی کہ یہ تینوں چیزیں دنیا کے ہر حصہ میں اللہ تعالیٰ نے پیدا کر رکھی ہیں۔اور سب دنیا کو اس کے فوائد سے حصہ دیا ہے۔گویا دوسرے الفاظ میں دنیا میں اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں، دریاؤں اور راستوں کا ایک چھینٹا دیا ہے جس سے وہ سارے طول وعرض میں پھیل گئے ہیں۔ان معنوں کی رو سے قرآنی علم کی وسعت بھی ظاہر ہوتی ہے۔جس وقت قرآن کریم نازل ہوا ہے۔دنیا کا ایک حصہ معلوم ہی نہ تھا۔جیسے امریکہ آسٹریلیا وغیرہ۔ایک دوسرا حصہ معلوم تو تھا مگر اس کی پوری چھان بین نہ تھی۔ جیسے وسطی اور جنوبی افریقہ اور اَور بہت سے جزائر۔اس وقت قرآن کریم کا یہ فرمانا کہ پہاڑ، دریا اور راستے کسی ایک ملک یا جگہ کی نعمت نہیں بلکہ یہ نعمت ساری دنیا کو خدا تعالیٰ نے دی ہے

اور گویا آسمان سے دنیا کی سطح پر ان کو پھینک دیا ہے اور وہ دنیا میں بکھر گئے ہیں۔ایک ایسی صداقت ہے جو علم الٰہی کے ذریعہ سے ہی ظاہر ہوسکتی تھی۔اب جبکہ دنیا قریباً سب کی سب دریافت ہوچکی ہے۔یہ صداقت کیسی کھل چکی ہے کہ دنیا کے تمام براعظموں میں پہاڑ دریا اور راستے پائے جاتے ہیں۔اور سب دنیا اس نعمت سے حصہ لے رہی ہے۔ پس القٰی کے لفظ کو ان تین اشیاء کے متعلق مجازاً استعمال کر کے قرآن کریم نے ایک نئے معنے پیدا کر دیئے ہیں۔ اور ایک نئی صداقت ظاہر کر دی ہے۔اور دوسرے مقامات پر جَعَلَ کے لفظ کے استعمال سے ان نادانوں کا منہ بھی بند کر دیا ہے جو اس لفظ سے دھوکا کھا کر یہ کہہ سکتے تھے کہ قرآن کے رو سے پہاڑ دریا اور راستے کہیں باہر سے لا کر زمین پر پھینک دئے گئے ہیں۔

راستوں کے بنانے پر ایک سوال اور اس کا جواب ایک اور سوال اس جگہ ہوسکتا ہے کہ پہاڑ اور دریا تو قانون قدرت بناتا ہے۔ان کے ساتھ راستوں کا کیوں ذکر کیا ہے۔وہ تو انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ انسانی بنائی ہوئی سڑکوں کا ذکر نہیں وہ تو دنیا کے ہر حصہ میں نہیں ہوتیں۔اس جگہ صرف ان راستوں کا ذکر ہے جو طبعی ذرائع سے بن جاتے ہیں۔مثلاً دریاؤں کی وجہ سے یا پہاڑوں کی وجہ سے یا جنگلوں کی وجہ سے۔اور یہی راستے ہیں جو عام ہیں اور جن سے سب دنیا فائدہ اٹھاتی ہے خصوصاً پرانے زمانہ میں فائدہ اٹھاتی تھی۔افغانستان اور ہندوستان کی سرحد سینکڑوں میل تک ملی ہوئی ہے مگر ہر حصہ اس کا راستہ نہیں۔راستے صرف چند ہیں۔جو پہاڑی درّوں کی مناسبت سے بن گئے ہیں۔یہی حال چینی ہندوستانی سرحد کا اور ہندوستانی برہمی سرحد کا ہے۔اور سب ممالک کا یہی حال ہے۔اصل بات یہ ہے کہ شہروں کے درمیان تو سڑک کا بنانا اپنے اختیار میں ہوتا ہے مگر علاقوں اور ملکوں کے درمیان سڑکوں کا بنانا اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا تعلق دریاؤں سے پار ہونے کی سہولت، پہاڑوں کے درّوں یا جنگلوں کے کناروں سے ہوتا ہے۔اور ہمیشہ سے دنیا ان راستوں کو استعمال کرتی چلی آئی ہے۔گو ان جگہوں پر کوئی سڑک نہیں بنی ہوئی تھی۔صرف قدرتی سہولتوں کی وجہ سے لوگوں نے ان راستوں کو اختیار کر لیا تھا۔اور ہزاروں سالوں سے آج تک وہ راستے کام دے رہے ہیں اور ان کے ذریعہ سے پرانے زمانہ میں تجارت ہوتی تھی۔ایک ملک سے دوسرے ملک پر چڑھائی ہوتی تھی۔ہندوستان پر جس قدر حملے شمال پر ہوئے ہیں دیکھ لو صرف چند درّوں سے ہوئے ہیں (تاریخ صوبہ سرحد از محمد شفیع صاحب اشاعت اول جون ۱۹۸۶ء ناشر یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور صفحہ ۵۲، ۵۵)۔ہندوستان میں آریہ قوم پھیلی ہے۔تو پہلے اسی طبعی راستہ پر چل کر جو پنجاب کے دریاؤں کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔اور پھر اس راستہ پر چل کر جو جمنا گنگا کے کنارے پر جاتا تھا۔یا ان

راستوں پر چل کر جو ہمالیہ اور دوسرے پہاڑوں یا کجلی بن کے دامن پر قدرت کے ہاتھوں سے تیار کیا گیا تھا۔اس زمانہ میں راستہ کے لئے طبعی نشانوں کا موجود ہونا ضروری ہوتا تھا۔جن کی وجہ سے لوگ مسافتوں اور جہات کا اندازہ لگا سکیں۔اسی طرح غذا کا مہیا ہونا ضروری ہوتا تھا۔پس پہاڑوں کے دامنوں،جنگلوں کے ساتھ ساتھ اور دریاؤں کے کناروں کے ساتھ ساتھ لوگ بالعموم سفر کرتے تھے اور یہ گویا طبعی راستے تھے جن سے دنیا کے تعلق قائم تھے۔ اور اس آیت میں انہی راستوں کا ذکر ہے نہ کہ مقامی سڑکوں کا جو مختلف شہروں کو آپس میں ملاتی ہیں اس بیان سے اس امر کی حکمت بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ کیوں ان تینوں چیزوں کو اکٹھا کر کے بیان کیا گیا ہے۔

راستوں سے مراد دریاؤں کے راستے اس کے علاوہ راستوں سے مراد وہ راستے بھی ہو سکتے ہیں جن پر دریا چلتے ہیں۔اور اگر اللہ تعالیٰ زمین میں ایسے خلال یا نشیب نہ پیدا کرتا جن میں دریاؤں کا پانی سکڑ کر چلتا ہے تو سب زمین پر پانی ہی پانی ہوتا اور دنیا رہنے کے قابل نہ ہوتی۔

پہلی اشیاء کو بیان کرنے کے بعد سبل،انہار اور رواسی کے بیان میں حکمت پہلی اشیاء کے ذکر کے بعد ان اشیاء کو الگ کیوں بیان کیا گیا ہے؟اس میں یہ حکمت ہے کہ پہلے متفرق چیزوں کا ذکر تھا۔اب اس آیت میں ان چیزوں کا ذکر ہے جو خزانہ کو جمع رکھتی ہیں۔پہاڑ برف کے ڈھیر جمع رکھتے ہیں درخت اور جڑی بوٹیوں کے ذخیرے رکھتے ہیں۔دریا پہاڑوں سے پانی لے کر سال بھر تک پانی ملک کو مہیا کرتے ہیں۔ اور طبعی راستے ان جگہوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے انسان کی مدد کرتے ہیں۔اگر پہاڑ صرف ایک بلند ٹیلا ہوتے اور اس طرح تدریجی طریق پر بڑھنے والی بلندیاں نہ ہوتے تو انسان ان کی چوٹیوں تک کس طرح پہنچ سکتا تھا۔ اگر دریا ایک پھیلا ہوا پانی ہوتے تو ان سے دنیا فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھی۔اُلٹا ان سے نقصان ہوتا کہ قابل کاشت زمینوں کو وہ پانی کے نیچے چھپائے رہتے اور چلنا پھرنا لوگوں کے لئے مشکل ہو جاتا۔

پہاڑوں اور دریاؤں کا خاص قانون کے ماتحت پھیلنا پس پہاڑوں اور دریاؤں سے فائدہ اسی صورت میں اٹھایا جا سکتا ہے کہ وہ خاص قانون کے ماتحت پھیلیں یا ان تک پہنچنے کے لئے ان کے ساتھ ساتھ راستے ہوں جن پر چل کر انسان ان کے فوائد سے متمتع ہو سکے۔

اس آیت کا پہلی آیت سے تعلق اس آیت کا پہلی آیات سے تعلق ایک تو نعماء الٰہی کے شمار کے لحاظ سے ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ جب تمہارے مادی فوائد کے لئے یہ کچھ سامان پیدا کئے گئے ہیں تو تمہاری روحانی ضرورتوں کو اللہ تعالیٰ کس طرح نظر انداز کر سکتا تھا۔دوسرے یہ بتایا گیا ہے کہ انسانی تدابیر صرف ایک وقت کی ضرورت

کو پورا کرسکتی ہیں۔ اللہ ہی ہے جو مستقل ذخائر کے جمع رکھنے کے سامان پیدا کرتا ہے۔ باولیاں کب تک پانی دے سکتی ہیں اور کہاں تک۔ دریا ہی ہیں جو سارا سال پانی دیتے ہیں اور ملکوں کے ملک ان سے سیراب ہوتے ہیں۔ اسی طرح پہاڑ ہیں جو ملکوں کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ اور سارا سال قسما قسم کی ضروری ادویہ اور پھل پھول اور نہ ختم ہونے والے ذخائر لکڑی کے ان سے ملتے ہیں۔ اور پھر یہ بڑے راستے ہی ہیں کہ جو دنیا کے درمیان تعلق قائم کررہے ہیں۔

مختلف زمانوں اور مختلف فطرتوں کی روحانی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کلام الٰہی کی ضرورت

پس اسی طرح روحانی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ایسے کلام کی ضرورت ہے جو صرف ایک وقت کے لوگوں یا چند لوگوں کے فائدہ کے لئے نہ ہو۔ بلکہ مختلف فطرتوں اور مختلف زمانوں کی ضرورت کو پورا کرنے والا ہو۔ اور جس کے ذریعہ سے دنیا روحانی مسافت طے کرسکے۔ یعنی ایک نبی کے زمانہ سے اس کے بعد کے نبی کے زمانہ تک پہنچانے کی اس میں قابلیت ہو۔ یعنی اس میں ایسا ارتقاء ہو کہ فطرت انسانی اس پر چل کر اگلے روحانی ملک میں یعنی بعد میں آنے والے نبی کی تعلیم تک پہنچنے کی قابلیت پیدا کرلے۔ انسان کو کیا معلوم ہے کہ سو یا دوسو سال بعد انسانی دماغ نے کیا ترقی کرنی ہے کہ وہ اس کے مطابق ذہنوں کو روشنی پہنچانے کے سامان کرے۔ یہ سفر تو الٰہی بنائے ہوئے راستہ پر ہی طے ہوسکتا ہے۔ جو انسانی دماغ کو برابر ترقی دئے چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف فلسفے ایک شاہراہ پر گامزن نہیں ہوتے۔ بلکہ کبھی آگے قدم بڑھاتے ہیں اور کبھی پھر واپس صدیوں کے فلسفہ کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی تعلیمات نبیوں کی معرفت انسانوں کو ایک ہی شاہراہ پر آگے ہی آگے بڑھاتی چلی گئی ہیں اور ان میں کسی جگہ بھی رجعت قہقری پیدا نہیں ہوئی۔

وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ

اور (ان کے علاوہ اس نے) کئی (اور) علامات بھی (قائم کی ہیں) اور ستاروں کے ذریعہ سے (بھی)

هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷﴾

وہ (لوگ) راہ پاتے ہیں۔

تفسیر۔ عَلٰمٰتٍ کا عطف اَلْقٰی پر ہے عَلٰمٰتٍ کا عطف بھی اَلْقٰی پر ہی ہے اور اس میں بھی

اس طرف اشارہ ہے کہ دنیا بھر میں سطح زمین یکساں اور مشابہ نہیں ۔ بلکہ نشیب و فراز، پانی، خشکی جنگل اور بیابان زمینوں کی مٹی کے فرق اس قدر ہیں کہ ان کے ذریعہ سے انسان راستہ معلوم کر لیتا ہے۔ اگر سب دنیا ایک ہی شکل کی ہوتی تو انسان کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی جگہ چکر لگا تا رہتا۔

ظاہری ستاروں کے بالمقابل روحانی ستارے یہ تو زمین پر راستوں کے معلوم کرنے کا ذریعہ ہے۔ ایک آسمانی ذریعہ بھی ہے جو رات کی تاریکی اور سمندر میں کام آتا ہے اور وہ ستارے ہیں۔ ان کو دیکھ کر انسان اپنے راستے کو معلوم کرتا ہے۔ یہی حال روحانی سفر کا ہے اس میں بھی علامات ہیں۔ یعنی روحانی ترقی کے مدارج میں امتیازی نشان پیدا کئے گئے ہیں جس کو دیکھ کر انسان سمجھ سکتا ہے کہ آگے کو کون سا راستہ جاتا ہے اور پیچھے کو کونسا۔ اسی طرح ستاروں کی طرح انبیاء کا وجود ہے کہ ان کے مقام سے بھی انسان روحانی سیر میں راستہ پاتا ہے۔ اور ہر نبی کو جو دوسرے نبی سے نسبت ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ سے وہ روحانی سیر میں مدد دیتا ہے۔ جس طرح ایک ستارہ اپنے مقام سے دوسرے ستارے کے مقام کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اسی طرح ہر نبی اپنی تعلیم سے دوسرے نبی کی خبر دیتا ہے اور اس طرح انسان اپنے ایمان میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ موسیٰؑ نے اپنے بعد آنے والے نبی کی اس نے اپنے بعد کے نبی کی اور اس نے اپنے بعد کے نبی کی خبر دی۔ اور گویا ہر ستارہ دوسرے ستارے کی طرف رہنمائی کرتا گیا اور سب ستاروں نے سورج کی یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منزل کی طرف رہنمائی کی۔ جس سے انسان کو روحانی سفر کے طے کرنے اور مرکز روحانیت کے مقام تک ہدایت پانے کا موقعہ مل گیا۔

اَفَمَنْ یَّخْلُقُ کَمَنْ لَّا یَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ ﴿۱۸﴾

پھر (بتاؤ تو سہی کہ) کیا جو پیدا کرتا ہے وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جو (کچھ بھی) پیدا نہیں کرتا کیا تم پھر (بھی) نہیں سمجھتے۔

تفسیر۔ آیت اَفَمَنْ یَّخْلُقُ میں اس کی ترتیب کے متعلق ایک سوال اور مفسرین کا جواب

آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ کیا جس نے پیدا کیا ہے وہ اس کی طرح ہو سکتا ہے جس نے پیدا نہیں کیا۔ اس پر بعض لوگوں نے یہ اعتراض اٹھایا ہے کہ کہنا تو یہ چاہیے تھا کہ کیا جو پیدا نہیں کرتا وہ اس کی طرح ہو سکتا ہے جو پیدا کرتا ہے (کشاف زیر آیت ھذا) کیونکہ مقابلہ میں ادنیٰ کو اعلیٰ کے مقابل پر رکھتے ہیں نہ کہ اعلیٰ کو ادنیٰ کے مقابل پر۔ طاقت کے اظہار کے لئے یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ کیا بچہ پہلوان کی طرح ہو سکتا ہے۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ کیا پہلوان بچہ کی طرح

ہوسکتا ہے۔ یہ اعتراض بالکل درست ہے۔ اگر اس آیت میں طاقت کا اظہار مقصود ہوتا تو ضرور یہی کہا جاتا کہ کیا جو نہیں پیدا کرتا وہ پیدا کرنے والے کے برابر ہوسکتا ہے۔ مگر اس جگہ یہ مراد ہی نہیں۔ علامہ زمخشری اس سوال کو بیان کر کے اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ مشرک خدا تعالیٰ کی صفات غیر اللہ کو دے کر گویا اللہ تعالیٰ کو بھی ایک مخلوق قرار دیتے تھے۔ اس لئے یہ فرمایا کہ اس طرح خدا تعالیٰ پر الزام لگتا ہے تمہارے جھوٹے معبودوں کا درجہ تو نہیں بڑھتا۔ خدا تعالیٰ کا ہی درجہ گھٹانا پڑتا ہے مگر کیا خدا تعالیٰ ان ادنیٰ وجودوں کے برابر ہوسکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ جواب اس قدر معقول نہیں جیسا کہ اعتراض جو انہوں نے اوپر اٹھایا ہے۔

آیت اَفَمَنْ يَّخْلُقُ میں اس کی ترتیب کے متعلق مشکل کا حل میرے نزدیک اس سوال کا جواب اس ترتیب کو مدنظر رکھ کر دیا جاسکتا ہے جو میں نے گذشتہ آیات میں بتائی ہے۔ اصل مضمون جیسا کہ میں بتا چکا ہوں یہ تھا کہ کیا خدا تعالیٰ کو کسی الہام بھیجنے کی ضرورت ہے؟ مشرک لوگ اپنے معبودوں کی نسبت یہ ظاہر کرتے تھے کہ ان کے معبود اس لئے الہام نازل نہیں کرتے کہ یہ ان کی شان کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ نہیں بلکہ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ نہ انہوں نے کوئی دنیوی نعمت انسان کو دی ہے نہ دینی نعمت دینے کی توفیق ہے۔ پھر تم کس طرح سمجھتے ہو کہ خدا تعالیٰ بھی انہی کی طرح ہو جائے۔ حالانکہ اس میں تو الہام بھیجنے کی طاقت ہے۔ پس جس طرح اس نے دنیوی نعمتیں دی ہیں وہ روحانی نعمتیں بھی دیتا ہے۔ تم چاہتے ہو کہ وہ بھی تمہارے خیالی معبودوں کی طرح بے بس ہو کر بیٹھ جائے مگر وہ تو زندہ خدا اور طاقتور ہے۔ اور اس نے ہزاروں سامان دنیوی ترقی کے پیدا کئے ہیں۔ پس وہ تمہارے معبودوں کی طرح روحانی ترقی کے طریق بتانے میں کیوں کوتاہی کرے۔ تمہارے معبودوں کا ایسا نہ کرنا ان کی علوّ شان کی وجہ سے نہیں بلکہ معذوری کے سبب سے ہے اور خدا تعالیٰ معذور نہیں۔ اس لئے وہ کلام بھیجتا رہا ہے اور بھیجتا رہے گا۔ چنانچہ اگلی آیت بھی انہی معنوں کی تصدیق کرتی ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ

اور اگر تم اللہ (تعالیٰ) کے احسان شمار کرنے لگو۔ تو (کبھی) تم ان کا احاطہ نہ کرسکو گے۔ اللہ (تعالیٰ) یقیناً بہت (ہی)

رَّحِيْمٌ ﴿۱۹﴾

بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر۔ دنیاوی نعمتوں کے ذکر سے روحانی نعمتوں کی طرف اشارہ یعنی اللہ تعالیٰ کی

نعمتیں گننا چاہو تب بھی گن نہیں سکتے۔ پھر جس طرح اس نے یہ دنیوی نعمتیں نازل کی ہیں کیوں روحانی نعمتیں نازل نہ کرے۔ اور معبودان باطلہ کی طرح جو کوئی طاقت نہیں رکھتے گونگا ہو کر بیٹھ رہے۔

دوسرے فرمایا کہ وہ غفور رحیم ہے اگر وہ ہدایت نہ بھیجے تو کمزوروں کی معافی اور قابل لوگوں کی عزت کے بڑھانے کے سامان کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ ہدایت بھیجنے سے کوتاہی کرے تو ساتھ ہی اس کی غفور اور رحیم کی صفات بھی معطل ہو جاتی ہیں۔ پس وہ ایسا نہیں کر سکتا۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۰﴾

اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اللہ (تعالیٰ) اس (سب) کو جانتا ہے۔

تفسیر۔ اب ایک اور دلیل دیتا ہے کہ کیوں انسان یا اُن کے معبودان باطلہ ہدایت کا سامان بہم نہیں پہنچا سکتے اور اللہ تعالیٰ ہی ایسا کر سکتا ہے۔ فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ ظاہر اور مخفی طاقتوں کو جانتا ہے۔ ان شبہات کو بھی جانتا ہے جن کو تم بیان کرتے ہو اور ان کو بھی جن کو تم چھپاتے ہو۔ پس ہدایت کا کام بھی وہی کر سکتا ہے۔

انسانی ہدایت کے لئے دو امور کی واقفیت کی غرض یاد رکھنا چاہیے کہ انسانی ہدایت کے لئے دو امور کا ہونا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ انسانی فطرت کی گہرائیوں سے کامل واقفیت ہو۔ کیونکہ جب تک ظاہری و باطنی قوتوں کا علم نہ ہو صحیح راہنمائی نہیں کی جا سکتی اور ساری قوتوں کے نشوونما کا سامان نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری بات یہ ضروری ہے کہ دلوں کے خیالات کا علم ہو۔ کیونکہ ہزاروں لاکھوں انسان اپنی قوم کے ڈر سے اپنے دلی شبہات بیان نہیں کر سکتے پھر جب ان کی مرض کا علم نہ ہو تو علاج کرنے والا علاج کس طرح کر سکتا ہے۔ مثلاً اس زمانہ میں سینکڑوں تعلیم یافتہ ہیں جو درحقیقت الہام کے وجود سے منکر ہیں۔ اگر ان کے سامنے الہام جاری ہونے کا مسئلہ پیش کیا جائے تو وہ قوم کے ڈر سے یہ تو نہیں کہتے کہ الہام کا وجود ہی کوئی نہیں اور سب مدعیان الہام یا جھوٹے تھے یا دھوکا خوردہ۔ پس اس کی بجائے وہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ قرآن کے بعد الہام کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح نئی تعلیم کے دلدادوں میں سے ہزاروں لاکھوں کو اللہ تعالیٰ پر اعتقاد نہیں۔ مگر جب ان سے خدا تعالیٰ کے متعلق بات کی جائے تو یہ کبھی نہ کہیں گے کہ خدا تعالیٰ نہیں ہے بلکہ دوسری قسم کی باتیں کریں گے کہ خدا تعالیٰ تو ہے مگر اسے کیا ضرورت ہے کہ دنیا کے معاملات میں دخل دے۔ پس دل میں نیکی پیدا کرنی چاہیے خدا تعالیٰ خوش ہو جائے گا۔ غرض تصوف کے جھوٹے مسائل کی

آڑ لے کر وہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کے جوئے سے آزاد ہونا چاہیں گے۔ مگر قوم کے ڈر سے یہ ظاہر نہ ہونے دیں گے کہ درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ کے وجود سے ہی منکر ہیں۔

مصلح کے لئے انسانی فطرت کی گہرائیوں کی کامل واقفیت اور دلوں کے خیالات کا علم ہونا ضروری ہے اب اس قسم کے دلی شبہات کو اگر مصلح نہیں جانتا تو وہ ان امور کے متعلق دلائل دیتا رہے گا جو اصل میں خرابی کا موجب نہیں۔ بلکہ دھوکا دینے کے لئے صرف منہ سے بیان کئے جاتے ہیں۔ لیکن جو دل کے عیب کا واقف ہے وہ منہ کی باتوں کو نظر انداز کر کے اس شبہ کے ازالہ پر زور دے گا جو دل میں چھپایا گیا ہے اور اصلاح میں کامیاب ہو جائے گا۔ اور دل کی باتوں کا علم چونکہ صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہے جس طرح صرف وہی انسانی قوتوں کا مکمل علم رکھتا ہے۔ اس لئے ہدایت نامہ بھیجنا بھی اس کے شایان شان ہے اور اسی کا بھیجا ہوا ہدایت نامہ دنیا کی اصلاح کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔

اس دعویٰ کا عملی ثبوت قرآن کریم کا وجود ہے۔ اس میں تمام انسانی قوتوں کی راہنمائی کے سامان موجود ہیں اور انسان کی مخفی سے مخفی قوتوں کو ابھارنے کے لئے تعلیم موجود ہے۔ اسی طرح اس میں ہر انسانی شبہ کا جواب موجود ہے۔ حتّٰی کہ جو شبہات سائنس کی ترقی کی وجہ سے آج کل کے زمانہ میں لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں اور جن کو اکثر آدمی اپنی قوم کے ڈر سے زبان پر لانے سے ڈرتے ہیں قرآن کریم نے انہیں بھی بیان کیا ہے اور ان کا جواب بھی دیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝۲۱

اور اللہ (تعالیٰ) کے سوا جن (معبودان باطلہ) کو وہ پکارتے ہیں وہ کچھ (بھی) پیدا نہیں کر سکتے اور (اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ) وہ خود پیدا کئے جاتے ہیں۔

تفسیر۔ اس جگہ یہ خیال مشرکوں کی طرف سے معاندانہ رنگ میں ظاہر کیا جا سکتا تھا کہ یہ تمہارا دعویٰ غلط ہے کہ ہمارے معبود ہدایت نہیں دے سکتے وہ بھی دلوں کے بھید جانتے ہیں اور وہ بھی ہدایت دینا چاہیں تو دے

سکتے ہیں۔جیسا کہ اکثر مشرک اپنے معبودوں کو علم غیب کا جاننے والا ظاہر کرتے ہیں۔
(The Rig veda pg :170 Editor Pandit Brahma Dutt Snatak M.A Sarvadeshik Arya Pratinidhi Sabha Bharat)

حتیٰ کہ بعض جاہل صوفی مسلمانوں میں سے بھی اس امر پر بحث کرتے رہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی نعوذ باللہ من ذالک علم غیب رکھتے تھے۔میں جب چھوٹا تھا۔ترکی ٹوپی کا استعمال کیا کرتا تھا۔ایک دفعہ ایک ایسے ہی شخص سے گفتگو کر رہا تھا اور ٹوپی کا پھُندنا میرے ہاتھ میں تھا۔اس نے کہا کہ رسول کریم صلعم کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت آپ کے ہاتھ میں یہ پھُندنا ہے۔بہر حال دوسری اقوام میں یہ خیال بڑی شدت سے پایا جاتا ہے۔پس مشرک جواب میں یہ بات پیش کر سکتے تھے کہ انہیں بھی علم تو ہے مگر وہ اپنی مرضی سے الہام نہیں بھیجتے۔کیونکہ انسان کو کسی بیرونی الہام کی ضرورت ہی نہیں۔سو اس کا جواب دیا کہ علم غیب خالق ہونے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔جو خالق ہے وہی اپنی مخلوق کے اندر کی طاقتوں اور اس کے فعلوں سے آگاہ ہو سکتا ہے۔دوسرا واقف نہیں ہو سکتا اور اگر واقف ہو تو ویسا ہی خالق وہ بھی ہو جائے۔مگر جن کو تم معبود مانتے ہو وہ تو خالق نہیں۔بلکہ سب کے سب خود مخلوق ہیں۔

خدا تعالیٰ کے سوا باقی ہستیوں کے علم غیب جاننے کا ردّ اس آیت سے کس لطیف پیرایہ میں خدا تعالیٰ کے سوا سب باقی ہستیوں کے علم غیب جاننے کے دعویٰ کو رد کیا گیا ہے۔مگر تعجب ہے کہ مسلمانوں میں اس تعلیم کی موجودگی میں ایک طبقہ ایسا موجود ہے جو یہ خیال کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو علم غیب بھی تھا اور وہ پرندے بھی پیدا کیا کرتے تھے۔حالانکہ اللہ تعالیٰ اس جگہ صاف فرماتا ہے کہ جس قدر وجودوں کی اللہ تعالیٰ کے سوا پوجا کی جاتی ہے۔ان میں سے ایک بھی کسی چیز کے پیدا کرنے پر قادر نہیں۔اور حضرت عیسیٰؑ انہی وجودوں میں سے ہیں جن کی لاکھوں کروڑوں انسان پوجا کرتے ہیں۔

اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۲۲﴾ ع ۲ / ۱۲ / ۸

وہ (سب) مردے ہیں نہ زندہ۔اور وہ (یہ بھی) نہیں جانتے کہ کب (دوبارہ) اٹھائے جائیں گے۔

حلّ لُغَات۔يَشْعُرُوْنَ شَعَرَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔اور شَعَرَ بِهٖ (شُعُوْرًا) کے معنے ہیں عَلِمَ بِهٖ۔کسی چیز کو معلوم کیا شَعَرَ لِكَذَا۔ فَطِنَ لَهٗ۔اس کو سمجھا ۔عَقَلَهٗ۔کسی چیز کو جانا۔اَحَسَّ بِهٖ۔اس کو محسوس کیا۔(اقرب) پس مَا يَشْعُرُوْنَ کے معنے ہوں گے کہ انہیں معلوم نہیں۔وہ

محسوس نہیں کرتے۔

تفسیر ۔خالق ہونے کے علاوہ ہدایت دینے والے وجود کے لئے زندہ ہونا بھی ضروری ہے۔تا کہ جب کوئی خرابی ہو وہ اس کی اصلاح کر سکے۔اس دلیل سے معبودان باطلہ کے ہدایت دینے کے قابل ہونے سے انکار کیا اور فرمایا کہ جن کو تم پوجتے ہو سب فوت ہو چکے ہیں پھر وہ ہادی کس طرح ہو سکتے ہیں۔اگر اس زمانہ میں خرابی پیدا ہو تو وہ اسے کس طرح دور کریں گے۔

اَیَّانَ یُبۡعَثُوۡنَ کی آیت کے رو سے حضرت عیسیٰؑ کی وفات کا ثبوت تعجب ہے کہ مسلمانوں میں اس ارشاد کے خلاف بھی عقیدہ پیدا ہو رہا ہے اور ایک کثیر جماعت حضرت عیسیٰؑ کو زندہ مان رہی ہے۔حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس قدر جھوٹے معبود قرآن مجید کے زمانہ میں تھے وہ سب فوت ہو چکے تھے پس چونکہ عیسائی حضرت عیسیٰ کو معبود مانتے تھے اس الٰہی شہادت کے ماتحت وہ قرآن کریم کے نزول سے پہلے فوت ہو چکے تھے۔ اور اگر انہیں زندہ تسلیم کیا جائے۔تو ماننا پڑے گا کہ وہ نعوذ باللہ معبودانِ باطلہ میں سے نہ تھے بلکہ فی الواقعہ خدا تھے۔نعوذ باللہ من ذالك۔

آیت لَا یَخۡلُقُوۡنَ اور اَیَّانَ یُبۡعَثُوۡنَ میں شرک کے رد میں چار زبردست دلائل ان دونوں آیات میں شرک کا رد بھی نہایت زبردست دلائل سے کیا گیا ہے اور اس کے لئے چار دلائل دیئے ہیں۔

(۱) لَا یَخۡلُقُوۡنَ وہ پیدا نہیں کرتے۔حالانکہ خدا ہونے کے لئے خالق ہونا ضروری ہے۔کیونکہ کامل وجود ہی معبود ہو سکتا ہے۔

(۲) وہ خود پیدا کئے گئے ہیں۔یعنی ان میں احتیاج الی الغیر پائی جاتی ہے اور محتاج الی الغیر ناقص ہوتا ہے معبود نہیں ہو سکتا۔

(۳) وہ مردہ ہیں۔زندہ نہیں۔یعنی اس زمانہ میں وہ بے نفع اور بے ضرر ہیں۔اور خدا وہی ہو سکتا ہے جو ہمیشہ نفع اور ضرر کی طاقت رکھتا ہو۔

(۴) انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔گویا ان کا انجام بھی دوسرے کے ہاتھ میں ہے۔ اس آخری دلیل کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ انہیں علم نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے سو اس کا جواب یہ ہے کہ سب سے زیادہ پوجا جانے والا وجود حضرت مسیح کا ہے۔وہ یوم البعث کے متعلق خود کہتے ہیں کہ۔

حضرت مسیحؑ کا یوم البعث کے متعلق عدم علم کا اقرار

’’لیکن اس دن یا اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا۔ نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا۔مگر باپ۔خبردار! جاگتے اور دعا مانگتے رہو۔ کیونکہ تم نہیں جانتے کہ وہ وقت کب آئے گا‘‘۔

(مرقس باب ۱۳ آیت ۳۲، ۳۳)

پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس اقرار پر باقی خدا مانے جانے والے انسانوں کے متعلق بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ

تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔ان کے دل (حق سے) ناآشنا ہیں۔

قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور وہ تکبر سے کام لے رہے ہیں۔

حلّ لُغات۔قُلُوْبُهُمْ مُنْكِرَةٌ مُنْكِرَةٌ اَنْكَرَ سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے اور اس کے معنے جاہل اور ناواقف کے ہیں۔پس قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ کے معنے یہ ہوئے کہ ان کے دل جہالت میں مبتلا ہو گئے۔مزید تشریح کے لئے دیکھو حجر آیت نمبر ۶۳۔

مُنْكَرُوْنَ اَنْكَرَ سے اسم مفعول مُنْكَرٌ بنتا ہے اور مُنْكَرُوْنَ اس کی جمع ہے۔اَنْكَرَهٗ کے معنے ہیں جَهِلَهٗ اس کو نہ پہچانا۔اَنْكَرَ حَقَّهٗ کے معنی ہیں جَحَدَهٗ اس کے حق کا جان بوجھ کر انکار کر دیا۔اَنْكَرَ عَلَيْهِ فِعْلَهٗ: عَابَهٗ وَنَهَاهُ اس کے فعل کو معیوب قرار دیا اور اس سے اُسے روکا۔اَلْمُنْكَر کے معنی ہیں مَالَيْسَ فِيْهِ رِضَى اللهِ مِنْ قَوْلٍ اَوْ فِعْلٍ وَالْمَعْرُوْفُ ضِدُّهٗ۔منکر وہ فعل یا قول ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو اور لفظ معروف (پسندیدہ) اس کے مخالف معنے ادا کرنے کے لئے بولا جاتا ہے(اقرب)

تفسیر۔ **قرآن مجید کے منکروں سے خطاب کرنے کے دو طریق** یہ جو فرمایا کہ تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے یہ خالی دعویٰ نہیں۔قرآن کریم جب منکروں سے خطاب کرتا ہے تو صرف دعویٰ پیش نہیں کرتا۔کیونکہ ان پر خالی دعویٰ کا اثر نہیں ہو سکتا۔بلکہ وہ ایسے موقعہ پر دو میں سے ایک طریق اختیار کرتا ہے۔

قرآن مجید کا دعویٰ کے بعد دلائل بیان کرنا یا واقعات کے بعد ان کے طبعی نتائج کو بیان کرنا

یا تو دعویٰ بیان کرنے کے بعد ہی اس کے دلائل دیتا ہے یا دلائل بیان کر کے بعد میں اس کا نتیجہ پیش کرتا ہے اور یہی دو طبعی طریق ہیں جن سے انسانی دماغ تسلی پاتا ہے اور دونوں اپنے اپنے رنگ میں نہایت موثر ہیں۔ بعض دفعہ دعویٰ بیان کر کے بعد میں دلائل دینا مفید ہوتا ہے اور بعض دفعہ واقعات بیان کر کے بعد میں ان کا طبعی نتیجہ بیان کرنا مفید ہوتا ہے۔ اس جگہ دوسرا طریق اختیار کیا ہے اور پہلی آیات کا عقلی نتیجہ پیش کیا ہے۔

پہلی آیات میں دو مضمون بیان ہوئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ سب کائنات ایک ہی رشتہ میں پروئی ہوئی ہے اور ایک چیز کا دوسری پر انحصار ہے۔ انسان کی پیدائش اصل ہے۔ اس کی غذا اول حیوانی ہے۔ حیوان درختوں وغیرہ سے غذا حاصل کرتے ہیں۔ آگے وہ درخت اور بوٹیاں آسمانی پانی سے پلتے ہیں اور وہ پانی انسان کے پینے کے کام بھی آتا ہے۔ پھر اُسی پانی سے نباتات اُگتی ہیں جو انسان کی غذائیں بنتی ہیں۔ یہ سب اشیاء رات، دن، سورج، چاند اور ستاروں کی تاثیرات سے نشوونما پاتی ہیں۔ دوسری طرف ان کے قیام کا ذریعہ سمندر ہے جس میں پانی کا ذخیرہ رہتا ہے۔ اور اس سے پانی چھن کر پھر انسانوں کو ملتا ہے۔ اور اس سمندر کو اپنے حال پر رکھنے کے لئے پہاڑ ہیں جو پانی جمع رکھتے ہیں۔ وہاں سے دریاؤں کے ذریعہ سے پانی بہتا ہے جو خاص راستوں پر چل کر سمندر میں آ کر گر جاتا ہے اور سطح زمین پر پھیل نہیں جاتا کہ زمین انسانوں کی رہائش کے قابل نہ رہے۔ ان سب امور سے ایک واضح نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ دنیا کی ہر چیز ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔ اور دنیا متفرق چیزوں کا مجموعہ نہیں۔ بلکہ اس کا اختلاف ایسا ہی ہے جیسے ایک زنجیر کی کڑیاں۔ اگر ایک کڑی نکال دی جائے تو زنجیر، زنجیر نہیں رہتی۔ اسی طرح کائنات میں سے ایک چیز کو نکال دو ساری دنیا تباہ ہو جائے گی۔ سمندر خشک کر دو پانی ختم ہو جائے گا۔ دریا خشک کر دو سمندر خشک ہو جائے گا۔ اس نشیب کو جو دریاؤں کے لئے راستہ بناتا ہے دور کر دو۔ سب دنیا پر پانی پھیل جائے گا اور زمین رہائش کے قابل نہ رہے گی۔ پہاڑ مٹا دو زمین پر زلزلے آئیں گے اور انسان ہلاک ہو جائے گا۔ دریاؤں کے لئے پانی کا ذخیرہ باقی نہ رہے گا اور وہ سارا پانی یکدم سمندر میں جا گرائیں گے۔ اگر ایک طرف دنیا سیلاب کی نظر ہوگی تو دوسری طرف سال بھر تک پانی کے مہیا رہنے کی صورت مفقود ہو جائے گی۔ چاند ستاروں کو مٹا دو تو جو ان کی وجہ سے پیدائش عالم پر اثر ہے وہ جاتا رہے گا اور زمین اپنی حالت پر نہ رہے گی۔ سورج کو الگ کر دو یہ بادلوں کا سلسلہ جاتا رہے گا اور لوگ پانی کو ترس جائیں گے اور سبزیوں کا پکنا بند ہو جائے گا۔ اور انسان کی صحت خراب ہو جائے گی۔ اور اس کی حیوانی غذا کے پیدا ہونے کا بھی امکان نہ رہے گا۔

کائنات کا نظام خدا تعالیٰ کے واحد ہونے کی دلیل ہے غرض یہ سب کائنات مل کر انسان کی خدمت کر رہی ہے۔ اور اس کا ہر حصہ دوسرے حصے کے قیام کا ذریعہ ہے۔ جب یہ حال ہے تو پھر دو خدا کا عقیدہ کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ اگر دنیا کو کئی خداؤں نے پیدا کیا ہے۔ تو وہ کون سا حصہ ہے جس کے بارہ میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ دوسرے سے آزاد ہے کہ سمجھا جا سکے کہ اُسے کسی اور نے پیدا کیا ہوگا۔ اور اگر ساری کائنات ایک زنجیر کی کڑیوں پر مشتمل ہے تو اس کا بنانے والا ایک ہی خدا تسلیم کرنا پڑے گا۔ سوائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ خدا تعالیٰ میں سب کائنات بنانے کی قدرت نہ تھی۔ اس لئے کئی خداؤں نے مل کر کام تقسیم کر لیا اور پہلے سے تجویز کردہ نقشہ کے مطابق ہر اک نے اپنا اپنا حصہ پورا کیا۔ لیکن یہ عقیدہ مشرکوں کا بھی نہیں اور ہے بھی خلاف عقل۔ کیونکہ ناقص وجود خدا نہیں ہو سکتے۔ پس اس دلیل کی موجودگی میں ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ تمہارا خدا وہی ہے جو ایک ہے۔

دوسرا مضمون پہلی آیات میں یہ بتایا گیا تھا کہ وہ سب وجود جن کو خدا کہا جاتا ہے فوت ہو چکے ہیں۔ پس جب وہ فوت ہو چکے ہیں تو پھر بھی ایک ہی خدا باقی رہ جاتا ہے جو موت سے بالا ہے۔

پس اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ میں پہلے مضامین کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے اور کوئی بے دلیل دعویٰ بیان نہیں کیا گیا۔

بعث بعد الموت کے انکار کے دو نتائج اس کے بعد فرماتا ہے۔ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ اس جگہ فاء، واو کے معنوں میں ہے اور فاء، واو کے معنوں میں عربی زبان میں مستعمل ہوتی ہے۔ (اقرب) اور ترجمہ یہ ہے کہ ''اور جو لوگ آخرۃ پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منکر ہیں اور وہ تکبر سے کام لیتے ہیں'' اس فقرہ میں اس سوال کا جواب دیا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کا ایک ہونا ایسا بدیہی امر ہے تو لوگ اس کے ایک ہونے کا انکار کیوں کرتے ہیں۔ اور وہ جواب یہ ہے کہ یہ انکار کسی دلیل پر مبنی نہیں۔ بلکہ باوجود ان دلائل کے شرک میں مبتلا ہونا اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ بعث بعد الموت کے منکر ہیں۔ اور اس انکار کی وجہ سے ان کے اندر سنجیدگی باقی نہیں رہی۔ کیونکہ جب یہ اپنے افعال کو بغیر نتیجہ سمجھتے ہیں تو انہیں ان کے اچھا برا ہونے کے متعلق خاص فکر پیدا نہیں ہوتی۔ اور ضد اور تعصب میں کوئی حرج نہیں دیکھتے۔ کیونکہ ان کے خیال میں گرفت تو کوئی ہونی نہیں۔ اس لئے آہستہ آہستہ ان کے دل جاہل اور غبی ہو گئے ہیں۔ اور وہ مادہ سمجھ اور ہدایت کا ان میں باقی نہیں رہا جو اس وقت انسان میں پیدا ہوتا ہے جب کہ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ میرے اعمال کا کوئی اہم نتیجہ نکلنے والا ہے۔ غرض آخرت کے انکار کی وجہ سے لاابالی پن اور سنجیدگی کا فقدان ان میں پیدا ہو گیا ہے اور دل علم سے محروم رہ گئے ہیں۔ اور اس وجہ سے بدیہی اور یقینی باتوں کا انکار بھی دلیری سے کر دیتے ہیں۔ اور غور کرنے کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ غرض اس جگہ مُّنْكِرَةٌ کے

معنے انکار کرنے والے کے نہیں بلکہ جاہل اور ناواقف کے ہیں۔ اور یہ بتایا ہے کہ بعث بعد الموت پر ایمان نہ ہونے کے سبب سے چونکہ سنجیدگی سے غور کرنے کا احساس نہیں اس لئے اس عادت کی وجہ سے دلوں سے سمجھ کا مادہ جاتا رہا ہے اور ان کو حس ہی نہیں ہوتی کہ ہمارا ایک عقیدہ دوسرے عقیدہ کے خلاف ہے۔

دوسرا نتیجہ بعث بعد الموت کے انکار کا یہ بتایا کہ ان میں تکبر پیدا ہوگیا ہے کیونکہ جو شخص جزا سزا کا مومن نہ ہو وہ نڈر ہو جاتا ہے اور جو نڈر ہو جائے وہ سچائی کا اقرار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ کے الفاظ سے دو قسم کے مشرکوں کا ذکر غرض قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ اور هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ کے الفاظ سے درحقیقت دو قسم کے مشرکوں کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک وہ ہیں جن سے سنجیدگی سے غور کرنے کا مادہ جاتا رہا ہے اور جہالت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ پس بوجہ دل کے بیمار ہو جانے کے وہ سچائی کے سمجھنے سے قاصر رہ گئے ہیں۔ اور دوسرے وہ لوگ جو دلائل سن کر ایک خدا کے عقیدہ کو دل میں تو صحیح سمجھتے ہیں لیکن تکبر اور ضد کی وجہ سے اس کا اقرار نہیں کرتے۔ کیونکہ جزاء سزا کے انکار کی وجہ سے وہ بے خوف ہیں۔ اور سچائی کے انکار میں کوئی نقصان نہیں دیکھتے۔

لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ؕ اِنَّهٗ لَا

یہ یقینی بات ہے کہ جو کچھ وہ پوشیدہ (طور پر) کرتے ہیں (اسے بھی) اور جو کچھ وہ ظاہر (طور پر) کرتے ہیں (اسے

يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

بھی) اللہ (تعالیٰ) جانتا ہے۔ وہ تکبر کرنے والوں کو ہر گز پسند نہیں کرتا۔

حلّ لُغات ۔ لَا جَرَمَ کی تشریح کے لئے دیکھو ہود آیت ۲۳۔

جَرَمَ يَجْرِمُ جَرْمًا قَطَعَ کاٹ دیا۔ لَا جَرَمَ قَالَ الْفَرَّاءُ هِيَ كَلِمَةٌ كَانَتْ فِي الْاَصْلِ بِمَنْزِلَةِ لَا بُدَّ وَلَا مَحَالَةَ فَجَرَتْ عَلٰى ذٰلِكَ وَ كَثُرَتْ حَتّٰى تَحَوَّلَتْ اِلٰى مَعْنَى الْقَسَمِ ۔ وَصَارَتْ بِمَنْزِلَةِ حَقًّا وَهُوَ مَأْخُوْذٌ مِنَ الْقَطْعِ ۔ فرّاء کا قول ہے کہ لَا جَرَمَ پہلے لَا بُدَّ یعنی ضرور کے معنی میں استعمال ہوا کرتا تھا پھر کثرت استعمال سے ہوتے ہوتے اس کے معنی قسم کے بن گئے اور حقاً یعنی یقیناً کے معنی دینے لگا ورنہ اس کے اصل معنی یہی ہیں کہ اسے کوئی کاٹ نہیں سکتا یعنی یہ اٹل بات ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ انکار بعث سے جہالت میں پڑنے والوں کی سزا توحید کا تکبر سے انکار کرنے والوں سے کم ہوگی فرمایا جس طرح اوپر بیان کئے گئے دلائل سے ایک خدا کا ثبوت ملتا ہے اس کے عالم الغیب ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ جو ان کے ظاہر و باطن کو جانتا ہے وہ ان کو ان کے اعمال کی ضرور سزا دے گا۔ ہاں وہ یہ فرق ضرور کرے گا کہ جو لوگ انکار بعث کی وجہ سے جہالت میں مبتلا ہو گئے ان کی سزا ان لوگوں سے کم ہوگی جو توحید کو سمجھتے تو ہیں۔ مگر تکبر کی وجہ سے انکار کرتے ہیں۔ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ کے الفاظ سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں وہ زیادہ سزا کے مستحق ہوں گے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے (کہ) وہ (کلام) جو تمہارے رب نے اتارا ہے کیا (ہی شاندار) ہے۔ تو وہ کہتے ہیں

الْاَوَّلِيْنَ ۙ﴿۲۵﴾

(کہ) یہ (خدا تعالیٰ کا کلام نہیں بلکہ) پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔

حلّ لُغات۔ اَسَاطِيْرُ اَسَاطِيْرُ سَطَرَ سے بنا ہے۔ اور سَطَرَ الْكَاتِبُ کے معنے ہیں كَتَبَ۔ اس نے لکھا۔ اور سَطَرَ الرَّجُلَ کے معنے ہیں صَرَعَهٗ۔ کسی کو کشتی میں گرا لیا۔ سَطَرهٗ بِالسَّيْفِ: قَطَعَهٗ بِهٖ۔ اس کو تلوار سے کاٹ ڈالا۔ اَلْاِسْطَارُ وَالْاُسْطَارُ وَالْاُسْطُوْرُ وَالْاُسْطِيْرُ: مَا يُسْطَرُ اَیْ يُكْتَبُ وَتُسْتَعْمَلُ فِی الْحَدِيْثِ لَا نِظَامَ لَهٗ۔ یعنی اِسْطَارٌ اور اُسْطَارٌ اُسْطُورٌ اور اُسْطِيْرٌ کے معنے لکھی ہوئی چیز کے ہیں اور ایسی باتوں کو بھی کہتے ہیں جن میں کوئی نظام نہ ہو۔ وَالْحِكَايَاتُ اور قصے کہانیوں کو بھی کہتے ہیں۔ اس کی جمع اَسَاطِيْر آتی ہے (اقرب) پس اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کے معنے ہوں گے پہلے لوگوں کی تحریری حکایتیں یا کہانیاں یا بے جوڑ باتیں۔

تفسیر۔ منکرین توحید اور بعث بعد الموت کا قرآنی دلائل کے اثر کو مٹانے کا غلط طریق

اس آیت سے پھر اصل مضمون کی طرف رجوع فرمایا اور بتایا کہ یہ منکرین توحید اور بعث بعد الموت جب ان دلائل کو سنتے ہیں تو بجائے غور کرنے کے کہہ دیتے ہیں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ تو پہلے لوگوں کی باتوں کو نقل کر دیا گیا ہے۔ اُسْطُوْرٌ جس کی جمع اَسَاطِيْرُ ہے اس کے معنے کہانی کے بھی ہوتے ہیں اور کتاب کے بھی۔ اور گو دونوں معنے اس آیت میں چسپاں ہو سکتے ہیں۔ مگر سیاق کو مدنظر رکھتے ہوئے کتاب کے معنے زیادہ چسپاں ہوتے ہیں کیونکہ اس سورۃ

میں نبیوں کے واقعات بیان نہیں ہوئے بلکہ بعض دلائل بیان ہوئے ہیں۔ پس سیاق کے لحاظ سے یہاں یہی معنے زیادہ چسپاں ہوتے ہیں کہ وہ لوگ جو دلائل کو سنتے ہیں تو ڈرتے ہیں کہ لوگوں پر اثر نہ ہوجائے اور اثر کو مٹانے کے لئے تخفیف کے لئے کہتے ہیں کہ اجی یہ کوئی نئی بات نہیں پہلے کئی لوگ یہ باتیں لکھ چکے ہیں ہم ان باتوں سے خوب واقف ہیں۔ گویا اس طرح وہ اپنے اتباع پر یہ اثر ڈالنا چاہتے ہیں کہ یہ خدائی کلام نہیں صرف پہلے لوگوں کی باتوں کو نقل کر کے یہ شخص بیان کر رہا ہے اور ہم ان باتوں کو پہلے سے ہی جانتے ہیں اور ان کی غلطی سے واقف ہیں۔

الٰہی دلائل کو مخالفین کا پہلوں کی نقل شدہ باتیں کہنا ہمیشہ کا وطیرہ ہے یہ حربہ حق کے خلاف ہمیشہ سے استعمال ہوتا چلا آتا ہے۔ جب ائمۃ الکفر دیکھیں کہ دلائل زبردست ہیں اور ان کا جواب دینا مشکل ہے۔ تو ہمیشہ یہ کہہ کر بات ٹال دیتے ہیں کہ اجی بس کرو یہ بھی کوئی دلائل ہیں۔ ہمیشہ سے لوگ یہ بات کہتے چلے آئے ہیں۔ تم نے ان سے نقل کر کے آگے لوگوں کو سنادی ہیں اور ان کے جاہل اتباع دلیل کی خوبی سے غافل ہوجاتے ہیں اور اسی پر خوش ہوجاتے ہیں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں اس لئے خدائی کلام نہیں ہوسکتا۔ گویا کہ خدائی کلام وہ ہوتا ہے جس میں نئی نئی باتیں بیان کی جائیں۔ حالانکہ خدائی کلام کی غرض تو گمشدہ صداقتوں کو قائم کرنا ہوتا ہے۔ گو اس میں زمانہ کی ضرورت کے مطابق نئے علوم بھی ہوتے ہیں۔ مگر اصولی باتیں سب نبیوں کی ایک ہی ہوتی ہیں۔ اِن اصولی باتوں کو چھوڑ کر جو نئی بات کہے گا وہ تو جھوٹ ہی بولے گا۔

لِيَحۡمِلُوۡۤا اَوۡزَارَهُمۡ كَامِلَةً يَّوۡمَ الۡقِيٰمَةِ‌ۙ وَمِنۡ اَوۡزَارِ

جس (قول) کے نتیجہ میں وہ قیامت کے دن اپنے بوجھ (بھی) پورے (پورے) اٹھائیں گے اور ان کے بوجھ بھی

الَّذِيۡنَ يُضِلُّوۡنَهُمۡ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ‌ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوۡنَ ۝۲۶ ع۳/۹

جن جاہلوں کو وہ گمراہ کر رہے ہیں۔ سنو! جو بوجھ وہ اٹھا رہے ہیں وہ بہت (ہی) بُرا ہے۔

حلّ لُغات۔ اَوۡزَارٌ اَوۡزَارٌ وِزۡرٌ کی جمع ہے اور وِزۡرٌ وَزَرَ کا مصدر ہے۔ وَزَرَہٗ کے معنے ہیں حَمَلَہٗ۔ اس نے اس کو اٹھایا۔ وَفِي اللِّسَانِ حَمَلَ مَا يُثۡقِلُ ظَهۡرَهٗ مِنَ الۡاَشۡيَاءِ الۡمُثۡقِلَةِ۔ اور لسان میں لکھا ہے کہ وِزۡرٌ کا لفظ ایسے بوجھ کے اٹھانے کے لئے بولتے ہیں جس کا اٹھانا مشکل ہو۔ نیز اَلۡوِزۡرُ کے معنے ہیں اَلۡاِثۡمُ۔ گناہ۔ اَلثِّقۡلُ۔ بوجھ۔ اَلسِّلَاحُ لِثِقۡلِهٖ عَلٰى حَامِلِهٖ۔ ہتھیار کیونکہ وہ بھی اٹھانے والے پر بوجھل ہوتے

ہیں۔ اَلْحِمْلُ الثَّقِيْلُ۔ بھاری بوجھ۔اس کی جمع اَوْزَارٌ آتی ہے۔(اقرب)

تفسیر ۔فرمایا اس قسم کی باتوں سے یہ عوام کو دھوکا تو دے لیتے ہیں ۔لیکن اپنی عاقبت کو اور بھی خراب کر لیتے ہیں۔آخر جزاء کے دن ان کے اپنے بداعمال کے علاوہ اس جرم کی سزا بھی ان کو ملے گی کہ فریب اور دھوکے سے جاہل عوام کو گمراہ کرتے رہے۔

لِيَحْمِلُوْٓا میں لام۔لام عاقبت ہے جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ پہلی بات کے نتیجہ میں یہ بات پیدا ہوئی ہے۔ اور معنے یہ ہیں کہ اس دھوکہ دہی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ اپنے گناہوں کی سزا بھی پائیں گے اور ان کے اعمال کی بھی جن کو انہوں نے گمراہ کیا ہوگا۔

بِغَيْرِ عِلْمٍ يُضِلُّوْنَهُمْ کی ضمیر مفعول کا حال ہے بِغَيْرِ عِلْمٍ۔يُضِلُّوْنَهُمْ کی ضمیر مفعول کا حال ہے اور یہ مراد نہیں کہ گمراہ کرنے والے بغیر علم کے گمراہ کرتے ہیں ۔کیونکہ ان آیات میں تو ذکر ہی یہ ہے کہ یہ لوگ شرارت سے گمراہ کر رہے ہیں۔ بلکہ معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ اپنے اتباع کو جو کوئی علم نہیں رکھتے باتیں بنا کر گمراہ کر دیتے ہیں۔

كَامِلَةً کے لفظ کے دو معنے كَامِلَةً ۔اس لفظ کے دو طرح معنے کئے جا سکتے ہیں (۱) اگر تو اسے يَوْمَ الْقِيٰمَةِ کا متعلق سمجھا جائے تو معنے یہ ہوں گے کہ کچھ سزا تو انہیں یہاں دنیا میں ملے گی لیکن پوری سزا ان کو قیامت میں ملے گی (۲) اگر اسے لِيَحْمِلُوْٓا کا متعلق سمجھا جائے تو اس کے معنے ہوں گے کہ یہ اپنے سارے کے سارے بوجھ اٹھائیں گے اور کوئی بوجھ کم نہ ہوگا۔یعنی مومن تو استغفار کرتا رہتا ہے اس لئے اس کے بوجھ کم ہوتے رہتے ہیں اور گناہ معاف ہوتے رہتے ہیں۔مگر یہ متکبر ہیں اس لئے ان کے سب گناہ باقی رہ جائیں گے اور سب کی سزا ان کو ملے گی۔

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ

جو لوگ ان سے پہلے تھے انہوں نے (بھی اپنے اپنے زمانہ کے انبیاء کے خلاف) تدبیریں کی تھیں جس کے نتیجہ میں

الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ اَتٰىهُمُ

اللہ (تعالیٰ) ان کی عمارتوں کے پاس ان کی بنیادوں کی طرف سے آیا۔جس پر چھت ان کے اوپر کی طرف سے ان پر

الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۲۷

آن گری اور (اس کا یہ) عذاب اُن پر ایسی طرف سے آیا کہ وہ (کچھ) نہیں سمجھتے تھے (کہ کہاں سے آ گیا)۔

حلّ لُغات۔ مَكَرَ کسی کو اس کے قصد سے کسی تدبیر کے ذریعہ سے پھیرنے کا نام مکر ہے اور یہ اچھا بھی ہوتا ہے اور بُرا بھی (اقرب) مزید تشریح کے لئے دیکھیں رعد آیت نمبر ۴۳۔

مَكَرَهٗ کے معنے ہیں خَدَعَهٗ۔ اس کو دھوکا دیا۔ اَللّٰہُ فُلَانًا: جَازَاهُ عَلَى الْمَكْرِ۔ جب اللہ تعالیٰ کے لئے مَكَرَ کا لفظ آئے تو اس کے معنے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مکر کا بدلہ دیا۔ قِيْلَ الْمَكْرُ صَرْفُ الْاِنْسَانِ عَنْ مَقْصَدِهٖ بِحِيْلَةٍ۔ بعض نے کہا کہ کسی کو اس کے قصد سے کسی حیلہ کے ذریعہ سے پھیرنے کا نام مکر ہے۔ وَهُوَ نَوْعَانِ مَحْمُوْدٌ يُقْصَدُ فِيْهِ الْخَيْرُ وَمَذْمُوْمٌ يُقْصَدُ فِيْهِ الشَّرُّ۔ اور مکر اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔ (اقرب)

اَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ اَتٰى کی تشریح کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۴۲۔

اَتَاهُ کے معنے ہیں جَاءَهٗ۔ اس کے پاس آیا۔ وَالْاَمْرَ: فَعَلَهٗ۔ اور جب اَتٰى کا مفعول اَلْاَمْرَ ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں کام کو کیا۔ اَتَى الْمَكَانَ: حَضَرَهٗ۔ کسی جگہ گیا۔ اَتٰى عَلَى الشَّيْءِ: اَنْفَدَهٗ۔ اس کو ختم کیا۔ وَبَلَغَ اٰخِرَهٗ اور اس کے انتہاء تک پہنچا۔ اَتٰى عَلَيْهِ الدَّهْرَ۔ اَهْلَكَهٗ۔ زمانہ نے اسے ہلاک کیا۔ (اقرب)

القواعدُ اَلْقَوَاعِدُ اس کا مفرد اَلْقَاعِدَةُ ہے اور قَوَاعِدُ الْبَيْتِ کے معنے ہیں اَسَاسُهٗ۔ گھر کی بنیادیں۔ (اقرب)

خَرَّ کے لئے دیکھو یوسف آیت نمبر ۱۰۱۔

خَرُّوْا خَرَّ ماضی سے جمع غائب کا صیغہ ہے۔ جس کے معنے ہیں سَقَطَ۔ سُقُوْطًا يُسْمَعُ مِنْهُ خَرِيْرٌ۔ ایسے طور پر گرنا کہ اس سے آواز سنائی دے۔ وَالْخَرِيْرُ يُقَالُ لِصَوْتِ الْمَاءِ وَالرِّيْحِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ مِمَّا يَسْقُطُ مِنْ عُلُوٍّ۔ (مفردات) اور خریر اس آواز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے اوپر سے گرنے یا ہوا اور پانی کے چلنے سے پیدا ہو۔

تفسیر۔ فرمایا اس طرح اشتعال دلا کر اور دھوکا دے کر لوگوں کو نبیوں کی تعلیم سے ناواقف رکھنا کوئی نئی بات نہیں۔ بلکہ پہلے انبیاء کے زمانہ میں بھی ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ مگر ان تدبیروں سے کبھی بھی نبیوں کے دشمن کامیاب نہیں ہوئے۔ یہ تدابیر آخر اُلٹ کر انہی پر پڑتی رہی ہیں۔

آنحضرتؐ پر پہلوں کی نقل کرنے کے اعتراض کا جواب یہ طریق کلام کیسا لطیف ہے۔ دشمنان اسلام

کا یہ اعتراض پہلے بیان ہوا ہے کہ یہ مدعی کوئی نئی تعلیم تو نہیں لایا۔ پہلے لوگوں کی باتوں کو نقل کر رہا ہے۔ اس آیت میں ان کا اعتراض انہی کے متعلق دُہرا دیا اور فرمایا کہ یہ سچ ہے کہ یہ نبی بہت سی باتیں وہ بیان کرتا ہے جو پہلے نبیوں نے بھی کہی ہیں۔ اور تم ان کو نقل کہتے ہو۔ مگر اپنا حال نہیں دیکھتے کہ تم بھی پہلے نبیوں کے دشمنوں کی نقل کر رہے ہو اور ویسی ہی شرارتیں کر رہے ہو جیسی کہ پہلے نبیوں کے دشمن کیا کرتے تھے۔ اگر اس نبی کا کلام پہلے لوگوں کی نقل ہے تو وہ اچھی نقل ہے۔ مگر تمہارے کام بھی نقل ہیں اور بُرے لوگوں کی نقل ہیں۔

نبی کی نقل اور کفار کی نقل میں فرق پس نقل کہہ کر بھی تو تم اعتراض سے نہیں بچ سکتے۔ کیونکہ یہ تو ان کی نقل کرتا ہے جو آخر کامیاب ہوئے اور تم ان کی نقل کر رہے ہو جو آخر ہلاک ہوئے۔ پس اگر دونوں طرف سے نقل ہو رہی ہے تو بھی تم ہی خسارہ میں رہتے ہو۔ کیونکہ تباہ ہونے والوں کی نقل کر رہے ہو۔ چنانچہ ان لوگوں کا حال بتاتا ہے جن کی کفار نقل کر رہے تھے۔ اور فرماتا ہے کہ تمہاری ہی طرح پہلے انبیاء کے دشمن بھی لوگوں کو نبیوں کے خلاف یہ کہہ کر بھڑکایا کرتے تھے کہ یہ نقال ہیں۔ مگر کیا اس اعتراض یا ایسے ہی اور اعتراضوں سے وہ نبیوں کی تعلیم کے پھیلنے میں کوئی کامیاب روک پیدا کر سکے۔ کیا اس طرح وہ نبیوں کے تباہ کرنے میں کامیاب ہو سکے؟ ہرگز نہیں بلکہ وہ خود ہی تباہ ہوئے۔

ائمۃ الکفر کو لوگوں کو دھوکہ دے کر نبیوں کی تعلیم سے ناواقف رکھنے کی سزا پھر ان کے عذاب کی نوعیت بتائی کہ تباہی بھی معمولی تباہی نہ تھی بلکہ اَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ ۔یعنی اللہ تعالیٰ نے ان پر اس طرح عذاب نازل کیا کہ ان کی خود ساختہ عمارتوں کی بنیادوں کو اُکھاڑ پھینکا اور دیواروں کے ساتھ چھتیں بھی گر گئیں۔ یعنی نہ توابع رہے نہ افسر سب ہی ہلاک ہوئے اور وہی دیواریں یعنی توابع جن پر انہیں ناز تھا اس طرح اوندھے منہ گرے کہ اپنے ساتھ اپنے سرداروں کو بھی لے گرے۔ پس عوام الناس پر جو تم کو اثر حاصل ہے اس پر مغرور نہ ہو کہ جب خدا تعالیٰ کا عذاب آتا ہے تو یہ حکومت دھری رہ جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کفار کے سارے نظام کو تباہ کر دیتا ہے اور افسر اور ماتحت سب ہی گرتے ہیں۔ بلکہ توابع ہی سرداروں کی تباہی اور ہلاکت کا موجب ہو جاتے ہیں۔

پھر بتایا کہ یہ عذاب ہمیشہ غیر معمولی طریق سے آتے رہے ہیں۔ حتّٰی کہ ائمہء کفر کو علم بھی نہ ہوتا تھا کہ عذاب آ رہا ہے اور عذاب آ جاتا تھا۔ اور ایسی راہوں سے آتا تھا۔ جن کا انہیں وہم اور گمان تک نہ ہوتا تھا۔

اللہ کے منکروں کے پاس آنے سے مراد عذاب کا آنا ہوتا ہے اَتَى اللّٰهُ۔ اللہ تعالیٰ کے منکروں کے

پاس آنے کے معنے ہمیشہ عذاب کے ہوتے ہیں۔

بہائیوں کا آتیٰ اللّٰہُ سے غلط استدلال اور اس کا جواب بہائیوں نے اسی قسم کی آیات پیش کر کے کہا ہے کہ دیکھو قرآن کریم میں لکھا ہے کہ خدا خود آئے گا۔ اس سے مراد بہاء اللہ کا ظہور ہے۔ حالانکہ یہ معنے قرآنی محاورہ کے سراسر خلاف ہیں۔ جیسا کہ یہ آیت صاف ظاہر کر رہی ہے۔ ہاں اگر بہاء اللہ کو اس زمانہ کے لوگوں کے لئے ایک عذاب سمجھا جائے تو ان کو بھی اللہ کی آمد کا عذابی ظہور ماننے میں ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ دین سے غافلوں کو اور زیادہ غفلت کے سامان پیدا کر کے عذاب دیا کرتا ہے۔

اس آیت میں اہل مکہ کو ان کی عمارت کے انہدام کا انتباہ اس آیت میں اہل مکہ کو گذشتہ واقعات کا حوالہ دے کر ہوشیار کیا گیا ہے کہ اب تمہارا نظام کھوکھلا ہو چکا ہے۔ اب تو وہ خود ہی گرنے کو تیار کھڑا ہے۔ تم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام کو کیا تباہ کرنا ہے تمہارے دیکھتے دیکھتے تمہاری عمارت دیواروں اور چھتوں سمیت زمین پر آ رہے گی۔ تاریخ دان جانتے ہیں کہ فتح مکہ سے پہلے آخری دن تک کفار غالب معلوم ہوتے تھے لیکن یکدم ان کی عمارت پیوند خاک ہوگئی۔

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ

پھر وہ قیامت کے دن (دوبارہ) انہیں رسوا کرے گا اور کہے گا (کہ اب) کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کی وجہ سے

الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا

تم (میرے انبیاء سے) دشمنی (اور مخالفت) رکھتے تھے۔ (اور) جنہیں علم دیا گیا ہوگا وہ (اس وقت) کہیں گے کہ

الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۙ﴿۲۸﴾

آج کافروں پر یقیناً رسوائی اور مصیبت (آنے والی) ہے۔

حل لغات ۔ثُمَّ حرف عطف ہے جو ترتیب اور تراخی کے لئے آتا ہے۔ یعنی یہ ظاہر کرتا ہے کہ معطوف اپنے معطوف علیہ کے بعد ترتیباً اور کچھ دیر بعد واقع ہوا ہے (اردو زبان میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے پھر، تب، بعد ازاں کے الفاظ استعمال کرتے ہیں) اور بعض اوقات ثُمَّ کے آخر میں تاء بھی لے آتے ہیں۔ جیسے

کہ اس شعر میں اِسے لایا گیا ہے۔

وَلَقَدْ اَمُرُّ عَلَى اللَّئِيْمِ يَسُبُّنِيْ
فَمَضَيْتُ ثُمَّتَ قُلْتُ لَا يَعْنِيْنِيْ (اقرب)

يَوْمٌ کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۴۔

اَيَّامٌ يَوْمٌ کی جمع ہے۔ اَلْيَوْمُ مِنْ طُلُوْعِ الْفَجْرِ اِلٰى غُرُوْبِ الشَّمْسِ ۔ دن کا وقت۔ اَلْوَقْتُ مُطْلَقًا۔ مطلق وقت جو بھی اور جتنا بھی ہو (اقرب)

يُخْزِيْهِمْ يُخْزِيْ اَخْزٰى سے مضارع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔اور اَخْزَاهُ کے معنے ہیں اَوْقَعَهُ فِي الْخِزْيِ اَوِ الْخِزَايَةِ وَاَهَانَهٗ۔اس کو کسی ایسی بات میں پھنسایا جس سے اُسے ندامت ہو اور اس طرح سے اُسے ذلیل کیا۔ اَخْزَى اللّٰهُ فُلَانًا کے معنے ہیں فَضَحَهٗ۔اللہ تعالیٰ نے اس کے عیوب کو ظاہر کر دیا۔اور اس طرح وہ رسوا ہو گیا (اقرب) پس يُخْزِيْهِمْ کے معنے ہوں گے ان کے عیوب کو ظاہر کر کے اللہ تعالیٰ انہیں رسوا کرے گا۔

تُشَاقُّوْنَ تُشَاقُّوْنَ شَاقَّ سے مضارع جمع مذکر مخاطب کا صیغہ ہے اور شَاقَّهٗ کے معنے ہیں خَالَفَهٗ۔اس سے ناموافقت کی۔عَادَاهُ۔اس سے دشمنی کی (اقرب) پس كُنْتُمْ تُشَاقُّوْنَ کے معنے ہوں گے (۱) تم مخالفت کرتے تھے (۲) تم دشمنی کرتے تھے۔

اَلْخِزْيُ کے اصل معنے ایسی ذات کے ہیں جو لوگوں کے سامنے شرمندگی کا موجب ہو۔مزید تشریح کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۹۹۔

اَلْخِزْيُ اَلْهَوَانُ ذلت۔ ذلیل وحقیر ہونا۔ اَلْعِقَابُ۔سزا۔ اَلْبُعْدُ دوری۔ اَلنَّدَامَةُ شرمندگی، پچھتانا۔ وَاَصْلُ الْخِزْيِ ذِلٌّ يُسْتَحْيٰ مِنْهُ اس کے اصل معنی ایسی ذلت کے ہیں جو لوگوں کے سامنے شرمندگی کا موجب ہو۔(اقرب)

تفسیر ۔ آنحضرتؐ کے مخالفین پر رسوائی اور ہلاکت کے دونوں عذاب بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی انسان پر آفت آتی ہے مگر وہ رسوائی کا موجب نہیں ہوتی ۔اور بعض دفعہ رسوائی تو ہوتی ہے مگر ہلاکت اس کے ساتھ نہیں ہوتی۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں پر جب عذاب آئے گا تو اس میں دونوں باتیں شامل ہوں گی تباہی بھی اور رسوائی بھی۔

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا

(ان پر) جن کی روحوں کوفرشتے (عین) اس وقت کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کررہے ہوتے ہیں نکالتے ہیں۔تو وہ (یہ

السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا

کہہ کر) صلح کی طرح ڈالتے ہیں (کہ) ہم (تو) کوئی بھی برائی (کا کام) نہیں کیا کرتے تھے (سوانہیں کہا جائے گا کہ

كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۹﴾

واقعہ) یوں نہیں بلکہ (اس کے برعکس ہے۔ یادرکھو) جو کچھ تم کرتے تھے اُسے اللہ (تعالیٰ) یقیناً خوب جانتا ہے

حل لغات۔ السَّلَمُ اَلْاِسْمُ مِنَ التَّسْلِيْمِ بِمَعْنَى السَّلَام۔ باب تفعیل سے اسم مصدر ہے اور اس کے معنے وہی ہیں جو سلام کے ہیں یعنی سلامتی۔ صلح۔ نیز اس کے معنے ہیں۔ اَلْاِسْتِسْلَامُ۔ تابعداری۔ فرمانبرداری۔(اقرب)

بَلٰى جَوَابٌ لِلتَّحْقِيْقِ تُوْجِبُ مَا يُقَالُ لَكَ لِاَنَّهَا تَرْكٌ لِلنَّفْيِ فَاِذَا قُلْتَ لِزَيْدٍ لَيْسَ عِنْدَكَ كِتَابٌ فَقَالَ بَلٰى لَزِمَهُ الْكِتٰبُ وَاِنْ قَالَ نَعَمْ فَلَا يَلْزَمُهُ۔ یعنی یہ نفی کے بعد آتا ہے۔ لیکن معنوں کو مثبت کر دیتا ہے جیسے کوئی کسی کو کہے کہ تیرے پاس کتاب نہیں۔ تو جواب میں وہ بَلٰى کا لفظ کہے۔ تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ کیوں نہیں؟ میرے پاس کتاب ہے۔ لیکن اگر جواب میں نَعَمْ کا لفظ کہے۔ تو معنے ہوں گے کہ میرے پاس کتاب نہیں۔(اقرب)

تفسیر۔ **ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ کہہ کر کفار کو مجرم قرار دیا گیا ہے** اس آیت میں بتایا کہ یہ عذاب ان کفار پر آئے گا جو موت تک کفر پر قائم رہیں گے۔ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ کہہ کر بتایا کہ ایسے لوگوں کی ساری عمر اپنی جانوں پر ظلم کرنے میں گذر جاتی ہے اور وہ سمجھتے یہ رہتے ہیں کہ وہ نبیوں پر ظلم توڑ رہے ہیں۔ گویا ان کی مثال اس درندہ کی سی ہوتی ہے جو پتھر کو چاٹتا ہے اور اس کی زبان سے خون بہنے لگتا ہے۔ مگر خون کی لذت کو پتھر کا مزا سمجھ کر وہ اس کے چاٹنے میں لگا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی ساری زبان ہی گھس جاتی ہے۔

صلح کو سلم کہے جانے کی وجہ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ۔ سَلَمَ کے معنے صلح کے ہیں اور صلح کو سلم اس لئے کہتے ہیں کہ

اس کے ذریعہ سے ہر ایک دوسرے کے شر سے بچ جاتا ہے۔ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ سے یہ مراد ہے کہ وہ یہ دیکھ کر کہ اب تو ہم پکڑے گئے اور بچنے کی کوئی راہ نہیں مصالحانہ باتیں کریں گے۔ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ کے لفظی معنے یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ صلح کی طرح ڈالیں گے۔

مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ میں بتایا گیا ہے کہ وہ اس وقت یہ تو کہہ نہیں سکیں گے کہ ہم نے معبودان باطلہ کی عبادت نہیں کی۔ پس وہ اپنے مشرکانہ اعمال کی اس طرح تشریح کریں گے کہ جو کچھ ہم نے کیا بدی کی نیت سے نہیں کیا بلکہ نیک نیتی سے کیا تھا۔

مَا كُنَّا نَعْمَلُ کے الفاظ میں کفار کی طرف سے اپنے شرک کرنے میں معذرت میرے نزدیک مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ کے معنے یہ نہیں کہ ہم نے کوئی شرک نہیں کیا۔ بلکہ یہ کہ ہمارا فعل جو بھی تھا وہ بدی کی نیت سے نہ تھا۔ اس کا محرک سُوْٓءٍ نہیں تھا۔ بلکہ نیک نیتی سے وہ فعل کیا گیا تھا۔

اس دنیا میں بھی جب مشرک توحید کے دلائل کے سامنے عاجز آ جاتے ہیں تو کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم تو بتوں وغیرہ کو سجدہ خدا سمجھ کر نہیں کرتے۔ بلکہ صرف توجہ کے قیام کے لئے ایسا کرتے ہیں ورنہ عبادت تو ہم اللہ تعالیٰ کی ہی کرتے ہیں۔

بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ میں کفار کی معذرت کا جواب بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ کہہ کر یہ بتلایا ہے کہ یہ تمہارا صرف ڈھکونسلا ہے۔ خدا تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ تم کس نیت اور ارادہ سے معبودان باطلہ کی عبادت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی تلاش سچے دل سے کرتے تو ان کی توجہ کے لئے ان جھوٹے سامانوں کی کیا ضرورت تھی۔ نیز یہ بھی بتایا کہ یہ عذر جھوٹا ہے تم تو فی الواقع مشرک تھے۔

مَا كُنَّا نَعْمَلُ کے ایک اور معنے مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے اپنی سمجھ کے مطابق کوشش کی اور جو کچھ کیا حق سمجھ کر کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ جھوٹ ہے۔ اگر تم نیک نیتی سے یہ کام کرتے تو ہم تم کو ہدایت کیوں نہ دیتے۔ ہمارا تو یہ قانون ہے کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت:۷۰) جو لوگ صحیح طور پر ہماری تلاش کرتے ہیں ہم ان کو ضرور اپنا راستہ دکھاتے ہیں۔ پس اگر تم نیک نیتی سے ہمیں پانے کی کوشش کرتے تو غلط راستہ پر کبھی نہ چلتے۔ ہم خود تم کو ہدایت دیتے۔ پس اس عذر کی وجہ سے تم سزا سے نہیں بچ سکتے۔

فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝۳۰

اس لئے (اب) تم جہنم کے دروازوں میں سے اس میں ہمیشہ کے لئے ٹھکانہ بناتے ہوئے داخل ہو۔ کیونکہ تکبر کرنے والوں کا ٹھکانہ یقیناً بہت بُرا (ہوتا) ہے۔

حل لغات۔ جَهَنَّمُ کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۱۹۔

جَهَنَّمُ دَارُ الْعَقَابِ کا نام ہے۔ یہ ممنوع من الصرف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ لفظ عجمی ہے۔ بعض اسے اصل میں فارسی یا عبرانی قرار دیتے ہیں لیکن یہ درست نہیں کہ عربی کے الفاظ کو غیر زبانوں کی طرف منسوب کیا جائے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ لفظ ایسے قاعدہ سے بنایا گیا ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس وجہ سے اس کو انہوں نے غیر زبان کا قرار دے دیا۔ عربی میں جَهَنَ۔ جُهُوْنًا کے معنے قَرُبَ وَدَنَا کے ہوتے ہیں اور اس سے جَهَنَّمُ بنا ہے یا یہ لفظ جَهَمَ سے بنا ہے۔ عربی زبان میں زیادۃِ نون فی وسط الکلمہ کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ پس جَهَمَ سے جَهَنَّمُ کا بنا خلاف قواعد نہیں اور جَهَمَ کے معنے ہیں اِسْتَقْبَلَهٗ بِوَجْهٍ مُكْفَهِرٍّ۔ کہ اس کو تیوری چڑھا کر ملا اور تَجَهَّمَهٗ کے معنے ہیں اِسْتَقْبَلَهٗ بِوَجْهٍ كَرِيْهٍ برے چہرے سے ملا۔ (اقرب) پس جَهَنَّمُ کے معنے ہوئے ایک ناپسندیدہ جگہ جو ناراضگی سے لینے کو بڑھتی ہے۔ یہ نام اس کے شعلے مارنے کی وجہ سے رکھا گیا۔

بِئْسَ بِئْسَ فعل ذم کہلاتا ہے۔ یعنی جب کسی کی مذمت مقصود ہو۔ اس وقت یہ فعل استعمال کرتے ہیں۔ جس کی مذمت کی جائے اُسے مخصوص بالذّم کہتے ہیں۔ اس کے بعد اس کا فاعل آتا ہے اور پھر مخصوص بالذّم۔ فاعل اور مخصوص بالذم دونوں مرفوع ہوتے ہیں۔ اس کے فاعل کے لئے ضروری ہے کہ لام جنس کے ساتھ مقرون ہو۔ یا مقرون بلام الجنس کی طرف مضاف ہو۔ جیسے بِئْسَ الرَّجُلُ زَيْدٌ اور بِئْسَ غُلَامُ الرَّجُلِ بِكْرٌ۔ اور کبھی اس کا فاعل ظاہراً مقرون باللام نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی جگہ نکرہ منصوب تمیز کے رنگ میں لے آتے ہیں یا مَا نکرہ استعمال کر لیتے ہیں۔ جیسے بِئْسَ رَجُلًا زَيْدٌ اور بِئْسَ مَا زَيْدٌ میں رَجُلًا اور مَا استعمال ہوئے ہیں (اقرب)

مَثْوٰى کے لئے دیکھو یوسف آیت نمبر ۲۲۔

مَثْوًى ثَوَاءٌ میں سے مصدر میمی یا اسم ظرف ہے جس کے معنے ہیں اَلْاِقَامَةُ مَعَ الْاِسْتِقْرَارِ کسی جگہ

رہائش اختیار کرنا ٹھہرنا۔ (مفردات) اَلْمَثْوٰی۔ اَلْمَنْزِلُ۔ اترنے اور ٹھہرنے کی جگہ۔ (اقرب)

تفسیر ۔اس آیت میں پھر اس امر پر زور دیا ہے کہ جو متکبر ہو یعنی حق کو سمجھتا ہو۔لیکن شرارت کی وجہ سے اور اس خیال سے کہ میں کیوں نبی کا متبع ہو کر چھوٹا بنوں حق کا انکار کرنے والا ہو وہ بہت سزا پائے گا۔ بہ نسبت اس کے جو مجرم تو ہے مگر اس کا جرم شرارت سے نہیں بلکہ غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے ہے۔ یہ موجب بھی گو مستحق سزا بناتا ہے مگر تکبر کے موجب سے کم۔ بِئْسَ کے معنی زیادہ برے کے ہوتے ہیں۔ پس اس لفظ سے دونوں قسم کے مجرموں کا فرق بیان کیا گیا ہے۔

وَ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ

اور (جب) ان لوگوں سے جنہوں نے تقویٰ (کا طریق) اختیار کیا ہے کہا گیا (کہ) تمہارے رب نے کیا (شاندار

قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ

کلام) اتارا ہے تو انہوں نے کہا (کہ ہاں) بہترین۔ جنہوں نے نیکوکاری (کی راہ) اختیار کی ان کے لئے اس دنیا

الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَ لَنِعْمَ

(کی زندگی) میں (بھی) بھلائی (مقدر) ہے۔ اور آخرت کا گھر (تو ان کے لئے) اور بھی بہتر ہوگا۔ اور تقویٰ

دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۳۱﴾

اختیار کرنے والوں کا گھر یقیناً بہت (ہی) اچھا ہوتا ہے۔

حلّ لُغَات ۔خَيْرًا اَلْخَيْرُ: وِجْدَانُ الشَّیْءِ عَلٰی كَمَالَاتِهِ اللَّائِقَةِ۔ کسی چیز کا اس کے مناسب کمالات سمیت پائے جانے کا نام خیر ہے۔ وَقِيْلَ حُصُوْلُ الشَّیْءِ لِمَا مِنْ شَأْنِهٖ اَنْ يَّكُوْنَ حَاصِلًا لَهٗ اَیْ يُنَاسِبُهٗ وَيُلِيْقُ بِهٖ۔ اور بعض محققین نے کہا ہے کہ کسی چیز کا ایسے طور پر ہونا کہ اس میں اس کے شایان شان باتیں پائی جائیں خیر کہلاتا ہے۔ اَلْمَالُ مُطْلَقًا۔ مال۔ اَلْكَثِيْرُ الْخَيْرُ۔ خیر اس شخص کو بھی کہتے ہیں جس میں ہر قسم کے کمالات بکثرت پائے جائیں۔ (اقرب)

نِعْمَ نِعْمَ فعل مدح کہلاتا ہے۔ یعنی جب کسی کی تعریف کرنی مقصود ہو تو اس وقت یہ فعل استعمال کیا

جا تا ہے۔ جس کی تعریف کی جائے اسے مخصوص بالمدح کہتے ہیں اس کے فاعل اور مخصوص بالمدح کے وہی احکام ہیں جو پہلے بِئْسَ کے متعلق لکھے جا چکے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ قرآن مجید کے متعلق مومنوں کا نقطہ نگاہ اس آیت میں مومنوں کے نقطہ نگاہ کو ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ قرآن مجید کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اگر کوئی کہے کہ وہ تو مسلمان تھے انہوں نے تو یہ کہنا ہی تھا ان کی گواہی کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ تو ہم کہتے ہیں کہ ان کا یہ قول اس وقت کا ہے جبکہ وہ مکہ میں تھے۔ چاروں طرف سے ان کو تنگ کیا جاتا تھا اور ان کو جان کے لالے پڑ رہے تھے۔ ایسے وقت میں ان کا اس کتاب کو قبول کر لینا اور اس کے متعلق یہ رائے ظاہر کرنا اس کی سچائی کی نہایت زبردست شہادت ہے۔

قَالُوْا خَيْرًا۔ انہوں نے کہا یہ کتاب مناسب کمالات کے ساتھ نازل ہوئی ہے یعنی جو باتیں کسی روحانی کتاب میں چاہئیں وہ سب بتمام وکمال اس میں موجود ہیں۔ یا جیسا خیال تھا کہ ایسی کتاب آنی چاہیے اس سے بھی بہتر اس کو پایا۔

نقطہ نگاہ بدلنے سے عمل میں فرق اَحْسَنُوْا۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ نقطہ نگاہ کے بدلنے سے عمل میں کتنا فرق پڑ جاتا ہے۔ ایک گروہ نے اسے اساطیر الاولین کہا۔ پس اس کے وعید سے نہ ڈرے اور ہلاکت کا شکار ہو گئے۔ اور مومن جنہوں نے اسے خیر سمجھا وہ اس کی پوری اتباع کرنے میں لگ گئے اور آخر خیر والے مقام یعنی جنت میں پہنچ گئے۔ وہ مقام کیسا ہے اس کا ذکر اگلی آیت میں کیا گیا ہے۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

(وہ گھر) دائمی رہائش کے باغات (ہیں) جن میں وہ داخل ہوں گے ان کے اندر نہریں بہتی ہوں گی۔ ان

لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۳۲﴾

(باغوں) میں جو کچھ وہ چاہیں گے انہیں ملے گا۔ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو اللہ (تعالیٰ) اسی طرح جزاء دیا کرتا ہے۔

حلّ لُغات۔ جَنّٰتُ عَدْنٍ کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۲۹۔

جَنّٰتٌ جَنَّۃٌ کی جمع ہے اور اَلْجَنَّۃُ جَنَّ میں سے ہے۔ وَاَصْلُ الْجَنِّ سَتْرُ الشَّیْءِ۔ جَنَّ کے اصل معنے کسی چیز کو ڈھانپنے کے ہیں۔ یُقَالُ جَنَّہُ اللَّیْلُ چنانچہ جَنَّہُ اللَّیْلُ کا محاورہ انہی معنوں میں مستعمل ہے کہ رات نے

اس کو ڈھانپ لیا۔ وَالْجَنَّۃُ کُلُّ بُسْتَانٍ ذِیْ شَجَرٍ یَسْتُرُ بِاَشْجَارِہِ الْاَرْضَ۔ اور جنت ہر اس باغ کو کہتے ہیں جس میں کثرت سے درخت ہوں اور وہ درختوں کے جھنڈ سے زمین کو ڈھانپ لے۔ وَقَدْ تُسَمَّی الْاَشْجَارُ السَّاتِرَۃُ جَنَّۃٌ۔ اور ڈھانپنے اور چھپانے والے یعنی گھنے درختوں کو بھی جَنَّۃٌ کہتے ہیں۔ وَسُمِّیَتِ الْجَنَّۃُ اِمَّا تَشْبِیْھًا بِالْجَنَّۃِ فِی الْاَرْضِ وَاِنْ کَانَ بَیْنَھُمَا بَوْنٌ۔ وَاِمَّا لِسَتْرِہٖ نِعَمَھَا عَنَّا الْمُشَارَ اِلَیْھَا بِقَوْلِہٖ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَھُمْ مِنْ قُرَّۃِ اَعْیُنٍ۔ اور جنت کو اس لئے جنت کے نام سے پکارا گیا ہے کہ یا تو وہ دنیاوی باغات کے مشابہ ہے اگرچہ ان میں اور اس میں بہت فرق ہے یا اس وجہ سے کہ اس کی نعمتیں ہم سے پوشیدہ ہیں جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ میں فرمایا ہے کہ جنت کی نعماء کا کسی کو علم نہیں۔ (مفردات)

عَدَنَ بِالْمَکَانِ عَدْنًا: اَقَامَ بِہٖ۔ عَدَنَ کے معنے ہیں کسی جگہ میں ٹھہرا۔ تَوَطَّنَہٗ۔ اس کو وطن بنایا۔ قِیْلَ وَمِنْہُ جَنَّاتُ عَدْنٍ اَیْ جَنَّاتُ اِقَامَۃٍ لِمَکَانِ الْخُلُوْدِ اور بعض محققین لغت نے کہا ہے وَجَنّٰتُ عَدْنٍ میں عدن اقامت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے کہ رہ پڑنے کے باغات۔ کیونکہ ان میں ہمیشہ رہا جائے گا۔ (اقرب)

تفسیر ۔ یعنی وہ مقام خیر ہمیشہ رہنے والا ہوگا۔ کیونکہ اچھی چیز کو ہمیشہ رکھا جاتا ہے۔

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ کا مطلب تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ۔ یہ نہیں کہ اس کی تہ میں نہریں بہتی ہوں گی۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اس میں بہنے والی نہریں اُسی کے نظام کے ماتحت ہوں گی۔ دنیا میں نہریں اور دریا ضروری نہیں کہ ان لوگوں کے تابع ہوں جن کے ملک یا زمین میں وہ بہتے ہوں۔ جب ایسی صورت ہو تو وہ ان سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ بسا اوقات دریا کئی ملکوں میں سے گذرتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے ملکوں میں جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ پس ان الفاظ سے یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ جنت کی نہریں جنت کے نظام کے کلی طور پر ماتحت ہوں گی اور کوئی دوسرا ان میں شریک نہ ہوگا۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ سے اس مقام کے بےنقص ہونے کی طرف اشارہ ہے جَنّٰتُ عَدْنٍ سے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ وہ ایسا مقام ہے جس میں کوئی نقص نہیں۔ کیونکہ فنا کا موجب نقص ہی ہوتا ہے۔

لَھُمْ فِیْھَا مَا یَشَآءُوْنَ کے دو معنی لَھُمْ فِیْھَا مَا یَشَآءُوْنَ۔ اس کے دو معنے ہو سکتے ہیں (۱) ان کی ہر خواہش پوری کی جائے گی کیونکہ ان کی مشیّت مشیّتِ ایزدی ہوگی۔ گویا مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ (الدھر: ۳۱) کی حالت ہوگی۔ اور ان کے دل میں انہی اشیاء کی خواہش پیدا ہوگی جو ان کو مل سکتی ہوں گی اور مل جائیں گی۔ حرص و آز سے ان کے دل خالی ہوں گے اور حسد کی آگ سے وہ محفوظ ہوں گے اور ہر گندگی سے دل پاک

ہو جائیں گے۔

(۲)ان کو ان جنتوں کے متعلق جن میں وہ رکھے جائیں گے پورا اختیار حاصل ہوگا۔اور ان کے متعلق ان کے دل میں جو خواہش پیدا ہوگی وہ ضرور پوری ہوگی کیونکہ انہیں وہاں پورا اختیار دیا جائے گا۔

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ

(وہ متقی) جن کی روحوں کو فرشتے اس حالت میں کہ وہ پاک نفس ہوں (یہ) کہتے ہوئے قبض کرتے ہیں کہ

عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۳﴾

(اب) تمہارے لئے سلامتی (ہی سلامتی) ہے۔جو کچھ (تم) کرتے تھے اس کے مطابق تم جنت میں داخل ہو جاؤ۔

حل لغات ۔سَلَامٌ سَلَامٌ کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۱۱۔

سَلَامٌ کے کئی معنی ہیں۔اِسْمٌ مِنَ التَّسْلِيْمِ ۔ باب تفعیل سے اسم مصدر ہے اور اس کے معنی سلامتی دینے کے ہیں۔اِنْقِيَادٌ یعنی فرمانبرداری۔سلام خدا کا نام بھی ہے۔کیونکہ وہ تمام عیبوں اور نقصوں سے پاک ہے۔(الحشر ع ۴)

تفسیر ۔یعنی متقی وہ ہوتے ہیں جن کو موت اس وقت کہ وہ طیب النفس ہوتے ہیں آتی ہے۔وہ ہر قسم کے نقصوں سے پاک ہوتے ہیں۔ہر قسم کی خوبیاں۔صفائی۔ترقی اور علوّ ہمت کے جذبات ان میں پائے جاتے ہیں (طیبین کے معنوں کے لئے کلمہ طیبہ کی تفسیر سورۂ ابراہیم رکوع ۴ میں دیکھو)

يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۔یعنی کفار تو خود ڈر کر صلح کی طرح ڈالیں گے اور مومنوں کو فرشتے خود بڑھ کر سلام کہیں گے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ

(اب) یہ (لوگ) اس بات کے سوا کس کا انتظار کر رہے ہیں کہ فرشتے ان کے پاس (آسمانی عذاب لے کر) آئیں یا

رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ

تیرے رب کا (فیصلہ کن) حکم آجائے۔ اسی طرح ان لوگوں نے کیا تھا جو ان سے پہلے (زمانوں کے) تھے اور

اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۳۴﴾

اللہ (تعالیٰ) نے ان پر (کوئی) ظلم نہیں کیا تھا بلکہ وہ (خود ہی) اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔

تفسیر۔ کفار پر فردی اور قومی عذاب کے آنے کی طرف اشارہ یعنی یہ کفار اب اپنی مدت گزار چکے ہیں۔ اب تو یہ صرف ان عذابوں کا انتظار کر رہے ہیں جو (۱) فردی طور پر ان پر آنے والے ہیں جیسا کہ اوپر کی آیات سے ظاہر ہے ملائکہ کا آنا فردی عذاب پر دلالت کرتا ہے۔ (۲) اس عذاب کا انتظار کر رہے ہیں جو قومی طور پر ان پر نازل ہوگا۔ اَمْرُ رَبِّكَ سے اسی طرف اشارہ ہے۔

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ۔ یعنی اپنے اعمال سے اپنے آپ کو عذاب کا مستحق بنانے کا فعل پہلے کفار بھی کرتے رہے ہیں۔ یہ بھی ویسا ہی کر رہے ہیں۔ مگر اس کا نقصان انہی کی جانوں کو پہنچے گا۔ نبی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ

پس ان کے عملوں کی سزا نے انہیں آ پکڑا۔ اور جس (عذاب کی خبر) پر وہ ہنسی کیا کرتے تھے اس نے انہیں گھیر لیا

يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۵﴾ ع

(اور تباہ کر دیا)۔

حل لغات۔ حَاقَ بِهِمْ حَاقَ بِهٖ کے معنے ہیں اَحَاطَ بِهٖ کسی چیز کا احاطہ کر لیا۔ (اقرب)

يَسْتَهْزِءُوْنَ يَسْتَهْزِءُوْنَ اِسْتَهْزَأَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے مزید تشریح کے لئے دیکھیں سورۂ رعد آیت نمبر ۳۳۔

اُسْتُھْزِئَ اِسْتَھْزَأَ سے مجہول کا صیغہ ہے اور اِسْتَھْزَأَ ھَزَأَ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنے ہیں سَخِرَ مِنْہُ اس سے ٹھٹھا کیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا میں عذاب الٰہی کی فلاسفی بیان کی گئی ہے سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا سے مراد عمل کے بدنتائج ہیں اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالمانہ عذاب نہیں دیتا۔ بلکہ کافر خود اپنی سزا اپنے عمل سے پیدا کرتا ہے۔ عذاب الٰہی کوئی بیرونی چیز نہیں بلکہ بدعمل انسان کے عمل کا طبعی نتیجہ ہے۔ اس میں عذاب الٰہی کی فلاسفی بیان کی گئی ہے۔ یہی عذاب ہے جس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ وہ عذاب جو طبعی نتائج کی قسم سے نہیں ہوتا بسا اوقات قابل اعتراض ہو جاتا ہے جیسے بعض دفعہ دنیاوی مجسٹریٹ مجرم کو سزا دیتا ہے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ اس نے جرم سے زیادہ سزا دے دی ہے۔ مگر بدپرہیزی سے جو بیماری پیدا ہوتی ہے اس کی نسبت کوئی نہیں کہتا کہ وہ بدپرہیزی کی مناسب سزا نہیں۔ کیونکہ ہر اک جانتا ہے کہ وہ طبعی نتیجہ ہے اور اپنی حد سے بڑھ سکتا ہی نہیں۔

حَاقَ بِھِمْ مَّا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَھْزِءُوْنَ سے بتایا ہے کہ کفار جس قسم کے اعتراض نبیوں پر کرتے ہیں ویسے ہی حالات میں سے انہیں گذرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ انہیں جھوٹا کہتے ہیں تو خود جھوٹ کے الزام کے نیچے آتے ہیں اگر بدکار کہتے ہیں تو خود ان کی بدکاریاں کھولی جاتی ہیں۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِہٖ

اور جن لوگوں نے شرک (کا طریق اختیار) کیا انہوں نے (یہ بھی) کہا ہے کہ اگر اللہ (تعالیٰ یہی) چاہتا (کہ اس

مِنْ شَیْءٍ نَّحْنُ وَ لَآ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِہٖ مِنْ

کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے) تو نہ ہم (ہی) اس کے سوا کسی چیز کی عبادت کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا ایسا

شَیْءٍ ؕ کَذٰلِکَ فَعَلَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ ۚ فَھَلْ عَلَی

کرتے اور نہ (ہی) ہم اس کے (فرمانے کے) بغیر کسی چیز کو (خود بخود) حرام ٹھہراتے جو (لوگ) ان سے پہلے

الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۶﴾

(سچائی کے دشمن) تھے انہوں نے (بھی) ایسا ہی کیا تھا۔ بھلا (کیا یہ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ) رسولوں پر (خدا کا پیغام) پہنچا دینے کے سوا (اور) کیا ذمہ واری ہے۔

تفسیر ۔اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وَ لَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ بیان ہو چکا ہے۔یعنی کفار یہ نہ خیال کریں کہ کج راستے کیوں بنے ہیں۔یہ راستے انہوں نے خود بنائے ہیں اللہ تعالیٰ نے نہیں بنائے۔اللہ تعالیٰ تو جبر سے کام نہیں لیتا اگر لیتا تو ہدایت دیتا۔اب خود کفار کے منہ سے وہی اعتراض نقل کیا گیا ہے۔فرماتا ہے کافر کہتے ہیں اگر اللہ چاہتا تو ہم یا ہمارے باپ دادے شرک نہ کرتے۔پس جب اس نے روکا نہیں تو معلوم ہوا کہ وہ ہمارے شرک کو ناپسند نہیں کرتا۔

قرآنی دلائل سے عاجز آکر کفار کے غیر معقول اعتراضات جو شخص یا جماعت بھی غلط عقائد اختیار کرے اسے دلائل کے سامنے دب کر غیر معقول رویہ ہی اختیار کرنا پڑتا ہے۔اور اس کے مقابلہ کی بنیاد کسی مقررہ اصل پر نہیں ہوتی بلکہ اسے حملہ کے مطابق جگہ بدلنی پڑتی ہے۔رکوع تین کے آخر میں بتایا گیا تھا کہ کفار تنگ آکر کہتے ہیں کہ بڑی اعلیٰ تعلیم لئے پھرتے ہو آخر یہ تعلیم پہلوں کی کتب سے نقل کی ہوئی ہے اور ہے کیا؟ اس کے دو جواب دیئے گئے تھے اول تو یہ کہ یہ اعتراض محض لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے ہے ورنہ اس میں کوئی حقیقت نہیں۔یعنی اگر نقل بھی ہو تو بھی اگر سچی بات ہے تو مانتے کیوں نہیں۔

دوسرا جواب یہ دیا تھا کہ اگر یہ نقل ہے تو تم بھی تو پہلے انبیاء کے مخالفین کی نقل کر رہے ہو۔وہ بھی ایسی ہی باتیں کیا کرتے تھے مگر نہ وہ کامیاب ہو سکے نہ تم کامیاب ہو سکتے ہو۔یہ عملی ثبوت ان کے اعتراضات کے بودا ہونے کا دیا کیونکہ اگر معقول اعتراض ہوتا اور انبیاء کی تعلیم واقع میں محض نقل ہوتی تو دنیا اپنے پہلے مذاہب کو چھوڑ کر انہیں اختیار کیوں کرتی۔اس کے بعد کفار اور مسلمانوں سے جو الگ الگ قسم کے سلوک ہونے والے تھے ان کا ذکر کیا ہے۔

کفار کا اپنے اعتراضوں کو غیر مؤثر پا کر پہلو بدلنا اس کے بعد پھر کفار کے اعتراضوں کی طرف رجوع کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ جب کفار اپنے پہلے اعتراض کا جواب سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ اعتراض مؤثر نہیں ہو سکتا تو وہ پھر پہلو بدلتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ سزا کیوں دینے لگا۔کیا خدا تعالیٰ قادر نہیں۔پھر اگر وہ ہمارے

طریق کو غلط سمجھتا ہے تو ہمیں اور ہمارے باپ دادوں کو اس سے ہٹا کیوں نہیں دیتا اور شرک کی توفیق ہم سے کیوں نہیں چھین لیتا۔ اللہ تعالیٰ اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ اس کا ذریعہ ایک ہی ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ جن انبیاء کو بھیجتا انہیں جبر کرنے کی تلقین کرتا۔ لیکن کافر بھی تو بعض نبیوں کو مانتے ہیں کیا وہ کوئی نبی پیش کر سکتے ہیں جس نے جبر سے کام لیا ہو۔ حالانکہ ان کے مخالفوں کو یہ بھی غلطی پر سمجھتے ہیں۔ پس اگر ان کے مسلّمہ نبیوں (مثلاً حضرت ابراہیم حضرت لوط علیہما السلام) نے جبر سے کام نہیں لیا اور خدا تعالیٰ نے انہیں یہ توفیق نہ دی کہ وہ اپنے مخالفوں کو زبردستی منوا لیتے۔ تو اب اس امر کی کیوں توقع رکھتے ہیں جس طرح ہمیشہ سے انبیاء محض تبلیغ سے کام لیتے آئے ہیں۔ اب بھی اسی طرح ہوگا۔

تعجب ہے اس آیت کی موجودگی میں بعض مسلمان دین میں جبر کو جائز سمجھتے ہیں (مرتد کی سزا اسلامی قانون میں مصنف ابوالاعلیٰ مودودی ص ۵۰) حالانکہ یہ امر قرآن کریم کی متعدد آیات کے خلاف ہے۔

وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ

اور ہم نے یقیناً ہر قوم میں (کوئی نہ کوئی) رسول (یہ حکم دے کر) بھیجا ہے کہ تم اللہ (تعالیٰ) کی عبادت کرو۔ اور حد

اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَ مِنْهُمْ

سے بڑھنے والے سرکش سے کنارہ کش رہو۔ اس پر ان میں سے بعض (تو) ایسے (اچھے ثابت) ہوئے کہ انہیں

مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا

اللہ (تعالیٰ) نے ہدایت دی اور بعض ایسے کہ ان پر ہلاکت واجب ہوگئی۔ پس تم (تمام) ملک میں پھرو اور دیکھو کہ

كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۳۷﴾

(انبیاء کو) جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا تھا۔

حَلّ لُغَات ۔ اِجْتَنِبُوْا اِجْتَنِبُوْا اِجْتَنَبَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اِجْتَنَبَهٗ کے معنے ہیں بَعُدَ عَنْهُ۔ اس سے دور ہو گیا۔ (اقرب)

الطَّاغُوْتَ الطَّاغُوتُ كلُّ مُتَعَدٍّ حد سے بڑھنے والا۔ كُلُّ رأسِ ضَلَالٍ۔ ہر شخص جو گمراہی کا سردار

ہو۔ اَلْکَاھِنُ۔ کاہن۔ اَلشَّیْطَانُ۔ شیطان۔ اَلْاَصْنَامُ۔ بت۔ کُلُّ مَعْبُوْدٍ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔ معبود باطل۔ مَرَدَۃُ اَھْلِ الْکِتٰبِ۔ اہل کتاب میں سے سرکش لوگ۔ اس کی جمع طَوَاغِیْتُ اور طَوَاغٍ آتی ہے (اقرب) الطَّاغُوْتُ: السَّاحِرُ۔ ساحر۔ اَلْمَارِدُ مِنَ الْجِنِّ۔ جنّات میں سے سرکش۔ اَلصَّارِفُ عَنْ طَرِیْقِ الْخَیْرِ۔ نیکی سے روکنے والا۔ (مفردات)

ھَدٰی کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۲۸۔

یَھْدِیْ ھَدٰی سے ہے اور ھَدَاہُ الطَّرِیْقَ وَاِلَیْہِ وَلَہٗ کے معنے ہیں بَیَّنَہٗ لَہٗ وَعَرَّفَہٗ بِہٖ۔ راستہ دکھایا، بتایا اور واضح کیا۔ ھَدٰی فُلَانًا: تَقَدَّمَہٗ اس کے آگے آگے چل کر منزل مقصود تک لے گیا۔ ھَدَاہُ اللّٰہُ اِلَی الْاِیْمَانِ اَرْشَدَہٗ۔ ایمان کی طرف رہنمائی کی۔ (اقرب)

العاقِبۃُ اٰخِرُ کُلِّ شَیْءٍ۔ ہر چیز کا آخر۔ انجام۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں کفار کے اعتراضات کے پانچ جوابات اس آیت میں کفار کے مذکورہ بالا اعتراض کے متعدد جواب دیئے گئے ہیں۔

پہلا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ہم ہر قوم میں رسول مبعوث فرما چکے ہیں۔ اور ان میں سے ہر اک نے توحید کی ہی تعلیم دی ہے۔ پس اگر تمہارا یہ دعویٰ درست ہے کہ خدا تعالیٰ شرک کو بھی کسی حالت میں پسند کر سکتا ہے تو بتاؤ کہ سب کے سب نبی شرک کے خلاف کیوں رہے اور کیوں توحید کی تعلیم دیتے رہے۔ اگر شرک بھی خدا تعالیٰ کی تصدیق کی مہر رکھتا ہے تو کوئی نبی تو شرک کی تعلیم دینے والا بھی آتا۔

دوسرا جواب بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ کے الفاظ میں دیا یعنی اگر جبر ہوتا تو پھر ایک ہی رسول کافی تھا جو ان لوگوں کو جنہیں ہدایت پر چلانا مقصود تھا ہدایت دے دیتا۔ بار بار اور ہر قوم میں نبی بھیجنے کی ضرورت تو تبھی ہوئی جبکہ لوگ بار بار نبیوں کے راستے کو چھوڑ گئے۔ جبر کی صورت میں یہ امر ممکن نہ تھا۔

تیسرا جواب یہ دیا کہ ہر نبی کی تعلیم میں بد صحبت سے بچنے کا حکم موجود ہے اور برے آدمیوں کو نہ ماننے کی تعلیم ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں شیطان کے حملہ سے محفوظ رہنے کا ارشاد ہے اگر یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو موحد بنا دیا اور بعض کو مشرک۔ اور اس دنیا میں جبر سے ہی کام لیا گیا ہے تو اس تعلیم کے کیا معنے ہوئے۔ اگر ہر اک شخص جس مذہب اور اصل پر ہے خدا تعالیٰ نے ہی اُسے اس مقام پر کھڑا کیا ہے اور اس کا اس میں اختیار نہیں تو نبی بھیج کر ہوشیار کرنے کا فائدہ کیا۔ جو موحد ہے موحد رہے گا اور جو مشرک ہے مشرک ہی رہے گا۔

چوتھا جواب یہ دیا ہے کہ ہر نبی کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے ان کے پیغام کو مان لیا حالانکہ پہلے وہ کافر تھے

اور کچھ نے نہ مانا۔اب اگر یہ درست ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ کسی کو بنادیا بنادیا۔تو ہر نبی کے زمانہ میں ایک جماعت ایمان کیوں لاتی رہی۔اگر خدا تعالیٰ نے انہیں کافر بنادیا تھا تو انہیں ایمان کس طرح نصیب ہوا۔پس ہر نبی کے زمانہ میں کافروں کی ایک جماعت کا مومن بن جانا ایک عملی ثبوت ہے اس امر کا کہ خدا تعالیٰ نے جبراً کسی کو کافر نہیں بنایا۔

پانچواں جواب یہ دیا کہ ہر نبی کے دشمن ہلاک ہوتے چلے آئے ہیں دنیا ان کے نشانوں سے معمور ہے۔علم نہ ہو تو دنیا میں پھر کر دیکھ لو اب اگر تمہارا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہی بعض لوگوں کو کافر یا مشرک بنایا ہے تو وہ لوگ تو مجبور محض تھے انہیں سزا دینا کس طرح جائز ہوسکتا تھا پس ان الٰہی عذابوں سے پتہ چلتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان کو مشرک یا کافر نہ بنایا تھا۔ بلکہ وہ اپنی مرضی سے مشرک یا کافر بنے تھے۔

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ

(اے رسول) اگر تو ان (لوگوں) کی ہدایت یابی کی بہت خواہش رکھتا ہے تو (سمجھ لے کہ) جو لوگ (دوسروں کو

يُّضِلُّ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۸﴾

دانستہ) گمراہ کر رہے ہوں انہیں اللہ (تعالیٰ) ہرگز ہدایت نہیں دیتا۔اور نہ ان کا کوئی مددگار ہوتا ہے۔

تفسیر۔اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اتباع سے خطاب اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اتباع سے خطاب ہے کہ تم میں سے ہر اک ان کفار کی ہدایت چاہتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ ہر اک کو ہدایت نہیں دے سکتا۔کیونکہ جس طرح وہ جبر سے کافر مشرک نہیں بناتا جبر سے مومن موحد بھی نہیں بناتا۔کیونکہ اس طرح ایمان کی غرض باطل ہوجاتی ہے یعنی قلبی صفائی پیدا نہیں ہوتی۔پس وہ تم کو بتا دینا چاہتا ہے کہ جو دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں انہیں وہ جبر سے ہدایت نہ دے گا۔بلکہ ان کے مددگاروں کے سلسلہ کو بھی کاٹ دے گا۔

لفظ حرص کا استعمال اور اس کے معنے اس آیت میں حرص کا لفظ استعمال ہوا ہے۔اس سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔حرص کے معنے اردو میں برے ہوتے ہیں لیکن عربی میں صرف شدید خواہش کے ہوتے ہیں اور یہ اپنے استعمال کے موقعہ کے لحاظ سے اچھے اور برے دونوں معنے دیتا ہے۔اگر برے کام کے لئے اس لفظ کو استعمال

کیا جائے تو اس کے معنے برے ہوتے ہیں۔اور اگر اچھے کام کے لئے اس لفظ کا استعمال ہو تو اس کے معنی اچھے ہوتے ہیں گویا یہ لفظ ذاتی معنے کوئی نہیں رکھتا۔اس نسبت کے مطابق اس کے معنے ہوتے ہیں جو جملہ میں اسے حاصل ہوتی ہے۔یہاں چونکہ خیر خواہی کے مفہوم میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔اس لئے اس کے معنے اس جگہ اچھے ہیں۔

یُضِلُّ میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں بلکہ مَنْ کی طرف ہے فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ۔اس میں یُضِلُّ کی ضمیر خدا تعالیٰ کی طرف نہیں پھرتی اور یہ معنے نہیں کہ جس کو خدا تعالیٰ گمراہ کرتا ہے اسے ہدایت نہیں دیتا کیونکہ اسی مضمون کو تو پہلی آیت میں رد کیا گیا ہے۔پس ضمیر مَنْ کی طرف پھرتی ہے۔اور مراد یہ ہے کہ جو دوسروں کو گمراہ کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا۔

اس جملہ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ہدایت تو توجہ سے ملتی ہے جو دوسروں کو گمراہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں اپنے لئے ہدایت کے کب طلب گار ہو سکتے ہیں اور جب دل میں تبدیلی نہ ہو تو ہدایت کس طرح ملے۔

مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ۔اس سے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ نصرت تو انسان کو ہدایت کے معاملہ میں سوائے خدا کے کوئی دیتا ہی نہیں۔مگر یہ لوگ ہدایت کے ذریعہ کو بند کر چکے ہیں۔

اگر یہ سمجھیں کہ ان کو خود بخود ہدایت ہو جائے گی تو یہ غلط بات ہے۔ان کی اصلاح محض اس طرح ہو سکتی تھی کہ یہ اسلام کو قبول کرتے۔مگر یہ لوگ تو بتوں کو ہدایت کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اس لئے ان کی ہدایت مشکل ہے۔اور جب یہ خدا تعالیٰ سے منہ موڑ کر جھوٹے معبودوں کی طرف متوجہ ہیں۔تو خدا تعالیٰ تو ان کی مدد کرے گا نہیں۔باقی رہے ان کے معبود وہ ان کی مدد کر ہی نہیں سکتے۔پس ان کا کوئی بھی مددگار نہ ہوگا۔

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ؕ

اور انہوں نے اللہ (تعالیٰ) کی بڑی زوردار قسمیں کھائی ہیں (کہ) جو مر جائے اللہ (تعالیٰ) اُسے (پھر) زندہ نہیں

بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۳۹﴾

کرے گا (مگر حقیقت) یوں نہیں یہ (تو ایک ایسا) وعدہ ہے جس (کے پورا کرنے) کا وہ ذمہ وار ہے۔لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔

حل لغات۔جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ جَهَدَ فِي الْاَمْرِ (يَجْهَدُ جَهْدًا) کے معنے ہیں جَدَّ وَتَعِبَ فِيْهِ۔کسی

معاملہ میں خوب محنت اور کوشش سے کام لیا۔ جَھَدَ دَابَّتَہٗ: بلغ جَھْدَھَا وحَمَّلَھَا فَوْقَ طَاقَتِھَا ۔ جانور پر بہت بھاری بوجھ لادا۔ اَلْجَھْدُ مصدر ہے نیز اس کے معنے ہیں اَلطَّاقَۃُ ۔ طاقت ۔ یُقَالُ ''اَفْرَغَ جَھْدَہٗ'' اَیْ طَاقَتَہٗ چنانچہ اَفْرَغَ جَھْدَہٗ کا فقرہ بول کر جھد سے مراد طاقت لیتے ہیں۔ اَلْمَشَقَّۃُ ۔ مشقت (اقرب) اَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ جَھْدَ اَیْمَانِھِمْ ۔ اَیْ بَالَغُوْا فِی الْیَمِیْنِ وَاجْتَھَدُوْا یعنی انہوں نے بڑی زوردار قسمیں کھائیں۔ (اقرب)

لَا یَبْعَثُ بَعَثَ سے مضارع یَبْعَثُ آتا ہے اور لَا یَبْعَثُ مضارع منفی ہے۔ بعث کی تشریح کے لئے دیکھو حجر آیت نمبر ۳۷۔

یُبْعَثُوْنَ بَعَثَ سے جمع مذکر غائب مجہول کا صیغہ ہے۔ اور بَعَثَہٗ (یَبْعَثُ بَعْثًا) کے معنے ہیں اَرْسَلَہٗ اس کو بھیجا۔ بَعَثَہٗ بَعْثًا: اَثَارَہٗ وَھَیَّجَہٗ۔ اس کو اُٹھایا اور جوش دلایا۔ بَعَثَ اللّٰہُ الْمَوْتٰی: اَحْیَاھُمْ اللہ نے مردوں کو زندہ کیا۔ بَعَثَہٗ عَلَی الشَّیْءِ: حَمَلَہٗ عَلٰی فِعْلِہٖ۔ اس کو کسی کام کے کرنے پر اُکسایا۔ اَلْبَعْثُ: النَّشْرُ اُٹھانا۔ (اقرب)

تفسیر ۔ کفار کا دلائل سے عاجز آکر قسمیں کھانا فرمایا یہ لوگ جب دلائل سے عاجز آجاتے ہیں تو قسمیں کھانے لگتے ہیں کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں تا کہ اپنے اتباع کو عذاب سے محفوظ رہنے کا یقین دلائیں۔ اور سچ کی جستجو سے غافل کردیں۔

کفار کی قسمیں کھانے کی وجہ اس جگہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کفار قسمیں کیوں کھاتے ہیں ایسی قسموں کا کیا فائدہ تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض لوگ کمزور طبیعت کے ہوتے ہیں وہ خود فیصلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

آئمۃ الکفر کا قسمیں کھا کر عوام کو ان کے سابق عقیدہ پر قائم رکھنا جب سچے مذہب کے دلائل سن کر ان کے دل متذبذب ہوجاتے ہیں تو ان کے سردار اور لیڈر قسمیں کھا کھا کر انہیں اپنے سابق عقیدہ پر پکا رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور چونکہ ان لوگوں میں عزم نہیں ہوتا۔ کچھ ان میں سے ان قسموں سے مرعوب ہوکر پھر اپنے پرانے خیالات کی طرف عود کرجاتے ہیں۔ پس یہ بھی لوگوں کو ہدایت سے محروم کرنے کا ایک ذریعہ ہے جو کفار کے سردار ہمیشہ سے استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ عوام الناس اس امر کو نہیں سمجھتے کہ قسم تو اس شخص کی قابل اعتبار ہوتی ہے جو نیک ہو اور صرف مزید زور دینے کے لئے ہوتی ہے۔ ورنہ جھوٹے لوگ جس طرح بغیر قسم کے جھوٹ بولتے ہیں قسم کے ساتھ بھی جھوٹ بولتے ہیں۔ یا پھر قسم شہادت کا فائدہ دیتی ہے یعنی جن امور میں اللہ تعالیٰ نے جھوٹی قسم پر اس دنیا میں گرفت کرنے کا فیصلہ کیا ہو۔ ان کے متعلق جھوٹی قسم کھانے والا اگر عذاب سے محفوظ رہے تو یہ اس کے

سچے ہونے کا ثبوت ہوتا ہے۔ ورنہ ہر قسم کی نہ اس دنیا میں سزا ملتی ہے نہ وہ کوئی دلیل ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عدالت دینی میں جھوٹی قسم کھانے والے سزا پاتے ہیں۔ یعنی ہر اک کو اس دنیا میں سزا نہیں ملتی۔

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يَخْتَلِفُونَ فِيهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ

(یہ دوبارہ زندگی اس لئے ہوگی کہ) تا وہ ان پر اس (حقیقت) کو ظاہر کرے جس میں وہ (آج) اختلاف کر رہے

كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كَاذِبِينَ ﴿۴۰﴾

ہیں اور تا جن لوگوں نے کفر (کا طریق) اختیار کیا ہے انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ جھوٹے تھے۔

تفسیر۔ بعث بعد الموت کی ضرورت اس میں اوپر کے مضمون کی دلیل بیان فرمائی گئی ہے اور وہ یہ کہ حشر بعد الموت مذہبی امور میں یقین پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس دنیا میں تو اختلاف کبھی مٹتا نہیں۔ ہمیشہ ہی بعض لوگ مدعیان نبوت کے منکر ہوتے ہیں اور بعض مومن۔ اگر اسی دنیا تک انسانی زندگی ختم ہو جائے تو اول تو نبی کے دعویٰ کے متعلق کامل انکشاف نہ ہو اور اس کا امر مشتبہ رہے دوسرے وہ طبقہ جو منکر ہے وہ ہمیشہ کے لئے ہدایت سے محروم رہ جائے اور یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے۔

اختلاف کو دور کرنے اور منکرین کے عبد بنائے جانے کے لئے بعث بعد الموت ضروری ہے

اس نے تو سب انسانوں کو عبد بننے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اگر اسی دنیا میں انسانی زندگی ختم ہو جائے تو پھر منکر کبھی عبد نہیں بن سکتے۔ اس لئے ضرور ہے کہ ایک اور زندگی انسان کو ملے۔ جس میں حقیقت واضح کر دی جائے تا سب لوگوں پر حقیقت کھل جائے اور جو اس دنیا میں حق کے سمجھنے سے محروم رہے ہیں اس دنیا میں حق کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔

تبیین کے لئے بعث بعد الموت کی ضرورت پر اعتراض اور اس کا جواب اس آیت پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبیوں اور آسمانی کتب کی نسبت بھی فرماتا ہے کہ وہ تبیین کرتی ہیں پس جب تبیین یہاں ہو جاتی ہے تو اس کے کیا معنے ہوئے کہ بعث بعد الموت کی اس لئے ضرورت ہے کہ جن امور میں اختلاف ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ تبیین کر دے۔ اس دنیا میں تبیین کا دعویٰ خود اسی سورۃ میں کیا گیا ہے فرماتا ہے وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (النحل: ۶۵) یعنی ہم نے تجھ پر یہ کامل کتاب صرف اس لئے اتاری ہے

کہ جس بارہ میں یہ لوگ اختلاف کرتے ہیں اس کے متعلق تو انہیں حقیقت کھول کر سنا دے۔ پس سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اس دنیا میں حقیقت کھول دی گئی تو اگلے جہان کی ضرورت نہ رہی۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس دنیا کے متعلق جب تبیین کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنے عقلی طور پر اور دلائل سے حقیقت کے کھول دینے کے ہوتے ہیں اور ایسی تبیین صرف ان لوگوں کے لئے کافی ہوتی ہے جو حق کے متلاشی ہوتے ہیں۔ مگر جو لوگ حق کے متلاشی نہ ہوں ان کے لئے یہ تبیین مفید نہیں ہوتی۔ پس ان کے لئے ایسی تبیین کی ضرورت ہے جو اس قدر واضح ہو کہ اس کے بعد انکار کی گنجائش نہ رہے۔ اور بہانہ سازی کا موقعہ ہی باقی نہ رہے۔ یہ تبیین اس دنیا میں نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ایسی تبیین کے بعد اعلیٰ ایمان نصیب نہیں ہو سکتا۔ جس طرح سورج کو سورج ماننا کوئی اعلیٰ خوبی نہیں۔ اسی طرح ایسے اظہار حق کے بعد ایمان کے اعلیٰ مقامات حاصل نہیں ہو سکتے۔ پس انسانوں میں سے جو اللہ تعالیٰ کے خاص فضلوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو موقعہ دینے کے لئے نبیوں والی تبیین تو اس دنیا میں ہو جاتی ہے اور سب بنی نوع انسان پر صداقت ظاہر کرنے کے لئے وہ تبیین جس کا ذکر اس آیت میں ہے اگلے جہان میں ہوتی ہے۔ ایسی تبیین کے بعد ایمان خاص نفع نہیں دیتا۔ ہاں کفار کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ سزا بھگتنے کے بعد خدا تعالیٰ کی بخشش کو حاصل کر لیں۔

غرض اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ وہ تبیین جو سب کو ایمان دے دے اس دنیا میں ہو نہیں سکتی۔ پس ایک اور جہان کی ضرورت ہے جہاں اس تبیین کو اللہ تعالیٰ ظاہر فرمائے۔

ایسی تبیین جس کا کوئی انکار نہ کر سکے بعث بعد الموت کے وقت ہوگی وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اس جملہ سے پہلی دلیل کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس جگہ جس تبیین کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ وہ ایسی تبیین ہے جس کے بعد کافر انکار کر ہی نہیں سکتا۔ اور اپنے جھوٹے ہونے کا اسے یقین ہو جاتا ہے نہ کہ عام تبیین جس کا ذکر دوسری آیات میں کیا گیا ہے۔

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَاۤ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ

ہمارا قول کسی (ایسی) چیز کے متعلق جس (کے پورا کرنے) کا ہم ارادہ کریں صرف یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کے متعلق کہہ

فَيَكُوْنُ ع ﴿۴۱﴾

دیتے ہیں کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔

تفسیر۔ قیامت کے انکار کی وجہ فرمایا ایک وجہ قیامت کے انکار کی یہ ہے کہ لوگ اسے ناممکن

سمجھتے ہیں۔حالانکہ اس دنیا میں جو ہماری طاقت کا اظہار ہو رہا ہے۔اس سے وہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ہمارے لئے کوئی بات انہونی نہیں۔ہم تو جب کسی امر کے متعلق کہتے ہیں کہ ایسا ہو جائے ویسا ہی ہو جایا کرتا ہے۔پھر قیامت پر کیوں شک ہے۔

پیشگوئیوں کو قیامت کے لئے بطور دلیل بیان کیا گیا ہے اس جگہ ان پیشگوئیوں کو قیامت کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے جو اس دنیا میں نبی کرتے ہیں اور باوجود حالات کے خلاف ہونے کے وہ پوری ہوتی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے قادر ہونے کو ثابت کر دیتی ہیں۔فرماتا ہے ان پیشگوئیوں پر قیاس کر کے تم قیامت کے امکان کو بھی سمجھ سکتے ہو۔

لفظ کُنْ سے مراد کُنْ۔بعض لوگوں کو اس آیت کے بارہ میں یہ شبہ پیدا ہوا کرتا ہے کہ کُنْ کہنے سے کیا مراد ہے وہ کہتے ہیں کہ جب کوئی چیز موجود ہی نہ تھی تو پھر حکم کس کو دے دیا۔

لفظ کُنْ سے آریہ اصحاب کا غلط استدلال آریہ لوگ کہتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کوئی مادہ موجود تھا تبھی تو اللہ تعالیٰ نے اس پر حکومت کی۔جو چیز ہے ہی نہیں وہ اسے حکم کس طرح دے سکتا ہے (ستیارتھ پرکاش اردو ترجمہ باب ۱۴ ص ۶۹۰)۔مگر یہ استدلال ان کا غلط ہے کیونکہ اس آیت کا وہ ترجمہ جس پر اعتراض کیا جاتا ہے یہ ہے ''جب ہم ارادہ کرتے ہیں اس چیز کا جس کے متعلق ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہو جائے۔اس کے متعلق کہتے ہیں کہ ہو جا۔پس وہ ہو جاتی ہے''۔ظاہر ہے کہ ان الفاظ پر اوپر کا اعتراض اس صورت میں بھی کہ مادہ کو پہلے سے موجود مانا جائے وارد ہوتا ہے۔کیونکہ خواہ پہلے سے موجود مادہ سے ہی کسی چیز کو بنایا جائے جب تک اس کی وہ نئی صورت نہ بنے جسے بنانے کا ارادہ کیا گیا ہو اسے کوئی حکم نہیں دیا جا سکتا۔

غرض آریوں کا اس آیت سے اپنے حق میں استدلال بالکل باطل ہے کیونکہ مادہ کو موجود ماننے کی صورت میں بھی وہی اعتراض باقی رہتا ہے جسے وہ دور کرنا چاہتے ہیں جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ آیت کے وہ معنے ہی نہیں جو اوپر کئے گئے ہیں۔بلکہ آیت کے معنے ہی کچھ اور ہیں۔

آنحضرتؐ کا ایک واقعہ میں لفظ کُنْ کا استعمال وہ صحیح معنے کیا ہیں؟ اسے سمجھنے کے لئے کُنْ کے معنوں کو پہلے صاف کر لینا ضروری ہے کُنْ کے عربی زبان میں کئی معنے ہوتے ہیں جن میں سے ایک معنے ''ایسا ہو جائے'' کے ہیں۔اس کا ثبوت مندرجہ ذیل واقعہ سے ملتا ہے۔تاریخ میں آتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تبوک کو روانہ ہو گئے۔تو بعض صحابہؓ پیچھے رہ گئے۔ان میں سے ایک ابوخیثمہ بھی تھے۔یہ بہت نیک تھے۔ان کا

خیال بھی نہ تھا کہ پیچھے رہیں۔مگر جب جنگ کے لئے باہر نکلنے کا حکم ہوا تو اس وقت وہ گھر پر موجود نہ تھے۔ جب وہ گھر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی بیوی ان کے انتظار میں بیٹھی ہے جیسے کوئی باتیں کرنے کی خواہش رکھتا ہو۔ انہوں نے بیوی کی اس خواہش کو نظر انداز کرتے ہوئے بیوی سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے ہیں۔ان کی بیوی نے کہا کہ ذرا بیٹھ تو جاؤ۔انہوں نے جواب دیا کہ خدا کا رسول تو جنگ کے لئے روانہ ہو جائے اور میں گھر میں آرام کروں۔ابوخیثمہ سے ایسا نہیں ہوسکتا۔اور اسی وقت نکل کر گھوڑے کو تیار کیا اور اس پر سوار ہو کر اس راستہ پر چل پڑے جس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تھے۔آخر مارا مار سفر کر کے کئی منزلوں کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شامل ہو گئے۔ جب یہ لشکر کے قریب پہنچے تو بعض صحابہ نے دور سے گرد اُٹھتی ہوئی دیکھی اور خیال دوڑانے لگے کہ یہ کون آرہا ہے۔اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کُنۡ اَبَاخَیۡثَمَۃَ۔ابوخیثمہ ہو جا۔اب اس فقرہ کا یہ مطلب تو ہو نہیں سکتا۔کہ آنے والا کوئی بھی ہو وہ ابوخیثمہ بن جائے پس اس کے معنے یہی ہیں کہ میری خواہش ہے کہ آنے والا ابوخیثمہ ہو (تاریخ الطبری احداث سنہ ۹ ذکر الخبر عن غزوۃ تبوک) کُنۡ کے یہی معنے اس آیت میں ہیں اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ جب ہم چاہتے ہیں کہ کوئی امر وقوع میں آئے تو ہم خواہش کرتے ہیں کہ وہ امر اس طرح ظہور میں آجائے اور ہمارے اس ارادہ کے بعد اسی طرح ظہور میں آجاتا ہے پس اس جگہ کسی معدوم شئے کو حکم دینے کا سوال ہی نہیں۔ کُن کا لفظ صرف آئندہ وقوع کی خواہش پر دلالت کرتا ہے۔

آیت کا مطلب غرض اس آیت کا صرف یہ مطلب ہے کہ جب ہم چاہتے ہیں کہ کوئی امر ہو جائے تو ہم اس قسم کی چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں اور جس طرح ہم ارادہ کرتے ہیں اسی طرح واقعہ ہو جاتا ہے۔

وَالَّذِيۡنَ هَاجَرُوۡا فِى اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا لَـنُبَوِّئَنَّهُمۡ

اور جن لوگوں نے اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا گیا اللہ (تعالیٰ) کے لئے ہجرت اختیار کی (ہمیں اپنی ذات کی قسم ہے

فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً‌ ؕ وَلَاَجۡرُ الۡاٰخِرَةِ اَكۡبَرُ‌ ۘ لَوۡ كَانُوۡا

کہ) ہم انہیں ضرور ہی دنیا میں اچھی جگہ دیں گے۔اور آخرت کا اجر (تو) اور بھی بڑا ہوگا۔کاش یہ (منکر اس

يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾

حقیقت کو) جانتے۔

حَلِّ لُغَات ۔لَنُبَوِّئَنَّهُمْ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ بَوَّأَ سے مضارع متکلم کا صیغہ ہے اور بَوَّأَهٗ اور بَوَّأَ لَهٗ مَنْزِلًا کے معنے ہیں: هَيَّأَهٗ وَمَكَّنَ لَهٗ فِيْهِ۔اس نے اس کے رہنے کے لئے مکان تیار کیا (اقرب) پس لَنُبَوِّئَنَّهُمْ کے معنے ہوئے۔ہم ضرور ان کے لئے جگہ بنائیں گے۔

تفسیر ۔اس رکوع میں پچھلی آیت کُنْ فَیَکُوْنُ کا ثبوت دیا ہے کہ دیکھ لو تھوڑی سی جماعت ہے تم نے ان پر ایسے ظلم کئے ہیں کہ ان کو ملک چھوڑنا پڑا۔پس ایسے لوگوں کو ہم دنیا میں اچھی سے اچھی جگہ دیں گے اور یہ ہو کر رہے گا۔

فِی اللہِ میں لفظ فِی کے تین معانی فِی اللہِ اس کے معنے کئی طرح ہو سکتے ہیں (۱) فِی بمعنی لام ہو۔اس صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ انہوں نے اللہ کی خاطر ہجرت کی۔اس کے سوا کوئی اور مقصد ان کا نہ تھا۔

حدیث میں آیا ہے کہ ہجرتیں کئی قسم کی ہوتی ہیں۔کوئی انسان بیوی کی خاطر ہجرت کرتا ہے کوئی مال کی خاطر۔کوئی خدا کی خاطر (بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی الیٰ رسول اللہ)۔تو فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو صرف خدا تعالیٰ کی خاطر ہجرت کر رہے ہیں۔آج دشمن اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے روپے کی خاطر لڑائیاں کیں۔عالم الغیب خدا جو جانتا تھا کہ ایسے اعتراض اس کے پاک بندوں پر کئے جائیں گے اس نے لڑائیوں کے شروع ہونے سے بھی پہلے اس اعتراض کا جواب دے دیا۔

(۲) اس میں مضاف کو مقدر سمجھا جائے اور عبارت یوں سمجھی جائے فِیْ دِیْنِ اللہِ یعنی وہ اللہ کے دین کی خاطر ہجرت کرتے ہیں۔یعنی ان کی ہجرت اس غرض سے ہے کہ مکہ میں تو دین کا کام کرنے کی آزادی نہیں۔پس ترک وطن کر کے ایسی جگہ چلے جائیں جہاں دین کی خدمت کرنے کی آزادی ہو۔

(۳) فِیْ کے وہی معنے لئے جائیں جو زیادہ معروف ہیں۔اس صورت میں ان الفاظ کا یہ مطلب ہوگا کہ انہوں نے اللہ میں ہو کر ہجرت کی۔یعنی کلی طور پر اللہ تعالیٰ کو اپنے پر مستولی کر لیا۔اور اس کی صفات کو اختیار کر لیا اور اپنے نفس کو مار کر اپنے ہر اک کام کو خدا تعالیٰ کے لئے کر دیا۔پس گویا ان کا مکہ سے نکلنا چند انسانوں کا نکلنا نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کا مکہ سے نکل جانا تھا۔ان کے جانے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ بھی مکہ والوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

مِنۡۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا یعنی ان کی ہجرت بغیر کسی وجہ کے نہیں۔ بلکہ اس لئے ہے کہ لوگوں نے ان کو وہاں رہنے نہیں دیا اور نکلنے پر مجبور کر دیا۔

مومن کو کفار کے ظلم کے باعث جلدی اپنی جگہ نہیں چھوڑنی چاہیے اس آیت سے استدلال ہوتا ہے کہ مومن کو جلدی ہی اپنی جگہ کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔ بلکہ تبلیغ کرتے رہنا چاہیے جب تک کہ لوگ اس حد تک مجبور نہ کر دیں کہ دین پر عمل وہاں ناممکن ہو جائے۔

لَنُبَوِّئَنَّهُمۡ کے وعدہ کے مطابق صحابہ کی عزت لَنُبَوِّئَنَّهُمۡ فِی الدُّنۡیَا حَسَنَةً ضرور ہی ہم ان کو اسی دنیا میں اس سے بہتر مقام دیں گے چنانچہ اس کے مطابق جہاں بھی مسلمان گئے وہیں ان کو بہتر مقام ملا۔ یہ ذکر اس ہجرت کا ہے جو مدینہ کی طرف حضرت عمرؓ اور بعض اور صحابہؓ نے کی تھی۔ مگر اس سے پہلے یا اس کے بعد جدھر بھی مسلمانوں نے ہجرت کی وہ جگہ ان کے لئے بہتر ہو گئی۔ اگر ہجرت کے آخری انجام کو دیکھا جائے تو اس ہجرت کے نتیجہ میں معمولی تاجر اور اونٹ پالنے والے دنیا کے بادشاہ ہو گئے۔

وَ لَاَجۡرُ الۡاٰخِرَةِ اَكۡبَرُ یعنی اصل مقام تو جزاء کا بعد الموت آئے گا اور وہ انعام بہت بڑا ہو گا۔ مگر ان لوگوں کو سمجھانے کے لئے دنیا میں بھی ہم مسلمانوں کو اعلیٰ مقام عطا فرمائیں گے۔ وَ لَاَجۡرُ الۡاٰخِرَةِ اَكۡبَرُ کے معنے اس مقام سے جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو دنیا میں ملا خوب سمجھ میں آسکتے ہیں۔ ان کو خدا تعالیٰ نے متمدن دنیا کے اکثر حصہ پر حکومت دی۔ جب انعام کا یہ حقیر حصہ تھا تو بڑا حصہ کیا ہو گا اور ہر اک صحابی کیا اجر پا رہا ہو گا۔

اس آیت کا تعلق پہلی آیت سے یہ ہے کہ اس میں بتایا تھا کہ تم قیامت کے منکر اس لئے ہو کہ ایسا ہونا ناممکن ہے لیکن دیکھتے نہیں کہ کس طرح ہم اس دنیا میں حکم دیتے ہیں اور ناممکن باتیں ممکن ہو جاتی ہیں۔ پھر بعث بعد الموت کو تم ہمارے لئے کیوں ناممکن خیال کرتے ہو۔ اب اس دعویٰ کی تائید میں ایک پیشگوئی فرماتا ہے جو یہ ہے کہ مکہ والے تو مسلمانوں کو ذلیل سمجھتے ہیں اور ان کو تکلیف دے کر اس لئے وطن سے نکالنا چاہتے ہیں کہ یہ باہر جا کر بے گھر بے در ہو جائیں اور تکلیف پائیں۔ مگر ہم پیشگوئی کرتے ہیں کہ ان کا باہر نکلنا مفید ہو جائے گا اور اس ہجرت کے نتیجہ میں ان کو دینی ہی نہیں بلکہ دنیوی فوائد بھی پہنچیں گے اور انہیں حکومت مل جائے گی۔ یہ پیشگوئی اس وقت کی گئی تھی جب کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ میں ہی تھے۔ اور مسلمان ایسے کمزور تھے کہ مکہ والے آپ کو قتل کرنے یا گھر سے نکال دینے یا قید کرنے کے منصوبے کر رہے تھے۔ اس کے ایک دو سال کے اندر اس ہجرت کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بادشاہ بنا دیا۔ یہ ایک زبردست نشان ہے ان لوگوں کے لئے جو قیامت کا انکار اس

لئے کرتے ہیں کہ ایسی بات کس طرح ہو سکتی ہے۔ جو خدا عجائبات دکھانے کا عادی ہے اس کی کس قدرت پر انسان تعجب کر سکتا ہے۔

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۳﴾

جو (ظلموں کا نشانہ بن کر بھی) ثابت قدم رہے اور (جو ہمیشہ ہی) اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں

حَلّ لُغَات ۔صَبَرُوْا صَبَرُوْا صَبَرَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ صَبَرَ کی تشریح کے لئے دیکھو سورۂ رعد آیت نمبر ۲۳۔

صَبَرُوْا صَبَرَ سے جمع کا صیغہ ہے اور اَلصَّبْرُ کے معنے ہیں تَرْكُ الشَّكْوٰى مِنْ اَلَمِ الْبَلْوٰى لِغَيْرِ اللّٰهِ لَا اِلَى اللّٰهِ کہ مصیبت کے دکھ کا شکویٰ خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کے پاس نہ کرنا۔ فَاِذَا دَعَا اللّٰهَ الْعَبْدُ فِيْ كَشْفِ الضُّرِّ عَنْهُ لَا يُقْدَحُ فِيْ صَبْرِهٖ۔ اگر بندہ اپنی رفع مصیبت کے لئے خدا تعالیٰ کے پاس فریاد کرے تو اس کے صبر پر اعتراض نہ کیا جائے گا۔ وَقَالَ فِي الْكُلِّيَاتِ الصَّبْرُ فِي الْمُصِيْبَةِ۔ اور کلیات میں لکھا ہے کہ صبر مصیبت کے وقت ہوتا ہے۔ وَصَبَرَ الرَّجُلُ عَلَى الْاَمْرِ نَقِيْضُ جَزِعَ اَيْ جَرُؤَ وَشَجُعَ وَتَجَلَّدَ اور صبر جزع یعنی شکویٰ کرنے اور گھبرانے کے مقابل کا لفظ ہے اور صَبَرَ کے معنے ہوتے ہیں دلیری دکھائی۔ جرأت دکھائی۔ ہمت دکھائی۔ اور صَبَرَ عَنِ الشَّيْءِ کے معنے ہیں اَمْسَكَ عَنْهُ کسی چیز سے رکا رہا۔ اَلدَّابَّةَ حَبَسَهَا بِلَا عَلَفٍ۔ اور صبر کا مفعول دابّۃ ہو تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ جانور کو بغیر چارہ دینے کے روکے رکھا۔ صَبَرْتُ نَفْسِيْ عَلٰى كَذَا کے معنے ہیں میں نے اپنے نفس کو کسی چیز پر قائم رکھا یا کسی چیز سے روکے رکھا۔ چنانچہ انہی معنوں میں صَبَرْتُ عَلٰى مَا اَكْرَهُ وَصَبَرْتُ عَمَّا اُحِبُّ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے کہ تکلیف دہ حالت پر میں نے نفس کو استقلال سے قائم رکھا اور پسندیدہ امور سے نفس کو باز رکھا گویا صبر کے تین معنے ہوئے گناہ سے بچنا اور اپنے نفس کو اس سے روکے رکھنا۔ (۲) نیک اعمال پر استقلال سے قائم رہنا۔ (۳) جزع فزع سے بچنا۔ (اقرب)

يَتَوَكَّلُوْنَ يَتَوَكَّلُوْنَ تَوَكَّلَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے مزید تشریح کے لئے دیکھو یوسف آیت نمبر ۶۸۔

تَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ : اِسْتَسْلَمَ اِلَيْهِ وَاعْتَمَدَ وَوَثِقَ بِهٖ توکل علی اللہ کے معنی ہیں کہ اپنے آپ کو اللہ کے

سپرد کر دیا اور اسی پر بھروسہ و اعتماد کیا۔(اقرب)

تفسیر ۔مراد یہ ہے کہ ھَاجَرُوْا اور ظُلِمُوْا جن لوگوں کی نسبت ہم نے کہا ہے وہ ایسی جماعت ہے کہ اس پر ظلم ہوئے اورانہوں نے صبر کیا اور گھروں سے بے گھر کئے گئے مگر اللہ تعالیٰ پر امید نہ چھوڑی۔

آنحضرتؐ کی ترقی کے متعلق کفار کے خیالات کی تردید اس آیت میں پہلی دو صفات کی گویا مزید تشریح کی گئی ہے مظلوم ہونا خدا تعالیٰ کی مدد کو کھینچتا ہے۔مگر جو مظلوم بھی ہو اور پھر صبر بھی کرے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل کو بہت زیادہ اور بہت جلدی جذب کرتا ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کی خاطر تکلیف اٹھا کر ہجرت کرنا ایک بڑی نیکی ہے۔ مگر اس حالت میں جب کہ سب سامان لٹ جائے اور وطن تک چھوڑنا پڑے دل کو اس یقین سے پُر رکھنا کہ ہم تباہ نہیں ہو سکتے اللہ تعالیٰ ضرور ہماری مدد کرے گا اس سے بھی بڑی نیکی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ

اور ہم تجھ سے پہلے (بھی ہمیشہ) مردوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا کرتے تھے ہم ان کی طرف وحی بھیجتے تھے

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ

اور (اے منکرو) اگر تم (اس حقیقت کو) نہیں جانتے تو اس (اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے) ذکر (کو ماننے) والوں

لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۴﴾

سے (ہی) پوچھ (کر معلوم کر) لو۔

حَلِّ لُغَات ۔الذِّکر اَلذِّکْرُ کے لئے دیکھو یوسف آیت نمبر ۱۰۵۔

اَلذِّکْرُ اَلتَّلَفُّظُ بِالشَّیْءِ وَاِحْضَارُهٗ فِی الذِّهْنِ بِحَیْثُ لَا یَغِیْبُ عَنْهُ۔کسی چیز کا منہ سے ذکر کرنا اور اسے ایسے طور پر مستحضر فی الذہن کرنا کہ وہ بھول نہ جائے۔اَلصِّیْتُ وَمِنْهُ لَهٗ ذِکْرٌ فِی النَّاسِ۔شہرت اور انہی معنوں میں لَهٗ ذِکْرٌ فِی النَّاسِ کا فقرہ بولتے ہیں کہ فلاں شخص کو لوگوں میں شہرت حاصل ہے۔

تفسیر ۔یعنی ان لوگوں کی مخالفت کی بڑی وجہ یہی ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مدعی ہمارے جیسا آدمی ہے اس لئے ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے۔لیکن یہ نہیں جانتے کہ پہلے نبی بھی تو انسانوں جیسے انسان تھے پھر وہ کس طرح

کامیاب ہو گئے۔

فَسۡـَٔلُوۡۤا اَہۡلَ الذِّکۡرِ کہہ کر کفار کو شرمندہ کیا گیا فَسۡـَٔلُوۡۤا اَہۡلَ الذِّکۡرِ اِنۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ کہہ کر کفار کو شرمندہ کیا گیا ہے۔ وہ دعویدار تھے کہ وہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کی اولاد ہیں (سیرۃ النبی لابن ھشام سیاقۃ النسب و لد اسماعیل علیہ السلام) اور ان کے حالات بھی ان کے سامنے تھے کہ کس طرح تکالیف اٹھا کر کامیاب ہوئے۔ پس فرماتا ہے کہ تم تو شائد اپنے بزرگوں کو بھول گئے ہو۔ اگر تم کو ان باتوں کا علم نہیں تو دوسری اقوام سے دریافت کرلو۔

اہل ذکر کے معنی یاد رکھنے والے کے ذکر کے معنے چونکہ یاد رکھنے کے بھی ہیں۔ اہل الذکر سے مراد یاد رکھنے والے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں یوں معنے ہوں گے کہ اگر تم نہیں جانتے اور باپ دادوں کی باتوں کو بھول گئے ہو تو جن کو یاد ہیں ان سے پوچھ لو یعنی مسلمانوں سے۔ یہ پیرایہ کلام نہایت لطیف اور بلیغ ہے۔ کفار یہ طنز سن کر دل میں کٹ ہی مرے ہوں گے۔

نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ کہہ کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ نبی کا شرف فوجوں اور سامانوں سے نہیں ہوتا بلکہ اس کی دولت اس کی وحی ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ سے وہ فتح پاتا ہے۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر کفار خیال کریں کہ اس بے سامان آدمی کے ذریعہ سے مسلمانوں کو حکومت کہاں سے مل جائے گی تو ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ پہلے انبیاء بھی ایسے ہی تھے اور ان کے پاس وحی الٰہی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے دنیا میں بہت بڑے تغیرات پیدا کر دیئے اور اسی دنیا میں ایک حشر برپا کر دیا۔

رِجَالًا کہے جانے کی وجہ یہاں پر رِجَالًا اس لئے فرمایا کہ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ہمارے پر ملائکہ کیوں نازل نہیں ہوتے۔ چنانچہ پہلی سورۃ میں بھی ان کا مطالبہ لَوۡ مَا تَاۡتِیۡنَا بِالۡمَلٰٓئِکَۃِ کے الفاظ میں گذر چکا ہے۔ یہاں ان کے اس خیال کو مدنظر رکھ کر ایک طنز بھی کی ہے۔ اور وہ یہ کہ تم تو فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے ہو پھر وہ ایلچی بن کر تمہارے پاس کیونکر آئیں۔ ایلچی بن کر تو مرد ہی آئیں گے۔

چونکہ ہجرت کے بعد حکومت ملنی تھی اور حکومت کے ساتھ ان لالچیوں کے گروہ نے بھی پیدا ہونا تھا جو اس حکومت کو دنیوی حکومت سمجھ کر اس میں سے حصہ بٹانے کی کوشش کرنے والے تھے جیسے کہ مسیلمہ سجاح وغیرہ نے۔ اس لئے کوئی بعید نہیں کہ اس آیت میں اس آنے والے فتنہ کا بھی سد باب کیا گیا ہو کہ جب لوگوں نے فصاحت پر دعویٰ نبوت کی بنیاد رکھنی تھی اور بعض عورتیں بھی نبوت کا دعویٰ کرنے والی تھیں ان دونوں خیالات کا رد رِجَالًا اور

نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِمۡ کے الفاظ سے کیا گیا۔

بِالۡبَیِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ ؕ وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡكَ الذِّكۡرَ

(ہم نے انہیں) روشن نشانات اور (الہامی) نوشتے دے کر (بھیجا تھا) اور تجھ پر ہم نے یہ (کامل) ذکر نازل کیا ہے

لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡهِمۡ وَ

تاکہ تُو سب لوگوں کو وہ (فرمانِ الٰہی) جو (تیرے ذریعہ سے) ان کی طرف نازل کیا گیا ہے کھول کر بتائے

لَعَلَّهُمۡ یَتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۴۵﴾

اور تاکہ وہ (اس پر) تدبر کریں۔

حَلّ لُغَات ۔بِالۡبَیِّنٰتِ اَلۡبَیِّنَاتُ اَلۡبَیِّنَۃُ کی جمع ہے۔اور اَلۡبَیِّنَۃُ کے معنے ہیں۔اَلدَّلِیۡلُ اَلۡحُجَّۃُ۔دلیل۔(اقرب)

الزُّبُر زَبَرَہٗ (یَزۡبُرُ) زَبۡرًا کے معنے ہیں: رَمَاہُ بِالۡحِجَارَۃِ۔اس کو پتھر مارے۔زَبَرَ الۡکِتَابَ (یَزۡبِرُ۔یَزۡبُرُ): کَتَبَہٗ۔کتاب کو لکھا۔وَزَادَ فِی مُفۡرَدَاتِ الرَّاغِبِ کِتَابَۃً غَلِیۡظَۃً۔اور مفردات میں زَبَرَ کے معنے موٹی قلم یا گہری روشنائی سے لکھنے کے آئے ہیں۔زَبَرَ السَّائِلَ: اِنۡتَهَرَہٗ۔سائل کو ڈانٹا۔زَبَرَعَنِ الۡاَمۡرِ: مَنَعَہٗ وَنَهَاہُ۔کسی کام سے روکا۔اَلزِّبۡرُ کے معنے ہیں۔اَلۡکِتَابُ۔کتاب۔اس کی جمع زُبُوۡرٌ ہے اور الزَّبُوۡرُ کے معنے ہیں اَلۡفِرۡقَۃُ۔حصہ۔اَلۡمِلۡكُ۔ملک۔اَلۡکِتَابُ۔کتاب۔کیونکہ یہ بھی لکھی جاتی ہے۔اس کی جمع زُبُرٌ ہے (اقرب)

تفسیر ۔**اس آیت میں پہلے مضمون کی مزید تشریح** اس آیت میں پہلی آیت کے مضمون کی مزید تشریح کی ہے اور بتایا ہے کہ نبی بیّنات اور زُبر لے کر آتے رہے ہیں۔یعنی نشانات اور احکامِ الٰہی لانا ہی ان کی غرض تھی اور انہی دونوں سامانوں سے ان کی ترقی ہوتی رہی ہے۔

اس جگہ الذِّکۡرَ سے مراد اعلیٰ شرف والی کتاب کے ہیں وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡكَ الذِّكۡرَ کے گو لفظی معنے تو یہی ہیں کہ تجھ پر ہم نے ذکر اتارا ہے۔لیکن چونکہ یہ زُبُر کے مقابل پر ہے جس کے معنے کتاب کے ہیں یعنی اس وحی کے جس کا ماننا فرض ہو۔اس لئے ذکر کے معنے اس جگہ خاص ہو جائیں گے۔کیونکہ جب دو لفظ ایک دوسرے کے مقابل استعمال کئے جائیں تو اگر دونوں لفظ مختلف قسم کی اشیاء پر دلالت نہ کرتے ہوں تو بعد میں آنے والا لفظ یا پہلے سے

اعلیٰ معنے دیتا ہے یا ادنیٰ۔ اس جگہ چونکہ موقعہ اعلیٰ معنوں کے اظہار کا ہے۔ اس لئے الذِّکْرَ کے معنے اعلیٰ شرف والی کتاب کے ہوں گے یا زیادہ مکمل کتاب کے۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ پہلوں کو تو بیّنات اور زُبر ملتے رہے ہیں تجھے بیّنات اور الذکر ملے ہیں جو ان کے انعام سے زیادہ ہے۔ پس اگر تیری کتاب سے ادنیٰ درجہ کی کتب کی مدد سے پہلے انبیاء اپنے دشمنوں کو شکستیں دیتے رہے ہیں تو تُو ان سے اعلیٰ الہام کا مورد ہو کر کیوں اپنے دشمنوں کو شکست نہ دے سکے گا۔ ان معنوں کے رو سے الذِّکْرَ کا الف لام کمال کے معنوں میں لیا جائے گا۔

اس آیت میں ذکر کے دوسرے معنی بھی چسپاں ہوسکتے ہیں اس کے علاوہ ذکر کے جو دوسرے معنے ہیں۔ وہ بھی اس سے مراد ہو سکتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں (۱) دعا (۲) محکم۔ مضبوط (۳) ثناء۔ تعریف (۴) کسی چیز کا اس طرح ذہن میں رکھنا کہ وہ بھول نہ سکے۔

ان معنوں کے رو سے آیت کے معنے ہوں گے کہ ہم نے تجھے جو کتاب دی ہے۔ اس میں خاص خوبی یہ ہے کہ وہ کامل دعاؤں پر مشتمل ہے اور اس وجہ سے وہ خدا تعالیٰ کے خاص فضل جذب کرنے کا موجب ہوگی۔ اور پھر وہ محکم تعلیمات پر مشتمل ہے۔ اس لئے کوئی اعتراض اسے نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ اور پھر وہ ثناء ہے جو لوگ اس سے تعلق رکھیں گے ان کی تعریف کا موجب ہوگی۔ ان کے اخلاق اور اعمال کو ایسا بنا دے گی کہ دنیا ان کی تعریف کرے گی یا یہ کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کامل ثناء ہے اس وجہ سے ماننے والوں کا عرفان بڑھے گا۔ پھر وہ ایسی مقبول ہوگی کہ اُسے بھلایا نہ جائے گا ہر وقت لوگ اس کی تلاوت میں مشغول رہیں گے۔

لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡھِمۡ ۔ لِتُبَیِّنَ کا لام لام تعلیل بھی ہوسکتا ہے اور لام عاقبت بھی۔ لام تعلیل کی صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم نے تجھ پر دوسری کتب سے اعلیٰ خوبیوں والی کتاب اتاری ہے تاکہ تو سب دنیا کو وہ تعلیم سنائے جو ان کے لئے اتاری گئی ہے۔ یعنی تجھ پر اترنے والی تعلیم کا سب سے اعلیٰ ہونا اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کسی ایک قوم یا ایک زمانہ کے لوگوں کے لئے نازل نہیں کیا۔ بلکہ سب لوگوں کے لئے نازل کیا ہے۔ خواہ وہ کسی قوم کے ہوں یا کسی زمانہ کے ہوں۔ لام عاقبت کی صورت میں یہ معنے ہوں گے کہ چونکہ تجھ پر اعلیٰ کتاب نازل ہوئی ہے اس لئے تو اسے مخفی کس طرح رکھ سکتا تھا۔ اس اعلیٰ کتاب کا نزول اس کا باعث ہوا ہے۔ کہ تو سب دنیا کو اس کی طرف بلا رہا ہے۔ ایسی کتاب جس پر نازل ہو وہ خاموش کس طرح رہ سکتا ہے۔

نُزِّلَ اِلَیۡھِمۡ کے الفاظ سے دو باتوں کی طرف اشارہ نُزِّلَ اِلَیۡھِمۡ کہہ کر کفار کے جذباتِ محبت کو ابھارا ہے۔ یعنی گو کتاب تجھ پر نازل ہوئی ہے۔ لیکن چونکہ غرض یہ ہے کہ اس کتاب سے سب دنیا فائدہ اٹھائے اس

لئے درحقیقت یہ نزول ساری دنیا پر ہی ہے۔ پھر یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی اس محبت کی قدر کیوں نہیں کرتے۔

نُزِّلَ اِلَیْهِمْ سے اس امر پر بھی زور دیا گیا ہے کہ اس کتاب کا سب دنیا تک پہنچانا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کا نزول سب دنیا کی طرف ہے اور یہ سب دنیا کا مال ہے۔ پس ان تک اس کا پہنچانا نہایت اہم فرض ہے۔ کاش! مسلمان اس نکتہ کو سمجھتے اور تبلیغ اسلام کے فریضہ کے ادا کرنے میں سستی نہ کرتے۔ تو آج دنیا میں اسلام کے سوا کوئی اور مذہب نظر نہ آتا کیونکہ اس کی پاک تعلیم کے سامنے کوئی اور تعلیم ٹھہر ہی نہیں سکتی۔ آج بے شک اس کی اشاعت میں روک ہے۔ کیونکہ دنیوی حرص و آز اسلام کے قبول کرنے میں روک ہو رہی ہے مگر یہ حالت تو آج پیدا ہوئی ہے۔ پہلے تو دنیا بھی مسلمانوں کے قبضہ میں تھی۔ جس طرح دین ان کے ہاتھ میں تھا۔

لِتُبَیِّنَ کے الفاظ سے قرآن کی دوسری کتب کے بالمقابل فضیلت لِتُبَیِّنَ میں ایک اور لطیف مضمون بھی بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض کتب ایسی ہیں جن کو انسان شرم کی وجہ سے سنا ہی نہیں سکتا۔ مثلاً بائبل کے بعض ٹکڑے۔ لیکن قرآن کریم ایسی شریفانہ باتوں پر مشتمل ہے کہ ہر جگہ پر اُسے سنایا جا سکتا ہے۔

ایک عیسائی کا قول ہے کہ قرآن میں یہ خوبی ہے کہ ہر مجلس میں پڑھا جا سکتا ہے۔ مگر ہماری کتابیں ایسی ہیں کہ ہر مجلس میں نہیں پڑھی جاسکتیں۔

حضرت لوط اور ان کی لڑکیوں کا واقعہ۔ بنی اسرائیل کا عورتوں بچوں کو خدا تعالیٰ کے حکم سے قتل کرنا یہ ایسے واقعات ہیں کہ ان کا مجالس میں بیان کرنا طبیعت پر سخت گراں گذرتا ہے (پیدائش باب ۱۹ آیت ۳۱، ۳۸ و استثناء باب ۳ آیت ۶)۔ آریہ لوگوں کی نیوگ کی تعلیم بھی ایسی ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ تو الگ رہے خود آریہ خاوند اپنی بیوی کو وہ تعلیم پڑھ کر نہیں سنا سکتا۔

مگر قرآن کریم ایسے مضامین پر مشتمل ہے اور ایسے الفاظ میں بیان ہوا ہے کہ اسے ہر قوم پر اور ہر عمر کے لوگوں کے سامنے پڑھا جا سکتا ہے۔

الہام فکر انسانی کو تیز کر دیتا ہے۔ لَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ سے اس طرف اشارہ کیا گیا کہ الہام فکر انسانی کو تیز کر دیتا ہے۔ صحابہ کا نمونہ اس کا بیّن ثبوت ہے۔ وہ اَن پڑھ اور زمانہ کے حالات سے ناواقف تھے۔ مگر الہام قرآنی کو سن کر اور سمجھ کر دنیا کے علماء کے استاد بن گئے اور ایسی سمجھ ان کو عطا ہوئی کہ دنیا کے ہر علم میں انہوں نے آئندہ زمانہ کے لئے ایک بہترین سبق چھوڑا ہے۔

اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ

پھر کیا جو لوگ (تیرے خلاف) بری (بری) تدبیریں کرتے چلے آئے ہیں وہ اس بات سے امن میں ہیں کہ

الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ

اللہ (تعالیٰ) انہیں اس ملک میں (ہی) ذلیل (ورسوا) کردے یا وہ عذاب (جس کی خبر دی جاچکی ہے)

لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۴۶﴾

جہاں سے وہ جانتے (بھی) نہ ہوں اُن پر آجائے۔

حلّ لُغات۔ یخسف یَخْسِفُ خَسَفَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور خَسَفَ الْمَكَانُ خُسُوْفًا کے معنے ہیں :ذَهَبَ فِي الْاَرْضِ وَغَرِقَ۔ کوئی جگہ زمین کے اندر دھنس گئی۔ خَسَفَ اللّٰهُ تَعَالٰى الْاَرْضَ:اَسَاخَهَا بِمَا عَلَيْهَا۔ اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کو زمین سمیت غرق کردیا۔ خَسَفَ اللّٰهُ الْاَرْضَ بِفُلَانٍ:غَيَّبَهُ فِيْهَا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین میں غائب کردیا۔ خَسَفَ فِي الْاَرْضِ وَخُسِفَ بِهٖ مَجْهُوْلًا اَىْ غَابَ فِيْهَا زمین میں دھنس کر غائب ہو گیا۔ خَسَفَ فُلَانًا۔ (بغیر صلہ کے) اَذَلَّهٗ وَحَمَّلَهٗ مَا يُكْرِهُهٗ۔ اس کو ذلیل کیا اور اس پر ایسے معاملات ڈالے جن کو وہ ناپسند کرتا تھا (اقرب) پس یخسفُ بِهِم کے معنے ہوں گے کہ (۱) ان کو زمین میں دھنسادے (۲) ان کو زمین کے اندر غائب کردے۔ (اقرب)

تفسیر۔ آیت اَنْ يَّخْسِفَ میں کفار کے انجام کی پیشگوئی اس آیت میں ایک اور پیشگوئی بیان کی گئی ہے جو کفار کے انجام کے متعلق ہے۔ فرماتا ہے کیا کافر اس سے مامون ہو گئے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ ان کو زمین کے اندر دھنسادے۔

خسف کے معنی گمنام ہونے کے خسف کے معنے دھنسانے کے بھی ہیں اور ذلیل کرنے کے بھی۔ مگر جب ذلیل کرنے کے معنوں میں آئے تو اس وقت اس کا مفعول بغیر کسی صلہ کے آتا ہے جیسے کہ خَسَفَ فُلَانًا اور جب باء کا صلہ آئے تو اس کے معنے دھنسادینے کے یا اندر غائب کرنے کے ہوتے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں خَسَفَ الْاَرْضَ بِفُلَانٍ فلاں شخص کو زمین میں غائب کردیا۔ چونکہ اس آیت میں باء کا صلہ استعمال ہوا ہے اس لئے یہی معنے اس کے ہوسکتے ہیں کہ ان کو زمین کے اندر غائب کردے یا دھنسادے۔ لیکن مراد گمنام ہوجانے اور جیتے جی

دفن ہو جانے کے ہوں گے اور استعمال مجازی سمجھا جائے گا۔

کفار پر موعود عذاب کا ظہور اور صحابہ کی عزت یہ عذاب کفار پر اس شان کے ساتھ آیا کہ آج صنادید عرب کے ناموں اور ان کے خاندانوں کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ لیکن ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ اور ان کی نسلوں کو آج بھی لوگ سر پر بٹھاتے ہیں۔

پیشگوئی کے مطابق فتح مکہ کے وقت کفار پر اچانک عذاب کا نزول اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ گو ہر عذاب ہی اسی طرح آتا ہے کہ کفار جانتے نہیں لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بعض واقعات اس آیت پر حیرت انگیز طور پر چسپاں ہوتے ہیں۔ مثلاً صلح حدیبیہ کا واقعہ ہی لے لو اس صلح کے وقت مکہ والوں کا خیال تھا کہ انہوں نے ایک بہت بڑی فتح حاصل کی ہے لیکن اس کے بعد جس طرح حالات نے یکدم پلٹا کھایا وہ ایک زبردست نشان ہے۔ پہلے مکہ والوں نے اس شرط کے پورا کرنے پر اصرار کر کے کہ جو ہم میں سے اسلام لا کر مدینہ جائے اسے واپس کر دیا جائے مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام سے آزاد ہو کر مکہ والوں سے برسر پیکار ہوگئی۔ اور آخر مکہ والوں کو ذلیل ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کرنی پڑی کہ اس جماعت کو مدینہ کی طرف ہجرت کی اجازت دے دی جائے۔ اس کے بعد خود کفار کی باہمی لڑائی نے معاہدہ کے رو سے مسلمانوں کو مکہ پر چڑھائی کا حق دے دیا۔ اور اس طرح مکہ اچانک اور یکدم فتح ہو گیا۔ (السیرۃ النبویۃ لابن هشام امر الهدنة)

اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۴۷﴾

یا وہ انہیں (قومی معاملات میں) ان کے آزادانہ تصرف کی حالت میں ہلاک کر دے پس (وہ یاد رکھیں کہ) وہ (ہرگز اللہ تعالیٰ کو ان باتوں کے پورا کرنے سے) عاجز نہ پائیں گے۔

حَلّ لُغَات۔ تَقَلُّبِهِمْ تَقَلَّبَ الشَّيْءُ کے معنے ہیں تَحَوَّلَ عَنْ وَجْهِهٖ۔ اپنی جہت سے پھر گیا تَقَلَّبَ عَلٰى فِرَاشِهٖ: تَحَوَّلَ مِنْ جَانِبٍ اِلٰى جَانِبٍ۔ بستر پر کروٹیں لیتا رہا۔ تَقَلَّبَ فِي الْاُمُوْرِ: تَصَرَّفَ فِيْهَا كَيْفَ شَاءَ۔ یعنی جس طرح چاہا اپنے معاملات میں خود مختاری سے کام لیا۔ (اقرب)

مُعْجِزِيْنَ مُعْجِزِيْنَ اَعْجَزَ سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے۔ اور اَعْجَزَهُ الشَّيْءُ کے معنے ہیں فَاتَهٗ۔ وہ چیز

اس کے ہاتھ سے جاتی رہی۔ اَعْجَزَ فُلَانٌ فُلَانًا : صَیَّرَہٗ عَاجِزًا فلاں نے فلاں کو عاجز کر دیا۔ اَعْجَزَہٗ : وَجَدَہٗ عَاجِزًا۔ اس کو عاجز پایا (اقرب) پس فَمَا ھُمْ بِمُعْجِزِیْنَ کے معنی ہوں گے وہ اس کو عاجز نہیں پائیں گے وہ اس کو عاجز نہیں کر سکیں گے۔

تفسیر۔ تَقَلُّب کے معنی تَقَلُّب کے معنے سفر کے بھی ہوتے ہیں جیسے کہ فرمایا ہے لَا یَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ (آل عمران: ۱۹۷) یعنی کفار کا ادھر ادھر اموال تجارت لے کر پھرنا تجھے دھوکہ میں نہ ڈالے اور تجھے یہ خیال نہ ہو کہ ان کے پاس تو بڑا سرمایہ ہے۔ بڑی طاقت ہے یہ کس طرح مغلوب ہوں گے۔ ان معنوں کے رو سے آیت زیر بحث کے معنے یہ ہوں گے کہ کفار مطمئن نہ ہوں کہ ان کے سفر ان کی طاقت کا موجب ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ان سفروں میں ہی عذاب میں مبتلا کرے گا۔ چنانچہ غزوہ بدر ایک قافلہ کی حفاظت ہی کی غرض سے ہوا اور اس میں کفار مکہ کی شوکت جاتی رہی۔ دوسرے معنے تقلّب کے تصرف کے ہیں۔ ان معنوں کے رو سے آیت کے معنے ہوں گے کہ ان کے تصرف میں خلل آجائے گا اور حکومت ضعیف ہو جائے گی چنانچہ یہ عذاب بھی مکہ والوں پر صلح حدیبیہ کے موقعہ پر نازل ہوا اور بعض کافر قبائل نے مکہ والوں کے جتھا میں شامل ہونے سے انکار کر دیا اور فیصلہ کیا کہ باوجود مذہبی اختلاف کے وہ مسلمانوں کے ساتھ ہوں گے اور یہی قبیلہ مکہ پر حملہ کروانے کا موجب بنا (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام غزوۃ بدر القبری)۔

اَوْ یَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّكُمْ

یا وہ انہیں آہستہ آہستہ گھٹا کر ہلاک کر دے۔ کیونکہ تمہارا رب یقیناً (مومنوں پر) بہت (ہی)

لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۴۸﴾

شفقت کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

حلّ لُغَات۔ تَخَوُّفٍ تَخَوَّفَ عَلَیْهِ شَیْئًا تَخَوُّفًا : خَافَهٗ عَلَیْهِ۔ اس پر کسی مصیبت کے آنے کا خوف محسوس کیا۔ وَ تَخَوَّفَ الشَّیْءَ : تَنَقَّصَهٗ۔ کسی چیز کو تھوڑا تھوڑا کر کے لیا۔ تَخَوَّفَ حَقَّهٗ : تَهَضَّمَهٗ اِیَّاهُ۔ اس کے حق کو مار لیا۔ هُوَ یَأْخُذُهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ۔ اَیْ یُصَابُوْنَ فِیْ اَطْرَافِ قُرَاهِمْ بِالشَّرِّ حَتّٰى یَأْتِیَ ذَالِكَ عَلَیْهِمْ ۔ هُوَ یَأْخُذُهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ کے معنے ہیں کہ ان کی اردگرد کی بستیوں پر تکالیف آ رہی ہیں۔ یہاں تک کہ اب ان کی

نوبت بھی آرہی ہے۔(اقرب) وَالتَّخَوُّفُ: ظُهُوْرُ الْخَوْفِ مِنَ الْاِنْسَانِ۔ انسان سے کسی خوف اور ڈر کے ظاہر ہونے کا نام تخوّف ہے۔(مفردات)

تفسیر۔ یَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ کے دو معنی یعنی ایک اور رنگ کا عذاب بھی مکہ والوں کو ملے گا اور وہ یہ کہ مکہ والوں کے تابع جو علاقے ہیں وہ آہستہ آہستہ انہیں چھوڑتے جائیں گے۔ چنانچہ مختلف علاقوں کے لوگوں نے مکہ فتح ہونے سے پہلے ہی اسلام لانا شروع کر دیا تھا۔

اس آیت کے یہ معنے بھی ہیں کہ ایک عذاب تم پر خوف کا آئے گا یعنی باوجود زیادہ ہونے کے تمہارے دلوں پر مسلمانوں کا ایسا رعب بٹھا دیا جائے گا کہ تم اندر ہی اندر خوف سے مرتے جاؤ گے۔ اس قسم کا عذاب نہایت شدید ہوتا ہے کیونکہ اس کا اثر اعصاب پر پڑ کر انسان کی حالت سخت پریشانی کی ہوجاتی ہے۔ یہ عذاب بھی مکہ والوں پر نازل ہوا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کا رعب ان پر ایسا تھا کہ ہر وقت وہ اسی غم میں گھلے جاتے تھے۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ (بخاری کتاب الصلوۃ باب قول النبیؐ جعلت لی الارض مسجدا) اللہ تعالیٰ نے میری مدد رعب کے قیام سے بھی کی ہے جدھر میں نکلوں مہینہ بھر کی مسافت کے علاقہ تک لوگوں میں دہشت پھیل جاتی ہے۔

سزا کے بعد صفت رؤوف کے ذکر کی وجہ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ یہ عجیب بات ہے کہ سزا کے ذکر کے بعد رءوف ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ یہ سارے عذاب تدریجی آئے ہیں۔ پہلے تخوف سے ان کو سمجھایا یعنی ادھر ادھر بستیوں میں اسلام پھیلایا۔ پھر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوئیں۔ پھر صلح حدیبیہ ہوئی جس سے ان کا رعب اڑ گیا۔ پھر اچانک فتح مکہ کے وقت ان کو شہر میں جا پکڑا۔ پس یہ رأفت اور رحم ہی تھا کہ آہستہ آہستہ پکڑا تا کہ جو ہدایت کے قابل تھے ہدایت پا جائیں۔ ورنہ چاہتا تو یکدم عذاب میں مبتلا کر دیتا۔

عذاب کفار کے لئے ہے اور رأفت مومنوں کے لیے دوسری وجہ اس کی یہ ہوسکتی ہے اور میرے نزدیک یہی زیادہ درست ہے کہ رءوفٌ رَّحِيْمٌ مسلمانوں کے لئے آیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں پر عذاب لانا مسلمانوں پر رأفت اور رحم کی غرض سے ہوگا تا انہیں ان عذابوں اور ظلموں سے بچایا جائے جو مکہ والوں کی طرف سے ان پر وارد ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جہاں عذابوں کا ذکر تھا وہاں غائب کی ضمیریں استعمال کی گئی تھیں اور رءوف رحیم سے پہلے یہ نہیں فرمایا کہ اِنَّ رَبَّهُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ بلکہ فرمایا ہے اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ پس غائب سے خطاب کی ضمیر کو بدل دینا بتاتا ہے کہ عذاب کفار کے لئے ہوگا اور رأفت اور رحمت مومنوں کے لئے

ہوں گی۔

اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُہٗ

اور کیا باوجود اس کے کہ وہ ذلیل ہو رہے ہیں انہوں نے (کبھی) اللہ (تعالیٰ) کے حضور (تذلّل کے ساتھ) جھکتے

عَنِ الۡیَمِیۡنِ وَ الشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰہِ

ہوئے جو کچھ بھی اللہ (تعالیٰ) نے (ان کے لئے) پیدا کیا ہے اُسے غور سے نہیں دیکھا کہ اس کے سائے دائیں

وَ ہُمۡ دٰخِرُوۡنَ ﴿۴۹﴾

جانب سے اور شمالی جانبوں سے اِدھر اُدھر ہو رہے ہیں۔

حلّ لُغات ۔**یَتَفَیَّؤُا** یَتَفَیَّؤُا تفیّأ سے مضارع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور تَفَیَّأَتِ الظِّلَالُ کے معنے ہیں: تَقَلَّبَتۡ۔ سائے ادھر سے اُدھر ہو گئے۔ (اقرب)

دَاخِرُوۡنَ دَاخِرُوۡنَ دَاخِرٌ سے جمع کا صیغہ ہے اور دَاخِرٌ دَخَرَ وَدَخِرَ سے اسم فاعل ہے اور دَخَرَ کے معنے ہیں: ذَلَّ وَصَغُرَ ذلیل اور چھوٹا ہو گیا۔ وَفِی الۡقُرۡآنِ ''سَیَدۡخُلُوۡنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیۡنَ'' اَیۡ اَذِلَّآءَ مُهَانِیۡنَ۔ اور قرآن مجید کی آیت ''سَیَدۡخُلُوۡنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیۡنَ'' میں داخرین کے معنے ذلیل کے ہیں۔ یعنی وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔ (اقرب)

تفسیر ۔ **مختلف اشیاء کے زوال سے کفار کو انتباہ** اس آیت میں کفار کو توجہ دلائی ہے کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے اور دلوں میں خشوع پیدا کرتے ہوئے خدا تعالیٰ کے قانون پر غور نہیں کرتے کہ کس طرح ہر شے پر ایک دن زوال آتا ہے۔ ہر قوم ایک دن ختم ہو جاتی ہے شہر اجڑ جاتے ہیں۔ حکومتیں بدل جاتی ہیں۔ ملک تباہ ہو جاتے ہیں۔ امیر غریب اور غریب امیر ہو جاتے ہیں۔ غرض ہر چیز کا سایہ ایک وقت آ کر سمٹ جاتا ہے یعنی اُسے جو رتبہ اور درجہ اور اثر اور نفوذ یا رعب یا شوکت یا شہرت حاصل ہوتی ہے جاتی رہتی ہے۔ پھر اس عام قانون سے تم کیوں فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اور غرور اور تکبر کو چھوڑ کر حقیقت پر غور نہیں کرتے تا تم کو عبرت حاصل ہو اور تم سچائی کو قبول کر لو۔

یمین کے لفظ کے مفرد رکھے جانے اور شمائل کے جمع رکھے جانے کی وجہ میں نے جو معنے کئے ہیں ان کے مطابق سُجَّدًا لِلّٰہِ اور ھُمْ دٰخِرُوْنَ کو اَوَ لَمْ یَرَوْا کی ضمیر کا حال بنایا ہے۔ بعض لوگوں نے ان کو مَا کا حال بنایا ہے (تفسیر ابن کثیر زیر آیت ھذا)۔ مگر چونکہ یہاں ذوی العقول کا صیغہ اور ضمیر استعمال کے گئے ہیں۔ اس لئے میرے نزدیک وہی معنے زیادہ درست ہیں جو میں نے کئے ہیں۔ ایک اور بات اس آیت میں قابل حل ہے اور وہ یہ کہ یمین کا لفظ مفرد ہے اور شمائل کا جمع ہے۔ ایسا کیوں کیا گیا ہے۔ حالانکہ چاہیے تھا کہ یا دونوں کو جمع رکھا جاتا یا دونوں کو مفرد۔ بعض نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ عرب کا محاورہ ہے اور قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے کہ مقابل کی چیزوں کا جب ذکر کریں تو ایک جمع اور دوسرے کو مفرد لاتے ہیں۔ جیسے جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ کہ ظلمات جمع استعمال ہوا ہے اور نور مفرد۔ یہ فرق اس لئے کیا جاتا ہے کہ ایک لفظ کو مفرد بول کر افراد جماعت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور دوسرے لفظ کو جمع استعمال کر کے جماعت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بعض دوسرے علماء نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یمین کا لفظ جمع کے معنوں میں بھی بولا جاتا ہے۔ (فتح البیان زیر آیت ھذا)

اس آیت کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ پہلے عذاب کا ذکر کیا تھا اب اس کی دلیل بیان فرمائی ہے کہ ان کی سمجھ میں اتنا بھی نہیں آتا کہ اسباب کبھی پیدا کرنے والے کے خلاف ہو سکتے ہیں۔ کیا یہ دیکھتے نہیں ہیں کہ سورج کے سایہ میں تغیر ہوتا رہتا ہے جس کی پیٹھ پر وہ ہوتا ہے اس کا سایہ بڑھ جاتا ہے۔ پھر کیا خدا کو اتنی بھی طاقت نہیں جتنی تم سورج میں سمجھتے ہو۔ جب اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ کی پیٹھ پر ہوجائے گا کیا اس کا سایہ نہ بڑھے گا اور ترقی نہ ہوگی۔ اسی طرح جن کی پشت پر سے وہ ہٹ جائے گا کیا ان کے سائے سمٹ نہ جائیں گے؟

یمین اور شمال کے الفاظ کی تفسیر میں مفسرین کو مشکل اس آیت میں جو یمین وشمال کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کی تفسیر کرنے میں مفسروں نے بڑی مشکل محسوس کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سورج کے ادھر اُدھر ہونے سے سایہ کی لمبائی چھوٹائی تو مشرق اور مغرب میں ہوتی ہے۔ مگر یہاں خدا تعالیٰ یمین وشمال بیان فرماتا ہے حالانکہ دائیں بائیں کا تعلق سایوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ بعض نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ یمین وشمال سے مراد مشرق ومغرب ہے کیونکہ اگر شمال کی طرف منہ کیا جائے تو مشرق ومغرب دائیں بائیں آجاتے ہیں (فتح البیان زیر آیت ھذا) مگر یہ عام دنیا کے خلاف ہے۔ دنیا کا قانون یہ ہے کہ مشرق کی طرف منہ کر کے سمتوں کی تعیین کرتے ہیں پس یہ توجیہ درست نہیں۔

یمین اور شمال کے الفاظ سے ہجرت مدینہ کی طرف اشارہ اصل بات یہ ہے کہ اس مثال سے اصل مقصد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مکہ والوں کے اثرات کا مقابلہ کرنا اور یہ بتانا تھا کہ ان دونوں میں سے کس کے

سائے بڑھیں گے اور کس کے گھٹیں گے۔ اور چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے جانے والے تھے اور اس آیت میں بھی ہجرت کا ذکر ہو چکا ہے اس لئے آپؐ گویا شمالی علاقہ کی طرف جانے والے تھے اور مکہ والے آپ سے جنوب میں آنے والے تھے۔ پس اگر کوئی شخص دونوں ملکوں کی سرحد پر کھڑا ہو کر مشرق کی طرف منہ کرے تو مکہ اس کے دائیں آئے گا اور مدینہ اس کے بائیں آئے گا۔ پس یمین وشمائل سے مکہ اور مدینہ مراد ہیں اور میرے نزدیک اسی وجہ سے یمین کو مفرد استعمال کیا ہے اور شمال کو جمع استعمال کیا ہے۔ جس سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ تمہارا سایہ محدود ہوگا اور وہ بھی گھٹ جائے گا اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جو بائیں طرف کے ملک میں چلا جائے گا اس کے کئی سائے ہوں گے یعنی وہ مختلف جہات سے ترقی کرے گا۔

وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ

اور جو (شے بھی) آسمانوں میں ہے اور (نیز) زمین پر جو بھی جاندار (موجود) ہے اور (تمام) فرشتے بھی

الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۵۰

اللہ (تعالیٰ) کے حضور میں ہی جھکے رہتے ہیں اور وہ بڑائی نہیں کرتے ۔

حلّ لُغَات ۔دَآبَّۃ دَبَّ (دَبًّا) کے معنے ہیں ۔مَشٰی عَلٰی هِيْنَتِهٖ كَمَشْيِ الطِّفْلِ وَالنَّمْلَةِ وَالضَّعِيْفِ۔ آہستہ آہستہ چلا جس طرح بچہ یا ضعیف یا چیونٹی چلتی ہے۔ اور دَآبَّۃٌ دابٌّ کا مؤنث ہے دَآبَّۃٌ کے معنے ہیں مَادَبَّ مِنَ الْحَيَوَانِ۔ ہر وہ حیوان جو زمین پر ضرب لگا کر چلتا ہے۔ وغَلَبَ عَلٰی مَا يُرْكَبُ وَيُحْمَلُ عَلَيْهِ الْاَحْمَالُ۔ دابّۃ کا استعمال زیادہ تر اس حیوان کے لئے ہوتا ہے جس پر سواری کی جاتی ہے یا اس پر بوجھ لادا جاتا ہے۔ ویَقَعُ عَلَى الْمُذَكَّرِ وَالْهَاءُ فِيْهَا لِلْوَحْدَةِ كَمَا فِي الْحَمَامَةِ دابّۃ کا لفظ مذکر کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور ۃ وحدت کی سمجھی جائے گی۔ یعنی دابّۃ کے معنے ہوں گے ایک حیوان۔ (اقرب)

تفسیر ۔فرماتا ہے جو آسمانوں میں ہیں یعنی فرشتے وہ بھی خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتے ہیں اور جو کوئی زمین میں بستے ہیں وہ بھی اس کے حکم کے ماتحت ہیں۔ پس جب خدا کے قبضے میں سامان بھی ہیں اور سامانوں کے مدبّر ملائکہ بھی۔ تو جب دونوں کو اس کی ترقی کے لئے لگا دیا جائے گا تو کیوں نہ محمدؐ رسول اللہ کا سایہ بڑھے گا۔

وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ کا مطلب وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ میں بتایا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

خدمت پر جن کو لگایا گیا ہے وہ تو کامل فرمانبردار ہیں وہ تو پورے زور سے کام میں لگ جائیں گے مگر تمہارے اتباع تو تمہاری اس طرح فرمانبرداری نہیں کریں گے اس لئے تمہارا نظام کھوکھلا اور ناقص ہو جائے گا۔

لفظ دابۃ کے استعمال کی وسعت اس آیت میں دابّۃ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور دابہ کا عام استعمال چوپایوں کے لئے ہے پھر اس جگہ یہ لفظ کیوں استعمال کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لفظ دَبّ سے ہے جس کے معنے آہستگی سے چلنے کے ہیں اور اس کا اسم فاعل دَابٌّ اور مؤنث دَابَّۃٌ ہے انہی معنوں میں اس جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور انسان اس میں شامل ہیں۔

يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا

وہ اپنے رب سے جو ان پر غالب ہے ڈرتے رہتے ہیں۔ اور جس بات کا انہیں حکم دیا جاتا ہے

يُؤْمَرُونَ ۩ ﴿۵۱﴾

(وہی) کرتے ہیں۔

تفسیر۔ يَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ کے الفاظ میں ہاروت و ماروت کے قصے کا ابطال یہ ملائکہ کی صفت بیان فرمائی ہے اس سے ہاروت ماروت کا قصہ بھی باطل ہو جاتا ہے۔ فرشتے تو اللہ تعالیٰ سے خوف کرتے اور اُس کے حکموں پر عمل کرتے ہیں وہ اس کے حکموں کو توڑنے والے نہیں ہو سکتے۔

مِنْ فَوْقِهِمْ۔ یہ ترکیب میں رب کا حال ہے یعنی فرشتے اس حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں جبکہ وہ ان کے اوپر ہے یعنی ان پر غالب ہے۔

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ

اور اللہ (تعالیٰ) نے (ہمیشہ ہر قوم کو یہی) فرمایا ہے (کہ) تم دو معبود مت بناؤ۔ وہ (یعنی معبود برحق تو) ایک ہی ہے

وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۵۲﴾

پس تم مجھ سے ہی (ڈرو) پھر (تم سے کہتا ہوں کہ) مجھ سے ہی ڈرو۔

حلّ لُغات۔ اِلٰهَيْنِ اِلٰهَيْنِ اِلٰهٌ سے تثنیہ کا صیغہ ہے اور اَلْاِلٰهُ کے معنے ہیں اَلْمَعْبُوْدُ مُطْلَقًا بِحَقٍّ اَوْ

بِبَاطِلٍ لِاَنَّ الْاَسْمَاءَ تَتَّبِعُ الْاِعْتِقَادَ لَا مَا عَلَيْهِ الشَّيْءُ فِيْ نَفْسِهِ۔ یعنی ہر معبود پر اِلٰہٌ کا لفظ بولتے ہیں خواہ وہ سچا ہو یا جھوٹا۔ کیونکہ اشیاء کا نام اعتقاد پر رکھا جاتا ہے نہ اس بات کو مدنظر رکھ کر کہ وہ چیز اپنے نام کے مطابق اپنے اندر حقیقت بھی رکھتی ہے یا نہیں۔ (اقرب)

وَاحِدٌ کے معنے کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۱۷۔

اَلْوَاحِدُ بِمَعْنَى الْاَحَدِ اَيِ الْمُنْفَرِدِ الَّذِيْ لَا نَظِيْرَ لَهٗ اَوْ لَيْسَ مَعَهٗ غَيْرُهٗ۔ ایسا یکتا کہ جس کا کوئی نظیر نہ ہو یا اس کا کوئی شریک نہ ہو۔ اور انہی معنوں میں یہ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ (اقرب)

فَارْهَبُوْنِ اِرْهَبُوْا۔ رَهَبَ سے جمع مخاطب کا صیغہ امر ہے۔ اور رَهِبَ الرَّجُلُ رَهْبَةً کے معنے ہیں: خَافَ۔ ڈر گیا (اقرب) اِرْهَبُوْنِ اصل میں اِرْهَبُوْنِيْ تھا۔ نِيْ کو گرایا گیا۔ پھر نِ کو جسے نون وقایہ کہتے ہیں لایا گیا اور صرف کسرہ پر اکتفاء کیا گیا۔ پس اِرْهَبُوْنِ کے معنے ہوں گے کہ مجھ ہی سے ڈرو۔ (اس کے لئے دیکھو سورۃ بقرہ ع ۵)

اِرْهَبُوْا۔ جمع مخاطب کا صیغہ امر ہے اور رَهُبَ الرَّجُلُ (يَرْهَبُ رَهْبَةً) کے معنے ہیں خَافَ ڈر گیا (اقرب) اِرْهَبُوْنِ اصل میں اِرْهَبُوْنِيْ تھا۔ ی کو گرا دیا گیا اور نونِ وَقایۃ کے کسرہ پر اکتفا کیا گیا۔ اِرْهَبُوْنِ کے معنے ہیں مجھ سے ڈرو۔

تفسیر - اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ کی ترکیب فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ۔ اصل میں فَاِيَّايَ ارْهَبُوْا فَارْهَبُوْنِ ہے جس کے معنے ہیں پس مجھ ہی سے ڈرو ہاں میں پھر کہتا ہوں کہ تم مجھ سے ڈرو اِرْهَبُوْا کو حذف کر دیا گیا اور فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ رہ گیا۔ فَاِيَّايَ بعد کے فعل یعنی فَارْهَبُوْنِ کا معمول نہیں بن سکتا۔ کیونکہ درمیان میں ف آئی ہے۔ اس لئے اس فعل سے پہلے ایک اِرْهَبُوْا محذوف مانا جائے گا۔ اس طرزِ کلام سے مقصود مضمون پر زور دینا ہوتا ہے۔ یعنی رہب اور خوف صرف خدا ہی سے ہونا چاہیے۔

اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ کے الفاظ میں جمع کو چھوڑ کر تثنیہ کے ذکر کرنے میں تین حکمتیں اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ۔ یہ جو فرمایا کہ دو معبود نہ بناؤ اس پر اعتراض ہوتا ہے کہ دو کا لفظ کیوں فرمایا۔ جمع کا صیغہ رکھ کر یہ کیوں نہ فرمایا کہ لَا تَتَّخِذُوْا اٰلِهَةً ایک سے زیادہ معبود نہ بناؤ۔ اس سے تو یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ دو سے زائد خدا بنانے جائز ہیں۔ ایسا اعتراض قلتِ تدبر سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس کے آگے ہی یہ الفاظ ہیں اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ خدا صرف ایک ہے۔ ان الفاظ کی موجودگی میں یہ شبہ پیدا ہی نہیں ہوسکتا کہ دو سے زیادہ خدا ماننے جائز ہیں۔ پس دو کا لفظ ایک کے مقابل

پر زور دینے کے لئے رکھا گیا ہے اور مراد یہ ہے کہ خدا صرف ایک ہے۔ پس زیادہ خدا بنانے تو الگ رہے تم کو دو خدا بھی نہیں بنانے چاہئیں۔

دوسری حکمت ان الفاظ کے اختیار کرنے میں یہ ہے کہ مشرک بھی اللہ اور دوسرے معبودوں میں فرق کرتے تھے وہ سب دنیا کے پیدا کرنے والے کو تو اللہ کہتے تھے اور دوسرے معبودانِ باطلہ کو محدود اختیارات والے خدا سمجھتے تھے۔ یا تو اس لحاظ سے کہ انہیں محدود طاقتیں حاصل تھیں مثلاً کوئی مینہ برساتا تھا، کوئی اولاد دیتا تھا، کوئی بیماریوں سے شفا دیتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ اور یا اس لحاظ سے کہ کوئی خدا ایک قبیلہ کی حفاظت کرتا تھا تو کوئی دوسرے کی۔ چنانچہ ان کے ہاں جس طرح مختلف اغراض کے لئے الگ الگ دیوتا تھے اسی طرح مختلف اقوام کے لئے بھی الگ الگ دیوتا تھے۔ گویا ایک خدا تو قادر مطلق تھا اور دوسرے معبود محدود اغراض اور محدود علاقوں کے لئے تھے۔ اس طرح خداؤں کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔ ایک قسم قادر مطلق خدا کی جو ان کے نزدیک بھی صرف ایک تھا اور دوسری قسم محدود اختیارات اور محدود علاقوں کے خداؤں کی جو اُن کے نزدیک بہت سے تھے (تفسیر کبیر لامام رازی سورۃ الزمر زیر آیت ولئن سألتهم من خلق السموت)۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ جو فرمایا ہے کہ دو خدا نہ بناؤ اس سے مراد یہ ہے کہ دو قسم کے خدا نہ بناؤ۔ خدا ایک ہی ہے اس کے سوا کوئی اور قسم کا خدا نہیں ہے۔

تیسری حکمت ان الفاظ کے استعمال کرنے میں یہ ہے کہ اس میں مجوس کے اس عقیدہ کا بطلان کیا گیا ہے جو دو خدا مانتے ہیں ایک خیر کا خدا دوسرا شر کا خدا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس قسم کے دو خدا موجود نہیں ہیں خدا صرف ایک ہی ہے جزائے خیر بھی اسی کی طرف سے آتی ہے اور جزائے شر بھی اُسی کی طرف سے آتی ہے پس دو خدا نہ بناؤ۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ جب ایک ہی خدا ہے تو پھر بتاؤ کہ شریعت اس کے سوا اور کون بنا سکتا ہے شریعت کا بنانا اسی کے اختیار میں ہوگا۔

اس آیت میں ہجرت اور اس کے نتائج کی پیشگوئی کی طرف اشارہ اس آیت میں ہجرت اور اس کے نتائج کے متعلق جو پیشگوئی کی گئی تھی اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان واقعات کے پورا ہونے پر تم کو معلوم ہو جائے گا کہ خدا ایک ہی ہے اس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں یعنی مسلمانوں کی ترقی اور کامیابی اللہ تعالیٰ کی توحید اور ذات کا ایک زبردست ثبوت ہوگی۔

ان آیات میں قرآن کریم کی تعلیم اور کفار کی تعلیم کا مقابلہ بھی ہو رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ کیا کبھی انسان قرآن کریم کی تعلیم سے مستغنی ہو سکتا ہے تم لوگوں نے اپنی عقل سے کام لے کر بے شمار معبود بنا رکھے ہیں یہ الہام ہی

ہے جو سچی توحید کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور انسانی دماغ کو تشتّط اور پراگندگی سے بچاتا ہے۔

وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ؕ

اور جو کچھ (بھی) آسمانوں اور زمین میں (پایا جاتا) ہے اِسی کا ہے اور اطاعت ہمیشہ اسی کا حق ہے پھر کیا تم

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾

اللہ (تعالیٰ) کے سوا اوروں کو اپنے بچاؤ کا ذریعہ بناتے ہو۔

حل لغات۔ الدِّیْنُ الدِّیْنُ کے لئے دیکھو یوسف آیت نمبر ۷۷۔

دَانَ دِيْنًا: اَطَاعَ۔ دَانَ جس کا مصدر دَيْنٌ ہے اس کے معنے ہیں اطاعت کی فُلَانًا: خَدَمَهٗ خدمت کی۔ خدمت ادا کی۔ حَكَمَ عَلَيْهِ۔ حکم لگایا فیصلہ کیا۔ اَلدِّيْنُ: اَلطَّاعَةُ دین کے معنی ہیں فرمانبرداری۔ اَلْقَضَاءُ۔ فیصلہ۔ (اقرب) وَاسْتُعِيْرَ لِلشَّرِيْعَةِ۔ اور یہ لفظ بالواسطہ شریعت یا قانون کے معنے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (مفردات)

واصبًا وَصَبَ الشَّيْءُ (يَصِبُ وَصُوْبًا) کے معنے ہیں دَامَ وَثَبَتَ۔ کوئی چیز قائم و دائم رہی۔ وَصَبَ الدَّيْنُ: وَجَبَ۔ قرضہ کی ادائیگی واجب ہوگئی۔ وَصَبَ فُلَانٌ عَلَى الْاَمْرِ: وَاظَبَ وَاَحْسَنَ الْقِيَامَ عَلَيْهِ کسی امر پر دوام اختیار کیا اور اس پر اچھی طرح کاربند رہا۔ اَلْوَاصِبُ: اَلدَّائِمُ۔ ہمیشہ رہنے والا۔ لَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا کے معنے ہیں دائمًا کہ اطاعت ہمیشہ اسی کا حق ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ آیت وَ لَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا میں شرک کے رد میں ایک زبردست دلیل شرک کے ردّ میں یہ ایک نہایت زبردست دلیل ہے جسے قرآن مجید نے متعدد جگہ پر پیش کیا ہے۔ فرماتا ہے آسمان و زمین کے نظام پر غور کرو۔ کائنات عالم کو دوربین نگاہ سے دیکھو تو تمہیں سب جگہ پر ایک ہی قانون جاری نظر آئے گا اور یہ تمام اشیاء ایک انتظام میں منسلک نظر آئیں گی جب قانون ایک ہے تو بادشاہ دو یا زیادہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ اگر کوئی دوسرا خدا ہوتا تو ضروری تھا کہ ہمیں دنیا میں قانون کا اختلاف نظر آتا۔ کیونکہ دوسرے خدا کا وجود ماننے کی صورت میں نظامِ عالم کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں:۔

۱۔ یہ کہ وہ پہلے خدا کی اطاعت کرے اوراس کے احکام کے ماتحت چلے ۔اس صورت میں اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ کیونکہ جو کام ایک کرسکتا ہے دو کو اس کام پر لگانے کی کیا ضرورت؟

۲۔ وہ پہلے خدا کے علاوہ کوئی اور نیا کام کرتا ہو اوراس کا قانون اور نظام الگ ہو۔اس صورت میں ضروری ہے کہ نظام عالم میں اختلاف نظر آوے۔لیکن چونکہ واقعہ میں ایسا نہیں ہے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ دوسرا خدا ہی کوئی نہیں۔صرف ایک ہی واحد و یگانہ خدا ہے۔

لَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا۔اس میں بتایا ہے کہ دوسری صورت ایک سے زیادہ خداؤں کی یہ ہوسکتی تھی کہ ایک خدا ایک زمانہ تک کام کرتا اوراس کے بعد وہ معطل ہوجاتا اوراس کی جگہ دوسرا خدا لے لیتا۔لیکن یہ بات بھی واقعات سے غلط ثابت ہورہی ہے۔جو قانون قدرت شروع سے چلایا گیا ہے وہی آج تک چلا آرہا ہے۔لاکھوں بلکہ کروڑوں سال گذرے مگر اس کے قانون میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ۔اس کا قانون اٹل ہے پس ایسے خدا کی موجودگی میں کہ جو زمین وآسمان کا مالک ہو اور جس کا قانون ازل سے ابد تک ہو دوسرے خدا کا وجود ماننا سخت غلطی اور بے وقوفی ہے۔

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ

اور جو نعمت بھی تمہارے شامل حال ہے وہ اللہ (تعالیٰ) ہی کی طرف سے ہے پھر جب تمہیں (کوئی تنگی اور) تکلیف

فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ۝۵۴

پہنچتی ہے تو (اس وقت بھی) تم اسی کے حضور فریاد کرتے ہو۔

حلّ لُغات ۔نِعْمَةٍ اَلنِّعْمَةُ کے معنے ہیں:اَلصَّنِيْعَةُ وَالْمِنَّةُ۔احسان ۔مَا اَنْعَمَ بِهٖ عَلَيْكَ مِنْ رِزْقٍ وَمَالٍ وَغَيْرِهٖ۔وہ مال یا رزق یا اس کے علاوہ کوئی اور چیز جو بطور انعام ملے ۔اَلْمَسَرَّةُ۔خوشی۔اَلْيَدُ الْبَيْضَاءُ الصَّالِحَةُ۔ایسا احسان جس میں کوئی کدورت اور کمی نہ ہو۔وَفِي الْكُلِّيَّاتِ۔ ’’اَلنِّعْمَةُ فِي اَصْلِ وَضْعِهَا اَلْحَالَةُ الَّتِيْ يَسْتَلِذُّ هَا الْاِنْسَانُ وَ هٰذَا مَبْنِيٌّ عَلٰى مَا اشْتُهِرَ عِنْدَهُمْ مِنْ اَنَّ الْفِعْلَةَ بِالْكَسْرِ لِلْحَالَةِ وَبِالْفَتْحِ لِلْمَرَّةِ۔‘‘ اور کلیات میں یوں لکھا ہے کہ نعمت اصل وضع کے لحاظ سے اس حالت کو کہتے ہیں جس سے انسان لذت اٹھاتا ہے اور یہ اس بناء پر ہے کہ حالت بیان کرنے کے لئے عربی زبان میں فِعْلَةٌ اور کسی کام کے ایک دفعہ

ہونے کے لئے فَعْلَۃٌ کا وزن لاتے ہیں اور نِعْمَۃٌ فِعْلَۃٌ کے وزن پر ہے اس لئے اس میں نعمت والی حالت کے معنے پائے جاتے ہیں ۔نِعْمَۃُ اللہِ: مَا اَعْطَاہُ اللہُ لِلْعَبْدِ مِمَّا لَا یَتَمَنّٰی غَیْرَہُ اَنْ یُعْطِیَہٗ اِیَّاہُ۔ اللہ کی نعمت وہ ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو دیتا ہے اور پھر بندہ اللہ کے سوا کسی اور سے یہ خواہش نہیں رکھتا کہ وہ اسے دے۔ اس کی جمع اَنْعُمٌ اور نِعَمٌ آتی ہے اور جب فُلَانٌ وَاسِعُ النِّعْمَۃِ کہیں تو اس کے معنے ہوں گے وَاسِعُ الْمَالِ یعنی فلاں مالدار ہے۔(اقرب)

اَلضُّرّ اَلضُّرّ کے معنے کے لئے دیکھو یوسف آیت نمبر ۸۹۔

اَلضُّرُّ ضِدُّ النَّفْعِ۔ ضُرّ کے معنے ہیں نقصان۔ سُوْءُ الْحَالِ وَالشِّدَّۃِ۔ تنگ حالی وَفِی الْکُلِّیَاتِ اَلضَّرُّ بِالْفَتْحِ شَائِعٌ فِیْ کُلِّ ضَرَرٍ وَبِالضَّمِّ خَاصٌّ بِمَا فِی النَّفْسِ کَمَرَضٍ وَھُزَالٍ کلیات میں یوں لکھا ہے کہ ضَرٌّ کے معنے خاص اس تکلیف کے ہیں جو خود نفس میں ہو جیسے بیماری یا لاغر پن وغیرہ لیکن ضُرٌّ کا لفظ عام ہے اور ہر تکلیف پر بولا جاتا ہے۔(اقرب)

تَجْأَرُوْنَ تَجْأَرُوْنَ جَأَرَ سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔اور جَأَرَ الدَّاعِیْ جَأْرًا کے معنے ہیں رَفَعَ صَوْتَہٗ بِالدُّعَاءِ پکارنے والے نے اونچی آواز سے پکارا۔جَأَرَ اِلَی اللہِ بِالدُّعَاءِ: ضَجَّ وَتَضَرَّعَ وَاسْتَغَاثَ اللہ کے حضور عاجزی سے فریاد اور دعا کی اور اُسی سے مدد چاہی۔وَمِنْہُ ثُمَّ اِذَا مَسَّکُمُ الضُّرُّ فَاِلَیْہِ تَجْئَرُوْنَ اور آیت اِذَا مَسَّکُمْ ...... الخ میں تَجْأَرُوْنَ کے معنی عاجزی کرنے اور فریاد کرنے کے ہیں۔(اقرب)

تفسیر ۔ توحید کی تائید میں ان دلائل کا ذکر جو کفار کی جانوں میں موجود تھے اس آیت میں ان آیات اور نشانات کا ذکر فرمایا ہے جو توحید کی تائید میں خود ان کی جانوں میں موجود تھے۔فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے تم کو سب نعمتیں ملی ہیں ۔کیونکہ جس قدر نعمتیں ہیں وہ ایک ہی نظام کا حصہ ہیں ۔مگر باوجود اس کے تم بعض نعمتوں کو دوسرے معبودوں کی طرف منسوب کر دیتے ہو۔لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ جب کبھی کوئی سخت قوی آفت آتی ہے تم کو اپنے معبودان باطلہ بھول جاتے ہیں اور اسی ایک خدا کی طرف جو حقیقی خدا ہے جھک جاتے ہو۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ تمہارے دل شرک پر مطمئن نہیں ۔پس جب شرک پر تم خود مطمئن نہیں تو اس پر اس قدر زور کیوں دیتے ہو۔

مشرکین کا تکلیف کے وقت معبودان باطلہ سے اعراض یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ شدید مصائب کے وقت میں لوگ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف جھکتے ہیں۔مسیحی جو مسیح کو خدائی کا مقام دیتے ہیں اس جنگ میں جو

اس وقت جرمنی اور انگلستان کے ساتھ ہو رہی ہے مسیح کو نہیں پکار رہے بلکہ ایک خدا کو پکار رہے ہیں۔ اگر انہیں مسیح کی خدائی پر پورا یقین ہوتا تو کبھی ایسا نہ کرتے۔

بدر کی جنگ کے موقع پر جب کہ گھمسان کا رَن پڑا تھا تو کفار نے لات اور عزیٰ کو نہیں پکارا۔ ابو جہل نے بھی ان باطل معبودوں سے دعا نہیں کی۔ بلکہ کہا تو یہی کہا اللّٰھُمَّ اِنْ کَانَ ھٰذَا ھُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِکَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَۃً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (الانفال: ۳۳) کہ اے اللہ اگر یہ مذہب اسلام سچا ہے اور ہم اس کی مخالفت ضد کی وجہ سے کر رہے ہیں تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا اس کے سوا کوئی اور دردناک عذاب ہمیں دے۔ اور خدائے واحد نے اس کی دعا سن بھی لی اور بدر میں ان پر پتھروں کی بارش بھی نازل کی اور اَور کئی قسم کے دردناک عذاب بھی ان پر نازل کئے۔ (بخاری کتاب التفسیر سورۃ الانفال باب قولہ و اذ قالوا اللّٰھم۔۔) اگر ان لوگوں کے دلوں میں لات اور عزیٰ کا ہی گہرا نقش واثر ہوتا تو انہی کو اس مصیبت میں پکارتے۔ مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ انہوں نے خدا تعالیٰ ہی کو بلایا اور یہی فطرت کی شہادت ہے۔

ثُمَّ اِذَا کَشَفَ الضُّرَّ عَنْکُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْکُمْ بِرَبِّھِمْ

پھر جب وہ تم سے اس تکلیف کو دور کر دیتا ہے تو تم میں سے بعض لوگ جھٹ (اوروں کو) اپنے رب کا شریک

یُشْرِکُوْنَ ﴿۵۵﴾

ٹھہرانے لگتے ہیں۔

تفسیر۔ آیت میں بِرَبِّھِمْ کے الفاظ استعمال کرنے کی حکمت بِرَبِّھِمْ۔ کا لفظ استعمال فرما کر انہیں شرم اور غیرت دلائی ہے کہ تم اپنے ہی رب کے شریک ٹھہراتے ہو۔ حالانکہ انسان کو اپنی چیز کی ایک غیرت ہوتی ہے وہ تو تمہارا اپنا رب ہے تمہیں اس کے ساتھ کوئی ضد تو نہیں کہ ضرور اس کے ساتھ شریک ٹھہراؤ۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مصیبت کے وقت تو اس کو یاد کرتے ہو اور جب مصیبت ٹل جاتی ہے تو پھر تم کو اپنے جھوٹے معبود یاد آجاتے ہیں۔

لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ۫

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے وہ اس کا انکار کر دیتے ہیں اچھا تم عارضی (اور وقتی سامانوں سے)

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۶﴾

نفع اٹھا لو اور (اس کا انجام بھی) تم جلد معلوم کر لو گے۔

حل لغات۔ ف فاء کا ترجمہ اس جگہ ’اچھا‘ زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔

تفسیر۔ لِيَكْفُرُوْا میں لام۔ لام عاقبت ہے لِيَكْفُرُوْا میں لام۔ لام عاقبت ہے اور مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ جب تم پر سے مصیبت ٹلا دیتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بجائے اس کا شکریہ ادا کرنے کے تم اس کے فضل کا انکار کر دیتے ہو اور کہتے ہو کہ یہ فضل فلاں دیوتا کی وجہ سے نازل ہوا ہے۔ جب تمہاری یہ حالت ہے تو تم دائمی فضل کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ ہم تمہاری ہدایت کی غرض سے اور اپنے رحم سے کام لیتے ہوئے چند بار تو تمہاری دعاؤں کو سن کر مصائب ٹال دیں گے مگر ہمیشہ تو ایسا نہ ہوگا آخر ایک دن ہم تمہاری دعاؤں کو ردّ کر دیں گے اور عذاب میں مبتلا کر دیں گے۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ؕ تَاللّٰهِ

اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے ایک حصہ وہ (اپنے) ان (جھوٹے معبودوں) کے لئے مخصوص کر دیتے

لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۷﴾

ہیں جن (کی حقیقت) کے متعلق وہ (کچھ) علم نہیں رکھتے۔ اللہ (تعالیٰ) کی قسم جو کچھ تم (جھوٹ سے کام لے کر) اپنے پاس سے گھڑتے رہے ہو (ایک دن) اس کی نسبت تم سے یقیناً باز پرس ہوگی۔

حلّ لُغَات۔ اَلنَّصِيْبُ اَلنَّصِيْبُ الحَظُّ: حصہ۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں شرک کی ایک اور شناعت شرک کی ایک اور شناعت اس آیت میں بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ الٰہی نعمتوں کو ایسے وجودوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جن کے وجود کا خود کوئی ثبوت

نہیں۔ یہ دلیل شرک کے ردّ میں ایک زبردست ثبوت ہے۔ مشرکوں نے شرک کی تائید میں بعض ایسے فلسفیانہ مسائل بنا رکھے ہیں کہ ان میں پڑ کر کمزور دماغ کے آدمی کچھ حیران سے ہو جاتے ہیں اور شرک اور توحید میں فرق کرنا ان کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں شرک کے متعلق ایک ایسی عام فہم دلیل دی گئی ہے جو ان سب فلسفیانہ وسوسوں کو رد کر دیتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس اصولی بحث کو جانے دو کہ ایک سے زیادہ معبود ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ کسی چیز کا ہو سکنا اَور امر ہے اور ہونا اَور امر ہے۔ فرض کر لو کہ ایک سے زیادہ معبود ممکن ہوں مگر اس سے یہ تو ثابت نہیں ہو جاتا کہ کوئی خاص بت یا خاص انسان جسے خدا تعالیٰ کا شریک بنایا جاتا ہے وہ بھی سچا معبود ہے۔ اس امر کا ثبوت کہ کوئی شخص یا بت معبود سچا ہے تو الگ دینا ہوگا۔ فرماتا ہے اپنے ایک ایک معبود کو لے لو کیا ان میں سے کسی کی خدائی کا ثبوت بھی تمہارے پاس ہے۔ اگر کسی معبود کی خدائی کا ثبوت بھی تمہارے پاس نہیں تو صرف فلسفیانہ دلائل شرک کی تائید میں دے کر تم توحید کے حملہ سے کس طرح بچ سکتے ہو۔ یہ وہ دلیل ہے جس کے سامنے کوئی مشرک نہیں ٹھہر سکتا۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ایک سے زیادہ خدا ممکن ہیں۔ مگر یہ کیونکر ثابت ہوا کہ کالی بھی خدا ہے یا رام یا کرشن بھی خدا ہیں یا مسیح اور ایسے ہی ان لوگوں کے مزعومہ خدا، خدا ہیں۔ ان کے خدا ہونے کا تو الگ ثبوت دینا پڑے گا جو کبھی کوئی مشرک نہیں دے سکتا۔ وہ ہمیشہ عام فلسفیانہ دلائل شرک کی تائید میں پیش کرے گا۔ اپنے مزعومہ معبود کی تائید میں کبھی کوئی معقول دلیل نہ دے گا اور نہ دے سکے گا۔ کیونکہ شرک کی تائید میں فلسفیانہ دلائل دینا اور بات ہے اور ایک کمزور وجود کو خدا ثابت کرنا اور بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ نے ان سب وجودوں کے متعلق جن کو خدا مانا جاتا ہے ایسے زبردست شواہد ان کے کمزور اور بے بس ہونے کے پیدا کر رکھے ہیں کہ جب اس طرف رخ کیا جائے مشرک کی سب شیخی کرکری ہو جاتی ہے۔

لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ کے دو معنی لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ سے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ وہ ان معبودوں کو یہ حصہ دیتے ہیں جو معبود اس بات تک کو نہیں جانتے کہ انہیں خدا تعالیٰ کی صفات دی جا رہی ہیں۔ مثلاً بُت۔ نہریں۔ دریا۔ پہاڑ وغیرہ جن کو لوگ خدا بناتے ہیں خود بے جان اشیاء ہیں۔

ایسا ہی حضرت عیسیٰؑ اور حضرت امام حسینؓ ہیں۔ لوگ ان کی طرف الوہیت کو منسوب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انہوں نے فلاں فلاں چیز دی مگر اُن بے چاروں کو اس بات کا پتہ بھی نہیں (انجیل یوحنا باب ۱ آیت ۱۔ تحفہ اثناعشریہ از علامہ الہند حضرت مولانا شاہ عبد العزیز اردو ترجمہ مولانا عبد المجید باب دوم در مکائد شیعہ کید نمبر ۲۶)۔ کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی میں کوئی دعویٰ خدائی کا نہیں کیا۔ اس صورت میں لَا يَعْلَمُوْنَ کی ضمیر معبودوں کی طرف مانی جائے گی۔

دوسرے معنے وہی ہیں جو اوپر بیان ہو چکے ہیں یعنی ان ہستیوں کی طرف خدا تعالیٰ کے افعال کو منسوب کرتے ہیں جن کے خدا ہونے کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ ان معنوں کے رو سے لَا یَعْلَمُوْنَ کی ضمیر یَجْعَلُوْنَ کے فاعل کی طرف پھرے گی۔

تَاللّٰہِ لَتُسْـَٔلُنَّ کا مطلب تَاللّٰہِ لَتُسْـَٔلُنَّ پوچھنے سے مراد خالی دریافت کرنا ہی نہیں ہوتا بلکہ سزا دینا ہوتا ہے اور یہ ہر زبان و ملک کا محاورہ ہے۔ مطلب یہ کہ تمہارے اس افتراء کی تم کو ضرور سزا ملے گی۔

بعض لوگوں کا تَاللّٰہِ کے لفظ سے غلط استدلال بعض نادان تَاللّٰہِ کے لفظ سے یہ استدلال کیا کرتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام خدا کا نہیں ورنہ یہ کیوں کہا جاتا کہ خدا کی قسم۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے تھا کہ ہمیں اپنی قسم ہے (تفسیر القرآن از پادری ویری جلد ۳ ص ۳۵)۔ لیکن یہ استدلال درست نہیں کیونکہ شاہانہ کلام میں اس قسم کا طرز بیان جائز ہوتا ہے۔ کیونکہ نام کے اظہار سے رُعب پیدا کرنا مقصود ہے۔ باپ اپنے بیٹے پر اثر ڈالنے کے لئے بعض دفعہ یہ کہتا ہے کہ تمہارا باپ تم کو یہ حکم دیتا ہے۔ اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ بولنے والا باپ نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔ اسی طرح بادشاہ خاص زور دینے کے لئے کہا کرتے ہیں کہ تمہارا بادشاہ تم کو یوں حکم دیتا ہے اور اس سے یہ مراد نہیں لی جاسکتی کہ بادشاہ اس وقت اپنی بادشاہت کا انکار کر کے کسی اَور کی بادشاہی کا اعلان کر رہا ہے۔

وَ یَجْعَلُوْنَ لِلّٰہِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَہٗ ۙ

اور وہ اللہ (تعالیٰ) کی طرف لڑکیاں منسوب کرتے ہیں (یہ کیسا جھوٹ ہے) وہ پاک (ذات) ہے اور

وَ لَہُمْ مَّا یَشْتَہُوْنَ ﴿۵۸﴾

(لطف یہ کہ) انہیں (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) وہ کچھ حاصل ہے جو وہ چاہتے ہیں۔

حلّ لُغات۔ سُبْحَانَہٗ کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۱۹۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ اَیْ اُبَرِّئُ اللّٰہَ مِنَ السُّوْءِ بَرَاءَۃً سبحان کے معنی عیوب سے پاک سمجھنے اور پاک کرنے کے ہیں۔ (اقرب)

یَشْتَہُوْنَ یَشْتَہُوْنَ اِشْتَہٰی سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور اِشْتَہٰی کے معنے ہیں۔ کسی چیز کو پسند کیا۔ اور اس کے لینے کی تمنا کی (اقرب) پس وَلَہُمْ مَّا یَشْتَہُوْنَ کے معنے ہوں گے۔ ان کو وہ کچھ حاصل ہے

جو وہ چاہتے ہیں۔

تفسیر ۔اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالیٰ کو اس لئے ناراضگی ہے کہ وہ اس کی طرف بیٹے کیوں منسوب نہیں کرتے اور بیٹیاں کیوں منسوب کرتے ہیں۔ وہ تو بیٹوں کے عقیدہ پر بھی ویسا ہی ناراض ہوتا ہے جیسے بیٹیوں کے عقیدہ پر۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا ہے تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (مریم:۹۲) قریب ہے کہ آسمان پھٹ کر گر جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر جائیں کیونکہ یہ لوگ رحمٰن خدا کا ایک بیٹا تجویز کرتے ہیں۔ پس بیٹوں کا ذکر کر کے مشرکوں کی کم عقلی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور یہ بتایا ہے کہ غلط راہ پر چل کر انسان ایسی باتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے جو خود اس کے اپنے مسلّمات کے رو سے قابل اعتراض ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کی طرف بیٹیاں منسوب کرتے ہیں حالانکہ یہ لوگ بیٹیوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اگر عقل سے کام لیتے تو جس چیز کو یہ اپنے لئے ذلت کا موجب سمجھتے ہیں اس چیز کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہ کرتے۔

یہ اس امر کی دلیل بیان کی گئی ہے کہ الہام کے بغیر ہدایت کا راستہ تلاش کرنے میں انسان کیسی کیسی موٹی غلطیاں کر جاتا ہے۔ پھر باریک مسائل میں وہ کیوں غلطی نہ کرے گا۔ پس سچا راستہ بتانا صرف اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے۔

اس کے جواب میں ممکن تھا کہ وہ کہہ دیتے کہ ہم تو خدا کی طرف کوئی برائی منسوب نہیں کرتے۔ لڑکیاں بھی خدا کی ہی ایک نعمت ہیں اُسی کی پروردہ ہیں۔ اس لئے یہ کوئی عیب نہیں۔ اس کا جواب اگلی آیت میں دیا گیا ہے۔

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۹﴾

اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی (کی پیدائش) کی بشارت دی جائے تو اس کا منہ جب کہ وہ اپنے غیظ (وغضب) کو (سینہ میں) دبا رہا ہوتا ہے سیاہ ہو جاتا ہے۔

حلّ لُغات ۔بُشِّرَ بُشِّرَ بَشَّرَ سے مجہول کا صیغہ ہے۔ اور بَشَّرَہٗ کے معنے ہیں اَخْبَرَہٗ فَفَرِحَ اس کو ایسی خبر دی جس سے وہ خوش ہوا۔ (اقرب)

كَظِيْمٌ كَظِيْمٌ کے معنے ہیں اَلْمَكْرُوْبُ۔ رنجیدہ (اقرب) مزید تشریح کے لئے دیکھو یوسف آیت نمبر ۸۵۔

اَلْکُظُوْمُ اِحْتِبَاسُ النَّفْسِ۔ کُظُوْمٌ کے معنے ہیں سانس کا رکنا۔ وَیُعَبَّرُ بِهٖ عَنِ السُّکُوْتِ۔ خاموشی کے موقعہ پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ کَظَمَ الْغَیْظَ۔ حَبَسَهٗ۔ غَیْظ کے ساتھ جب کَظَمَ کا لفظ آئے تو اس کے معنے ہوتے ہیں غصہ کو روک لیا۔ کَظَمَ السِّقَاءَ شَدَّهٗ بَعْدَ مِلْئِهٖ مَانِعًا لِنَفَسِهٖ۔ اور جب سقاء کے لئے کَظَمَ کا لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں مشکیزہ بھر کر پانی کو محفوظ رکھنے کے لئے اس کا منہ بند کر دیا۔ پس کظیم ایسے شخص کو کہیں گے کہ جو اپنے اندر غصہ کو دبائے رکھے اور ظاہر نہ ہونے دے۔ (مفردات)

تفسیر ۔ یعنی ان کی یہ حالت ہے کہ ان میں سے کسی کو جب بیٹی کی پیدائش کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا ہو جاتا ہے اور غم اور شرم کے جذبات کو بمشکل دبا رہا ہوتا ہے۔ لیکن یہ شخص جو بیٹی کی پیدائش پر سیاہ رو ہو جاتا ہے اس ہستی کی طرف جو نور ہی نور ہے اسی چیز کو جسے اس قدر قابل شرم سمجھتا ہے منسوب کر دیتا ہے۔

یَتَوَارٰی مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَیُمْسِکُهٗ

(اور) جس بات کی اسے بشارت دی گئی ہے اس کی (مزعومہ) شناعت کے باعث وہ لوگوں سے چھپتا (پھرتا) ہے

عَلٰی هُوْنٍ اَمْ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا

(اور سوچتا ہے کہ) آیا وہ اسے (آئندہ آنے والی) ذلّت کے باوجود (زندہ) رہنے دے یا اُسے (کہیں) مٹی میں

یَحْکُمُوْنَ ۝۶۰

گاڑ دے۔ سنو! جو رائے وہ قائم کرتے ہیں بہت بری ہے۔

حلّ لُغات ۔ یَتَوَارٰی یَتَوَارٰی تَوَارٰی سے مضارع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور تَوَارٰی کے معنے ہیں۔ اِسْتَتَرَ چھپ گیا۔ (اقرب) پس یتواری کے معنے ہوں گے وہ چھپتا ہے۔

هُوْنٌ هَانَ الرَّجُلُ هُوْنًا کے معنے ہیں۔ ذَلَّ وَحَقَرَ وہ ذلیل اور حقیر ہو گیا۔ ضَعُفَ۔ کمزور ہو گیا۔ اَلْهُوْنُ هَانَ کا مصدر ہے۔ نیز اس کے معنے ہیں اَلْخِزْیُ۔ رسوائی۔ (اقرب)

یَدُسُّهٗ یَدُسُّهٗ دَسَّ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور دَسَّ الشَّیْءَ تَحْتَ التُّرَابِ کے معنی ہیں: اَدْخَلَهٗ فِیْهِ۔ وَدَفَنَهٗ تَحْتَهٗ وَاَخْفَاهٗ کسی چیز کو زمین میں دبا کر مخفی کر دیا (اقرب) پس اَمْ یَدُسُّهٗ کے معنے ہوں

گے۔ یا اُسے مٹی میں دبا دے۔ گاڑ دے۔

تفسیر ۔یعنی باوجود پدری محبت کے اس تذبذب میں پڑ جاتا ہے کہ ذلت برداشت کر کے لڑکی کو زندہ رہنے دے یا اس بے چاری کو زندہ درگور کر دے۔

لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا رواج سارے عرب میں نہ تھا اس بارہ میں یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ عام طور پر لوگوں کو یہ غلطی لگی ہوئی ہے کہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا رواج عربوں میں عام تھا۔لیکن یہ بات نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر ان کے ملک میں لڑکیوں کی تعداد بہت کم ہو جانی چاہیے تھی۔اصل بات یہ ہے کہ بے شک لڑکی کی پیدائش کو تو عرب کے سارے ملک میں ہی برا سمجھا جاتا تھا مگر ان کو زندہ دفن کرنے کا رواج عملاً صرف بعض بڑے بڑے اور متکبر لوگوں میں تھا۔لڑکی کی پیدائش کو برا سمجھنا اور بات ہے اور اسے زندہ درگور کر دینا اور۔آج تک لوگ لڑکی کی پیدائش کو عموماً برا سمجھتے ہیں اِلَّا ما شاء اللہ۔مگر انہیں مارتے چند ہی لوگ ہیں۔

لڑکیوں کے زندہ درگور کرنے کے ذکر میں صرف قوم کے عمائدین کا ذکر ہے عرب میں بھی یہ فعل مکہ میں بہت ہی کم ہوتا تھا۔عام طور پر ان قبائل میں جو اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتے تھے یہ طریق رائج تھا اور وہ بھی بعض بڑے لوگوں میں۔پس اس جگہ عام رسم کا ذکر نہیں بلکہ قوم کے عمائدین کے ایسے فعل کو بیان کیا گیا ہے جس کی نقل گو ساری قوم نہیں کرتی تھی مگر اسے ایک عزت کا فعل سب سمجھتے ہیں۔(تاریخ الاسلام السیاسی تألیف ڈاکٹر ابراہیم حسن جلد اول صفحہ ۶۵ مکتبۃ الحفظۃ المصریۃ بالقاھرۃ)

اَلَا سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ کا مطلب اَلَا سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ میں بتایا ہے کہ وہ جو بیٹیوں کو برا سمجھتے ہیں ان کا یہ فعل نہایت ہی گندہ ہے اگر بیٹیاں نہ ہوتیں تو وہ کس طرح پیدا ہوتے۔اور اگر آئندہ بیٹیاں نہ ہوں تو ان کے بیٹوں کی نسل کس طرح چلے۔

قرآن مجید کے ذریعہ عورتوں کی عزت کا قیام قرآن کریم نے شروع سے ہی عورتوں کی عزت کو قائم کیا ہے اور ان کے حق کو تسلیم کیا ہے۔مگر باوجود اس کے اب تک یہ کہا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں پر ظلم کیا۔بھلا وہ کون سی کتاب ہے جس میں ابتداء ہی سے عورت کے حقوق کی حفاظت اور نگہداشت کی گئی ہو۔وہ صرف اور صرف قرآن مجید ہی ہے۔

لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَ لِلّٰهِ

جولوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کی حالت بری ہے۔اور (ہر) اعلیٰ صفت (اور شان) اللہ (تعالیٰ) ہی

الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۱﴾

کی ہے۔اور وہی غالب (اور) حکمت والا ہے۔

ع ۷ / ۱۴

حلّ لُغات۔ اَلْمَثَلُ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى اعلیٰ صفت اور شان اللہ ہی کی ہے۔اَلْمَثَلُ کے معنے کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۳۶۔

اَلْمَثَلُ اَلشِّبْهُ۔ مشابہ۔ اَلنَّظِيْرُ۔ نظیر۔ اَلصِّفَةُ۔ بیان۔ اَلْحُجَّةُ۔ دلیل۔ يُقَالُ اَقَامَ لَهٗ مثلًا اَیْ حُجَّةً اور اَقَامَ لَهٗ مَثَلًا میں مَثَلًا دلیل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اَلْحَدِيْثُ۔ عام بات۔ اَلْقَوْلُ السَّائِرُ۔ ضرب المثل۔ اَلْاٰيَةُ۔ نشان۔

تفسیر۔مثل کے مختلف معنوں میں سے ایک معنے بات کے بھی ہوتے ہیں۔مثلاً عرب لوگ کہتے ہیں بَسَطَ لَهٗ مَثَلًا اَیْ حَدِيْثًا (اقرب) فلاں شخص نے اس سے خوب لمبی بات کی۔اس آیت میں مثل کا لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ جولوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے منہ سے جب بات نکلتی ہے بری ہی نکلتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بات بتائی جاتی ہے وہ اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے۔یہاں اصل مضمون جس کے بارہ میں سورت نازل ہوئی ہے کھول کر بیان کر دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جولوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہ کلام الٰہی کے وجود کے بھی منکر ہوتے ہیں اور اپنی ہدایت کے لئے خود قانون بنانا چاہتے ہیں لیکن اس کوشش میں بری طرح ناکام رہتے ہیں اور جو بات کرتے ہیں اُلٹی ہی کرتے ہیں۔لیکن جو کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے وہ سب عیبوں سے پاک ہوتا ہے اور سب خوبیوں کا جامع ہوتا ہے پھر کلام الٰہی کی ضرورت کا یہ لوگ کس طرح انکار کر سکتے ہیں۔

قرآن مجید کے بیان کا ایک خاص انداز اس جگہ کہا جا سکتا ہے کہ کیوں یوں نہ کہا گیا کہ جولوگ کلام الٰہی کے منکر ہوتے ہیں وہ غلط باتیں کرتے ہیں۔یہ کیوں کہا گیا کہ جولوگ یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے غلط باتیں کرتے ہیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کا ایک خاص انداز یہ بھی ہے کہ وہ ایسے طریق پر بات کرتا ہے کہ جس نقص کا وہ ذکر کر رہا ہو اس کے بواعث بھی وہ ساتھ ہی بیان کرتا جاتا ہے۔اسی انداز کو یہاں اختیار کیا گیا ہے اور یہ

بتایا گیا ہے کہ جو لوگ کلام الٰہی کی ضرورت کے منکر ہوتے ہیں وہ ایسا یوم آخر کے انکار کی وجہ سے کرتے ہیں۔ ورنہ کوئی شخص جو یوم آخر پر ایمان لاتا ہو کلام الٰہی کی ضرورت کا انکار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایسا شخص انسانی زندگی کا سب سے اہم زمانہ اسی زمانہ کو سمجھے گا جو مرنے کے بعد آنے والا ہے اور چونکہ مرنے کے بعد پھر واپس لوٹنے کی کوئی صورت نہیں وہ اُخروی زندگی کی اہمیت کو جانتے ہوئے اس ضرورت کو بھی محسوس کرے گا کہ اس عالم سے واقف ہستی کی طرف سے ہی وہ راہ بتائی جانی چاہیے۔ جس پر چل کر بعد الموت زندگی اچھی گذار سکے۔ اگر صرف اس قدر کہا جاتا کہ جو کلام الٰہی کے منکر ہیں ان کی باتیں غلط ہوتی ہیں تو اس سے یہ مفہوم ادا نہ ہو سکتا تھا۔

صفت عزیز اور حکیم سے یوم آخر کا ثبوت اَلْعَزِيْزُ اور اَلْحَكِيْمُ کی صفات آخر میں اس لئے رکھی ہیں تا اس طرف اشارہ ہو کہ غالب ہی اپنی طاقت کا اظہار کر سکتا ہے اور الحکیم ہی حکمتوں کو بیان کر سکتا ہے اس لئے یقیناً اس کی تعلیم اعلیٰ ہوگی اور انسان کی نجات کا موجب ہوگی۔ ورنہ جو حکیم نہیں اور عزیز نہیں وہ اول تو پُر حکمت کلام نہیں کر سکتا اور اگر کوئی بات کرے گا تو اس کے پورا کرنے کی اس میں طاقت نہ ہوگی۔

ان صفات سے یوم آخر کا بھی ثبوت پیش کیا اور بتایا کہ خدائے حکیم کا فعل حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا اور بغیر یوم آخرت کے انسانی پیدائش ایک بے حکمت فعل رہ جاتی ہے۔

اسی طرح عزیز خدا کا غلبہ کامل اس دنیا میں نہیں ہو سکتا اس کے لئے یوم آخر کی ضرورت ہے۔ اگر کہو اس دنیا میں کیوں نہیں ہو سکتا تو اس کا جواب صفت حکیم ہے یعنی اسی دنیا میں کامل غلبہ ظاہر ہو تو ایمان فضول ہو جاتا ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ

اور اگر اللہ (تعالیٰ کی یہ سنت ہوتی کہ وہ) لوگوں کو ان کے (ارتکاب) ظلم پر (فوراً) پکڑ لیتا (اور توبہ کے لئے مہلت

دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ

نہ دیتا) تو وہ اس (زمین) پر کسی جاندار کو (زندہ) نہ چھوڑتا مگر (اس کی یہ سنت ہے کہ) وہ (اصلاح کے لئے) انہیں

اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً

ایک معیّن وقت تک مہلت دیتا (چلا جاتا) ہے پھر جب ان (کی سزا) کا وقت آجاتا ہے تو وہ نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ

وَّ لَا يَسۡتَقۡدِمُوۡنَ ﴿۶۲﴾

(کرپیچھے ہٹ) سکتے ہیں اور نہ (اس سے) آگے نکل (کر بچ) سکتے ہیں۔

حلّ لُغات۔ دَآبَّۃٌ دَآبَّۃٌ کے لئے دیکھو نحل آیت نمبر ۵۰۔

اَجَلٌ اَجَلٌ کے معنے کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۳۹۔

اَلْاَجَلُ کے معنے ہیں مُدَّۃُ الشَّیْءِ۔ کسی چیز کی مدت۔ وَوَقْتُہُ الَّذِیْ یَحِلُّ فِیْہِ۔ کسی امر کی وہ مدت جب جا کر وہ واقعہ ہوتا ہے۔ (اقرب)

السَّاعَۃ السَّاعَۃُ کے معنے ہیں اَلْوَقْتُ الْحَاضِرُ۔ موجودہ وقت۔ اَلْقِیَامَۃُ۔ قیامت۔ وَقِیْلَ الْوَقْتُ الَّذِیْ تَقُوْمُ فِیْہِ الْقِیَامَۃُ۔ اور بعض نے اس سے یہ مراد لی ہے کہ وہ وقت جبکہ قیامت برپا ہوگی۔ وَعِبَارَۃٌ عَنْ جُزْءٍ قَلِیْلٍ مِنَ النَّھَارِ اَوِاللَّیْلِ: رات یا دن کے تھوڑے حصے کو بھی ساعۃ کہتے ہیں۔ جب یہ کہیں کہ جَلَسْتُ عِنْدَکَ سَاعَۃً مِنَ النَّھَارِ اَوِاللَّیْلِ تو اس کے معنے ہوتے ہیں۔ اَیْ وَقْتًا قَلِیْلًا مِنْہُ۔ یعنی میں تمہارے پاس کچھ دیر بیٹھا رہا۔ (اقرب)

تفسیر۔ آیت مَا تَرَکَ عَلَیْھَا مِنْ دَآبَّۃٍ سے کفار کے ایک شبہ کا ازالہ اس میں کفار کے ایک شبہ کا ازالہ کیا ہے جو پہلی آیت سے پیدا ہوسکتا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر انسان غلط تعلیم دیتا ہے اور خدا کی کلام ہی سے ہدایت ملتی ہے تو چاہیے تھا کہ سب کفار ہلاک ہوجاتے مگر وہ تو ہلاک نہیں ہوئے بلکہ دنیا میں کئی قسم کی ترقیاں ان کو ملتی ہیں معلوم ہوا کہ وہ بھی کوئی زیادہ غلطی پر نہیں ہیں یا یہ کہ وہ بھی حق پر ہیں۔ اس شبہ کا یہ جواب دیا کہ کلام الٰہی کو تو خیر تم نہیں مانتے لیکن بعض امور کو تو تم بھی خدا تعالیٰ کے منشاء کے خلاف سمجھتے ہو۔ مثلاً چوری، ڈاکہ، قتل وغیرہ۔ کیا ان جرائم کے مرتکب فوراً پکڑ لئے جاتے ہیں۔ اگر نہیں تو اس ڈھیل کو دیکھتے ہوئے تم الٰہی کلام کے منکروں پر فوری گرفت نہ آنے کی وجہ سے یہ کس طرح استدلال کرسکتے ہو کہ یہ کلام خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں ورنہ اس کے انکار پر فوراً گرفت ہوتی اور کوئی کافر نہ بچتا۔

فوری سزا نہ آنے کی وجہ پھر اس فوری گرفت نہ ہونے کی وجہ بھی بتائی کہ یہ ڈھیل کا قانون اللہ تعالیٰ نے اس لئے جاری کیا ہے کہ اس کے بغیر نسل انسانی چل ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ اگر ہر جرم کی سزا میں انسان کو فوراً تباہ کردیا جاتا تو دنیا پر انسان کی نسل کس طرح باقی رہتی۔ اگر کوئی کہے کہ دنیا میں نیک بھی تو ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک

نیک بھی ہوتے ہیں۔مگر یہ تو ضروری نہیں کہ نیکوں کے باپ دادا آدم تک سب نیک ہی ہوں ۔پس اگر ان کے باپ دادوں کو پکڑا جاتا اور وہ ہلاک کر دیئے جاتے تو ساتھ ہی ان کے وہ نسل بھی غائب ہو جاتی جس نے آئندہ کسی زمانہ میں نیک ہونا تھا۔پس اگر ہر گناہ پر اس دنیا میں گرفت کا قانون جاری ہو تو ماننا پڑے گا کہ دنیا کبھی کی تباہ ہو جانی چاہیے تھی مگر ایسا نہیں۔

ہر گناہ کی سزا فوری نہیں ملتی معلوم ہوا کہ ہر گناہ کی سزا فوراً نہیں ملتی اور یہ مزید ثبوت یوم آخرت کا ہے جہاں جزا سزا کا عمل تکمیل تک پہنچ جائے گا۔اگر اس دن کو نہ مانا جائے تو خدا تعالیٰ کا فیصلہ نامکمل رہ جاتا ہے۔

آیت مَا تَرَكَ عَلَيْهَا الخ پر ایک سوال اور اس کا جواب ایک سوال اس آیت کے متعلق یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیوں فرمایا گیا ہے کہ اگر ہر گناہ پر اسی دنیا میں گرفت ہو جاتی تو اس دنیا کے پردہ پر کوئی حیوان نہ رہتا۔ مکلف تو انسان ہیں سزا ملتی تو انسان کو ملتی دوسرے حیوان کیوں ہلاک ہو جاتے۔اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ شروع سورۃ میں بیان کیا گیا ہے باقی حیوان انسان ہی کے فائدہ کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔پس جب انسان ہلاک کر دیا جاتا تو ان کی بھی ضرورت نہ رہتی اور عام قیامت آجاتی۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ

اور وہ اللہ (تعالیٰ) کے لئے وہ چیز تجویز کرتے ہیں جسے وہ (خود اپنے لئے) ناپسند کرتے ہیں اور ان کی

اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ؕ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ

زبانیں (بڑی جرأت سے کام لے کر یہ) جھوٹ بولتی ہیں کہ انہیں بھلائی ملے گی یہ اٹل بات ہے کہ ان کے لئے

مُّفْرَطُوْنَ ﴿۶۳﴾

(دوزخ کی) آگ (کا عذاب مقدر) ہے اور یہ کہ انہیں (اس میں) چھوڑ دیا جائے گا۔

حلّ لُغات۔ تَصِفُ تَصِفُ وَصَفَ سے مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔اور وَصَفَ الشَّیْءَ کے معنے ہیں ۔نَعَتَهٗ بِمَافِيهِ وَحَلَّاهُ۔کسی چیز کو پورے طور پر اور عمدہ طریق سے بیان کیا ۔وَصَفَ الطَّبِيْبُ لِلْمَرِيْضِ: بَيَّنَ لَهٗ مَا يَتَدَاوٰى بِهٖ۔طبیب نے مریض کو علاج کے لئے دوا بتائی (اقرب) پس تَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ

الْکَذِبَ کے معنے ہوں گے۔ ان کی زبانیں جھوٹ بیان کرتی ہیں۔

اَلْحُسْنٰی کے معنے کے لئے دیکھو رعد ۱۹۔ یونس ۲۷۔

اَلْحُسْنٰی ضِدُّ السُّوْاٰی۔ حسنی۔ سوی۔ یعنی برائی کے مقابل کا لفظ ہے اور اس کے معنے ہیں اَلْعَاقِبَۃُ الْحَسَنَۃُ۔ اچھا انجام۔ الظَّفَرُ کامیابی۔ (اقرب)

لَاجَرَمَ کے معنے کے لئے دیکھو آیت نمبر ۲۳ و آیت نمبر ۲۴ سورۃ ھذا۔

مُفْرَطُوْنَ اَفْرَطَ سے اسم مفعول مُفْرَطٌ آتا ہے اور مُفْرَطُوْنَ اس کی جمع ہے۔ اَفْرَطَ الْاَمْرَ کے معنی ہیں نَسِیَہٗ۔ کسی بات کو بھول گیا۔ تَرَکَہٗ وَخَلَّفَہٗ۔ اس کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اَفْرَطَ عَلَیْہِ: حَمَّلَہٗ مَالَایُطِیْقُ: اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالا۔ وَمَا اَفْرَطْتُ مِنَ الْقَوْمِ اَحَدًا کے معنے ہیں اَیْ مَا تَرَکْتُ میں نے لوگوں میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑا (اقرب) پس اَنَّھُمْ مُّفْرَطُوْنَ کے معنے ہوں گے۔ انہیں اس میں چھوڑ دیا جائے گا۔

تفسیر۔ اس آیت میں پہلے مضمون کی طرف پھر ایک اور رنگ میں رجوع کیا ہے۔ فرماتا ہے کہ یہ لوگ کس طرح یقین رکھتے ہیں کہ ان کا انجام اچھا ہوگا جبکہ اللہ تعالیٰ کی نسبت وہ باتیں منسوب کرتے ہیں جن کو یہ خود بھی ناپسند کرتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی طرف عیب منسوب کرتے ہیں ان کا انجام کس طرح اچھا ہو سکتا ہے۔

اَنَّھُمْ مُّفْرَطُوْنَ کا مطلب وَ اَنَّھُمْ مُّفْرَطُوْنَ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح انہوں نے خدا تعالیٰ کو چھوڑ دیا ہے ان کو بھی اللہ تعالیٰ عذاب میں ڈال کر چھوڑ دے گا اور وہ خبر نہ لے گا۔

تَاللّٰہِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓی اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَیَّنَ لَھُمُ

اللہ (تعالیٰ) کی قسم! ہم نے تجھ سے پہلے کی (تمام) امتوں کی طرف رسول بھیجے تھے پھر انہیں شیطان نے ان کے

الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَھُمْ فَھُوَ وَلِیُّھُمُ الْیَوْمَ وَ لَھُمْ عَذَابٌ

(بد) اعمال خوبصورت کر کے دکھائے سو آج وہی ان کا آقا (بنا ہوا) ہے اور ان کے لئے (آج) دردناک

اَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾

عذاب (مقدر) ہے۔

حلّ لُغَات ۔اَلْوَلِيُّ کے معنے ہیں اَلْمُحِبُّ وَالصَّدِيْقُ دوست اور محبت کرنے والا۔اَلنَّصِيْرُ مددگار۔ وَكُلُّ مَنْ وَلِيَ اَمْرَ اَحَدٍ فَهُوَ وَلِيُّهُ۔جس شخص کے قبضہ میں کسی کا معاملہ ہو۔(اقرب)

تفسیر ۔تَاللّٰهِ کے متعلق دیکھو آیت نمبر ۵۶ سورۃ نحل۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ پہلے نبیوں کے زمانے میں بھی شیطان نے انبیاء کے مخالفین کو یہ تسلی دے کر گمراہ کئے رکھا تھا کہ جو ہم کر رہے ہیں اس پر کوئی گرفت نہیں۔یہی حال ان کا ہے یہ بھی اس قدر غلطیاں کر کے مطمئن بیٹھے ہیں اور جانتے نہیں کہ ایک دردناک عذاب ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ

اور ہم نے اس کتاب کو تجھ پر اسی لئے اتارا ہے کہ جس (جس) بات کے متعلق انہوں نے (باہم) اختلاف

الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً

(پیدا) کرلیا ہے اس (کی اصل حقیقت) کو ان پر روشن کرے۔اور (نیز) جو (اس پر) ایمان لائیں ان کی

لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۶۵﴾

رہنمائی کے لئے اور (ان پر) رحمت (نازل) کرنے کے لئے۔

تفسیر ۔ **کلام الٰہی کے نزول کی ضرورت** یعنی کلام الٰہی کے نزول کی ایک اور بھی ضرورت ہے کہ دنیا میں لوگوں میں اخلاقی اور مذہبی امور کے بارہ میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔یہ اختلاف بغیر اس کے کس طرح دور ہوسکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک یقینی علم حاصل ہوجائے۔پس اس علم کے دینے کے لئے یہ کتاب نازل ہوئی ہے۔اس کے سوا کون سی تعلیم دنیا کے اختلاف مٹا سکتی ہے۔اگر دنیا کو معلوم ہوجائے کہ یہ کلام خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے تب تو وہ اپنے خیالات کو چھوڑ دے گی۔اس کے بغیر وہ کس طرح اپنے خیالات کو چھوڑ سکتی ہے۔

کیونکہ طبعاً ہر شخص اپنے خیالات کو دوسروں کے خیالات پر ترجیح دیتا ہے۔

انبیاء کی بعثت کی ضرورت اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ تم کو پہلے نبیوں کے بعد دوسرے نبی کے آنے پر اعتراض ہے۔ دوسرا نبی تو خود تمہارے اعمال کی وجہ سے آیا ہے تم نے سچائی کو چھوڑ کر اختلاف کیوں کیا۔ تم اختلاف نہ کرتے تو بے شک نبی کی ضرورت نہ ہوتی مگر تم نے مرض تو پیدا کر لی اب کہتے ہو کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کسی اختلاف کو دور کرنے والے شخص کی آمد کی ضرورت نہیں۔

مذکورہ بالا مضمون پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ فرض کرو لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر ہی عمل کرتے رہتے اور اختلاف نہ کرتے تو کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کامل شریعت یا کامل تعلیم نہ آتی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ فرضی کلام ہے۔ حقیقتاً نہ اختلاف کرنے سے لوگوں نے رکنا تھا اور نہ اس تعلیم کے آنے میں روک پیدا ہونی تھی۔ مگر بفرض محال ایسی صورت ہوتی بھی تو اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل :۹۶) اگر دنیا میں سب فرشتے ہی فرشتے ہوتے یعنی سب کے سب انسان نیک ہوتے تو ہم ان میں سے ہر ایک شخص پر اپنا کلام نازل کرتے یعنی اس صورت میں ایک نبی قوم کی طرف نہ بھیجا جاتا بلکہ سب ہی نبی ہو جاتے اور انکار اور کفر کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا۔ مگر نہ دنیا سب کی سب نیک بنی نہ خدا تعالیٰ نے نبیوں کے سلسلہ کو بند کیا۔

هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ میں مضمون کے دوسرے پہلو کو لیا کہ جو اختلاف کرتے ہیں ان کے لئے تیرا یہ کام ہے کہ قرآن کریم کے رو سے ان کے اختلاف دور کرے اور جو مومن ہیں ان کے لئے ترقئ مدارج اور رحمت کے حصول کا ذریعہ اس قرآن کو بنائے۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ

اور اللہ (تعالیٰ) نے (ہی) آسمان سے (عمدہ) پانی اتارا ہے اور اس کے ذریعہ سے اس نے تمام زمین کو اس کے

بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً

مردہ ہو چکنے کے بعد (از سرنو) زندہ کیا ہے۔ جو لوگ (حق بات کو) سنتے (اور اسے قبول کرنے کے لئے

لِّقَوۡمٍ يَّسۡمَعُوۡنَ ﴿٦٦﴾ ع

تیار ہوتے) ہیں ان کے لئے اس میں یقیناً ایک (بہت بڑا) نشان (پایا جاتا) ہے

تفسیر ۔ پانی سے مراد کلام الٰہی اس جگہ پانی سے مراد کلام الٰہی ہے۔ کیونکہ پانی کے نزول کے ذکر کے بعد لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّسۡمَعُوۡنَ فرمایا ہے۔ یعنی اس پانی کے نزول میں سننے والوں کے لئے نصیحت ہے۔ مادی پانی کے نزول میں سننے والوں کے لئے نشان نہیں ہوتا۔ بلکہ دیکھنے والوں یا سمجھنے والوں یا غور کرنے والوں کے لئے نشان ہوتا ہے۔ سننے کے لفظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں روحانی پانی یعنی کلام الٰہی مراد ہے اور پہلے نبیوں کی وحیوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کئی دفعہ آسمان سے روحانی پانی اتار چکا ہے اور اس کے ذریعے سے دنیا کو زندہ کر چکا ہے اگر تم پہلے انبیاء کے حال سنتے تو ضرور اس صداقت کو تسلیم کرتے۔

اَحۡيَا بِهِ الۡاَرۡضَ سے هُدًى وَّرَحۡمَةً ہونے کی دلیل اَحۡيَا بِهِ الۡاَرۡضَ سے وَهُدًى وَّرَحۡمَةً کی دلیل دی کہ یہ کلام کیوں مسلمانوں کے لئے رحمت اور ہدایت ثابت نہ ہوگا جبکہ سابق کلام مردہ قوموں کو زندہ کرتے چلے آئے ہیں۔ جو اس وقت ہوا وہی اب بھی ہوگا۔

وَاِنَّ لَكُمۡ فِى الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَةً ؕ نُسۡقِيۡكُمۡ مِّمَّا فِىۡ

اور تمہارے لئے چار پایوں میں (بھی) یقیناً نصیحت حاصل کرنے کا ذریعہ (موجود) ہے (کیا تم دیکھتے نہیں کہ)

بُطُوۡنِهٖ مِنۡۢ بَيۡنِ فَرۡثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا

جو کچھ ان کے پیٹوں میں (گند وغیرہ بھرا) ہوتا ہے اس میں سے یعنی گوبر اور خون کے درمیان سے ہم تمہیں پینے

لِّلشّٰرِبِيۡنَ ﴿٦٧﴾

کے لئے (پاک اور) صاف دودھ (مہیا کر) دیتے ہیں جو (اس کے) پینے والوں کے لئے خوشگوار (بھی) ہوتا ہے۔

حلّ لُغات ۔ اَلۡاَنۡعَامُ اَلنَّعَمُ: اَلۡاِبِلُ وَالشَّاءُ وَقِيۡلَ خَاصٌّ بِالۡاِبِلِ۔ نَعم کا لفظ اونٹ اور بکریوں پر بولا جاتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ صرف اونٹوں پر بولا جاتا ہے۔ وَقَالَ فِى الۡمِصۡبَاحِ النَّعَمُ: اَلۡمَالُ

الرَّاعِیْ وَھُوَ جَمْعٌ لَاوَاحِدَ لَهٗ مِنْ لَفْظِهٖ وَاَکْثَرُ مَا یَقَعُ عَلَى الْاِبِلِ۔اور مصباح میں یوں لکھا ہے کہ نَعَم چرنے والے جانوروں کو کہتے ہیں۔اور لفظ نعم جمع ہے۔اور اس کے مادہ (ن۔ع۔م) سے اس کا کوئی مفرد نہیں (جیسے عربی میں نِسْوَۃٌ کا لفظ ہے جس کے معنے عورتوں کے ہیں۔اس کا مفرد اس کے مادہ میں سے نہیں آتا۔ہاں مفرد کے لئے اِمْرَءۃٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے)وَقَالَ اَبُوْ عُبَیْدٍ اَلنَّعَمُ: اَلْجِمَالُ فَقَطْ وَیُؤَنَّثُ وَیُذَکَّرُ۔اور ابوعبید کہتے ہیں کہ نَعَم کا لفظ صرف اونٹوں پر بولا جاتا ہے۔اور یہ نر اور مادہ دونوں پر استعمال ہوتا ہے۔اس کی جمع اَنْعَامٌ ہے۔وَقِیْلَ النَّعَمُ :اَلْاِبِلُ خَاصَّةً وَالْاَنْعَامُ ذَوَاتُ الْخُفِّ والظِّلفِ وَھِیَ الْاِبِلُ وَالْبَقَرُ وَالْغَنَمُ۔اور بعض کہتے ہیں کہ نَعَم کا لفظ اونٹوں کے لئے خاص ہے لیکن انعام میں اونٹ بھیڑ اور گائے سبھی شامل ہیں۔وَقِیْلَ یُطْلَقُ الْاَنْعَامُ عَلٰی ھٰذِہِ الثَّلَاثَةِ فَاِذَا انْفَرَدَتِ الْاِبِلُ فَھِیَ نَعَمٌ۔وَاِنِ انْفَرَدَتِ الْغَنَمُ وَالْبَقَرُ لَمْ تُسَمَّ نَعَمًا اور بعض کے نزدیک انعام کا لفظ بھیڑ اونٹ اور گائے کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے۔اور اگر اونٹوں کو ان سے علیحدہ کیا جائے تو اونٹوں کے لئے نَعَم کا لفظ بولا جائے گا مگر صرف گائے بھیڑ بکریوں کو نَعَم نہیں کہیں گے۔(اقرب)

فَرْثٌ اَلسِّرْجِیْنُ مَادَامَ فِی الْکَرِشِ۔گوبر جب وہ اوجھری میں ہو فرث کہلاتا ہے۔(اقرب)

سَائِغًا السَّائِغُ:اَلسَّھْلُ الْمُدْخِلُ مِنَ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ۔کھانے پینے کی آسانی سے حلق سے اترنے والی اشیاء سائغ کہلاتی ہیں۔(اقرب)

تفسیر۔انعام میں عبرت یہ فرما کر کہ چارپایوں میں بھی تمہارے لئے عبرت ہے کیا لطیف بات بیان فرمائی ہے۔چارپائے غذا کے طور پر بھی کام آتے ہیں۔ان میں سے دودھ بھی لیا جاتا ہے ان کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے۔اس کے علاوہ انعام اسباب اٹھانے کے بھی کام آتے ہیں۔

انعام کا بوجھ اٹھانے کے لئے کام میں استعمال ہونا عرب میں زیادہ تر اونٹ اس کام آتے تھے کیونکہ وہاں گائے بیل کم ہوتے ہیں۔لیکن دوسرے ملکوں میں بیل بھی بوجھ اٹھا کر لے جانے میں بہت مدد دیتے ہیں۔رہ گئیں بکریاں اور بھیڑیں سو بعض پہاڑی ملکوں میں ان سے بھی اسباب اٹھانے کا کام لیا جاتا ہے خصوصاً جبکہ سفر اونچے پہاڑوں کا ہو تو ان جانوروں پر تھوڑا تھوڑا اسباب لاد کر گلّے پالنے والے کرایہ کا فائدہ بھی اٹھا لیتے ہیں۔میں نے کانگڑہ میں دیکھا ہے کہ لاہول کے پہاڑوں پر سے آنے والے گڈریے اپنے اسباب کثرت سے بھیڑوں پر لاد کر لاتے ہیں۔سینکڑوں بھیڑوں پر دس دس بیس بیس سیر اسباب لدا ہوا عجیب لطف دیتا ہے۔پس سب انعام ہی

اسباب اٹھانے کا کام دیتے ہیں۔پس عِبْرَۃٌ کا لفظ جو عُبُوْرٌ سے نکلا ہے جس کے معنے سفر کے بھی ہوتے ہیں۔اسے استعمال کر کے اس طرف اشارہ فرمایا کہ جانوروں سے سفروں میں کام لیتے ہو وہ تم کو اور تمہارے اسباب کو ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لے جاتے ہیں مگر ان سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔یعنی اپنے ذہنوں کے سفر میں ان سے مدد نہیں لیتے اور ان کی حالت پر غور کر کے اس زیر بحث مسئلہ میں جہالت کے ملک سے علم کے ملک کی طرف سفر نہیں کرتے۔

عِبْرَۃٌ کے معنی عِبْرَۃٌ کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ ایک چیز کو دیکھ کر دوسری اُسی کے مشابہ چیز کی طرف ذہن کا انتقال کیا جائے اور پہلی پر قیاس کر کے دوسری کو سمجھا جائے۔پس جانوروں کے ذکر میں عبرۃ کا لفظ استعمال فرما کر ایک عجیب پر لطف مضمون پیدا کر دیا گیا ہے۔

وہ عبرۃ کیا ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے وہ خود ہی اگلے الفاظ میں بیان فرما دی ہے اور وہ یہ ہے کہ چارپائے گھاس پتے کھاتے ہیں جس سے گوبر بنتا ہے پھر گوبر میں سے ایک حصہ خون بنتا ہے اور اس خون کا ایک حصہ دودھ بن جاتا ہے جسے انسان مزے لے کر پیتا ہے اور وہ ایسا خالص ہوتا ہے کہ کوئی نفاست پسند انسان بھی اس کے پینے میں کراہت محسوس نہیں کرتا۔حالانکہ دودھ پہلے خون تھا اور خون اس فضلہ سے بنتا ہے جو غذا سے جانور کے معدہ میں تیار ہوتا ہے اور وہاں سے انتڑیوں میں جا کر باریک عروق کے ذریعہ سے دل کی طرف لے جایا جاتا ہے جہاں جاتے ہی وہ خون بن جاتا ہے اور خون تھنوں میں آ کر دودھ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

گھاس پتوں سے دودھ بنانے کے ذکر سے روحانی تعلیم کے صاف کرنے کی طرف اشارہ

اس آیت میں اس مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہی گھاس اور پتے جن کو انسان استعمال نہیں کر سکتا جانور کے پیٹ میں جا کر گوبر بنتے ہیں اور اس سے خون بنتا ہے اور اس سے دودھ اور وہ دودھ خالص ہوتا ہے کوئی گندگی اس میں نہیں ہوتی اور پینے میں مزہ دار ہوتا ہے۔اس گھاس کو انسان اس جانور سے باہر دودھ کی شکل میں تبدیل نہیں کر سکتا لیکن اللہ تعالیٰ اس کو لے کر جانور کے ذریعہ سے دودھ بنا دیتا ہے۔اس سے انسانوں کو نصیحت حاصل کرنی چاہیے کہ وہی فطرتی تعلیم جس پر چل کر انسان یقین کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا اور ہزاروں گند اور نقص اس میں پائے جاتے ہیں۔جب اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی روحانی مشین میں سے گذرتی ہے تو مصفّٰی دودھ کی طرح ہو جاتی ہے جس سے کسی قسم کا نقصان روحانی صحت کو نہیں پہنچ سکتا بلکہ ہر طرح فائدہ پہنچتا ہے۔پس جانوروں کے اندر جو دودھ بنتا ہے اس سے یہ لوگ کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے اور نہیں سمجھتے کہ انسان کی سچی غذا فطرت کے میلان تب ہی بن سکتے

ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ ان کو روحانی دودھ کی شکل میں بدل دے۔ اور یہ کام انسان خودنہیں کرسکتا۔ جو گھاس کو دودھ میں تبدیل نہیں کرسکتا وہ فطرت کے اَن گھڑے جذبات کو اعلیٰ تعلیم میں کب تبدیل کرسکتا ہے۔

اس آیت میں ایک لفظی اشکال اس آیت میں ایک لفظی اشکال بھی ہے اور وہ یہ کہ بطونہٖ میں مفرد کی ضمیر ہے اور ماقبل اس کے آنعام جمع کا لفظ ہے۔ مفسرین نے اس کے دو جواب دیئے ہیں۔ ایک یہ کہ مفرد کی ضمیر معنیً پھرائی گئی ہے اور مراد یہ ہے کہ جس چیز کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ یعنی انعام۔ اس کے پیٹ میں مذکورہ طریق سے دودھ بنتا ہے گو یا ضمیر انعام کی طرف نہیں بلکہ مَاذُکِرَ یامَاذَکَرْنَاہُ کی طرف ہے اور ما کی طرف خواہ وہ جمع کے لئے ہو مفرد کی ضمیر پھیرنی جائز ہے۔ (تفسیر فتح البیان زیر آیت ھذا)

مختلف مفسرین کے نزدیک لفظی اشکال کی تاویل دوسری تاویل مفسرین یہ کرتے ہیں کہ کبھی جمع کا لفظ بول کر اس کی طرف مفرد ضمیر اس اشارہ کے لئے لاتے ہیں کہ اس کے ہر فرد یا اس کی ہر قسم کے ساتھ یہ معاملہ گذرتا ہے۔ یہ دونوں تاویلات درست ہیں اور عربی قواعد کے مطابق ہیں۔

سائنس کی موجودہ تحقیق دودھ بننے کے متعلق قرآن مجید کے بیان کے مطابق ہے یہ آیت اس امر پر بھی شاہد ہے کہ قرآن کریم کا نازل کرنے والا دنیا کا خالق بھی ہے کیونکہ اس میں دودھ کے پیدا ہونے کا وہ طریق بتایا گیا ہے جو اس وقت دنیا کو معلوم نہ تھا اور بعد میں دریافت ہوا ہے۔ اور وہ یہ کہ غذا معدہ میں سے انتڑیوں میں آتی ہے اور اس سے فرث تیار ہوتا ہے اس فرث سے ایک مادہ خون بن جاتا ہے اور اس خون سے دودھ بنتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو نزول قرآن کے بعد کی تحقیق سے ثابت ہوئی ہے۔ چنانچہ بعد کے مفسرین نے ابتدائی مفسرین کی غلطی کو پیش کر کے ظاہر کیا ہے کہ درحقیقت فرث سے خون اور خون سے لبن بنتا ہے۔ مگر جو تشریح انہوں نے بیان کی ہے وہ بھی پوری طرح سائنس کے مطابق نہیں۔ لیکن قرآن کریم کے الفاظ سائنس کی موجودہ تحقیق کے بالکل مطابق ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ غذا معدہ سے انتڑیوں میں جاتی ہے وہاں سے اس کا منہضم لطیف حصہ بعض عروق کے ذریعہ سے ایک حصہ سیدھا دل تک جاتا ہے اور وریدوں میں گر کر فوراً خون بن جاتا ہے اور ایک اور لطیف حصہ معدہ سے براہ راست جگر میں جا کر وہاں سے وریدوں کے ذریعے دل میں گر کر خون بن جاتا ہے پھر یہ خون جب تھنوں کے قریب جاتا ہے تو وہاں اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان پیدا کئے ہیں کہ وہ خون وہاں جا کر دودھ بن جاتا ہے۔

پرانے زمانہ کے لوگوں کی دودھ کے بننے کے طریقہ سے ناواقفیت اس حقیقت سے پرانے زمانہ کے لوگ ایسے ناآشنا تھے کہ مفسرین نے اس آیت کے معنے کرنے میں سخت مشکلات محسوس کی ہیں اور رائج الوقت

خیالات کے مطابق یہ سمجھا ہے کہ شاید فرث اور خون کے بننے کے درمیان کوئی تغیر ایسا ہوتا ہے جس سے دودھ بنتا ہے۔ چنانچہ صاحب کشاف لکھتے ہیں کہ جب غذا جانور کے معدہ میں جاتی ہے تو اس کا نچلا حصہ گوبر بن جاتا ہے اور درمیانی حصہ دودھ بن جاتا ہے اور اوپر کا حصہ خون بن جاتا ہے (کشاف زیر آیت ھذا)۔ حالانکہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ فرث اور خون میں سے ہوتے ہوئے دودھ کا مادہ آتا ہے یعنی پہلے فرث کی حالت ہوتی ہے پھر خون کی پھر دودھ کی۔ اور ان پہلی دو چیزوں میں سے کسی کو بھی انسان خوشی سے کھانے کو تیار نہیں ہوتا۔ نہ گوبر کھانے پر راضی ہو سکتا ہے اور نہ خون پینے پر خوشی سے تیار ہو سکتا ہے۔ لیکن جب وہی خون دودھ بن جاتا ہے تو اسے خوب مزے لے کر پیتا ہے اور اس میں فرث کی گندگی اور اور خون کے زہروں میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی تھوڑی سی مقدار میں بھی دودھ نہیں بنا سکتا۔ ممکن ہے کسی وقت لوگ کچھ دودھ بھی بنا لیں۔ لیکن اس طرح ساری دنیا کو غذا نہیں پہنچا سکتے۔ یوں تو لوگ گیسوں سے پانی بھی بنا لیتے ہیں۔ لیکن وہ چند قطرے پانی کے بادلوں کا کام نہیں دے سکتے۔ اسی طرح اگر کسی وقت کوئی شخص گھاس پات سے دودھ بھی بنا لے تو تعجب نہیں۔ مگر دنیا کو غذا دینے کا کام پھر بھی جانوروں کے سپرد ہی رہے گا جس طرح پانی مہیا کرنے کا کام بادلوں کے سپرد ہے۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ انسان غذا کو گندہ تو کر سکتا ہے لیکن اس سے دودھ نہیں بنا سکتا۔ اسی طرح انسان انبیاء کی تعلیم کو لے کر خراب تو کر دیتے ہیں لیکن انسان دماغوں میں پائی جانے والی غیر مصفّٰی فطرتی صداقتوں کو مصفّٰی اور اعلیٰ روحانی تعلیم نہیں بنا سکتے۔

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ

اور کھجوروں کے پھلوں اور انگوروں سے (بھی کہ) جن سے تم شراب (بھی) بناتے ہو اور اچھا رزق (بھی) جو لوگ

سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۶۸

عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لئے اس میں یقیناً ایک (بڑا) نشان (پایا جاتا) ہے۔

حلّ لُغَات ۔ اَلنَّخِيْلُ النَّخِيْلُ نَخْلٌ کی جمع ہے اور یہ مؤنث استعمال ہوتا ہے۔ لیکن نَخْلٌ کا لفظ مؤنث مذکر دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اس کے معنے ہیں کھجور کے درخت۔ (اقرب)

اَلْاَعْنَابُ اَلْاَعْنَابُ عِنَبٌ کی جمع ہے اور عِنَبٌ کے معنے ہیں ثَمَرُ الْکَرْمِ وَھُوَ طَرِیٌّ۔ فَاِذَا یَبِسَ فَھُوَ الزَّبِیْبُ یعنی عنب تازہ انگوروں کو کہتے ہیں۔ جب وہ خشک ہوجائیں تو وہ زبیب (منقّہ) کہلاتے ہیں۔ (اقرب)

سَکَرًا اَلْخَمْرُ۔ شراب۔ نَبِیْذٌ یُتَّخَذُ مِنَ التَّمْرِ وَالْکَشُوْثِ۔ کھجوروں کا رس۔ کُلُّ مَا یُسْکِرُ۔ ہر نشہ آور چیز۔ اَلْخَلُّ۔ سرکہ۔ اَلطَّعَامُ۔ کھانا۔ (اقرب)

تفسیر۔ مفسرین کے نزدیک سکر کے معنی شراب کے اس آیت میں بعض مفسرین نے سکر کے معنے شراب کے کئے ہیں۔ پھر ان کو یہ مشکل پڑی ہے کہ اس آیت میں سکر کو تو اللہ تعالیٰ انعام کے طور پر ذکر فرما رہا ہے حالانکہ شراب ناجائز ہے۔ اس پر انہوں نے یہ تاویل کی ہے کہ یہ آیت اس وقت کی نازل شدہ ہے جبکہ شراب جائز تھی۔ اور یہ جواب دے کر انہوں نے اس آیت کو منسوخ قرار دے دیا ہے (تفسیر القرطبی زیر آیت ھذا)۔ بعض لوگوں نے اس مشکل کو مدنظر رکھتے ہوئے سکر سے کھانا مراد لیا ہے۔ ان معنوں پر دوسرے علماء نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر یہ معنے ہوں تو آیت میں تکرار واقع ہوجائے گا۔ کیونکہ آگے وَ رِزْقًا حَسَنًا بھی بیان فرمایا ہے۔ اس کا انہوں نے یہ جواب دیا ہے کہ سکر کے لفظ میں طاقت مدنظر رکھی ہے اور رزق میں غذائیت مدنظر رکھی ہے۔ (تفسیر البغوی زیر آیت ھذا)۔ یہ سب مشکل ان کو اس لئے پڑی ہے کہ انہوں نے جواز اور عدم جواز کا مسئلہ اس جگہ سے نکالنا چاہا ہے۔

تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَکَرًا کا مطلب حالانکہ خدا تعالیٰ اس جگہ بات ہی یہ بتانا چاہتا ہے کہ بسا اوقات ہماری پیدا کردہ طیّب چیزیں جب تم تصرّف کرتے ہو تو اسے گندہ کر دیتے ہو۔ وہی چیز جو تازہ ہونے کی حالت میں پاک ہوتی ہے جب تم اس میں تغیر کرتے ہو تو کیسی گندی ہوجاتی ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔ ان الفاظ سے اس طرف اشارہ کیا کہ عقل مند سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ جس چیز کو جس غرض سے بناتا ہے اس میں تغیر کرنا اس کی اصلاح کا موجب نہیں ہوتا بلکہ خراب کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ پس نہ تو انسان خود روحانی تعلیم بنا سکتا ہے نہ اسے یہ اختیار ہے کہ خدا تعالیٰ کی بھیجی ہوئی تعلیم میں کسی قسم کا دخل دے اور اسے اس مقصد سے پھرا دے جس کے لئے وہ نازل ہوئی ہے ورنہ ضرور خرابی پیدا ہوجائے گی۔

وَ اَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِیۡ مِنَ الۡجِبَالِ

اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف (بھی) وحی کی (ہوئی) ہے کہ تو پہاڑوں میں اور درختوں میں اور جو (انسان

بُیُوۡتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعۡرِشُوۡنَ ﴿ۙ۶۹﴾

انگوروں وغیرہ کے لئے) ٹیک بناتے ہیں ان میں (اپنے) گھر بنا۔

تفسیر ۔ **وحی الٰہی کی ضرورت کے متعلق تیسری مثال** وحی الٰہی کی ضرورت کے متعلق یہ تیسری مثال بیان فرمائی ہے اور اس میں پہلی دو مثالوں سے بھی زیادہ وضاحت ہے۔

یہاں فرمایا ہے کہ ہم نے نحل یعنی شہد کی مکھی کی طرف بھی اس کے ظرف کے مطابق ایک وحی کی ہے اور وہ وحی یہ ہے کہ پہاڑوں پر یا درختوں پر یا عرشوں پر گھر بنا۔ یہ وحی استعداد باطنی ہے جو شہد کی مکھی میں پیدا کی گئی ہے۔

تمام کائنات کا کارخانہ وحی الٰہی پر چل رہا ہے اور اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ تمام کائنات کا کارخانہ وحی الٰہی پر چل رہا ہے۔ کسی پر وحی خفی نازل ہوتی ہے کسی پر وحی جلی۔ مگر بہرحال سب کارخانہ وحی پر چل رہا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقتوں اور میلانوں پر چل کر ہی ہر چیز اپنا صحیح فرض ادا کرتی ہے۔ اگر اس طریق کو چھوڑ دے تو کبھی اپنا فرض اچھی طرح ادا نہ کر سکے۔

خدا تعالیٰ کی وحی کی وسعت اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی وحی بہت وسیع ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وحی نہیں آسکتی (محمدیہ پاکٹ بک از مولانا عبداللہ صاحب امرتسری ص ۶۱۴) حالانکہ اس آیت سے جانوروں کو بھی وحی ثابت ہوتی ہے۔ اس وحی سے Instinct یعنی طبعی میلانوں کی طرف اشارہ ہے۔ اس قسم کی وحی عارضی طور پر انسان کو بھی ہوتی ہے۔ بعض دفعہ یکدم اس کو کوئی خیال آتا ہے جو اس کے لئے بہت مفید ہوتا ہے۔ دنیا کے تمام موجد یہی کہتے ہیں کہ اکثر ایجادوں کا خیال ان کے دل میں یکدم پیدا ہوا یا ایجاد کا خیال تو علمی تحقیق کے سلسلہ میں پیدا ہوا لیکن کئی درمیانی مشکلات کا حل ایک فوری ذہنی لہر کے پیدا ہونے سے حاصل ہوا۔

ایڈیسن جو سب سے بڑا موجد ہے۔ اس نے اپنے متعلق صاف لکھا ہے کہ میں نے ایک ہزار ایجاد کی ہے ان میں سے سب سے بڑی ایجادیں ایک فوری خیال کی بناء پر ہوئی ہیں۔ درحقیقت یہی وہ کیفیت ہے جسے صوفی لوگ

الہام کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

جانوروں کی تحقیقات میں سے شہد کی مکھی اور چیونٹی کی تحقیقات بہت وسیع ہوئی ہے۔اس تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ چیونٹیوں میں بہت بڑا بھاری نظام ہوتا ہے۔یہ ہاتھوں سے بات کرتی ہے۔انسان کی طرح اپنی لاش کی حفاظت کرتی ہے غلے کا ڈھیر رکھتی ہے۔سردی اور گرمی کے مکانات علیحدہ علیحدہ رکھتی ہے۔چوبارے بناتی ہے۔ایک قسم کا کیڑا ہے جس میں سے ایک مادہ نکلتا ہے جو چیونٹی کے لئے دودھ کا کام دیتا ہے ان کیڑوں کو یہ جمع کر کے اپنے گھروں میں رکھتی ہیں۔اوران کی غذا کا خیال رکھتی ہیں اور جب غلہ میں کمی ہو تو تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ وہ ان کیڑوں کو پہلے غذا دیتی ہیں۔پھر بچ رہے تو خود کھاتی ہیں۔ان میں لڑائیاں بھی ہوتی ہیں۔صلح بھی ہوتی ہے۔غرض ایک وسیع نظام ان میں پایا جاتا ہے(The Book of Knowledge under word Ant)۔یہ سب ایک قسم کی وحی خفی کے نتیجہ میں ہے۔

شہد کی مکھیوں کا نظام اور اس کے ذکر کی وجہ اسی طرح نحل کا بھی بڑا عظیم الشان نظام ہے۔بعض ماہروں کا خیال ہے کہ انسانوں کے نظام سے ان کا نظام بہتر ہوتا ہے۔ان کا احساس بعض باتوں میں انسان سے زیادہ ہوتا ہے۔ان کے ہر چھتہ میں ایک ملکہ ہوتی ہے۔سب مکھیاں اس کی پیروی کرتی ہیں۔ان کی نسلیں علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں انسانوں کی طرح سب مل کر نہیں رہتیں۔جب نئی ملکہ پیدا ہوتی ہے تو پرانی مکھیاں اس کو مارنا چاہتی ہیں تو ساری نئی جوان مکھیاں اس کا پہرہ دیتی ہیں اور مل کر اس کی حفاظت کرتی ہیں وہ ملکہ بڑی ہو کر اپنے ساتھیوں سمیت علیحدہ چھتہ بناتی ہے۔پھر ملکہ لڑائی کر کے یا تو پہلی بڑی مکھیوں کو پہلے چھتہ سے نکال دیتی ہے یا شکست کھا کر دوسری جگہ پر چلی جاتی ہے۔ان کے نظام کی اور بھی تفصیلات ہیں جو حیرت انگیز ہیں (The Book of Knowledge under word Ant)۔ خدا تعالیٰ نے نحل کے ذکر کو اس لئے چنا ہے کہ یہ معلوم ہو کہ ایک بالا ہستی ہے جس نے اسے یہ علم دیا ہے اور اس کو ایسا نظام دیا ہے جو خود اس کا سوچا ہوا نہیں ہے۔نیز اس مثال کو اس لئے چنا ہے کہ شہد کی مکھی کا نظام معمولی غور سے نظر آجاتا ہے۔اور اس لئے بھی کہ اس سے ایک ایسی غذا پیدا ہوتی ہے جسے انسان نے بہترین سمجھا ہے۔اس نظام کا اس میں پایا جانا یہ بتاتا ہے کہ اس میں عقل ہے۔مگر اس کا ایک ہی حالت میں رہنا اور ترقی نہ کر سکنا یہ بتاتا ہے کہ وہ نظام اس کو کسی اور ہستی نے دیا ہے اور باہر سے آیا ہے اس نے خود وہ نظام تیار نہیں کیا۔

آیت اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا سے انسانوں کے مختلف درجہ میں مورد وحی ہونے کی طرف اشارہ اس آیت میں اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ نحل یعنی شہد کی مکھیاں بھی مختلف قسم کی ہیں بعض

پہاڑوں میں چھتے بناتی ہیں، بعض میدان کے درختوں پر اور بعض گھروں یا ان عرشوں پر جو انگور وغیرہ کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔اس سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ انسانوں میں سے مَورِدِ وحی بھی ایک سے نہیں ہوتے۔بعض کا مقام پہاڑ پر ہوتا ہے بعض کا درخت پر اور بعض کا چھتوں اور عرشوں پر۔یعنی بعض بہت اونچے مقام کے ہوتے ہیں بعض ان سے ادنیٰ اور بعض ان سے ادنیٰ۔اس میں گویا اسی مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے جو آیت تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (البقرۃ:۲۵۴) میں بیان کیا گیا ہے۔

ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ

پھر ہر قسم کے پھلوں میں سے (تھوڑا تھوڑا لے کر) کھا اور اپنے رب کے (بتائے ہوئے) طریقوں پر جو (تیرے لئے)

يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ

آسان (کئے گئے) ہیں چل۔ان (مکھیوں) کے پیٹوں سے (تمہارے) پینے کی ایک (لطیف) چیز نکلتی ہے جو

شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً

مختلف رنگوں کی ہوتی ہے (اور) اس میں لوگوں کے لئے شفاء (کی خاصیت رکھی گئی) ہے۔جو لوگ سوچ (اور فکر)

لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۷۰

سے کام لیتے ہیں ان کے لئے اس میں یقیناً کئی نشان (پائے جاتے) ہیں۔

حلّ لُغَات۔اُسْلُكِيْ: اُسْلُكِيْ سَلَكَ سے امر مؤنث مخاطب واحد کا صیغہ ہے۔اور سَلَكَ الْمَكَانَ سَلْكًا کے معنے ہیں: دَخَلَ فِيْهِ۔وَ كَذَا سَلَكَ الطَّرِيْقَ دَخَلَهٗ سَارَ فِيْهِ مُتَّبِعًا اِيَّاهُ۔کسی جگہ میں داخل ہوا۔ یا کسی راستہ پر چلا۔اس سے اسم فاعل سَالِكٌ آتا ہے (اقرب) مزید تشریح کے لئے دیکھو حجر آیت نمبر ۱۴۔

نَسْلُكُ سَلَكَ سے مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے۔اور سَلَكَ الْمَكَانَ سَلْكًا وَ سُلُوْكًا کے معنی ہیں دَخَلَ فِيْهِ کسی جگہ میں داخل ہوا اور اس کے اندر گیا سَلَكَ الطَّرِيْقَ اَيْ دَخَلَهٗ وَسَارَ فِيْهِ مُتَّبِعًا اِيَّاهُ۔فَهُوَ سَالِكٌ۔اور سَلَكَ الطَّرِيْقَ کے معنی ہیں۔راستہ اختیار کر کے اس پر چل پڑا اور اس سے اسم فاعل سَالِكٌ (یعنی

راستہ اختیار کر کے اس پر چلنے والا) آتا ہے۔سَلَكَ الشَّيْءَ فِي الشَّيْءِ: اَدْخَلَهٗ فِيْهِ كَمَا تُسْلَكُ الْيَدُ فِي الْجَيْبِ وَالْخَيْطُ فِي الْإِبْرَةِ اور سَلَكَ الشَّيْءَ فِي الشَّيْءِ کے معنی ہیں۔ایک چیز کو دوسری چیز کے اندر داخل کیا جیسے گریبان میں ہاتھ ڈالنا یا سوئی کے سوراخ میں تاگہ ڈالنا۔وَفِي الْقُرْآنِ سَلَكْنٰهُ فِي قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ۔اور قرآن مجید کی آیت سَلَكْنٰهُ فِي قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ میں یہ لفظ انہی معنوں میں آیا ہے۔وَسَلَكَ فُلَانًا الْمَكَانَ کے معنے ہیں اَدْخَلَهٗ۔فلاں شخص کو مکان میں داخل کیا۔(اقرب)

ذُلُلًا۔ذُلُلًا ذَلُوْلٌ کی جمع ہے۔اور ذَلُوْلٌ ذَلَّ (يَذِلُّ ذُلًّا وَذِلًّا) سے صیغہ صفت ہے اور ذَلَّ الْبَعِيْرُ کے معنے ہیں۔ضِدُّ صَعُبَ۔اس کا کام میں لانا آسان ہو گیا۔کہتے ہیں۔ذَلَّتْ لَهُ الْقَوَافِيْ اَيْ سَهُلَتْ۔قافئے اس کے تابع ہو گئے ہیں اور شعر بنانا اس کے لئے آسان ہو گیا۔پس ذلول کے معنے ہوں گے آسان (اقرب) آیت فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا میں ذُلُلًا کے معنے ہیں مُنْقَادَةً غَيْرَ مُتَصَعِّبَةٍ آسان جو مشکل نہ ہو (مفردات) پس فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا کے معنے ہوں گے کہ اپنے رب کے بتائے ہوئے طریقوں پر جو تیرے لئے آسان کئے گئے ہیں چل۔

اَلْوَانٌ اَلْوَانٌ کے لئے دیکھو نحل آیت نمبر ۶۹ جلد ھذا۔

تفسیر۔اس میں مکھی کی مزید تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ مکھی کو ہم یہ وحی بھی کرتے ہیں کہ مختلف پھلوں پھولوں سے غذا لے اور پھر اس کو ان ذرائع سے کام لے کر جو ہم نے تیرے اندر پیدا کئے ہیں اور احکامِ الٰہی کے مطابق چل کر شہد تیار کر۔پھر فرماتا ہے کہ جب وہ شہد نکلتا ہے تو وہ مختلف رنگوں اور مختلف قسموں کا ہوتا ہے۔مگر سب قسموں کے اور سب رنگوں کے شہدوں میں یہ خاصیت مشترک ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے لئے شفاء کا موجب ہوتے ہیں۔

اس میں انسانی وحی کی طرف اشارہ فرمایا کہ وہ وحی بھی مختلف وقتوں اور مختلف رنگوں میں نازل ہوتی رہی ہے ایک نبی کی تعلیم دوسرے نبی کی تعلیم سے بعض باتوں میں مختلف ہوتی تھی لیکن باوجود اس کے ہر نبی کی وحی اس قوم کے لئے جس کے لئے وہ نازل ہوتی تھی شفاء کا موجب ہوتی تھی۔

فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ سے ہر انسان کے صاحب وحی ہو سکنے کی طرف اشارہ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ہر انسان صاحبِ وحی ہو سکتا ہے۔لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریق پر فرمانبرداری سے چلے اور جہاں تک فطرت کا تعلق ہے اُسے خراب نہ ہونے

دے۔ جب وہ اپنی فطرت کو پاک رکھے اور اس وحی پر عمل کرے جو وحی خفی کے رنگ میں ہر انسان بلکہ ہر مخلوق پر نازل ہوتی ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ اس پر وہ وحی نازل کرتا ہے جو شہد کی مانند ہوتی ہے۔ یعنی خالص ہوتی ہے اور اس میں بنی نوع انسان کے لئے شفاء کی خاصیت ہوتی ہے۔ یعنی انسانی کمزوریوں کو دور کر کے انسان کو کامل بنا دیتی ہے۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً میں وحی الٰہی کے بغیر کسی کام کے نہ چل سکنے کی طرف اشارہ

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ۔ اس میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بغیر وحی الٰہی کے دنیا میں کوئی کام نہیں چلتا۔ جو انسان کہتا ہے کہ میں خود ہدایت کا کام کرلوں گا وہ غلطی پر ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس مضمون پر خاص زور دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ انسانی کوشش دنیوی امور میں بہ منزلہ دعا کے ہے اور اس کے نتیجہ میں انسان کے ذہن میں جو تدبیر آتی ہے وہ بھی وحی ہے۔ غرض مکھی کی مثال سے یہ بتایا ہے کہ کلام الٰہی کے بغیر کامیاب زندگی ناممکن ہے حتیٰ کہ جانور بھی وحی کے محتاج ہیں اور ان پر ایک قسم کی وحی نازل ہوتی ہے جس کی نمایاں مثال شہد کی مکھی میں پائی جاتی ہے۔ پس جبکہ موجودات کے ہر طبقہ کے لئے خدا نے وحی نازل کی ہے حالانکہ ان کی زندگی محدود اور عقل مختصر ہے تو انسان جس کی زندگی کا اثر اگلے جہان پر بھی پڑتا ہے اس کا نظام بغیر وحی کے کس طرح چل سکتا ہے۔

کلام الٰہی بھی شہد کی طرح شفاء کی تاثیر رکھتا ہے

قرآن کریم کے متعلق متعدد جگہ وہی الفاظ آئے ہیں جو شہد کے بارہ میں اس آیت میں آئے ہیں اور ان سے یہ بتایا ہے کہ یہ کلام اپنے اندر وہی خاصیت رکھتا ہے جو وحی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے یعنی شفاء کی تاثیر۔ چنانچہ سورۃ بنی اسرائیل رکوع ۹ میں فرماتا ہے وَ نُنَزِّلُ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ مَا ھُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحۡمَۃٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ (آیت: ۸۳)۔ سورۃ یونس رکوع ۶ میں فرماتا ہے یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ مَّوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ (آیت: ۵۸)۔ پھر حٰمٓ سجدہ رکوع ۵ میں فرماتا ہے قُلۡ ھُوَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ھُدًی وَّ شِفَآءٌ (آیت: ۴۵)۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۙ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى

اور اللہ (تعالیٰ) نے تمہیں پیدا کیا ہے پھر وہ تمہاری روحیں قبض کرتا ہے اور تم میں سے بعض (بعض آدمی)

اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ

ایسا ہوتا ہے کہ وہ عمر کی بدترین حالت کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ علم (والا ہونے) کے

عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۷۱﴾ ع

ع ۹ ۱۵

بعد (پھر) بے علم ہو جاتا ہے۔ اللہ (تعالیٰ) یقیناً بہت جاننے والا (اور) ہر بات پر پورا (پورا) قادر ہے۔

حلّ لُغَات۔ اَرْذَلِ الْعُمُرِ اَرْذَلُ کے معنے ہیں اَلدُّوْنُ فِیْ مَنْظَرِہٖ وَحَالَاتِہٖ۔ اپنے حالات اور منظر میں حقیر۔ اَلرَّدِیُّ مِنْ کلِّ شَیْءٍ۔ ہر چیز کا ردّی حصہ۔ اَرْذَلُ الْعُمُرِ۔ اٰخِرُہٗ فِیْ حَالِ الْکِبَرِ وَالْعَجْزِ۔ بڑھاپے اور کمزوری میں عمر کا آخری حصہ۔ عمر کی بدترین حالت (اقرب) پس وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰی اَرْذَلِ الْعُمُرِ کے معنے ہوں گے کہ تم میں سے بعض ایسے ہیں جو عمر کی بدترین حالت کی طرف لوٹا دیئے جاتے ہیں۔

تفسیر۔ مَنْ یُّرَدُّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ کا مطلب پچھلے رکوع میں تو اس بات کا ذکر تھا کہ تمہارے معبود کلام الٰہی نہیں بنا سکتے۔ اس رکوع میں اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ تم خود بھی کلام نہیں بنا سکتے۔ اب اسی سلسلہ میں ایک عام بات بیان فرمائی کہ کامل کلام تو وہ بنا سکتا ہے جس کے قبضہ میں پیدائش اور موت کا اختیار ہو۔ پھر اپنی عقل پر بھی اُسے قبضہ حاصل ہو۔ پس انسان کلام تیار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ نہ اس کے قبضہ میں پیدائش ہے کہ وہ اپنی تعلیم کے مطابق خاصیتیں دوسرے انسانوں میں رکھ دے نہ اس کے قبضہ میں موت ہے کہ وہ بعد الموت زندگی کے سامان پیدا کر سکے۔ نہ اس کے قبضہ میں عقل ہے کہ وہ ایسے وجود بنی نوع انسان کی تعلیم کے لئے مقرر کر سکے جن کی عقل ہمیشہ سلامت رہے۔ کئی حکومتیں بہترین دماغ کے انسان چن کر پروفیسر مقرر کرتی ہیں لیکن وہ بوڑھے ہو کر اُلٹی سیدھی باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ اب یہ فرق کون کرے کہ کس وقت سے ان کے دماغ میں فتور شروع ہوا ہے کہ اس وقت کی باتوں کو ردّی قرار دے۔ پس کئی شاگرد ایسے ضعیف دماغ کی باتوں کو صحیح سمجھ کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ پس کلام ہدایت خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے آ سکتا ہے۔ کیونکہ وہی انسان کا پیدا کرنے والا ہے اور اس کی ضرورتوں کو سمجھتا ہے وہی وفات دینے والا ہے اور بعد الموت اس کی رہنمائی کا فرض ادا کر سکتا ہے اُسی کے قبضہ میں انسانی عقل ہے۔ پس وہ جن لوگوں کو اس وحی کے کام پر مقرر کرتا ہے ان کی عقلوں کی صحت کا بھی ضامن ہوتا ہے۔

کوئی نبی ارذل العمر تک نہیں پہنچا سوچنے والوں کے لئے یہ ایک بہت بڑا نشان ہے کہ آج تک کوئی نبی دنیا میں نہیں گذرا جو ارذل العمر تک پہنچا ہو اور جس کی نسبت یہ کہا جا سکے کہ فلاں وقت دماغی کمزوری کی وجہ سے اس کی باتوں کا اعتبار نہیں رہا تھا۔ کیا سینکڑوں نبیوں میں سے جن کو دنیا جانتی ہے ایک بھی ایسی مثال کا نہ ملنا اس امر کا ثبوت نہیں کہ ان کو بھیجنے والا عقل انسانی کا مالک ہے۔ اس لئے اس نے جن کو اپنے بندوں کی تعلیم پر مقرر کیا ان کی عقل کی

بھی خود ہی حفاظت کی۔

قومی زندگی کو لیا جائے تو اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ قوموں پر بھی بڑھاپا آتا ہے اور وہ علم کو بھلا بیٹھتی ہیں۔ اس وقت ایک نئی نسل کی ضرورت ہوتی ہے جن کو خدا تعالیٰ پھر نئے سرے سے اپنی وحی کے ذریعے تعلیم دے۔

اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ قَدِیۡرٌ کہہ کر اس طرف اشارہ کیا کہ جس کا علم قائم رہتا ہے اور جو قدرت سے کام کر سکتا ہے، الہام نازل کرنا اسی کا کام ہے۔

وَ اللّٰہُ فَضَّلَ بَعۡضَکُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ فِی الرِّزۡقِ ۚ فَمَا الَّذِیۡنَ

اور اللہ (تعالیٰ) نے رزق میں (بھی تو) تم میں سے بعض کو بعض سے بڑھایا (ہوا) ہے۔ پھر جن لوگوں کو فضیلت دی

فُضِّلُوۡا بِرَآدِّیۡ رِزۡقِہِمۡ عَلٰی مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُمۡ

گئی ہے وہ اپنا (مقبوضہ) رزق (کسی صورت میں بھی تو) ان کی طرف جن پر ان کے داہنے ہاتھ قابض ہیں لوٹانے

فَہُمۡ فِیۡہِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعۡمَۃِ

والے نہیں تا وہ اس میں برابر (کے حصہ دار) ہو جائیں۔ پھر کیا وہ (اس حقیقت کے جاننے کے باوجود)

اللّٰہِ یَجۡحَدُوۡنَ ﴿۷۲﴾

اللہ (تعالیٰ) کی نعمت کا انکار کرتے ہیں۔

حلّ لُغَات۔ عَلٰی مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُمۡ ھُوَ مَلَکَۃُ یَمِیۡنِیۡ کے معنے ہیں۔ اَمۡلِکُہٗ وَأَقۡدِرُ عَلَیۡہِ۔ کہ میں اس کا مالک ہوں اور اس پر پورا قابو رکھتا ہوں (اقرب) پس عَلٰی مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُمۡ کے معنے ہوں گے جن پر ان کے داہنے ہاتھ قابض ہیں۔

نِعۡمَۃ نِعۡمَۃٌ کے لئے دیکھو سورۃ ہذا آیت نمبر ۵۴۔

یَجۡحَدُوۡنَ یَجۡحَدُوۡنَ جَحَدَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور جَحَدَ حَقَّہٗ اور بِحَقِّہٖ کے معنے ہیں۔ اَنۡکَرَہٗ مَعَ عِلۡمِہٖ بِہٖ۔ اس نے جان بوجھ کر کسی کے حق کا انکار کر دیا۔ کَفَرَ بِہٖ اس کا انکار کیا۔ کَذَّبَہٗ۔ اس کو

جھٹلایا۔(اقرب) پس یَجۡحَدُوۡنَ کے معنے ہوں گے کہ اللہ کی نعمتوں کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں۔

تفسیر ۔ **اس آیت میں الہام الٰہی کے نزول کی دلیل** اس آیت میں الہام کی ایک اور زبردست دلیل دی ہے اور وہ یہ کہ الہام الٰہی صرف عقائد کی اصلاح ہی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے علاوہ اس کے ذریعہ سے دنیاوی حکومتوں کے توازن کی بھی اصلاح کی جاتی ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ کا بعض افراد یا بعض قوموں پر فضل نازل ہوجاتا ہے اور وہ دوسروں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ یہاں تک تو عام قانون ہے اور اگر ایسے لوگ انصاف سے کام لیں اور کسی کی حق تلفی نہ کریں تو قابل اعتراض بات نہیں۔ لیکن ہمیشہ ہوتا یہ ہے کہ جن لوگوں کے اختیار میں دنیا آتی ہے وہ کسی صورت میں ان لوگوں کے ساتھ جو ان کے غلام یا بمنزلہ غلام ہوں ان اختیارات کو تقسیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے جو انہیں حاصل ہو چکے ہوں۔ ان کے قبضہ سے دنیا کو نکال کر عزت اور رتبہ کو لیاقت اور قابلیت اور بنی نوع انسان کی مساوات کی بنیاد پر رکھنے کا صرف اور صرف ایک علاج ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نبی ارسال فرما کر پھر بنی نوع انسان کو ان کے حقوق واپس دلائے۔

جو لوگ ملکوں اور حکومتوں کی باگ پر قابض ہوجاتے ہیں ان کا بڑا بہانہ یہی ہوتا ہے کہ دنیا کا انتظام لائق آدمیوں کے ہاتھ میں رہنا چاہیے۔ اور وہ بعض خاندانوں اور گھرانوں کو لیاقت کے لئے مخصوص کر لیتے ہیں اور بادشاہتیں قائم ہوجاتی ہیں۔ بعض خاندان حکومت کرنے کے اہل قرار دے دئے جاتے ہیں اور عوام الناس سے نہ کوئی رائے لیتا ہے نہ ان کا انتظام میں کوئی دخل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ حقوق انسانوں کے مذہبی لیڈر، پیر اور کاہن چھین لیتے ہیں۔ دین کو پنڈتوں، مولویوں اور پادریوں کی جائداد قرار دے لیا جاتا ہے۔ نہ عوام کو دین سے واقف رکھا جاتا ہے نہ انہیں اس کے متعلق دلچسپی لینے کا موقعہ دیا جاتا ہے۔ بس یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ ان کا کام صرف مذہبی پیشواؤں کے بتائے ہوئے مسائل کو ماننا ہے۔ مذہبی کتابوں پر خود غور کرنا اور ان سے فائدہ اٹھانا ان کا کام نہیں۔

غرض جب قوم نبوت کے زمانہ سے دور ہوجاتی ہے اس کے حقوق بعض خاندانوں کے قبضہ میں بطور توارث چلے جاتے ہیں اور عام لوگ دین اور دنیا کے معاملہ میں بھی مشورہ دینے یا رائے دینے کے قابل نہیں سمجھے جاتے اور اس فرق اور امتیاز کو ایک فرضی قابلیت کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔ ایک بادشاہ کا احمق بیٹا دنیا کا سب سے بڑا سمجھدار سمجھا جاتا ہے۔ وہ نادان خود ایسا مغرور ہوتا ہے کہ جب دنیا کے سامنے اپنا کوئی احمقانہ اعلان کرتا ہے تو اس میں اس قسم کے نامعقول الفاظ استعمال کرتا ہے کہ مابدولت نے لوگوں کے فائدہ کے لئے فلاں اعلیٰ تجویز سوچی ہے جس کا اظہار

اس اعلان کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے۔ اور کبھی وہ اس قسم کا اعلان کرتا ہے کہ اہل دنیا کی یہ خوش قسمتی ہے کہ مابدولت فلاں بات میں اس کے شریک ہیں اور جس قدر وہ بے وقوف ہوتا ہے اُسی قدر زیادہ تعلّی کرتا ہے۔

یہی حال مذہبی دنیا کا ہوتا ہے۔ علماء کے بیٹے نیم علم رکھتے ہوئے اور غور وفکر کی طاقتوں سے محروم ہوتے ہوئے صرف اس لئے مشائخ میں سے کہلاتے ہیں کہ وہ علماء کی اولاد ہیں۔ اور دنیا سے مطالبہ کرتے ہیں کہ بغیر دلیل کے ان کی جاہلانہ باتوں کو تسلیم کیا جائے اور جو ان کے سامنے خدا تعالیٰ کا کلام رکھے۔ اُسے ان فرسودہ قصوں اور بے معنی روایتوں کا جن کی سند ان کے پاس کوئی نہیں ہوتی انکار کرنے والا قرار دے کر کافر ومرتد قرار دے دیا جاتا ہے۔

نبی لوگوں کو آزادی عمل اور آزادی رائے دینے کے لئے آتا ہے ایسے وقت میں صرف ایک نبی ہی کام آسکتا ہے اور ان امور کا علاج کرسکتا ہے۔ جب وہ ظاہر ہوتا ہے تو وہ جاہل جو اپنے آپ کو عالم کہتے تھے اس کی شناخت سے محروم رہ جاتے ہیں اور وہ عالم جو جاہل کے نام سے مشہور تھے اپنی بصیرت اور پاکیزہ فطرت کی مدد سے اس پر ایمان لے آتے ہیں۔ تب فرشتوں اور شیطان کی لڑائی شروع ہوجاتی ہے۔ اور وہ جو نا قابل سمجھے جاتے تھے قابلیت کے نام پر بنی نوع انسان کو غلام بنا کر رکھنے والوں کی ایک ایک تدبیر کو اس طرح کچل ڈالتے ہیں کہ جیسے چیل مردار کی بوٹیوں کو پتھروں پر مارتی ہے اور ان خودساختہ قابلوں کی قابلیت کی قلعی کھل جاتی ہے اور مدتوں سے دبے ہوئے عوام کو پھر اُبھرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ اور انسانیت پھر آزادی کا سانس لیتی ہے۔ یہی مضمون ہے جسے اس آیت میں بیان کیا گیا اور بتایا گیا ہے کہ جس کے قبضہ میں خدا تعالیٰ کی نعمت آجائے وہ انہیں جنہیں اس نے غلام بنا کر رکھا ہے۔ کبھی اپنے حصہ میں برابر کا شریک نہیں بناتا۔ بھلا کبھی بھی بنی نوع انسان کو ایسے لوگوں نے آزادی رائے اور آزادی عمل دی ہے۔ اگر نہیں تو پھر نبیوں کے سوا جو وقتاً فوقتاً آکر دنیا کو آزادی بخشیں اور کون سی صورت انسان کی ترقی کی رہ جاتی ہے؟

شریعت کے نزول کی ضرورت اس دلیل میں نبوت کی عملی ضرورت کو ثابت کیا گیا ہے اور یہ ایسی زبردست دلیل ہے کہ ہر صاحبِ بصیرت اسے دیکھ کر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ نبوت کے بغیر کبھی بھی دنیا اپنے حقوق کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ یہ نعمت جب تک دنیا کو بار بار نہ ملے انسان کا قدم ترقی کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔

اَفَبِنِعۡمَةِ اللّٰهِ سے عوام الناس کو ملامت اَفَبِنِعۡمَةِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ سے عوام الناس کو ملامت کی ہے کہ تمہاری ہی آزادی کے لئے یہ رسول آیا ہے۔ اور تم اس نعمت کی ناقدری کرتے ہوئے انہی ظالموں کے ساتھ مل کر کام کررہے ہو جو تمہارے حقوق پر ناجائز طور پر قابض ہورہے ہیں۔

ملکیت کے بارہ میں اسلامی نقطہ نگاہ اس آیت میں نہایت لطیف پیرایہ میں اس قانون کو جو ملکیت کے بارہ میں اسلام نے پیش کیا ہے بیان کیا گیا ہے۔ایک طرف رِزْقِهِمْ کہہ کر مال و امتعہ پر ان لوگوں کا قبضہ تسلیم کیا گیا ہے جو مالدار اور بڑے ہوتے ہیں۔دوسری طرف بِرَآدِّيْ کہہ کر جس کے معنے واپس لوٹانے والے کے ہیں یہ امر تسلیم کیا ہے کہ مال کے مالک عوام الناس ہیں۔کیونکہ لوٹائی وہی چیز جاتی ہے جو دوسرے کی ہو۔اپنی چیز دی جاتی ہے لوٹائی نہیں جاتی۔پس ان دو الفاظ سے بظاہر متضاد مضمون نکلتا ہے۔

بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ سے ہر چیز پر دو ملکیتوں کی طرف اشارہ رِزْقِهِمْ بتاتا ہے کہ مالدار لوگ اپنے مالوں کے مالک ہیں اور بِرَآدِّيْ بتاتا ہے کہ عوام الناس ان مالوں کے مالک ہیں۔مگر درحقیقت اس میں تضاد نہیں۔

اسلام نے ملکیت پر بعض حقوق بنی نوع انسان کو دیئے ہیں اور بعض کمانے والے کو اسلام کی تعلیم کا امتیازی نشان ہی یہ ہے کہ اس نے ہر چیز پر دو ملکیتوں کو تسلیم کیا ہے۔اس شخص کی ملکیت کو بھی جس نے اسے کمایا اور من حیث الجماعت بنی نوع انسان کی ملکیت کو بھی۔بعض حقوق کمانے والے کو دئے گئے ہیں۔اور بعض حقوق بنی نوع انسان کو۔کیونکہ اصل ملکیت دنیا کی اشیاء پر ہر انسان کو بحیثیت انسان حاصل ہے۔پھر یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ قبضہ ایسا نہ ہو کہ دوسرے انسانوں کی ترقی میں روک ہو۔بلکہ وہ دروازے کھلے رہیں جن میں سے ہو کر دوسرے لوگ بھی آگے آسکیں۔اس پر زکوٰۃ،ورثہ اور سونے چاندی کے جمع کرنے کی ممانعت،سود کی ممانعت وغیرہ مسائل سے بہت واضح روشنی پڑتی ہے۔مگر یہ موقعہ ان امور کے بیان کا نہیں۔خلاصہ یہ کہ اسلام نہ تو بے قید شخصی ملکیت کا قائل ہے اور نہ غیر محدود جماعتی تصرف کا۔وہ دونوں کو قیود سے پابند کر کے انفرادی اور جماعتی کشمکشوں کو اپنے اپنے دائرہ میں اپنی قابلیتوں کے اظہار کا موقعہ دیتا ہے۔

مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ اس سے مراد عام طور پر غلام ہیں اور قرآن مجید کے محاورہ میں بھی اکثر جگہ یہی معنے مستعمل ہوئے ہیں۔مگر اپنی بناوٹ کے لحاظ سے یہ لفظ عام ہے۔جو شخص کسی نہ کسی لحاظ سے کسی کے قبضہ و تصرف میں ہو وہ بھی اس لفظ کے اندر شامل ہے۔اس لحاظ سے تمام ماتحت نوکر،مزارعین اور مزدور وغیرہ اس کے اندر شامل ہوں گے۔

اس آیت میں شریعت کے خود بنانے والوں کا جواب اس آیت میں اس سوال کا بھی جواب دیا گیا ہے کہ شریعت ہم خود ہی بنالیں گے خدائی الہام کی کیا ضرورت ہے۔اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتا ہے کہ شریعت بنانا خدا کا ہی حق ہونا چاہیے کیونکہ صحیح قانون وہی بنا سکتا ہے جس کی اپنی غرض حقوق کی تقسیم میں کوئی نہ ہو۔اگر غرض والا

شخص شریعت بنائے گا تو وہ اپنا اور اپنی قوم کا فائدہ مدنظر رکھے گا۔ مثلاً اگر شریعت کا بنانا مردوں کے سپرد ہوگا تو وہ عورتوں کے حقوق پوری طرح ادا نہ کریں گے اور اگر امراء قانون بنائیں گے تو وہ امراء کے حقوق کا خاص خیال رکھیں گے اور غرباء کے حقوق کو نظر انداز کر دیں گے۔ علیٰ ہٰذا القیاس جو کوئی بھی قانون بنائے گا وہ اپنے حقوق کا زیادہ خیال رکھے گا اور دوسروں کے حقوق پوری طرح ادا نہ کرے گا۔ اس لئے فرمایا کہ ہم نے شریعت بندوں کے اختیار میں نہیں رکھی تا ایسا نہ ہو کہ جس کے قبضہ میں کوئی نعمت آئی ہوئی ہو وہ اُسے دبا کے بیٹھا رہے۔ اور اس کا بیان کرنا اپنے ذمہ رکھا ہے تا کہ عوام الناس کو جو بطور غلاموں کے ہیں اور اپنے حقوق منوانے میں کوئی آواز نہیں رکھتے ان کو ان کے حقوق دلوائے جاتے رہیں۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ

اور اللہ (تعالیٰ) نے تمہارے لئے خود تم ہی سے بیویاں بنائی ہیں اور (نیز) اس نے تمہاری بیویوں سے تمہارے

مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ

لئے بیٹے اور پوتے پیدا کئے ہیں اور اُس نے تمہیں تمام (قسم کی) پاکیزہ چیزوں سے رزق بخشا ہے کیا پھر

اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ۟ۙ﴿۷۳﴾

(بھی) ایک ہلاک ہونے والی چیز پر (تو) وہ ایمان رکھیں گے اور اللہ (تعالیٰ) کے انعام کا وہ انکار کر دیں گے

حلّ لُغات۔ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَنْفُسٌ نَفْسٌ کی جمع ہے۔ اور نَفْسُ الشَّیْءِ کے معنے ہیں عَیْنُهٗ۔ خود وہی چیز۔ (اقرب) پس مِنْ اَنْفُسِكُمْ کے معنے ہوں گے۔ کہ خود تم ہی میں سے۔

حَفَدَةً حَفَدَةً جمع ہے اور اس کا مفرد اَلْحَافِدُ ہے اور اس کے معنے ہیں اَلْخَادِمُ۔ نوکر۔ اَلنَّاصِرُ۔ مددگار۔ اَلتَّابِعُ۔ تابع۔ وَلَدُ الْوَلَدِ۔ پوتا۔ (اقرب)

الباطل اَلْبَاطِلُ ضِدُّ الْحَقِّ۔ جھوٹ۔ (اقرب)

تفسیر۔ توحید کامل کا تقاضا کامل رہنمائی ہے ان آیات میں بدل بدل کر شریعت کے نزول کی ضرورت اور شرک کے مضمون کو بیان کیا گیا ہے یونہی بے جوڑ طور پر نہیں۔ بلکہ ایک دوسرے کی تائید کے لئے۔

اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ الہام کے بغیر انسان شرک جیسی مرض میں مبتلا ہوجاتا ہے اور توحید کامل تقاضا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی رہنمائی کرے۔ کیونکہ جب خدا ایک ہی ہے تو بندوں کی ہدایت کا کام کسی دوسرے پر کس طرح چھوڑ سکتا ہے۔ اگر کئی خدا ہوتے تو ایک دوسرے پر کام چھوڑ دیتا۔ جیسے بچوں کی نگرانی کا کام بعض دفعہ ماں، باپ پر چھوڑ دیتی ہے اور بعض دفعہ باپ، ماں پر چھوڑ دیتا ہے۔ مگر ایک ہی خالق، ایک ہی مالک کس پر اس کام کو چھوڑ دے۔ وہ تو خود ہی کرے گا۔ اسی طرح توحید کمال کو چاہتی ہے اور بنی نوع انسان کو کسی مقصد کے بغیر پیدا کرنا نقص پر دلالت کرتا ہے۔ اور توحید کا عقیدہ اس کی اجازت نہیں دیتا۔

شریعت اور بعث بعد الموت لازم ملزوم ہیں پس اگر انسان بغیر مقصد کے پیدا نہیں ہوا تو پھر بعد الموت زندگی بھی ضروری ہے۔ اور اگر وہ زندگی ضروری ہے تو ایسی وسیع زندگی کے لئے تیار کرنے کی غرض سے ایک شریعت اور ہدایت کا خدا تعالیٰ کی طرف سے آنا بھی ضروری ہے۔ پس اسی سلسلہ میں اپنے موقعہ پر بعد الموت کی زندگی کا ثبوت بھی بیان کیا گیا ہے۔

توحید اور آسمانی ہدایت کی ضرورت کا بیان غرض توحید اور آسمانی ہدایت کی ضرورت کے مضمون کو ایک دوسرے کی تائید میں اس طرح بدل بدل کر لایا گیا ہے کہ مضمون میں ایک غیر معمولی شوکت پیدا ہوگئی ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مادی دنیا کے تمام اجرام ایک دوسرے پر سہارا لئے کھڑے ہیں اسی طرح روحانی دنیا کی عمارت بھی ایک دوسرے کو سہارا دے رہی ہے۔ اور اس کا ایک حصہ دوسرے کی اس طرح تائید کر رہا ہے کہ جدھر سے بھی رخ کرو ایک ہی حقیقت اور ایک ہی نظام کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔

توحید عین فطرت ہے چنانچہ اس آیت میں پھر توحید کی طرف رخ کیا ہے اور بتایا ہے کہ جہاں دولت و حکومت پر انسانی قبضہ اس طرف رہنمائی کرتا ہے کہ انسانی فطرت دوسرے انسانوں کو جو اس کے محکوم ہیں اپنے ساتھ شریک کرنے پر تیار نہیں ہوتی اور اس وجہ سے ایک بیرونی تحریک کی ضرورت ہوتی ہے جو اس بگڑے ہوئے نظام کو بدل کر مساوات انسانی اور حقوق انسانی کو قائم کرے۔ اسی طرح اس سے خدا تعالیٰ کی توحید کی طرف بھی توجہ ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ جب اللہ تعالیٰ تم کو کوئی نعمت دیتا ہے۔ تو جہاں تک وہ تمہارے قبضہ کو تسلیم کرتا ہے وہ تمہارے حقوق تمہاری اولاد کی طرف بطور وراثت منتقل ہونے کی اجازت دیتا ہے اور تم اپنے اچھے مال جو خدا تعالیٰ نے تم کو دئے ہیں۔ اپنی اولاد کی طرف منتقل کرتے ہوئے دوسروں کو نہیں دے دیتے اور نہ دوسروں کو یہ حق دیتے ہو کہ وہ تمہاری جائداد جس کو چاہیں دے دیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم باطل یعنی شرک میں مبتلا ہوتے ہو اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں

کا انکار کرتے ہو۔ یہ انکار وہ کس طرح کرتے ہیں اس کا ذکر اگلی آیت میں کیا گیا ہے۔

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ

اور وہ اللہ (تعالیٰ) کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں سے ان کے (دینے کے)

السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۷۴﴾

لئے کسی رزق کے ذرہ بھر (بھی) مالک نہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔

حل لغات۔ اَلسَّمٰوٰتِ اور وَالْاَرْضَ کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۴۔

اَلسَّمٰوٰتُ سَمَاءٌ کی جمع ہے۔ اَلسَّمَاءُ۔ آسمان۔ کُلُّ مَا عَلَاكَ فَاَظَلَّكَ۔ ہر اوپر سے سایہ ڈالنے والی چیز۔ سَقْفُ کُلِّ شَیْءٍ وَبَیْتٍ چھت رِوَاقُ الْبَیْتِ برآمدہ۔ ظَهْرُ الْفَرَسِ گھوڑے کی پیٹھ۔ اَلسَّحَابُ۔ بادل۔ اَلْمَطَرُ بارش۔ اَلْمَطْرَةُ الْجَیِّدَةُ ایک دفعہ کی برسی ہوئی عمدہ بارش۔ اَلْعُشْبُ سبزہ و گیاہ۔ (اقرب)

اَلْاَرْضُ کرۂ زمین۔ کُلُّ مَا سَفَلَ ہر نیچے کی چیز۔ (اقرب)

تفسیر۔ شرک اللہ تعالیٰ پر ظلم ہے فرماتا ہے کہ ان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے وراثت کے اس حق کو تسلیم کیا ہے کہ ان کے مال اور ان کی جائدادیں ان کی اولادوں کو ملیں۔ مگر یہ لوگ خدا تعالیٰ پر یہ ظلم کرتے ہیں کہ اس کے اختیارات اور اس کی حکومت ان کو دے دیتے ہیں جن کو اس نے اپنا وارث تجویز نہیں کیا۔ یعنی خدا تعالیٰ تو اپنے اختیارات سپرد نہیں کرتا اور یہ کر دیتے ہیں گویا اپنے متعلق تو ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہمارے اختیارات انہیں ملیں جو ہماری اولاد ہیں اور جن سے ہم تعلق رکھتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ چاہتے ہیں کہ اس کے اختیارات خود ہی ان کے سپرد کر دیں جن کو خدا تعالیٰ وہ اختیارات دینا نہیں چاہتا اور جن کو اس نے ایسے اختیارات نہیں دیئے۔ حالانکہ اگر باوجود اس کے کہ ان کی جائدادیں حقیقی طور پر ان کی مقبوضہ نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں۔ ان کو یہ حق حاصل ہے کہ جن کو اپنا وارث سمجھتے ہیں اپنی جائدادیں ان کو دے دیں تو خدا تعالیٰ کو کیوں اختیار نہیں کہ وہ اپنی منشاء کے مطابق اپنے دین کا وارث ان کو بنائے جنہیں وہ پسند کرتا ہے۔

شرک انسانی ترقی میں روک ہے اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ شرک کی وجہ سے انسانی ترقی بھی رک جاتی ہے۔ کیونکہ جب مشرک کی توجہ ان ہستیوں کی طرف ہو جاتی ہے جن کو کوئی طاقت حاصل نہیں

تو ان سے تو اسے کوئی فائدہ ملتا نہیں ہاں یہ نقصان ضرور پہنچ جاتا ہے کہ اس ہستی کی طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے جو ان کو ہر اک قسم کی نعمتیں دے سکتی ہے۔ اس لئے ہمیشہ مشرک قوموں کی ذہنی ترقی رک جاتی ہے اور دینی امور میں ان کا فکر نہایت کُند ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابل پر جو اقوام مشرک نہیں ہوتیں اگر کسی وقت سچائی سے ہٹ بھی جائیں تو ان کی ذہنی ترقی کچھ نہ کچھ ہوتی رہتی ہے۔ کیونکہ وہ اس وجود کے متعلق غور کرتی رہتی ہیں جس میں سب طاقتیں ہیں۔ پس کچھ نہ کچھ سچائی ان کو بغیر الہام کے بھی ملتی رہتی ہے۔

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا

پس (اے مشرکو) تم اللہ (تعالیٰ) کے متعلق (اپنے پاس سے) باتیں مت بناؤ اللہ (تعالیٰ) یقیناً (سب کچھ) جانتا

تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

ہے اور تم (کچھ بھی) نہیں جانتے۔

حلّ لُغَات۔ لَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ کے معنے ہیں کہ تم اللہ کے متعلق باتیں مت بناؤ۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو سورۂ رعد آیت نمبر ۳۶۔ زیر آیت النحل ۶۱ جلد ھٰذا۔

تفسیر۔ لَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ کے معنی یعنی اللہ تعالیٰ کے متعلق خود قانون نہ بناؤ کیونکہ تم تو اللہ تعالیٰ کی قدرتوں تک سے ناواقف ہو۔ وہ جس قدر حقوق دین کے بارہ میں بندوں کو دینا پسند کرتا ہے آپ ہی اپنے بندوں کو دے گا اور ان کو دے گا جن کو وہ ان کے اخلاص کی وجہ سے اپنی روحانی اولاد کا مرتبہ بخشتا ہے۔

الہامی کلام میں خدا سے مراد بعض دفعہ الہامی کلام میں بعض نبیوں کو خدا تعالیٰ کے بیٹے کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے جیسا کہ مسیح علیہ السلام کے بارہ میں آتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے بیٹے تھے۔ چنانچہ انجیل میں آتا ہے کہ مسیح نے حواریوں سے کہا کہ:۔

> ''پس تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ اور انہیں باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دو۔'' (متی باب ۲۸ آیت ۱۹)

اس جگہ بیٹے کے لفظ سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان کو برگزیدہ کر کے اپنی آسمانی بادشاہت کا وارث بنایا تھا۔ قرآن کریم میں بھی اس مضمون کا ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا

سُبۡحٰنَہٗ ؕ بَلۡ عِبَادٌ مُّکۡرَمُوۡنَ (الانبیاء:۲۷) یعنی مشرک کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بیٹے پیدا کئے ہیں یہ غلط کہتے ہیں جن کو خدا تعالیٰ بیٹا کہتا ہے وہ صرف اس کے مکرم بندے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا منشاء اس لفظ کے استعمال سے ان کے اعزاز کو ظاہر کرنا ہوتا ہے جو انہیں اس کے حضور حاصل ہے۔ مگر افسوس کہ نادان ان محاورات سے دھوکا کھا کر خدا تعالیٰ کے عاجز بندوں کو حقیقتاً خدا تعالیٰ کا بیٹا سمجھنے لگتے ہیں اور بعض دوسرے نادان ان محاورات پر اعتراض کرنے لگ جاتے ہیں۔

آیت اِنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ الخ سے الہامی کلام میں ہر لفظ کی حقیقت پر مبنی ہونے کی طرف اشارہ

اِنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ جو لفظ استعمال کرتا ہے وہ ایک ایسی حقیقت پر مبنی ہوتا ہے جو اس کی دوسری صفات کے مخالف نہیں ہوتی۔ مگر تم ایسے معنوں میں ان الفاظ کا استعمال کرتے ہو جو محض جہالت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان سے کوئی حقیقت بھی تو ظاہر نہیں ہوتی۔ مثلاً خدا تعالیٰ جن معنوں میں بیٹا کہتا ہے اس سے تو اس گہرے تعلق کا اظہار مقصود ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو اپنے پاک بندوں سے ہے۔ مگر مشرک اسے حقیقی بیٹا بنا کر کے اس پاکیزہ تعلق کو ایک جسمانی تعلق بنا دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کو بھی گرا دیتے ہیں اور ان بندوں کی بھی ہتک کرتے ہیں جن کو وہ معبود بناتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح وہ ان کے متعلق اس عظمت کا تو انکار کر دیتے ہیں جو عرفان اور قربانی سے حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ فرضی عظمت ان کو دیتے ہیں جو جسمانی تعلق سے حاصل ہوتی ہے اور جو پہلی کے مقابل پر کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا عَبۡدًا مَّمۡلُوۡکًا لَّا یَقۡدِرُ عَلٰی شَیۡءٍ وَّ

اللہ (تعالیٰ تمہارے سمجھانے کو) ایک ایسے بندے کی حالت بیان کرتا ہے جو غلام ہو (اور) جو کسی بات کی (بھی)

مَنۡ رَّزَقۡنٰہُ مِنَّا رِزۡقًا حَسَنًا فَہُوَ یُنۡفِقُ مِنۡہُ سِرًّا وَّ

طاقت نہ رکھتا ہو اور (اس کے مقابلہ میں اس بندے کی حالت کو بھی) جسے ہم نے اپنے پاس سے اچھا رزق دیا ہو

جَہۡرًا ؕ ہَلۡ یَسۡتَوٗنَ ؕ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ ؕ بَلۡ اَکۡثَرُہُمۡ لَا

اور وہ اس میں سے پوشیدہ طور پر (بھی) اور علانیہ طور پر (بھی ہماری راہ میں) خرچ کرتا ہو۔ کیا وہ دونوں (قسم کے

يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۶﴾

لوگ) برابر ہو سکتے ہیں (ہرگز نہیں) تمام تعریف (تو) اللہ (تعالیٰ) ہی کو (سزاوار) ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر (لوگ) جانتے نہیں۔

تفسیر۔ روحانی امور میں اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حد پر کھڑا رہنا چاہیے چونکہ پہلی آیت میں اس طرف اشارہ تھا کہ روحانی امور میں اس حد پر کھڑا رہنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ مقرر کرے۔ ورنہ انسان دھوکا کھا کر کہیں کا کہیں چلا جاتا ہے اور اس طرف اشارہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ بعض بندوں کو عزت دے کر بعض پیار کے ناموں سے یاد کرتا ہے تو اس کے اَور معنے ہوتے ہیں اور مشرک جب ویسے ہی ناموں سے مخلوق میں سے بعض کو یاد کرتے ہیں تو اس کے معنے اور ہوتے ہیں۔

آزاد اور غلام کی مثال میں آنحضرتؐ کے لئے اچھے الفاظ کا استعمال اور اس کی مثال کے طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کو اشارۃً پیش کیا اور فرمایا کہ کیا تم سوچتے نہیں کہ ایسا شخص جو ہوا و ہوس کا شکار ہو اور عبد مملوک کی حیثیت رکھتا ہو اور بوجہ دوسروں کا غلام ہونے کے اپنی قابلیتوں کا صحیح استعمال نہ کر سکتا ہو اور رسم و رواج اور توہمات کی قیود میں جکڑا ہوا ہو اور اسے ایک غلام کی حیثیت حاصل ہو کیا اس دوسرے شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو رسوم اور توہمات کی غلامی سے آزاد ہو کر خدا تعالیٰ کی دی ہوئی طاقتوں سے ظاہر اور مخفی طور پر خدا تعالیٰ کے بندوں کی خدمت کرتا رہتا ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اس شخص کی مدد کرے گا جو اس کی دی ہوئی قوتوں کو مفید طور پر اس کے بندوں کی خدمت میں لگاتا ہے اور یہی شخص کامیاب ہوگا۔ اس مثال سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ شخص ہی خدا کے فضلوں کا وارث ہو سکتا ہے اور اس شخص کے لئے اللہ تعالیٰ جو بھی اچھے الفاظ استعمال فرمائے وہ ان کا مستحق ہے۔

محمد رسول اللہ کی کامیابی کی وجہ اس میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ تم تو خدا تعالیٰ کے دئے ہوئے انعامات سے صرف اپنے خاندانوں اور اولاد کو فائدہ پہنچاتے ہو اور محمدؐ رسول اللہ سب دنیا کو اپنے انعامات میں شریک کرتا ہے۔ پس اس کی کامیابی یقینی ہے اور تمہاری ناکامی یقینی۔

سِرًّا وَّ جَهْرًا کے تین معنی سِرًّا وَّ جَهْرًا کے تین معنے ہو سکتے ہیں:۔

۱۔ پوشیدہ طور پر بھی ظاہر بھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنی نوع انسان کی وہ خدمت بھی کرتے تھے

جو لوگوں کو نظر نہ آتی تھی جیسے دعا اور استغفار۔ اور وہ بھی جو لوگوں کو نظر آتی تھی۔ جیسے وہ اخلاق فاضلہ جو بنی نوع انسان کے متعلق آپ سے ظاہر ہوتے تھے جن کا ذکر حضرت خدیجہؓ کے اس قول میں ہے کہ كَلَّا وَاللهِ مَا يُخْزِيْكَ اللهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ (بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی) یعنی خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز نہ چھوڑے گا۔ کیونکہ آپ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے اور مہمانوں کی خدمت کرتے ہیں اور ان اخلاق کو ظاہر کرتے ہیں جو دنیا سے مفقود ہو چکے تھے اور جو لوگ ایسے مصائب میں مبتلا ہوں جو ناحق ان پر پڑ گئے ہوں ان کی آپ مدد کرتے ہیں اور جو شخص بالکل بے بس ہوتا ہے اس کا بوجھ آپ اٹھا لیتے ہیں۔

سِرًّا وَّ جَهْرًا کے معنی رات اور دن کے ۲۔ دوسرے معنے اس کے رات اور دن کے بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ رات کا کام مخفی ہوتا ہے اور دن کا ظاہر۔ اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ آپ نے خدمت خلق میں رات اور دن ایک کر دئے ہیں اور بغیر آرام کرنے کے بنی نوع انسان کی بہتری میں کوشاں رہتے ہیں۔

آنحضرتؐ کا سِرًّا وَّ جَهْرًا بنی نوع انسان کی خدمت کرنا ۳۔ تیسرے معنے یہ ہیں کہ آپؐ وہ خدمات بھی کرتے ہیں جو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ یعنی ان کی قدر نہیں جانتے جیسے تبلیغ حق۔ کہ لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے اُسے خدمت نہیں سمجھتے تھے حالانکہ وہ اعلیٰ درجہ کی خدمت تھی اور آپ وہ خدمات بھی کرتے ہیں جن کو لوگ پہچانتے ہیں اور ان کی خوبی کا اعتراف کرتے ہیں۔ مثلاً ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک آدمی حضور کے پاس آیا اور عرض کیا کہ ابوجہل میرا روپیہ نہیں دیتا۔ آپ اُسی وقت اس آدمی کے ساتھ چل کھڑے ہوئے۔ اور ابوجہل کے دروازہ پر دستک دی۔ ابوجہل باہر نکلا اور حضور کو کھڑے دیکھ کر حیران سا رہ گیا اور آنے کی وجہ دریافت کی۔ (کیونکہ وہ تو دن رات آنحضرت صلعم کی ایذا دہی اور سبّ و شتم میں مشغول رہتا تھا۔ اس کے لئے آپ کا اس کے پاس آنا تعجب کا موجب تھا) آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس شخص کا روپیہ دینا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں دینا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو اس شخص کو پریشان نہ کرو فوراً اس کا حق ادا کرو۔ وہ ایسا مرعوب ہوا کہ گھر جا کر فوراً روپیہ لے آیا اور اس شخص کو دے دیا۔ جب لوگوں میں اس بات کا چرچا ہوا تو لوگوں نے ابوجہل کو ملامت کی کہ آپ ہم سے تو یہ کہتے ہیں کہ اس کی کوئی بات نہ مانو اور خود اس سے ایسے ڈر گئے۔ اس نے جواب دیا کہ کیا بتاؤں اس وقت مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میں نے اس کی بات کا انکار کیا تو ایک وحشی اونٹ اسی وقت مجھ کو چبا جائے گا اور میں نے اس ڈر سے اس کی بات کو مان لیا۔ (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام، ابو جھل أمر الأراشی۔۔۔)

ممکن ہے کہ کشفی طور پر واقعی ایک مست اونٹ بھی آپ کے ساتھ اسے نظر آ گیا ہو۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس کا تذکرہ نہیں فرمایا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابوجہل نے بعد میں اپنے ڈر کو چھپانے کے لئے جو آپ کے سچ کی تائید کرنے کی وجہ سے ہوا اور کفار کے اعتراض سے بچنے کے لئے بہانہ بنا کر یہ بات کہہ دی ہو۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان کے بعض نیک اعمال مخفی ہوتے ہیں اور بنی نوع انسان ان کا کوئی بدلہ نہیں دے سکتے۔ اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسا یوم جزاء لائے جس میں اس کے ایسے اعمال بھی دنیا پر ظاہر کئے جائیں اور اُسے اپنا حق مل جائے۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ

اور اللہ (تعالیٰ) دو اور شخصوں کی حالت (بھی) بیان کرتا ہے جن میں سے ایک گونگا ہو جو کسی بات کی طاقت نہ رکھتا

عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ

ہو اور وہ اپنے مالک پر بے فائدہ بوجھ ہو جدھر بھی (اس کا آقا) اسے بھیجے (وہ) کوئی بھلائی (کما کر) نہ لائے

بِخَيْرٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ

(پس) کیا وہ (شخص) اور وہ (دوسرا) شخص جو انصاف کرنے کا حکم دیتا ہو اور وہ (خود بھی) سیدھی راہ پر (قائم)

عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۷﴾ ع

ہو باہم برابر ہو سکتے ہیں۔

حلّ لُغَات۔ اَبْكَمُ بَكِمَ يَبْكَمُ بَكَمًا کے معنے ہیں خَرِسَ۔ گونگا ہو گیا۔ فَهُوَ اَبْكَمُ۔ اور اس سے صیغہ صفت اَبْكَمُ آتا ہے۔ (اقرب)

اَلْكَلُّ اَلْمُصِيْبَةُ۔ اَلْكَلُّ کے معنے مصیبت۔ اَلثَّقِيْلُ لَا خَيْرَ فِيْهِ۔ ایسا بوجھ جس میں کوئی فائدہ نہ ہو۔ اَلْعَيِّلُ اَلْعِيَالُ۔ گھر کے لوگ جن پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اَلثِّقْلُ۔ بوجھ۔ اَلضَّعِيْفُ۔ کمزور۔ وَيُطْلَقُ الْكَلُّ عَلَى الْوَاحِدِ وَغَيْرِهِ اور كَلٌّ کا لفظ واحد تثنیہ جمع سب کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ (اقرب)

المولیٰ اَلْمَوْلیٰ کے معنے کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۳۱۔

اَلْمَوْلیٰ اَلْمَالِکُ۔ مالک۔ اَلْمُعْتِقُ آزاد کرنے والا۔ اَلصَّاحِبُ۔ ساتھی۔ آقا اَلْحَلِیْفُ۔ معاہد۔ اَلرَّبُّ۔ رب۔ اَلْوَلِیُّ کارساز۔ اَلْمُنْعِمُ۔ محسن۔ اَلْمُحِبُّ محبت کرنے والا۔ اَلْقَرِیْبُ۔ رشتہ دار۔ (اقرب)

یُوَجِّھْہُ وَجَّھَہٗ اِلَیْہِ فِیْ حَاجَۃٍ کے معنے ہیں۔ اَرْسَلَہٗ فَوَجَّہَ اِلَیْہِ اَیْ فَذَھَبَ لَازِمٌ وَمُتَعَدٍّ۔ اس کو کسی ضرورت کے لئے بھیجا اور وہ اس کے لئے چلا گیا۔ یہ لفظ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے (اقرب) پس اَیْنَمَا یُوَجِّھْہُّ کے معنے ہوں گے جہاں کہیں وہ اسے بھیجتا ہے۔

صراط اَلصِّرَاطُ اَلطَّرِیْقُ۔ راستہ۔ (اقرب)

تفسیر ۔ **اس آیت میں پہلے مضمون کی مزید وضاحت** اس آیت میں پہلے مضمون کو ایک اَور مثال سے واضح کیا۔ پہلی مثال میں تو یہ بتایا تھا کہ اگر ایک شخص گو قابلیت تو رکھتا ہو لیکن بوجہ دوسروں کے قبضہ میں ہونے کے اس میں اس قابلیت کے اظہار کی طاقت نہ ہو تو اس کا وجود اور عدم وجود برابر ہوتا ہے۔ اب اس آیت میں ایک ایسے غلام کی مثال بیان فرمائی ہے جو گونگا ہو اور کسی نیک کام کے کرنے کی طاقت ہی نہ رکھتا ہو ایسا شخص بھی کسی فضل کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیونکہ نہ تو اس میں کام کی طاقت ہوتی ہے کہ لوگوں کو نفع پہنچائے اور نہ اس کی زبان چلتی ہے کہ منہ سے ہی لوگوں کو نیک باتوں کی تعلیم دیتا رہے۔ پھر فرمایا کہ ان عیوب کی وجہ سے اس کا آقا جو کام بھی اس کے سپرد کرے وہ اسے پورا نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے مقابل پر وہ غلام جو اپنے مالک کے حکم کے مطابق لوگوں کو بھی عدل کرنے کا حکم دیتا ہو اور خود بھی سیدھے راستے پر قائم ہو یعنی نیک کام کر کے اپنے آقا کو خوش کرتا رہتا ہو۔ بڑی فضیلت رکھتا ہے اور یہ دونوں کسی صورت میں برابر نہیں ہو سکتے۔ اور آقا ان دونوں سے یکساں سلوک نہیں کر سکتا۔

آنحضرتؐ اور کفار کے ایک گروہ کا مقابلہ اس آیت میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار کے ایک گروہ کا مقابلہ کر کے دکھایا ہے۔ فرماتا ہے۔ تم گونگے ہو تمہاری آنکھوں کے سامنے تمام عیب کئے جاتے تھے۔ شرک ہوتا تھا اور ہو رہا ہے خدا کی صفات کو غلط طور پر پیش کیا جاتا تھا اور کیا جاتا ہے۔ مگر تم میں سے کسی کی زبان نہ ہلی۔ اور کسی نے لوگوں سے نہ کہا کہ شرک نہ کرو اور خدا کی ہتک نہ کرو۔ اگر کسی نے زبان ہلائی اور حق بیان کیا اور اپنے آقا کی عزت کے تحفظ کے لئے کلمہ خیر کہا تو وہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

پھر اسی پر بس نہیں اگر تم دوسروں کو نیکی کا حکم نہ دے سکتے تھے تو خود ہی نیکی پر قائم رہتے اور اپنے نیک اعمال سے خدا تعالیٰ کی سبوحیت اور پاکیزگی کا اعلان کرتے۔ شرک سے دوسروں کو نہیں روک سکتے تھے تو کم از کم خود تو شرک

نہ کرتے مگر تم سے یہ بھی نہ ہوا۔ پھر دین کو جانے دو۔ تم اگر دنیا کے اموال اور متاع کے پیچھے پڑے تھے تو اسی میں ترقی کی ہوتی۔ مگر تم تو دنیا میں بھی دوسروں کا بوجھ اٹھانے کی بجائے خود بوجھ بن رہے ہو۔ مگر اس کے مقابل پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھو کہ وہ غیروں کو انصاف کا حکم دیتے ہیں اور اپنی ذات میں صراط مستقیم پر ہیں۔ یعنی ہر لحاظ سے کامل ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ہم اس کی مدد کریں یا تمہاری؟

آیت ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا میں دو قسم کے کفار کی حالت کا بیان اس آیت اور اس سے پہلی آیت میں دو قسم کے کفار کی حالت کو بیان کیا ہے اور ان دونوں گروہوں کے مقابل پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت کو پیش کیا ہے۔ ایک قسم کفار کی یہ بیان کی کہ وہ رسوم و توہمات کے غلام ہیں اور گو ان میں کام کی قابلیت تو ہے مگر وہ لوگوں کے ڈر سے کام کر نہیں سکتے۔ اور دوسری قسم کے کفار کی حالت یہ بتائی کہ وہ رسوم و توہمات کے غلام بھی ہیں اور ان کی قابلیتیں بھی ماری گئی ہیں۔ اگر رسوم اور توہمات سے آزاد بھی ہو جائیں تب بھی ان کی حالت ایسی مسخ ہو چکی ہے کہ وہ کوئی نیک کام نہیں کر سکتے بلکہ اللہ تعالیٰ پر بوجھ ہیں کہ اس کی سبوحیت پر ان کے وجود سے داغ لگ رہا ہے۔ اس کے مقابل پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے غلام نہیں اور جو طاقتیں انہیں ملی ہیں انہیں بنی نوع انسان کی خدمت میں لگا رہے ہیں۔ نیز وہ زبردست روحانی طاقتیں رکھتے ہیں جن کی مدد سے خود بھی اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاق دکھاتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی ہدایت کی طرف بلاتے ہیں اب تم خود ہی سوچو کہ ایسے شخص کو ہم اپنے کام کے لئے چنیں گے جو قابل بھی ہو اور ہمارے دین کی خدمت بھی کر رہا ہو یا اس گروہ کو جو قابل تو ہو مگر اپنی طاقتوں کو خدا کی راہ میں لگانے سے معذور ہو۔ کیونکہ وہ رسم و رواج کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یا پھر اس کو جو نہ تو قابل ہو نہ رسم و رواج کی قیود سے آزاد۔

وَ لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَاۤ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا

اور آسمانوں اور زمین کی ہر پوشیدہ چیز (بھی) اللہ (تعالیٰ) ہی کی ہے۔ اور اس (موعودہ) گھڑی (کی آمد) کا معاملہ تو

كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

ایسا ہی ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا بلکہ وہ (اس سے بھی) قریب تر (وقت میں واقع ہو جانے والا) ہے۔

قَدِيْرٌ ﴿۷۸﴾

اللہ (تعالیٰ) یقیناً ہر بات پر پورا (پورا) قادر ہے۔

حلّ لُغات۔ **السّاعة** اَلسَّاعَۃُ کے لئے دیکھو سورۃ ہذا آیت نمبر ۶۲ جلد ھٰذا۔

لَمْحِ الْبَصَرِ لَمَحَ (يَلْمَحُ لَمْحًا) الْبَصَرُ: اِمْتَدَّ اِلَى الشَّیْءِ۔ کسی چیز کو آنکھ نے دیکھا لَمَحَ الرَّجُلُ الشَّیْءَ وَاِلَى الشَّیْءِ: اَبْصَرَهٗ بِنَظْرٍ خَفِيْفٍ اَوِاخْتَلَسَ النَّظْرَ کسی چیز پر سرسری نگاہ ڈالی۔ لَمَحَ الشَّیْءِ بِالْبَصَرِ: صَوَّبَهٗ اِلَيْهِ۔ اسے ٹکٹکی لگا کر دیکھا (اقرب) پس لَمْحِ الْبَصَرِ کے معنے ہوں گے آنکھ کا دیکھنا یا اتنی دیر دیکھنا جتنی دیر کہ آنکھ ایک دفعہ کھل کر پھر بند ہوتی ہے۔

شَیْءٍ شَیْءٌ شَاءَ کا مصدر ہے اور شَاءَهٗ (يَشَاءُهٗ شَيْئًا) کے معنے ہیں۔ اَرَادَهٗ کسی چیز کا ارادہ کیا۔ اللّٰہُ الشَّیْءَ۔ قَدَّرَهٗ۔ کسی چیز کا اندازہ کیا نیز الشَّیْءُ کے معنے ہیں مَايَصِحُّ اَنْ يُعْلَمَ وَيُخْبَرَ عَنْهُ وَهُوَ مُذَكَّرٌ يُطْلَقُ عَلَى الْمُذَكَّرِ وَالْمُؤَنَّثِ وَيَقَعُ عَلَى الْوَاجِبِ وَالْمُمْكِنِ جس کو معلوم کر کے اس کے متعلق خبر دینی صحیح ہو اور یہ لفظ مذکر ہے لیکن مذکر اور مؤنث دونو کے لئے بولا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور دیگر مخلوقات کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کی جمع اَشْيَاءُ ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ **آنحضرتؐ کے منکرین کی تباہی کی خبر سے ایک اعتراض کا جواب** گذشتہ آیات میں بیان فرمایا تھا کہ کیا گونگے، نکمے اور نااہل وجودان کے برابر ہو سکتے ہیں جو عدل کی تعلیم دوسروں کو دیتے اور خود نیک عمل کرتے ہیں یعنی نہیں ہو سکتے۔ اب بیان فرماتا ہے کہ جب یہ برے نیکوں جیسے سلوک کے مستحق نہیں ہو سکتے تو سنو ہم جو زمین و آسمان کا راز جاننے والے ہیں تم کو ایک راز کی خبر بتاتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی ہلاکت کا وقت آنکھ جھپکتے آنے والا ہے بلکہ وہ اس سے بھی قریب تر ہے۔ اس جگہ چونکہ یہ سوال ہو سکتا تھا کہ غیب جاننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان اپنی مرضی کے مطابق نتیجہ نکالنے پر قادر بھی ہو اس لئے اس آیت کو اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کے الفاظ پر ختم کیا اور بتایا کہ ہم غیب ہی نہیں جانتے بلکہ آئندہ ہونے والے واقعات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی بھی پوری طاقت رکھتے ہیں۔

آنحضرتؐ کے دشمنوں کی تباہی کو اتفاقی حادثہ کہنے والوں کا جواب اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن تباہ ہوں گے تو بعد میں آنے والے لوگ اس واقعہ کی قدر کم کرنے

کے لئے کہیں گے کہ آپؐ کے دشمنوں کی تباہی ایک اتفاقی حادثہ تھا یا یہ کہ ان کے حالات ہی ایسے تھے کہ ہلاک ہوجاتے۔ چنانچہ آج کل کے مسیحی مصنف اس مضمون پر بہت ہی زور دیا کرتے ہیں اور آپؐ کے مخالفوں کی ہلاکت کو طبعی امور کا نتیجہ قرار دیا کرتے ہیں۔ دیکھو قرآن کریم کا اتارنے والا عالم الغیب اس آیت میں کس طرح ان لوگوں کے اعتراض کا جواب دیتا ہے۔ آیت کو شروع غیب کا علم رکھنے کے دعویٰ سے کرتا ہے اور پھر کفار کی ہلاکت کی خبر دیتا ہے اور ختم اس پر کرتا ہے کہ یہ سب کچھ اتفاقی نہ ہوگا بلکہ ہماری قدرت کے ذریعہ سے ہوگا۔ کس طرح اس آیت میں ایک طرف تو مکہ میں رہتے ہوئے جبکہ کفار کے ظلم زوروں پر تھے اور مسلمانوں کے پاس کوئی طاقت نہ تھی وہ ہجرت پر مجبور ہورہے تھے فرماتا ہے کہ ہم غیب کا علم رکھنے والے خدا تم کو بتا دیتے ہیں کہ کفار کی ہلاکت کا وقت اب آن پہنچا۔ اور یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ ان کی تباہی ہماری قدرت کے ذریعہ سے ہوگی اور ان حالات کے ذریعہ سے جو انسانی طاقت میں نہیں۔

آنحضرتؐ کی ترقی معجزانہ ہے اب دیکھو کس طرح اس آیت کے نزول کے بعد مدینہ کے سب لوگ مسلمان ہوگئے۔ حالانکہ پہلے صرف چند آدمی مسلمان ہوئے تھے اور کس طرح خود کفار نے محمد رسول اللہ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کیا ورنہ آپؐ مکہ کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔ صرف اُسی وقت آپ نے مکہ چھوڑا جبکہ کفار نے آپ کو قتل کر دینے کا فیصلہ کرلیا اور پھر اسی رات آپؐ وہاں سے نکلے بلکہ اس وقت نکلے جبکہ کفار نے آپ کے گھر کا محاصرہ کرلیا۔ گویا کفار پر آخری حجت پوری کردی کہ میں مکہ کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ مگر چونکہ تم نے میرے لئے اور کوئی راستہ نہیں چھوڑا اس لئے یہاں سے جاتا ہوں۔ اس کے بعد کفار نے کس قدر زور آپؐ کو مدینہ میں کمزور کرنے کے لئے لگایا۔ مگر کس طرح آناًفاناً آپ کا زور بڑھتا چلا گیا اور آخر کفار تباہ ہوئے۔ اسے کون اتفاقی امر کہہ سکتا ہے؟ کون طبعی نتائج کہہ سکتا ہے؟ خصوصاً جبکہ قبل از وقت پیشگوئی بھی کردی گئی تھی۔ مسیحی مصنف یہ تو ثابت کرسکتے ہیں کہ جب مسلمانوں نے کسریٰ اور قیصر پر حملہ کیا ان کی حکومتیں تنزل کی طرف جارہی تھیں۔ مگر سوال یہ نہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع نے جب ایران اور روم پر حملہ کیا تھا اس وقت ایرانی اور رومی حکومت کی مسلمانوں کے مقابل پر کیا حیثیت تھی۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ جب محمد رسول اللہ صلعم نے مکہ میں بیٹھے اپنی فتح اور منکرین کی شکست کی خبر دی تھی اس وقت کون سی طاقت آپ کے پاس تھی؟ اگر خدا نے آپ کو وہ طاقت دی جس نے ایک طرف عرب کو تہ و بالا کر دیا اور دوسری طرف ایران و روم کو تو اس کا نام معجزہ نہیں تو اَور کس چیز کا نام معجزہ ہوا کرتا ہے۔

آنکھ جھپکنے کے معنی زمانہ قریب کے یہ پیشگوئی مکی زندگی کے آخر میں کی گئی تھی اور سب سے پہلی فتح بدر کے

موقعہ پر ہوئی گویا کوئی اڑھائی تین سال بعد۔ اور فتح مکہ کا واقعہ اس پیشگوئی کے بعد کوئی نو دس سال بعد ہوا۔ لیکن اس آیت میں فتح کے وقت کی خبر ان الفاظ میں دی گئی ہے کہ آنکھ جھپکتے بلکہ اس سے بھی پہلے یہ واقعہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں اس قسم کے الفاظ کے معنے قریب زمانہ کے ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ پلک جھپکنے سے پلک جھپکنا ہی مراد ہو۔ بعض لوگ ایسے الفاظ پیشگوئیوں میں دیکھ کر اعتراض کرنے لگ جاتے ہیں اور الہامی زبان کے محاورات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ

اور اللہ (تعالیٰ) نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حالت میں پیدا کیا ہے کہ تم کچھ (بھی) نہیں جانتے تھے

وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۹﴾

اور اس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل پیدا کئے ہیں تا کہ تم شکر ادا کرو۔

تفسیر۔ فرماتا ہے کہ اے لوگو ہم نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے جبکہ تم کچھ نہ جانتے تھے تم کو آنکھ کان اور دل دے کر دنیا میں بھیجا تا کہ تم علم سیکھو لیکن تم نے ہماری اس بخشش سے کچھ بھی فائدہ نہ اُٹھایا۔ نہ آنکھوں سے دیکھا۔ نہ کانوں سے سنا۔ نہ دل سے سوچا۔ اس فقرہ میں کیسا رحم اور افسوس بھرا ہوا ہے۔ خدائے قادر اپنے بندوں کی اس غفلت پر جس نے انہیں عذاب کا مستحق بنا دیا کیسے محبت سے بھرے ہوئے الفاظ میں افسوس کا اظہار کرتا ہے۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ کا تعلق سورت کے مضمون سے اس آیت کا تعلق سورۃ کے مضمون سے یہ ہے کہ اس میں الہام الٰہی کی ضرورت کی ایک اور دلیل دی گئی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو ہر ایک علم سے خالی ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ اسے آنکھ کان اور دل دے کر پیدا کرتا ہے تا وہ علم حاصل کرے اور ان کی مدد سے وہ علم سیکھتا ہے۔ پس جو دنیوی علوم انسان سیکھتا ہے وہ سبھی اللہ تعالیٰ کے مہیا کئے ہوئے ذرائع سے سیکھتا ہے۔ کوئی انسان ایسا نہیں جو کہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے دئے ہوئے ان ذرائع کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی اپنے لئے حصول علم کے سامان پیدا کروں گا۔ پھر روحانی علم کے سیکھنے کے لئے جو ذرائع اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے ان کے استعمال سے اُسے کیوں انکار ہوتا ہے۔

تعجب ہے کہ انسان کی سب عظمت ان ذرائع کے استعمال سے ہوتی ہے جو اُسے قدرت عطا فرماتی ہے۔

انسان کے جس قدر کمالات ہیں وہ انہی طاقتوں کی مدد سے حاصل کئے جاتے ہیں اوران طاقتوں کے استعمال میں وہ کوئی سبکی محسوس نہیں کرتا۔مگر جب روحانی ذرائع کا سوال پیدا ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے مجھے ان کی کیا ضرورت ہے میں خود اپنا کام کرسکتا ہوں۔حالانکہ جس طرح اُسے مادی ترقی کے لئے عطا کردہ جوارح کی ضرورت ہے اسی طرح روحانی کمالات کے حصول کے لئے اُسے ان سامانوں کی ضرورت ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کاملہ سے اس کے لئے پیدا کرتا ہے۔

آیت کے اخیر میں فرماتا ہے کہ ان چیزوں کے دینے کی غرض تو یہ تھی کہ تمہارے اندر اللہ تعالیٰ کے فضلوں کی قدر پیدا ہو۔تم اُلٹا ان طاقتوں سے مغرور ہو جاتے ہو اور کہتے ہو کہ ہمیں کسی بیرونی مدد کی ضرورت نہیں۔

بچہ کے اعضاء کے کام کرنے کے متعلق سائنس کی قرآن مجید کے بیان کے مطابق تحقیقات اس آیت میں کانوں کے بعد آنکھوں اور آنکھوں کے بعد دلوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اسی ترتیب سے یہ اعضاء انسان کے علم کے بڑھانے کا موجب ہوتے ہیں۔سب سے پہلے بچہ کے کان کام کرتے ہیں۔ان کے بعد آنکھیں اور سب کے بعد دل یعنی قوت فکریہ کام کرتی ہے۔آج سائنس نے ثابت کیا ہے کہ سب سے پہلے بچہ کے کان کام کرنے لگتے ہیں اور اس کے بعد آنکھیں کام شروع کرتی ہیں اور سب سے آخر میں قوت فکریہ کام کرنا شروع کرتی ہے۔چنانچہ جانوروں میں بچوں کی آنکھیں بعض دفعہ کئی کئی دن کے بعد کھلتی ہیں۔اس عرصہ میں صرف کان کام کر رہے ہوتے ہیں۔انسانوں کے بچوں کی آنکھیں بظاہر کھلی ہوتی ہیں۔لیکن ان کا فعل کانوں کے فعل کے بعد شروع ہوتا ہے اور قوت فکریہ تو ایک عرصہ کے بعد کام شروع کرتی ہے۔یہ ترتیب بھی قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے کا ایک ثبوت ہے کیونکہ اس میں وہ مضمون بیان کئے گئے ہیں جو اس زمانہ میں مخفی تھے۔

أَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِي جَوِّ السَّمَاءِ ط مَا

کیا انہوں نے پرندوں کو جو آسمان کی فضا کے اندر مسخر کئے گئے ہیں (غور کی نظر سے) نہیں دیکھا انہیں (تم پر

يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ ط إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ

آ گرنے اور نوچ کھانے سے) اللہ (تعالیٰ) کے سوا (اور) کوئی نہیں روک رہا۔جو لوگ ایمان رکھتے ہیں ان

يُّؤْمِنُوْنَ ۝۸۰

کے لئے اس میں یقیناً کئی نشان (پائے جاتے) ہیں۔

حلّ لُغَات۔ جَوٌّ جَوٌّ: مَابَیْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ زمین اور آسمان کی درمیانی فضا۔ جَوُّ الْبَیْتِ: دَاخِلُهٗ: گھر کا اندر کا حصہ۔ (اقرب)

يُمْسِكُهُنَّ يُمْسِكُ اَمْسَكَ سے مضارع کا صیغہ ہے اور اَمْسَكَ الشَّیْءَ بِیَدِہٖ کے معنے ہیں۔ قَبَضَهٗ: کسی چیز کو ہاتھ سے پکڑا۔ اَمْسَكَ اللّٰهُ الْغَیْثَ: حَبَسَهٗ وَمَنَعَ نُزُوْلَهٗ اللہ تعالیٰ نے بارش کو روک دیا۔ اَمْسَكَ عَنِ الْكَلَامِ: سَكَتَ کلام کرنے سے خاموش رہا۔ اَمْسَكَ عَنِ الْاَمْرِ: كَفَّ عَنْهُ وَامْتَنَعَ: کسی کام سے رُکا رہا۔ (اقرب) پس مَا يُمْسِكُهُنَّ کے معنی ہوں گے انہیں کوئی نہیں روکتا۔

اَلْقَوْمُ اَلْقَوْمُ اَلْجَمَاعَةُ مِنَ الرِّجَالِ خَاصَّةً وَقِیْلَ تَدْخُلُهُ النِّسَاءُ عَلٰی تَبِیْعَةٍ سُمُّوْا بِذَالِكَ لِقِیَامِهِمْ بِالْعَظَائِمِ وَالْمُهِمَّاتِ قوم کا لفظ مردوں کی جماعت پر بولا جاتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس میں عورتیں بھی بالواسطہ شامل ہو جاتی ہیں۔ اور مردوں پر قوم کا لفظ اس لئے بولتے ہیں کہ وہ اہم امور کو سرانجام دیتے ہیں۔ یُذَكَّرُ وَیُؤَنَّثُ فَیُقَالُ قَامَ الْقَوْمُ وَقَامَتِ الْقَوْمُ۔ یہ لفظ مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قَامَ الْقَوْمُ (مذکر) اور قَامَتِ الْقَوْمُ (مؤنث) دونوں طرح کہہ دیتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ مفسرین کے نزدیک مسخرات فی جو السماء کے معنی مفسرین نے مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ کے یہ معنے کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر ظاہری سامانوں کے ان کو جوّ میں اڑنے کی طاقت دی (تفسیر بیضاوی زیر آیت ھذا) اور یہ گویا اس کی قدرت کا اظہار ہے۔ مگر یہ معنے صحیح نہیں۔ اس آیت میں درحقیقت کفار کی سزا کا ذکر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان پرندوں کو خدا تعالیٰ نے روکا ہوا ہے مگر ایک دن آئے گا کہ یہ پرندے تم پر گریں گے اور تمہاری لاشوں کو نوچ نوچ کر کھائیں گے جیسا کہ بعد کی جنگوں میں ہوا کہ کئی جنگوں میں کفار میدان جنگ سے بھاگتے ہوئے راستوں پر لاشیں چھوڑ گئے اور وہ پرندوں کی خوراک بنیں۔

نابغہ ذبیانی کا ایک شعر ان معنوں کی تائید کرتا ہے وہ کہتا ہے

اِذَا مَا غَدٰی بِالْجَیْشِ حَلَّقَ فَوْقَهٗ

عَصَائِبُ طَیْرٍ تَهْتَدِیْ بِالْعَصَائِبِ

یعنی میرا ممدوح ایسا ہے کہ جب وہ لشکر لے کر نکلتا ہے تو پرندے اس کے ساتھ اڑتے جاتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ ضرور اپنے دشمن کو مار بھگائے گا اور ہماری غذا کا سامان پیدا ہو جائے گا۔

پرندوں کے مسخر ہونے کے ذکر سے کفار پر عذاب کی پیشگوئی امیر تیمور کے متعلق تاریخ میں آتا ہے کہ جدھر وہ جاتا تھا اس کے لشکر کے ساتھ گدھ اڑتے جاتے تھے۔ کیونکہ جدھر وہ جاتا تھا اس کو دشمن پر فتح حاصل ہوتی تھی اور گدھوں کو اندرونی شعور سے یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ اس کے ساتھ جانے میں غذا ملتی ہے۔ غرض پرندوں کا اڑنا درحقیقت محاورہ ہے کسی قوم کی شکست اور ہلاکت کے اظہار کے لئے۔ اور اس جگہ اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآن شریف میں بھی آتا ہے اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ۔ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ۔ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ (الفیل: ۲ تا ۵)۔ یعنی ابرہہ کا لشکر جو مکہ پر حملہ کرنے آیا تھا اس کو ہم نے ہلاک کر دیا اور ایسی بھاگڑ پڑی کہ وہ اپنے مردے جنگل میں چھوڑ گئے۔ جس پر پرندے اکٹھے ہو گئے اور ان کی بوٹیاں نوچ نوچ کر اور پتھروں پر مار مار کر انہوں نے کھائیں۔ یہ بھی گدھوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ مردہ کی بوٹی نوچ کر کسی اونچی جگہ پر بیٹھ کر کھاتے ہیں اور مٹی سے صاف کرنے کے لئے اُسے پتھر یا لکڑی پر مار مار کر کھاتے ہیں۔

ممکن ہے اس آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہو کہ تم دیکھ چکے ہو اللہ تعالیٰ کے ایک دشمن کی لاشوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے پرندوں نے نوچ کر کھایا تھا وہی پرندے آسمان پر اڑ رہے ہیں اور ہمارے حکم کے منتظر ہیں۔ اس وقت تک ہم ہی نے مسلمانوں کو جہاد سے روکا ہوا ہے۔ جب یہ جہاد کے لئے نکلیں گے تو تمہارا ابرہہ کے لشکر کا سا حال ہو گا اور ایسا ہی ہوا۔

آیت کے آخر میں اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ کہنے کا مطلب آخر میں فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ یعنی اس پیشگوئی پر آج تم کو تعجب آتا ہو گا مگر جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اس میں خدا تعالیٰ کے نشانات مشاہدہ کر رہے ہیں اور انہیں اس کے وقوع پر کامل یقین ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ

اور اللہ (تعالیٰ) نے تمہارے گھروں کو تمہاری رہائش کا ذریعہ بنایا ہے اور اس نے چار پایوں کے چمڑوں سے (بھی)

جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ

تمہارے لئے گھر بنائے ہیں جنہیں تم سفر کے وقت ہلکا (پھلکا) پاتے ہو اور (نیز) اپنے قیام کے وقت (ان سے

يَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَاۤ

فائدہ اٹھاتے ہو) اور ان (جانوروں) کی باریک اُونوں اور (نیز) ان کی موٹی اونوں اور ان کے بالوں کو بھی مستقل

اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۸۱﴾

سامان اور ایک وقت تک (کے لئے) عارضی سامان (بنایا ہے)۔

حلّ لُغات ۔سَكَنًا سَكَنًا سَكَنَ سے مصدر ہے ۔اور سَكَنَ فُلَانٌ دَارَهٗ کے معنے ہیں اِسْتَوْطَنَهَا وَاَقَامَ بِهَا ۔اپنے گھر میں قیام پذیر ہوا۔ سَكَنَ اِلَيْهِ :اِرْتَاحَ اور جب سَكَنَ کا صلہ الیٰ آئے تو اس کے معنے ہیں ۔اُس نے اس کے پاس آرام پایا۔ نیز اَلسَّكَنُ کے معنے ہیں ۔كُلُّ مَا يُسْكَنُ اِلَيْهِ وَفِيْهِ وَيُسْتَأْنَسُ بِهٖ ۔ ہر وہ چیز جس سے انس و آرام حاصل ہو۔ اَلرَّحْمَةُ رحمت ۔اَلْبَرَكَةُ برکت ۔(اقرب)

بُيُوتٌ کے لئے دیکھو سورۃ حجر آیت نمبر ۸۳۔

تَسْتَخِفُّوْنَهَا تَسْتَخِفُّوْنَهَا اِسْتَخَفَّ سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے ۔اور اِسْتَخَفَّهٗ کے معنے ہیں ۔ اسے ہلکا سمجھا۔(اقرب)

يَوْمَ ظَعْنِكُمْ ظَعْنٌ ظَعَنَ کا مصدر ہے اور ظَعَنَ (يَظْعَنُ ظَعْنًا) کے معنے ہیں سَارَ ۔ وہ چل پڑا ۔ چنانچہ کہتے ہیں ''ظَعَنُوْا عَنْ دِيَارِهِمْ'' کہ وہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر کوچ کر گئے ۔(اقرب) پس تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ کے معنے ہوں گے ۔کہ تم کوچ کے وقت انہیں ہلکا سمجھتے ہو۔

اَصْوَافٌ اَصْوَافٌ صَوْفٌ کی جمع ہے ۔بھیڑوں بکریوں کی اُون کو کہتے ہیں اور وَبَرٌ ۔اونٹوں کی اون کو کہتے ہیں اس کی جمع اَوْبَارٌ ہے ۔(اقرب)

اَشْعَارٌ اَشْعَارٌ شَعْرٌ کی جمع ہے اور اَلشَّعْرُ ان سب قسم کے بالوں کو کہتے ہیں جو وبر اور صوف کے علاوہ

ہوتے ہیں۔(اقرب)

اَلْاَثَاثُ اَلْاَثَاثُ: مَتَاعُ الْبَیْتِ بِلَا وَاحِدٍ اثاث کا مفرد نہیں آتا اور گھر کے سامان پر یہ لفظ بولتے ہیں۔ وَقِیْلَ هُوَ مَا یُتَّخَذُ لِلْاِسْتِعْمَالِ وَالْمَتَاعِ لَا لِلتِّجَارَةِ۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اثاث اس سامان کو کہتے ہیں جو استعمال اور فائدہ اٹھانے کے لئے بنایا جاتا ہے نہ کہ تجارت کی غرض سے۔ وَقِیْلَ الْمَالُ کُلُّهٗ۔ اور بعض نے اس کو عام رکھا ہے اور ہر قسم کے سامان کو اس میں شامل کیا ہے۔(اقرب)

تفسیر۔ یعنی اس وقت تم آرام سے زندگی بسر کر رہے ہو۔ مستقل گھر بھی ہیں اور سفروں کے لئے خیمے بھی ہیں کہ آسانی سے اٹھا سکتے ہو۔ اور جہاں ڈیرہ لگانا چاہو ڈیرے لگا دیتے ہو۔ اور تجارت کرتے پھرتے ہو۔ اس انعام کو اپنے اعمال سے کیوں ضائع کرتے ہو۔

خیموں کے متعلق تَسْتَخِفُّوْنَهَا کہنے کا مطلب خیموں کے متعلق جو یہ فرمایا کہ تم انہیں سفر اور حضر میں ہلکا پاتے ہو۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ سفر کے وقت اٹھانا سہل ہوتا ہے۔ اور اقامت کے وقت گھر کا کھڑا کرنا آسان ہوتا ہے۔ چند منٹ میں جنگل میں شہر بن جاتا ہے۔ چمڑوں کے خیموں کا ذکر اس لیے کیا کہ عربوں میں انہی کا رواج تھا (تفسیر کبیر از امام رازی زیر آیت ھذا) اور وہ بارش وغیرہ سے اور سردی سے بچانے کے لیے کپڑا کے خیمہ سے زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَکُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ

اور اللہ (تعالیٰ) نے جو کچھ پیدا کیا ہے اس میں اس نے تمہارے لئے کئی سایہ دینے والی چیزیں بنائی ہیں (جن کے نیچے

الْجِبَالِ اَکْنَانًا وَّ جَعَلَ لَکُمْ سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ الْحَرَّ وَ

تم آرام پاتے ہو) اور پہاڑوں میں (بھی) تمہارے لئے پناہ کی جگہیں بنائی ہیں اور (نیز) اس نے تمہارے لئے

سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمْ بَاْسَکُمْ ط کَذٰلِکَ یُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْکُمْ

کئی (قسم کی) قمیصیں بنائی ہیں جو تمہیں گرمی سے بچاتی ہیں اور کئی (قسم کی) قمیصیں (یعنی زرہیں) جو تمہیں

لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۲﴾

تمہاری (آپس کی) جنگ (کی سختی) سے بچاتی ہیں۔اسی طرح وہ تم پر اپنے (روحانی) انعام کو (بھی) پورا کرتا ہے تاکہ تم (اس کے) کامل فرمانبردار بنو۔

حلّ لُغَات۔اَكْنَانٌ اَكْنَانٌ كِنٌّ کی جمع ہے اور اَلْكِنُّ کے معنے ہیں: وِقَاءُ كُلِّ شَيْءٍ وَسِتْرُهٗ۔ہر چیز کا پردہ۔اور اس کو محفوظ رکھنے والا جسم۔اَلْبَيْتُ: گھر۔(اقرب)

سَرَابِيْلُ سَرَابِيْلُ کے لئے دیکھو سورۃ ابراہیم آیت نمبر ۵۱۔

سَرَابِيْلُ سِرْبَالٌ کی جمع ہے۔اَلسِّرْبَالُ: اَلْقَمِيْصُ سربال کے معنی ہیں قمیص۔وَقِيْلَ اَلدِّرْعُ اور زرہ کو بھی سربال کہتے ہیں۔وَقِيْلَ كُلُّ مَالُبِسَ اور بعض نے اسے عام رکھا ہے کہ ہر وہ چیز جو پہنی جائے سربال ہے۔

بَأْسٌ بَأْسٌ: اَلشِّدَّةُ فِي الْحَرْبِ لڑائی کی شدت کو بأس کہتے ہیں۔(اقرب)

تُسْلِمُوْنَ تُسْلِمُوْنَ اَسْلَمَ سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔اور اَسْلَمَ کے معنے ہیں اِنْقَادَ مطیع ہو گیا اَسْلَمَ فُلَانٌ: تَدَيَّنَ بِالْاِسْلَامِ۔مذہب اسلام میں داخل ہو گیا۔اَسْلَمَ الْعَدُوَّ: خَذَلَهٗ۔دشمن کو رسوا کیا۔اَسْلَمَ اَمْرَهٗ اِلَى اللّٰهِ: سَلَّمَهٗ۔اپنے معاملے کو اللہ کے سپرد کر دیا (اقرب) پس لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ کے معنے ہوں گے (۱) تا کہ تم کامل فرمانبردار بنو (۲) تم اپنے معاملات کو اللہ کے سپرد کرو۔

تفسیر۔اس آیت میں بھی سابق آیت کا مضمون چل رہا ہے اور چند اَور انعامات گنا تا ہے کہ سفر کرتے ہو تو آرام سے درختوں تلے رہتے ہو۔پہاڑوں میں آرام کرتے ہو۔لباس دئے ہیں جن سے گرمی کی تکلیف سے محفوظ رہتے ہو۔اور زرہیں دی ہیں جن کی مدد سے لڑائی میں تمہاری حفاظت ہوتی ہے۔یہ سب نعمتیں اس لئے دی گئی ہیں تا آرام سے رہو اور دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رہو۔مگر اب تم اپنے ہاتھوں سے اس امن کو برباد کرنے لگے ہو اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتیں اُسی کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہو۔خدا تعالیٰ تو چاہتا تھا کہ ان نعمتوں کے شکریہ میں اس کے فرمانبردار بنو۔لیکن ہوا یہ ہے کہ یہی امن تم کو مغرور کر کے خدا تعالیٰ ہی کے خلاف کھڑا رہا ہے۔

لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ کے معنی لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ علاوہ ان معنوں کے جو اوپر بیان ہوئے ہیں مُسلم کے معنے دوسرے کو شر سے اور تکلیف سے محفوظ رکھنے والے کے بھی ہیں۔کیونکہ تُسْلِمُوْنَ اَسْلَمَ سے نکلا ہے جس کا مادہ

سَلِمَ ہے اوراس کے معنے محفوظ ہوجانے کے ہوتے ہیں۔اَسْلَمَ اس کا متعدی ہے۔پس اس کے معنے ہوئے جو دوسرے کو شر اور نقصان سے محفوظ رکھے۔عربی زبان کا عام قاعدہ ہے کہ ہر فعل لازم ثلاثی پر ہمزہ زائد کر کے اسے متعدی بنایا جاسکتا ہے۔عربوں میں عام طور پر گو سَلِمَ کا لفظ محفوظ ہوجانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔لیکن اَسْلَمَ متعدی کے اور استعمال تو ہیں مگر سَلِمَ مادہ کے ان معنوں سے متعدی کے معنے موجودہ کتبِ لغت سے ثابت نہیں۔مگر اسلامی ادب میں ان معنوں کا جو عربی لغت کے عام قاعدہ کے رو سے جائز ہیں استعمال ثابت ہے۔

مسلم کے معنی حدیث میں حدیث میں ہے اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَیَدِهٖ (مسلم کتاب الایمان باب بیان تفاضل الاسلام ۔۔۔) مسلمان وہ ہے جس کی زبان سے اور ہاتھ سے سب وہ لوگ محفوظ رہتے ہیں جو اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔میرے نزدیک اس آیت میں یہ معنے بھی مراد ہیں اور مفہوم یہ ہے کہ ان نعمتوں کے دینے کی غرض تو یہ تھی کہ تم محفوظ رہو اور خدا کے شکر گزار بن کر دوسرے لوگوں کو شر سے محفوظ رکھو مگر تم نے تو ان نعمتوں کو ظلم کا ذریعہ بنالیا ہے۔

اس آیت سے ایک سیاسی نکتہ بھی نکلتا ہے اور وہ یہ کہ کسی اکثریت کو یہ نہیں چاہیے کہ اقلیت کو ملک سے نکال دے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ ظالموں کو نہ نکالا جائے۔جو قوم کسی کے نظام کو توڑتی ہو ان کا تو نکالنا ضروری ہے مگر مسلمان مکہ والوں کے نظام کو توڑتے نہیں تھے۔صرف یہ کہتے تھے کہ آزادی سے ہمیں رَبُّنَا اللّٰہُ کہنے دو اور مذہب کے معاملہ میں جبر نہ کرو۔مگر باوجود اس کے کہ وہ ان کے نظام میں خلل نہ ڈالتے تھے وہ انہیں ایذا دیتے تھے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ

پس اگر وہ (اب بھی) پھر جائیں تو (اس کی وجہ سے اے نبی تجھ پر کوئی الزام نہیں آئے گا کیونکہ) تیرے ذمہ صرف

الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۳﴾

کھول کر پہنچا دینا ہے۔

تفسیر ۔یعنی اس مصالحانہ پیشکش کے بعد بھی اگر یہ لوگ اپنے ارادہ سے باز نہ آئیں اور بلا وجہ مسلمانوں کو دکھ دیں تو تیرا کام تو صرف نصیحت ہے وہ تو نے کر دی۔اب یہ اپنے نیک و بد کے خود ذمہ وار ہیں۔

يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَ اَكْثَرُهُمُ

وہ اللہ (تعالیٰ) کے (اس) انعام کو (بخوبی) پہچانتے ہیں (مگر) پھر (بھی) اس کا انکار کر رہے ہیں اور ان میں سے

الْكٰفِرُوْنَ ۝۸۴ ع

ع ۱۱ / ۱۷

اکثر تو پکے کافر ہیں۔

حلّ لُغَات ۔یُنْكِرُوْنَهَا یُنْكِرُوْنَهَا اَنْكَرَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔اس کے معنے کے لئے دیکھو نحل آیت نمبر ۲۳۔وحجر آیت نمبر ۵۴۔

تفسیر ۔یعنی الٰہی نعمتوں کو اپنے نفوس میں دیکھتے ہوئے پھر بھی یہ لوگ ناشکری سے کام لے رہے ہیں۔ یَعْرِفُوْنَ کہہ کر یہ بتایا ہے کہ اول تو انسان کو محض نعمت کو دیکھ کر ہی نصیحت حاصل کر لینی چاہیے مگر ان کو تو اس سے بڑا مقام حاصل ہے اور وہ یہ کہ خود ان پر یہ نعمتیں نازل ہیں اور یہ اپنے نفوس میں ان نعمتوں کا وجود پاتے ہیں۔مگر پھر بھی ان کا انکار کرتے جاتے ہیں۔یعنی عملاً ان کی ناقدری کرتے ہیں یہ مراد نہیں کہ لفظاً انکار کرتے ہیں۔کیونکہ منہ سے تو کفار بھی کہتے تھے کہ یہ نعمتیں ہمیں خدا تعالیٰ کی طرف سے ملی ہیں۔

یُنْكِرُوْنَهَا کے بعد اَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ کہنے کی وجہ آخر میں فرمایا وَ اَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔اس کے یہ معنے نہیں کہ ان میں سے اکثر منکر ہیں کیونکہ یہ معنی تو ثُمَّ یُنْكِرُوْنَهَا میں آچکے ہیں۔نیز یہاں یہ الفاظ نہیں فرمائے کہ اَكْثَرُهُمْ كَافِرُوْنَ بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔حالانکہ خالی یہ بات کہنے کے لئے کہ یہ کافر ہیں اس قدر کہنا کافی تھا کہ اَكْثَرُهُمْ كٰفِرُوْنَ۔الف لام کی زیادتی کی ضرورت نہ تھی۔

لفظ كَافِرُوْنَ پر الف لام لانے کی وجہ پس الف لام کی زیادتی زائد مفہوم پیدا کرنے کے لئے ہے جو اس موقعہ پر کامل کے معنے دیتا ہے۔پس اَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ کے معنے ہیں وہ پکے منکر ہیں۔یعنی انکار عام نہیں بلکہ بڑا شدید ہے اور اصرار کے ساتھ ہے۔الف لام کا یہ مفہوم قواعد نحو سے ثابت ہے۔کہتے ہیں اَنْتَ الرَّجُلُ۔تو کامل مرد ہے (اقرب الموارد زیر لفظ ال) یہی وجہ ہے کہ یُنْكِرُوْنَهَا میں تو سب کو شامل رکھا تھا اور اس جملہ میں اَكْثَرُهُمْ کا لفظ استعمال فرمایا یہ بتانے کے لئے کہ یہ قوم ساری ہی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کر رہی ہے۔مگر ان میں سے اکثر تو اس انکار میں حد سے بڑھ گئے ہیں گویا قوم کی اکثریت میں عناد اور انکار کا مادہ شدت سے پیدا ہو گیا ہے۔

ترتیب مضمون کے لحاظ سے اس آیت کے معنی ترتیب مضمون کو مدنظر رکھتے ہوئے اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ایک طرف تو دنیوی نعمتوں کو تسلیم کرتے ہیں دوسری طرف روحانی نعمتوں کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔ گویا اعتراف کا لفظ دنیوی نعمتوں کے متعلق ہے جن کا اقرار کرتے تھے اور یُنْكِرُوْنَهَا میں روحانی نعمتوں کا ذکر ہے جن کا وہ انکار کرتے تھے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ

اور (اس دن کو بھی یاد کرو) جس دن ہم ہر ایک قوم میں ایک گواہ کھڑا کریں گے پھر (اس وقت) ان لوگوں کو جنہوں

لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۵﴾

نے کفر (کا طریق) اختیار کیا ہے (عذر خواہی یا تلافی کی) اجازت نہیں دی جائے گی اور نہ (ہی) ان کا کوئی عذر قبول کیا جائے گا۔

حلّ لُغَات۔ شَهِيْدٌ شَهِيْدٌ کے معنے ہیں اَلشَّاهِدُ۔ گواہ۔ اَلْاَمِيْنُ فِيْ شَهَادَتِهٖ۔ ٹھیک ٹھیک گواہی دینے والا۔ (اقرب)

یُسْتَعْتَبُوْنَ یُسْتَعْتَبُوْنَ اِسْتَعْتَبَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اِسْتَعْتَبَهٗ کے معنے ہیں۔ اَعْطَاهُ الْعُتْبٰى۔ اس سے راضی ہو گیا۔ وَطَلَبَ اِلَيْهِ اَیْ مِنْهُ الْعُتْبٰى۔ اس کی رضاء چاہی۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ ''اِسْتَعْتَبْتُهٗ فَاَعْتَبَنِیْ'' اَیْ اِسْتَرْضَيْتُهٗ فَاَرْضَانِیْ میں نے اس کی خوشنودی چاہی تو وہ مجھ سے خوش ہو گیا۔ اور انہی معنوں میں یہ فقرہ استعمال ہوتا ہے کہ مَابَعْدَ الْمَوْتِ مُسْتَعْتَبٌ اِیْ اِسْتَرْضَاءٌ۔ موت کے بعد کوئی طلب رضا نہ ہوگی۔ اَلْعُتْبٰى: اَلرِّضَا۔ عتبیٰ کے معنے رضا مندی (اقرب) اَلْاِسْتِعْتَابُ اَنْ يَّطْلُبَ مِنَ الْاِنْسَانِ اَنْ يَّذْكُرَ عَتْبَهٗ لِيُعْتَبَ۔ اِسْتِعْتَابٌ جو اِسْتَعْتَبَ کا مصدر ہے کے معنے ہیں کہ کوئی عذر بیان کرے تا کہ اس سے ناراضگی دور ہو سکے (مفردات) پس وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ کے معنے ہوں گے کہ ان کا کوئی عذر قبول نہ کیا جائے گا (۲) ان کو رضا جوئی کا موقعہ نہ دیا جائے گا۔

تفسیر۔ اس جرم عظیم کے ذکر کے بعد پھر اُخروی زندگی کا حوالہ دیا کہ اس دنیا میں تو اس جرم کی سزا ملے ہی گی مگر آخرت میں یہ اور بھی زیادہ سزا پائیں گے اور وہ سزا اور ذلت بہت سخت ہوگی کیونکہ تمام ارواح انسانی خواہ

ان کے اجسام کسی زمانہ میں کیوں نہ دنیا میں رہے ہوں جمع کی جائیں گی اور ہر قوم کا نبی سامنے لایا جائے گا اور اپنی قوم کے متعلق گواہی دے گا۔ پھر کیوں یہ لوگ اس ذلت کا جو اس وقت ان کو نصیب ہوگی خیال نہیں کرتے۔ ایک دوسری جگہ اس ذلت کا مندرجہ ذیل الفاظ میں ذکر فرمایا ہے فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا۔ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ عَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ (النساء: ۴۳، ۴۴) یعنی جب سب اقوام اور نبی جمع ہوں گے اس وقت ان کو ایسی ندامت ہوگی کہ یہ خواہش کریں گے کہ زمین پھٹ جائے اور ہم اس میں دفن ہو جائیں۔

ہر قوم میں نبی کے مبعوث ہونے کا ثبوت اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں نبی مبعوث فرمائے ہیں۔ قرآن کریم نے یہ عقیدہ مختلف آیات میں بیان فرمایا ہے اور اس میں وہ دوسرے سب مذاہب سے منفرد ہے اور یہ اس کی صداقت کے ثبوتوں میں سے ایک زبردست ثبوت ہے۔

کافروں کو اذن نہ دیئے جانے کا مطلب یہ جو فرمایا کہ کافروں کو اس وقت اذن نہ دیا جائے گا اس کے معنے بعض نے یہ کئے ہیں کہ انہیں بولنے کا اذن نہ دیا جائے گا (تفسیر مظہری زیر آیت ھذا)۔ یہ معنے درست نہیں کیونکہ قرآن کریم کی متعدد آیات سے ثابت ہے کہ کفار قیامت کو اللہ تعالیٰ سے کلام کریں گے۔ اور اپنے عذرات بھی پیش کریں گے۔ پس اس لَا يُؤْذَنُ سے مراد یا تو جنت میں دخول کی اجازت ہے اور یا اس کے معنے شفاعت کے ہیں اور مراد یہ ہے کہ جب نبی حشر کے دن آئیں گے اور ان کو اپنی قوم کے ان افراد کے حق میں شفاعت کی اجازت دی جائے گی جو گو پوری طرح کامل نہ ہوئے تھے مگر اس کے قابل تھے کہ نبی انہیں اپنا کہہ سکیں اس وقت یہ لوگ شفاعت سے محروم رہ جائیں گے اور ان کے حق میں شفاعت کی اجازت نہ دی جائے گی۔

شفاعت کے لئے اذن ضروری ہے قرآن کریم اور حدیث سے شفاعت کے متعلق ثابت ہے کہ اذن سے ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ (سبا: ۲۴) یعنی شفاعت صرف انہی کو فائدہ دے گی جن کے حق میں اذن الٰہی ہوگا۔ سورۃ یونس رکوع ۱۔ طٰہٰ رکوع ۶ اور النجم رکوع ۲ میں بھی یہ مضمون بیان ہوا ہے اور سورۃ بقرہ رکوع ۳۴ میں بھی۔ حدیث میں بھی شفاعت کے متعلق اذن کا لفظ آتا ہے۔ مسند احمد حنبل جلد ۵ صفحہ ۴۳ پر ابوبکرۃ کی روایت میں ہے ثُمَّ يُؤْذَنُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّبِيِّيْنَ وَالشُّهَدَآءِ اَنْ يَّشْفَعُوْا۔ یعنی پھر فرشتوں، نبیوں اور شہداء کو اللہ تعالیٰ اجازت دے گا کہ وہ شفاعت کریں۔

قرآن کریم میں ایک اور مفہوم بھی اس اذن کا بیان ہوا ہے۔ سورۃ المرسلات میں ہے وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ

فَيَعْتَذِرُوْنَ۔ یعنی کفار کو ایسی اجازت نہ دی جائے گی کہ وہ عذر پیش کر سکیں یعنی ایسی کوئی اجازت انہیں نہ ملے گی کہ اس سے فائدہ اٹھا کر وہ کوئی معقول عذر پیش کر سکیں۔

قیامت میں انبیاء کی شہادت سے مراد یہ جو فرمایا کہ قیامت کے دن انبیاء بطور گواہ کھڑے کئے جائیں گے میرے نزدیک انبیاء کی شہادت سے مراد ان کا نمونہ ہے کہ وہ اپنے نمونے کو پیش کریں گے کہ کلام الٰہی نے ہم پر یہ اثر کیا ہے۔ اس تعلیم کو ماننے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہمیں خدا مل گیا اور ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ اس طرح پر خدا تعالیٰ اس وقت کافروں کو شرمندہ کرے گا کہ دیکھو ہماری کلام کا اعجاز جس سے روحانی قوتیں حاصل کر کے ہمارا یہ نبی اس کمال تک پہنچ گیا اور تم اس کلام کا انکار کر کے کہاں سے کہاں جا گرے۔

نبی اور کلام الٰہی میں تلازم ہر نبی کلام الٰہی کے نتیجے کا عملی نمونہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ کلام بغیر نبی کے نہیں آتا۔ نبی سے کلام کی شان کا پتہ لگتا ہے اور کلام سے نبی کی شان کا۔

وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا

اور جن لوگوں نے ظلم (کا طریق اختیار) کیا ہے وہ جب اس (موعود) عذاب کو دیکھیں گے تو (اس وقت) نہ (تو) وہ

هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۶﴾

(عذاب) ان پر سے ہلکا کیا جائے گا اور نہ (ہی) انہیں مہلت دی جائے گی۔

حلّ لُغات۔ يُنْظَرُوْنَ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ اَنْظَرَ سے مضارع جمع مذکر مجہول کا صیغہ ہے اور اس کے معنے ہیں ان کو مہلت نہ دی جائے گی۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو حجر آیت نمبر ۹۔

اَنْظَرَهُ الدَّيْنَ: اَخَّرَهٗ۔ قرض ادا کرنے کے لئے قرض دار کو مزید مہلت دی۔ يُقَالُ كُنْتُ اَنْظُرُ الْمُعْسِرَ اَيْ اَمْهِلُهٗ یعنی كُنْتُ اَنْظُرُ الْمُعْسِرَ کا فقرہ انہی معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے کہ میں تنگدست قرض دار کو مہلت دیا کرتا تھا۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس جگہ عذاب سے مراد اُخروی عذاب ہے۔

وَ اِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ

اور جن لوگوں نے (اللہ تعالیٰ کے) شریک بنائے ہیں جب وہ (ان) اپنے (بنائے ہوئے) شریکوں کو دیکھیں گے

شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا

تو کہیں گے (کہ) اے ہمارے رب یہ ہمارے (بنائے ہوئے) شریک ہیں جنہیں ہم تجھے چھوڑ کر پکارا کرتے

اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۚ﴿۸۷﴾

تھے جس پر وہ (بڑی جلدی سے) انہیں کہیں گے (کہ) تم یقیناً جھوٹے ہو۔

حلّ لُغَات۔ مِنْ دُوْنِكَ دُوْنَ کا لفظ عربی میں آٹھ معنوں میں مستعمل ہوتا ہے (۱) فَوْقَ (یعنی بلند ہونے) کے مخالف معنے دیتا ہے کہتے ہیں۔ هُوَ دُوْنَهٗ اَیْ اَحَطُّ مِنْهُ رُتْبَةً۔ کہ وہ اس سے رتبہ میں کم ہے (۲) ظرف کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنے اَسْفَلَ (یعنی نیچے ہونے) کے ہوتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں هٰذَا دُوْنَ ذَاكَ اَیْ مُتَسَفِّلٌ عَنْهُ۔ یہ اس سے نیچے واقع ہے۔ (۳) اَمَامَ (یعنی آگے) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہتے ہیں مَشٰی دُوْنَهٗ اَیْ اَمَامَهٗ وہ اس کے آگے آگے چلا۔ (۴) وَرَاءَ (پیچھے) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جیسے کہتے ہیں قَعَدَ دُوْنَهٗ اَیْ وَرَاءَهٗ۔ وہ اس کے پیچھے بیٹھا۔ (۵) اور کبھی دُوْنَ کے معنے فَوْقَ (یعنی بلند ہونے) کے ہوتے ہیں۔ گویا یہ لفظ اضداد میں سے ہے (۶) اس کے معنی غَيْرٌ (یعنی سواء) کے بھی ہوتے ہیں۔ (۷) اس کے معنی شریف (اعلیٰ درجہ) کے ہوتے ہیں۔ (۸) کسی چیز کے خَسِيْسٌ ہونے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں شَیْءٌ دُوْنٌ اَیْ خَسِيْسٌ کہ یہ چیز کم درجہ کی ہے (اقرب) علاوہ ازیں کہتے ہیں۔ حَالَ الْقَوْمُ دُوْنَ فُلَانٍ اَیْ اِعْتَرَضُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ مَنْ يَّطْلُبُهٗ فَلَمْ يَقْدِرْ اَنْ يَّنَالَهٗ۔ یعنی فلاں کے درمیان قوم حائل ہوگئی اور اس کو اس کے تلاش کرنے والے سے بچا لیا۔ (اقرب)

اَلْقَوْا اَلْقَوْا اَلْقٰی سے جمع کا صیغہ ہے اور اَلْقَاهُ اِلَى الْاَرْضِ کے معنے ہیں طَرَحَهٗ۔ اس کو زمین پر پھینکا اور اَلْقٰی اِلَيْهِ الْقَوْلَ وَبِالْقَوْلِ کے معنے ہیں۔ اَبْلَغَهٗ اِيَّاهُ اس کو کوئی بات پہنچا دی۔ اَلْقٰی عَلَيْهِ الْقَوْلَ: اَمْلَاهُ۔ اُسے کوئی بات لکھا دی۔ اَلْقٰی اِلَيْهِ السَّمْعَ: اَصْغٰی۔ اس کی بات توجہ سے سنی (اقرب) مزید تشریح کے لئے دیکھو

نحل آیت نمبر ۱۶۔

پس اَلْقَوْا اِلَیْہِمُ الْقَوْلَ کے معنی ہوں گے وہ ان کو جلدی سے کہیں گے۔

تفسیر ۔ اَلْقٰی اِلَیْہِ الْقَوْلَ کے معنے ہیں کہ اس کی طرف جواب پھینکا۔ اور پھینکنے سے مراد یہ ہے کہ وہ فوراً ان کے منہ پر جواب الٹا کر ماریں گے کہ بس جھوٹ نہ بولو۔

کفر اور گناہ کی دوستی کبھی پکی نہیں ہوسکتی یہ عجیب بات ہے کہ دنیا میں ان کی خاطر یہ لوگ نبیوں سے لڑا کرتے تھے۔ مگر قیامت کو خدا تعالیٰ سے کہیں گے کہ ان معبودوں کو پکڑو کہ یہی ہم کو گمراہ کرتے تھے۔ اس میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ کفر و گناہ کی دوستی کبھی پکی نہیں ہوتی۔ کیونکہ انسان ایک حد تک دوسرے کی خاطر تکلیف اٹھا سکتا ہے۔ حد سے زیادہ نہیں۔ پس کفر کی وجہ سے چونکہ مختلف عذاب آتے رہتے ہیں درمیان میں ایسے مواقع بھی آتے رہتے ہیں جب اس دوستی کی حد ختم ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے سے بیزاری کا اظہار شروع ہو جاتا ہے۔

یہ جو فرمایا فَاَلْقَوْا اِلَیْہِمُ الْقَوْلَ اس کے معنے ایک تو اچھی طرح کہنے کے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں اَلْقٰی اِلَیْہِ الْقَوْلُ: اَبْلَغَہٗ۔ اس تک بات پہنچا دی ان معنوں کے رو سے ترجمہ یہ ہوگا کہ وہ خوب زور سے انہیں کہہ دیں گے۔ نیز القی کے معنے پھینکنے کے بھی ہیں اور پھینکنے کے لفظ میں جلدی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ پس اَلْقَوْا اِلَیْہِمُ الْقَوْلَ کے یہ معنے بھی ہیں کہ وہ فوراً جواب دیں گے۔ فَلَا یُخَفَّفُ عَنْہُمْ سے بتایا کہ یہ عذر ان کا غیر معقول ہے اگر کسی نے گمراہ کیا تھا تو وہ گمراہ ہوئے کیوں؟ کیوں نہ ورغلانے والے کی بات کو رد کیا۔

وَ اَلْقَوْا اِلَی اللّٰہِ یَوْمَئِذِ ِالسَّلَمَ وَ ضَلَّ عَنْہُمْ مَّا کَانُوْا

اور (اس حالت کو دیکھ کر) وہ (ظالم جلدی سے) اللہ (تعالیٰ) کے حضور (اپنی) اطاعت کا اظہار کریں گے اور جو کچھ

یَفْتَرُوْنَ ﴿۸۸﴾

وہ اپنے پاس سے گھڑا کرتے تھے وہ (سب ان کے ذہنوں سے) غائب ہو جائے گا۔

حلّ لُغَات ۔ اَلسَّلَمَ السَّلَمَ کے لئے دیکھو نحل آیت نمبر ۲۹۔

ضَلَّ عَنْہُمْ ضَلَّ عَنْہُمْ کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۳۱۔

ضَلَّ یَضِلُّ ضِدّ اِھْتَدٰی یعنی ہدایت کے خلاف حالت پر ہو گیا۔ اور دین اور حق کو نہ پایا۔ ضَلّ عَنْہُ

يَضَلُّ: لَمْ يَهْتَدِ اِلَيْهِ ۔ اس طرف راہ نہیں پائی۔ ضَلَّ يَضَلُّ (ضاد کی زبر سے) فُلَانٌ الطَّرِيْقَ وَ عَنِ الطَّرِيْقِ: لَمْ يَهْتَدِ اِلَيْهِ۔ راستہ نہ پایا۔ یہی معنی ہوتے ہیں۔ جب دار یا منزل یا ہر اپنی جگہ پر قائم رہنے والی چیز کا اس کے بعد مذکور ہو۔ ضَلَّ الرَّجُلُ فِي الدِّيْنِ ضِلَالًا وَضَلَالَةً: ضِدُّ اِهْتَدٰى۔ اس شخص نے دین کے معاملہ میں درست راہ نہیں پائی۔ ضَلَّ فُلَانٌ الْفَرَسَ۔ اس کا گھوڑا کھویا گیا۔ ضَلَّ عَنِّيْ كَذَا: ضَاعَ۔ ضائع ہو گیا۔ ضَلَّ الْمَاءُ فِي اللَّبَنِ: خَفِيَ وَ غَابَ۔ پانی دودھ میں مل گیا۔ اور غائب ہو گیا۔ ضَلَّ فُلَانٌ فُلَانًا: نَسِيَهُ۔ اس شخص کو بھول گیا۔ ضَلَّ النَّاسِي: غَابَ عَنْهُ حِفْظُ الشَّيْءِ بھول گیا۔ اس کے ذہن سے بات نکل گئی۔ ضَلَّ سَعْيُهُ: عَمِلَ عَمَلًا لَمْ يَعُدْ عَلَيْهِ نَفْعُهُ۔ ایسا کام کیا جس کا اسے کوئی نفع نہ ہوا۔ (اقرب)

يَفْتَرُوْنَ يَفْتَرُوْنَ اِفْتَرٰى سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور اِفْتَرٰى عَلَيْهِ الْكَذِبَ کے معنے ہیں: اِخْتَلَقَهُ۔ اس کے خلاف جھوٹ بنا لیا (اقرب) پس ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ کے معنے ہوں گے جو وہ گھڑا کرتے تھے ضائع ہو جائے گا۔

تفسیر۔ قیامت کے دن کفار کی لجاجت اپنے معبودان کے سامنے یعنی جب کفار دیکھیں گے کہ آج تو وہ بھی ہمارے دشمن ہو رہے ہیں جن کی ہم عبادت کیا کرتے تھے تو وہ جلدی سے اپنے رویہ کو بدل کر لجاجت سے باتیں کرنی شروع کر دیں گے اور کہیں گے کہ ہم تو آپ ہی کے بندے ہیں یہ عبادت وغیرہ تو صرف توجہ کے قیام کے لئے تھی یا ہم یہ کام نیک نیتی سے سچ سمجھ کر کرتے تھے کوئی اللہ تعالیٰ سے بغاوت کا منشاء نہ تھا اور جو بڑے بڑے دعوے وہ دنیا میں کرتے تھے سب غائب ہو جائیں گے۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا

جن لوگوں نے (خود بھی) کفر (کا طریق) اختیار کیا ہے اور (دوسروں کو بھی) اللہ (تعالیٰ) کی راہ سے روکا ہے ان

فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴿۸۹﴾

کو ہم اس عذاب سے بڑھ کر ایک اور عذاب دیں گے کیونکہ وہ (ہمیشہ) فساد (کے کام) کرتے تھے

حل لغات۔ اَلْفَوْقُ اَلْفَوْقُ فَاقَ کا مصدر ہے۔ جس کے معنے بلند ہونے کے ہیں۔ اصل میں یہ

ظرف مکان ہے جیسے کہتے ہیں صَعَدْتُ فَوْقَ الْجَبَلِ کہ میں پہاڑ پر چڑھا۔اور کبھی کبھی ظرف زمان کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ کہتے ہیں لَبِثْنَا فَوْقَ شَهْرٍ اَیْ زَمَانًا اَكْثَرَ مِنْ شَهْرٍ ۔ہم ایک ماہ سے زائد ٹھہرے۔یہ معرب ہوتا ہے۔لیکن جب اس کا مضاف الیہ حذف ہو۔اور معنیٰ وہ ذہن میں ہو تو اس وقت یہ مبنی ہوتا ہے۔اور اس کے آخر پر ضمہ آتا ہے۔چنانچہ کہتے ہیں عِنْدِیْ مِائَةٌ فَمَا فَوْقُ۔کہ میرے پاس سو سے اوپر چیزیں ہیں۔یہاں فوق کے بعد مضاف الیہ حذف ہے۔اور اگر مضاف الیہ بولا جائے تو وہ معرب ہوتا ہے۔اور کبھی کبھی فوق کا لفظ بطور اسم کے استعمال ہوتا ہے۔اور بعض اوقات زیادتی کے بیان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔چنانچہ کہتے ہیں اَلْعَشْرَةُ فَوْقَ التِّسْعَةِ اَیْ تَزِيْدُ عَلَيْهَا۔دس نو سے زیادہ ہوتے ہیں۔علاوہ ازیں کہتے ہیں هٰذَا فَوْقَ ذَاكَ اَیْ اَفْضَلُ مِنْهُ۔کہ یہ اُس سے افضل ہے۔(اقرب)

تفسیر۔ گمراہ کرنے والے کو قیامت کے دن زیادہ سزا ملے گی اس آیت میں پھر وہی فرق بتایا کہ کافر دو قسم کے ہیں ایک گمراہ اور ایک گمراہ کرنے والے۔اور یہ بھی بتایا ہے کہ گمراہ کرنے والوں کو دوسروں سے زیادہ سزا ملے گی۔

لطف یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ دنیا میں جاہلوں سے کہتے ہیں کہ ہم تمہاری نجات کے ذمہ وار ہیں لیکن وہاں جن کی نجات کے ذمہ وار بنتے تھے ان سے بھی زیادہ انہیں سزا ملے گی۔

وَ يَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ

اور (اس دن کو بھی یاد کرو) جس دن ہم ہر ایک قوم کے اندر ان کے خلاف خود انہی میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے

اَنْفُسِهِمْ وَ جِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَ نَزَّلْنَا

اور (اے رسول) تجھے ہم ان (سب) کے خلاف گواہ بنا کر لائیں گے اور ہم نے یہ کتاب ہر ایک بات کو کھول کر

عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ

بیان کرنے کے لئے اور (تمام لوگوں کی) رہنمائی کے لئے اور (ان پر) رحمت کرنے اور کامل فرمانبرداری اختیار

بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝۹۰ ع

کرنے والوں کو بشارت دینے کے لئے اُتاری ہے۔

حلّ لُغَات۔ تِبْيَانًا تِبْيَانًا یہ بَانَ کا مصدر ہے۔اور بَانَ الشَّیْءُ (يَبِيْنُ تِبْيَانًا) کے معنے ہیں۔ اِتَّضَحَ۔کوئی چیز واضح ہوگئی اور بَانَ کا فعل لازم ہے لیکن کبھی کبھی متعدی بھی استعمال ہوتا ہے۔(اقرب)

تفسیر۔ قیامت کے دن آنحضرتؐ کی شہادت سے مراد آپ کا نمونہ پیش کرنا ہے اس آیت میں پہلی آیت کے مضمون کو مکمل کیا گیا ہے۔فرماتا ہے جب سب نبی اپنے اپنے نمونہ کو پیش کریں گے اس وقت تو بھی ان لوگوں پر بطور گواہ پیش ہوگا اور ہم تجھے دکھا کر ان سے پوچھیں گے کہ یہ بھی تو تم میں سے ایک تھا یہ کیوں شرک وغیرہ بدعقائد میں نہ پھنسا۔اور کیوں اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بندہ بن کر دوسروں کی ہدایت کا موجب ہوا۔کیا اسی وجہ سے نہیں کہ اس پر خدا تعالیٰ کا کلام نازل ہوا تھا اور تم اس سے محروم تھے بلکہ اس کلام کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتے تھے۔

اس کے بعد اس وحی کی برکات کی طرف اشارہ فرمانے کے لئے فرماتا ہے۔اے محمدؐ ہم نے تجھ پر وہ کتاب اتاری ہے جس میں ہر روحانی ضرورت کی تشریح ہے اور اس میں رحمت اور ہدایت کے سامان ہیں۔یعنی تجھ میں اور تیری قوم کے لوگوں میں جو فرق ہے وہ اسی کلام کی وجہ سے ہے۔

قرآن کریم میں ہر چیز کے اصول موجود ہیں یہاں کُلِّ شَیْءٍ سے دنیا کی ہر چیز مراد نہیں بلکہ وہ چیزیں مراد ہیں جو اسی کتاب سے مناسبت رکھتی ہیں۔کوئی استاد اگر اپنے شاگرد کو کہے کہ ساری کتب اٹھالاؤ تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ لائبریری کی سب کتب اُٹھالائے۔بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ اپنی کتب اٹھالاؤ ایسا ہی یہاں پر کل سے مراد وہ چیزیں ہیں جو روحانیت کی ترقی کے لئے ضروری ہیں۔اگر کوئی کہے کہ بعض مسائل کی تفصیل صرف احادیث میں ملتی ہے۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصول سب قرآن کریم میں بیان ہیں جو تفاصیل احادیث میں ہیں وہ قرآن کریم کی تفسیر ہیں۔محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کا فہم سب سے زیادہ دیا تھا۔وہ قرآن کریم سے جو مطالب اخذ کرتے تھے ہم نہیں کر سکتے۔پس اگر آپ نے قرآنی مطالب کی بعض تفاصیل بیان کی ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کریم نامکمل ہے بلکہ اس کے صرف یہ معنے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کامل فہم سے ان مسائل کا قرآن سے استنباط کیا۔گو ہمارا ذہن اس باریکی کو نہیں پاسکا۔

اہلِ قرآن کو غلطی لگنے کی وجہ اہل قرآن کہلانے والوں کو اس مسئلہ میں سخت غلطی لگی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرح کے آدمی تھے ان کی بات کیوں مانیں جو قرآن کریم میں ہے وہ مانیں گے حالانکہ رسول کریمؐ کی بات کے ماننے کا سوال نہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ آپ ہم سے قرآن کریم کو زیادہ سمجھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم: ۴،۵) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کے متعلق جو کچھ فرماتے تھے وحی الٰہی کے مطابق فرماتے تھے غلطی نہیں کرتے تھے۔ پس جس کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا اس کے فہمِ قرآن کو دوسروں کے فہم پر مقدم کیا جائے گا۔ ہمارا یہ حق ہے کہ یہ بحث کریں کہ یہ حدیث صحیح نہیں۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ حدیث تو صحیح ہے مگر رسول کریم صلعم نے غلطی کی۔ نعوذ باللہ من ذالک قرآن کریم کی تعلیم کے بارہ میں آپؐ کی تفسیر اگر ہماری سمجھ میں نہیں آتی تو بھی آپ ہی کی تفسیر کو ہمیں صحیح ماننا پڑے گا۔ بشرطیکہ جس حدیث میں وہ مذکور ہے وہ صحتِ احادیث کے اصول پر پوری اترتی ہو۔

قرآن کریم کے چار کام اس جگہ قرآن کریم کے چار کام بتائے ہیں (۱) تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ہے یعنی سب ضروری امور روحانیہ کی تشریح اس میں موجود ہے (۲) ہدایت ہے (۳) رحمت ہے۔ (۴) مومنوں کے لئے بشارت ہے۔ اگلی آیات میں ان مطالب کی تشریح کی گئی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ

اللہ (تعالیٰ) یقیناً عدل کا اور احسان کا اور (غیر رشتہ داروں کو بھی) قرابت والے (شخص) کی طرح (جاننے

ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ ج

اور مدد) دینے کا حکم دیتا ہے اور (ہر ایک قسم کی) بے حیائی اور ناپسندیدہ باتوں اور بغاوت سے روکتا ہے۔ وہ تمہیں

يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۹۱﴾

نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سمجھ جاؤ۔

حلّ لُغات ۔ **اَلْعَدْلُ** اَلْعَدْلُ عَدَلَ کا مصدر ہے اور عَدَلَ (يَعْدِلُ) فُلَانًا بِفُلَانٍ کے معنے ہیں۔ سَوّٰى بَيْنَهُمَا۔ دونوں کے ساتھ برابر کا سلوک کیا۔ عَدَلَ الْقَاضِيْ وَالْوَالِيْ (عَدْلًا وَعَدَالَةً) قاضی نے انصاف

کیا۔ نیز اَلْعَدْلُ کے معنے ہیں۔ضِدُّ الْجَوْرِ۔انصاف۔اَلْعَادِلُ اَلْمَرْضِیُّ لِلشَّھَادَۃِ۔درست گواہی دینے والا۔ راستباز۔اَلْعَدْلُ مِنَ الْقُضَاۃِ وَالْحُکَّامِ۔اَلْوَافُوْنَ لِلْحَقِّ فِی اَحْکَامِھِمْ۔وہ حکام اور قاضی جو درست فیصلے کرنے والے ہوں۔(اقرب)

اَلْاِحْسَانُ اَلْاِحْسَانُ اَحْسَنَ سے مصدر ہے اور اَحْسَنَ کے معنے ہیں اَتیٰ بِالْحَسَنِ۔پسندیدہ کام کیا۔ اَحْسَنَ الشَّیْءَ جَعَلَہٗ حَسَنًا۔کسی چیز کو عمدہ بنا دیا۔عَلِمَہٗ۔کسی چیز کو جانا۔اور انہی معنوں میں یہ فقرہ بولا جاتا ہے کہ فُلَانٌ یُحْسِنُ الْقِرَاءَۃَ اَیْ یَعْلَمُھَا۔فلاں شخص اچھی طرح پڑھنا جانتا ہے(اقرب)

اَلْقُرْبیٰ اَلْقُرْبُ فِی الرَّحِمِ۔رشتہ داری۔(اقرب)

اَلْفَحْشَاءُ اَلْفَاحِشَۃُ۔سخت قباحت والا گناہ یا ہر وہ بات جس سے اللہ نے روکا ہے۔اَلْبُخْلُ فِی اَدَاءِ الزَّکٰوۃِ۔زکوٰۃ کی ادائیگی میں بخل۔(اقرب)

اَلْمُنْکَرُ اَلْمُنْکَرُ اَنْکَرَ سے اسم مفعول ہے(اس کے لئے دیکھو حجر آیت نمبر ۶۳) نیز اس کے معنے ہیں مَا لَیْسَ فِیْہِ رِضَی اللّٰہِ مِنْ قَوْلٍ اَوْفِعْلٍ۔وَالْمَعْرُوْفُ ضِدُّہٗ۔ناپسندیدہ بات یا فعل۔معروف اس کے مخالف معنے دیتا ہے۔(اقرب)

تَذَکَّرُوْنَ تَذَکَّرُوْنَ تَذَکَّرَ سے جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور تذکّر کے وہی معنے ہیں جو ذَکَرَ کے ہیں۔ذکر کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۲۰۔

یَتَذَکَّرُ تَذَکَّرَ سے مضارع کا صیغہ ہے اور تَذَکَّرَ کے معنے ہیں ذَکَرَ الشَّیْءَ وَحَفِظَہٗ فِی ذِھْنِہٖ۔کسی چیز کو ذہن میں محفوظ کیا یعنی یاد کیا۔ مَا کَانَ قَدْ نَسِیَ۔فَطِنَ بِہٖ بھولی ہوئی بات کو بیان کیا۔اَللّٰہَ مَجَّدَہٗ وَسَبَّحَہٗ۔ اللہ کی بزرگی بیان کی اور اس کی تسبیح کی۔(اقرب)

تفسیر ۔پچھلے رکوع کے آخر میں دعویٰ کیا گیا تھا وَ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًی وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ۔یعنی قرآن کریم ان چار خوبیوں کا حامل ہے (۱) تِبْیَانٌ لِکُلِّ شَیْءٍ (۲) ھدایت (۳) رحمۃ (۴) بشریٰ للمسلمین۔اس رکوع میں اور اگلے رکوعوں میں اس امر کا ثبوت دیا گیا ہے کہ یہ چاروں امور قرآن کریم میں پائے جاتے ہیں اور ان کی بناء پر قرآن کریم کے کامیاب ہونے میں کوئی شک نہیں۔

سب سے پہلا ثبوت یہ آیت ہے اور میرے نزدیک اس آیت میں جو مضمون بتایا گیا ہے وہی ان چاروں باتوں کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

اس آیت میں تین باتوں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور تین باتوں سے رکنے کا حکم دیا گیا ہے اور بری باتوں سے روکنا رحمت پر دلالت کرتا ہے اور اچھی باتوں کے کرنے کا حکم دینا ہدایت پر دلالت کرتا ہے۔

یہ آیت قرآن کریم کے جامع ہونے کی بہترین مثال ہے پھر اس میں اخلاقی امور کے سب مدارج کو جمع کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ آیت جامع ہو گئی ہے اور تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ کی بہترین مثال ہے۔ آیت کو ختم لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ پر کیا گیا ہے۔ تَذَکَّرَ کے وہی معنے ہوتے ہیں جو ذَکَرَ کے معنے ہیں پس اس کے معنے یاد رکھنے یا خدا تعالیٰ کی بڑائی کرنے کے ہیں۔ اور لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ کے معنے ہیں تا تم اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حقوق کو یاد رکھو یا یہ کہ تا تم اللہ تعالیٰ کی تحمید و تمجید کرو۔ اور چونکہ یہی دونوں مقصد ہیں جن کو پورا کرنے کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے اس لئے اس آیت میں یہ بشارت بھی دی گئی ہے کہ اس تعلیم پر چل کر تم اپنی پیدائش کے مقصود کو پالو گے۔

دیکھو کس قدر چھوٹی سی آیت ہے اور کس طرح اس میں ان سب امور پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کا قرآن کریم کی فضیلت کے متعلق دعویٰ کیا گیا ہے۔ اس ایجاز کے ساتھ ایسی تفصیل قرآن کریم کے سوا اور کسی کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ اور پھر کوئی اغلاق نہیں معمّہ نہیں مضمون صاف ہے ہر عقلمند ایک ادنیٰ تأمل سے حقیقت کو معلوم کر سکتا ہے۔

اب میں آیت کے مضمون کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرتا ہوں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا میں ہر ایک چیز کے لئے ایک اثبات کا پہلو ہوتا ہے اور دوسرا نفی کا۔ کوئی چیز مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ اس کے دونوں پہلو مکمل نہ ہوں۔ یعنی جن چیزوں کا اس کی تکمیل کے لئے موجود ہونا ضروری ہے وہ اس میں پائی جائیں اور جن چیزوں سے اس کی ذات میں نقص پیدا ہوتا ہو ان سے وہ پاک ہو۔

مکمل مذہبی تعلیم کے لئے تین ضروری خصوصیتیں مذہب کو مدنظر رکھتے ہوئے مکمل تعلیم کے لئے مندرجہ ذیل باتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

۱۔ یہ کہ وہ ان باتوں کے کرنے کا حکم دے جن سے روحانیت اپنے کمال کو پہنچ سکتی ہو اور ان باتوں سے منع کرے جو اس کمال سے محروم رکھنے والی ہوں۔

۲۔ یہ کہ وہ ایسا قانون تجویز کرتے وقت جو صرف ایک شخص یا قوم سے تعلق نہ رکھتا ہو بلکہ کثیر افراد اور کثیر اقوام سے تعلق رکھتا ہو ان تمام طبائع کا لحاظ رکھے جن کے لئے وہ وضع کیا گیا ہو۔ اور ایسے احکام دے جن پر ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق عمل کر سکے۔

۳۔ تیسری خصوصیت مکمل تعلیم میں یہ ہونی چاہیے کہ اس کے احکام بنی نوع انسان کے لئے قابل عمل ہوں

اوران سے کوئی فساد مذہب میں یا اخلاق میں یا عقل میں یا تمدن میں نہ پیدا ہوتا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان تینوں خوبیوں کو جمع کر دیا ہے۔ دیکھو کتنی چھوٹی سی آیت ہے مگر اس میں تکمیل کے دونوں پہلو (نفی و اثبات) کس خوبی اور خوش اسلوبی سے جمع کر دئے گئے ہیں۔ تین باتوں یعنی عدل، احسان اور ایتاء ذی القربیٰ کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور تین باتوں یعنی فحشاء، منکر اور بغی سے روکا گیا ہے۔ عدل کے معنی برابری کے ہوتے ہیں یعنی انسان دوسرے سے ایسا سلوک یا معاملہ کرے جیسا کہ اس کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس پر ظلم کیا جاتا ہے تو وہ اتنا بدلہ لے سکتا ہے جتنا ظلم ہوا ہے مگر اس سے زیادہ سختی نہیں کر سکتا۔ اگر اس سے کوئی شخص حسن سلوک کا معاملہ کرتا ہے تو اس کا بھی فرض ہے کہ کم سے کم اتنا حسن سلوک اس سے کرے۔

اللہ تعالیٰ سے عدل کے معنی اللہ تعالیٰ سے عدل کرنے کے یہ معنے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ نیک معاملہ کیا ہے۔ یہ بھی اس کا حق ادا کرے اور اپنے وجود سے اللہ تعالیٰ کے لئے اعتراضات کے مواقع پیدا نہ کرے۔ اسی طرح یہ کہ اس کا حق غیر اللہ کو نہ دے اور شرک میں مبتلا نہ ہو کیونکہ شرک کرنا گو یا خدا تعالیٰ کا حق چھین کر دوسرے کو دینا ہے اور یہ ظلم ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کریم میں شرک کا نام ظلم بھی رکھا گیا ہے۔ پس خدا کا بیٹا یا بیوی یا اس کے شریک قرار دینا عدل نہیں بلکہ ظلم ہے۔ کیونکہ ظلم اسی کو کہتے ہیں کہ ایک کا حق کسی اور کے سپرد کر دیا جائے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنی طرف منسوب کر لینا بھی عدل کے خلاف ہے۔ مثلاً شریعت کا بنانا اور الہام الٰہی کا بھیجنا خدا تعالیٰ کا کام ہے۔ اب اگر کوئی شخص خود ہی شریعت بنانے کا مدعی بن بیٹھے یا الہام نازل کرنے کا جیسا کہ بہاء اللہ وغیرہ نے کیا تو وہ عدل کو توڑتا ہے۔ اگر انسان خدا تعالیٰ کے ساتھ عدل کرے تو شرک، کفر اور نافرمانی سب مٹ جائیں۔

عدل سے بڑھ کر دوسرا درجہ احسان بتایا ہے۔ احسان کا مفہوم یہ ہے کہ یہ نہ دیکھنا چاہیے کہ دوسرا ہم سے کیا سلوک کرتا ہے بلکہ اگر وہ برا سلوک کرتا ہے تب بھی ہم اس کے ساتھ اچھا ہی سلوک کریں۔ یہ مقام پہلے مقام سے بڑا ہے اور عفو، درگذر، غرباء کی مدد، صدقہ و خیرات اور قومی خدمات وغیرہ نیکیاں سب اس کے اندر شامل ہیں۔

علوم کی ترقی و تدوین کے لئے کوشش کرنا بھی اس کے اندر آ جاتا ہے کیونکہ ان کے نتیجہ میں اپنوں اور بیگانوں کو جسمانی اور روحانی فائدہ اور آرام پہنچتا ہے۔

ایتاء ذی القربیٰ کا درجہ تیسرا مقام اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى کا بتایا ہے جس کے معنے ''رشتہ داروں کو دینا یا رشتہ داروں کا دینا ہے''۔ اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ بنی نوع انسان سے ایسا سلوک کرو جیسا کہ ایک رشتہ دار

دوسرے رشتہ دار سے سلوک کیا کرتا ہے۔

ماں کی محبت بے لوث ہوتی ہے اس سلوک سے احسان کا سلوک مراد نہیں کیونکہ احسان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس سلوک سے وہ سلوک مراد ہے جو محبت طبعی کی وجہ سے مبادلہ کے خیال کے بغیر کیا جاتا ہے۔ احسان کرتے وقت تو انسان کو یہ خیال ہوتا ہے کہ فلاں شخص نے مجھ سے اچھا سلوک کیا ہے میں اس سے بہتر بدلہ دوں تا میری نیک نامی ہو یا گنہگار کی خطا معاف کرتے ہوئے یہ خیال آجاتا ہے کہ میں اس سے حسن سلوک کروں گا تو اس کے دل سے بغض نکل جائے گا اور یہ میرا دوست بن کر میری تقویت کا موجب ہوگا۔ لیکن ماں جو اپنے بچہ سے محبت کرتی ہے اور اس کے لئے قربانی کرتی ہے اس میں ذرّہ بھر بھی بدلہ کی خواہش نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی محبت کی بنیاد اس کی اپنی ہی قربانی پر ہوتی ہے ایک عورت کے ہاں جب اولاد نہیں ہوتی تو اس کے دل میں یہ خیال نہیں پیدا ہوتا کہ میرا لڑکا ہوتا تو وہ میری خدمت کرتا۔ بلکہ اسے اولاد کی خواہش اس جذبہ کے ساتھ ہوتی ہے کہ میں اسے پالتی، اس کی خدمت کرتی، اسے کپڑے پہناتی، اُسے بیاہتی، اس کے بچوں کو کھلاتی۔ غرض اولاد کی خواہش کے وقت ماں کے دل میں خدمت لینے کا ادنیٰ سے ادنیٰ احساس بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس خواہش کا موجب اولاد کی خدمت کرنے کا شوق ہوتا ہے یہی وہ نیکی کا جذبہ ہے جو انسان کے لئے سب سے بڑی نیکی ہے۔ اور جس کے حصول کے بعد انسان کا اخلاقی وجود مکمل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ احسان کا مقام حاصل کرنے کے بعد جب کہ تم کو لینے سے زیادہ دینے کی خواہش ہوتی ہے تو وہ مقام نیکی کا بھی حاصل کرو کہ سب بنی نوع انسان تمہیں اپنے بچے نظر آنے لگیں اور ان کی خدمت کا جوش تمہارے دل میں اس طرح موجزن ہو جائے جس طرح ایک ماں کے دل میں اپنے بچہ کی محبت جوش مارتی رہتی ہے۔

احسان اور ایتاء ذی القربیٰ قرب الٰہی کی دو سیڑھیاں ہیں یہ تعلیم جو اوپر بیان ہوئی ہے اس میں اثباتی تعلیم کا ذکر کیا گیا ہے اور نہایت مختصر الفاظ میں اخلاق فاضلہ کے سب پہلوؤں کو بیان کر دیا گیا ہے۔ اس موقعہ پر یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حق تو عدل میں ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی شخص احسان یا ایتاء ذی القربیٰ کا معاملہ نہیں کر سکتا۔ مگر بندوں کے ساتھ سلوک کا حکم عدل میں بھی ہے اور پھر احسان و ایتاء ذی القربیٰ میں بھی ہے بلکہ پچھلے دو مقامات میں تو خالص بندوں ہی کے ساتھ تعلقات سلوک مراد ہیں۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ تک پہنچنے اور اس کی مرضی کو پانے کے لئے بندوں سے سلوک ضروری ہے۔ گویا احسان اور ایتاء ذی القربیٰ قرب الٰہی کی دو سیڑھیاں ہیں۔

فحشاء سے مراد اس اثباتی تعلیم کے بعد نفی کے پہلو کو لیا گیا ہے اور اس میں بھی تین ہی باتوں سے روکا گیا ہے۔ سب سے پہلے فحشاء سے روکا ہے اور فحشاء کا لفظ جب منکر کے مقابل میں آئے تو اس سے مراد صرف وہ بدی ہوتی ہے جس کا علم صرف اس کے مرتکب کو ہو، دوسرے کو نہ ہو۔ اس کے بعد منکر سے روکا ہے۔ منکر سے مراد وہ بدی ہے جو لوگوں کو نظر آتی ہو اور وہ اسے برا محسوس کرتے ہوں۔ اگرچہ اس کا اثر باقی لوگوں کے حقوق پر عملاً بہت کم پڑتا ہو۔ مثلاً گالیاں دینا جھوٹ بولنا وغیرہ یہ سب منکر میں شامل ہیں۔ پس منکر سے اس لئے منع فرمایا کہ اس سے لوگوں کو ذہنی تکلیف پہنچتی ہے۔

تیسری بات جس سے روکا ہے وہ بغی ہے یعنی کسی کا حق مار لینا۔ یہ بدی نہ صرف لوگوں کو محسوس ہی ہوتی ہے بلکہ اس سے لوگوں کو نقصان بھی پہنچتا ہے۔

دنیا کی تمام بدیاں فحشاء منکر اور بغی میں آجاتی ہیں دنیا میں جس قدر بدیاں پائی جاتی ہیں خواہ وہ کسی قسم کی ہی کیوں نہ ہوں۔ ان تینوں اقسام میں آجاتی ہیں۔ یا تو بدی ایسی مخفی ہوتی ہے کہ لوگوں کی نظر سے پوشیدہ رہتی ہے یا ایسی ہوتی ہے کہ دوسرے لوگوں کو بھی اس کا علم ہو جاتا ہے اور انہیں اس سے ذہنی تکلیف پہنچتی ہے اور یا پھر وہ بدی ایسی سخت ہوتی ہے کہ اگر بعض کو اس سے ذہنی تکلیف پہنچتی ہے تو بعض دوسروں کے حقوق اس فعل کی وجہ سے تلف ہو جاتے ہیں۔ ان سب قسم کی بدیوں سے بچنے کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے۔

کامل تعلیم کے لئے تمام فطرتوں کا لحاظ ضروری ہوتا ہے میں نے اوپر بتایا تھا کہ کامل تعلیم کے لئے جو سب ضرورتوں پر حاوی ہو یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں تمام فطرتوں کا لحاظ رکھا گیا ہو۔

اس آیت میں جو تعلیم دی گئی ہے اس میں وہ بات بھی موجود ہے کیونکہ دنیا میں بعض انسان ایسے ہوتے ہیں جو فحشاء میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن ظلم کرنا ہرگز پسند نہیں کرتے اور اسی طرح کئی ایسے بھی ہوتے ہیں جو ظلم کر کے دوسروں کا مال تو لے لیتے ہیں مگر جھوٹ سے ان کو نفرت ہوتی ہے اور وہ کسی کا حق مارنا بھی پسند نہیں کرتے مگر شریعت کی بیان کردہ وہ بدیاں جو انسان کی ذات سے تعلق رکھتی ہیں یعنی دل میں کسی کا کینہ رکھنا یا عیب جوئی کرنا یا چغلی کرنا وغیرہ وہ ان میں مبتلا ہوتے ہیں۔

قرآنی تعلیم ہی مکمل تعلیم ہے اللہ تعالیٰ نے تین جامع الفاظ رکھ کر ہر قسم کی بدیوں کو اور سب طبائع کی بدیوں کو شامل کر دیا ہے۔ اور ایسا ہی نیکیوں کے ذکر میں بھی ہر قسم کے میلان والوں کو جمع کر دیا ہے۔ عدل کو بھی اور احسان کو بھی اور بلا مبادلہ خدمت کرنے کی طاقت کو بھی۔

نیکی کے حصول اور بدی سے بچنے کا طبعی طریقہ اس کے علاوہ ان مختصر سے الفاظ میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ بدی سے بچنے اور نیکی کے اختیار کرنے کا راستہ کون سا ہے۔ چنانچہ نیکیاں گناتے ہوئے نیکی کے نچلے درجے کو پہلے بیان فرمایا ہے پھر اس کے اوپر کے درجہ کو پھر اُس کے اوپر کے درجہ کو۔ اسی طرح بدیوں کے ذکر کو سب سے پہلے نچلے درجہ کی بدی سے شروع کیا ہے پھر اس سے اوپر کی بدی بیان کی ہے اور پھر اس سے اوپر کی اور اسی طرح انسان کو نیکیوں کے حصول اور بدیوں سے بچنے کا طبعی طریقہ بھی بتا دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ جو انسان نیکی کے حصول کے لئے کوشش کرنی چاہے اسے پہلے عدل کا مقام اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے پھر احسان کا پھر ایتاء ذی القربیٰ کا۔ اسی طرح جو بدیوں سے بچنا چاہے اسے پہلے بغی سے بچنا چاہیے پھر منکر سے بچنے کے قابل ہو سکے گا اور پھر منکر سے بچنے کی جدوجہد کرنی چاہیے پھر کہیں جا کر وہ فحشاء سے بچنے کے قابل ہوگا۔ اس کے برخلاف اس ترتیب سے اس امر کی طرف بھی رہنمائی کی گئی ہے کہ نیکیوں میں تنزّل کی سیڑھی کون سی ہے۔ جو انسان ایتاء ذی القربیٰ کے مقام پر ہے اسے اس پر مضبوطی سے قائم ہونا چاہیے ورنہ گر کر احسان کے مقام پر آ جائے گا۔ اور احسان پر جو کھڑا ہے اسے اپنے مقام کا خیال رکھنا چاہیے ورنہ عدل کے مقام پر آ گرے گا۔ اسی طرح اس پر خوش نہ ہونا چاہیے کہ مجھ میں صرف فحشاء پائی جاتی ہیں کیونکہ جو فحشاء کا مرتکب ہوتا ہے منکر کا ارتکاب اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے اور پھر بغی کا۔

نیکی کرنے کے لئے سب سے پہلے چھوٹی بدی کو پھر بڑی کو چھوڑنا چاہیے غرض اس بیان میں ترتیب کو مدنظر رکھ کر انسانی ذہن کو اس طرف منتقل کیا ہے کہ نیکی کرنے میں سب سے چھوٹی نیکی پہلے حاصل ہوتی ہے اور بدی کو ترک کرتے ہوئے سب سے بڑی بدی کو پہلے چھوڑا جاتا ہے۔ اس جدوجہد کی مثال سیڑھی کی ہے جو انسان نیکی کی عمارت پر چڑھنا چاہے وہ سب سے پہلے نچلے زینہ پر قدم رکھے گا اور پھر ایک ترتیب سے ترقی کرتا ہوا اوپر تک چڑھ جائے گا۔ اور جو شخص بدیوں کے مکان پر چڑھ چکا ہے اور نیچے اترنا چاہتا ہے اسے سب سے پہلا قدم اوپر کے زینہ پر رکھنا ہوگا۔ اور پھر وہ تدریجاً نیچے آتا جائے گا۔

اسلامی تعلیم پر ہر درجہ کا آدمی عمل کر سکتا ہے میں نے اوپر ذکر کیا تھا کہ تیسری خوبی جس کا مکمل تعلیم میں پایا جانا ضروری ہے یہ ہے کہ اس پر عمل کرنا سب انسانوں کے لئے ممکن ہو۔ یہ خوبی بھی مذکورہ بالا تعلیم میں پائی جاتی ہے۔ جہاں یہ تعلیم نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے وہاں اس پر عمل بھی ہر درجہ اور طبقہ کے آدمیوں کے لئے ممکن ہے۔ وہ نہ تو ادنیٰ اخلاق کی تعلیم دے کر خاموش ہو جاتی ہے کہ اعلیٰ ترقیات کے خواہش منداس سے تسلی نہ پا سکیں اور نہ اعلیٰ اخلاق کے بیان پر بس کر دیتی ہے کہ کمزور انسان نیکی سے محروم رہ جائیں۔ بلکہ وہ نیکی اور بدی کے تمام مدارج کو

بیان کرتی ہے تا کہ بدوں کو بدی چھڑانے میں مدد دے اور نیکوں کی نیکی کے حصول میں اعانت کرے۔ایک بدی میں ڈوبے ہوئے انسان کو یہ کہنا کہ تو ایسا نیک ہو جا کہ سب دنیا کا سہارا تو ہی ہو اور تو سب کے لئے بمنزلہ ماں کے ہو جا۔ ایسا ہی بے فائدہ ہوگا جیسے ایک الف، ب پڑھنے والے کو ایم۔اے کا کورس شروع کرا دینا۔اسی طرح ایک اعلیٰ درجہ کے نیک آدمی کو یہ کہنا کہ دیکھو بغاوت اور سرکشی نہ کرو اور ظلم نہ کرو بالکل فضول بات ہوگی۔ جو شرارت میں بڑھا ہوا ہو اس سے پہلے بڑی بدیاں چھڑوائی جائیں تبھی اصلاح ممکن ہے۔اور جو نیکی میں ترقی کر رہا ہو اسے صرف باریک گناہوں سے ہوشیار رہنے کی تلقین کرنا کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ کیونکہ بدی کی عام راہوں کو تو وہ پہلے ہی چھوڑ چکا ہے۔اور یہ سب خوبیاں اوپر کی تعلیم میں موجود ہیں۔وہ بڑی نیکی کی راہیں بھی بتاتی ہے اور چھوٹی نیکی کی بھی۔ اور بڑی بدیوں سے بھی بچاتی ہے اور چھوٹیوں سے بھی۔اور ہر شخص خواہ کسی درجہ کا ہو اس کو سمجھ سکتا ہے اور اس پر عمل بھی کر سکتا ہے۔

ہر چیز کی تکمیل کے چھ درجے ہوتے ہیں اور ساتواں کمال کا یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس آیت میں تین درجے بدی کے اور تین درجے نیکی کے بیان فرمائے گئے ہیں۔ چونکہ نیچر میں ہمیں یہ قانون رائج معلوم ہوتا ہے کہ تکمیل سے پہلے ہر شے کو چھ مدارج طے کرنے پڑتے ہیں۔اس آیت میں گویا روحانی تکمیل کا سب نصاب بیان کر دیا گیا ہے جسے پڑھ کر انسان ساتواں درجہ یعنی کمال کا مقام حاصل کر سکتا ہے۔

بدی سے نیکی کی طرف آنے کے مدارج جو بدیوں میں ڈوبے ہوئے لوگ ہیں انہیں پہلی جدوجہد بغی سے بچنے کے لئے کرنی پڑتی ہے۔اس دلدل سے نکلتا ہے تو منکر کا کیچڑ آ جاتا ہے اور جب منکر کے کیچڑ سے نکلتا ہے تو فحشاء کے گرد و غبار میں پھنس جاتا ہے۔ جب اس سے نجات پاتا ہے تو عدل کے مرغزار کی حد شروع ہو جاتی ہے۔اسے قطع کر لیتا ہے تو احسان کا چمن آ جاتا ہے۔اسے طے کر لیتا ہے تو ایتاء ذی القربیٰ کا چشموں والا باغ آ جاتا ہے اور اس کے آگے جنت ہی جنت ہے۔اسی مناسبت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے (کنز العمال باب الثامن فی بر الوالدین۔الأم)۔اس آیت میں بھی ایتاء ذی القربیٰ کو جو ماں کے سے سلوک پر دلالت کرتا ہے تکمیل کا آخری اور جنت سے پہلا مقام بتایا گیا ہے۔اور جنت کا مقام ذاکر کا ہے جو خدا تعالیٰ میں محو ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ اس کے دل میں ڈیرا جما لیتا ہے اور محب اور محبوب دائمی اور نہ ٹوٹنے والے رشتہ میں پروئے جاتے ہیں۔

اس آیت کی اہمیت ابتداء اسلام سے ہی مسلّم ہے یہ آیت ہر جمعہ میں خطبہ کے دوسرے حصہ میں پڑھی

جاتی ہے اور یہ رواج حضرت عمر بن عبد العزیز اموی خلیفہ کے عمل سے شروع ہوا ہے (تاریخ الخلفاء ذکر عمر بن عبد العزیز)۔ اس امر سے ظاہر ہے کہ مسلمان ابتدا ہی سے اس آیت کی اہمیت کو سمجھتے رہے ہیں۔ عیسائی اس آیت پر بہت چڑتے ہیں اور ویری نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ مسلمان اس تعلیم کو اعلیٰ اعلیٰ کہہ کر پیش کرتے ہیں (تفسیر القرآن از وہیری) وہ ہمارے مسیح کی تعلیم سے تو اس کا مقابلہ کریں جو متی باب ۲۲۔ ۳۷۔ ۳۹ میں بیان ہے جہاں لکھا ہے ''خداوند اپنے خدا سے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے اور دوسرا اس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔'' حالانکہ مسیح کی اس تعلیم پر عیسائیوں کا فخر بالکل بے جا اور فضول ہے۔ قرآن مجید کی تعلیم کے مقابلہ میں اس تعلیم کو پہلے قدم کی سی حیثیت حاصل ہے۔

عیسائیت کی تعلیم کا مقابلہ اسلامی تعلیم سے بے شک مسیح نے کہا کہ ''خدا سے اپنے سارے دل اور ساری جان اور ساری عقل سے محبت رکھ''۔ مگر سوال یہ ہے کہ دل کس نے دیا؟ جان کس نے دی؟ عقل کس نے عطا فرمائی؟ اللہ نے۔ پس ان کے ساتھ جو بھی محبت کی جائے گی۔ وہ عدل کے مقام سے اوپر نہیں جا سکتی ہاں عدل کا لفظ اس فقرہ سے بہت زیادہ وسیع ہے کیونکہ ان چیزوں کے علاوہ اور بھی چیزیں ہیں جن کی قربانی ضروری ہوتی ہے مثلاً احساسات وجذبات۔ جب تک انسان اپنی ہر ایک خواہش ہر ایک ارادہ اور دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر خدا سے محبت نہ کرے گا تو وہ عدل کرنے والا نہیں کہلا سکتا۔ بے شک ساری جان سے محبت کرنا اچھی بات ہے مگر کئی لوگ ہیں جو اپنی جان سے بڑھ کر اپنی اولاد سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور کئی ایسی طبائع ہیں جو اپنے دل اور اپنی جان کی نسبت مال سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ اور کئی اس فطرت کے ہوتے ہیں جو اپنی عزت وناموس کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دینے سے دریغ نہیں کرتے۔ تو خالی ساری جان، سارے دل اور ساری عقل کے لفظ کے اندر ہر قسم کی قربانی اور خدا تعالیٰ سے کامل محبت جس کو عدل کا لفظ ظاہر کرتا ہے نہیں آسکتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دوسری جگہ مختلف قسم کے جذبات کو یوں بیان فرمایا ہے قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (التوبة: ۲۴) کہہ دے کہ اگر تمہیں اپنے آباؤ اجداد یا اپنی اولاد یا اپنے بھائی یا اپنی بیویاں یا اپنی قوم اور قبیلہ یا اپنے اموال اور تجارتیں خدا اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد سے پیارے ہیں تو تم وہ چیز نہیں ہو جو قبول کئے جانے کے لائق ہو پس انتظار کرو یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کا فیصلہ آجائے۔ اللہ تعالیٰ فاسق قوم کو کبھی کامیاب نہیں کرتا۔

فطرت انسانی کی محبوب ترین اشیاء کی تفصیل دیکھو اس میں ہر قسم کے انسانوں کے لئے خدا تعالیٰ سے محبت کا معیار بتا دیا ہے۔ بعض لوگ جن میں احسان کی قدر کا مادہ زیادہ ہوتا ہے انہیں اپنے ماں باپ سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے ان لوگوں کے لئے فرمایا کہ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ اگر تم خدا کے مقابلہ میں اپنے آباء سے زیادہ محبت کرتے ہو تو تم ابھی تک مومن نہیں۔

بعض لوگوں کے اندر بقائے نسل کا تقاضا بہت نمایاں ہوتا ہے اور وہ اپنی اولاد کو سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے ''ابناء کم'' کا لفظ فرما کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ جب تک تم اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر خدا سے محبت نہ کرو گے اس وقت تک تمہارا ایمان قبولیت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتا۔

پھر کئی لوگوں کو جتھا سب سے پیارا لگتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے ''اِخْوَانُكُمْ'' کا لفظ رکھ کر فرمایا کہ جب تک تم اپنے بھائیوں سے بھی زیادہ خدا تعالیٰ سے محبت نہ کرو تم اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں کر سکتے۔

کئی ایسے ہوتے ہیں کہ جن پر شہوت کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور انہیں اپنی بیویاں دنیا میں سب سے زیادہ پیاری ہوتی ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے ''اَزْوَاجُكُمْ'' کا لفظ رکھا گیا اور بتایا گیا کہ اس صورت میں جب تک تم اپنی بیویوں کی محبت کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے تابع نہ کرو گے تم اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل نہیں کر سکتے۔

بعض لوگ اپنے قبیلے اور خاندان کو سب چیزوں پر ترجیح دیتے ہیں ان کے لئے ''عَشِيْرَتُكُمْ'' کا لفظ فرما کر توجہ دلائی کہ جب تک اللہ تعالیٰ کو اپنے قبیلہ سے بھی زیادہ نہ چاہو گے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں کر سکتے۔

بعض ایسے بخیل ہوتے ہیں کہ جنہیں روپیہ اپنی اولاد اور جان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ بیسیوں ایسے لوگ دیکھے گئے ہیں جنہوں نے باوجود مالدار ہونے کے اپنی اولاد کے لئے کوئی دوائی تک منگا کر نہ دی اور وہ ان کے سامنے تڑپ تڑپ کر مر گئی تو ایسے لوگوں کے لئے فرمایا کہ اپنے اموال کو بھی خدا تعالیٰ کی محبت پر مقدم نہ رکھو ورنہ کبھی نیکی کا اعلیٰ مقام نہ پا سکو گے۔

بعض لوگ اس طبیعت کے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے ملک اور وطن کی خدمت کو اپنی ہر ایک چیز پر مقدم سمجھتے ہیں اور ان کا نعرہ ہی حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِيْمَانِ ہوا کرتا ہے۔ جیسا کہ ہمارے ملک میں ہجرت کے زمانہ میں ہزاروں لوگ اپنی اولاد، جائداد اور اموال چھوڑ کر ملک کی محبت کے نام پر ملک بدر ہو گئے۔ ایسے لوگوں کے لئے فرمایا کہ اگر تمہیں اپنے وطن اور گھر خدا سے زیادہ پیارے ہیں تو تم ابھی مومن نہیں ہو۔

قرآن کریم نے عدل کی یہ مختصر سی تشریح فرمائی ہے اب اس تعریف کے مقابلہ میں ''سارے دل ساری عقل

اور ساری جان‘‘ والی بات کیا حقیقت رکھتی ہے؟

متی کے اس حکم کا دوسرا حصہ یہ ہے۔ ’’دوسرا اس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔‘‘ اول تو یہی خلاف عقل ہے کہ اس حکم کو پہلے کی مانند قرار دیا جائے بے شک یہ ضروری حکم ہے مگر اسے پہلے حکم کی مانند قرار نہیں دیا جا سکتا۔ خدا تعالیٰ بہر حال مقدم ہے۔ مانند ماننے کا تو یہ مطلب ہے کہ اگر کبھی خدا تعالیٰ کا حکم اور پڑوسی کی خواہش ٹکرا جائیں تو ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں اور کہیں کہ یہ دونوں پہلو برابر ہیں یہ بھی ویسا ہی پیارا ہے اور وہ بھی۔ ایک کو دوسرے پر کس طرح ترجیح دی جائے۔

عیسائیت کی تعلیم کا معیار صفت عدل سے بڑھ کر نہیں اور پھر یہ حکم بھی عدل سے اوپر نہیں جاتا۔ کیونکہ اس میں ہر شخص کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے پڑوسی سے اپنے جیسی محبت کرے۔ تو گویا یہ وہ پہلا مقام ہے جس کو اسلام نے عدل قرار دیا ہے یا زیادہ سے زیادہ احسان کا مقام ہے مگر اسلام اس مقام سے انسان کو اوپر لے جاتا ہے اور فرماتا ہے کہ نہ صرف تم عدل کرو اور نہ صرف احسان کرو بلکہ تم بنی نوع انسان سے ایسا سلوک کرو جس میں کسی قسم کی ریاء یا بدلے کی خواہش کا شائبہ بھی نہ ہو۔ جس طرح ماں اپنے بچہ سے محبت کرتی ہے وہ اُسے اپنے برابر نہیں چاہتی بلکہ اپنے آپ کو اس کے آرام کے لئے قربان کر دیتی ہے۔

اس کے علاوہ قرآن کریم نے اس آیت میں نیکی اور بدی کے جو مدارج بیان فرمائے ہیں اور پھر جو ان کی ترتیب بیان فرما کر ان سے بچنے کی راہنمائی کی ہے وہ انجیل میں کہاں؟ پھر قرآن مجید نے اس حکم میں مختلف فطرتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک جامع تعلیم دی ہے۔ مگر انجیل میں ان سب باتوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ پس قرآن کریم کی تعلیم ہی جامع۔ کامل۔ قابل عمل اور اعلیٰ ہے۔

وَ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدۡتُّمۡ وَ لَا تَنۡقُضُوا الۡاَیۡمَانَ

اور (چاہیے کہ) اللہ (تعالیٰ) کے (ساتھ کئے ہوئے اپنے) عہد کو جب تم نے (اس سے کوئی) عہد کیا ہو پورا کرو

بَعۡدَ تَوۡکِیۡدِهَا وَ قَدۡ جَعَلۡتُمُ اللّٰهَ عَلَیۡکُمۡ کَفِیۡلًا ؕ اِنَّ

اور قسموں کو انہیں پختہ کرنے کے بعد جبکہ تم نے اللہ (تعالیٰ) کو (اس کی قسم کھا کر) اپنا ضامن بنالیا ہے مت

اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۹۲﴾

توڑو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ (تعالیٰ اُسے) یقیناً جانتا ہے۔

حلّ لُغَات۔ کَفِیۡلٌ کَفَلَ الرَّجُلَ والصَّغِیرَ (کَفْلًا وَ کَفَالَۃً) عَالَہٗ وَاَنۡفَقَ عَلَیۡہِ وَقَامَ بِہٖ۔ کسی کی پرورش کی اور اس کے اخراجات کو اٹھایا۔ اس سے اسم فاعل کَافِلٌ ہے۔ کَفَلَ بِالۡمَالِ (کَفْلًا وَ کُفُوۡلًا) ضَمِنَہٗ۔ کسی مال کا ضامن ہوا۔ اور اس سے صیغہ صفت کَفِیۡلٌ آتا ہے کفیل کے معنے ضامن کے ہیں۔ کَافِلٌ اور کَفِیۡلٌ ایک ہی معنے رکھتے ہیں۔ نیز لفظ کَفِیۡلٌ مذکر و مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے کہتے ہیں رَجُلٌ کَفِیۡلٌ۔ وَامۡرَاَۃٌ کَفِیۡلٌ۔ اور لیثؔ نے کَفِیۡلٌ اور کَافِلٌ کے درمیان فرق کیا ہے۔ کہتا ہے کہ کَفِیۡلٌ ضامن کو کہتے ہیں اور کَافِلٌ وہ شخص ہوتا ہے جو کسی کے اخراجات برداشت کرتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ عہد اللہ کی تشریح بِعَھۡدِ اللّٰہِ۔ عہد اللہ سے کیا مراد ہے۔ اس کی تشریح دوسری جگہ قرآن شریف میں آئی ہے (۱) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

’’اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡھِمۡ فَمَنۡ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنۡکُثُ عَلٰی نَفۡسِہٖ وَمَنۡ اَوۡفٰی بِمَا عٰھَدَ عَلَیۡہُ اللّٰہَ فَسَیُؤۡتِیۡہِ اَجۡرًا عَظِیۡمًا‘‘ (الفتح:۱۱) وہ لوگ جو تیری بیعت کرتے ہیں وہ یقیناً اللہ کی بیعت کرتے ہیں اور اللہ کی مدد ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ پھر جو شخص اس بیعت کو توڑ دیتا ہے وہ اپنے نفس کا نقصان کرتا ہے اور جو اس ’عہد اللہ‘ کو پورا کرتا ہے تو اس کو خدا تعالیٰ اجر عظیم دے گا۔

عہد اللہ سے مراد اسلام قبول کرنا ہے اس آیت سے معلوم ہوا کہ ’’عہد اللہ‘‘ سے مراد اسلام ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی میں آپ کی بیعت مراد ہوتی تھی اور آپ کے بعد اسلام میں داخل ہونا۔

(۲) اللہ تعالیٰ کفار کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے وَقَالَتۡ طَّآئِفَۃٌ مِّنۡ اَھۡلِ الۡکِتٰبِ اٰمِنُوۡا بِالَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ الآیہ (آل عمران:۷۳)۔ کہ کفار کہا کرتے تھے کہ تم صبح کے وقت مسلمان بن جاؤ اور شام کو مرتد ہو جانا۔ اسی تسلسل کے ضمن میں چند آیات کے بعد فرماتا ہے بَلٰی مَنۡ اَوۡفٰی بِعَھۡدِہٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُتَّقِیۡنَ۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَشۡتَرُوۡنَ بِعَھۡدِ اللّٰہِ وَ اَیۡمَانِھِمۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَھُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ وَلَا یَنۡظُرُ اِلَیۡھِمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَ لَا یُزَکِّیۡھِمۡ ۪ وَ لَھُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ (آل عمران:۷۷۔۷۸) یوں نہیں جو تم کہتے ہو بلکہ بات یوں ہے کہ جو اپنے عہد کو پورا کرے اور تقویٰ سے کام لے تو (اس کا انجام اچھا ہوگا کیونکہ) اللہ متقیوں سے پیار کرتا ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ

کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلہ میں دنیوی فوائد اٹھاتے ہیں یقیناً ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے کلام نہ کرے گا اور نہ قیامت کے دن ان کی طرف (محبت سے) دیکھے گا۔ اور نہ انہیں پاک قرار دے گا اور انہیں دردناک عذاب ملے گا۔

ان آیات سے بھی ظاہر ہے کہ ''عہد اللہ'' سے مراد اسلام قبول کرنا ہے۔

(۳) پھر فرمایا ہے وَ لَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ؕ وَ كَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا (الاحزاب:۱۶)۔ فرمایا کہ ان لوگوں نے لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ کا عہد کیا تھا مگر اسے پورا نہ کیا۔ اور اللہ تعالیٰ سے جو عہد کئے جاتے ہیں ان کے توڑنے پر ضرور پرسش ہوتی ہے۔ لیکن جب ہم قرآن کریم میں دیکھتے کہ ان کا یہ عہد کہاں مذکور ہے تو منافقوں کی طرف سے اس کا ذکر قرآن کریم میں کہیں نہیں ملتا۔ ہاں اللہ تعالیٰ کا حکم ملتا ہے۔ چنانچہ سورۃ انفال میں ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ (الانفال:۱۶) کہ اے مومنو! جب کفار سے تمہارا مقابلہ ایسی حالت میں ہو کہ تم مل کر حملہ کرنے لگے ہو تو کبھی پیٹھ نہ پھیرا کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنا حکم ہے منافقوں کا کوئی ایسا عہد قرآن وحدیث میں مذکور نہیں۔

آنحضرتؐ کے زمانہ میں عہد اللہ سے مراد بیعت والا عہد تھا پس معلوم ہوا کہ ''عہد اللہ'' سے مراد وہی بیعت والا عہد تھا جس میں سب نیک باتوں کے ماننے کا عہد کیا گیا تھا۔ اور سب احکام الٰہی اس میں شامل تھے۔ چنانچہ سورۃ توبہ میں اس عہد کی تشریح یوں کی گئی ہے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ ؕ وَ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (التوبة :۱۱۱) کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی جانیں اور ان کے اموال اس وعدہ کے مقابل کہ انہیں جنت ملے گی خرید لئے ہیں۔ چنانچہ اس سودے کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے جنگ کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں کبھی تو وہ دشمن کو قتل کر دیتے ہیں کبھی خود مارے جاتے ہیں۔ یہ جنت دینے کا وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک پکا وعدہ ہے جو تورات وانجیل اور قرآن سب میں بیان ہوا ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ سے عہد کر کے اسے پورا کرتے ہوں ہم انہیں کہتے ہیں کہ اس نفع مند بیع پر جو تم نے کی ہے خوش ہو جاؤ اور یہ بیع ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔

غرض قرآن مجید سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ''عہد اللہ'' سے مراد اسلام ہی ہے اور اِذَا عَاهَدْتُّمْ کے معنے یہی ہیں کہ جب تم مسلمان ہوئے ہو تو اسلام کی تعلیم پر پورے طور سے عمل کرو۔ چونکہ اسلام کی تعلیم کا خلاصہ اِنَّ اللّٰهَ

یَاْمُرُ والی آیت میں بتایا گیا تھا اس لئے اس کے بیان کرنے کے بعد اس آیت میں یہ تاکید کی گئی ہے کہ اب تم لوگ اس تعلیم کے مطابق عملدرآمد کرو۔

اس آیت کے پہلے حصہ میں یہ بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ تم جو عہد کرتے ہو اس کو بھی پورا کرو۔ اور جو تمہارے آپس میں معاہدات ہوتے ہیں ان کو بھی مت توڑو۔ یعنی جب تم خدا تعالیٰ کو ضامن کر کے کسی انسان سے معاہدہ کرو تو اس کو ضرور پورا کرو۔ کیونکہ تم خدا تعالیٰ کو ضامن مقرر کر چکے ہو۔ پس خدا کا نام لے کر کئے ہوئے معاہدہ کو اگر تم توڑو گے تو گویا خدا تعالیٰ کو بدنام کرنے والے بنو گے۔ اور خدا تعالیٰ کو غیرت آئے گی اور اسے تمہیں سزا دینی پڑے گی۔

اس آیت میں پھر اسی مضمون کو قائم رکھا گیا ہے جو پہلی آیت میں بیان ہوا تھا۔ یعنی حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ گویا اسلام اور عہد الٰہی اللہ تعالیٰ اور بندوں کے صحیح تعلق پیدا کرنے کے دو نام ہیں۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پورا کرنے کا حکم یہاں جو یہ فرمایا کہ اس عہد کو پورا کرو جس میں تم نے اللہ تعالیٰ کو ضامن مقرر کیا ہو اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے عہد پورے نہ کرو تو کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ خدائی عہد میں سچ بولنا شامل ہے۔ بلکہ ان الفاظ سے اس مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انہی عہدوں کی پابندی انسان پر فرض ہے کہ جن کا ضامن اللہ تعالیٰ ہو۔ جن عہدوں کا ضامن اللہ تعالیٰ نہ ہو ان کا پورا کرنا غیر ضروری ہی نہیں بلکہ گناہ ہے۔ مطلب یہ کہ ہر وہ عہد جو انصاف اور سچائی پر مبنی ہو اس کا اللہ تعالیٰ ضامن ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر مومن سے سچائی کا عہد لے چکا ہے اور جو شخص اس عہد کے بعد کسی انسان سے کسی جائز امر کا اقرار کرتا ہے وہ اس عہد کے ساتھ گویا خدا تعالیٰ سے بھی ایک عہد باندھتا ہے اور خدا تعالیٰ اس عہد کا ضامن ہو جاتا ہے۔ لیکن جو عہد کسی ناپاک امر یا ظلم کے متعلق ہو اس کا پورا کرنا ضروری نہیں بلکہ گناہ ہے اللہ تعالیٰ اس عہد کا ضامن نہیں کیونکہ وہ گناہ اور ناپاکی کے لئے ضامن نہیں ہوتا۔ غرض اللہ تعالیٰ کے ضامن ہونے سے اس طرف اشارہ نہیں کیا کہ جن عہدوں پر قسم کھاؤ صرف انہیں پورا کرو۔ بلکہ اس مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے کہ سب وہ عہد جو عدل، احسان اور ایتاء ذی القربیٰ کے مطابق ہوں انہیں پورا کرو اور وہ عہد جن میں فحشاء، منکر اور بغی کا رنگ پایا جاتا ہو انہیں پورا نہ کرو۔ ان کے بارہ میں تم سے کوئی سوال نہ ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کا ضامن نہیں۔ بلکہ اُن سے منع کرتا ہے۔ مذکورہ بالا حکم میں ان لوگوں کے لئے ہدایت ہے جو اگر کسی ناجائز امر پر قسم کھا لیتے ہیں تو عہد کی پابندی کے نام سے اس پر مصر رہتے ہیں۔

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ

اورتم اس ڈر سے کہ کوئی قوم ایسی (نہ) ہوجائے جو (کسی) دوسری قوم سے زیادہ طاقتور ہو اپنی قسموں کو آپس میں

تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ

دھوکا کرنے کا ذریعہ بناتے ہوئے اس عورت کی طرح مت بنو جس نے اپنا (محنت سے کاتا ہوا) سوت (اس کے)

اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَ لَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ

مضبوط ہو چکنے کے بعد توڑ کر پارہ پارہ کر دیا تھا اس (ذریعہ) سے اللہ (تعالیٰ عنقریب) تمہارا امتحان لے

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾

گا اور جس بات کے متعلق تم آپس میں اختلاف کرتے رہے ہو گے اس (کی حقیقت) کو وہ قیامت کے دن ضرور

تمہارے سامنے کھول (کر رکھ) دے گا۔

حلّ لُغَات۔ نَقَضَتْ نَقَضَتْ نَقَضَ سے مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور نَقَضَ الْبِنَاءَ کے معنے ہیں۔ هَدَمَهٗ۔ عمارت کو گرا دیا۔ نَقَضَ الْعَظْمَ: كَسَرَهٗ۔ ہڈی کو توڑ دیا۔ نَقَضَ الْحَبْلَ: حَلَّهٗ۔ رسہ کے بل کو کھول دیا۔ (اقرب)

غَزْلَهَا غَزَلَتِ الْمَرْأَةُ الْقُطْنَ وَالصُّوْفَ: مَدَّتْهُ وَفَتَلَتْهُ خِيْطَانًا۔ عورت نے سُوت کاتا۔ اَلْغَزْلُ مصدر ہے۔ اور غزل سُوت کو بھی کہتے ہیں۔ (اقرب)

انکاث اَنْكَاثٌ نِكْثٌ کی جمع ہے۔ اَلنِّكْثُ کے معنے ہیں مَا نُقِضَ مِنَ الْاَكْسِيَةِ وَالْاَخْبِيَةِ لِيُغْزَلَ ثَانِيَةً کچے تاگے۔ اس کی جمع اَنْكَاثٌ آتی ہے۔ (اقرب)

دَخَلًا الدَّخَلُ کے معنے ہیں مَا دَاخَلَكَ مِنْ فَسَادٍ فِي الْعَقْلِ اَوْ فِي الْجِسْمِ۔ جسم اور عقل میں خرابی۔ اَلْخَدِيْعَةُ وَالْمَكْرُ۔ دھوکا اور فریب اور آیت لَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ میں انہی معنوں میں آیا ہے اور وہاں پر مفعول لہٗ ہے۔ (اقرب)

اَرْبٰى اَرْبٰى رَبٰى سے اسم تفضیل ہے اور رَبَا (يَرْبُوْ) الْمَالُ کے معنے ہیں زَادَ وَنَمَا۔ مال زیادہ ہو گیا اور بڑھ

گیا۔ اَرْبٰی عَلَیْہِ کَذَا۔ یعنی کسی سے آگے بڑھ گیا (اقرب) پس اَنْ تَکُوْنَ اُمَّۃٌ ھِیَ اَرْبٰی مِنْ اُمَّۃٍ کے معنے ہوں گے کہ ایک قوم دوسری سے زیادہ طاقتور ہے۔

یَبْلُوْکُمْ یَبْلُوْ بَلَی سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور بَلَاہُ یَبْلُوْہُ بَلَاءً کے معنے ہیں۔ جَرَّبَہٗ وَاخْتَبَرَہٗ۔ اس کا امتحان لیا (اقرب) پس یَبْلُوْکُمْ کے معنے ہوں گے کہ وہ تمہارا امتحان کرتا ہے۔

تفسیر۔ اس آیت کا مطلب پہلی آیت سے متعلق ہونے کی صورت میں اس آیت کو ایک نیا مضمون بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور پچھلی آیت کے مضمون کا تسلسل بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر پہلی آیت کے مضمون کو ہی جاری سمجھا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ آپس کے معاہدات کو پوری طرح سے نبھاؤ۔ اگر تم ان عہدوں کو توڑو گے تو خدا تعالیٰ نے جو تمہاری مضبوط جماعت بنا دی ہے وہ تباہ ہو جائے گی اور آپس کا اعتبار جاتا رہے گا۔

معاہدات کی پابندی قومی اتحاد کے قیام کے لئے اشد ضروری ہوتی ہے۔ کیونکہ جماعت کا قیام ایک دوسرے سے حسن سلوک پر مبنی ہوتا ہے۔ اور حسن سلوک اس وقت تک رہتا ہے جب تک لوگ معاہدات کی پابندی کریں۔ جب لوگ معاہدات پورے نہ کریں۔ تو پہلے بددلی اور اس کے بعد بدظنی پیدا ہو جاتی ہے اور ایک شخص کے برے عمل کے نتیجہ میں دوسرے سینکڑوں آدمی قومی نظام کے فوائد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ پس چاہیے کہ انسان جس طرح بھی ہو سکے اپنے وعدوں کو پورا کرے تا کہ اعتبار قائم ہو اور لوگ برضا و رغبت ایک دوسرے کی امداد کے لئے تیار ہوں اور قوم ترقی کر سکے۔

قومی عہد کی تشریح انفرادی عہد کے علاوہ ایک قومی عہد بھی ہوتا ہے یعنی افراد ایک شخص کے ہاتھ پر قومی ترقی کے لئے عہد کرتے ہیں جس کا نام خلافت ہے۔ وہ عہد بھی اس کے اندر شامل ہے اور اس آیت میں اس کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔ فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمہاری ایک جماعت بنا دی ہے اور ایک نظام قائم کر دیا ہے۔ اور تم نے اس نظام کی پابندی کی قسمیں کھائی ہیں۔ اب اس کی پابندی کرتے رہنا۔ ورنہ نتیجہ یہ ہو گا کہ تمہاری قربانیوں سے جو رعب اسلام کا قائم ہوا ہے وہ جاتا رہے گا۔ اور پھر نئے سرے سے محنت کرنی پڑے گی۔ یہ ایک بہت بڑا سیاسی نکتہ بتایا ہے چند آدمیوں کے تفرقہ سے سب نظام برباد ہو جاتا ہے اور قوم کی محنت اکارت جاتی ہے اور نئے سرے سے محنت اور قربانی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مگر اُدھڑی ہوئی چیز پھر اس طرح نہیں جڑتی جیسے کہ نئی اور پھٹے ہوئے دل پھر اس طرح نہیں ملتے جس طرح کہ وہ جو ہمیشہ متصل رہے۔ اس لئے اس عہد کے قیام کے لئے نہایت سخت کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔

دوسری اقوام سے بھی معاہدات کی پابندی لازمی ہے اس آیت کے الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں غیر قوموں کے ساتھ معاہدات کا بھی ذکر ہے۔اس مضمون کے لحاظ سے اس آیت کو ایک مستقل مضمون قرار دینا ہوگا۔یعنی لَا تَكُوْنُوْا سے نیا مضمون شروع سمجھا جائے گا۔اور مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے عہد اور اپنے اندرونی عہد کی پابندی لازمی ہے۔اسی طرح دوسری اقوام کے ساتھ جو عہد کئے گئے ہوں ان کی پابندی بھی ضروری ہے۔ان معاہدات کی نگہداشت رکھو ورنہ دنیا کا امن برباد ہوجائے گا۔چنانچہ دَخَلًا کا لفظ بھی اسی بات کو ظاہر کرتا ہے اور کَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ سے بھی یہی مراد ہے کہ امن کے قائم ہونے کے بعد فساد کی صورت پیدا نہ کرو۔

اس صورت میں اس آیت کے تین معنے ہوسکتے ہیں۔

دوسری قوم سے معاہدہ کرتے وقت صفائی نیت ضروری ہے (۱) یہ جائز نہیں کہ تم کسی دوسری قوم سے اس لئے صلح کرلو کہ ابھی وہ طاقتور ہے تم اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔معاہدہ کے بعد جب وہ تمہاری طرف سے غافل ہوجائے گی تو تم اندر ہی اندر تیاری کرکے ایک دن اس پر حملہ کرکے اسے تباہ کردوگے۔سیاسی دنیا اس قسم کی حرکات ہمیشہ سے کرتی آئی ہے۔اسلام کی بنیاد چونکہ عدل، احسان اور ایتاء ذی القربیٰ پر ہے وہ اس فعل کو خواہ وہ دشمن اسلام کے مقابل پر کیا جائے ناپسند کرتا اور اس سے منع فرماتا ہے۔

ایسے معاہدے ناجائز ہیں جو کسی قوم کو کمزور کرکے اس کے ملک پر قبضہ کرنے کی نیت سے ہوں

(۲) دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ ایسے معاہدات نہیں کرنے چاہئیں کہ جن کی غرض یہ ہو کہ کسی کمزور قوم کے ساتھ بظاہر تو معاہدہ کیا جائے اور دراصل غرض اس کے ملک پر قبضہ کرنے کی ہو۔جیسا کہ یورپین قومیں آج کل کررہی ہیں۔

(۳) تیسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ ایسے معاہدات ہرگز جائز نہیں جن کی غرض معاہد قوم کو کمزور کرنا ہو۔چاہیے کہ جس سے صلح کرو اس سے پوری صلح کرو۔

اس آیت میں کس قدر زبردست اخلاقی تعلیم دی ہے اور بتایا ہے کہ قومی برتری بے شک اچھی چیز ہے لیکن دھوکے اور فریب سے اس کا حصول ہرگز جائز نہیں۔معاہدات کی غرض قیام امن ہونا چاہیے نہ کہ دوسرے کا نقصان یا فریب دہی۔

آج کل یورپ کی تباہ شدہ حالت معاہدہ کی اسلامی تعلیم کو چھوڑنے کی وجہ سے اس کے مقابل

میں دیکھو یورپ آج کیا کر رہا ہے۔ معاہدات کر کے کمزور قوموں کو تباہ کیا جاتا ہے۔ جیسے چین میں ہوا۔ مصر میں ہوا۔ ترکی میں ہوا اور ایران میں ہوا۔ اور ایک زمانہ میں ہندوستان میں بھی ہو چکا ہے۔ اور آج کل پھر پولینڈ۔ فرانس۔ فن لینڈ۔ ناروے۔ رومانیہ۔ چیکوسلواکیہ وغیرہ ممالک سے ایسے ہی واقعات پیش آ رہے ہیں۔

معاہدہ کے متعلق مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام غرض اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ:۔

(۱) کوئی معاہدہ اس نیت سے نہ کیا جائے جس کا مقصد کسی دوسری طاقت کو دھوکا دے کر کمزور کرنا ہو۔

(۲) کسی کمزور قوم سے کوئی ایسا معاہدہ نہ کیا جائے جس کا مقصد یہ ہو کہ اس قوم کو اس معاہدہ کے پیچ میں لا کر اپنے ماتحت کر لیا جائے۔

(۳) کوئی معاہدہ اس نیت سے نہ کیا جائے جس کا مقصد کسی دوسری طاقت کو ترقی سے روکنا ہو۔ قیام امن کے لئے کیا ہی لطیف تعلیم دی ہے۔ اگر اس کی پابندی کی جائے تو تمام فسادات یکدم مٹ سکتے ہیں۔ اتحادیوں اور ائتلافیوں کی سابق عالمگیر اور موجودہ لڑائی ایسے ہی معاہدات کے نتیجہ میں پیدا ہوئی اور ہو رہی ہے۔ معاہدہ وارسائی نہ ہوتا تو یہ نئی جنگ بھی نہ ہوتی قرآن کریم فرماتا ہے کہ ایسے معاہدات جائز ہی نہیں۔ معاہدہ نیک نیتی پر مبنی ہونا چاہیے اور اس کا واحد مقصد قیام امن ہونا چاہیے۔

اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اے مسلمانو! یہ مواقع بطور امتحان آتے ہیں اللہ تعالیٰ دیکھے گا کہ تم طاقت پا کر اسلام کی اخلاقی تعلیم پر کس طرح کاربند رہتے ہو اور دنیا کی ترقیات تمہیں کہیں دوسری اقوام کے نقش قدم پر تو نہیں چلا دیتیں۔

کس مپرسی کی حالت میں اسلام کی یہ اعلیٰ تعلیم اس کی صداقت کی دلیل ہے یہ مضمون قرآن مجید کی سچائی کا کتنا بڑا ثبوت ہے اور اسلام کی برتری کی کیسی عظیم الشان دلیل ہے۔ ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ ہی میں تشریف رکھتے ہیں اور مسلمان ایک چپہ بھر زمین کے بھی مالک نہیں۔ مگر اس شان اور عظمت کے ساتھ ایک زبردست حکومت کے احکام بیان ہو رہے ہیں۔ اور پھر ایسے رنگ میں کہ ہر عقلمند اور شریف انسان انہیں سن کر اس تعلیم کی برتری کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیا یہ سچ نہیں کہ آج بھی جبکہ تیرہ سو سال گذر چکے ہیں اس کلام کی سچائی ظاہر ہو رہی ہے۔ آج کل کے فسادات اور قوموں کی بے چینیاں صرف ان احکام کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے ہی پیدا ہو رہی ہیں۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ

اور اگر اللہ (تعالیٰ) اپنی (ہی) مشیت نافذ کرتا تو وہ تم (سب) کو ایک ہی جماعت بنا تا۔ لیکن (وہ ایسا نہیں

مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ

کرتا۔ بلکہ) جو شخص (گمراہی کو) چاہتا ہے اسے وہ گمراہ کرتا ہے اور جو (ہدایت کو) چاہتا ہے اسے وہ ہدایت دیتا

تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾

ہے اور جو کچھ تم کیا کرتے ہو اس کی بابت (قیامت کے دن) تم سے پوچھا جائے گا۔

تفسیر۔ اللہ تعالیٰ کی تعلیم کو جبراً جاری نہ کرنے کی وجہ یہاں سوال ہو سکتا تھا کہ تعلیم تو یہ بہت اعلیٰ ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اس تعلیم کو جبراً کیوں نہ جاری کر دیا کہ فسادات سے دنیا محفوظ ہو جاتی۔ اس بارہ میں فرماتا ہے کہ بے شک اگر اللہ تعالیٰ اپنی مشیت جاری کرتا تو ایسا ہی کرتا۔ لیکن چونکہ انسان کو مقدرت دے کر اس کا امتحان لینا مقصود ہے اس لئے جو گمراہ ہونا چاہتا ہے خدا تعالیٰ اسے گمراہ ہونے دیتا ہے۔ اور جو مومن بننا چاہتا ہے اس کی راہنمائی ایمان کی طرف کرتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے اعمال کا جواب دہ بنایا ہے۔ اور یہ امر جائز نہیں جب تک اسے قدرت دے کر آزاد نہ چھوڑ دیا گیا ہو۔ تا وہ اپنی مرضی سے ہدایت کا یا گمراہی کا جو راستہ بھی پسند کرے اختیار کر لے۔

اس آیت میں مسلمانوں کو نصیحت اس آیت میں مسلمانوں کو بھی نصیحت کی گئی ہے کہ ممکن ہے تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ ہم ایسے معاہدات اسلام کے فائدہ کے لئے کریں گے پھر وہ کیوں ناجائز ہونے لگے اور فرماتا ہے کہ ایسے معاہدات بہر حال ناجائز ہیں خواہ اسلام کی تائید کے لئے ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ اگر ساری دنیا کا ایک طریق پر آ جانا تمام امور انصاف پر مقدم ہوتا تو اللہ تعالیٰ خود ہی ایسا کر سکتا تھا۔ وہ تم کو گناہ میں ملوث کیوں کرتا۔ پس سب دنیا کا اسلام پر جمع کرنا بھی ایسا مقصد نہیں جس کے لئے یہ طریق اختیار کرنا جائز ہو۔ غرض اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو قوم بھی جبر سے اور تعدّی سے دنیا کو ایک کرنا چاہے گی وہ کبھی کامیاب نہ ہوگی۔ اور اس کے ان اعمال کے متعلق اسے پوچھا جائے گا یعنی اس کی اس کو سزا ملے گی۔

مسلمانوں کی تباہی کی بڑی وجہ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ بغیر رضامندی کے زیادہ دیر تک غیر اقوام کسی

قوم کے ماتحت نہیں رہ سکتیں اور جو قومیں دوسری قوموں کو غلام بنا کر رکھنا چاہتی ہیں آخر اس غلامی کا نتیجہ خود ان اقوام کے ہی خلاف نکلتا ہے اور ان اقوام کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی تباہی کی بڑی وجہ یہی تھی۔ ان کی آئندہ نسلیں گھر کے غلاموں ہی سے اخلاق سیکھتی تھیں اور اسی وجہ سے ہوتے ہوتے آخر کار ان کے اخلاق غلاموں کے سے ہو گئے۔ اگر وہ قرآنی احکام پر عمل کر کے جلد سے جلد غلامی کو مٹا دیتے تو کبھی یہ دن دیکھنا انہیں نصیب نہ ہوتا۔ ان کی تباہی گویا وَلَتُسْـَٔلُنَّ کا ایک دردناک نظارہ تھی۔

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ

اور تم اپنی قسموں کو آپس میں فریب کرنے کا ذریعہ مت بناؤ۔ ورنہ (تمہارا) قدم بعد اس کے کہ وہ (خوب مضبوطی

ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ

سے) جم چکا ہو (پھر) پھسل جائے گا اور تم اس بدی کا مزہ چکھو گے کیونکہ تم نے (اس طرح سے اور لوگوں

اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۹۵﴾

کو بھی) اللہ (تعالیٰ) کی راہ سے روکا اور تم پر بڑا عذاب (نازل) ہوگا۔

تفسیر۔ معاہدات کی پابندی پر زور اس آیت میں لَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ کے الفاظ کو دہرایا ہے۔ اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ گو معاہدات کی بنیاد بدنیتی پر رکھنا اور معاہدہ توڑنے کی نیت سے کرنا اصولاً بھی برا ہے لیکن مسلمانوں کے لئے خصوصاً برا ہے کیونکہ مسلمان دین حق کے حامل ہیں۔ ان کے خراب رویہ کو دیکھ کر خواہ وہ سیاسی معاملات میں ہی کیوں نہ ہو لوگ دین سے بھی متنفر ہو جائیں گے۔ اور خود مسلمانوں کے حق میں بھی یہ اچھا نہ ہوگا۔ کیونکہ اس قسم کی باتوں سے وہ کمزور ہو جائیں گے اور ان میں اضمحلال پیدا ہو جائے گا۔

تَذُوْقُوا السُّوْٓءَ سے معاہدات کے توڑنے کے نتیجہ کی طرف اشارہ تَذُوْقُوا السُّوْٓءَ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر تم معاہدات توڑو گے تو تم بھی دنیا کے فائدہ کی خاطر دین کو بھی نقصان پہنچاؤ گے۔

یہ جو فرمایا کہ ایک قدم قائم ہونے کے بعد پھسل جائے گا۔ اس میں قدم سے مراد مسلمانوں کی حکومت کا استحکام ہے اور قدم کی تنکیر عظمت کے اظہار کے لئے ہے اور اس میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام کی بشارت ہے۔

ان آیات میں جو معاہدات پر اس قدر زور دیا گیا ہے۔اس میں اس امر کی خبر دی گئی ہے کہ مسلمان ساری دنیا پر چھا جائیں گے۔کیونکہ جس قوم کے معاہدات توڑنے سے دنیا میں فساد برپا ہو جاتا ہے وہ وہی قوم ہوتی ہے جو اپنے زمانہ میں سب اقوام پر غالب ہو۔ورنہ کمزور اقوام کو معاہدہ توڑنے کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی اور نہ ان کے معاہدہ توڑنے سے دنیا پر کوئی زلزلہ آتا ہے۔پس اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس عظمت کی خبر دیتے ہوئے نصیحت فرماتا ہے کہ تم اپنے معاہدات کو اچھی طرح نباہنا اور سمجھ سوچ کر معاہدات کرنا۔

افسوس ابتدائی زمانہ کے بعد مسلمانوں نے اس راز کو نہ سمجھا اور تباہ ہو گئے۔ایک زمانہ تھا کہ جب مسلمان کا لفظ مجسم اعتبار سمجھا جاتا تھا اور کسی اور ضمانت کی ضرورت نہ ہوتی تھی مگر اب مسلمان کے لفظ سے زیادہ بے اعتبار لفظ کوئی نہیں۔اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ

اور تم اللہ (تعالیٰ) کے (ساتھ کئے ہوئے) عہد کے بدلے میں (اس کے مقابل پر) حقیر (اور تھوڑی سی) قیمت

اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ

(رکھنے والی چیز) مت لو۔اگر تم علم رکھتے ہو تو (سمجھ لو کہ) جو کچھ اللہ (تعالیٰ) کے پاس ہے وہ تمہارے لئے

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾

یقیناً (اس سے بدرجہا) بہتر ہے۔

تفسیر۔چونکہ اس جگہ ترقیات اور حکومت کی پیشگوئیاں تھیں اور حکومت کے زمانہ میں دشمن سازش کرنے اور جاسوس رکھنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔جس کے لئے وہ اپنے مقابل فریق کے آدمیوں کو بڑی بھاری رقوم بھی پیش کرتے ہیں۔اور یہ زمانہ مسلمانوں پر بھی آنے والا تھا۔اس لئے پہلے سے ہی آگاہ کر دیا کہ دیکھنا ایسی حرکت نہ کرنا۔تمہارے لئے کئی قسم کے لالچ پیدا ہوں گے اور ایک زمانہ آئے گا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے راز دریافت کرنے کے لئے مکہ والے تمہیں رشوتیں بھی پیش کریں گے مگر لَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا تم اللہ تعالیٰ کے عہد کو دنیا کی قیمت پر فروخت نہ کر دینا یعنی کمزوری نہ دکھانا۔جو عہد کیا ہے۔اس کو ضرور پورا کرنا۔یہ رشوتیں تو

ثمن قلیل ہی ہوں گی۔ مگر جو کچھ تمہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں سے ملے گا وہ تمہارے لئے اس سے کہیں بہتر ہوگا اور آج تم اس کو جان بھی نہیں سکتے۔ مکہ میں رہتے ہوئے مسلمان اس پیشگوئی کو سمجھ بھی نہ سکتے تھے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ آیت ''سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۔'' (القمر: ۴۶) اس وقت تک کہ جنگ بدر واقع نہ ہوگئی اور مکہ فتح نہ ہوگیا۔ میری سمجھ میں پوری طرح نہ آتی تھی (درمنثور سورۃ قمر)۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَلَنَجْزِيَنَّ

جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ (تعالیٰ) کے پاس ہے وہ (ہمیشہ) باقی رہنے والا ہے

الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾

اور (ہمیں اپنی ذات کی قسم ہے کہ) جو لوگ ثابت قدم رہے ہیں ہم انہیں یقیناً ان کے بہترین عمل کے مطابق (ان کے تمام اعمال صالحہ کا) بدلہ دیں گے۔

حلّ لُغَات۔ يَنْفَدُ يَنْفَدُ نَفِدَ سے مضارع کا صیغہ ہے۔ اور نَفِدَ الشَّیْءُ (يَنْفَدُ نَفَادًا) کے معنے ہیں فَنِيَ وَذَهَبَ وَانْقَطَعَ۔ کوئی چیز فنا، ضائع اور ختم ہوگئی (اقرب) پس يَنْفَدُ کے معنے ہوں گے کہ ختم ہو جائے گا۔

تفسیر۔ آیت میں دو باتوں کی طرف اشارہ اس میں یہ بتایا ہے کہ رشوتوں کے مال جن کی وجہ سے لوگ قوم سے غداری کرتے ہیں آخر ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ عزت جو اپنی قوم کی ترقی سے ملتی ہے وہ دیرپا ہوتی ہے اور بہت بڑی ہوتی ہے۔

دوسرے یہ بھی بتایا کہ آخر دشمن جو کچھ بھی دے گا محدود مال ہوگا۔ لیکن وہ انعام جو نیکی اور تقویٰ اور وفاداری کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ سے ملے گا وہ ہمیشہ رہنے والا ہوگا کہ اس کا فائدہ اس دنیا سے گذر کر اگلے جہان کی زندگی تک بھی پہنچے گا۔

بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ میں اعلیٰ انعام کا اشارہ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اس میں یہ بتایا ہے کہ ہم کنجوس گاہک کی طرح ردّی چیز کو چن کر باقی کو اس پر قیاس نہ کریں گے۔ بلکہ جو عمل تمہارے اعلیٰ سے اعلیٰ ہوں گے ان کے مطابق تمام اعمال کو قرار دے کر ان کا اجر دیں گے۔ نیز یہ بھی بتایا کہ ان کا بدلہ ان کے اعمال سے زیادہ

ہوگا۔ کیونکہ لکھا ہے کہ ایک نیکی کا اجر کم سے کم دس گنا ملتا ہے۔ لیکن یہ قید لگا دی کہ یہ انعام صرف انہی کو ملے گا جو صبر کریں گے یعنی مشکلات سے گھبرائیں گے نہیں اور دین کو بیچیں گے نہیں۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ

جو کوئی مومن ہونے کی حالت میں مناسب حال عمل کرے گا۔ مرد ہو کہ عورت

فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ

ہم اس کو یقیناً ایک پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ہم ان (تمام لوگوں) کو ان کے بہترین عمل کے مطابق

بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾

ان (کے تمام اعمال صالحہ) کا بدلہ دیں گے۔

تفسیر ۔ **اسلام میں مرد و عورت کے حقوق کی مساوات** اس آیت میں ایک طرف تو مسلمانوں کو بتایا ہے کہ اسلام میں مرد اور عورت دونوں کے حقوق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ آئندہ جدوجہد میں ہر شخص کو مرد ہو یا عورت اس کے عمل کے برابر بدلہ ملے گا اور عورت و مرد میں فرق نہ کیا جائے گا۔ دوسری طرف کفار کو یہ توجہ دلائی ہے کہ تم عورت کو مارتے ہو تم کو حکومت کس طرح دی جا سکتی ہے۔ اب تو وہ حکومت قائم کی جائے گی جس میں مرد اور عورت دونوں کے حقوق محفوظ ہوں۔

اسلام کی سچائی کا یہ کس قدر زبردست ثبوت ہے کہ ہزاروں سالوں کی انسانی زندگی کے بعد اس نے پہلی مرتبہ مرد اور عورت کے حقوق کو تسلیم کیا اور اس کے جاری کرنے کی اس وقت خبر دی جبکہ ابھی مسلمانوں کو حکومت بھی نہ ملی تھی اور اس کے باوجود ظالم دشمن اسلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام میں عورتوں کے حقوق کی نگہداشت نہیں کی گئی۔

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ

اس لئے (اے مخاطب) جب تو قرآن پڑھنے لگے تو دھتکارے ہوئے شیطان (کے شر) سے (محفوظ رہنے کے

الرَّجِيْمِ ﴿۹۹﴾

لئے) اللہ (تعالیٰ) کی پناہ مانگ (لیا کر)۔

حلّ لُغَات ۔اِسْتَعِذْ اِسْتَعِذْ اِسْتَعَاذَ سے امر مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور اِسْتَعَاذَ۔ عَاذَ سے باب استفعال ہے اور عَاذَ بِهٖ فِی کَذَا (یَعُوْذُ عَوْذًا۔ وَعِیَاذًا) کے معنے ہیں ۔لَجَأَ اِلَیْهِ وَاعْتَصَمَ۔ اس کی پناہ لی۔ تَقُوْلُ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ اَیْ اَلْتَجِئُ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْتَصِمُ مِنَ الشَّيْطَان۔ اور اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کے معنے ہیں کہ میں اللہ کی پناہ لیتا ہوں اور شیطان سے بچتا ہوں۔

اِسْتَعَاذَ بِهٖ مِنْهُ اِعْتَصَمَ وَلَجَأَ اِلَیْهِ مِنْهُ۔ اس نے اس کے ذریعہ پناہ لی۔ (اقرب)

پس اِسْتَعِذْ کے معنے ہوں گے کہ شیطان سے بچنے کے لئے اللہ کی پناہ چاہو۔

تفسیر ۔اِذَا قَرَاْتَ کے یہ معنے نہیں کہ جب تو قرآن ختم کیا کرے تو معوّذتین پڑھ لیا کر۔ کیونکہ وہ سورتیں تو قرآن میں شامل ہیں۔ بہرحال پڑھی ہی جائیں گی ان کو چھوڑ تو نہ دیا جائے گا۔ پس اس جگہ جیسا کہ سنت نبویؐ سے ثابت ہے شروع تلاوت میں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ پڑھنے کا حکم ہے۔

پہلے فرمایا تھا کہ ثابت قدم لوگوں کو یہ یہ عظیم الشان انعامات ملنے والے ہیں۔ اب اس نعمت کی حفاظت کے لئے ایک گر بتاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تم شیطان کے حملوں سے بچنے کے لئے خدا تعالیٰ کی پناہ میں آ جاؤ۔ تا تم ان انعامات کے وارث ہو سکو اور رستہ سے بھٹک نہ جاؤ۔

بعض نادانوں نے غلط آراء اور روایات پر بنیاد رکھ کر اس آیت کے یہ معنے کئے ہیں کہ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے اور اس کی شان نزول یہ ہے۔ کہ سورۃ النجم کی تلاوت کرتے ہوئے ایک دفعہ آپ کی زبان پر بعض شرکیہ کلمات شیطان نے جاری کر دئے تھے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ آئندہ جب قرآن پڑھا کرو تو پہلے اعوذ ضرور پڑھ لیا کرو تا شیطان پھر تمہاری زبان پر کوئی کلمۂ شرک جاری نہ کر دے۔ (تفسیر القرآن از وہیری زیر آیت ھذا)

حالانکہ اول تو یہ واقعہ ہی غلط ہے (اس واقعہ پر اصل گفتگو اس کے اصل مقام یعنی سورۂ حج میں ہوگی) دوم اس آیت کے سیاق و سباق سے اس مضمون کا کوئی جوڑ ہی نہیں۔ بھلا کون عقلمند اس امر کو تسلیم کر سکتا ہے کہ واقعہ ہوا ہو سورۃ النجم کی تلاوت پر۔ اس کا ذکر ہوا ہو سورۃ حج میں اور اعوذ پڑھنے کے لئے سورۃ النحل میں تاکید کی جاوے۔ اور تاکید بھی اسلامی غلبہ کے ذکر میں کی جائے تا کہ کسی کا ذہن اس کے مضمون کی طرف جا ہی نہ سکے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذَالِكَ۔

میں جیسا کہ اوپر بتا چکا ہوں یہ آیت اپنے مضمون ماسبق کے ساتھ پوری طرح مطابق ہے اور کسی دوسرے واقعہ کی طرف اسے منسوب کرنا ظلم ہے۔ پھر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرا شیطان مسلمان ہو گیا ہے وہ مجھے سوائے خیر کے کسی چیز کا حکم ہی نہیں دیتا (مسند احمد بن حنبل مسند ابن عباسؓ) اس ارشاد کی موجودگی میں کوئی عقل مند کس طرح تسلیم کر سکتا ہے کہ شیطان نے آپ کی زبان پر شرک کے کلمات جاری کروائے تھے۔ مسلمان تو توحید کا قائل ہوتا ہے۔ پس آپ کا شیطان جب موحد ہو گیا تھا تو اگر اسے کوئی طاقت تھی بھی تو بھی وہ آپ کی زبان پر مشرکانہ کلمات جاری نہیں کر سکتا تھا۔ پس اس فرضی واقعہ کو اس آیت پر چسپاں کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک بہتان ہے۔

قرآن کریم پڑھنے سے پہلے تعوذ کی حکمت یہ سوال کہ قرآن سے پہلے استعاذہ (اعوذ پڑھنے) کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ چور وہیں آتا ہے جہاں خزانہ ہو۔ اور اسی سے مقابلہ کرنے کی فکر کی جاتی ہے جس سے خطرہ ہو۔ قرآن کریم ایک ایسا روحانی خزانہ ہے جس کے مٹانے کے لئے شیطان تڑپتا ہے اور وہی ہتھیار ہے جس سے اس کا سر کچلا جاتا ہے۔ پس شیطان اور شیطانی لوگ پوری کوشش کرتے ہیں کہ اس سے لوگوں کو دور رکھیں۔ اس وجہ سے اس کی تلاوت سے پہلے استعاذہ کا حکم دیا۔ اس حکم سے یہ بھی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جب قرآن کریم سے پہلے بھی استعاذہ کا حکم ہے۔ تو باقی سارے کاموں سے پہلے تو بدرجہ اولیٰ استعاذہ کر لینا چاہیے۔

اسلامی ترقیات کے ساتھ تعوذ کا گہرا تعلق اس سوال کا جواب کہ یہ حکم اس موقعہ پر کیوں رکھا گیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں یہ سب سے پہلا موقعہ ہے کہ اسلامی حکومت کی ایسی وضاحت سے خبر دی گئی ہو۔ پہلے بھی اشارات تھے مگر اس سے پہلے اس قدر وضاحت نہ ہوئی تھی۔ اور جب دنیوی ترقیات کا ذکر ہو تو بعض کمزور طبائع دینی ضرورتوں سے غافل ہو کر دنیوی امور کی ادھیڑ بن میں پڑ جاتی ہیں پس چونکہ اس سورۃ میں دنیوی ترقیات کی خبر دی گئی تھی۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو حکم دے دیا گیا کہ آئندہ جب قرآن کریم پڑھنے لگو اس سے پہلے تعوذ

کرلیا کرو۔ تا کہ دنیوی فتوحات کی پیشگوئیاں تمہاری توجہ کو اپنی طرف پھرا کر تم کو دین کے اعلیٰ مقاصد سے غافل نہ کر دیں۔ اور دنیا دین پر مقدم نہ ہو جائے۔

اللہ اللہ! کیا پاک کلام ہے اور اس میں کس طرح مومنوں کے ایمان کی حفاظت کے سامان پیدا کئے گئے ہیں۔ اور اس کے باوجود دشمن کہتا ہے کہ لالچ دے دے کر قرآن کریم نے لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کیا تھا۔ (ستیارتھ پرکاش اردو ترجمہ باب ۱۴ صفحہ ۷۰۱)۔

إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿١٠٠﴾

(سچی) بات یقیناً یہی ہے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اپنے رب (کی پناہ) پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ان پر اس کا کوئی تسلط نہیں ہے۔

تفسیر۔ انجیلی تعلیم کے مقابل قرآن مجید کی دنیوی کاموں میں حصہ لینے کی تعلیم بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا میں پڑ کر انسان خدا تعالیٰ سے محبت کر ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ حضرت مسیح کی طرف انجیل میں یہ قول منسوب کیا گیا ہے۔

(۱) ''اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو''۔ (متی باب ۱۹ آیت ۲۴)

نیز (۲) ''دولت مندوں کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا کیسا مشکل ہے کیونکہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔'' (لوقا باب ۱۸ آیت ۲۴ و ۲۵)

اس خیال کے لوگوں کی طرف سے یہ اعتراض ہوسکتا تھا کہ دنیا کے متعلق خبریں پڑھنے سے بعض لوگوں کے ایمان میں کمزوری پیدا ہونے کا احتمال ہوسکتا تھا تو مسلمانوں کو دنیوی فتوحات اور حکومت کی خبر دی ہی کیوں گئی؟ اس کا جواب یہ دیا کہ شیطان کا قبضہ کمزوروں پر ہوتا ہے۔ مومن دنیا میں پڑ کر بھی دین کی طرف سے غافل نہیں ہوتا۔ پس اس جگہ ہم صرف کمزوروں کو ہوشیار کرتے ہیں۔ یہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ مضبوط ایمان والے بھی دنیا میں پڑ کر نجات سے محروم ہو جاتے ہیں۔ گویا اسلام کی تعلیم اس بارہ میں یہ ہے کہ دست در کار و دل با یار۔ اور یہی مقام اعلیٰ

مقام ہے۔اسی وجہ سے اسلام نے دنیا کو چھوڑنے کی تعلیم نہیں دی بلکہ دنیا کے کاموں میں حصہ لیتے ہوئے اس کی اصلاح کا حکم دیا ہے۔اگر نیکوں کو دنیا سے علیحدہ رکھا جائے تو ظاہر ہے کہ دنیا کی اصلاح کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔اگر ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں دنیا کی باگ آئے جو باوجود دنیا پر تصرف حاصل کر لینے کے انصاف اور عدل اور تقویٰ قائم رکھیں تبھی دنیا کی اصلاح ہوسکتی ہے۔اور دوسروں کے لئے نیک مثال قائم ہوسکتی ہے۔دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے ہاتھ جب دنیا کا نظم ونسق آیا۔تو انہوں نے کس طرح اس میں پڑ کر اس سے علیحدہ رہنے کا نمونہ دکھایا۔اور ایک ایسی شاندار مثال قائم کی جو اب بھی کہ اس پر تیرہ سو سال گذر چکے ہیں۔اہل عقل کے دلوں میں گدگدیاں پیدا کر دیتی ہے۔

اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ

اس کا تسلط صرف ان لوگوں پر (ہوتا) ہے۔جو اس سے دوستی رکھتے ہیں۔اور جو اس کی وجہ

مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ ع

سے شرک کرتے ہیں۔

ع ۱۳ / ۱۱ / ۱۹

تفسیر۔هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ میں ضمیر بہ کا مرجع هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ۔بِهٖ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف بھی جاسکتی ہے جس کا ذکر رَبِّهِمْ کے الفاظ میں پہلی آیت میں ہو چکا ہے۔اس صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ اس کا تصرف ان لوگوں پر ہے جو اپنے رب کے شریک قرار دیتے ہیں۔اور اس ضمیر کا مرجع شیطان بھی ہوسکتا ہے۔اس صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ وہ شیطان کے سبب سے شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اس آیت میں یہ بتلایا ہے کہ شیطان کا قبضہ اور تصرف اس کے دوستوں پر ہوتا ہے جو شخص استعاذہ کرتا ہے وہ تو گویا اس سے دشمنی کا اعلان کرتا ہے۔اس لئے وہ اس کے قبضہ سے نکل جائے گا۔

استعاذہ کے حکم میں آنحضرتؐ کا ذکر نہیں ہوسکتا اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ والی آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق نہیں۔کیونکہ اس میں تو یہ بتایا ہے کہ اس کا قبضہ اپنے دوستوں پر ہوتا ہے نہ کہ ان لوگوں پر جو خدا تعالیٰ پر توکل کرنے والے ہوں۔اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے متواتر اعلان ہو چکا ہے کہ ''میرا توکل تو صرف خدا پر ہے''۔پس اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہو ہی نہیں

سکتا۔ دوسرے لوگوں کا ہی ذکر ہے۔

وَ اِذَا بَدَّلْنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ

اور جب ہم کسی نشان کی جگہ پر کوئی اور نشان لاتے ہیں اور (اس میں کیا شک ہے کہ) اللہ (تعالیٰ) جو کچھ اتارتا ہے

قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ

اس (کی ضرورت) کو وہ (سب سے) بہتر جانتا ہے تو (مخالفین) کہتے ہیں کہ تو مفتری ہے (مگر حقیقت یوں)

لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

نہیں بلکہ ان میں سے اکثر علم نہیں رکھتے۔

حلّ لُغات۔ یُنَزِّلُ یُنَزِّلُ نَزَّلَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو سورۃ حجر آیت نمبر ۲۳۔

نُنَزِّلُ نَزَّلَ سے مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور نَزَّلَہٗ کے معنے ہیں۔ صَیَّرَہٗ نَازِلًا اس کو اترنے والا کردیا۔ یعنی ایسی حالت میں کردیا کہ اُترے۔ اَلْقَوْمَ: اَنْزَلَھُمُ الْمَنَازِلَ۔ لوگوں کو ان کی جگہوں پر اتارا۔ اَلشَّیْءَ: رَتَّبَہٗ۔ کسی چیز کو مرتب کیا۔ عِیْرَہٗ: قَدَّرَلَھَا الْمَنَازِلَ۔ قافلہ کے امام نے قافلہ کے لوگوں کے لئے جگہیں مقرر کردیں۔ (اقرب) تَنْزِیْلٌ اصل میں آہستہ آہستہ اتارنے کو کہتے ہیں۔

تفسیر۔ **آیت کے معنی اور اس سے مراد** اٰیَۃً کے اصل معنے نشان کے ہیں۔ گو قرآن کریم کے جملوں کو بوجہ اس کے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی ذات میں ایک نشانِ ہدایت ہے۔ آیت کہتے ہیں۔ مگر اٰیَۃً کے معنے کتاب کے فقرے کے نہیں ہوتے۔ اور قرآن کریم میں کسی جگہ پر اس لفظ کا استعمال یقینی طور پر ان معنوں میں نہیں ملتا۔ اگر بعض جگہ آیت کا لفظ جملہ کے معنوں میں نظر بھی آتا ہے تو وہ بھی یقینی نہیں کیونکہ اس جگہ دلیل اور نشان کے معنے بھی ہوسکتے ہیں۔ ہاں مسلمانوں میں شروع سے اس لفظ کا استعمال ان معنوں میں مروّج چلا آتا ہے۔ صحابہ بھی قرآنی جملوں کو اٰیۃ کہہ کر پکارتے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کلام میں بھی یہ استعمال پایا جاتا ہے (بخاری کتاب التفسیر باب تفسیر ان الصفا و المروۃ۔۔۔)۔ اس استعمال سے دھوکا کھا کر بعض مفسرین نے اس

آیت کے یہ معنے کئے ہیں کہ جب قرآن کریم کی ایک آیت منسوخ کر کے دوسری آیت نازل کی جاتی۔ تو کفار اعتراض کرتے کہ تم جھوٹے ہو۔ اگر قرآن خدا تعالیٰ کا کلام ہوتا تو اس کی آیتیں منسوخ کیوں ہوتیں (تفسیر قرطبی زیر آیت ھذا)۔

میرے نزدیک یہ معنے درست نہیں کیونکہ تاریخ سے کوئی ایک آیت بھی ثابت نہیں ہوتی جسے بدل کر اس کی جگہ دوسری آیت رکھی گئی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن کے سینکڑوں حافظ جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں قرآن کریم کو حفظ کر لیا تھا اس امر کی شہادت دیتے کہ پہلے ہمیں فلاں آیت کے بعد فلاں آیت یاد کروائی گئی تھی۔ لیکن اس کے بعد اسے بدل کر فلاں آیت یاد کرائی گئی۔ اس قسم کی شہادت کا نہ ملنا بتاتا ہے کہ اس بارہ میں جس قدر خیالات رائج ہیں ان کی بنیاد محض ظنیات پر ہے نہ کہ علم پر۔

میں اس کا منکر نہیں کہ بعض احکام زمانہ نبویؐ میں بدلے گئے ہیں۔ مگر مجھے قرآن کریم کے کسی حکم کی نسبت ثبوت نہیں ملتا کہ پہلے اور طرح ہو اور بعد میں بدل دیا گیا ہو۔ میرے نزدیک جو احکام وقتی ہوتے تھے وہ غیر قرآنی وحی سے نازل ہوتے تھے۔ قرآن کریم میں اترتے ہی نہ تھے۔ اس لئے قرآن کریم کو بدلنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی تھی۔

ناسخ منسوخ کے متعلق بحث اس پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اگر آیاتِ قرآنیہ کو کبھی بدلا نہیں گیا تو اس آیت کے کیا معنے ہوئے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اٰیَۃً کے وہ معنے جن میں یہ لفظ بالعموم قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے۔ نشان آسمانی کے ہیں۔ اور وہی اس جگہ مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب ہم ایک نشان بدل کر اس کی جگہ دوسرا نشان لے آتے ہیں اور ایسا کرنا قابل اعتراض نہیں ہوتا کیونکہ اس امر کو تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کونسا نشان کس موقعہ کے لئے مناسب ہے تو کفار اعتراض کرنے لگ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تُو تو جھوٹا ہے۔ مگر یہ اعتراض ان کا جہالت پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ وہ قانون ہے جس کا ظہور ہر نبی کے زمانہ میں ہوتا ہے۔ یعنی ہر نبی کو بعض انذاری باتیں بتائی جاتی ہیں جو درحقیقت مشروط ہوتی ہیں۔ مخاطب قوم کے قلوب کی حالت سے۔ اگر وہ اپنے دل کی حالت بدل لیں تو وہ انذار کی خبر بھی ٹل جاتی ہے۔ جیسے قرآن کریم میں حضرت یونسؑ کی قوم کا واقعہ بیان فرمایا ہے کہ ان کی ہلاکت کی خبر حضرت یونسؑ کی معرفت دی گئی۔ مگر بعد میں ان کی توبہ کی وجہ سے اسے بدل دیا گیا۔ (یونس آیت ۹۹)

انذاری پیشگوئیاں مشروط ہوتی ہیں یہ عام قانون انذاری پیشگوئیوں کے متعلق ہے کہ اگر مخالف توبہ کر لیں تو مقدر عذاب کو روک دیا جاتا ہے۔ ہاں وعدہ کی خبر ضرور پوری ہو کر رہتی ہے۔ مگر اس کے متعلق بھی سنت اللہ یہ ہے کہ اگر وہ قوم جس سے وعدہ ہو پوری قربانی سے کام نہ لے یا پوری فرمانبرداری نہ دکھائے تو اس کے پورا ہونے میں

تاخیر کردی جاتی ہے۔جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب انہوں نے متواتر حضرت موسیٰؑ کی نافرمانی کی تو وہ ارضِ موعودہ جس میں داخل کرنے کے لئے حضرت موسیٰؑ انہیں مصر سے نکال کر لائے تھے چالیس سال تک کے لئے اس کی فتح روک دی گئی اس کے موعود ہونے کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ (المائدة:۲۲) اے قوم اس پاک زمین میں داخل ہو جاؤ جو خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے لکھ رکھی ہوئی ہے۔

اس کے بعد یہود کی نافرمانی کا ذکر کر کے فرماتا ہے قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ۚ یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ (المائدة:۲۷) یعنی جب انہوں نے نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ اب یہ ملک چالیس سال تک کے لئے بنی اسرائیل پر حرام کر دیا گیا ہے۔پس تو نافرمان قوم کی حالت پر افسوس نہ کر۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وعدہ کو ٹلا دیا گیا ہے۔لیکن اسے منسوخ نہیں کیا گیا۔کیونکہ وعدہ خدا تعالیٰ منسوخ نہیں کیا کرتا۔

مذکورہ بالا قانون کے مطابق انذار کی پیشگوئی جب کبھی ٹلتی ہے تو کفار شور مچا دیتے ہیں کہ دیکھو یہ جھوٹا ہے۔اگر سچا ہوتا تو کیوں اس کی بات پوری نہ ہوتی۔ایسے ہی اعتراضات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کیا کرتے تھے۔اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آیات تو کسی غرض اور مقصد کے لئے نازل ہوتی ہیں۔جب ہم دیکھیں کہ ایک شخص نے اپنی اصلاح کر لی ہے تو ہم اس کے متعلق اپنے حکم کو بھی بدل دیتے ہیں اور اس کی سزا منسوخ کر دیتے ہیں اس کی جگہ اس کے لئے اپنی رحمت کا نشان دکھاتے ہیں۔کیونکہ ہماری غرض سزا دینا نہیں بلکہ اصلاح کرنا ہوتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایسے کئی مواقع پیش آئے ہیں۔مثلاً یہی کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کفار مکہ کی نسبت فرماتا ہے لَا یُؤْمِنُوْنَ (البقرة:۷) لیکن بعد میں ان میں سے بہت سے لوگ ایمان لے آئے۔یہ عذاب کی خبر تھی اس وجہ سے جن جن لوگوں نے خشیت اللہ پیدا کر لی ان کا عذاب بدل دیا گیا اور ان کو ایمان عطا ہو گیا۔

جھوٹ کی تعریف بظاہر یہ مسئلہ بالکل صاف ہے لیکن ہمیشہ ہی لوگ اس بارے میں ٹھوکر کھاتے ہیں۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ بات بدلنے کو جھوٹ سمجھتے ہیں۔حالانکہ سزا کو بدلنا جھوٹ نہیں ہوتا۔وعدہ کو بدلنا جھوٹ

ہوتا ہے۔ چنانچہ عربی زبان میں وعدہ کے بدلنے کو جھوٹ کہتے ہیں۔ وعید یعنی عذاب کی خبر کو بدلنے کو جھوٹ نہیں کہتے بلکہ اسے رحم اور احسان کہتے ہیں۔ اقرب میں لکھا ہے اَلْخُلْفُ فِی الْوَعْدِ عِنْدَ الْعَرَبِ کِذْبٌ وَفِی الْوَعِیْدِ کَرَمٌ (اقرب)۔ یعنی وعدہ کا بدلنا عربوں کے نزدیک جھوٹ کہلاتا ہے اور وعید یعنی سزا کی خبر کا بدلنا شرافت اور احسان کہلاتا ہے۔

غرض ایک معنے تو اس آیت کے یہ ہیں کہ ہم وعید کی خبروں کو بعض دفعہ بدل دیا کرتے ہیں۔ کفار اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن ان کا اعتراض صحیح نہیں۔ ایسا کرنا حکمت کے عین مطابق ہے اس میں کسی کا حق نہیں مارا جاتا کہ قابل اعتراض ہو۔ ان معنوں کے رو سے اس آیت کا تعلق ان انذاری آیات سے ہوگا جو پہلے بیان ہو چکی ہیں۔

اس آیت کے ایک اور معنی ایک اور معنے بھی اس آیت کے ہیں اور وہ ترتیب قرآن کو مدنظر رکھتے ہوئے اس مقام پر زیادہ چسپاں ہوتے ہیں اور وہ یہ کہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اس سورۃ میں کلام الٰہی کی ضرورت کے دلائل بیان کئے جا رہے ہیں اور اس کے ثبوت میں پہلے انبیاء کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً اسی سورۃ کے آٹھویں رکوع میں فرماتا ہے کہ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ (النحل: ۶۴) ہمیں اپنی ذات ہی کی قسم کہ جو تجھ سے پہلے قومیں گذر چکی ہیں ان میں بھی ہم رسول بھیج چکے ہیں۔ پھر رکوع ۱۲ میں فرماتا ہے وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (النحل: ۹۰) یعنی اس دن کو یاد کرو جبکہ ہم ہر قوم کے خلاف اسی قوم کا نبی گواہ بنا کر کھڑا کریں گے۔

نسخ آیات کے ایک لطیف معنی اس میں اس طرف اشارہ تھا کہ سب قوموں میں نبی مبعوث ہو چکے ہیں۔ تو چونکہ گذشتہ انبیاء کے وجود کو کلام الٰہی کی ضرورت کے ثبوت میں پیش کیا گیا تھا جب کفار ہر طرف سے عاجز آ گئے تو انہوں نے یہ دلیل اسلام کے خلاف پیش کی کہ اگر پہلے بھی نبی گذر چکے ہیں تو چاہیے تھا کہ ان کی تعلیم اور اسلام کی تعلیم ایک ہی ہوتی مگر اس میں تو ان کی تعلیموں کے خلاف تعلیم بھی پائی جاتی ہے پس معلوم ہوا کہ محمد (رسول اللہ) جو اپنے تسلیم کردہ نبیوں کے خلاف باتیں کہتے ہیں جھوٹے ہیں ورنہ یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ خدا تعالیٰ ان نبیوں کو کچھ کہے اور اس کو کچھ اَور کہے۔

سو اس اعتراض کو بیان کر کے اس کا جواب دیا کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ اسے کس زمانہ میں کیا نازل کرنا چاہیے۔ یعنی پہلے انبیاء کی تعلیم سے جہاں جہاں قرآن کریم نے اختلاف کیا ہے۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ اس سچی تعلیم کی قرآن

نے مخالفت کی ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن کی طرف کلام نازل ہوا ہے وہ پہلے لوگوں سے مختلف ہیں اور ایک ہی شخص مختلف لوگوں کو ان کے حالات کے مطابق مختلف حکم دیتا ہے اور دے سکتا ہے اور یہ اختلاف اس امر کی دلیل کبھی اور کسی صورت میں نہیں قرار دیا جاتا کہ چونکہ مختلف حکم ہیں حکم دینے والے بھی مختلف ہیں۔ اختلاف ہمیشہ حکم دینے والوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہی نہیں پیدا ہوتا بلکہ بعض دفعہ اختلاف ان لوگوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جنہیں حکم دیا گیا ہو۔ جب مخاطب مختلف قابلیتوں کے ہوں تو ایک ہی حکم دینے والا مختلف لوگوں کو ان کے حسب حال مختلف حکم دیتا ہے۔ اصل سوال تو یہ ہونا چاہیے کہ قرآن کی تعلیم زمانہ کے حسب حال ہے یا نہیں۔ اگر وہ زمانہ کے حسب حال ہے تو اس اختلاف سے علم الٰہی کا ثبوت ملا نہ اس کا کہ محمد رسول اللہ پر کلام نازل کرنے والا کوئی اَور ہے اور پہلے نبیوں پر کلام نازل کرنے والا کوئی اَور۔

یہ معنے اگلی آیات سے بھی بالکل مطابق آتے ہیں اس لئے یہی اس موقعہ کے لحاظ سے زیادہ صحیح ہیں۔ ہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس صورت میں اٰیَۃً کے معنے پہلی کتاب کے لئے جائیں گے یعنی جب ایک کتاب کی جگہ دوسری کتاب کو بدلا جاتا ہے اور کتاب بھی آیت ہوتی ہے۔ بلکہ سب سے بڑا معجزہ انبیاء کا کتاب ہی ہوتا ہے۔

قرآن کریم کے دیگر کتب کے مصدق ہونے سے مراد تعجب ہے کہ یہ اعتراض آج تک قرآن کریم پر ہو رہا ہے۔ چنانچہ مسیحی مصنف آج تک یہی اعتراض کرتے چلے جارہے ہیں کہ جب قرآن کریم کتب سابقہ کا مصدق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو ان سے اختلاف کیوں کرتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن نعوذ باللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بنایا ہوا ہے اور انہوں نے پہلی کتب سے ناواقفیت کی وجہ سے ایسی باتیں لکھ دی ہیں جو پہلی کتب کے خلاف ہیں۔ (تفسیر القرآن از وہیری سورہ بقرہ آیت ۹۰)۔

بعض مفسرین نے اس آیت کے معنے کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ اس میں سورۃ النجم کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی تلاوت کے وقت شیطان نے بعض آیتیں بلند آواز سے آپ کی تلاوت کے درمیان میں پڑھ دی تھیں اول تو یہ واقعہ ہی سرے سے باطل ہے جیسا کہ انشاء اللہ اس کے موقعہ پر بتایا جائے گا۔ لیکن اگر بفرض محال اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی اس آیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ اس آیت میں تو یہ ذکر ہے کہ جو آیت بدلی گئی وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی اور جس نے بدلا وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی۔ اور جس واقعہ کو وہ اس آیت پر چسپاں کرتے ہیں اس میں خود وہ تسلیم کرتے ہیں کہ جو آیات بدل گئیں وہ شیطان کی تھیں پس ان کی اپنی تشریح ہی ثابت کرتی ہے کہ اس فرضی واقعہ کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔

علاوہ ازیں اگلی آیت بھی ان معنوں کو ردّ کر رہی ہے کیونکہ اس آیت میں اس اعتراض کا دوسرا جواب دیا گیا ہے جو یہ ہے کہ اس قرآن کو روح القدس نے اتارا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ روح القدس کا اتارنا کفار کے اس اعتراض کا جواب نہیں ہوسکتا کہ پہلے اس نے نعوذ باللہ مشرکانہ تعلیم دی تھی اب اسے بدل کیوں دیا گیا ہے۔ کیونکہ روح القدس کا اتارنا اس کے محفوظ ہونے کی دلیل تو بن سکتا ہے شیطان کی ملونی اور اس کے بعد اس کی منسوخی کی دلیل نہیں بن سکتا۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ

تو (ایسے معترض سے) کہہ (کہ) روح القدس نے اسے تیرے رب کی طرف سے حق (وحکمت) کے ساتھ

لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّ

اتارا ہے تاکہ جو لوگ ایمان لائے ہیں انہیں وہ (ایمان پر) ہمیشہ کے لئے قائم کردے اور (نیز اس نے) کامل

بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

فرمانبرداروں کی (مزید) رہنمائی کے لئے اور (انہیں) بشارت دینے کے لئے اسے اتارا ہے۔

حلّ لُغات۔ اَلْحَقِّ اَلْحَقُّ کے لئے دیکھو ابراہیم آیت نمبر ۲۳۔ رعد آیت نمبر ۱۵۔ رَبّ کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۴۔

اَلْحَقُّ حَقَّ کا مصدر ہے۔ اور حَقَّهٗ حَقًّا کے معنے ہیں غَلَبَهٗ عَلَى الْحَقِّ۔ حق کی وجہ سے اس پر غالب آیا۔ وَالْاَمْرَ اَثْبَتَهٗ وَاَوْجَبَهٗ۔ کسی امر کو ثابت کیا اور واجب کیا۔ كَانَ عَلٰى يَقِيْنٍ مِنْهُ۔ کسی معاملہ پر یقین سے قائم تھا۔ اَلْخَبَرَ۔ وَقَفَ عَلٰى حَقِيْقَتِهٖ اور حَقَّ الْخَبَرَ کے معنے ہوں گے اس کی حقیقت سے آگاہ ہوا اور اَلْحَقُّ کے معنے ہیں ضِدُّ الْبَاطِلِ سچ۔ اَلْاَمْرُ الْمُقْضِيُّ فیصلہ شدہ بات۔ اَلْعَدْلُ۔ عدل۔ اَلْمِلْكُ۔ ملکیت۔ اَلْمَوْجُوْدُ الثَّابِتُ۔ موجودہ قائم۔ اَلْيَقِيْنُ بَعْدَ الشَّكِّ۔ یقین۔ اَلْمَوْتُ۔ موت اَلْحَزْمُ دانائی۔ (اقرب)

اَلرَّبُّ مالک، آقا یا مطاع مستحق یا صاحب الشئ یعنی کسی چیز والا۔ رَبَّ الشَّيْءَ۔ جَمَعَهٗ اس چیز کو جمع کیا مَلَكَهٗ اس کا مالک ہوا۔ اَلْقَوْمَ سَاسَهُمْ وَكَانَ فَوْقَهُمْ قوم پر حکومت اور سیاست کی۔ اَلنِّعْمَةَ: زَادَهَا نعمت کو

بڑھایا۔ اَلْاَمْرَ: اَصْلَحَہٗ وَاَتَمَّہٗ کام کو درست اور مکمل کیا۔ اَلدُّھْنَ: طَیَّبَہٗ وَاَجَادَہٗ۔ تیل میں عمدگی اور خوبی پیدا کی۔ اَلصَّبِیَّ: رَبَّاہُ حَتّٰی اَدْرَكَ بچہ کی تربیت کی حتیٰ کہ وہ اپنے کمال کو پہنچ گیا۔(اقرب)

یُثَبِّتُ یُثَبِّتُ ثَبَّتَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ ثَبَّتَ کے معنوں کے لئے دیکھو ابراہیم آیت ۲۷۔

یُثَبِّتُ ثَبَّتَ کا مضارع ہے۔ جس کا مجرد ثَبَتَ ہے اور ثَبَتَ الْاَمْرُ عِنْدَ فُلَانٍ کے معنے ہیں تَحَقَّقَ وَ تَاَكَّدَ۔ کوئی امر کسی کے نزدیک یقینی طور پر ثابت ہوگیا۔ ثَبَتَ فُلَانٌ عَلَی الْاَمْرِ۔ دَاوَمَہٗ۔ کسی کام پر دوام اختیار کیا۔ وَاَثْبَتَہٗ وَثَبَّتَہٗ۔ جَعَلَہٗ ثَابِتًا فِیْ مَكَانِہٖ لَا یُفَارِقُہٗ۔ اور اَثْبَتَہٗ اور ثَبَّتَہٗ کے معنے ہیں اس کو اس کی جگہ پر ایسے طور پر ثبات بخشا اور مضبوط رکھا کہ وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکے۔ سو ثابت کے معنے ہوں گے اپنی جگہ پر مضبوط رہنے والا۔(اقرب)

ھُدًی ھُدًی ھدٰی کا مصدر ہے ھدٰی کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۲۸۔

یَھْدِیْ ھُدًی سے ہے اور ھَدَاہُ الطَّرِیْقَ وَاِلَیْہِ وَلَہٗ کے معنے ہیں بَیَّنَہٗ لَہٗ وَعَرَّفَہٗ بِہٖ۔ راستہ دکھایا، بتایا اور واضح کیا۔ ھَدٰی فُلَانًا۔ تَقَدَّمَہٗ اس کے آگے آگے چل کر منزل مقصود تک لے گیا۔ ھَدَاہُ اللّٰہُ اِلَی الْاِیْمَانِ: اَرْشَدَہٗ۔ ایمان کی طرف رہنمائی کی۔(اقرب)

تفسیر۔ قرآن مجید کا پہلی کتب سے اختلاف اس کے جھوٹا ہونے کی دلیل نہیں اس آیت میں کفار کے اعتراض کا ایک اور جواب دیا ہے۔ پہلی آیت میں تو یہ جواب دیا تھا کہ یہ تعلیم زمانہ کے مطابق ہے۔ اس لئے اگر بعض مواقع پر اس کو پہلی کتب سے اختلاف ہے تو یہ اس کے جھوٹا ہونے کی دلیل نہیں۔ بلکہ اس امر کی دلیل ہے کہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب بعض اَور جواب دیتا ہے۔

پہلی کتب سے اختلاف رکھتے ہوئے قرآن مجید کے سچا ہونے کے چار دلائل (۱) اس کتاب کو روح القدس نے اتارا ہے یعنی اس کلام میں نہایت پاکیزہ تعلیم ہے۔ اگر یہ مفتری کا کلام ہوتا تو افتراء کرنے والے کی کوئی غرض تو اس کلام میں نظر آتی۔ لیکن سارا قرآن پڑھ جاؤ اس میں محمد رسول اللہؐ کی اپنی کوئی غرض تم کو نظر نہ آئے گی۔ بلکہ اس کلام کے پیچھے ایک پاکیزگی کی روح کام کرتی ہوئی تم کو دکھائی دے گی۔ اس پاکیزگی کی روح سے تم سمجھ سکتے ہو کہ جہاں اس کو پہلی کتب سے اختلاف ہوا اور اس اختلاف کی کوئی توجیہ نہ ہو سکے تو یہی ماننا پڑے گا کہ وہ کتب بگڑ گئی ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قرآن خدا کا کلام نہیں۔ کیونکہ یہ نہیں ہوسکتا کہ خدائی کلام تو پاکیزگی کی روح

سے خالی ہو اور مفتری کا کلام پاکیزگی کی روح سے معمور ہو۔

(۲) دوسرا جواب اس میں یہ دیا گیا ہے کہ یہ کلام حق پر مشتمل ہے۔ جہاں کہیں اس کلام نے پہلی کتب سے اختلاف کیا ہے۔ اگر وہ اختلاف زمانہ کے بدلنے کے سبب سے نہیں تو تم دیکھو گے کہ عقلِ انسانی اسی بات کی تصدیق کرے گی جو قرآن کریم نے بیان کی ہے اور اسے رد کرے گی جو پہلی کتب میں بیان ہوا ہے۔ یہ بھی ایک زبردست ثبوت قرآن کریم کی سچائی کا ہے۔ مثلاً حضرت ہارون کا واقعہ ہی لے لو۔ قرآن میں لکھا ہے کہ انہوں نے شرک نہیں کیا (طٰہٰ:۹۱)۔ اب اول تو عقلاً ایک نبی کی طرف شرک کا منسوب کرنا کسی صورت میں جائز نہیں۔ لیکن عقلی بحث کو جانے دو خود بائبل اپنے اس بیان کی تردید کر رہی ہے۔ کیونکہ جنہوں نے بچھڑا بنایا تھا بائبل کے بیان کے رو سے انہیں قتل کروایا گیا تھا۔ لیکن اس واقعہ کے معاً بعد ہارونؑ سے بائبل کے رو سے یہ سلوک کیا گیا کہ کہانت ان کی نسل کے لئے مخصوص کر دی گئی اور انہیں اللہ تعالیٰ نے خاص عزت بخشی۔ یہ سلوک جو ان سے بچھڑے کے واقعہ کے معاً بعد بائبل میں بیان ہوا ہے بتاتا ہے کہ اس موقعہ پر ان کا رویہ قابل تعریف تھا۔ اور بائبل نے جو شرک میں شمولیت ان کی طرف منسوب کی ہے خود اس کی اپنی شہادت کے رو سے باطل ہے۔ (خروج باب ۴۰ آیت ۱۲ تا ۱۵ باب ۳۲ آیت ۲۷، ۲۸)

غرض قرآن کریم کو جہاں جہاں بھی پہلی کتب سے اختلاف ہے اس کی بات کی عقلاً یا نقلاً تصدیق ہو جاتی ہے۔ اور اس کے خلاف بیانات کی تردید یا عقل کر دیتی ہے یا نقل یا دونوں ہی سے اس کی تردید ہو جاتی ہے۔ پس اس امر کی موجودگی میں پہلی کتب سے اس کا اختلاف اس بات کی علامت نہیں کہ قرآن کریم کو محمدؐ رسول اللہ نے بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے نازل نہیں کیا۔ بلکہ اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ تازہ بتازہ محفوظ کلام ہے اور پہلے کلام محرّف مبدّل ہو گئے ہیں۔

(۳) تیسری دلیل اس اعتراض کے جواب میں اس آیت میں یہ دی گئی ہے کہ قرآن ہدایت مجسم ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان صحیح تعلق قائم کرتا ہے اور اسے خدا تعالیٰ تک پہنچاتا ہے اور یہ کام افتراء والے کلام سے ناممکن ہے۔ پس جب اس پر چل کر انسان خدا سے تعلق پیدا کر لیتا ہے۔ اور پہلی کتب سے نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ گو وہ نزول کے لحاظ سے سچی کتب تھیں مگر موجودہ زمانہ کے لحاظ سے وہ مردہ ہیں۔ اور اس غرض کو پورا نہیں کر رہیں جو ان سے متوقع ہے۔ پس اختلاف کی صورت میں ان کا قول غلط ہے اور قرآن کا درست۔

(۴) چوتھی دلیل یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ مومنوں کے لئے بشارت ہے یعنی اس پر چل کر انسان اللہ تعالیٰ کے فضلوں کا وارث ہوتا ہے۔ اور اس کے نشانات اس کی تائید میں دکھائے جاتے ہیں۔ اگر یہ جھوٹا ہوتا تو اس پر چلنے

والوں کے لئے اس قدر بشارات کے سامان کون پیدا کر سکتا تھا۔ جھوٹ بولنے والا دعویٰ تو کر سکتا ہے مگر ان دعوؤں کے پورا کرنے کے سامان تو پیدا نہیں کر سکتا۔

غرض چار دلائل اس آیت میں ان کے اعتراض کے رد میں بیان کئے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک اکیلا ہی ان کے اعتراض کو توڑنے کے لئے کافی ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ

اور ہم یقیناً جانتے ہیں (کہ) وہ کہتے ہیں (کہ یہ وحی الٰہی نہیں بلکہ) ایک آدمی اسے سکھاتا ہے (مگر وہ نہیں سمجھتے

لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ

کہ) جس شخص کی طرف وہ (اشارہ کرتے اور ان کے ذہن اس کی طرف) مائل ہوتے ہیں اس کی زبان اعجمی ہے

عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۴﴾

اور یہ (قرآنی زبان تو خوب) روشن (کر کے دکھانے والی) عربی زبان ہے۔

حلّ لُغات۔ اَلْبَشَرُ اَلْبَشَرُ: اَلْاِنْسَانُ ذَكَرًا اَوْ اُنْثٰى وَاحِدًا اَوْ جَمْعًا وَقَدْ يُثَنّٰى كَقَوْلِ الْقُرْاٰنِ: اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا۔ بَشَرٌ کے معنے ہیں انسان خواہ وہ مذکر ہو یا مؤنث واحد ہو یا جمع۔ بعض اوقات لفظ بشر کا تثنیہ بھی بنایا جاتا ہے جیسے قرآن کی آیت اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ میں بَشَرَيْنِ تثنیہ ہے۔ (اقرب)

لِسَانٌ لِسَانٌ کے معنے ہیں اَلْمِقْوَلُ بولنے کا آلہ (زبان) اَللُّغَةُ۔ بولی جانے والی زبان۔ مذکر اور مؤنث ہر دو طرح استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ لِسَانٌ فَصِيْحٌ اور لِسَانٌ فَصِيْحَةٌ دونوں طرح بولتے ہیں۔ (اقرب)

يُلْحِدُوْنَ يُلْحِدُوْنَ اَلْحَدَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور لَحَدَ (مجرد اَلْحَدَ) بِلِسَانِهٖ اِلٰى كَذَا کے معنے ہیں مَالَ۔ کسی طرف مائل ہوا۔ اور اَلْحَدَ فُلَانٌ کے معنے ہیں مَالَ عَنِ الْحَقِّ۔ حق سے منحرف ہو گیا (مفردات) پس يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ کے معنے ہوں گے کہ وہ اس کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

اَعْجَمِيٌّ اَلْاَعْجَمُ مَنْ لَا يُفْصِحُ وَلَا يُبَيِّنُ كَلَامَهٗ وَاِنْ كَانَ مِنَ الْعَرَبِ۔ وہ شخص جو اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح واضح نہ کر سکے خواہ وہ عرب ہی کیوں نہ ہو۔ مَنْ لَيْسَ بِعَرَبِيٍّ وَاِنْ اَفْصَحَ بِالْعَجَمِيَّةِ وہ شخص جو

عرب نہ ہوا گرچہ وہ عجمی یعنی غیر عربی زبان فصیح بولتا ہو۔(اقرب)

تفسیر۔ کفار کے اس اعتراض کا جواب کہ کوئی بشر آنحضرتؐ کو سکھا تا ہے اس آیت میں کفار کا ایک اور اعتراض بیان کیا گیا ہے جو آج تک مسلمانوں اور مسیحیوں کا محلِ نزاع بنا ہوا ہے۔ میں آیت کا مفہوم بیان کرنے سے پہلے اس اعتراض کی حقیقت بیان کرتا ہوں۔

جیسا کہ آیت کے الفاظ سے ظاہر ہے اس میں کفار کا یہ اعتراض بیان کیا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ پر الہام نہیں ہوتا بلکہ ان کو ایک آدمی یہ باتیں سکھا تا ہے۔ گو قرآن کریم نے اس شخص کا نام نہیں بتایا۔لیکن عبارت سے ظاہر ہے کہ کفار کا اعتراض اس موقعہ پر یہ نہ تھا کہ اسے کوئی نامعلوم شخص سکھا تا ہے بلکہ اس موقعہ پر ان کا اعتراض کسی خاص شخص کے متعلق تھا جس کا وہ اپنے پروپیگنڈا میں نام بھی بتاتے تھے۔قرآن کریم نے گو اس کی شخصیت کا اظہار نہیں کیا۔ مگر یہ بتایا ہے کہ جس شخص پر وہ اعتراض کرتے تھے وہ اعجمی تھا اور اسی بنا پر ان کے اعتراض کو ردّ کیا ہے اور توجہ دلائی ہے کہ ایک اعجمی کی مدد سے یہ کتاب جو عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ زبان میں ہے کیونکر تیار ہوسکتی تھی۔

مفسرین نے اس اعتراض کے متعلق مختلف واقعات بیان کئے ہیں۔ایک روایت یہ ہے کہ جویطب بن عبدالعزّٰی کا ایک غلام جس کا نام عائش یا یعیش تھا وہ پہلی کتب پڑھا کرتا تھا اور اسلام لے آیا تھا اور اسلام پر مضبوطی سے قائم رہا تھا۔مکہ کے لوگ اس کی نسبت الزام لگاتے تھے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھا تا ہے (روح المعانی زیر آیت ھٰذا)۔فراّء اور زجاجؔ کا یہی قول ہے اور مقاتلؔ اور ابن جبیر کا قول ہے کہ مکہ کے لوگ ابوفکیہ پر الزام لگایا کرتے تھے کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سکھا تا ہے۔(روح المعانی زیر آیت ھذا)

بعض نے کہا ہے کہ ابوفکیہ کا نام یسارؔ تھا اور وہ مکہ کی ایک عورت کا غلام تھا اور یہودی تھا۔

بیہقی اور آدم بن ابی ایاس نے عبداللہ بن مسلم الحضرمی سے روایت کی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے دو نصرانی غلام تھے وہ عین التمر کے رہنے والے تھے۔ان میں سے ایک کا نام یسار اور دوسرے کا نام جبر تھا۔دونوں مکہ میں تلواریں بنایا کرتے تھے اور کام کرتے وقت انجیل بھی پڑھتے تھے۔رسول کریم بازار سے گزرتے ہوئے ان کو انجیل پڑھتے ہوئے دیکھ کر کچھ دیر کے لئے وہاں ٹھیر جاتے۔(فتح البیان زیر آیت ھذا نیز روح المعانی زیر آیت ھذا)

ایک روایت میں ہے کہ ان میں سے ایک سے لوگوں نے پوچھا کہ اِنَّكَ تُعَلِّمُ مُحَمَّدًا۔کیا تم محمدؐ کو سکھاتے ہو؟ فقالَ لَا بَلْ هُوَ يُعَلِّمُنِي۔اس نے کہا نہیں بلکہ محمدؐ مجھے سکھاتے ہیں۔(روح المعانی زیر آیت ھذا)

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک عجمی رومی غلام مکہ میں تھا اس کا نام بلعام تھا۔ رسول اللہ اسے اسلام سکھایا کرتے تھے۔ اس پر قریش کہنے لگے کہ یہ محمدؐ کو سکھاتا ہے۔ (روح المعانی زیر آیت ھذا)

علاوہ ازیں علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ قیسؔ ایک عیسائی غلام تھا اس کی ملاقات رسول اللہ سے تھی۔ اس پر الزام لگائے گئے تھے کہ وہ محمدؐ کو سکھاتا ہے۔ (قرآن العظیم از جلال الدین سیوطی زیر آیت ھذا)

درمنثور میں لکھا ہے کہ عدسؔ ایک غلام تھا جو اوسہ بن ربیع کا غلام تھا اس کی نسبت الزام لگایا جاتا تھا۔ اور روح المعانی (جلد ۱۴) اور کشاف میں لکھا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کفار سلمانؓ فارسی کے متعلق الزام لگایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر سیلؔ لکھتا ہے کہ ڈاکٹر پریڈیاؔ نے سوانح محمدؐ میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن سلام کے متعلق لوگ اعتراض کیا کرتے تھے جس کا نام یہودیوں میں عبدیاؔ بن سلوم تھا۔ لیکن خود سیلؔ نے ہی اس کا رد کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ پریڈیا نے عبداللہ بن سلام کے متعلق غلطی کھائی ہے۔

سلمان کا نام اس نے غلطی سے عبداللہ ابن سلام سمجھ لیا ہے۔ (یعنی دراصل جس کا نام لیا جاتا تھا وہ سلمان تھے)

سیلؔ کہتا ہے کہ عام خیال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نسطوری پادری سے جس کا نام سرگیس تھا مدد لی تھی۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ سرگیس بحیرہ راہب کا نام تھا۔ جس سے محمدؐ صاحب جبکہ آپ حضرت خدیجہؓ کی طرف سے تجارت کے لئے شام کو گئے تھے ملے تھے۔ اس کی سند میں مشہور مصنف المسعودی کو پیش کیا جاتا ہے جس نے لکھا ہے کہ بحیرہ راہب کا نام عیسائیوں کی کتاب میں سرگیس آتا ہے۔ (تفسیر القرآن از پادری ویری زیر آیت ھذا)

آنحضرتؐ کو کسی بشر کے سکھانے کے متعلق پادریوں کی غلط آراء

پادری ویریؔ مختلف روایات بیان کر کے اپنی رائے کو یوں ظاہر کرتے ہیں کہ ناموں میں خواہ کتنا ہی اختلاف ہو لیکن یہ بات ہم کو یقینی طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صاحب کے پاس ایسے ذرائع موجود تھے کہ ہجرت سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کی مدد حاصل کر سکتے تھے۔ اور یہ بات کہ وہ اس مدد سے فائدہ حاصل کیا کرتے تھے اس کا ناقابل تردید ثبوت مکی زندگی کے آخری دور کی سورتوں میں جن میں یہودیوں اور مسیحیوں کی کتب کی کہانیاں بیان ہیں مہیا ہے۔

پھر یہی صاحب آیت زیر بحث کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد صاحبؐ کے ہمسائے غیر مذاہب کے لوگوں سے مدد حاصل کرنے کا الزام ان پر لگایا کرتے تھے اور اس اعتراض کا جو جواب قرآن نے دیا وہ محمد صاحبؐ کی پوزیشن کی کمزوری کو ثابت کر رہا ہے۔ چنانچہ آرنلڈ صاحب بھی اس بارہ میں لکھتے ہیں کہ اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ وہ غیر ملکی تھے۔ ہم کہتے ہیں کہ وہ انہیں مسالا تو مہیا کر کے دے سکتے تھے۔

آگے ویری کہتا ہے کہ یہی تو ہے جو وہ کیا کرتے تھے اور اسی وجہ سے کہ محمد صاحب اس مسالے کو لے کر اور اپنی نبوت کے مقصد کی تائید میں ڈھال کر خدا (تعالیٰ) کی طرف منسوب کر کے ان واقعات کو دہرادیا کرتے تھے اور جبرائیل فرشتہ کی وحی اس کو بتاتے تھے۔ ہم اس پرانے الزام کو دہرانے میں ہچکچاتے نہیں کہ وہ جان بوجھ کر جھوٹ بولا کرتے تھے (تفسیر القرآن از پادری ویری زیر آیت ھذا) (نَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ ھٰذِہِ الْخُرَافَاتِ)

آیت یُعَلِّمُہٗ بَشَرٌ کا اصل مفہوم مسلمان مفسروں اور عیسائی مؤرخوں اور پادریوں کے خیالات تحریر کرنے کے بعد اب میں اس آیت کا مفہوم بیان کرتا ہوں۔ آیت زیر بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ اعتراض کیا کرتے تھے کہ رسول کریم ؐ کو قرآن کا مضمون کوئی انسان سکھاتا ہے۔ اس اعتراض کا جواب اللہ تعالیٰ یہ دیتا ہے کہ ان کی زبان تو اعجمی ہے اور یہ کلام تو عربی میں ہے۔ مسیحی کہتے ہیں کہ یہ جواب غلط ہے کیونکہ معترض یہ نہیں کہتا کہ وہ غلام قرآن کا مضمون عربی زبان میں بنا کر آپ کو دے دیا کرتے تھے۔ بلکہ یہ کہتا ہے کہ وہ یہودی کتب کے مضامین آپ کو بتاتے تھے اور آپ ان مضامین کو اپنی عبارت میں ڈھال لیا کرتے تھے۔

میرے نزدیک کسی کے کلام کو سمجھنے سے پہلے اس کی عام حالت کا جائزہ لینا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اگر قرآن کے دوسرے جوابات جو وہ مخالفوں کے اعتراضوں کے دیتا ہے ایسے ہی بیہودہ ہوتے ہیں جیسا کہ یہ جواب ہے جو پادری ویریؔ اور آرنلڈ صاحب نے قرآن کریم کی طرف منسوب کیا ہے تو بے شک ان کی یہ تنقید قابل اعتناء ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر اس کے برخلاف قرآن اپنے مخالفوں کے اعتراضات کے مناسب اور مدلل جواب دیتا ہے۔ تو پھر اس امر کے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یا تو پادری صاحبان نے سوال نہیں سمجھا یا جواب نہیں سمجھا۔

دوسرا قابل غور امر اس بارہ میں یہ ہے کہ اگر یہ جواب ایسا ہی بے جوڑ تھا جیسا کہ میسرز ویری اور آرنلڈ ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو کیوں مکہ والوں نے اس کو ردّ نہ کیا؟ اگر ان کا وہی اعتراض تھا جو میسرز ویری اور آرنلڈ نے سمجھا ہے تو انہوں نے کیوں اس کے جواب میں یہ بات نہ کہی کہ ہمارا تو یہ اعتراض نہیں کہ آپ عربی اس یہودی یا عیسائی غلام سے بنواتے ہیں۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ آپ مسالہ اس سے لیتے ہیں۔ اور پھر اپنی زبان میں اس کے مضامین کو بیان کر دیتے ہیں۔ کفار کی طرف سے یہ اعتراض کسی کمزور روایت میں بھی نہیں پایا جاتا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ شاید مسلمانوں نے وہ اعتراض تاریخ میں نقل نہ کیا ہو۔ کیونکہ جب بیسیوں روائیتیں جن سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا اسلام پر زد پڑتی ہے۔ کتب احادیث میں درج ہیں۔ تو اس ایک اعتراض کے نقل کرنے میں ان کے لئے کیا روک تھی؟ پس صاف ظاہر ہے کہ کفار نے اس امر کو تسلیم کر لیا تھا کہ ان کے سوال کو ٹھیک طور پر سمجھ لیا گیا ہے اور جواب

اس کے مطابق ہی دیا گیا ہے۔

اعجمی کے معنی غیر عرب کے اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ مذکورہ سوال کا جواب جو قرآن کریم نے دیا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا مطلب سمجھنے سے پہلے اَعْجَمِیٌّ کے معنے سمجھ لینے ضروری ہیں۔ عربی زبان میں عرب اور عجم دو لفظ عربوں اور غیر عربوں کے لئے مستعمل ہوتے ہیں۔ اور اسی مادہ سے اَعْجَمٌ کا لفظ ہے جو غیر عرب کے لئے بولا جاتا ہے۔ چنانچہ تاج العروس جلد ۸ میں ہے۔ عرب کہتے ہیں رَجُلٌ اَعْجَمُ وَقَوْمٌ اَعْجَمُ۔ وہ شخص اعجم ہے یا وہ قوم اعجم ہے۔ مطلب یہ کہ وہ آدمی یا قوم غیر عرب ہے۔ عربوں میں سے نہیں ہے۔

اعجمی کے معنے اس حد تک کے حوالہ سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اعجم غیر عرب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس کے سوا اعجم کے معنے مَنْ لَا یُفْصِحُ کے بھی ہیں یعنی وہ شخص جو بات کھول کر نہ بیان کر سکے۔ اسی طرح یہی معنے اعجمی کے بھی ہیں۔ (تاج) اور ان معنوں میں عرب کی نسبت بھی یہ لفظ بولا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اعجم اس شخص کی نسبت بھی بولتے ہیں جس کی زبان میں لکنت ہو خواہ وہ فصیح الکلام ہی کیوں نہ ہو۔ (تاج)

اعجمی لفظ کا استعمال زبان کے لئے ان معانی کو بیان کرنے کے بعد اب میں اس طرف توجہ پھیرنا چاہتا ہوں کہ اس جگہ اعجمی کا لفظ انسان کی نسبت نہیں بولا گیا بلکہ زبان کی نسبت بولا گیا ہے۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ جس کی نسبت قرآن بنانے میں مدد دینے کا الزام لگایا گیا ہے وہ اعجمی ہے۔ بلکہ یوں فرمایا ہے کہ جس شخص کی نسبت یہ لوگ ایسا گمان کر رہے ہیں اس کی زبان اعجمی ہے یعنی (۱) غیر عرب لوگوں کی زبان ہے یا (۲) یہ کہ اس کی زبان ایسی ناقص ہے کہ وہ اپنا مطلب بیان ہی نہیں کر سکتا۔

اَعْجَمِیٌّ کے ایک معنے لکنت کے بھی ہیں وہ معنے بولی کی نسبت استعمال نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ لکنت چمڑے کی زبان میں ہوتی ہے۔ الفاظ سے مرکب بولی میں لکنت نہیں ہوا کرتی۔ پس جب اعجمی کا لفظ زبان کی نسبت بولا جائے تو اس کے دو معنے ہوتے ہیں۔ غیر عرب زبان یعنی جسے اعجم لوگ بولتے ہیں۔ یا پھر اس حد تک غیر فصیح زبان جو مطلب واضح نہ کر سکتی ہو خواہ اس کا بولنے والا عرب ہی کیوں نہ ہو۔ اور خواہ وہ عربی میں ہی کیوں بات نہ کر رہا ہو۔

آیت کے دو معنی اعجمی زبان کے معنوں کی تعیین کرنے کے بعد اب میں یہ بتاتا ہوں کہ ان دونوں معنوں کو مدنظر رکھ کر اس آیت کے یہ دو معنے ہوتے ہیں۔

(۱) یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ کو قرآن کوئی دوسرا شخص سکھاتا ہے۔ وہ شخص جس کی طرف یہ لوگ اس کام کو منسوب کرتے ہیں اس کی زبان تو غیر عربی ہے۔

(۲) جس کی نسبت یہ لوگ اس کام کو منسوب کرتے ہیں وہ تو اپنے خیالات ادا کرنے پر قادر ہی نہیں اور قرآن کی زبان عربی ہے۔ اور عربی بھی وہ کہ مضمون اس میں سے پھوٹ پڑتے ہیں۔

ان دونوں جوابوں کو دیکھ لو کہ نہایت معقول اور مدلل اور مسکت ہیں۔ جو عربی نہ جانتا ہو وہ بھی عرب کو کچھ سکھا نہیں سکتا۔ اور جس کی دماغی حالت ایسی کمزور ہو کہ صحیح طور پر بات نہ کر سکتا ہو وہ بھی کوئی علمی بات کسی کو نہیں بتا سکتا۔

آنحضرتؐ پر عیسائی غلام سے سیکھنے کا اعتراض اور اس کا جواب اب میں یہ بتاتا ہوں کہ کفار کس شخص کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ اس غلام کے مختلف نام آتے ہیں۔ مگر ان مختلف ناموں میں سے اس جگہ کے مطابق وہی روایت ہے جس میں جبر کی نسبت سکھانے کا شبہ ظاہر کیا گیا ہے۔ کیونکہ باقی غلام جن کے نام لئے گئے ہیں کھلے طور پر مسلمان تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صبح شام ملتے رہتے تھے۔ ان میں کسی ایک کو اعتراضات کا نشانہ بنانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اگر اعتراض ہوتا تو سب پر ہوتا۔ وہ شخص جو اکیلا تھا اور جس کی نسبت کفار کو شبہ ہوتا تھا کہ شاید یہ باتیں سکھاتا ہے وہ جبر ہی ہے جو بہت دیر بعد مسلمان ہوا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں نہیں آتا تھا بلکہ جیسا کہ روایات سے ثابت ہے آپ بعض دفعہ اس کے پاس جبکہ وہ تلواریں بناتے ہوئے انجیل کی آیات پڑھا کرتا تھا کھڑے ہو جاتے تھے۔ پس اس آیت میں جس شخص کی طرف اشارہ ہے وہ یہی شخص ہے اور جیسا کہ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص اپنے مذہبی جوش کی وجہ سے لوہا کوٹتے ہوئے انجیل پڑھتا جاتا تھا اور بوجہ غیر زبان ہونے کے عجوبہ خیال کرتے ہوئے لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے جوش سے متاثر ہوتے اور آپ بھی بعض دفعہ اس کے پاس کھڑے ہو جاتے اور یہ خیال کر کے کہ جس شخص میں مذہب کا اس قدر جوش ہے وہ ضرور سنجیدگی سے دینی مسائل پر غور کرے گا اسے اسلام کی تلقین کرتے۔ بعض لوگ جنہوں نے اس کے پاس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑے دیکھا انہوں نے یہ مشہور کر دیا کہ وہ آپ کو سکھاتا ہے۔ چنانچہ اوپر جو احادیث نقل ہوئی ہیں ان میں یہ بھی آتا ہے کہ اس سے یا اس کا جو ایک اور ساتھی تھا اس سے بعض لوگوں نے سوال کیا کہ کیا تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے دین کی باتیں سکھاتے ہو؟ تو اس نے کہا کہ نہیں وہ مجھے سکھاتے ہیں۔ (روح المعانی زیر آیت ھٰذا)

اس سوال و جواب سے ظاہر ہے کہ لوگ اسی کی نسبت گمان کرتے تھے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھاتا ہے۔ اس الزام کا جواب قرآن کریم نے یہ دیا ہے کہ اس کی زبان تو اعجمی ہے یعنی وہ عربی زبان نہیں

جانتا یا ایسی تھوڑی جانتا ہے جسے زبان جاننا نہیں کہہ سکتے ۔اور قرآن کی زبان تو عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ ہے پھر بتاؤ کہ ان دونوں کے درمیان تبادلہ خیال کس طرح ہوتا ہے ۔آخر مذہب کی تعلیمات سکھانے کے لئے زبان ہی ذریعہ ہے اگر دونوں شخصوں کی زبان ایک نہیں ۔ایک کی زبان غیر عربی ہے اور دوسرے کی عربی ۔تو عربی دان غیر عربی دان سے کس ذریعہ سے فائدہ اٹھا سکتا ہے ۔یہ جواب نہایت معقول ہے اور اس جواب کو کوئی غیر معقول نہیں کہہ سکتا۔

دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہو سکتے تھے کہ اس کی زبان جس کی نسبت اتہام لگایا جاتا ہے کہ وہ سکھاتا ہے گو عربی ہو۔مگر وہ اپنا مفہوم ادا کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا ۔اگر یہ معنے کئے جائیں تب بھی جواب درست ہے ۔ کیونکہ جواب میں قرآن کریم کو پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ قرآن کی زبان اس قدر وسیع مطالب پر مشتمل ہے کہ وہ مبین کہلانے کی مستحق ہے یعنی وہ ہر اعتراض کا خود ہی جواب بھی دیتی جاتی ہے ۔پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک شخص جو اپنا مطلب بھی پوری طرح واضح نہیں کر سکتا یعنی موٹی عقل والا اور کُند ذہن ہے ۔وہ ایسے مطالب محمد رسول اللہ کو بتائے کہ ہر دعویٰ کے ساتھ اس کی دلیل بھی موجود ہو۔اور ہر مشکل جو قرآن پڑھتے ہوئے انسانی ذہن پیدا کرے اس کا حل بھی ساتھ ہی موجود ہو ۔جو شخص کسی علمی بات کے بیان کرنے کے قابل نہیں اور موٹی عقل کا آدمی ہے اور اپنے مطلب کو واضح نہیں کر سکتا وہ اس قسم کی باتیں سمجھا ہی کس طرح سکتا ہے ۔یہ دلیل بھی ایسی کامل اور مُسکت ہے کہ اس کے معقول اور لاجواب ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

ممکن ہے کوئی اعتراض کرے کہ ہو سکتا تھا کہ وہ غلام اپنے بھدّے پیرایہ میں اناجیل کے واقعات سنا دیتا ہو۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے اپنے الفاظ میں بیان کر دیتے ہوں ۔اس کا جواب یہ ہے کہ مبین کا لفظ اس سوال کا جواب بھی دے رہا ہے ۔کیونکہ بتانے والا اگر نامکمل سچائیاں بتاتا تھا تو کونسی صورت تھی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مبین صداقتوں یعنی ان صداقتوں میں جو اپنی سچائی کی آپ ہی دلیل ہوں تبدیل کر سکتے تھے کیا کوئی شخص یہ طاقت رکھتا ہے کہ جھوٹ یا غلط بات کو صرف مدلل ہی نہیں بلکہ ایسا مدلل بنا دے کہ مضمون روز روشن کی طرح کھل جائے ۔

بعض مسیحی اعتراض کو یہ رنگ دیتے ہیں کہ قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ اس میں چونکہ یہود و نصاریٰ کی کتب کی باتیں ہیں اور محمدؐ رسول اللہ بوجہ امّی ہونے کے خود ان باتوں سے واقف نہیں ہو سکتے تھے ۔اس لئے ثابت ہوا کہ یہ باتیں انہوں نے خدا تعالیٰ سے معلوم کر کے دنیا کو بتائی ہیں ۔اس دعویٰ کے خلاف یہ اعتراض ہے کہ وہ بعض مسیحی غلاموں سے غلط اور بے جوڑ روایات سن کر قرآن میں داخل کر لیتے تھے ۔اور اس صورت میں یہ ضروری نہیں کہ جس شخص سے

وہ ان قصوں کو سنیں وہ ضرور بڑے دماغ کا اور بڑی سمجھ کا آدمی ہو۔ بلکہ واقعات چونکہ غلط بیان ہوئے ہیں اس لئے جاہل اور اکھڑ غلام کی نسبت ایسا الزام کے واقعات زیادہ مطابق بیٹھتا ہے نہ کہ اعتراض کو دور کرتا ہے۔

قرآن مجید اپنے اندر جملہ کتب کی صداقتیں رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ قرآن کریم میں کہیں وہ دعویٰ بیان نہیں جو مسیحی قرآن کی طرف منسوب کرتے ہیں۔قرآن کریم اپنی سچائی کی یہ دلیل نہیں دیتا کہ چونکہ اس میں اہل کتاب کی کتب کی باتیں بیان ہوئی ہیں وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ بلکہ قرآن تو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس میں وہ صداقتیں موجود ہیں جو اہل کتاب کی کتب میں نہیں ہیں اس لئے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ چنانچہ اسی سورۂ نحل میں یہ آیات گذر چکی ہیں کہ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ وَ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ (النحل: ۶۴، ۶۵) یعنی ہمیں اپنی ہی ذات کی قسم ہے کہ تجھ سے پہلے ہر قوم میں نبی گزر چکے ہیں۔اور ہر قوم کے پاس ہدایت نامہ آ چکا ہے مگر باوجود اس کے شیطان نے ان قوموں کو گمراہ کر دیا اور اب وہ مختلف باتیں اپنے مذہب کی طرف منسوب کر رہے ہیں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل نہ ہوئی تھیں اور وہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کے تصرف میں آئے ہوئے ہیں اور دردناک عذاب کا مورد بننے کے خطرہ میں ہیں۔ پس ان کے ان اختلافات کے مٹانے کے لئے ہم نے تجھ پر یہ کتاب اتاری ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ سچائیاں جو ان سے مخفی ہو چکی ہیں اور وہ ان کے متعلق اختلاف کر رہے ہیں بیان کرے۔اور اس قرآن کے ذریعہ سے ہم نے مومنوں کے لئے ہدایت اور رحمت کے سامان پیدا کئے ہیں۔

اس آیت میں پہلے سب قوموں میں نبی آنے کا ذکر ہے اور بعد میں قرآن کریم کے نزول کا۔اور یہ نہیں فرمایا کہ چونکہ یہ پہلے نبیوں کی کتب کی باتیں بیان کرتا ہے اس لئے سچا ہے۔ بلکہ یہ فرمایا ہے کہ پہلی کتب کو لوگوں نے چھوڑ دیا اور شیطان کے پیچھے چل پڑے اور ان میں قسم قسم کے اختلاف پیدا ہو گئے۔یہ قرآن ان اختلافوں کو مٹانے اور جو صداقت مخفی ہو گئی تھی اسے ظاہر کرنے کے لئے آیا ہے۔قرآن کریم کے اس دعوے کی موجودگی میں یہ کہنا کہ محمد رسول اللہ محض پچھلی کتب کی باتیں بیان کر کے جن کو وہ چند غلاموں سے سن لیتے تھے اپنی سچائی کا دعویٰ کرتے تھے کس قدر غلط ہے۔

خود یہ آیت بھی تو جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں یہی بات پیش کر رہی ہے۔کہ قرآن کریم کی برتری کسی نقل کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے مبین ہونے کی وجہ سے ہے۔اور مُبِیْن ہونے کے لئے وسیع اور مخفی علوم کی ضرورت

ہے۔جن کی اس آدمی سے جس کی طرف یہ کلام منسوب کیا جاتا ہے تو کیا امید کی جاسکتی ہے بڑے سے بڑا عقلمند انسان بھی اس کتاب کے بنانے میں مدد نہیں دے سکتا جس میں سب سچائیاں بادلیل بیان کی گئی ہوں ۔ اور سب اعتراضوں کا ردموجود ہو۔ایسی کتاب تو صرف خدا تعالیٰ ہی اتار سکتا ہے۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ یہ کہنا غلط ہے کہ وہ غلام جاہل تھے ۔ہم تو سمجھتے ہیں کہ کوئی بڑا عالم رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قبضہ میں آ گیا تھا۔جن مسیحیوں نے اس آیت کا مشار الیہ سرگیس کو قرار دیا ہے اسی حکمت سے قرار دیا ہے کیونکہ وہ زیادہ عقلمند تھے۔اورانہوں نے اس امر کو محسوس کر لیا تھا کہ قرآن کریم میں یہود ونصاریٰ اور اسلام کے درمیان اختلافی امور کی جو بحث ہے وہ غلام تو الگ رہا اچھے لکھے پڑھے عیسائی کی دسترس سے بھی باہر ہے ۔اس لئے انہوں نے ایک فرضی سرگیس کو تجویز کیا کہ وہ ایک نُسطوری راہب تھا اور آپ کو سکھایا کرتا تھا۔ تاریخی طور پر تو خود مسیحی مصنفوں نے ہی ان کی بات کو رد کر دیا ہے۔

عیسائیوں کے اعتراض کا عقلی ردّ مگر میں عقلی طور پر بھی اس کا ایک جواب بیان کر دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر نصاریٰ اس الزام کو یہ شکل دیں تو پھر بھی انہی کے مذہب پر زد پڑتی ہے کیونکہ اس کے یہ معنے ہوں گے کہ یہود ونصاریٰ کی جو تصویر اسلام نے پیش کی ہے خواہ انسانوں سے سیکھ کر کی ہے مگر ہے وہی سچی۔اور اگر وہ تصویر سچی ہے تو ان کے مذاہب کے غلط ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔اس پہلو کے بدلنے سے صرف ان کو یہ تسلی ہوگئی کہ ہمارے مذاہب تو جھوٹے ثابت ہو ہی گئے ہیں ہم نے قرآن پر بھی اعتراض کر دیا کہ اسے بھی انسانوں نے بنایا ہے۔لیکن یاد رہے کہ شبہ یقین کا قائم مقام نہیں ہوسکتا قرآن کریم کی طرف جو بات وہ منسوب کر رہے ہیں اسے تو خود ان کے اپنے آدمی نا قابل قبول قرار دیتے ہیں۔لیکن یہ تسلیم کر کے کہ قرآن کریم نے یہودیوں اور مسیحیوں سے جہاں جہاں اختلاف کیا ہے وہ کسی بڑے عالم کی تحقیق ہے۔جس نے اہل کتاب کی لائبریریاں چھان کر ان باتوں کو نکالا ہے ۔اور موجودہ مذاہب کی غلطیوں کو ظاہر کر دیا ہے۔اس سے تو ان مذاہب کا کچھ بھی نہیں رہتا۔اور یہودی اور مسیحی زیادہ سے زیادہ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے سکتے ہیں کہ یہودیت وہ نہیں جو موجودہ تورات اور کتب یہود میں موجود ہے بلکہ وہ ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے۔اور نصرانیت وہ نہیں جو موجودہ اناجیل میں ہے بلکہ وہ ہے جو قرآن میں ہے۔اور اگر وہ ایسا کہیں گے تو دوسرے لفظوں میں قرآن کریم کی تصدیق کریں گے۔

اب ایک پہلو آیت کے ترجمہ کا رہ گیا ہے جو قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ آیت کا یہ ترجمہ کہ جس کی نسبت لوگ گمان کرتے ہیں اس کی زبان غیر عربی ہے۔اس کے گو ایک معنے یہ بھی ہوسکیں کہ اس کو عربی یا آتی ہی

نہیں یا اتنی نہیں آتی کہ وہ اپنا مطلب بیان کر سکے۔لیکن اس کے یہ معنے بھی تو ہو سکتے ہیں کہ اس کی مادری زبان غیر عربی ہے۔اور ایسا شخص جسکی مادری زبان غیرعربی ہو بعد میں عربی سیکھ بھی تو سکتا ہے پس جواب مکمل نہ ہوا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معنے اس آیت کے نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ سوال قرآن کریم نے دوسری جگہ خود بیان کیا ہے۔اور اس کا الگ جواب دیا ہے۔جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ معنے آیت زیر بحث میں نہیں ہیں۔نیز اس سے یہ امر بھی ثابت ہوتا ہے کہ پادری ویری کا یہ استنباط کہ سورۃ نحل کا جواب بالکل بودا ہے اور اس سے اعتراض کی سچائی ثابت ہوتی ہے۔ان کی ناواقفیت کی وجہ سے ہے کیونکہ جب قرآن کریم نے وہی سوال جو وھیری صاحب اور دوسرے مسیحی مصنفوں نے اس آیت سے نکالا ہے سورۃ فرقان میں خود بیان کیا ہے اور اس کا جواب نہایت زبردست دیا ہے۔تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ سورۃ نحل میں اس سوال کا نہایت بودا جواب دیا جاتا۔

سورۃ فرقان خود وھیری صاحب کے نزدیک ابتدائی مکی سورتوں میں سے ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:۔

''اس سورۃ کی آیتیں محمد (صلعم) کی ابتدائی مکی وحی میں سے ہیں۔'' (تفسیر قرآن از پادری ویری تعارف سورہ فرقان)

اور سورۃ نحل کی نسبت وہ لکھتے ہیں کہ:۔

''تمام شہادت اندرونی ہو یا بیرونی ہمیں اس امر کے ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ یہ (نحل) آخری مکی سورتوں میں سے ہے۔'' (تفسیر القرآن از پادری ویری تعارف سورۃ نحل)

اب کیا کوئی عقلمند تسلیم کر سکتا ہے کہ جس اعتراض کو سورۃ فرقان میں نہایت زبردست دلائل کے ساتھ رد کیا ہے اس کے چھ سال کے بعد اس سوال کا جواب سورۃ نحل میں نہایت بودا اور کمزور دے دیا ہے۔اگر فرقان بعد کی ہوتی تو کوئی شبہ بھی کر سکتا تھا کہ اس وقت جواب نہیں سوجھا بعد میں جواب بنالیا۔مگر فرقان خود مسیحی مصنفوں کے نزدیک پہلے کی ہے اور نحل بعد کی۔

اب میں مضمون کو یکجا بیان کرنے کے لئے پہلے وہ دلائل بیان کرتا ہوں جو سورۃ فرقان میں بیان کئے گئے ہیں۔ سورۃ فرقان میں آتا ہے:۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكُ ۟ اِفْتَرٰىهُ وَ اَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا۔ وَ قَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا۔ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (الفرقان: ۵ تا ۷)

یعنی کفار کہتے ہیں کہ قرآن ایک جھوٹی کتاب ہے اور محمد رسول اللہ کو اس کے بنانے میں دوسرے لوگ مدد

دیتے ہیں۔ان کفار نے یہ اعتراض کر کے سخت ظلم کیا ہے اور جھوٹ بولا ہے اور وہ اس اعتراض کو پکا کرنے کے لئے یوں دلیل دیتے ہیں کہ قرآن میں ہے کیا۔بس پرانے لوگوں کی باتیں نقل کردی گئی ہیں ۔محمد (صلعم) وہ باتیں لکھوا لیتے ہیں اور صبح وشام ان کے سامنے وہ پڑھی جاتی ہیں (تا کہ یاد رہیں) تُو ان سے کہہ کہ قرآن کو تو اس نے اتارا ہے جو آسمان اور زمین کے رازوں کو جانتا ہے۔وہ بہت بخشنے والا اور مہربان ہے۔

اس آیت میں صاف لفظوں میں اس اعتراض کو نقل کیا گیا ہے جو ویری صاحب سورۃ نحل کی آیت سے نکالنا چاہتے ہیں اور اس اعتراض کو پڑھ کر یہ بھی صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ سورہ نحل والی آیت کا اعتراض اس آیت سے مختلف ہے۔کیونکہ سورۃ نحل میں ایک شخص کی طرف سکھانا منسوب کیا گیا ہے اور یہاں کئی شخصوں کی طرف۔پھر سورۃ نحل والی آیت میں گو نام نہیں لیا گیا مگر یہ ضرور بتایا گیا ہے کہ جس پر الزام لگایا جاتا ہے وہ معیّن شخص ہے۔لیکن سورۃ فرقان میں وہ جماعت غیر معیّن رکھی گئی ہے۔اسی طرح سورۃ نحل میں سکھانے کے کام کا وقت نہیں بتایا گیا لیکن سورۃ فرقان میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ صبح وشام یہ تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

سورۃ فرقان کی آیات کے الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ چونکہ صبح وشام نماز کے لئے اور قرآن سیکھنے کے لئے دارارقم میں جمع ہوتے تھے۔وہ نادان یہ خیال کرتے تھے کہ شاید اس جگہ جمع ہو کر بعض مسیحی غلام اپنی کتب کی باتیں ان کو بتاتے ہیں یا ان سے لکھ کر صحابہ لے آتے ہیں اور پھر وہ صبح وشام حفظ کی جاتی ہیں۔ان جاہلوں کی عقل میں صبح وشام کی نمازیں تو آ ہی نہیں سکتی تھیں۔وہ اس اجتماع کو منصوبہ بازی کا وقت سمجھتے تھے۔ خود مجھے اس بارہ میں ایک تجربہ ہوچکا ہے جس سے اس قسم کی بدگمانی کی حقیقت خوب معلوم ہوجاتی ہے۔

کوئی بیس سال کا عرصہ ہوا میں لاہور گیا۔مجھ سے آریوں کے مشہور لیڈر لالہ رام بھجدت جواب فوت ہوچکے ہیں ملنے کے لئے آئے۔ان کے ساتھ کچھ اَور صاحبان بھی تھے۔جن میں شیر پنجاب جو سکھوں کا مشہور اخبار ہے اس کے ایڈیٹر صاحب بھی شامل تھے۔اتفاق سے اس دن میرا لیکچر تھا۔وہ لیکچر سننے کے لئے ٹھیر گئے۔مجھے سارا دن کام کی وجہ سے حوالے نکالنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔اس لئے میں نے حافظ روشن علی صاحب مرحوم کو (اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت فرمائے) جو آیات کو نکالنے کا خاص ملکہ رکھتے تھے سٹیج پر بٹھالیا۔اور کہا کہ میں آپ کو مضمون بتاتا جایا کروں گا۔آپ مجھے آیت کے الفاظ بتاتے جایا کریں۔خیر میں نے لیکچر شروع کیا۔جہاں کسی آیت سے استدلال کی ضرورت ہوتی۔میں آہستہ سے ایک دو لفظ آیت کے پڑھ دیتا یا مضمون بتا دیتا اور وہ ساری آیت پڑھ دیتے۔ میں اسے پڑھ کر جو استدلال پیش کرنا ہوتا تھا اسے بیان کر دیتا۔دوسرے دن شیر پنجاب میں ایک مضمون نکلا کہ کل

ہم بھی امام جماعت احمدیہ قادیان کے لیکچر میں تھے لیکچر اچھا تھا۔مگر ہم نے ذرا تجسس کیا اور سٹیج کے پچھلی طرف گئے تو معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے پیچھے ایک عالم چھپایا ہوا تھا۔وہ مضمون بتا تا جا تا تھا اور مرزا صاحب دہراتے جاتے تھے۔واقف کار لوگوں میں کئی دن اس پر ہنسی اُڑتی رہی اور سردار صاحب سے بھی کسی نے جا ذکر کیا وہ بہت شرمندہ ہوئے۔اور کہا کہ میں نے تو سمجھا تھا کہ میں نے اپنی ہوشیاری سے راز معلوم کرلیا ہے۔

ایسی ہی ہوشیاری مکہ والوں نے دکھائی تھی۔کام والے لوگوں کو صبح وشام ہی فرصت مل سکتی تھی۔وہ صبح اور شام کی نمازیں ادا کرنے کے لئے اور قرآن پڑھنے کے لئے دارارقم میں جمع ہو جاتے تھے۔کفار کے بعض زیادہ عقلمند لوگ خیال کرتے تھے کہ ہم نے راز معلوم کرلیا ہے۔یہ قرآن کی تصنیف کے لئے جمع ہوتے ہیں۔(السیرۃ النبویۃ لابن ھشام۔ذکر من اسلم من الصحابۃ بدعوۃ ابی بکر)

عقلمند کے لئے اس میں بھی ایک نشان ہے کیونکہ اس میں بھی یہ اعتراف پایا جاتا ہے کہ قرآن کو کوئی ایک شخص نہیں بنا سکتا۔تبھی انہوں نے اس کے بنانے میں مدد دینے والی ایک جماعت قرار دی۔جن میں سے بعض عقلی باتیں جمع کرتے تھے اور بعض پرانی کتب کی تعلیم جمع کرتے تھے۔

اب میں سورۃ فرقان میں اس اعتراض کے جو جواب دئے گئے ہیں بیان کرتا ہوں کفار کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اس کے دو پہلوؤں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) اول یہ کہ جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ قرآن کریم کے بنانے میں مدد دیتے ہیں۔کیا وہ ایسا کر سکتے تھے؟

(۲) دوسرے یہ کہ جس چیز کی نسبت کہا جاتا ہے کہ بعض غلاموں نے لکھائی ہے۔کیا وہ انسانوں کی لکھائی ہوئی ہوسکتی ہے؟

پہلے سوال کا جواب قرآن کریم یہ دیتا ہے کہ یہ سوال نہایت ظالمانہ اور جھوٹا ہے۔اس جواب میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جن غلاموں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ آ آ کر رسول کریمؐ کو قرآن سکھایا کرتے تھے ان کے متعلق دیکھنا چاہیے کہ وہ اسلام کی خاطر کیا کیا تکالیف اٹھا رہے تھے۔یہ کیونکر ممکن ہوسکتا تھا کہ ایسے لوگ جو خود قرآن بنا بنا کر محمدؐ رسول اللہ کو دیتے تھے اس جھوٹے کلام کی خاطر رات اور دن تکلیفیں اٹھا رہے تھے۔اسلام کی خاطر ان غلاموں میں سے بعض نے جانیں دیں۔بعض کی آنکھیں نکالی گئیں۔ایک میاں بیوی کو اس طرح قتل کیا گیا کہ خاوند کی دونوں لاتوں کو دو اونٹوں سے باندھ کر دو طرف چلا دیا۔اور اس کی بیوی کی شرمگاہ میں نیزہ مار کر اس کے سامنے قتل کیا۔اور ان کے لڑکے کو بھی سخت ایذائیں دیں۔اس دوران میں انہیں بار بار کہا جاتا تھا کہ محمد رسول اللہ

کا انکار کر دیں تو چھوڑ دئے جائیں گے۔مگر میاں بیوی مرتے مر گئے پر صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا (الاصابة فی تمییز الصحابة ذکر سمیّة بنت خباط)۔یہ آزادوں کا سردار نام نہاد غلام یاسرؓ بھی انہی غلاموں میں سے تھا جن کے متعلق یہ اتہام لگایا جاتا تھا کہ وہ محمد رسول اللہؐ کو سکھاتے ہیں۔کیا کوئی انسان مان سکتا ہے کہ خود ہی قرآن بنا کر دینے والے محمدؐ رسول اللہ کے نام پر ایسے ایسے عذاب اٹھا کر جانیں قربان کر رہے تھے۔

مکہ کے کافر تو وقتی جوش میں اندھے ہو رہے تھے کیا آج کل کی عیسائی دنیا میں بھی کوئی دیکھنے والی آنکھ نہیں؟ کوئی بولنے والی زبان نہیں جو اس بار بار دہرائے جانے والے ظالمانہ اور جھوٹے اعتراض کے خلاف آواز اٹھائے؟

اعتراض کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ کیا وہ کلام ان غلاموں کا سکھایا ہوا ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ جنہیں تم قصے کہتے ہو وہ قصے ہیں ہی نہیں بلکہ پیشگوئیاں ہیں۔ان کا اتارنے والا تو آسمانوں اور زمین کے غیبوں کا جاننے والا خدا ہے۔یعنی ان میں آئندہ کے حالات بیان کئے گئے ہیں نہ کہ پرانے واقعات۔اور انسان آئندہ کے حالات نہیں جان سکتا۔اور نہ بتا سکتا ہے۔اب دیکھو تو یہ جواب کیسا واضح اور صحیح ہے۔

آنحضرت کا جبر غلام سے انجیل سیکھنا غلط ہے

غرض سورۂ نحل میں یہ اعتراض نہیں کہ دوسرا کوئی شخص اسے مضمون سکھاتا ہے۔وہ اعتراض فرقان میں بیان ہوا ہے اور اس کا ایسا دنداں شکن جواب دیا گیا ہے کہ شریف آدمی اسے سن کر پھر اس اعتراض کو نہیں دوہرا سکتا۔اور سورۂ نحل میں وہ اعتراض نہیں بلکہ یہ اعتراض بیان ہوا ہے کہ فلاں غلام قرآن سکھاتا ہے۔حالانکہ وہ غلام عربی نہیں جانتا تھا۔صرف کچھ آیات انجیل کی جو غالباً یونانی زبان میں ہوں گی کام کرتے وقت پڑھا کرتا تھا۔محمد رسول اللہ اس کے جوش کو دیکھ کر اس کے پاس تبلیغ کے لئے ٹھیر جاتے تھے کہ کوئی بات اس کے کان میں پڑ جائے تو شاید کسی وقت ہدایت کا موجب بنے تبھی اس نے خود اقرار کیا ہے کہ یہ مجھے سکھاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ جواب میں فرماتا ہے کہ اسے تو عربی بولنی اس قدر نہیں آتی کہ کوئی علمی مضمون بیان کر سکے۔ یہ اتنی ہی مدد کر سکتا ہے کہ انجیل کی عبارتیں عبرانی یا یونانی زبانوں میں آپ کو یاد کرا دے۔لیکن اگر ایسا ہوتا تو قرآن کا ایک حصہ عبرانی یا یونانی ہوتا۔مگر قرآن تو سارا عربی میں ہے۔پھر جبکہ ترجمانی وہ غلام نہیں کر سکتا اور عبرانی یونانی کی عبارتیں قرآن میں موجود نہیں تو سکھایا کس نے اور سیکھا کس نے؟ اس سے زبردست جواب اور کیا ہو سکتا ہے اور اسے بودا کہنے والے کو سوائے متعصب یا موٹی عقل والے کے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

آنحضرت پر جبر غلام سے سیکھنے کا اعتراض

یہ بھی یاد رہے کہ روایت میں دو غلاموں کا ذکر آتا ہے لیکن میں نے ایک غلام کا ذکر کیا ہے۔اس کی دو وجہیں ہیں۔ایک یہ کہ قرآن کریم کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک

غلام کے متعلق اعتراض کیا کرتے تھے۔ دوسرے ایک روایت جس میں ذکر ہے کہ اس شخص سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا تو محمد (صلعم) کو سکھاتا ہے؟ تو اس نے کہا کہ نہیں۔ اس میں بھی ایک ہی آدمی کا ذکر ہے۔ پس خواہ دو غلام ہی اس جگہ اکٹھے کام کرتے ہوں پر شبہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی کے متعلق کیا جاتا تھا۔

آنحضرتؐ کے زمانہ میں انجیل کا عربی ترجمہ نہ ہوا تھا اس جگہ ایک اور سوال بھی غور طلب ہے جو اس اعتراض کے متعلق ہماری صحیح راہنمائی کر سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کیا اس وقت تورات اور انجیل کے عربی تراجم ہو چکے تھے اور وہ اس قدر رائج تھے کہ غلام بھی ان کو کام کے وقت پڑھا کرتے تھے؟ کیونکہ اگر یہ صورت نہ ہو تو عبرانی اور یونانی کتب کی عبارتوں سے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی فائدہ اٹھا سکتے تھے اور نہ وہ غلام خود ہی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ کیونکہ عبداللہ بن سلام کے سوا کسی ایک مسلمان کے متعلق بھی تاریخ سے ثابت نہیں کہ وہ عبرانی جانتا تھا (مسلم کتاب الحدود باب رجم الیھود اھل الذمۃ فی الزنی) اور یونانی سے واقف کا تو تاریخ میں میرے علم میں کوئی ذکر ہی نہیں آتا۔ جہاں تک میری تحقیق ہے اس وقت تک عربی زبان میں تورات اور انجیل کے تراجم نہیں ہوئے تھے۔ اور جب ان کتب کے تراجم نہیں ہوئے تو طالمود وغیرہ جو یہود کی روایتوں کی کتب ہیں ان کے تراجم کس نے کرنے تھے۔ میرے اس خیال کی تائید مندرجہ ذیل دلائل سے ہوتی ہے۔

انجیل کے تراجم کا رواج چودھویں عیسوی سے ہوا (۱) اس وقت تک انجیل کے تراجم کا رواج ہی نہ تھا۔ تراجم کا رواج تیرھویں چودہویں صدی سے شروع ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے مفسرین جنہوں نے تفسیر میں مدد لینے کے لئے ہر قسم کے علوم پڑھ ڈالے تھے جب تورات اور انجیل کے حوالے دینے بیٹھتے ہیں تو بالکل بے ثبوت کہانیاں ان کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ جن کا نام و نشان بھی بائبل میں نہیں ہے جس کی وجہ یہی ہے کہ ان کو عربی کی انجیل میسر نہ تھی۔ اگر عربی میں تورات اور انجیل ہوتی تو کیا یونان کا فلسفہ اور حکمت پڑھنے والے ان کتب کو نہ پڑھتے؟

آنحضرتؐ کے زمانہ میں انجیل یونانی یا عبرانی میں تھی (۲) اسلامی روایات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اناجیل یونانی یا عبرانی زبان میں ہی تھیں۔ بخاری باب بدء الوحی میں ورقہ بن نوفل کے متعلق لکھا ہے قَدْ تَنَصَّرَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَكَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ الْعِبْرَانِيَّ فَيَكْتُبُ مِنَ الْاِنْجِيْلِ بِالْعِبْرَانِيَّةِ مَاشَآءَ اللّٰهُ اَنْ يَكْتُبَ۔ (بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ) یعنی ورقہ عبرانی زبان میں انجیل لکھا کرتے تھے۔

بعض روایات میں بجائے عبرانی کے عربی کا لفظ بھی ہے۔ مگر ہم اس روایت کو ترجیح دینے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ اگر عربی میں تورات وانجیل ہوتی تو بہت سے لوگ اس کے پڑھنے والے نکلتے۔ بلکہ میرے نزدیک تو یہ بھی ممکن ہے کہ عبرانی بھی راوی کی غلطی سے لکھا گیا ہو۔ کیونکہ اس وقت یونانی اناجیل ہی مروج تھیں اور عبرانی انجیل قریباً مفقود ہو چکی تھی۔

(۳) تیسرا ثبوت اس **آنحضرتؐ کے صحابہ میں سے صرف عبداللہ بن سلام ہی عبرانی جانتے تھے** امر کا کہ تورات کا ترجمہ عربی میں نہ ہوا تھا یہ ہے کہ یہودی جن کے بعض قبائل مدینہ میں آکر بس گئے تھے۔ ان کے پاس بھی تورات کا عربی ترجمہ نہ تھا۔ چنانچہ اگر کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی حوالہ کی ضرورت ہوتی تو عبداللہ بن سلام سے آپ کو مدد لینی پڑتی تھی جو عبرانی جانتے تھے (مسلم کتاب الحدود باب رجم الیھود اھل الذمۃ و الزنی)۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عبرانی پڑھنی شروع کی تھی تا کہ وہ تورات اور انجیل کو پڑھ سکیں (مشکوٰۃ المصابیح کتاب الایمان باب الاعتصام بالکتاب و السنۃ)

(۴) چوتھے ثبوت کے طور میں ایک مسیحی مضمون نویس کی شہادت پیش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر الگزنڈر سوٹر۔ ایم۔اے۔ایل۔ایل۔ڈی۔ اپنی کتاب دی ٹیکسٹ اینڈ کینن آف دی نیوٹسٹیمنٹ کے صفحہ ۷۴ پر لکھتے ہیں۔ [۱]

"Arabic versions:

These come partly directly from Greek partly through Syriac and partly through Captic. Muhammad himself knew The Gospel story only orally. The oldest manuscript goes no further back than 8th century........Two versions of the Arabic are reported to have taken place at Alaxendria in the 13th century.

(The Text & Canon of the New Testament By Dr. Alexender Souter .M.A.L.L.D. Pg 74)

انجیل کے عربی تراجم کے عنوان کے نیچے لکھتے ہیں:۔

''ان تراجم کے کچھ ٹکڑے تو براہ راست یونانی سے ہوئے کچھ ٹکڑے سریانی زبان سے ترجمہ ہوئے اور کچھ قبطی زبان سے۔ محمد (صلعم) بھی اناجیل کے متعلق صرف زبانی معلومات رکھتے تھے۔ پرانے سے پرانا ترجمہ عربی

۱؎ پہلے یہ کتاب ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔ اب دوبارہ ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ صفحہ دوسرے ایڈیشن کا دیا گیا ہے۔

کا آٹھویں صدی سے اوپر نہیں جاتا۔'' (رسول کریم صلعم چھٹی صدی میں پیدا ہوئے تھے)۔

پھر لکھتے ہیں کہ بیان کیا جاتا ہے کہ دوترجمے عربی کے تیرہویں صدی میں اسکندریہ کے مقام پر کئے گئے تھے۔

ان دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ انجیل کا عربی ترجمہ اس وقت تک نہ ہوا تھا اور جن لوگوں نے انجیل پڑھنی ہوتی تھی وہ عبرانی یا یونانی میں پڑھا کرتے تھے۔

پس یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا کہ جبر عربی زبان میں تورات اور انجیل پڑھتا تھا اور آپ اس سے سیکھ لیتے تھے۔ وہ عبرانی یونانی زبان کے الفاظ جو اس نے رٹے ہوئے ہوں گے پڑھا کرتا ہوگا۔ پس آپ زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتے تھے کہ اس کے بولے ہوئے لفظوں کو یاد کرلیں۔ مگر اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوسکتا تھا۔

آنحضرتؐ پر کسی شخص سے سیکھنے کے اعتراض کے بعد ارتداد کا ذکر اور اس کی وجہ

آخر میں ایک باریک اشارہ کو بھی واضح کردینا چاہتا ہوں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ جس اعتراض کا ذکر کیا گیا ہے وہ جبر کے متعلق تھا۔ اور وہ اشارہ یہ ہے کہ اس اعتراض کی تفصیلات کے بعد جو سب سے پہلی آیت ہے اس میں مرتدوں کا ذکر ہے اور جبر کی زندگی کے ایک اہم واقعہ کا تعلق بھی ایک مرتد سے ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جبر دل سے مسلمان ہوگئے تھے مگر ظاہر نہ کرتے تھے۔ رسول کریم صلعم جب مدینہ تشریف لے گئے تو ایک شخص کو کاتب وحی مقرر کیا جس کا نام عبداللہ بن ابی سرح تھا۔ یہ وہاں قرآن کریم ہی کے متعلق ایک شبہ میں پڑ کر مرتد ہوگیا۔ اور جب مکہ میں آیا تو لوگوں کو جبر کے مسلمان ہونے کی اطلاع دے دی۔ جس کی وجہ سے سالہا سال تک ان کو سخت تکالیف دی گئیں (العصابۃ ذکر جبر)۔ پس اس اعتراض کے معاً بعد آیت ارتداد رکھ کر ایک باریک اشارہ اس طرف کیا گیا ہے کہ اس متّہم غلام پر ایک زمانہ میں ایک مرتد کی طرف سے بھی ظلم ٹوٹنے والا ہے۔

آنحضرتؐ پر کسی سے سیکھنے کے اعتراض کے جواب میں چار امور

مذکورہ بالا اعتراضات کے بارہ میں بعض اور امور بھی بیان کردیتا ہوں تا حسب ضرورت کام آئیں۔

(۱) قرآن کریم نے کسی ایک فرقہ کو نہیں لیا۔ بلکہ سب سے اختلاف کیا ہے وہ کس فرقہ کا آدمی تھا جو اس کام میں آپ کی مدد کرتا تھا؟ کیا وہ خود اپنے مذہب کے خلاف تعلیم بھی آپ کو سکھاتا تھا؟

(۲) قرآن کریم نے بائبل کے غلط واقعات کی اصلاح کی ہے۔ یہ اصلاح کس غلام کی مدد سے آپ کرسکتے تھے۔ جیسے مثلاً ہارونؑ کا شرک نہ کرنا اور داؤدؑ و سلیمانؑ و نوحؑ کی پاکیزگی ثابت کرنا یہ ایسے واقعات ہیں کہ آج تیرہ سو سال کے بعد یورپین مسیحی مصنف ان کے بارہ میں قرآن کریم کی تائید پر مجبور ہورہے ہیں۔

(۳) آپ نے بائبل کے واقعات کے متعلق بعض نئی باتیں بیان کی ہیں جن کا اس وقت کسی یہودی اور عیسائی فرقہ کو بھی علم نہ تھا لیکن وہ آج سچی ثابت ہو رہی ہیں۔ جیسے فرعون کی لاش کا محفوظ رہنا اور آخر مل جانا۔

(۴) روایات سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلعم چوتھے یا پانچویں سال بعد دعویٰ کے اس غلام کے پاس کھڑے ہوا کرتے تھے کیونکہ روایات میں آتا ہے کہ جب آنحضرت صلعم کا بائیکاٹ ہوا ہے اس وقت اس کے پاس کھڑے ہوا کرتے تھے لیکن قرآن کریم کی بعض سورتیں اس واقعہ سے پہلے اتر چکی تھیں اور ان میں عیسائیوں کا ذکر موجود تھا جیسے سورۃ طٰہٰ سورۃ فرقان۔ کہف۔ مریم وغیرہ۔ چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ جو بالکل ابتدائی زمانہ میں اسلام لانے والے ہیں فرماتے ہیں کہ سورۃ بنی اسرائیل۔ کہف۔ سورۃ طٰہٰ۔ سورۃ مریم۔ سورۃ انبیاء اِنَّ هُنَّ مِنَ الْعِتَاقِ الْاَوَّلِ وَهُنَّ مِنْ تِلَادِیْ (بخاری کتاب التفسیر سورۃ الانبیاء) یہ قرآن کریم کی ابتدائی سورتوں میں سے ہیں اور میرا پرانا مال ہیں یعنی میں نے ابتداء اسلام میں یہ سورتیں یاد کی تھیں۔ ان سورتوں میں کثرت سے یہودیوں اور عیسائیوں کے واقعات آتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا یَهْدِیْهِمُ اللّٰهُ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۰۵﴾

جو لوگ اللہ (تعالیٰ) کے نشانوں پر ایمان نہیں لاتے انہیں اللہ (تعالیٰ) ہدایت نہیں دیتا اور ان کے لئے دردناک عذاب (مقدر) ہے۔

حلّ لُغَات۔ اَلْعَذَابُ اَلْعَذَابُ کے معنوں کے لئے دیکھو حجر آیت نمبر ۵۱۔

اَلْعَذَابُ: كُلُّ مَاشَقَّ عَلَى الْاِنْسَانِ وَمَنَعَهٗ عَنْ مُرَادِهٖ۔ عذاب کے معنی ہیں جو انسان پر شاق گذرے اور حصول مراد سے اسے روک دے وَفِی الْكُلِّيَّاتِ كُلُّ عَذَابٍ فِی الْقُرْاٰنِ فَهُوَ التَّعْذِيْبُ اِلَّا وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ فَاِنَّ الْمُرَادَ الضَّرْبُ۔ اور کلیات میں لکھا ہے کہ عذاب سے مراد قرآن مجید میں عذاب دینا ہوتا ہے سوائے آیت وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا کے۔ وہاں سزا مراد ہے۔ (اقرب)

اَلْاَلِیْمُ اَلْاَلِیْمُ اَلْمُوْجِعُ دکھ دینے والا۔ (اقرب)

تفسیر ۔یعنی چونکہ یہ لوگ ایسی زبردست آیتوں اور نشانوں کے ہوتے ہوئے بھی ایسے بیہودہ اعتراض کرتے ہیں ۔اور ایسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم پر بجائے ایمان لانے کے اس پر ہنسی کرتے ہیں۔اس لئے یہ لوگ ضرور سزا پائیں گے۔

إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ

جھوٹ وہی لوگ باندھا کرتے ہیں جو اللہ (تعالیٰ) کے نشانوں پر ایمان نہیں رکھتے اور یہی لوگ جھوٹ بولنے میں

اللَّهِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَاذِبُونَ ﴿١٠٦﴾

کامل ہوتے ہیں۔

تفسیر ۔ محمد رسول اللہ کی مسلمہ سچائی اس امر کا ثبوت ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ پر افتراء نہیں کیا اس جگہ رسول کریم صلعم کی زندگی کو بطور نمونہ کے پیش کیا ہے۔اور کہا ہے کہ خدا تعالیٰ پر جھوٹ تو وہی شخص بنا سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ کی طاقت پر ایمان نہ ہو۔مگر محمد رسول اللہ کو دیکھو کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی عظمت دنیا میں قائم کر رہے ہیں اور نہ صرف خود بلکہ لوگوں کو بھی یہی تعلیم دے رہے ہیں کہ اس کی تعظیم کرو۔اس لئے ایسے شخص پر اعتراض کرنا کسی سیاہ دل کا ہی کام ہے۔دوسرے یہ کام ایک عادی جھوٹے شخص کے سوا دوسرا شخص نہیں کرسکتا اور محمد رسول اللہ کی سچائی کے گواہ تو تم بھی ہو۔

مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ

جو لوگ (بھی) اپنے ایمان لانے کے بعد اللہ (تعالیٰ) کا انکار کریں مگر وہ نہیں جنہیں (کفر پر) مجبور کیا گیا ہو اور ان

مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلَٰكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا

کا دل ایمان پر مطمئن ہو بلکہ وہ جنہوں نے (اپنا) سینہ کفر کے لئے کھول دیا ہو ان پر اللہ (تعالیٰ)

فَعَلَيۡهِمۡ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۰۷﴾

کا (بہت) بڑا غضب (نازل) ہوگا اور ان کے لئے بڑا (بھاری) عذاب (مقدر) ہے۔

حلّ لُغات۔اُکْرِہَ اُکْرِہَ اَکْرَہَ سے مجہول کا صیغہ ہے۔اور اَکْرَھَہٗ عَلَی الْاَمْرِ کے معنے ہیں۔حَمَلَہٗ عَلَیْہِ قَھْرًا۔کسی کو کسی کام پر زبردستی آمادہ کیا۔اَکْرَہَ فُلَانًا: حَمَلَہٗ عَلٰی اَمْرٍ یَکْرَھُہٗ۔اس کو کسی ایسے کام پر آمادہ کیا جس کو وہ ناپسند کرتا تھا۔وَقِیْلَ عَلٰی اَمْرٍ لَا یُرِیْدُہٗ طَبْعًا اَوْ شَرْعًا۔اور بعض کہتے ہیں۔اَکْرَہَ فُلَانًا کے معنے ہیں کہ اس نے اسے ایسے کام پر آمادہ کیا جس کو وہ طبعاً یا مذہباً ناپسند کرتا تھا۔اس سے اسم فاعل مُکْرِہٌ اور اسم مفعول مُکْرَہٌ آتا ہے۔(اقرب)

پہلے حصہ میں واحد کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔لیکن ان پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا سے جمع کے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی میں مَنْ جمع کے لئے بھی آتا ہے اور مفرد کے لئے بھی۔اور چونکہ یہ لفظ مفرد ہے۔بعض دفعہ اس کے بعد مفرد کے صیغے استعمال ہوتے ہیں مگر مراد جمع ہوتی ہے۔ایسا ہی یہاں ہوا ہے۔اس لئے معنوں کے مطابق اردو میں مفرد کی جگہ جمع کے صیغے استعمال کئے گئے ہیں۔ورنہ ترجمہ غلط ہو جاتا۔(مفردات)

قَلْبٌ قَلْبٌ اَلْفُؤَادُ۔دل۔وَقَدْ یُطْلَقُ عَلَی الْعَقْلِ۔اور کبھی قلب کا لفظ عقل کے لئے استعمال ہوتا ہے اس کی جمع قُلُوْبٌ آتی ہے۔(اقرب)

مُطْمَئِنٌّ مُطْمَئِنٌّ اِطْمَأَنَّ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔اور اِطْمَئَنَّ کے معنوں کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۲۹۔

تَطْمَئِنُّ اِطْمَأَنَّ سے مضارع مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور اِطْمَئَنَّ اِلٰی کَذَا کے معنے ہیں سَکَنَ وَ آمَنَ لَہٗ۔سکون پکڑا اور تسلی پائی۔(اقرب)

اَلْغَضَبُ اَلْغَضَبُ ثَوَرَانُ دَمِ الْقَلْبِ اِرَادَۃَ الْاِنْتِقَامِ۔سزا دینے کے غرض سے دل کے خون کے جوش مارنے کا نام غضب ہے۔وَاِذَا وُصِفَ اللّٰہُ تَعَالٰی بِہٖ فَالْمُرَادُ بِہِ الْاِنْتِقَامُ دُوْنَ غَیْرِہٖ۔اور جب غضب کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنے صرف سزا دینے کے ہوتے ہیں۔جوش وغیرہ کے معنے اس میں نہیں پائے جاتے۔(مفردات)

تفسیر۔اس ضمنی اعتراض کا جواب دے کر کہ جب انہیں آئندہ زمانہ کی ترقیات کی پیشگوئیوں کی طرف

توجہ دلائی جاتی ہے اور دلائل سے بتایا جاتا ہے کہ اس قسم کے روحانی حشر ہمیشہ دنیا میں ہوتے آئے ہیں تو کفار اس بات سے فائدہ اٹھا کر کہ آئندہ کی پیشگوئیاں گذشتہ انبیاء کے واقعات کے پردہ میں بیان کی گئی ہیں جھٹ کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو پہلے ہی جانتے ہیں کہ یہ قرآن کسی دوسرے شخص کا سکھایا ہوا ہے۔ وہ دوسری کتب کی باتیں ان کو سکھا دیتا ہے۔ اب پھر ترقیات کے ذکر کی طرف بات کو پھرایا گیا ہے اور ادھر توجہ دلائی ہے کہ ترقیات کے ساتھ امن ہی حاصل نہیں ہوتا بلکہ بعض قسم کے فتنے بھی پیدا ہوجاتے ہیں۔ مخالفوں میں بھی مخالفت کا زیادہ جوش پیدا ہوجاتا ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں اپنے ایمانوں کا خاص طور پر خیال رکھنا۔ اور بتایا ہے کہ جو شخص کسی دنیوی غرض کی وجہ سے مرتد ہوگا وہ بڑے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔

آیت مَنْ شَرَحَ میں عبداللہ بن ابی سرح کے ارتداد کی پیشگوئی میرے نزدیک اس آیت میں عبداللہ بن ابی سرح کے ارتداد کی پیشگوئی ہے۔ اور پہلی آیات سے اس آیت کا جو ربط میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی ربط حاصل ہے کہ جبر کی وجہ سے جو اعتراض ہوا تھا اس میں بھی قرآن کریم کے انسانی کلام ثابت کرنے کی کوشش کا ذکر تھا۔ اور یہ مرتد جس کا یہاں ذکر ہے اس نے بھی ارتداد اسی دلیل پر کیا تھا کہ قرآن خدائی کلام نہیں۔ انسانوں کا بنایا ہوا کلام ہے۔

یہ پیشگوئی ایک زبردست پیشگوئی ہے۔ اور چونکہ مکہ میں کی گئی اور ان حالات میں کی گئی کہ عبداللہ کو ابھی کاتب وحی مقرر نہ کیا گیا تھا۔ پھر اس میں اشارۃً وجہ ارتداد بھی بتائی گئی کہ اسے قرآن کریم کے الہامی ہونے کے بارہ میں شبہ ہوگا۔ اس لئے اس کی عظمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

یہ جو آگے فرمایا ہے کہ جو مجبوراً ارتداد کرے اس پر اتنا عذاب نہیں۔ شاید یہ اشارہ جبر ہی کی طرف ہو۔ اور ممکن ہے کہ ظلم کی وجہ سے وہ دلیری سے اسلام کا اظہار نہ کر سکے ہوں۔ گو بعض روایات میں عمار کے متعلق اس کو چسپاں کیا جاتا ہے مگر مضمون کی ترتیب کو دیکھتے ہوئے جبر پر یہ واقعہ زیادہ چسپاں ہوتا ہے (تفسیر کبیر لامام رازی زیر آیت ھذا)۔

مسیحیوں نے اس آیت پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام بزدلی کی تعلیم دیتا ہے اور ظلم کے موقعہ پر ارتداد کی اجازت دیتا ہے (تفسیر القرآن از پادری ویری)۔ لیکن یہ اعتراض بھی ان کے دوسرے اعتراضوں کی طرح غلط ہے۔ کیونکہ اس جگہ سے یہ ہرگز نہیں نکلتا کہ اللہ تعالیٰ اس فعل کو معاف کر دے گا۔ اس جگہ تو صرف یہ کہا ہے کہ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ والے کے متعلق اس آیت میں حکم نہیں بیان کیا گیا۔ اور سزا سے مستثنیٰ نہیں بتایا گیا۔ بلکہ اس گروہ کو علیحدہ قرار دے کر یہ کہا ہے کہ اس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَ اَنَّ

(اور) ایسا اس سبب سے ہوگا کہ انہوں نے اس ورلی زندگی سے محبت کر کے اسے آخرت پر مقدم کر لیا اور (نیز اس

اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

وجہ سے) کہ اللہ (تعالیٰ) کفر اختیار کرنے والے لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

حلّ لُغَات ۔اِسْتَحَبُّوْا اِسْتَحَبُّوْا اِسْتَحَبَّ سے جمع کا صیغہ ہے اور اِسْتَحَبَّہٗ کے معنے اَحَبَّہٗ اس سے محبت کی ۔اِسْتَحْسَنَہٗ اس کو پسند کیا ۔اِسْتَحَبَّ الْکُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ کفر کو ایمان پر ترجیح دی (اقرب) پس اِسْتَحَبُّوا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَۃِ کے معنے ہوں گے کہ انہوں نے اس ورلی زندگی سے محبت کر کے اسے آخرت پر ترجیح دی۔

تفسیر ۔ اسلام سے بے زاری کسی دنیوی فائدہ کے لئے ہی ہوسکتی ہے اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اسلام چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ایک صداقت ہے ۔اس سے بیزار ہو کر کوئی مرتد نہیں ہوسکتا۔ جو ہوگا دنیوی اغراض سے ہوگا۔ اور ایسا آدمی خدا تعالیٰ سے کسی نیک سلوک کا کب امیدوار ہوسکتا ہے۔

اس آیت سے عبداللہ کے اس دعویٰ کو رد کیا ہے کہ میں یہ دیکھ کر کہ قرآن انسانی کلام ہے مرتد ہوا ہوں ۔اور بتایا ہے کہ یہ شخص ظاہر کچھ اَور کرے گا مگر اصل وجہ دنیاوی لالچ ہوگی ۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ سَمْعِهِمْ وَ

یہ وہ لوگ ہیں جن (کے کفر کی وجہ سے ان) کے دلوں اور ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں پر اللہ (تعالیٰ) نے مہر

اَبْصَارِهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ

لگا دی ہے اور یہ لوگ ہی ہیں جو پکے غافل ہیں ۔(اور) اس میں کوئی شک نہیں کہ وہی

فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

آخرت میں (سب سے) زیادہ نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔

حلّ لُغَات۔ طَبَعَ عَلَیْہِ کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۷۵۔

طَبَعَ الشَّیْءَ: صَوَّرَہٗ بِصُوْرَةٍ مَّا اس کی کوئی صورت یا شکل بنائی۔ عَلَیْہِ: خَتَمَ مہر لگائی۔ اللّٰہُ الْخَلْقَ خَلَقَھُمْ پیدا کیا۔ السَّیْفَ عَمِلَہٗ وَصَاغَہٗ بنایا۔ اَلدِّرْھَمَ نَقَشَہٗ وَسَکَّہٗ مضروب کیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ یعنی جو لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر دین حق کو نہیں چھوڑتے بلکہ دوسری اغراض کے ماتحت ایسا کرتے ہیں۔ ان کی آنکھوں، کانوں اور دلوں پر مہر لگ جاتی ہے کیونکہ وہ بدترین نمونہ اخلاق کا پیش کرتے ہیں۔ اور ایک بڑی نعمت کو محض چھوٹے سے فائدے کے لئے قربان کر دیتے ہیں۔ لَاجَرَمَ اَنَّھُمْ الخ۔ یعنی جب ایسے شخصوں کو ہم اس دنیا میں ذلیل کریں گے تو اس میں تو کوئی شبہ رہتا ہی نہیں کہ وہ آخرت میں بھی عذاب پائیں گے کیونکہ ایسے گناہوں کی سزا کا اصل مقام وہی ہے۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّکَ لِلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ

اور تیرا رب یقیناً ان لوگوں کے لئے جو دکھ میں ڈالے جانے کے بعد ہجرت کر گئے پھر انہوں نے جہاد کیا اور (اپنے

جٰهَدُوْا وَ صَبَرُوْۤا ۙ اِنَّ رَبَّکَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ

عہد پر) ثابت قدم رہے (ہاں) تیرا رب یقیناً اس (شرط کو پورا کرنے) کے بعد (ان کے لئے) بہت بخشنے والا

رَّحِیْمٌ ﴿۱۱۱﴾ ع

(اور) بار بار رحم کرنے والا (ثابت) ہوگا۔

حلّ لُغَات۔ فُتِنُوْا فُتِنُوْا فَتَنَہٗ سے مجہول کا صیغہ ہے۔ اور فَتَنَ (فَتْنًا وفُتُوْنًا) زَیْدٌ عَمْرًا کے معنے ہیں اَوْقَعَہٗ فِی الْفِتْنَةِ فَفَتَنَ هُوَ اَیْ وَقَعَ فِیْھَا اس کو فتنہ میں ڈالا اور وہ فتنہ میں پڑ گیا۔ (لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے)

فَتَنَهٗ کے معنے ہیں اَعْجَبَهٗ ۔ وہ اس کو پسند آیا ۔ اَلْمَالُ النَّاسَ: اِسْتَمَا لَهُمْ ۔ مال نے لوگوں کو اپنی طرف مائل کرلیا ۔ فَتَنَهٗ فِتْنَةً: خَبَرَهٗ اس کو آزمایا ۔ فُلَانًا: اَضَلَّهٗ اس کو گمراہ کیا ۔ فَتَنَ فُلَانًا عَنْ رَأْيِهٖ صَدَّهٗ ۔ اس کو اس کی رائے سے روکا ۔ فَتَنَ الصَّائِغُ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ: اَذَابَهُ وَاَحْرَقَه بِالنَّارِ لِيُبَيِّنَ الْجَيِّدَ مِنَ الرَّدِيْءِ وَيُعْلَمَ اَنَّهٗ خَالِصٌ اَوْ مَشُوْبٌ ۔ سنار نے سونے کو آگ میں ڈال کر پگھلایا تاکہ اس کے کھرے اور کھوٹے کو معلوم کرے ۔ اور فُتِنَ الرَّجُلُ فِيْ دِيْنِهٖ کے معنے ہیں مَالَ عَنْهُ اپنے دین سے علیحدہ ہو گیا ۔ فُتِنَ فُلَانٌ اَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ فذَهَبَ مَالُهٗ اَوْ عَقْلُهٗ اس پر مصیبت نازل ہوئی اور اس کی وجہ سے اس کا مال یا عقل جاتی رہی ۔ وَ كَذَالِكَ اِذَا اخْتُبِرَ اور جب کسی کا امتحان لیا جائے تو فُتِنَ صیغہ مجہول اس کے لئے استعمال ہوتا ہے (اقرب) پس فُتِنُوْا کے ایک معنے یہ ہوں گے کہ انہیں دکھ میں ڈالا گیا۔

جَاهَدُوْا جَاهَدُوْا جَاهَدَ سے جمع کا صیغہ ہے ۔ اور جَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (مُجَاهَدَةً وَجِهَادًا) کے معنے ہیں ۔ بَذَلَ وُسْعَهٗ اللہ کے دین کے لئے انتہائی کوشش کی ۔ جَاهَدَ الْعَدُوَّ ۔ قَاتَلَهٗ دشمن سے لڑا ۔ (اقرب)

پس جَاهَدُوْا کے معنے ہوں گے (۱) انہوں نے جہاد کیا (۲) انہوں نے اللہ کے دین کے لئے کوشش کی ۔

تفسیر ۔ **اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ کے ماتحت توبہ قبول کئے جانے والوں کے لئے چار شرائط** اس آیت میں ان لوگوں کا حکم بتایا گیا ہے جن کو پہلے اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ کے الفاظ سے مستثنیٰ بتایا گیا تھا ان کا حکم یہ بتاتا ہے کہ اگر کسی سے ایسی غلطی ہو جائے کہ وہ ظلم کی برداشت نہ کر کے ظاہراً ارتداد کرلے گو دل میں مطمئن ہو تو اس کے لئے یہ حکم ہے کہ اول وہ اس مقام کو چھوڑ دے جہاں اُسے لوگوں سے دب کر ارتداد کرنا پڑا۔

(۲) دوسرے وہ دین کی اشاعت میں لگ جائے اور اپنے آپ کو دین کے لئے گویا وقف کر دے۔

(۳) تیسرے یہ مجاہدہ بند نہ کرے بلکہ استقلال سے اس پر قائم رہے ۔ اور اپنے ظاہری ارتداد کے بدلہ میں دوسرے لوگوں کو ہدایت دینے کی کوشش کرے۔

(۴) آئندہ اس سے پھر ایسی خطا ظاہر نہ ہو ۔ اگر وہ ان باتوں پر عمل کرے تو فرماتا ہے کہ ان سب کاموں کے کر لینے کے بعد تیرا رب اس شخص کو معاف فرما دے گا۔

ان قربانیوں کے بعد توبہ قبول کرنے کا حکم ہوتے ہوئے مسیحی مصنفوں کا یہ لکھنا کہ اسلام نے ظلم کے وقت ظاہری انکار کی اجازت دی ہے ان مظالم میں سے ایک ظلم ہے جو مسیحی پادری اسلام پر کرتے چلے آتے ہیں۔

(تفسیر القرآن از ویری جلد ۳ صفحہ ۴۷)

يَوْمَ تَأْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَ تُوَفّٰى كُلُّ

(اس جزا کا ظہور خصوصیت سے اس دن ہوگا) جس دن ہر شخص اپنی جان کے متعلق جھگڑتا ہوا آئے گا اور ہر شخص نے

نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

جو کچھ کیا ہوگا (اس کا اجر) اسے پورا پورا دیا جائے گا اور ان پر (کسی رنگ میں بھی) ظلم نہ کیا جائے گا۔

حلّ لُغات۔ تُجَادِلُ تُجَادِلُ جَادَلَ سے واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اور جَادَلَهٗ (مُجَادَلَةً وَ جِدَالًا) کے معنے ہیں خَاصَمَهٗ شَدِيْدًا اس نے اس سے سخت جھگڑا کیا۔ (اقرب)

پس يَوْمَ تَأْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا کے معنے ہوں گے جس دن ہر شخص اپنی جان کے متعلق جھگڑتا ہوا آئے گا۔

تُوَفّٰى تُوَفّٰى وَفّٰى (باب تفعیل) سے مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اور وَفّٰى کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۱۰۵۔

يَتَوَفّٰى کا مادہ وَفٰى اور ماخذ وَفَاةٌ ہے اور یہ باب تفعّل سے فعل مضارع ہے۔ وفات کے معنی موت کے ہیں اور تَوَفّٰى کے معنی موت وارد کرنے اور جان نکال لینے کے ہیں۔ اقرب الموارد میں ہے تَوَفَّى اللهُ زَيْدًا: قَبَضَ رُوْحَهٗ اللہ تعالیٰ نے زید کی روح قبض کرلی یا جان نکال لی۔ تُوُفِّيَ فُلَانٌ مَجْهُوْلًا قُبِضَتْ رُوْحُهٗ وَمَاتَ۔ تُوُفِّيَ بصیغہ مجہول کے معنی ہیں اس کی جان نکال لی گئی اور وہ مرگیا۔ فَاللهُ الْمُتَوَفِّيْ وَالْعَبْدُ الْمُتَوَفّٰى۔ غرض اللہ تعالیٰ مُتَوَفِّيْ یعنی وفات دینے والا ہوتا ہے اور انسان مُتَوَفّٰى یعنی وفات پانے والا۔

اور قاموس میں ہے اَوْفٰى فُلَانًا حَقَّهٗ وَوَفَّاهُ وَوَافَاهُ فَاسْتَوْفَاهُ وَتَوَفَّاهُ وَالْوَفَاةُ الْمَوْتُ وَتَوَفَّاهُ اللهُ قَبَضَ رُوْحَهٗ کہ جو لفظ تَوَفّٰى اِسْتِيْفَاءٌ یعنی پورا پورا لینے کے معنی دیتا ہے وہ اِيْفَاءٌ تَوْفِيَةٌ اور مُوَافَاةٌ کا مطاوع اور لفظ وَفٰى سے ماخوذ ہوتا ہے۔ اور اس کا مفعول کوئی حق یا کوئی مالیت ہوتی ہے۔ اور جس لفظ تَوَفّٰى کے معنی قبض روح کے ہوتے ہیں وہ لفظ وَفَاةٌ سے ماخوذ ہوتا ہے۔ جس کے معنی موت کے ہیں اور تَوَفَّاهُ اللهُ کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ نے اس کی روح قبض کرلی۔ یعنی جان نکال لی۔ اور کلّیات ابوالبقاء میں ہے وَالْفِعْلُ مِنَ الْوَفَاةِ یعنی یہ فعل لفظ وَفَاةٌ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی موت کے ہیں۔

تفسیر ۔ یَوْمَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ کا ظرف ہے۔مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن جب ہر شخص اپنے انجام کی اہمیت سمجھ کر پورا زور لگائے گا کہ کسی طرح میں گرفتاری سے بچ جاؤں اس وقت اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے جو کمزوری دکھا کر بعد میں ساری عمر اصلاح اور قربانی وغیرہ میں لگے رہیں گے غفور رحیم کا سلوک کرے گا۔

آیت ارتداد سے بزدلی سیکھانے کا اعتراض کرنے والوں کو جواب جو لوگ آیت ارتداد سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس میں بزدلی کی تعلیم دی گئی ہے۔ان آیات پر غور کریں کہ کتنی بڑی قربانی ایسے لوگوں سے چاہی گئی ہے۔جو شخص اس قربانی کی اہمیت کو سمجھے گا وہ امتحان کے موقعہ پر بزدلی دکھائے گا ہی کیوں۔کیونکہ بزدل آدمی اس قدر قربانی کرنے کی طاقت کہاں رکھتا ہے کہ ترک وطن کرے۔جہاد فی سبیل اللہ کرے اور اپنے نفس کو ساری عمر اس کام میں لگائے رکھے۔ان کاموں کی توفیق تو وہی پائے گا جن سے کسی عارضی غفلت کی وجہ سے غلطی ہو گئی ہو یا جو بعد میں سچی توبہ کر چکا ہو۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مرتد کا دوبارہ مسلمان ہونا حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک مرتد مدعی نبوت دوبارہ مسلمان ہوا۔اس سے جو آپ نے سلوک کیا وہ گویا اس آیت کی تفسیر ہے۔اس شخص کا نام طلیحہ ابن خویلد اسدی تھا۔یہ مسلمانوں کے خلاف بعض جنگوں میں شامل ہوا تھا۔کچھ عرصہ کے بعد اس نے اسلام میں داخل ہونا چاہا۔مگر حضرت عمرؓ نے اس کو معاف نہ کیا۔ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک صحابی شرحبیل بن حسنہؓ (جو بظاہر بہت دبلے پتلے اور کمزور تھے مگر فنِ جنگ کے بڑے ماہر تھے) ایک لڑائی میں ایک کافر سردار کے ساتھ لڑ رہے تھے کہ اس سردار نے یہ دیکھ کر کہ تلوار کی جنگ میں مَیں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا جلدی سے آگے بڑھ کر ان کو کمر سے پکڑ لیا اور نیچے گرا کر چھاتی پر چڑھ گیا۔قریب تھا کہ وہ آپ کو قتل کر دیتا کہ طلیحہ بن خویلد جو دل سے مسلمان ہو چکا تھا لیکن بوجہ حضرت عمرؓ کے توبہ قبول نہ کرنے کے اب تک کفار ہی میں شامل تھا۔اس نظارہ کو دیکھ کر اپنے ایمان کو چھپا نہ سکا اور آگے بڑھ کر اس کافر سردار پر تلوار کا ایسا وار کیا کہ اس کا سر تن سے جدا ہو گیا اور حضرت شرحبیلؓ کی جان بچ گئی۔اس واقعہ سے باقی مسلمان بہت متاثر ہوئے۔اور انہوں نے حضرت عمرؓ کے پاس سفارش کی کہ اسے معاف کر دیا جائے۔اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں اس شرط پر معاف کرتا ہوں کہ یہ شخص اپنی ساری بقیہ زندگی جہاد میں گزارے اور اسلامی مملکت کی سرحدوں پر زندگی بسر کرے۔چنانچہ وہ ہمیشہ سرحد پر ہی رہتے تھے اور کفار سے لڑائی کرتے رہتے تھے آخر اسی حالت میں وفات پا گئے گو اس شخص نے جان بوجھ کر ارتداد کیا تھا مگر معلوم ہوتا ہے حضرت عمرؓ نے اسی آیت سے استدلال کر کے اس کے مشابہ حکم اس کو دے دیا۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً

اور اللہ (تعالیٰ) نے (تمہیں سمجھانے کے لئے) ایک بستی کا حال بیان کیا ہے جسے (ہر طرح سے) امن حاصل

يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ

ہے (اور) اطمینان نصیب ہے ہر طرف سے اس کا رزق اسے بافراغت پہنچ رہا ہے۔ پھر (بھی) اس نے

اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا

اللہ (تعالیٰ) کی نعمتوں کی ناشکری کی ہے اس (کی اس ناشکری) پر اللہ (تعالیٰ) نے اس (کے باشندوں) پر ان

يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

کے اپنے (گھنونے) عمل کی وجہ سے بھوک اور خوف کا لباس نازل کیا اور اس کا مزہ چکھایا۔

حلّ لُغات۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا کے معنوں کے لئے دیکھو ابراہیم آیت نمبر ۲۵۔ ضَرَبَ لَهٗ مَثَلًا کے معنے ہیں وَصَفَهٗ وَقَالَهٗ وَبَيَّنَهٗ مثل کو بیان کیا۔ اور اچھی طرح سے واضح کیا۔

رَغَدًا رَغَدَ عَيْشُهٗ رَغَدًا کے معنے ہیں طَابَ وَاتَّسَعَ اس کی زندگی خوشگوار اور کشادہ ہوگئی وَعَيْشَةٌ رَغَدٌ کے معنی ہیں واسعةٌ طَيِّبَةٌ آسودہ زندگی۔ (اقرب)

اَذَاقَ اَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ۔ اَذَاقَ ذَاقَ سے بنا ہے۔ ذَاقَ الْعَذَابَ وَالْمَكْرُوْهَ کے معنے ہیں نَزَلَ بِهٖ فَقَاسَاهُ اس پر مصیبت نازل ہوئی اور اس نے سہی۔ اَذَاقَهٗ: صَيَّرَهٗ يَذُوْقُ اسے چکھایا۔ (اقرب) پس اَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ کے معنے ہوں گے اللہ نے اس پر بھوک کا عذاب نازل کیا اور اس کو اس کا مزہ چکھایا۔

تفسیر۔ اس آیت میں مکہ کے متعلق پیشگوئی فرمائی ہے۔ اس سے پہلے کفر اور اسلام کا مقابلہ کیا گیا تھا۔ مگر کفار کے دل میں یہ خیال ہو سکتا تھا کہ شاید مکہ بوجہ اس تقدس کے جو اسے حاصل ہے مغلوب ہونے سے محفوظ رہے کیونکہ قریب زمانہ میں ابرہہ کے لشکر کی شکست کے ذریعہ وہ مکہ کی حفاظت کا نظارہ دیکھ چکے تھے ان کے اس جھوٹے اطمینان کو بھی اس آیت میں رد کر دیا گیا ہے فرماتا ہے کہ مکہ بھی ایسے مجرموں کو نہیں بچا سکتا۔ مکہ کا امن بھی

خوف اور قحط سے جاتا رہے گا۔ کیونکہ ساکنین مکہ کے اعمال انہیں فضل الٰہی سے محروم کر رہے ہیں۔

یہ دونوں عذاب ہجرت کے بعد مکہ والوں پر آئے۔ خوف تو جنگوں کا لازمی نتیجہ ہے۔ بھوک کا عذاب بھی آیا جبکہ ان کے کئی قافلے مسلمانوں کے ہاتھ پڑے اور ان کی ضرورتوں کے سامان جنگوں میں ان کے ہاتھوں سے چھین لئے گئے۔

عذاب کے ساتھ لباس کا ذکر لانے کی وجہ لباس کا لفظ اس امر کے بتانے کے لئے استعمال فرمایا ہے کہ دونو عذاب سخت ہوں گے اور ان کے بدن پر ان کے آثار ظاہر ہونے لگیں گے۔ دبلے ہو جائیں گے زرد پڑ جائیں گے۔ گویا بھوک اور خوف کے اثرات ان کے جسم کو اس طرح ڈھانپ لیں گے جس طرح لباس جسم کو ڈھانک لیتا ہے۔

وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ

اور یقیناً ان کے پاس انہی میں سے (ہمارا) ایک رسول آچکا ہے مگر انہوں نے اسے جھٹلایا جس پر اس حالت میں کہ

الْعَذَابُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

وہ ظلم کر رہے تھے (ہمارے) عذاب نے انہیں آ پکڑا۔

تفسیر۔ اس آیت میں اور وضاحت کر دی ہے کہ یہاں سے مکہ والے ہی مراد ہیں۔ فرمایا اس بستی والوں پر حجت پوری ہو گئی انہیں سمجھانے کے لئے رسول آیا پھر وہ رسول بھی ان میں سے تھا باہر سے نہ تھا کہ کہہ دیتے ہم اس کے حالات سے واقف نہیں اس کے سچ اور جھوٹ کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ مگر باوجود اس کی خیر خواہی کے اور اس کے اخلاق حمیدہ کے معلوم ہونے کے انہوں نے اس کی تکذیب کی جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ کر دیا۔ یہاں دو الزام ان پر لگائے ہیں۔ ایک تو یہ کہ خدا کے رسولؐ کا انکار کیا۔ دوسرے اپنے مشاہدہ کا انکار کیا کہ باوجود رسول کریم صلعم کی صداقت سے واقف ہونے کے آپ کے دعوے کے منکر ہو گئے۔ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ میں بتایا کہ عذاب ان کے ظلم ہی کی حالت میں ان کو پکڑ لے گا۔ یعنی یوں نہ ہو گا کہ ان کے اعمال کے بدلے ان کی اولادوں سے لئے جائیں بلکہ ان کے اعمال کی سزا یہ ظالم خود ہی بھگتیں گے۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّ اشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ

پس جو حلال (اور) طیب (مال) اللہ (تعالیٰ) نے تمہیں دیا ہے تم اس میں سے کھاؤ اور اللہ (تعالیٰ) کی نعمت کا اگر تم

اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۵﴾

اسی کی عبادت کرتے ہو شکر کرو۔

تفسیر۔ پہلی آیت میں کفار کے لئے بھوک اور خوف کے عذاب کی خبر دی تھی۔ اب اس آیت میں مومنوں کے لئے فراخیِ رزق اور فراغتِ بال کی خبر دی۔ اور فرمایا کفار کا رزق چھینا جائے گا۔ مسلمانوں کا بڑھایا جائے گا۔ مگر ایک فرق بھی ہوگا کہ کفار تو جائز ناجائز سب ذرائع سے مال کماتے تھے۔ مسلمانوں کو حلال رزق ملے گا جو طیب بھی ہوگا۔ یعنی صحتوں کو اچھا کرنے والا ہوگا۔ اس میں خوف کی بھی نفی کی۔ کیونکہ کھانا جسم کو تبھی فائدہ پہنچاتا ہے جب غم اور خوف نہ ہو۔ پس طیب رزق یعنی جسم اور دماغ اور دل کو تقویت اور صحت بخشنے والے کھانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ ان کے دلوں کو غم اور خوف سے اللہ تعالیٰ نجات دے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر کرو کے الفاظ میں بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ تم کو بافراغت کھانا اور مطمئن دل عطا فرمائے ہیں۔ پس اس ظاہری باطنی نعمت کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

خدا تعالیٰ کے لئے شکر ادا کرنے پر ایک اعتراض اور اس کا جواب بعض لوگ شکر پر اعتراض کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو کسی کے شکر کی کیا احتیاج ہے؟

اول تو یہ اعتراض فضول ہے کیونکہ شکر ایک طبعی اظہار ہے جو ہر احسان کے بعد شریف آدمی کا دل اپنی ممنونیت بتانے کے لئے کرتا ہے۔ اس کے پیدا ہونے میں ضرورت یا عدم ضرورت کا کوئی سوال ہی نہیں۔

دوسرے جیسا کہ اس آیت میں بتایا گیا ہے شکر سے توحید کا عقیدہ مضبوط ہوتا ہے۔ جس طرح ظاہر جسم کو ایک ہی قسم کا کام کرنے سے عادت پڑ جاتی ہے اسی طرح قلب اور دماغ کو بھی متواتر ہونے والے سے اعمال کی عادت پڑ جاتی ہے۔ پس جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر بجالاتے رہتے ہیں ان کے دماغ پر اور دل پر ایک مستقل اثر باقی رہ جاتا ہے۔ اور ہر نعمت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کے وہ عادی ہو جاتے یں۔ اور مشرکانہ خیال سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ

اس نے تم پر صرف مردار کو خون کو اور سؤر کے گوشت کو اور (ہر) اس چیز کو حرام کیا ہے جس پر اللہ (تعالیٰ) کے سوا کسی

مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ

اور کا نام لیا گیا ہو اور جو شخص (ان میں سے کسی چیز کے کھانے پر) مجبور کیا جائے بحالیکہ وہ نہ باغی ہو اور نہ حد سے

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۶﴾

بڑھنے والا ہو تو (یاد رہے کہ) اللہ (تعالیٰ) یقیناً بہت ہی بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

حلّ لُغَات۔ اُھِلَّ اَھَلَّ سے مجہول کا صیغہ ہے اور اَھَلَّ الْقَوْمُ الْھِلَالَ کے معنے ہیں رَفَعُوْا اَصْوَاتَھُمْ عِنْدَ رُؤْيَتِهٖ۔ لوگوں نے چاند کو دیکھ کر اپنی آوازوں کو بلند کیا۔ اَھَلَّ الصَّبِيُّ: رَفَعَ صَوْتَهٗ بِالْبُكَاءِ۔ بچے نے روتے ہوئے آواز بلند کی۔ اَھَلَّ فُلَانٌ بِذِكْرِ اللّٰهِ: رَفَعَ صَوْتَهٗ بِهٖ عِنْدَ نِعْمَةٍ اَوْ رُؤْيَةِ شَيْءٍ يُعْجِبُهٗ کسی نعمت کے ملنے پر یا کسی خوش کن چیز کے دیکھنے پر اللہ تعالیٰ کا نام اونچی آواز سے لیا۔ اَھَلَّ بِالتَّسْمِيَةِ عَلَى الذَّبِيْحَةِ اَيْ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ۔ جانور کے ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا۔ مَآ اُھِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ اَيْ نُوْدِيَ عَلَيْهِ بِغَيْرِ اسْمِ اللّٰهِ عِنْدَ ذَبْحِهٖ۔ جانور کو ذبح کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام لیا۔ (اقرب)

فَمَنِ اضْطُرَّ یہ اِضْطَرَّ سے مجہول کا صیغہ ہے اِضْطَرَّهٗ اِلَيْهِ کے معنے ہیں اَحْوَجَهٗ وَاَلْجَاَهٗ فَاضْطُرَّ۔ اس کو اس کا محتاج بنا کر اس کی طرف جانے کے لئے لاچار کیا اور وہ اس کی طرف لاچار اور مجبور ہو کر گیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ اے مسلمانو تم کو اللہ تعالیٰ رزق کی فراخی دینے لگا ہے اس وقت کے آنے سے پہلے ہی یہ سبق سیکھ لو کہ حلال اشیاء کا استعمال جو طیب بھی ہوں تم کو جائز ہو گا۔

یاد رہے کہ مال کی حلت ذریعہ کسب کے صحیح ہونے پر مبنی ہوتی ہے۔ مگر خوردنی اشیاء کے لئے اس کے علاوہ ایک اور شرط بھی ہے اور وہ یہ کہ وہ اس قسم میں شامل نہ ہوں جسے حرام کیا گیا ہے۔ پس اس سوال کو کہ کونسی اشیاء حلال ہیں اور کونسی حرام اس آیت میں حل کیا گیا ہے۔

الفاظ قرآنیہ بتاتے ہیں کہ اشیاء کی حلّت وحرمت میں اصل حلت ہے اور حرمت ایک قید کے طور پر ہے۔ بعض

لوگوں کو خیال ہے کہ ہر شے حرام ہے سوائے اس کے جسے خدا تعالیٰ نے جائز کر دیا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ مالک ہے اور مالک کی اجازت کے بغیر کسی چیز کا استعمال جائز نہیں ہوتا۔لیکن یہ درست نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے کہ ہم نے ہر چیز انسان کے لئے پیدا کی ہے اور اس کے لئے مسخر کر دی ہے۔ پس اس عام حکم سے ہر چیز انسان کے لئے جائز ہو گئی سوائے اس کے جس سے نصاً یا اشارۃً روک دیا گیا ہو۔

لحم خنزیر میں چربی کے شامل ہونے کے متعلق فقہاء کا اختلاف اس آیت میں جو لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ فرمایا اس کے متعلق فقہاء میں اختلاف ہے کہ لحم میں چربی بھی شامل ہے یا نہیں (القرطبی زیر آیت ھذا)۔ جہاں تک لغت کا سوال ہے شَحْمٌ یعنی چربی کو لَحْمٌ سے الگ قسم کا خیال کیا جاتا ہے۔لیکن مفسرین کہتے ہیں کہ لحم کے نام میں شحم بھی شامل ہے۔ گو مفسرین کی دلیل ذوقی ہے اور لغت والوں کی بات اس مسئلہ میں زیادہ قابل اعتبار ہے۔ مگر اس کے باوجود میرے نزدیک سؤر کی شحم یعنی چربی جائز نہیں۔ اور اس کی دلیل میرے پاس یہ ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا ہے کہ مردہ جانور کی چربی حرام ہے (بخاری کتاب البیوع باب بیع المیتة)۔ اور سؤر کی حرمت اور مردہ کی حرمت ایک ہی آیت میں اور ایک ہی الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ پس دونوں کا حکم ایک قسم کا سمجھا جائے گا۔لیکن سؤر کی جلد کا استعمال جائز ہوگا کیونکہ وہ کھائی نہیں جاتی۔

احادیث میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ام سلمٰی رضی اللہ عنہا کی ایک بکری مر گئی۔ چند آدمی اس کو اٹھا کر باہر لئے جا رہے تھے۔ نبی کریم صلعم نے ان سے فرمایا کہ تم اس کا چمڑا کیوں نہیں اتار لیتے؟ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ تو میتہ ہے۔ آپ نے فرمایا کیا تم نے اسے کھانا ہے (مسند احمد بن حنبل)۔

پس معلوم ہوا کہ جس کا گوشت حرام ہو اس کے چمڑے کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔ ہاں سؤر کے بالوں کے بنے ہوئے بُرشوں کو مکروہ کہا جائے گا۔ کیونکہ ان کو منہ میں ڈالا جاتا ہے جو کھانے کا دروازہ ہے۔

کیا بیان شدہ صرف چار چیزیں ہی حرام ہیں اس آیت کے متعلق ایک بہت بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں چار چیزوں کی حرمت بیان فرمائی گئی ہے۔ کیا یہی چار چیزیں حرام ہیں اور ان کے سوا اور کوئی چیز حرام نہیں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں پر جو حصر پایا جاتا ہے یہ حصر اضافی ہے۔ یعنی کفار کے حرام کو مدنظر رکھ کر اضافی طور پر ان چیزوں کو حرام کیا گیا ہے (تفسیر مظہری زیر آیت ھذا)۔ چونکہ وہ سائبہ وغیرہ کو حرام کہا کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ حرام نہیں حرام تو یہ اشیاء ہیں جو ہم گنوا رہے ہیں۔ اس صورت بیان میں حصر تعداد کا نہیں ہوا کرتا بلکہ اقسام کا ہوا کرتا ہے۔ پس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس قسم کی چیزیں حرام نہیں جو تم کہتے ہو۔ بلکہ اس قسم کی چیزیں

حرام ہیں جو ہم بتاتے ہیں۔ اور حرمت کی نفی بقیہ اشیاء کے متعلق نہیں سمجھی جائے گی بلکہ ان اشیاء کے متعلق سمجھی جائے گی جن کا حرام ہونا کفار بیان کرتے تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تھی اس وقت تک یہی چار چیزیں حرام تھیں باقی بعد میں ہوئیں۔ یہ جواب واقعات کے لحاظ سے بھی غلط ہے اور اس لئے بھی کہ اس سے آیت کے لفظ اِنَّمَا کو آئندہ کے لئے منسوخ ماننا پڑتا ہے مگر قرآن کریم کا کوئی لفظ منسوخ نہیں۔ بعض نے مجبور ہو کر کہہ دیا ہے کہ یہی چار چیزیں حرام ہیں۔ ان کے سوا اور کوئی شے حرام نہیں (تفسیر کبیر لامام رازی زیر آیت ھذا)۔

اس آیت میں حصر زمانی یا حصر اضافی میرے نزدیک حصر اضافی بعض صورتوں میں جائز ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں جہاں بھی حرمت کا ذکر کیا گیا ہے وہاں پر حصر انہی چار چیزوں پر کیا گیا ہے۔ یہ ذکر چار سورتوں میں ہے۔ سورۃ نحل۔ بقرہ۔ انعام۔ مائدہ۔ سورۃ نحل اور انعام میں تو اس سے پہلے یہ ذکر موجود ہے کہ کفار اپنی مرضی سے مختلف اشیاء کو حلال وحرام کر لیتے تھے۔ مگر سورۃ مائدہ اور بقرہ میں یہ ذکر بالکل نہیں۔ سورۃ بقرہ میں تو اعمال خیر کے مسئلہ میں اس مسئلہ کو بیان کیا ہے اور سورۃ مائدہ میں کفار کے حلال وحرام کرنے کا ذکر کئے بغیر حلال وحرام کی ایک مستقل بحث کی گئی ہے۔ اور اس جگہ حرام اشیاء کو بھی گنایا گیا ہے۔ پس چونکہ دو اور سورتوں میں حصر تو موجود ہے مگر ان میں کفار کے حلال وحرام کرنے کا کوئی ذکر نہیں۔ اس لئے اس حصر کو اضافی قرار دینا ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔

آیت میں حصر زمانی درست معلوم نہیں ہوتا جنہوں نے کہا ہے کہ حصر زمانی لحاظ سے ہے ان کا قول بھی درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ مکہ کے زمانہ تک تو یہ تشریح درست ہوسکتی تھی۔ مگر یہی آیات سورۃ بقرہ میں بھی نازل ہوئی ہیں۔ جس کا زمانہ ہجرت کے تیسرے سال تک پہنچتا ہے۔ اور مائدہ میں بھی نازل ہوئی ہے جو سب سے آخری سورتوں میں شمار کی جاتی ہے۔ پس جبکہ یہی آیت بعینہٖ مدنی سورتوں میں بھی ہے جس زمانہ میں کئی دوسری چیزوں کے استعمال سے روکا جا چکا تھا تو یہ تاویل بھی درست نہیں ہوسکتی۔

اب رہا ان لوگوں کا قول جنہوں نے کہا ہے کہ یہی چیزیں حرام ہیں کوئی اَور چیز حرام نہیں۔ سو میرے نزدیک ان کی بات درست ہے کیونکہ اس کے سوا اَور کوئی معنے نہیں بن سکتے۔ جن لوگوں کا یہ مذہب ہے ان میں سے ایک ابن عباسؓ ہیں۔ ان کے متعلق بخاری میں جابر بن عبداللہ سے ایک روایت آتی ہے کہ ان کا یہی مذہب تھا کہ یہی چار چیزیں حرام ہیں جو اس آیت میں بیان ہیں۔

اور ابوداؤد کی روایت ہے کہ ابن عمرؓ کا بھی یہی مذہب تھا۔ اس میں آتا ہے کہ اَنَّہٗ سُئِلَ عَنْ اَکْلِ الْقُنْفُذِ فَتَلَا قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ الآیۃ (سنن ابو داؤد کتاب الاطعمۃ باب فی اکل حشرات الارض۔۔۔)

اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی ابن ابی حاتم نے اور بعض اَور لوگوں نے مسند صحیح سے بیان کیا ہے کہ اِنَّھَا کَانَتْ اِذَا سُئِلَتْ عَنْ اَکْلِ کُلِّ ذِیْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ وَمِخْلَبٍ مِنَ الطَّیْرِ قالت قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ الآیۃ۔ (روح المعانی سورۃ الانعام زیر آیت ۱۴۳ تا ۱۴۷)

اسی طرح ابن ابی حاتم نے ابن عباسؓ سے بھی روایت کی ہے کہ قَالَ لَیْسَ مِنَ الدَّوَابِّ شَیْءٌ حَرَامٌ اِلَّا مَا حَرَّمَ اللہُ تَعَالٰی فِی کِتَابِہٖ قُلْ لَّآ اَجِدُ۔ امام مالکؒ کا بھی یہی مذہب تھا۔ (روح المعانی زیر آیت سورۃ انعام آیات ۱۴۳ تا ۱۴۷)

اب سوال یہ ہے کہ کیا باقی سب چیزوں کا کھانا جائز ہے بعض ائمہ کا یہ مذہب ہے کہ ان کے سوا باقی سب اشیاء کا کھانا جائز ہے مگر میرے نزدیک باوجود اس کے بعض اشیاء کا کھانا ناجائز ہے۔ مگر ہم انہیں شریعت کی اصطلاح میں حرام نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ ابن ماجہ میں سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ اَلْحَلَالُ مَا اَحَلَّ اللہُ فِیْ کِتَابِہٖ وَالْحَرَامُ مَا حَرَّمَ اللہُ فِیْ کِتَابِہٖ (ابن ماجہ کتاب الاطعمۃ باب اکل الجبن والسمن)

جو خدا تعالیٰ نے حرام کیا صرف وہی حرام ہوگا باقی اس کے تابع ہوں گے اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے جن اشیاء کو حلال کیا ہے انہی کو ہم حلال کہہ سکتے ہیں اور جن کو حرام کہا ہے انہی کو ہم حرام کہہ سکتے ہیں۔ باقی جو درمیانی چیزیں ہیں ان کے متعلق حکم حلال اور حرام کے تابع ہوگا۔ دلالۃ النص کے طور پر نہ ہو گا۔ سورۃ مائدہ میں بھی اشارۃً اس صداقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ وہاں فرمایا ہے اُحِلَّتْ لَکُمْ بَھِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ (المائدۃ:۲)۔ چوپایوں میں سے تم پر انعام کی قسم کے بہائم حلال ہیں سوائے ان کے جن کا ذکر حراموں میں کیا گیا ہے۔

حرام کے مقابل پر حلال اشیاء انعام کی کئی قسمیں ہیں۔ اونٹ۔ بکری۔ مینڈھا۔ دنبہ۔ گائے۔ یہ حلال ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِیْرِ وَمَآ اُھِلَّ لِغَیْرِ اللہِ بِہٖ (المائدۃ:۴) یعنی ان حلال چیزوں کے مقابل پر کچھ حرام بھی ہیں۔ اول مردہ خواہ حلال جانور کا ہو۔ دوسرے خون وہ بھی خواہ حلال جانور کا ہو۔ تیسرے خنزیر کا گوشت۔ چوتھے جس پر خدا تعالیٰ کے سوا دوسرے معبودوں کا نام بلند کیا گیا ہو خواہ وہ جانور حلال ہی کیوں نہ ہوں پھر مردہ اور خون کی مزید تشریح کی گئی ہے اور فرمایا ہے۔ کہ نَطِیْحَۃُ۔ مَوْقُوْذَۃٌ وغیرہ

حرام ہیں ۔ یہ نئی حرمت نہیں بلکہ میتہ اوردم کی تشریح ہے ۔ یہ سب کچھ بیان کر کے پھر خدا تعالیٰ فرماتا ہے ۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَهُمْ (المائدۃ:۵) کہ مسلمان پوچھتے ہیں کہ ان کے لئے کیا کیا چیزیں حلال کی گئی ہیں؟ اب اگر اِنَّمَا حُرِّمَ عَلَيْكُمْ کے معنے یہ ہوتے کہ ان کے سوا باقی سب چیزیں کھانی جائز ہیں تو جب قرآن کریم نے ان چار چیزوں کو اس سوال سے پہلے بیان کر دیا تھا۔ یہ سوال دوبارہ کیوں کیا جاتا؟

حرام اور حلال چیزوں کے بیان کرنے کے بعد پھر اس سوال کو بیان کرنا اور اس کا جواب دینا بتاتا ہے کہ پہلی حلال چیزوں کی تشریح میں کچھ اغلاق ابھی باقی تھا جس کے متعلق صحابہ نے سوال کیا اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے سوال کا یہ جواب نہیں دیا کہ ابھی تو ہم بتا چکے ہیں پھر کیوں پوچھتے ہو۔ بلکہ سوال کی ضرورت تسلیم کر کے اس کا جواب دیا ہے۔ اور وہ جواب یہ دیا ہے کہ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ (المائدۃ:۵) کہ باقی اشیاء میں سے جو طیّبات ہیں وہ حلال ہیں اور جو طیبات نہیں وہ حلال نہیں ۔ اس سے معلوم ہوا کہ سب حلال چیزیں طیب نہیں ہیں۔ جو طیب ہیں صرف ان کا کھانا جائز ہے باقی کا کھانا جائز نہیں۔ لیکن ان کا نام حرام نہیں رکھ سکتے ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی قسم کا مضمون بیان فرمایا ہے ۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ اِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ وَالْحَرَامَ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا اُمُوْرٌ مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهَا كَثِيْرٌ مِنَ النَّاسِ ۔ (بخاری کتاب الایمان باب فضل من استبرألدینہ)

یعنی حلال بھی بیان ہو چکے ہیں اور حرام بھی ۔ پھر ان دونوں کے درمیان مشتبہ امور ہوتے ہیں ۔ جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ پس ان کے بارہ میں قیاس اور علم طب اور تجربہ وغیرہ سے کام لے کر فیصلہ کیا جائے گا۔

پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ دیکھو ہر بادشاہ کی رکھ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رکھ اس کی محرمات ہیں ۔ جس طرح ہوشیار چرواہا رکھ کے پاس نہیں چراتا ۔ تا ایسا نہ ہو کہ غفلت میں اس کے جانور اس میں چلے جائیں اور وہ سزا کا مستحق ہو جائے ۔ اسی طرح مومن محرمات کے ساتھ کے علاقہ میں اپنے نفس کو نہیں چراتا تا پکڑا نہ جائے۔

اس روایت سے استنباط ہوتا ہے کہ حرام اشیاء سے ملتی جلتی اشیاء کو بھی گو حرام نہیں کہہ سکتے مگر ان سے بچنا تقویٰ کے لئے ضروری ہے۔

نئی اشیاء کے حلال وحرام کے پرکھنے کا ذریعہ اس اصول کے مطابق جو نئی نئی اشیاء دنیا میں نکلتی رہتی ہیں ان کے متعلق یہی حکم ہوگا کہ ہم ان کا قیاس حرام اور حلال پر کریں ۔ اگر حلال سے ان کی مشابہت زیادہ ہے تو انہیں استعمال کریں ۔ اگر حرام سے مشابہت زیادہ ہے تو ان سے اجتناب کریں ۔ چنانچہ تازہ مثال اس قسم کی چیزوں کی

تمبا کو ہے۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام بانی سلسلہ احمدیہ سے اس کے بارہ میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا یہ چیز بعد میں نکلی ہے مگر اس کے حالات کو دیکھتے ہوئے ہم سمجھتے ہیں ۔کہ اگر رسول کریم صلعم کے زمانہ میں اس کا رواج ہوتا تو حضورؐ اس سے ضرور منع فرماتے ۔(الحکم ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۷)

اسلام کے نزدیک کھانے کی چیزوں کے کئی درجے اصل بات یہ ہے کہ کھانے کی چیزوں کے متعلق اسلام نے کئی درجے بتائے ہیں ۔حرام ۔ممنوع۔حلال۔طیب۔حرام وہ جسے قرآن نے حرام کیا ۔ممنوع جسے قرآن کریم کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق رسول کریم صلعم نے منع فرمایا یا بعد کی معلوم شدہ چیز جس کے متعلق تحقیقات کر کے مسلمان اسے ناپسندیدہ قرار دے دیں۔

حلال اور طیب کے معنی حلال ۔وہ جو اپنی اصل وضع کے لحاظ سے طیب ہو۔

طیب ۔وہ جو اپنی موجودہ حالت میں بھی طیب ہو۔یعنی ہر وہ چیز جس کو کسی صورت میں بھی کھانا جائز ہے اس کو حلال کہیں گے۔جیسے بکرا حلال ہے۔مگر چونکہ کچے گوشت کی صورت میں کھایا نہیں جا سکتا ہے اس لئے اس صورت میں طیب نہیں ہوگا۔لیکن اس کو پکا کے کھانا طیب ہوگا۔

بہترین غذا طیب سے اتر کر حلال ہے۔اس کے بعد اور اشیاء ہیں وہ ممنوع ہیں ۔ان کا کھانا درست نہیں ۔مثلاً ڈاکٹر ہیضہ کے دنوں میں کھیرے کا کھانا منع کر دے تو گو کھیرا عام دنوں میں حلال اور طیب ہے مگر ان دنوں میں حلال تو رہے گا طیب نہ رہے گا۔جو چیزیں حرام کے بعد ہیں یعنی ممنوع ہیں ان کے متعلق بھی ہم کہیں گے کہ ان کا کھانا درست نہیں ۔یعنی ان کے کھانے سے انسان نقصان اٹھائے گا۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف جانور مختلف کاموں کے لئے پیدا کئے ہیں۔کوئی خوبصورتی کے لئے کہ دیکھنے میں خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔کوئی آواز کے لئے کہ اس کی آواز بہت عمدہ ہے۔کوئی کھانے کے لئے کہ اس کا گوشت اچھا ہے ۔کوئی دوائی کے لئے کہ اس کے گوشت میں کسی مرض سے صحت دینے کی طاقت ہے ۔صرف جانور اور حلال دیکھ کر اسے نہیں کھانا چاہیے۔ہوسکتا ہے کہ ایک جانور کا گوشت صحت کے لئے مضر نہ ہو مگر وہ مثلاً بعض فصلوں یا انسانوں میں بیماری پیدا کرنے والے کیڑوں کو کھاتا ہو تو گوشت کے لحاظ سے اس کا گوشت حلال بھی ہوگا اور طیب بھی ۔مگر پھر بھی بنی نوع انسان کا عام فائدہ دیکھتے ہوئے اس کا گوشت طیب نہ رہے گا۔کیونکہ اس کے کھانے کی وجہ سے انسان بعض اور فوائد سے محروم رہ جائیں گے۔

حلال اور حرام کے سمجھنے کے متعلق ایک بچپن کا واقعہ مجھے بچپن ہی میں یہ سبق سکھایا گیا تھا۔میں بچپن

میں ایک دفعہ ایک طوطا شکار کر کے لایا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسے دیکھ کر کہا محمود اس کا گوشت حرام تو نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ہر جانور کھانے کے لئے ہی پیدا نہیں کیا۔ بعض خوبصورت جانور دیکھنے کے لئے ہیں کہ انہیں دیکھ کر آنکھیں راحت پائیں۔ بعض جانوروں کو عمدہ آواز دی ہے کہ ان کی آواز سن کر کان لذت حاصل کریں۔ پس اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہر حس کے لئے نعمتیں پیدا کی ہیں وہ سب کی سب چھین کر زبان ہی کو نہ دے دینی چاہئیں۔ دیکھو یہ طوطا کیسا خوبصورت جانور ہے۔ درخت پر بیٹھا ہوا دیکھنے والوں کو کیسا بھلا معلوم ہوتا ہوگا۔

طیب میں یہ بھی شرط ہے کہ دوسری مخلوق کا حق نہ مارا جائے غرض طیب کے لئے جہاں صحت کے لحاظ سے اچھا ہونا شرط ہے وہاں اس کے کھانے میں یہ بھی شرط ہے کہ اس چیز کے کھانے سے انسان کے دوسرے حواس یا دوسرے بنی نوع انسان یا دوسری مخلوق کا حق نہ مارا جائے۔ بلکہ دوسروں کے جذبات کو مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مَا اسْتَخْبَثَتْہُ الْعَرَبُ فَھُوَ حَرَامٌ (روح المعانی سورۃ الانعام زیر آیت ۱۴۳ تا ۱۴۷) یعنی جسے عرب خراب کھانا سمجھیں وہ حرام ہے۔ یہاں حرام کے معنے یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک اس کا کھانے والا گنہگار ہوتا ہے۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ عربوں کے سامنے اسے نہیں کھانا چاہیے کیونکہ اس طرح آپس کے تعلقات کشیدہ ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں گائے کا گوشت بھی ایسا ہی ہے۔

جملہ مسلمانوں کو نصیحت مسلمانوں کو احتیاط چاہیے کہ گائے کا گوشت ہندوؤں کے سامنے نہ کھایا کریں اور اس کا ذکر بھی ان کے سامنے نہ کیا کریں۔ کیونکہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ

اور اپنی زبانوں کے جھوٹے بیان کے سبب سے (یہ) مت کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے (تا ایسا نہ ہو) کہ تم

هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ

اللہ (تعالیٰ) پر جھوٹ باندھنے والے بن جاؤ۔ جو لوگ اللہ (تعالیٰ) پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ ہرگز

يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

کامیاب نہیں ہوتے۔

حلّ لُغَات۔ **تَصِفُ** تَصِفُ وَصَفَ سے مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اور وَصَفَ کے لئے دیکھو نحل آیت نمبر ۶۳۔

يُفْلِحُوْنَ يُفْلِحُوْنَ اَفْلَحَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور اَفْلَحَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں فَازَ وَظَفِرَ بِمَا طَلَبَ۔ وہ اپنے مطلوب کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اَفْلَحَ زَيْدٌ: نَجَعَ فِيْ سَعْيِهٖ وَاَصَابَ فِيْ عَمَلِهٖ۔ اپنی کوشش میں کامیاب ہوگیا اور حسب خواہش مطلوب کو پالیا۔ (اقرب) پس لَا يُفْلِحُوْن کے معنے ہوں گے وہ کامیاب نہیں ہوتے۔

تفسیر - لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ میں یا تو مَا مصدر یہ ہے اور لَا تَقُوْلُوْا کا مفعول اَلْكَذِب ہے یعنی اپنی زبانوں کے بولے ہوئے جھوٹ کی بناء پر یہ نہ کہو کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں حرام ہے۔ یا پھر مَا موصولہ ہے جس کے رو سے معنے یہ ہوں گے کہ جن چیزوں کو تمہاری زبانیں جھوٹ بول کر حلال حرام قرار دیتی ہیں ان کی نسبت یہ نہ کہو کہ وہ حلال ہیں یا حرام۔

تمہاری زبان سے مراد دونوں صورتوں میں قوم کے سرداروں کی زبانوں سے ہے کیونکہ ساری قوم جھوٹ نہیں بنایا کرتی۔ بعض لیڈر جھوٹ بولتے ہیں اور دوسرے لوگ ان کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔

لِتَفْتَرُوْا میں لام عاقبت ہے لِتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ۔ یہاں پر لام عاقبت کے معنے دیتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ کہو کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اللہ پر افتراء کرنے لگ جاؤ گے یعنی اس طرح اپنے پاس سے حلال حرام قرار دینا اللہ تعالیٰ پر افتراء کے مترادف ہے کیونکہ حلال حرام مقرر کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ مفتری کامیاب نہیں ہوتے۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ مگر مسلمانوں کو اس طرف توجہ نہیں۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والے ماموروں کی سب سے بڑی نشانی ہی یہ ہے۔

مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۖ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱۸﴾

(یہ دنیا) تھوڑا سا عارضی سامان ہے۔ اور (اس کے نتیجہ میں) ان کے لئے دردناک عذاب (مقدر) ہے۔

تفسیر۔ یعنی چند دن تک اگر عذاب سے بچ جائیں تو اور بات ہے مگر لمبی عمر نہیں پاتے۔ یعنی اتنا عرصہ الہام شائع کرنے کے بعد نہیں پاتے جتنا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا۔

وَ عَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ

اور جن لوگوں نے یہودی مذہب اختیار کیا تھا ان پر (بھی) ہم نے اس سے پہلے وہ (تمام) چیزیں حرام کی تھیں جن

قَبْلُ ۚ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ

کا ذکر ہم نے تجھ سے کیا ہے۔ اور ہم نے ان پر (یہ احکام دے کر) ظلم نہیں کیا تھا بلکہ وہ (ان احکام کو توڑ کر) اپنی

يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۹﴾

جانوں پر ظلم کیا کرتے تھے۔

حلّ لُغات۔ قَصَصْنَا قَصَصْنَا قَصَّ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور قَصَّ کے لئے دیکھو یوسف آیت نمبر ۴۔

قَصَّ يَقُصُّ قَصًّا وَقَصَصًا اَثَرَهٗ: تَتَبَّعَهٗ شَيْئًا بَعْدَ شَيْءٍ۔ اس کا نشان تلاش کرتے ہوئے اس کے پیچھے گیا۔ وَمِنْهُ فَارْتَدَّا عَلٰۤى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا۔ اَیْ رَجَعَا فِي الطَّرِيْقِ الَّتِيْ سَلَكَاهَا يَقُصَّانِ الْاَثَرَ۔ اور انہی معنوں میں قرآن کریم کی آیت فَارْتَدَّا عَلٰۤى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا۔ میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ قَصَّ عَلَيْهِ الْخَبَرَ وَالرُّؤْيَا: حَدَّثَ بِهِمَا عَلٰى وَجْهِهِمَا بات کو بے کم وکاست بیان کیا۔ ٹھیک طور پر بیان کیا۔ وَمِنْهُ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ۔ اَیْ نُبَيِّنُ لَكَ اَحْسَنَ الْبَيَانِ۔ اور انہی معنوں میں سورہ یوسف کی آیت نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ میں یہ لفظ آیا ہے۔ یعنی ہم تیرے سامنے ٹھیک ٹھیک بات بیان کرتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ کفار کی طرح یہودیوں نے بھی ایسا کیا تھا جس کے بدلہ میں ان کو سزا ملی

تھی۔ اگر تم بھی کرو گے تو تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا۔

اس آیت میں مِنۡ قَبۡلُ کے لفظ سے مراد مِنۡ قَبۡلُ کے متعلق مفسرین میں بہت اختلاف ہوا ہے کہ اس سے کیا مراد ہے۔ بعضوں نے مِنۡ قَبۡلُ سے مراد سورۃ انعام لی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے سورۃ انعام میں ان محرمات کا ذکر آ چکا ہے۔ اسی کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے (مجمع البیان زیر آیت ھذا)۔ لیکن یہ غلط ہے۔ وہاں بھی یہ الفاظ ہیں قُلۡ لَّاۤ اَجِدُ فِیۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطۡعَمُہٗۤ (الانعام:١٤٦) یعنی کفار سے کہہ دے کہ میں تو اپنے اوپر نازل ہونے والی وحی میں سوائے فلاں فلاں چیز کے اَور کوئی چیز حرام نہیں پاتا۔ ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ سورۃ انعام سے بھی پہلے یہ حکم نازل ہو چکا تھا۔

چار حرام چیزوں کا ذکر چار سورتوں میں اب مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ان چار حرام چیزوں کا ذکر صرف چار سورتوں میں ہے۔ بقرہ میں جو مدینہ میں نازل ہوئی۔ مائدہ میں جو نہ صرف مدینہ میں نازل ہوئی بلکہ اس کے آخری ایام میں نازل ہوئی (تفسیر کبیر لامام رازی زیر آیت ھذا)۔ نحل میں کہ جہاں کہا ہے کہ یہ حکم مِنۡ قَبۡلُ نازل ہو چکا ہے۔ اور انعام میں کہ وہاں بھی یہی اشارہ کیا گیا ہے کہ اس سے پہلے یہ حکم نازل ہو چکا ہے۔ پس آپس میں ایک دوسری کی طرف اشارہ سمجھا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ دونوں سورتیں ایک دوسرے سے پہلے نہیں ہو سکتیں۔ اور ان دونوں کے علاوہ کسی اور مکی سورۃ میں یہ ذکر ہے نہیں۔

مفسرین نے یا تو اس عقدہ کو حل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی یا اکثر ایسے جواب دیئے ہیں جو معقول نہیں۔ مثلاً بعض نے سورۃ مائدہ کی طرف اشارہ قرار دیا ہے جو درست نہیں۔ کیونکہ سورۃ مائدہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے (تفسیر کبیر لامام رازی سورۃ الانعام:١٢٠)۔ رازی نے یہ جواب دیا ہے کہ سورۃ انعام ہی سب سے پہلی سورۃ ہے جس میں یہ ذکر ہے۔ اور اس کی آیت قَدۡ فَصَّلَ لَکُمۡ مَّا حَرَّمَ عَلَیۡکُمۡ میں اس کے بعد آنے والی آیت قُلۡ لَّاۤ اَجِدُ فِیۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا کی طرف اشارہ ہے (تفسیر کبیر لامام رازی سورۃ الانعام آیت ١٤٦)۔ اور اتنے تھوڑے فاصلہ کی بناء پر اگلی آیات کی طرف اشارہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

امام رازی کا یہ جواب ہرگز درست نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قَدۡ فَصَّلَ لَکُمۡ سے بعد کی آیت کی طرف تو اشارہ ہو یا نہ ہو۔ مگر جس آیت کی طرف وہ اشارہ کرتے ہیں وہ بھی تو یہی کہتی ہے کہ قُلۡ لَّاۤ اَجِدُ فِیۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیَّ جس کے معنے یہ ہیں کہ اس آیت سے بھی پہلے کوئی اور آیت موجود ہے جس میں یہ مسئلہ بیان ہوا ہے۔ پس یہ جواب بھی مشکل کو حل نہیں کرتا۔

مصنف فتح الباری نے اس کا ایک عجیب جواب دیا ہے جو میرے نزدیک قابل قدر ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس مشکل کا کوئی اَور حل موجود نہ ہوتا تو یقیناً یہی جواب صحیح ہوتا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس کا اشارہ سورۃ مائدہ کی طرف ہے اور گو مائدہ نزول کے لحاظ سے انعام سے بعد کی ہے۔ لیکن چونکہ علم الٰہی میں سورۃ مائدہ کو آخری ترتیب میں پہلے رکھنا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے پہلے نازل ہونے والی سورۃ میں اس بعد میں رکھی جانے والی سورۃ کی طرف اشارہ کر دیا اور اس طرح ایک ثبوت مہیا کر دیا کہ قرآن کریم کی ترتیب الہامی ہے۔ ان کا یہ جواب نہایت لطیف ہے اور بعض دوسرے مقامات کے حل کرنے کے وقت مدنظر رکھنے کے قابل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ترتیب قرآن میں پہلے نازل ہونے والی سورتوں میں بعد میں نازل ہونے والی سورتوں کے مضامین کو واضح کیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ نحل کے بعض مسائل کو سورۃ اسراء میں حل کیا گیا ہے حالانکہ سورۃ اسراء پہلے کی ہے اور سورۃ نحل بعد کی ہے اور یہ قرآن کے علمی کمالات میں سے معجزانہ کمال ہے۔

باوجود اس جواب کو لطیف سمجھنے کے میرے نزدیک اس موقعہ پر اس جواب کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کا جواب ترتیب نزول کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی موجود ہے۔ قرآن کریم سے یہ تو ثابت ہے کہ سورۃ نحل سورۃ انعام سے پہلے نازل ہوئی ہے کیونکہ سورۃ انعام میں دو جگہ اس کے مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک انعام کے چودہویں رکوع میں جس میں فرمایا ہے قَدۡ فَصَّلَ لَکُمۡ مَّا حَرَّمَ عَلَیۡکُمۡ اِلَّا مَا اضۡطُرِرۡتُمۡ اِلَیۡہِ (الانعام: ۱۲۰) اور دوسرے آیت قُلۡ لَّاۤ اَجِدُ فِیۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطۡعَمُہٗۤ اِلَّاۤ اَنۡ یَّکُوۡنَ مَیۡتَۃً اَوۡ دَمًا مَّسۡفُوۡحًا اَوۡ لَحۡمَ خِنۡزِیۡرٍ فَاِنَّہٗ رِجۡسٌ اَوۡ فِسۡقًا اُہِلَّ لِغَیۡرِ اللّٰہِ بِہٖ (الانعام: ۱۴۶) اور تاریخ سے بھی یہ امر ثابت ہے کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ اسراء کے واقعہ کے بعد جو ہجرت سے صرف چھ ماہ یا ایک سال پہلے ہوا تھا (الطبقات الکبری لابن سعد ذکر معراج)۔ حرام حلال کے احکام نازل ہوئے ہیں اور یہ بھی احادیث سے ثابت ہے کہ سورۃ انعام ایک ہی دفعہ سب کی سب نازل ہوئی تھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے نازل نہیں ہوئی (الاتقان)۔ پس معلوم ہوا کہ سورۃ نحل کے بعد ہی یہ سورۃ نازل ہوئی ہے اور اسی کی آیت کی طرف اس میں اشارہ ہے۔ اب رہ گیا یہ سوال کہ آیت زیر بحث میں جو مِنۡ قَبۡلُ کے الفاظ ہیں ان سے کیا مراد ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امر بالکل سادہ ہے۔ مگر نا معلوم مفسرین کا ذہن ادھر کیوں نہیں گیا۔ بات یہ ہے کہ مِنۡ قَبۡلُ سے مراد کوئی پہلی نازل شدہ سورۃ نہیں بلکہ اسی سورۃ کی پہلی نازل شدہ آیت ہے چنانچہ اس آیت سے دو آیتیں پہلے اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَۃَ (النحل: ۱۱۶) والی آیت موجود ہے اسی کی طرف مِنۡ قَبۡلُ کا اشارہ ہے مِنۡ قَبۡلُ میں سال یا دو سال کی شرط نہیں۔ ہم عام طور پر تصنیف میں جو بات

پہلے لکھی گئی ہو اس کی نسبت کہتے ہیں کہ ''میں پہلے لکھ چکا ہوں''۔ اس سے مراد کوئی دوسری کتاب نہیں ہوتی بلکہ ان الفاظ سے پہلے کی کوئی عبارت مراد ہوتی ہے۔ اسی رنگ میں یہ الفاظ اس آیت میں مستعمل ہوئے ہیں۔

بنی اسرائیل کے اپنے نفسوں پر ظلم کرنے کی تشریح یہ جو فرمایا ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اس سے یہ مراد ہے کہ بعض اور چیزیں بھی یہود کے لئے ممنوع قرار دی گئی تھیں جیسے گائے اور بکری کی چربی۔ پس اس کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ حرمت حقیقی نہ تھی بلکہ ان کے ظلموں کی وجہ سے تھی۔ چنانچہ سورۂ انعام میں اس مضمون کو وضاحت سے بیان فرمایا گیا ہے فرماتا ہے وَ مِنَ الْبَقَرِ وَ الْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (الانعام: ۱۴۷) یعنی یہود پر گائے اور بکری کی چربی بھی حرام کی گئی تھی سوائے اس چربی کے جو پیٹھ پر ہو یا انتڑیوں کے ساتھ لگی ہوئی ہو یا ہڈی کے اوپر لگی ہوئی ہو۔ مگر یہ حرمت ان کی سرکشیوں کی سزا طور پر جاری کی گئی تھی مستقل حرمت نہ تھی۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا

پھر (یاد رکھو کہ) جن لوگوں نے بے خبری کی حالت میں (کوئی) برائی کی ہو (اور) پھر اس کے بعد (اس سے) توبہ

مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ

کرلیں اور (اپنی غلطی کی) اصلاح (بھی) کریں ان کے حق میں تیرا رب ان (شرائط کے پورا کرنے) کے بعد

رَّحِيْمٌ ۝۱۲۰ ع

بہت ہی بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا (ثابت) ہوگا۔

ع ۱۵ / ۹ / ۲۱

حلّ لُغات۔ اَلسُّوْءُ اَلسُّوْءُ کے لئے دیکھو یوسف آیت نمبر ۵۴۔

اَلسُّوْءُ كُلُّ مَا يَغُمُّ الْاِنْسَانَ مِنَ الْاُمُوْرِ الدُّنْيَوِيَّةِ وَالْاُخْرَوِيَّةِ وَمِنَ الْاَحْوَالِ النَّفْسِيَّةِ وَالْبَدَنِيَّةِ وَالْخَارِجَةِ مِنْ فَوَاتِ مَالٍ وَجَاهٍ وَفَقْدِ حَمِيْمٍ۔ دنیوی واخروی معاملات اور نفسی و بدنی حالات یا ان کے علاوہ اور خارجی واقعات یعنی مال وعزت کے کھوئے جانے یا دوست واحباب کی علیحدگی کی وجہ سے جو امور انسان کو اندوہگین بنائیں ان سب کو سوء کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ (مفردات)

جَھَالَۃ جَھَالَۃٌ جَھِلَ کا مصدر ہے اور جَھِلَہٗ کے معنے ہیں ضِدُّ عَلِمَہٗ اس سے ناواقف اور بے خبر رہا۔ نیز اَلْجَھَالَۃُ کے معنی ہیں ضِدُّ الْعِلْمِ وَالْمَعْرِفَۃِ۔ بے علمی اور بے خبری۔ (اقرب)

تفسیر ۔اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا تھا کہ یہود نے نافرمانی کی اس لئے ان پر تکالیف آئیں جیسے فرمایا وَ لٰکِنْ کَانُوْٓا اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ کہ وہ ظلم کرتے تھے اس لئے اس کا نتیجہ انہیں دکھ ملا۔ اب فرمایا ہے کہ گو یہود نے غلطیاں کیں۔ لیکن اگر وہ اب بھی توبہ کریں تو خدا تعالیٰ کو بخشنے والا مہربان پائیں گے۔ اس میں یہود کا کوئی خاص لحاظ نہیں بلکہ یہ عام قانون کے مطابق ہے۔

ظاہر ہے کہ اولاد کی تکالیف کا ماں باپ پر اثر پڑتا ہے جس طرح بچوں کے بیمار ہونے سے ماں باپ کو تکلیف ہوتی ہے اسی طرح ان کے دوزخ میں پڑنے سے ماں باپ کو تکلیف ہوگی۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آتا ہے کہ قیامت کے دن بعض ظاہر میں صحابی نظر آنے والے لوگوں کو دوزخ میں جاتے دیکھیں گے تو فرمائیں گے اُصَیْحَابِیْ۔ اُصَیْحَابِیْ (بخاری کتاب التفسیر باب و کنت علیھم شھیدًا) پس اس تکلیف سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ بزرگوں کی اولاد سے نیکی کا سلوک کرتا ہے اور ان بزرگوں کو تکلیف سے بچانے کے لئے ان کی اولاد کی حفاظت کی جاتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَلْحَقْنَا بِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ کہ ہم مومنوں کی اولاد کو اگر وہ مومن ہوں گے جنت میں ان کے ساتھ ملا دیں گے خواہ اولاد کا درجہ کم ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے انبیاء وصلحاء کی امتوں اور جماعتوں کے لئے بار بار قرآن کریم میں وعدے ہیں۔ کہ ان پر خاص فضل ہوگا تا ان کے دکھ پانے سے انبیاء اور صلحاء کو تکلیف نہ ہو۔ اور چونکہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ سب قوموں کی طرف انبیاء آئے ہیں اس لئے ساری دنیا ہی اس فضل میں حصہ دار ہے اور یہود کی خصوصیت نہیں۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّکَ لِلَّذِیْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَھَالَۃٍ۔ جہالت علم کے مقابل کا لفظ ہے اور اس کے معنے ناواقفیت کے ہیں لغت میں ہے اَلْجَھَالَۃُ ضِدُّ الْعِلْمِ۔ اسی طرح لکھا ہے اَلْجَھَالَۃُ ضِدُّ الْعِلْمِ وَالْمَعْرِفَۃِ یعنی جہالت علم کا ضد ہے اور جہالت کے معنے عدم علم اور عدم معرفت کے ہیں۔ اس جگہ عدم علم کے معنے نہیں کیونکہ جسے علم نہ ہو اسے سزا نہیں ملتی بلکہ عدم معرت کے ہیں یعنی علم تو حکم کا ہو لیکن تقویٰ میں کمزوری کی وجہ سے یہ شخص وقت پر اپنے نفس کو قابو میں نہ رکھ سکے۔ ایسا شخص سزا کا مستحق ہوتا ہے کیونکہ علم کے بعد تقویٰ کے حصول کی کوشش نہ کرنا ایک دانستہ گناہ ہے۔

درحقیقت معرفت ہی ہے جو انسان کو گناہ سے بچاتی ہے۔ جو لوگ ظاہری علم کو کافی سمجھتے ہیں وہ آخر گناہ میں

ملوث ہو کر رہتے ہیں۔ پس انسان کو معرفت اور خشیت الٰہی میں ترقی کرنے کی ہمیشہ کوشش کرنی چاہیے۔

جہالت کی دو اقسام یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جہالت دو قسم کی ہوتی ہے ایک دائمی جس کا شکار عرفان سے بالکل محروم ہوتا ہے اور گناہ میں ہی اُسے سب لذت ملتی ہے۔ دوسری وقتی۔ اس کا شکار ادنیٰ عارف بھی ہو جاتا ہے کیونکہ بعض وقت اس کے عرفان کا درجہ کم ہوتا ہے تو اس وقت وہ نفسانی جذبات کا شکار ہو جاتا ہے چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَیَخْرُجُ مِنْہُ الْاِیْمَانُ فَیَصِیْرُ عَلٰی رَأْسِہٖ کَالظُّلَّۃِ الخ یعنی جب زانی زنا کر رہا ہوتا ہے تو اس وقت اس کے قلب کی حالت مومنانہ نہیں ہوتی اور اس کا ایمان اس کے دل سے نکل کر اس کے سر پر چھاتے کی طرح منڈلاتا رہتا ہے۔ (ترمذی ابواب الایمان باب لا یزنی الزانی) آخری فقرہ کے معنے بعض شراحِ احادیث نے یہ کئے ہیں کہ وہ ایمان اس وقت اس شخص کی سفارش کر رہا ہوتا ہے۔

اَصْلَحُوْا کے دو معانی وَ اَصْلَحُوْا۔ اپنی اصلاح کر لیں یا دوسروں کی اصلاح کریں دونوں ہی معنے ہو سکتے ہیں۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ گناہ کے بعد انسان کو صرف قلبی توبہ ہی نہیں کرنی چاہیے بلکہ جن وجوہ سے وہ گناہ سرزد ہوا تھا ان کو بھی دور کرنا چاہیے۔ تا کہ آئندہ گناہ سرزد نہ ہو سکے۔ اور ''دوسروں کی اصلاح کریں'' سے اس طرف اشارہ ہے کہ اپنے گناہ کے کفارہ کے طور پر انہیں دوسرے لوگوں کی اصلاح کرنی چاہیے۔ تا کہ ان کے ثواب میں جن کو وہ ہدایت کی طرف لائے ہوں شامل ہو جائیں۔ اور سابق گناہ کی وجہ سے جو اعمال میں کمی ہو جائے پوری ہو جائے۔

اِنَّ اِبْرٰھِیْمَ کَانَ اُمَّۃً قَانِتًا لِّلّٰہِ حَنِیْفًا ؕ وَ لَمْ یَکُ

ابراہیم یقیناً ہر (اک) خیر کا جامع۔ اللہ (تعالیٰ) کے لئے تذلل اختیار کرنے والا (اور) ہمیشہ خدا کی کامل

مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۱۲۱﴾ ۙ

فرمانبرداری کرنے والا تھا۔ اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔

حلّ لُغات۔ اَلْاُمَّۃُ اَلْاُمَّۃُ کے معنے ہیں۔ اَلْاِمَامُ۔ امام اَلرَّجُلُ الَّذِیْ لَا نَظِیْرَ لَہٗ۔ ایسا آدمی جس کا کوئی نظیر نہ ہو۔ مُعَلِّمُ الْخَیْرِ۔ نیکی کی تعلیم دینے والا نیز اَلْجَامِعُ لِلْخَیْرِ۔ خیر کا جامع۔ (تاج) پس اِنَّ اِبْرَاھِیْمَ کَانَ اُمَّۃً کے معنی ہوں گے کہ ابراہیم یقیناً ہر ایک خیر کا جامع، نیکی کی تعلیم دینے والا امام، اور بے نظیر شخص تھا۔

قَانِتًا قَانِتٌ ۔قنَتَ سے اسم فاعل ہے اور قَنَتَ (يَقْنُتُ قُنُوْتًا) کے معنے ہیں اَطَاعَ۔اطاعت کی اور قَنَتَ اللّٰہَ وَقَنَتَ لِلّٰہِ کے معنے ہیں ذَلَّ اللہ تعالیٰ کے حضور تذلل اختیار کیا نیز اس کے معنے ہیں ۔دَعَا۔اس نے دعا کی ۔قَامَ فِي الصَّلٰوةِ۔نماز شروع کی ۔اَمْسَكَ عَنِ الْكَلَامِ ۔کلام کرنے سے رکا رہا۔نیز اَلْقَانِتُ کے معنے ہیں اَلْقَائِمُ بِالطَّاعَةِ الدَّائِمِ عَلَيْهَا پوری طرح اطاعت کرنے والا۔اَلْمُصَلِّي ۔نماز گزار۔(اقرب)

الحنیف اَلْحَنِيْفُ: اَلصَّحِيْحُ الْمَيْلُ اِلَى الْاِسْلَامِ الثَّابِتُ عَلَيْهِ۔اسلام کی طرف صحیح میلان رکھنے والا اور اس پر قائم رہنے والا ۔اَلْمَائِلُ عَنْ دِيْنٍ اِلَى دِيْنٍ۔ایک دین کو چھوڑ کر دوسرے دین کی طرف جانے والا۔ اَلْمُسْلِمُ ۔کامل فرمانبردار۔اس کی جمع حُنَفَاءُ آتی ہے۔(اقرب)

تفسیر ۔ حضرت ابراہیمؑ کو امت کہنے کی تشریح اس آیت میں ابراہیم علیہ السلام کو امت کہا ہے اس کے ایک تو یہ معنے ہیں کہ وہ نیکی کی تعلیم دینے والا اور سب قسم کی خیر کا جامع تھا۔دوسرے میرے نزدیک ادھر بھی اشارہ ہے کہ اس کے اندر وہ طاقتیں موجود تھیں جن سے امتیں پیدا ہوتی ہیں۔حتی کہ ان طاقتوں کی وجہ سے اسے امت کہا جاسکتا ہے گویا وہ درختِ امت کے لئے بطور بیج کے تھا۔

حضرت ابراہیمؑ کی صفات کا بیان اس آیت میں حضرت ابراہیم کی بہت سی صفات بیان فرمائی ہیں۔ایک تو یہ کہ وہ معلم خیر تھے۔دنیا کو نیکی کی تعلیم دیتے تھے۔دوسرے یہ کہ وہ جامع الخیر تھے۔سب قسم کے اخلاق فاضلہ ان میں پائے جاتے تھے۔تیسرے یہ کہ وہ نہایت اعلیٰ فطرت رکھتے تھے جو زبردست نمو کی قوتیں پوشیدہ رکھتی تھی۔ جس سے امتوں کا پیدا ہونا ممکن تھا۔چوتھے یہ کہ وہ قانت تھے ۔اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار تھے ۔دعائیں کرنے والے تھے ۔پانچویں یہ کہ وہ حنیف تھے یعنی زبردست قوۃ مقاومۃ رکھتے تھے اور کبھی حق کے راستہ سے دوسری طرف مائل نہ ہوتے تھے۔چھٹے یہ کہ وہ مشرک نہ تھے یعنی توحید پر کامل طور پر قائم تھے۔یہ کامل توحید کے معنے اس سے نکلتے ہیں کہ قَانِتًا لِلّٰہِ اور حَنِيْفًا کے بعد یہ فقرہ رکھا گیا ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ عام موحد مراد نہیں ۔بات یہ ہے کہ عام طور پر انسان جب اس کے اندر خوبیاں پیدا ہوجائیں اپنی ذات پر بھروسہ کرنے لگ جاتا ہے اور اس میں کبر اور خود بینی وخود رائی وخود ستائی پیدا ہوجاتی ہیں اور وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگ جاتا ہے۔یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے متعلق یہ فرما کر کہ لم يك من المشركين یہ بتایا ہے کہ باوجود اتنی خوبیوں کے وہ خدا ہی کا بندہ رہا اور اپنے نفس کی خوبیوں کو اپنی طرف منسوب کر کے شرک کا مرتکب کبھی نہیں ہوا۔

شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ

(وہ) اس کے انعاموں کا شکر گزار تھا۔ اس (کے رب) نے اسے برگزیدہ کیا اور ایک سیدھی راہ کی طرف

مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۲۲﴾

اس کی راہنمائی کی۔

حلّ لُغَات۔ اجتباہُ اِجْتَبَاهُ کے معنے ہیں: اِخْتَارَهٗ وَ اصْطَفَاهُ اس کو چن لیا اور برگزیدہ کیا (اقرب)

تفسیر۔ یعنی وہ اپنی ہر ایک خوبی کو نعمت الٰہی سمجھتا تھا اور وہ ان تمام صفات کو خدا تعالیٰ کا دیا ہوا خزانہ قرار دیتا تھا۔ پس چونکہ وہ تمام نعمتوں کو خدا ہی کی عطا سمجھتا تھا۔ اس لئے جس قدر زیادہ اس کی خوبیاں نکھرتی تھیں اسی قدر وہ اپنے شکر اور انابت الی اللہ میں بڑھتا تھا۔

جب انسان میں یہ باتیں ہوں تو پھر اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ اس کو اپنے فضل کے لئے چن لیتا ہے چنانچہ فرمایا تب ان نیکیوں کے بدلے میں مَیں نے اس کو پسند کر لیا اور اس کو ہر خوبی سے متصف پا کر اپنا برگزیدہ بنا لیا تھا۔ اور اس کو ایسے راہ پر ڈال دیا جو مستقیم تھی۔ یعنی خدا تک پہنچانے والی تھی۔

مُسْتَقِيْمٍ کے لفظ میں اس طرف اشارہ ہے۔ کہ وہ خدا تعالیٰ تک پہنچانے والی راہ تھی کیونکہ مستقیم راستہ وہی ہوتا ہے جو دو نقطوں کے درمیان ہو۔ اور دین کے معاملہ میں ایک نقطہ انسان ہے اور دوسرا نقطہ خدا ہے۔ پس جو راستہ خدا تعالیٰ تک پہنچائے وہی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ہوگا۔ اور جو راہ خدا تعالیٰ تک نہیں پہنچاتا وہ مستقیم کہلا ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اس کا رخ اس نقطہ سے ہٹ گیا جس کی طرف پہنچنا مقصود تھا۔

اس آیت کا تعلق پہلی آیات سے یہ ہے کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ تم کو بھی انعام ملیں گے تم مکہ والوں کی طرح نہ بن جانا۔ جنہوں نے شریعت ہی کا انکار کر دیا۔ اور اپنے لئے خود ساختہ قانون کافی سمجھا۔ اور تم یہود کی طرح بھی نہ بننا۔ جنہوں نے خدائی شریعت میں اختلافات شروع کر دیئے۔ اور اس کی خلاف ورزی کرنے لگ گئے۔

اب بتاتا ہے کہ تم کیسے بننا۔ فرمایا تم ابراہیمؑ کی طرح بننا۔ جو اوصاف اس کے ہیں وہ اپنے اندر پیدا کرنا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو سلوک ہم نے ابراہیمؑ کے ساتھ کیا تھا وہی تمہارے ساتھ کریں گے۔ وہ سلوک کیا تھا؟ اگلی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

وَ اٰتَيۡنٰهُ فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً ؕ وَ اِنَّهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ لَمِنَ

اور ہم نے اسے دنیا میں (بھی بڑی) کامیابی بخشی تھی۔ اور وہ آخرت میں (بھی)

الصّٰلِحِيۡنَ ؕ﴿۱۲۳﴾

یقیناً صالح لوگوں میں سے ہوگا۔

تفسیر ۔ان صفات کی وجہ سے ہم نے ابراہیمؑ کو دنیا میں بھی بڑی ترقیات دی تھیں۔ اور اس کو دنیا میں آرام کی زندگی عطا کی تھی اور آخرت میں بھی وہ صالحین میں سے ہوگا۔

مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ کا مطلب مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ سے مراد جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں (نحل رکوع ۱۲) یہ ہے کہ اس کی طاقتیں مرنے کے بعد اگلے جہان کی اعلیٰ ترقیات سے کامل مناسبت رکھنے والی ہوں گی۔ یعنی وہ اعلیٰ سے اعلیٰ انعامات پانے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی قابلیت رکھتا ہوگا۔

حضرت ابراہیمؑ کی دنیوی ترقی اس آیت میں جہاں یہ بتایا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو یہ انعامات ہم نے دیئے تھے۔ وہاں اس سے یہ ظاہر کرنا بھی مقصود ہے کہ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ابراہیمؑ کے لئے تو بگڑنے کا موقعہ ہی نہ تھا۔ کیونکہ وہ دنیاوی ترقیات سے محروم تھا۔ فرماتا ہے اگر کوئی یہ کہے تو یہ غلط ہوگا۔ ہم نے اسے دنیوی ترقیات بھی دی تھیں (چنانچہ بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود دوسرے ملک سے ہجرت کر کے آنے کے حضرت ابراہیمؑ کی مالی حالت بھی بہت اعلیٰ ہوگئی تھی اور حکومت بھی حاصل ہوگئی تھی۔ پیدائش باب ۱۳ آیت ۲، ۱۴ تا ۱۶)

مگر باوجود اس کے وہ خدا تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ رہے۔ پس اے مسلمانو! جب تم کو بادشاہت ملے تو ابراہیم کی طرح تمام ترقیات کو خدا تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتیں اور امانتیں سمجھنا۔ اور مغرور نہ ہو جانا۔

ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

اور (اے رسول) ہم نے تجھے وحی کے ذریعہ سے حکم دیا ہے کہ (ہماری) کامل فرمانبرداری پر ہمیشہ قائم رہنے والے ابراہیم کے طریق کی پیروی کر اور (اے مکہ والو جانتے ہو کہ) وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔

حلّ لُغات۔ مِلَّةٌ مِلَّةٌ کے معنوں کے لئے دیکھو ابراہیم آیت نمبر ۱۴۔

اَلْمِلَّةُ: اَلشَّرِيْعَةُ اَوِالدِّيْنُ۔ شریعت اور دین کو ملت کہتے ہیں۔ وَقِيْلَ الْمِلَّةُ وَالطَّرِيْقَةُ سَوَاءٌ۔ بعض کہتے ہیں کہ ملت اور طریقہ ہم معنے لفظ ہیں۔ وَهِيَ اِسْمٌ مِنْ اَمْلَيْتُ الْكِتٰبَ ثُمَّ نُقِلَتْ اِلٰى اُصُوْلِ الشَّرَائِعِ بِاِعْتِبَارِ اَنَّهَا يُمْلِيْهَا النَّبِيُّ اور ملت اسم ہے جو اَمْلَيْتُ الْكِتَابَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے پھر وہ شریعت کے اصول کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ کیونکہ شریعت کے اصول نبی لکھاتا ہے۔ وَقَدْ تُطْلَقُ عَلَى الْبَاطِلِ كَالْكُفْرِ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ اور کبھی یہ لفظ جھوٹے مذہبوں پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ کے محاورہ سے ظاہر ہے۔ وَلَا تُضَافُ اِلَى اللّٰهِ وَلَا اِلٰى آحَادِ الْاُمَّةِ۔ اور یہ اللہ کی طرف منسوب نہیں ہوتا۔ اور نہ امت کے کسی فرد کی طرف۔ یعنی دِيْنُ اللّٰهِ تو کہہ سکتے ہیں مگر مِلَّةُ اللّٰهِ نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح قوم کی ملت کہیں گے زید یا بکر کی ملت کا لفظ نہیں بولیں گے۔ (اقرب)

تفسیر۔ ترقیات کے موقعہ پر توکل اور ایمان رکھنے کی نصیحت اس آیت میں گویا اس مضمون کو جو میں اوپر بیان کر آیا ہوں خود اللہ تعالیٰ نے کھول کر بیان فرما دیا ہے اور مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ تم ابراہیم کے طریق پر چلنا۔ اور پھر مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ کو دہرا کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ تم بھی ترقیات کے موقعہ پر خدا تعالیٰ کا توکل اور اس پر ایمان نہ چھوڑنا۔

اس آیت سے بعض مسیحی یہ غلط استدلال کرتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابراہیمی دین ہی کے تابع تھے۔ حالانکہ اس آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جیسے اس نے کمال پیدا کیا اور شکرگزاری دکھائی ویسے ہی تم بھی کرو۔ یعنی تفصیلات میں اطاعت مراد نہیں بلکہ ان امور میں نقش قدم پر چلنے کی ہدایت دی گئی ہے جن کا اوپر کی آیت میں ذکر ہے۔ اور اس میں کیا شبہ ہے کہ ان امور پر چلنے

کی ہر شخص کو ضرورت ہے اور آدم سے لے کر آخری انسان تک کوئی ان صفات سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ ابراہیمؑ سے پہلے بھی جو لوگ خدا رسیدہ تھے انہی صفات کے حامل تھے اور ابراہیم بھی۔ ابراہیمؑ کا نام خصوصاً اس لئے لیا گیا ہے کہ مکہ کے لوگ ان کو اپنا باپ کہتے تھے (محاضرات تاریخ الامم الاسلامیة جلد ا صفحہ ۵۶) اور باپ کی مثال دے کر غیرت دلانا اصلاح کا بہترین طریق ہے۔

سر ولیم میور اس آیت پر لکھتا ہے کہ محمدؐ صاحب پر اس جہالت کے زمانہ میں یہ علم منکشف ہوگیا تھا کہ خدا تعالیٰ کی رسالت اور نبوت تمام قوموں میں مسلسل طور پر جاری ہے (لائف آف محمد زیر عنوان گرینڈ کیتھولک فیتھ)۔ (اللہ تعالیٰ بعض دفعہ دشمن کے منہ سے بھی حق کہلوا دیتا ہے)

إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۖ وَإِنَّ

سبت (کا وبال) انہی لوگوں پر ڈالا گیا تھا جنہوں نے اس میں اختلاف کیا تھا۔ اور تیرا رب اس امر کے متعلق جس

رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

میں وہ اختلاف کرتے تھے یقیناً قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔

حلّ لُغات۔ اَلسَّبْتُ یہ سَبَتَ (یَسْبِتُ) کا مصدر ہے اور سَبَتَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں اِسْتَرَاحَ۔ اس نے آرام کیا۔ نیز اس کے معنے ہیں ہفتہ کا روز۔ (اقرب)

تفسیر۔ سبت کے ذکر پر مفسرین کی حیرانگی اس جگہ مفسرین بہت حیران ہوئے ہیں کہ سورۃ النحل مکی ہے اس میں سبت کے ذکر کا کیا تعلق تھا۔ انگریز مفسرین نے ایک اور شگوفہ چھوڑا ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کا ذکر اس آیت سے پہلے تھا مگر وہ آیت قرآن سے ضائع ہوگئی ہے اور یہ آیت رہ گئی ہے جس کی وجہ سے عبارت کا ربط جاتا رہا ہے۔

سبت کے ذکر کے متعلق مختلف مفسرین کا خیال بعض مفسرین نے کہا ہے کہ چونکہ مسلمانوں کو بھی نیکیوں کا حکم دیا گیا تھا۔ اس لئے ایک نیکی کے حکم اور اس کی خلاف ورزی کے انجام کا ذکر کرکے مسلمانوں کو ڈرایا ہے تا وہ احتیاط رکھیں۔

بعض نے سبت کے لفظ سے سبت کے توڑنے کا عذاب مراد لیا ہے۔ یعنی وہ عذاب ان کے لئے تھا جنہوں

نے اس میں اختلاف کیا تھا (کشاف زیر آیت ھذا)۔

سبت ایک جدید مفسر نے اس جگہ سبت کے معنے قطع کے بھی کئے ہیں (بیان القرآن از چوہدری محمد علی صاحب زیر آیت ھذا)۔مگر ایسے موقعوں پر ان معنوں میں عرب لوگ ہرگز اس لفظ کو استعمال نہیں کرتے۔

سبت کے معنی وبال کے میرے نزدیک سبت کے وبال کے معنے ہی ٹھیک ہیں۔قرآن مجید میں بھی اور عربی زبان میں بھی اس بات کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ مضاف حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کا قائم مقام بنا دیتے ہیں۔ پس ''جُعِلَ السَّبْتُ'' کے یہ معنے ہیں کہ سبت کا اثر صرف ان لوگوں پر ہوا تھا۔(اور وہ یقیناً برا اثر تھا) جنہوں نے اس میں اختلاف کیا تھا۔سورۃ بقرہ میں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ سبت کی حرمت کو توڑنے کی وجہ سے یہود کو سزا ملی تھی۔

سبت کے ذکر کا پہلی آیات سے تعلق اب یہ سوال بے شک پیدا ہوتا ہے کہ سبت کے ذکر کا پہلی آیات سے کیا ربط ہوا،تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہود میں نزول قرآن سے پہلے بھی یہ خیال تھا،اور آج تک ہے کہ ہماری ساری تباہی اور بربادی صرف سبت کے توڑنے کی وجہ سے ہے۔اور یہ کہ انہیں ہرگز ترقی نہ ملے گی جب تک وہ پھر سبت کی عزت کو قائم نہ کریں گے۔آج بیسویں صدی میں بھی جبکہ مسلمان جمعہ کی حرمت کو توڑ رہے ہیں۔اور عیسائی اتوار کو چھوڑ رہے ہیں۔ یہودیوں میں ایسی سوسائٹیاں بن رہی ہیں جو سبت کی حرمت کو قائم کرنے کی تبلیغ کر رہی ہیں فلسطین میں انہوں نے کئی گاؤں میں اس کو جبراً قائم کرنا چاہا۔جس کی وجہ سے وہاں کئی فسادات بھی ہو چکے ہیں۔پس جب یہود کو کہا گیا کہ اب تمہاری ترقی اسلام سے وابستہ ہے (دیکھو پچھلی آیات) تو ان کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ جس چیز یعنی سبت کے قائم کرنے پر ہماری عزت کا انحصار ہے۔مسلمانوں کے ساتھ ملنے سے تو ہم اس سے اور بھی دور جا پڑتے ہیں۔کیونکہ مسلمانوں میں جمعہ کی عزت کی جاتی ہے،اور ہمارے لئے ہفتہ کے دن کی عزت کرنا واجب ہے۔اور اس سوال کا جواب دینا ضروری تھا چنانچہ اس آیت میں اس سوال کا جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ تباہی خدا کے کلام کی نافرمانی سے آتی ہے۔سبت کے توڑنے پر تباہی بھی اسی وجہ سے آئی تھی۔کہ خدا نے اس کی عزت کا حکم دیا تھا اور اب جبکہ خدا کا یہ حکم ہے۔کہ اسلام کے ذریعہ جو نیا عہد قائم کیا گیا ہے۔اس میں داخل ہو جاؤ تو اب تباہی اس حکم کی خلاف ورزی سے آئے گی۔اس لئے اب تم سبت کی حرمت کو قائم کر کے بھی عزت حاصل نہیں کر سکتے۔اب عزت صرف اسلام میں داخل ہونے اور اس کی اتباع کرنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ

(اور اے رسول) تو (لوگوں کو) حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے اپنے رب کی راہ کی طرف بلا اور اس طریق

وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ

سے جو سب سے اچھا ہو۔ ان سے (ان کے اختلافات کے متعلق) بحث کر تیرا رب ان کو (بھی) جو اس کی راہ

ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ﴿۱۲۶﴾

سے بھٹک گئے ہوں۔ (سب سے) بہتر جانتا ہے۔ اور وہ ہدایت پانے والوں کو (بھی سب سے) بہتر جانتا ہے۔

حلّ لُغَات۔ اَلْحِكْمَة اَلْحِكْمَةُ کے معنے ہیں۔ اَلْعَدْلُ۔ عدل۔ اَلْعِلْمُ۔ علم۔ اَلْحِلْمُ۔ بردباری۔ اَلنُّبُوَّةُ۔ نبوت۔ قِیْلَ مَا یَمْنَعُ مِنَ الْجَهْلِ۔ جو جہالت سے روکے۔ وَقِیْلَ كُلُّ كَلَامٍ مُوَافِقُ الْحَقِّ۔ ہر وہ بات جو حق کے موافق ہو۔ وَقِیْلَ وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ مَوْضِعِهٖ وَصَوَابُ الْاَمْرِ وَسَدَادُهٗ اور بعض نے کہا ہے کہ کسی چیز کو برمحل رکھنا اور کسی معاملہ کا درست اور صحیح ہونا حکمت کہلاتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ چونکہ دین کی اشاعت اب وسیع ہونے والی تھی۔ اور یہود اور نصاریٰ میں جن کے پاس الٰہی کتابیں تھیں اسلام کی منادی ہونے والی تھی۔ اس لئے فرمایا کہ ان کے مقابلہ میں زیادہ مضبوطی کی ضرورت ہے۔ مشرکوں کے مقابلہ میں یہ آسانی تھی کہ شرک کا ردّ کر دینے سے ہی سب جھگڑے کا فیصلہ ہو جاتا تھا۔ مگر یہود نصاریٰ کے مقابلہ میں شریعت کی تفصیلی بحثوں میں بھی پڑنا لازمی تھا۔ اس لئے پہلے سے یہ تاکید کر دی کہ دعوۃ بالحکمۃ ہو۔

حکمت کے مختلف معنوں کے لحاظ سے آیت کے معنی حکمت کے معنی کئی ہیں۔ مثلاً علم، پختگی، عدل، نبوت، حلم اور بردباری۔ جو چیز جہالت سے روکے۔ جو کلام حق کے موافق ہو۔ محل و موقع کے مناسب حال بات۔ یہ سب معنے یہاں چسپاں ہوتے ہیں۔ فرمایا حکمت کے ساتھ بلاؤ۔ یعنی علمی باتوں کو بیان کرو۔ یعنی پہلے نبیوں کے صحیفوں پر مسائل کی بنیاد رکھ کر بات کرو۔ افسوس کہ مسلمان مفسروں نے اس حکم کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور لوگوں سے سن سنا کر بائیبل کے متعلق ایسے حوالے اپنی کتب میں لکھ دیئے ہیں کہ یہود اور عیسائیوں کو آج تک ان کی وجہ سے اسلام پر حملہ کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ دوسرے یہ فرمایا کہ پختہ باتیں بیان کرو کوئی بات بھی کچی نہ ہو۔

بعض دفعہ انسان تائیدی دلائل کو مستقل دلائل کی صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دشمن انہی کو پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ فرمایا۔ پہلے ہر دلیل کو اچھی طرح سے جانچ لو۔ جو پختہ اور مضبوط ہو اسی کو پیش کرو۔

عدل کے لفظ سے ایک نصیحت عدل کے معنی کے رو سے یہ ہدایت فرمائی کہ کسی پر ایسا اعتراض نہ کرو جو تم پر بھی پڑتا ہو۔ کیونکہ اول تو یہ انصاف سے بعید ہے۔ دوسرے دشمن موقعہ پا کر بحث میں اس بات کو پیش کر دیتا ہے اور پھر شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔

آریہ اور عیسائی صاحبان کا اسلام کے خلاف بے انصافی سے اعتراض کرنا آج کل آریہ اور عیسائی اسلام کے خلاف اسی بے انصافی سے کام لے رہے ہیں۔ یعنی وہ ایسے اعتراض اسلام پر کرتے ہیں جو ان کے مذہب پر زیادہ پڑتے ہیں۔ حالانکہ وہ باتیں جن پر وہ اعتراض کرتے ہیں۔ اگر عیب ہیں تو پھر وہ اپنے مذہب کو کیوں مانتے ہیں۔ اسلام ایسے اعتراضوں سے منع کرتا ہے۔ مگر افسوس کہ اس زمانہ کے مسلمان اس نصیحت سے بالکل غافل ہیں۔ اور احمدیہ جماعت کے بانی کے خلاف ایسے امور کو اعتراض کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ جو سب انبیاء میں پائے جاتے ہیں۔ اگر وہ امور قابل اعتراض ہیں تو ان کی وجہ سے سب ہی نبیوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔

حکمت کے معنی حلم کے (۴) حکمت کے معنے حلم کے بھی ہوتے ہیں۔ فرمایا کہ نرمی کے ساتھ اور عقل سے کام لیتے ہوئے بات کیا کرو۔ کیونکہ جو شخص ایسا نہیں کرتا بلکہ جلد تیز ہو کر غصے اور جوش میں آجاتا ہے وہ دوسرے کو ہرگز سمجھا نہیں سکتا۔

(۵) نبوت کے معنوں کی رُو سے یہ مطلب ہوگا کہ الٰہی کلام کی مدد سے لوگوں کو دین کی طرف بلاؤ۔ جو دلائل خود قرآن کریم نے دیئے ہیں انہی کو پیش کرو۔ اپنے پاس سے ڈھکونسلے نہ پیش کیا کرو۔ آہ! اگر اس گُر کو مسلمان سمجھتے تو یہودیت اور عیسائیت کو کھا جاتے۔ ہمارا ہتھیار قرآن کریم ہی ہے جس کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ (الفرقان: ۵۳) اس قرآن کی تلوار لے کر دنیا سے جہاد کے لئے نکل کھڑا ہو۔ پر افسوس کہ آج دنیا کی ہر چیز مسلمان کے ہاتھ میں ہے لیکن اگر نہیں تو یہی تلوار، جس کو لے کر نکل کھڑے ہونے کا حکم تھا۔

(۶) مَا يَمْنَعُ مِنَ الْجَهْلِ کی رُو سے آیت کا یہ مطلب بنے گا کہ تم ایسے طریق سے کلام کیا کرو۔ جس کو دوسرا سمجھ سکے۔ اور اس سے اس کی غلط فہمی دور ہو سکے۔ یعنی وہ بات ہونی چاہیے جو جہالت کا قلع قمع کرے۔ اور مخاطب کے فہم کے مطابق ہو۔ چنانچہ حدیث میں بھی آتا ہے۔ ''اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ اٰلِهٖ وَسَلَّمَ اَنْ نُكَلِّمَ النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ'' (فردوس الاخبار للدیلمی فصل امر امرنا) کہ ہم کو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ لوگوں سے ان کے فہم اور ادراک کے مطابق کلام کیا کرو۔ بعض لوگ لیکچر دیتے ہیں تو موٹے موٹے لفظ اور اصطلاحیں استعمال کر کے رعب ڈالنا چاہتے ہیں۔ ان تقریروں سے جاہلوں پر رعب تو ضرور پڑ جاتا ہوگا۔ مگر فائدہ ان کی تقریر سے کوئی نہیں اٹھاتا۔

(۷) مُوَافِقُ الْحَقِّ کلام کو بھی حکمت کہتے ہیں۔ ان معنوں کے رُو سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسی بات کیا کرو۔ جو سچی اور واقعات کے مطابق ہو۔ بعض لوگ یہ سمجھ کر کہ ہم سچے دین کی طرف ہی بلا رہے ہیں۔ بعض غلط باتوں کو بھی بیان کر دیتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ طریق غلط ہے۔ دشمن کے مقابلہ میں جو بات کہو سچی کہو۔ دوسروں کو ہدایت دیتے دیتے خود ہی گمراہ نہ ہو جاؤ۔ جیسے کہ فرمایا لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ (المائدة:۱۰۶) اگر تم ہدایت پر قائم رہتے ہو۔ تو اس کی پرواہ نہ کرو کہ دوسرا گمراہ ہوتا ہے۔ یعنی کوئی ایسی بات جو گناہ ہو اس خیال سے نہ کرو کہ اس کے ذریعہ سے میں دوسرے کو ہدایت دوں گا۔ جب تمہاری ہدایت اور دوسرے کی ہدایت ٹکرا جائے تو اس وقت تم اپنی ہدایت کی فکر کرو۔ اور دوسرے کی ہدایت کو خدا پر چھوڑ دو۔ کہ اللہ تعالیٰ یہ پسند نہیں کرتا کہ مومن کافر ہو جائے اور کافر مومن۔ وہ تو دوسروں کو ہدایت دینا چاہتا ہے۔

(۸) حکمت۔ محل و موقع کے مناسب کلام کو بھی کہتے ہیں۔ ان معنوں کے رو سے مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ تبلیغ میں برمحل بات کرنی چاہیے۔ اگر بعض دلائل سے دشمن کے برانگیختہ ہونے کا اندیشہ ہو، اور خطرہ ہو کہ وہ اس طرح سے تمہاری بات نہ سنے گا۔ تو یہ مناسب نہیں کہ بلاوجہ اس کو چڑاؤ۔ تم اس کے سامنے دوسرے دلائل بیان کرو جن کو وہ ٹھنڈے دل سے سن سکے۔ گویا بات کرتے وقت پہلے مزاج شناسی کر لو۔ اگر تم ان کو خواہ مخواہ بھڑکاؤ گے، تو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

اللہ اللہ کیا مختصر الفاظ میں تبلیغ کے سب گُر بیان کر دیئے ہیں۔ جو شخص بھی ان پر عمل کرے گا کبھی اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے گا۔

اَلْمَوْعِظَةُ الْحَسَنَةُ موعظہ حسنہ کے معنے پہلے گزر چکے ہیں۔ (یعنی وہ کلام جو دلوں کو نرم کر دیتا ہو، اور ان پر گہرا اثر ڈالتا ہو) اس نصیحت سے مسلمانوں کو ادھر توجہ دلائی کہ خشک دلیلوں ہی سے کام نہ چلایا کرو۔ بلکہ جذبات کو ابھارنے والی بات بھی کیا کرو۔ اور حکمت کے ساتھ موعظہ حسنہ کو بھی شامل رکھا کرو۔ حسنہ کا لفظ رکھ کر بتا دیا کہ جھوٹی غیرتیں نہ دلاؤ۔ جیسا کہ آج کل کے جاہل علماء لوگوں کو بلاوجہ راستبازوں کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔

جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ کہنے سے مراد جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ کہہ کر یہ بتایا ہے کہ ان سے جھگڑا

کرتے وقت یہ بھی مدنظر رکھا کرو۔ کہ مختلف دلائل میں سے جو سب سے اعلیٰ اور مضبوط دلیل ہو، اس کو بطور بنیاد اور مرکز کے قائم کیا کرو۔ اور باقی دلائل کو اس کے تابع۔ کیونکہ تائیدی دلیل کے ٹوٹ جانے سے اصل دلیل کو کوئی ضعف نہیں پہنچتا۔ برخلاف اس کے کہ اگر مرکزی نقطہ کمزور ہو تو مضبوط تائیدی دلائل بھی کوئی زیادہ فائدہ نہیں دیتے اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ میں بتلایا ہے کہ تم اچھی طرح سے تبلیغ کرتے رہو۔ لیکن اگر لوگ نہ مانیں تو اس سے یہ نتیجہ نکال کر مایوس نہ ہو جانا کہ ہمیں تبلیغ کرنی ہی نہیں آتی۔ کیونکہ بہت ممکن ہے کہ تمہاری تبلیغ میں کوئی نقص نہ ہو۔ مگر مخاطب کے دل پر اس کے گناہوں کا ایسا زنگ ہو کہ خدا تعالیٰ اس کے لئے ہدایت کی کھڑکی نہ کھولے۔

غرض تبلیغ میں منہمک رہنا چاہیے۔ نتیجہ نکالنا اور اثر پیدا کرنا خدا تعالیٰ کا کام ہے۔

وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَ لَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۲۷﴾

اگر تم (لوگ زیادتی کرنے والوں کو) سزا دو تو جتنی تم پر زیادتی کی گئی ہو تم اتنی (ہی) سزا دو اور (ہمیں اپنی ذات کی قسم ہے کہ) اگر تم صبر کرو گے تو صبر کرنے والوں کے حق میں وہ (یعنی صبر کرنا) بہتر ہوگا۔

حلّ لُغات۔ عَاقَبْتُمْ عَاقَبْتُمْ عَاقَبَ سے جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور عَاقَبَ فُلَانٌ بِذَنْبِهٖ (وَعَلٰی ذَنْبِهٖ مُعَاقَبَةً وَعِقَابًا) کے معنے ہیں، اَخَذَهٗ بِهٖ اس کے قصور پر گرفت کی اور سزا دی۔ پس اِنْ عَاقَبْتُمْ کے معنے ہوں گے اگر تم سزا دو۔ (اقرب)

تفسیر۔ بعض مفسرین نے پہلی آیات کو اس آیت سے منسوخ قرار دیا ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھ سکا کہ منسوخ ہونے والی ان میں کونسی بات ہے۔ کیا علم سے بحث کرنا حکمت اور پختہ بات اور سچی بات کا کہنا اور بردباری سے کلام کرنا منسوخ ہیں یا منسوخ ہونے والی باتیں ہیں؟ پس یہ آیتیں ہرگز منسوخ نہیں۔

اس آیت کا مطلب صرف یہ ہے کہ تمہارے دشمن تمہاری دعوۃ بالحکمۃ کو سن کر نہیں مانیں گے بلکہ تمہارے قتل کرنے کے لئے تلواریں اٹھائیں گے۔ تو فرمایا کہ جب ایسا ہو تو تم کو بھی اپنے دفاع کے لئے تلوار اٹھانے کی اجازت ہوگی۔

یہ کتنا معجزانہ کلام ہے کہ ابھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں ہیں، یہود سے کوئی مقابلہ شروع نہیں ہوا نہ نصاریٰ سے۔مگر مکہ ہی میں یہ خبر دے دی گئی کہ یہود بھی اور نصاریٰ بھی تم پر ظلم اور زیادتی کریں گے۔اور اس وقت دفاع کے طور پر تم کو ان کے مقابلہ کی اجازت ہوگی۔ہاں یہ نصیحت یاد رکھنا کہ جلد بازی نہ کرنا اور پہلے صبر کا نمونہ دکھانا پھر کوئی چارہ نہ رہے تو مقابلہ کرنا۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی پوری تعمیل کی اور دیر تک اہل کتاب کے ظلم سہے اور آخر مجبوراً ان کے مقابلہ پر نکلے۔

جہاد کا حکم دیتے ہوئے قرآن مجید کی اخلاقی خوبی قرآن کریم کی یہ کتنی بڑی اخلاقی خوبی ہے کہ جہاد کا حکم دینے سے پہلے اس نے اس کی حدود و قیود کو بیان کرنا شروع کر دیا ہے تا زیادتی کرنے کا احتمال ہی باقی نہ رہے۔

عقاب کے لفظ میں یہ اشارہ کیا ہے کہ ناجائز حملہ کا جواب ہی جہاد کہلاتا ہے، جارحانہ حملہ جہاد نہیں کہلا سکتا کیونکہ عقاب کا لفظ اس فعل کے متعلق بولا جاتا ہے۔جو دوسرے کے فعل کے جواب میں کیا جائے۔پس اس لفظ سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جب سزا دو، جرم کے بعد دو بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ کے الفاظ سے یہ ہدایت کی ہے کہ سزا دینی ہی پڑے تو بھی یہ خیال رہے کہ جتنی تم کو تکلیف پہنچائی گئی ہے۔اس سے زیادہ نہ ہو۔

لَئِنْ صَبَرْتُمْ میں صبر کی تلقین لَئِنْ صَبَرْتُمْ میں صبر کی ترغیب دی ہے اور بتایا ہے کہ صبر اپنے نتیجہ کے لحاظ سے نہایت ہی اعلیٰ ہوتا ہے۔

جنگ اُحد میں حضرت حمزہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چچا) اور شہداء احد کے ساتھ کفار نے یہ سلوک کیا کہ ان کے ناک اور کان بھی کاٹ دیئے (یعنی مثلہ کیا) مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صبر کیا۔اور موقعہ پانے پر بھی اس قبیح اور ننگِ انسانیت رسم کی اجازت نہ دی۔

بعض اوقات کفار معاہدات توڑتے تھے۔مگر آپؐ صبر ہی فرماتے تھے (السیرۃ النبویۃ لابن هشام غزوۃ احد)۔صبر کا نتیجہ بہتر ہوتا ہے۔بدلہ لینے سے صرف انسان کا غصہ دور ہو جاتا ہے۔مگر صبر کرنے کی صورت میں اس کی روحانیت ترقی کر جاتی ہے۔

وَ اصْبِرْ وَ مَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ

اور (اے رسول) تو صبر کر اور تیرا صبر کرنا اللہ (تعالیٰ کی مدد) سے ہی (وابستہ) ہے اور تو ان (لوگوں کی حالت)

وَ لَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

پر غم نہ کھا اور جو تدبیریں وہ کرتے ہیں ان کی وجہ سے تکلیف محسوس نہ کر۔

حلّ لُغَات۔ ضَيْقٌ ضَيْقٌ ضَاقَ (يَضِيْقُ) کا مصدر ہے اور ضَاقَ الشَّيْءُ کے معنی ہیں ضِدُّ اِتَّسَعَ۔ کوئی چیز تنگ ہوگئی۔ ضَاقَ الرَّجُلُ اس نے بخل سے کام لیا۔ نیز اَلضَّيْقُ کے معنے ہیں اَلشَّكُّ فِي الْقَلْبِ دل میں شک ہونا۔ مَا ضَاقَ عَنْهُ صَدْرُكَ جس سے دل تنگ پڑے اور تکلیف ہو۔ (اقرب) پس لَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ کے معنے ہوں گے کہ جو تدبیریں وہ کرتے ہیں ان سے تکلیف محسوس نہ کر۔

تفسیر۔ اس آیت میں صبر کا لفظ دوسرے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور مضمون میں تکرار نہیں ہے۔ اس جگہ صبر کا مفہوم یہ ہے کہ جب کفار کے ساتھ جنگ کی اجازت ملی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سمجھ لیا کہ اب کفار پر عذاب آنے والا ہے۔ اس لئے آپؐ پر یہ حکم نہایت شاق گزرا اور آپؐ کا دل بھر آیا۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ اے رسول، اللہ کا یہی فیصلہ ہے تم صبر کرو۔ گویا اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کے صدمہ میں ہمدردی کا اظہار فرماتا ہے۔

آنحضرتؐ کے اخلاق کا کمال اس آیت سے آپ کے اخلاق کا کمال ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو دن رات تنگ کرتے تھے اور حضور کی جان کے درپے رہتے تھے ان کی تباہی کی خبر پا کر بھی آپ بے چین ہوگئے حتّٰی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ''وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ'' کہ تجھے اتنا رنج ہے کہ ہم ہی تجھے توفیق دیں تو تُو صبر کر سکے گا۔ ورنہ یہ غم بہت زیادہ ہے۔

اس جملہ کے یہ بھی معنے ہو سکتے ہیں کہ تو صبر کر کیونکہ تیرا صبر کرنا اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ہے۔ اور ایسا صبر ہی اعلیٰ اخلاق میں سے ہوتا ہے۔ جو صبر کمزوری اور ضعف کی وجہ سے ہوتا ہے وہ بے چارگی ہے اعلیٰ اخلاق میں سے نہیں۔ طاقت رکھتے ہوئے خاموش رہنا ہی اعلیٰ اخلاق کو ظاہر کرتا ہے۔ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ سے اوپر کے معنوں کی تائید ہو جاتی ہے۔ حَزِنَ عَلَيْهِ دوسروں کی تکلیف پر غم کرنے پر بولا جاتا ہے۔ پس ان الفاظ کی موجودگی میں اس

آیت میں صبر کے معنے ذاتی تکلیف پر صبر کے کرنا بالکل بے جوڑ بات ہے۔ ان الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت میں صبر سے مراد دشمن کی تباہی پر غم نہ کرنا ہے۔

لَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ کا مطلب وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ۔ان الفاظ کے یہ معنی نہیں کہ ان کی شرارتوں پر غصے نہ ہو۔ بلکہ اس جگہ یہ الفاظ اسی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں جو بعض دفعہ ماں کے دل میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کی اولاد شرارت کر کے کسی عذاب میں مبتلا ہوتی ہے جس سے وہ ان کو بچا نہیں سکتی۔ اس وقت وہ ان کو خوب کوستی ہے۔ یہ کوسنا غصہ کا نہیں، غم اور رنج کا ہوتا ہے۔ اور اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ نہ تم ایسے کام کرتے اور نہ تم کو یہ دکھ پہنچتا۔ اور نہ تمہارے ساتھ میں دکھ پاتی۔ محمد رسول اللہ کے ایسے ہی جذبات کی اس جگہ ترجمانی کی گئی ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۶ / ۹ / ۲۲

اور یاد رکھ کہ اللہ (تعالیٰ) یقیناً ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جنہوں نے تقویٰ (کا طریق) اختیار کیا ہو۔ اور جو نیکوکار ہوں

تفسیر ۔متقی انسان وہ ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط کر لے۔ اور اتنا بڑھا لے کہ خدا تعالیٰ خود اس کی سپر بن جائے۔ اور اس کا محافظ ہو جائے اور محسن وہ ہے جو خود حفاظت میں آ جانے کے بعد دنیا کو بھی خدا کی حفاظت میں لانے کی کوشش کرے۔ پس محسن کا درجہ متقی سے اعلیٰ ہے۔

بعض لوگ خود بہت نیک ہوتے ہیں مگر دوسروں کو بچانے کی فکر نہیں کرتے۔ اور بعض دوسروں کی فکر تو کرتے ہیں۔ مگر اپنی ذاتی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی کامل معیت حاصل کرنے کے لئے دونوں باتیں ضروری ہیں یعنی متقی ہو اور محسن بھی۔

متقی کی تعریف اس جگہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے۔ کہ متقی کے یہ معنے نہیں جسے دنیا کی ہوش ہی نہ ہو۔ قرآن میں ایسے شخص کا نام جاہل آیا ہے۔ متقی تو وہ ہوتا ہے جس کے ہر کام میں خشیت خدا نظر آ رہی ہو۔ جو کوئی کام ہی نہیں کرتا۔ اس میں خشیت کہاں سے پیدا ہوگی۔ متقی کا تو لفظ ہی بتاتا ہے کہ وہ خطرات میں پڑتا ہے۔ مگر خدا اس کی حفاظت کرتا ہے۔ پس متقی وہ ہے، جو دنیا کے کاموں میں پڑے مگر اس کے بد اثر سے محفوظ رہے۔

محسن کے تین معنی محسن کے متعلق بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس کے معنے مسرف کے نہیں ہوتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں۔ کہ تو اگر اپنے وارثوں کے لئے مال چھوڑ جائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ

تو انہیں اس حالت میں چھوڑ جائے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں (بخاری کتاب النفقات باب فضل النفقة علی الاھل)۔

محسن کے یہ معنے بھی ہیں کہ وہ ایسے کام کرنے والا ہو، جن سے دنیا میں حسن پیدا ہو۔ جس نے اپنا گھر ہی اجاڑ لیا۔ اس نے حسن کیا پیدا کرنا ہے۔ پس محسن وہ ہے جو اپنا گھر محفوظ رکھتا ہے۔ اور پھر دنیا کی خبر گیری کرتا ہے۔ مگر اس کے یہ معنے بھی نہیں کہ خود تو عیاشیوں میں پڑا رہے لیکن جب خرچ کرنے کا موقعہ آئے تو کہے کہ میرے پاس کچھ نہیں۔

اسی طرح محسن وہ ہے جس کے فعل کا نتیجہ اچھا نکلے۔ پس جس کے اتفاق سے بد نتیجہ نکلے خواہ اخلاقی یا تمدنی وہ محسن نہیں ہے۔

اس آیت میں یہود و نصاریٰ سے جنگ کا نتیجہ بھی بتا دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کا ساتھ دے گا۔ اور ظاہر ہے۔ کہ جس کے ساتھ خدا ہو، اس پر کون فتح پا سکتا ہے۔

سُوْرَةُ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ مَکِّیَّةٌ

سورۃ بنی اسرائیل ۱؎ یہ سورۃ مکی ہے

وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ مِائَةٌ وَّاثْنَتَا عَشْرَةَ اٰيَةً وَاِثْنَا عَشَرَ رُكُوْعًا

اور بسم اللہ سمیت اس کی ایک سو بارہ آیات ہیں اور بارہ رکوع ہیں۔

وجہ تسمیہ ۱؎ اس سورۃ کا نام بنی اسرائیل اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس میں وہ واقعات بیان کئے گئے ہیں جو بنی اسرائیل کو پیش آئے تھے اور مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ تمہیں بھی یہ واقعات پیش آئیں گے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مثیل موسیٰ قرار دے کر مسلمانوں کو بنی اسرائیل قرار دیا گیا تھا۔ پس اس مشابہت کی وجہ سے مسلمانوں سے بھی یہود سے ملتے جلتے واقعات کا پیش آنا ضروری تھا۔ اور اسی کی طرف اس سورۃ میں توجہ دلائی گئی ہے۔ اور بنی اسرائیل کی تاریخ کے دو حصوں میں سے پہلے حصہ کو یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کے واقعات کو بیان کر کے مسلمانوں کی اس سے مشابہت بتائی گئی ہے۔ اس سورۃ کا دوسرا نام اسراء بھی ہے۔ کیونکہ اسے اسراء کے ذکر سے شروع کیا گیا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ اسراء اس کا اہم مضمون ہے۔

یہ سورۃ مکی ہے یہ سورۃ بعض کے نزدیک باجماع مکی ہے (بحر محیط سورة بنی اسرائیل) مگر بعض نے اختلاف کرتے ہوئے کہا ہے کہ دو سے آٹھ تک آیات مدنی ہیں۔ ابن عباسؓ اور زبیرؓ سے ابن مردویہؒ نے روایت کی ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور نہایت ابتداء میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے یعنی بعثت کے تیسرے چوتھے سال نازل ہوئی ہے۔

بخاری میں ابن مسعودؓ سے روایت ہے۔ ’’قَالَ فِيْ بَنِيْۤ اِسْرَائِيْلَ وَالْكَهْفِ وَ مَرْيَمَ اِنَّهُنَّ مِنَ الْعِتَاقِ الْاُوَلِ وَهُنَّ مِنْ تِلَادِيْ‘‘۔ (بخاری کتاب تفسیر القرآن باب قولہ و منکم من یرد الی ارذل العمر) یعنی عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں۔ بنی اسرائیل اور کہف اور مریم شروع میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے بھی پہلے حصہ کی ہیں اور یہ میرے پرانے مال میں سے ہیں یعنی جن سورتوں کو میں نے شروع میں یاد کیا ہے ان میں یہ سورتیں بھی ہیں۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری کی ساری سورۃ یا اس کا کچھ حصہ ابتدا میں نازل ہوا تھا۔ مگر یہ واضح نہیں کہ ابتدا سے ان کی کیا مراد تھی۔ یعنی عبداللہ بن مسعودؓ کے ذہن میں ابتدائی سالوں کی کیا تعیین تھی۔

میرے نزدیک یہ سورۃ بالکل ابتدائی سالوں کی نہیں ہے بلکہ چوتھے سال سے شروع ہو کر اس کا نزول دسویں

گیارہویں سال تک جا کر ختم ہوا ہے۔ بشرطیکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے حافظہ نے غلطی نہ کی ہو۔ اگر ایسا ہو تو یہ ساری سورۃ غالباً دسویں اور گیارہویں سال میں نازل ہوئی ہے۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ گیارہویں، بارہویں سال میں نازل ہوئی ہو۔ مسیحی مفسرین قرآن نے بھی اس سورۃ کا زمانہ نزول ۶ سنہ بعد نبوت سے لیکر ۱۲ سنہ بعد نبوت بتایا ہے۔ (تفسیر القرآن از وہیری جلد ۳ صفحہ ۵۲، ۵۳) یہ الٰہی تصرف ہے کہ ان لوگوں کے منہ سے یہ صداقت نکلی ورنہ ان کا فائدہ اس میں تھا کہ وہ اسے بعد ہجرت بتاتے۔

اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے تعلق پہلی سورۃ سے اس سورۃ کا یہ تعلق ہے کہ پہلی سورۃ میں مسلمانوں کی ترقی کی خبر دی تھی اور بتایا تھا کہ انہیں بڑی بڑی حکومتیں ملیں گی اور ساتھ ہی ہوشیار بھی کر دیا تھا کہ یہود نے ان نعمتوں کی قدر نہ کی اور ترقی کے ایام میں خدا کی عبادت کو بھول گئے۔ (اس امر کی طرف اشارہ سبت کے لفظ سے کیا گیا تھا۔ دیکھو سورۃ نحل ع ۱۶) اے مسلمانو! تم نہ بھولنا۔ بلکہ اس زمانہ میں پہلے سے زیادہ عبادت میں مشغول ہونا۔

اس سورۃ میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو ان ممالک کا بادشاہ بنا دیا جائے گا جن پر یہود کی حکومت تھی۔

کفار کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلہ اور مسلمانوں کی فتح کی پیشگوئی اس سورۃ کی ابتدا کو پہلی سورۃ کی انتہا سے یہ تعلق ہے کہ پہلی سورۃ کے آخر میں یہ پیشگوئی تھی کہ اب عنقریب تمہارا مقابلہ اہل کتاب سے شروع ہوگا اور وہ بھی تم کو کفار کی طرح دکھ دیں گے لیکن ان کے مقابلہ پر بھی اس وقت تک صبر سے کام لینا جب تک کہ مجبوری نہ ہو۔ اور یاد رکھنا کہ ان کے مقابل پر اللہ تعالیٰ تم کو اسی طرح فتح دے گا جس طرح کفار مکہ پر فتح دینے کا وعدہ ہے۔ اب سورۃ اسراء میں اس مقابلہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ وہ مقابلہ مدینہ میں جا کر شروع ہوگا۔ اور یہ کہ اس مقابلہ کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ان کے مقدس مقامات پر مسلمانوں کو قبضہ اور حکومت حاصل ہو جائے گی۔

یہودیوں کی دو تباہیوں کے ذکر سے مسلمانوں کی دو تباہیوں کی پیشگوئی اس سورۃ میں خصوصیت کے ساتھ یہود کی دو تباہیوں کا ذکر فرمایا ہے کہ دو دفعہ خاص طور پر انہوں نے نافرمانی کی اور دونوں دفعہ ہی وہ خطرناک عذاب میں گرفتار ہوئے۔

اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ مسلمانوں پر بھی ایسی تباہی کے دو زمانے آنے والے ہیں مگر ساتھ ہی امید بھی دلا دی کہ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیّن ہیں اس لئے آپ کا سلسلہ یہود کی طرح تباہ نہ ہوگا بلکہ ان ابتلاؤں کے بعد اور بھی شان سے چمک اٹھے گا۔

پہلی سورۃ میں جو بعض باتیں اشارۃً فرمائی تھیں اس سورۃ میں ان کو واضح کیا گیا ہے۔ مثلاً پہلی سورۃ میں شہد کے متعلق فرمایا تھا کہ ”فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ“ اور اس سے اشارہ کیا تھا کہ کلام الٰہی میں بھی شفا ہے۔ اس سورۃ میں اس مضمون کو بوضاحت بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (آیت: ۸۳)

ترتیب نزول یہ سورۃ نزول میں سورۃ نحل سے پہلے ہے۔ مگر مضمون کی ترتیب کے لحاظ سے بعد میں رکھے جانے کے قابل ہے۔ اس لئے جمع قرآن کے وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسے سورہ النحل کے بعد رکھا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ سورتوں کے نزول کی ترتیب اور تھی لیکن جمع قرآن کے وقت اس ترتیب کو بدل دیا گیا۔ کیونکہ سارے قرآن کریم کو پڑھتے ہوئے اور بعد میں آنے والوں کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسری ترتیب کی ضرورت تھی۔ اور یہ امر قرآن کریم کے زبردست معجزات میں سے ہے۔ اس کی ہر سورۃ الگ الگ مضمون پر مشتمل ہے اور ساتھ ہی اس کے اس کی سورتوں میں زبردست اتصال بھی پایا جاتا ہے۔ جب نزول قرآن کے وقت الگ الگ سورتیں نازل ہو رہی تھیں اور اس وقت کی ضرورت کو مدنظر رکھا جاتا تھا تب بھی پڑھنے والوں کو کوئی مشکل پیش نہ آتی تھی۔ کیونکہ ہر سورۃ کا مضمون مکمل تھا۔ مگر جب بعد میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے دوسری ترتیب سے مرتب کیا تو پھر علاوہ اس مضمون کے جو الگ الگ سورتوں سے نکلتا تھا ایک اَور سلسلہ مضمون پیدا ہو گیا جس نے قرآنی مضامین کو اور زیادہ وسعت دیدی۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

اسراء کے ذکر سے شروع کرنے میں حکمت اسراء کے ذکر سے اس کو یہ بتانے کے لئے شروع کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو موسیٰ علیہ السلام کا جانشین مقرر کیا گیا ہے۔ اس لئے ان مقامات پر بھی آپ کو قبضہ دیا جائے گا جن کا حضرت موسیٰؑ اور ان کے اتباع سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اور یہ بتانے کے لئے کہ موسیٰؑ کی طرح آپ کو بھی ہجرت کرنی پڑے گی اور وہ ہجرت آپ کی قوم کی ترقی کا موجب ہوگی۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کا ذکر شروع کیا کہ کس طرح موسیٰؑ کو بھیجا اور ان کی قوم کو ان کے ذریعہ ترقی دی۔ کس طرح انہیں متنبّہ کیا کہ ترقی کے زمانہ میں غافل نہ ہونا مگر انہوں نے اس نصیحت سے فائدہ نہ اٹھایا اور سخت سزا پائی۔ پھر فرماتا ہے کہ اس قرآن کو ہم نے تورات سے بھی زیادہ مؤثر بنایا ہے اس کے ذریعہ سے اس سے بھی بڑھ کر تبدیلی ہوگی مگر اس کے راستہ میں بھی وہی خطرہ ہے کہ جب دولت آجائے گی تو فسق و فجور بھی آجائے گا۔

دنیا کا کمانا تو برا نہیں مگر اس کے ساتھ خدا کا بھی خیال رکھنا چاہیے اور نیکی کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔ پھر نیکی کے اصول بتائے ہیں۔ پھر فرماتا ہے کہ منکرین قرآن جب ان اصول کو سنتے ہیں تو بجائے غور کرنے کے اعراض اور تکبر

سے کام لیتے ہیں اور اپنے انجام کا خیال نہیں کرتے۔ اگر انجام کی طرف توجہ دلائی بھی جائے تو پروا نہیں کرتے۔ لیکن قرآن کریم کے مخالف خواہ بیرونی ہوں یا اندرونی سخت سزا پائیں گے۔ چنانچہ قرب قیامت میں یعنی زمانہ مسیح موعود میں ایک سخت عذاب دنیا پر تکذیب قرآن کی وجہ سے نازل ہوگا اور اس وقت پھر ایک جنگ خدا کے فرشتوں اور ابلیس کے درمیان ہوگی۔ اس جنگ میں آدم کے متبعین کو غلبہ دیا جائے گا۔

قرآن کریم کے ابد الآباد تک رہنے کی پیشگوئی لوگ چاہتے ہیں کہ تجھے تباہ کر دیں مگر ہم نے تو تیرے لئے ایک عظیم الشان مقصد تجویز کر رکھا ہے۔ ہم تیرے نام کو آخر زمانہ تک اور دنیا کے کناروں تک پھیلائیں گے اور تیری قابلیت کو دنیا پر ظاہر کیا جائے گا۔ ہم نے اس قرآن کو ایسا بنایا ہے کہ وہ ابد الآباد تک کام آئے گا۔ اور روحانی خزانے اس کے ذریعہ سے آہستگی کے ساتھ دنیا پر ظاہر کئے جائیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ بخیل نہیں ہے۔ پھر آخر میں آخری زمانہ کی علامت بیان فرمائی گئی ہے۔ اور اس کے شر سے بچنے کا ذریعہ دعا کو بتایا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ①

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر (شروع کرتا ہوں) جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

پاک (ذات اور پاک صفات) ہے وہ (خدا) جو رات کے وقت اپنے بندہ کو (اس) حرمت والی مسجد سے (اس)

اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ؕ

دور والی مسجد تک جس کے اردگرد کو (بھی) ہم نے برکت دی ہے (اس لئے) لے گیا کہ تا ہم اسے اپنے بعض نشان

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ②

دکھلائیں یقیناً وہی (خدا) ہے جو (اپنے بندوں کی پکار کو) خوب سننے والا (اور ان کی حالتوں کو) خوب دیکھنے والا ہے

حلّ لُغات۔ سُبْحٰنَ سُبْحٰنَ کے معنے کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۱۹۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ اَیْ اُبَرِّئُ اللّٰهَ مِنَ السُّوْءِ بَرَاءَةً۔ سبحان کے معنی عیوب سے پاک سمجھنے اور پاک کرنے کے

ہیں۔(اقرب)

اَسْرٰی بِہٖ اَسْرٰی بِہٖ کے معنے ہیں۔اس کو رات کے وقت لے گیا۔مزید تشریح کے لئے دیکھو حجر آیت نمبر ۶۶۔

اَسْرِ سَرَی سے باب افعال کا صیغہ امر ہے اور سَرَی الرَّجُلُ کے معنی ہیں سَارَ عَامَّۃَ اللَّیْلِ رات کا اکثر حصہ چلا۔اَسْرَی الرَّجُلُ اِسْرَاءً مِثْلُ سَرَی۔اور اَسْرٰی (باب افعال ثلاثی مزید) کے معنے سَرٰی (ثلاثی مجرّد) کے ہی ہیں۔وَقِیْلَ اَسْرٰی لِاَوَّلِ اللَّیْلِ وَسَرٰی لِاٰخِرِ اللَّیْلِ۔اور بعض محققین لغت کہتے ہیں کہ اَسْرٰی کا فعل رات کے ابتدائی حصہ میں چلنے کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔اور سَرٰی کا فعل رات کے آخری حصہ میں چلنے پر۔اَسْرَاہُ وَاَسْرٰی بِہٖ (متعدی) کے معنی ہیں۔سَیَّرَہٗ بِاللَّیْلِ اَیْ سَیَّرَہٗ لَیْلًا یعنے اسے رات کو روانہ کیا۔(اقرب)

اَلْعَبْدُ اَلْعُبُوْدِیَّۃُ اِظْھَارُ التَّذَلُّلِ وَالْعِبَادَۃُ اَبْلَغُ مِنْھَا لِاَنَّھَا غَایَۃُ التَّذَلُّلِ۔عبودیت کے معنے عاجزی کے اظہار کے ہیں اور لفظ عبادۃ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ اس کے معنے انتہائی عاجزی کرنے کے ہیں۔وَلَا یَسْتَحِقُّھَا اِلَّا مَنْ لَہٗ غَایَۃُ الْاِفْضَالِ وَھُوَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔اور انتہائی عاجزی اسی کے سامنے کی جاسکتی ہے جس کے انعام واکرام بہت زیادہ ہوں اور ایسی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہی ہے۔وَالْعِبَادَۃُ ضَرْبَانِ عِبَادَۃٌ بِالتَّسْخِیْرِ وَعِبَادَۃٌ بِالْاِخْتِیَارِ۔اور عبادت کی دو اقسام ہیں (۱) کسی چیز کا بلاارادہ عبادت کرنا یعنی اس کا اللہ تعالیٰ کے لئے عاجزی کرنا۔(۲) اختیاری عبادت اور یہ انسانوں کے ساتھ خاص ہے۔

وَالْعَبْدُ یُقَالُ عَلٰی اَرْبَعَۃِ اَضْرُبٍ۔اور عبد کا لفظ چار طرح پر استعمال ہوتا ہے۔(۱) عَبْدٌ بِحُکْمِ الشَّرْعِ۔شریعت کے رو سے غلام۔جس کا بیچنا اور خریدنا جائز ہو۔ان معنوں کے اعتبار سے لفظ عَبْدٌ کی جمع عِبِیْدٌ ہوگی۔(۲) عَبْدٌ بِالْاِیْجَادِ وَذٰلِکَ لَیْسَ اِلَّا لِلّٰہِ۔پیدا کئے جانے کے باعث عبد کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور اس لحاظ سے عَبْدٌ کی اضافت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہوگی۔کیونکہ صرف خالق وہی ذات ہے۔(۳) عَبْدٌ بِالْعِبَادَۃِ وَالْخِدْمَۃِ۔عبادت اور خدمت کے باعث عبد کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔اس لحاظ سے لوگ دو حصوں میں منقسم ہو جائیں گے جو محض اللہ تعالیٰ کے لئے عبادت کرنے والے ہیں۔یعنی عَابِدٌ ان معنوں کے لحاظ سے اس کی جمع عِبَادٌ آتی ہے۔(۴) دنیا کے غلام اور دنیا دار۔(مفردات)

اَلمسجدُ الحرامُ اَلْمَسْجِدُ الْحَرَامُ اَلْکَعْبَۃُ۔مسجد حرام کعبہ کو کہتے ہیں۔

الاقصیٰ اَلْاَقْصٰی قَصٰی سے اسم تفضیل ہے اور قَصَی (یَقْصُوْ وَقَصِیَ یَقْصٰی) اَلْمَکَانُ کے معنے ہیں بَعُدَ کوئی جگہ دور ہوگئی۔ اور اَقْصٰی کے معنے ہیں۔ اَبْعَدُ۔ بہت دور۔ اس کی جمع اَقَاصِیْ آتی ہے۔ (اقرب) پس اَلْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی کے معنے ہوں گے دور والی مسجد۔

تفسیر۔ آیت اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ کی تفسیر میں اختلاف یہ آیت ان معرکۃ الآراء آیتوں میں سے ہے جن کے متعلق مفسرین میں بہت اختلاف رہا ہے۔ اس آیت کے متعلق قریباً سب سابق مصنف۔ مفسرین اور نیز اس زمانہ کے مفسر کہتے ہیں کہ اس میں معراج کا واقعہ بیان کیا گیا ہے گو معراج کی تفاصیل میں شدید اختلاف ہے۔

یہ مسئلہ بوجہ اختلاف روایات اس قدر پیچیدہ ہوگیا ہے کہ مجھے اس کے سلجھانے کے لئے اس کے کئی حصے کرنے پڑیں گے۔ سب سے پہلے میں اس امر کو لیتا ہوں کہ اس آیت کے سوا قرآن کریم میں معراج کا واقعہ ایک اور جگہ بھی بیان ہوا ہے اور وہ سورۂ نجم ہے۔ اس جگہ پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

معراج کا ذکر سورۃ نجم میں اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۔ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۔ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ۔ وَ هُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۔ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۔ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۔ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۔ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۔ وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۔ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۔ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۔ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰى ۔ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى (النجم: ۵ تا ۱۹) یعنی قرآن کریم ایک وحی الٰہی ہے اللہ تعالیٰ نے جو بڑی طاقتوں والا ہے محمد رسول اللہ کو یہ علم سکھایا ہے۔ وہ بڑی طاقت ظاہر کرنے والا اور حکومت کرنے والا خدا ہے۔ اور اس وقت اس نے یہ کلام نازل کیا جبکہ وہ (یعنی محمد رسول اللہ صلعم) اُفُقِ اَعلیٰ پر تھے (یعنی سب سے اعلیٰ مقام پر) محمد رسول اللہ خدا کے اور قریب ہوئے اور قریب ہو کر پھر نیچے کی طرف آئے یعنی بنی نوع انسان کے قریب ہوئے۔ حتیٰ کہ آپ دو قوسوں کے درمیان کی وتروں کی طرح ہو گئے بلکہ اس سے بھی قریب۔ یعنی دو مشترک وتروں کی جگہ ایک ہی وتر ہو گیا۔ اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ پر وحی نازل کی جو اس قرآن میں موجود ہے۔ دل نے جو کچھ دیکھا تھا اس میں اس نے غلطی نہیں کی (بلکہ فی الواقع اس نے ایسا ہی دیکھا تھا) کیا تم لوگ اس بارہ میں اس سے جھگڑتے ہو جو اس نے دیکھا۔ حالانکہ اس نے یہ بات ایک دفعہ نہیں بلکہ دو دفعہ دیکھی ہے اور اس نظارہ کا مقام سدرۃُ المنتہٰی ہے۔ اس سدرۃ المنتہٰی کے پاس ہی جنت کا مقام ہے۔ اس نے اس وقت اس نظارہ کو دیکھا تھا جبکہ سدرہ کو ایک عجیب پر شوکت جلوہ نے ڈھانک لیا تھا نظر نے بھی اس

وقت غلطی نہیں کی۔ نہ کوئی بات کم دیکھی اور نہ زیادہ۔ (بلکہ جو کچھ دیکھا ٹھیک دیکھا) اس وقت (محمد رسول اللہ صلعم نے) اس (یعنی اللہ تعالیٰ) کی بہت بڑی آیات دیکھیں۔

سورۃ نجم میں بیان شدہ امور معراج کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں یہ آیات معراج کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان آیات میں جن امور کا ذکر ہے وہ سب معراج سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً (۱) سدرۃ المنتہیٰ تک آپ کا جانا (۲) اس وقت سدرۃ المنتہیٰ پر کسی چیز کا نازل ہونا (۳) اس کے پاس جنت کا دیکھنا (۴) قاب قوسین کی حالت کا پیدا ہونا (۵) اللہ تعالیٰ کا دیکھنا (۶) کلام الٰہی کا وہاں نازل ہونا۔ یہ سب امور وہ ہیں کہ جن کا ذکر معراج کی حدیثوں میں آتا ہے۔ چنانچہ سدرۃ المنتہیٰ کا معراج میں دیکھنا حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں آتا ہے جسے ابن جریر۔ ابن ابی حاتم ابن مردویہ۔ البزار۔ ابویعلیٰ اور بیہقی چھ جامعین حدیث نے اپنی اپنی کتب میں نقل کیا ہے۔ اس کے یہ الفاظ ہیں کہ ثُمَّ انْتَهٰى اِلَى السِّدْرَةِ۔ پھر آپ معراج کی رات آسمان پر جانے اور انبیاء سے ملنے کے بعد آگے بڑھے۔ تو سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے۔ (الخصائص الکبریٰ باب خصوصیتہ صفحہ ۱۷۴)

اسی طرح ابن جریر۔ ابن المنذر۔ ابن ابی حاتم۔ ابن مردویہ۔ البیہقی اور ابن عساکر نے ابوسعید خدریؓ سے معراج کے بارہ میں روایت کی ہے۔ اس میں بھی آسمان پر جانے اور نبیوں سے ملنے کے بعد سدرۃ المنتہیٰ تک جانے کا ذکر ہے۔

اسی طرح مسند احمد بن حنبل۔ بخاری۔ مسلم اور ابن جریر میں مالک ابن صعصہ کی روایت معراج کے متعلق درج ہے۔ اس میں بھی لکھا ہے کہ ثُمَّ رُفِعْتُ اِلٰى سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى۔ یعنی نبیوں سے مختلف آسمانوں پر ملنے کے بعد مجھے اٹھا کر سدرۃ المنتہیٰ تک لے جایا گیا۔ (الخصائص الکبریٰ جلد اول صفحہ ۱۶۵)

نیز بخاری نے انسؓ سے روایت کی ہے اس میں بھی آسمان پر جانے اور نبیوں سے ملاقات کے بعد سدرۃ المنتہیٰ تک جانے کا ذکر ہے۔ (بخاری کتاب بدء الخلق باب المعراج۔ نیز الخصائص الکبریٰ جلد اول ص ۱۵۳)

دوسرا امر آیات قرآنیہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے ہیں اس وقت اسے کسی چیز نے ڈھانپا ہے۔ جیسے کہ الفاظ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى (النجم:۱۷) سے ظاہر ہے۔ اس کا ذکر بھی احادیث معراج میں آتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے بیان ہوا ہے کہ جب آپؐ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے تو فَغَشِيَهَا نُوْرُ الْخَلَّاقِ عَزَّوَجَلَّ (الخصائص الکبریٰ جلد اول ص ۱۷۴) یعنی اس وقت اللہ تعالیٰ کے نور نے سدرۃ کو ڈھانپ لیا۔ نیز مسلم نے انسؓ سے جو معراج کے متعلق روایت کی ہے اس کے یہ الفاظ

ہیں فَلَمَّا غَشِيَهَا مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ مَا غَشِيَ تَغَيَّرَتْ فَمَا اَحَدٌ مِنْ خَلْقِ اللّٰهِ يَسْتَطِيْعُ اَنْ يَنْعَتَهَا مِنْ حُسْنِهَا۔ یعنی جب آپ سدرۃ المنتہٰی تک پہنچے تو اللہ تعالیٰ کے ایک خاص فضل نے سدرہ کو ڈھانپ لیا اور اس میں ایسا تغیر ہوا کہ کوئی شخص اس کے حسن کی تعریف نہیں کرسکتا۔ (مسلم کتاب الایمان باب الاسراء برسول اللہ و فرض صلوٰۃ)

تیسری بات آیات قرآنیہ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ سدرہ کے پاس جنت بھی آپ نے دیکھی۔ اس کا ذکر بھی معراج کی احادیث میں آتا ہے۔ چنانچہ نبیوں کی ملاقات کے بعد آتا ہے کہ ثُمَّ اِنِّيْ رُفِعْتُ اِلَى الْجَنَّةِ پھر مجھے جنت تک لے جایا گیا۔ اور پھر اس کے بعد ہے کہ ثُمَّ اِنِّيْ رُفِعْتُ اِلٰى سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى یعنی جنت کے بعد مجھے سدرۃ المنتہٰی تک لے جایا گیا۔ یہ روایت ابوسعید خدریؓ کی ہے اور ابن جریر نے نقل کی ہے۔ (ابن جریر جلد ۱۵ ص ۱۱) اور ان کے علاوہ اور کتب حدیث میں بھی آتی ہے۔

معراج میں قاب قوسین کا مقام سورۂ نجم میں چوتھی بات یہ بیان کی ہے کہ ان نظاروں کے وقت میں ایک حالت پیدا ہوئی۔ جس کا نام فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى رکھا گیا ہے۔ معراج کی روایات میں اس کا ذکر بھی ہے چنانچہ حضرت ابوسعیدؓ کی مذکورہ بالا روایت میں سدرۃ المنتہٰی کے ذکر کے بعد یہ الفاظ ہیں کہ فَكَانَ بَيْنِيْ وَبَيْنَهٗ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى یعنے میرے اور اس کے درمیان صرف قاب قوسین یا اس سے بھی کم فرق رہ گیا۔ (میں اس جگہ احادیث کے الفاظ کی تشریح نہیں کرتا کہ اس کا کیا مطلب ہے صرف یہ بتاتا ہوں کہ حدیث معراج میں وہی حالات بیان ہوئے ہیں جو سورۂ نجم میں آئے ہیں)

معراج میں رؤیت باری تعالیٰ پانچویں بات سورۂ نجم کی آیات میں یہ بتائی گئی ہے کہ اس موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ جیسا کہ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى میں اشارہ کیا گیا ہے۔ معراج کی احادیث میں بھی یہ امر کئی روایات میں بیان ہوا ہے چنانچہ ایک روایت حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کی ابن مردویہ نے نقل کی ہے۔ اس میں آتا ہے کہ آپ سدرۃ المنتہٰی کا ذکر فرمارہے تھے کہ میں نے پوچھا یارسول اللہ آپ نے وہاں کیا دیکھا۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا۔ میں نے وہاں کچھ دیکھا۔ حضرت اسماءؓ فرماتی ہیں۔ آپ کی مراد یہ تھی کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا (الخصائص الکبریٰ جلد اول ص ۱۷۷) حضرت ابن عباسؓ کی روایت مسلم نے نقل کی ہے اس میں اوپر والی آیت کا ذکر کرکے بیان کیا ہے کہ رَاٰهُ بِفُؤَادِهٖ مَرَّتَيْنِ رسول کریم صلعم نے اپنے دل کی آنکھ سے اللہ تعالیٰ کو دو دفعہ دیکھا۔ (مسلم کتاب الایمان باب معنی و لقد راٰہ نزلۃً اُخریٰ)

شب معراج آنحضرتؐ کا اللہ تعالیٰ سے کلام چھٹی بات سورۂ نجم کی آیات میں یہ بیان کی گئی ہے۔ کہ

سدرۃ المنتہیٰ کے قریب اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم سے کلام کیا۔ جیسا کہ فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی کے الفاظ سے ظاہر ہے معراج کی احادیث میں اس امر کا بھی ذکر آتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث جو اوپر لکھی جا چکی ہے اس میں ذکر ہے کہ جب آپ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس پہنچے تو فَکَلَّمَہُ اللّٰہُ تعالٰی عِنْدَ ذٰلِکَ۔ اللہ تعالیٰ نے سدرۃ کے پاس آپ سے کلام کیا۔ (خصائص جلد اول ص ۱۷۴) اسی طرح ابن ابی حاتم نے انس بن مالکؓ سے روایت کی ہے۔ اور اس میں بھی یہ الفاظ ہیں کہ جب میں اس سدرہ کے پاس پہنچا تو قَالَ اللّٰہُ لِیْ یَا مُحَمَّدُ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے کلام کیا اور فرمایا کہ اے محمدؐ! (آگے لمبی بات بیان ہے)۔ (خصائص جلد اول ص ۱۵۵)

مذکورہ بالا مشابہتوں سے جو سورۂ نجم کی آیات اور واقعہ معراج میں پائی جاتی ہیں۔ یہ امر قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ سورۂ نجم میں معراج ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ ثابت کرنے کے بعد کہ سورۂ نجم میں جو رؤیت اور کلام اور سدرۃ المنتہیٰ کے دیکھنے کا ذکر ہے وہ معراج کا ہی واقعہ ہے۔ اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سورہ نجم بالاتفاق ۵ سنہ بعد نبوت میں یا اس سے پہلے نازل ہوئی ہے اور اس کے نزول کے ساتھ ایک ایسے عظیم الشان واقعہ کا تعلق ہے کہ اس کے نزول کے متعلق کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔ اور وہ واقعہ یوں ہے۔

سورۃ نجم کا تعلق ہجرت سے ۵ سنہ بعد نبوت میں رجب کے مہینہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض صحابہ کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ مکہ میں ظلم انتہا کو پہنچ گیا ہے اور مغرب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس طرف ایک ملک ہے جس میں کسی پر ظلم نہیں ہوتا تم وہاں چلے جاؤ۔ آپ کے حکم پر بعض لوگ مذکورہ بالا مہینہ اور مذکورہ بالا سال میں مکہ سے حبشہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ان میں آپ کے داماد حضرت عثمانؓ اور آپ کی صاحبزادی رقیہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ (زرقانی شرح مواہب، الھجرۃ الاولیٰ الی الحبشۃ)

تلاوت سورۃ نجم اور سجدہ کفار کی حقیقت کفار کو جب ان لوگوں کی ہجرت کا علم ہوا تو انہوں نے ان کا پیچھا کیا لیکن وہ ان کو پکڑ نہ سکے اور ان کے پہنچنے سے پہلے یہ لوگ کشتیوں میں سوار ہو کر حبشہ کو روانہ ہو گئے۔ اور وہاں امن سے رہنے لگے۔ کفار کو جب یہ خبر ملی تو انہوں نے عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ربیعہ کو وفد بنا کر نجاشی کے پاس بھیجا کہ وہ ان کو لوٹا دے۔ مگر اس نے ان کی بات نہ مانی اور یہ وفد ناکام لوٹا۔ اس وفد کی واپسی کے بعد ایک دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کفار مکہ آئے اور قرآن کریم سنانے کے لئے کہا۔ آپ نے سورۂ نجم پڑھ کر انہیں سنائی۔ اس میں سجدہ آتا ہے۔ آپ نے اس پر سجدہ کیا اور سب کفار نے بھی ساتھ ہی سجدہ کیا اور مشہور ہو گیا کہ مکہ کے

سب لوگ مسلمان ہو گئے ہیں۔ یا کم سے کم یہ کہ اس کے عمائدین مسلمان ہو گئے ہیں۔ کفار نے بعد میں یہ توجیہ کی کہ اس سورۃ کو پڑھتے وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے معبودوں کی بھی تعریف کی تھی۔ اس لئے انہوں نے سجدہ کیا تھا۔ مسلمان کہتے ہیں کہ شیطان نے اس وقت یہ کلمات بلند آواز سے کہہ دیئے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کہے۔ (میری تحقیق یہ ہے۔ کہ کفار نے مسلمانوں کے واپس لانے کی کوشش میں ناکام ہو کر حبشہ میں یہ جھوٹی خبر پہنچا دی کہ مکہ کے لوگ مسلمان ہو گئے ہیں تا کہ مسلمان خود واپس آ جائیں۔ جب بعض مسلمان واپس آ گئے تو اس خوف سے کہ مکہ کے قریب پہنچ کر جب ان کو اس خبر کا جھوٹ ہونا معلوم ہوگا وہ واپس چلے جائیں گے۔ انہوں نے یہ تدبیر کی کہ آپ کی مجلس میں آ کر قرآن سننے کی خواہش کی اور سجدہ کیا۔ تا کہ لوگوں میں یہ خبر مشہور ہو جائے اور مسلمان واپس نہ لوٹیں۔ اور جب یہ فائدہ اٹھا لیا تو بعد میں اپنے اَتباع کے سامنے شرمندگی سے بچنے کے لئے یہ جھوٹ بولا کہ چونکہ رسول کریم صلعم نے مشرکانہ کلمات کہہ دیئے تھے اس لئے ہم نے سجدہ کیا تھا۔ بہر حال اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔ یہ مضمون سورہ حج اور سورۂ نجم میں انشاء اللہ بیان کیا جائے گا) بہر حال پہلی ہجرت پر ابھی تین ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ بعض مسلمان مکہ کے لوگوں کے مسلمان ہونے کی خبر سن کر حبشہ سے واپس مکہ آ گئے۔ اس واقعہ سے جو تمام کتب تاریخ اور احادیث میں مذکور ہے ثابت ہے کہ سورۂ نجم شوال ۵ سنہ بعد نبوت سے یقیناً پہلے نازل ہو چکی تھی اور اس میں چونکہ معراج کا واقعہ درج ہے اس لئے معراج کا واقعہ بھی یقیناً شوال ۵ سنہ بعد نبوت سے پہلے ہو چکا تھا۔

زمانہ واقعہ معراج معراج کے واقعہ کی تاریخ بتانے کے بعد اب میں اس واقعہ کو لیتا ہوں جس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔ اور جس کے متعلق میں یہ نوٹ لکھ رہا ہوں۔ اس واقعہ کی نسبت زرقانی شرح مواہب میں لکھا ہے کہ ۱۱ سنہ بعد نبوت ربیع الاول یا ربیع الثانی یا رجب یا شعبان میں ہوا ہے۔ (زرقانی جلد اول زیر عنوان وقت الاسراء)

مسیحی مؤرخین نے اسے بارہویں سال بعد نبوت میں تسلیم کیا ہے (میور لائف آف محمد صفحہ ۱۲۱)

اسراء اور معراج دو مختلف وقتوں میں ہوئے احادیث میں اس کے متعلق جو روایات آتی ہیں وہ بھی اس زمانہ کی تصدیق کرتی ہیں۔ چنانچہ ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ قَالَ اُسْرِیَ بِالنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْلَۃَ سَبْعَۃَ عَشَرَ مِنْ شَھْرِ رَبِیْعِ الْاَوَّلِ قَبْلَ الْھِجْرَۃِ بِسَنَۃٍ (خصائص الکبریٰ جلد اول صفحہ ۱۶۲) یعنی عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسراء کا واقعہ ہجرت سے ایک سال پہلے سترہ ربیع الاول کو پیش آیا۔ اسی طرح بیہقی نے ابن شہاب سے روایت کی ہے کہ مدینہ تشریف لے جانے سے

ایک سال پہلے یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ نیز بیہقی نے سعدی سے روایت کی ہے کہ ہجرت سے کوئی چھ ماہ پہلے یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ (دونوں روایات خصائص جلد اول کے صفحہ ۱۶۲ پر مذکور ہیں) نیز ابن سعد نے حضرت ام سلمہؓ سے روایت کی ہے کہ یہ واقعہ ایک سال ہجرت سے پہلے سترہ ربیع الاول کو پیش آیا تھا۔

ان سب روایات سے یہ امر یقین کے مرتبہ تک پہنچ جاتا ہے کہ اسراء کا واقعہ ہجرت سے چھ ماہ یا ایک سال پہلے گزرا ہے۔

اس کے علاوہ اور ثبوت بھی اس امر کی تائید میں ہیں کہ یہ واقعہ شعب ابی طالب سے نکلنے کے بعد کا ہے۔ اور شعب ابی طالب میں آپ اور آپ کے ساتھی ساتویں سال بعد نبوت میں داخل ہوئے تھے اور دسویں سال میں وہاں سے نکلے تھے (الطبقات الکبریٰ لابن سعد ذکر حصر قریش رسول اللہ و بنی ھاشم فی الشعب)۔ اور وہ ثبوت یہ ہے کہ حدیث اسراء کے متعلق ایک ہی موقعہ کا گواہ ہے۔ اور وہ امّ ہانیؓ آپ کی چچازاد بہن ہیں جو ابوطالب کی بیٹی تھیں۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ جس رات یہ واقعہ ہوا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف فرما تھے (خصائص الکبریٰ جلد ۱ صفحہ ۱۷۱)۔

اور بہت سے صحابہؓ نے بھی یہی بیان کیا ہے کہ آپؐ اس رات امّ ہانی کے مکان پر تھے۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی زندگی یا ابوطالب کی زندگی میں آپ امّ ہانی کے گھر میں نہیں رہ سکتے تھے۔ پس امّ ہانی کے گھر میں آپ کا ان ایام میں رہنا بھی بتاتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت خدیجہ اور ابوطالب کی وفات کے بعد کا ہے۔ اور ان دونوں کی وفات بھی ۱۰ سنہ بعد نبوت میں ہوئی ہے (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام وفاۃ ابی طالب و خدیجۃ)۔ پس اس شہادت سے بھی یہی استنباط ہوتا ہے کہ یہ واقعہ گیارہویں، بارہویں سال بعد نبوت کا ہے۔

واقعہ معراج نبوت کے پانچواں سال کا ہے اور اسراء گیارہویں کا خلاصہ یہ کہ تاریخ۔ احادیث اور عقلی استدلال سب اس امر کی تائید میں ہیں کہ اسراء کا واقعہ گیارہویں بارہویں سال بعد نبوت کا ہے۔ اور پہلے میں یہ ثابت کر چکا ہوں کہ معراج کا واقعہ پانچویں سال بعد نبوت سے پہلے کا ہے۔ پس جب ان دونوں واقعات کی تاریخوں میں چھ سات سال کا فرق ہے تو انہیں ایک واقعہ کہنا کسی طرح درست نہیں ہوسکتا۔ اور حق یہی ہے کہ معراج کا واقعہ اَور ہے اور بیت المقدس کی طرف جانے کا واقعہ بالکل اَور ہے۔

معراج اور اسراء کے الگ الگ وقت میں ہونے کا ایک ثبوت علاوہ تاریخی شواہد کے ایک اَور امر بھی میرے اس استدلال کی تائید میں ہے اور وہ یہ ہے کہ حدیث معراج سے ثابت ہے کہ پانچ نمازوں کی فرضیت

معراج کے واقعہ میں ہوئی ہے۔اب اگران دونوں واقعات کوایک سمجھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ پانچوں نمازیں گیارہویں، بارہویں سال بعد نبوت میں فرض ہوئی ہیں جو بالبداہت غلط ہے۔ پانچوں نمازوں کے فرض ہونے کا زمانہ شروع زمانہ نبوی سے ثابت ہے اورسب مسلمانوں کااس پر اتفاق ہے (بخاری کتاب الصلوٰۃ باب کیف فرضت الصلوٰۃ فی الاسراء)۔پس اس امر سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ معراج نبوی نبوت کے ابتدائی ایام میں ہوا ہے جبکہ اسراء کا واقعہ گیارہویں بارہویں سال میں ہوا ہے۔

بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ قرآن کریم میں جو دو معراجوں کا ثبوت ملتا ہے۔اس کا ذکر اس امر کے بتانے کے لئے کیا گیا ہے کہ سورۂ نجم میں جس معراج کا ذکر ہے وہ دوسرا معراج ہے۔ ورنہ ایک معراج نبوت کے ملتے وقت یا اس کے ساتھ ہی ہوا تھا اور نمازیں اس میں فرض ہوگئی تھیں۔ چنانچہ بخاری نے انسؓ سے روایت کیا ہے اور ابن جریر نے بھی اپنی تفسیر میں اس روایت کو بیان کیا ہے کہ جَآءَہٗ ثَلَاثَةُ نَفَرٍ قَبْلَ اَنْ یُوْحٰی اِلَیْہِ۔الخ۔کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تین فرشتے آئے۔(بخاری کتاب التوحید باب قولہ و کلم اللہ موسیٰ تکلیمًا) اور یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا ہے۔آگے وہی معراج کا واقعہ مذکور ہے۔اوراس میں بیت المقدس کی طرف جانے کا ذکر نہیں بلکہ سیدھا آسمان پر جانے کا ذکر ہے۔اورآخر میں نمازوں کے فرض ہونے کا ذکر ہے۔اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ معراج کا واقعہ کم سے کم ایک دفعہ نبوت کے ملنے سے عین پہلے یا عین اس وقت ہوا ہے اور یہی بات درست ہے۔کیونکہ نمازیں فرض شروع اسلام سے ہیں اور ایک سال بھی نبوت کے بعد ایسا نہیں گزرا۔جس میں نمازیں فرض نہ ہوں (اکثر محققین اس طرف گئے ہیں کہ نبوت سے پہلے کا نہیں۔اس وقت کا ہے۔راوی کو زمانہ کے قرب کی وجہ سے غلط فہمی ہوئی ہے اور میرے نزدیک بھی یہی صحیح ہے۔کیونکہ نبوت سے پہلے نمازوں کا فرض ہونا عقل کے خلاف ہے)۔

معراج اور اسراء دو الگ الگ واقعات ہیں خلاصہ یہ کہ معراج اور اسراء دو الگ الگ واقعات ہیں۔ اور جیسا کہ سورۂ نجم کی آیات سے ظاہر ہے معراج دو ہیں۔اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک معراج نبوت کے ابتدائی ایام میں ہوا ہے۔ بلکہ کہہ سکتے ہیں اسی معراج میں شرعی نبوت کی بنیاد پڑی ہے۔اور نمازیں فرض کی گئی ہیں۔ اور دوسرا معراج ۵ سنہ بعد نبوت میں ہوا ہے۔یا یہ کہ وہ بھی اس سے پہلے ہو چکا تھا صرف اس کا ذکر سورۂ نجم میں کیا گیا ہے۔اور اسراء کا واقعہ بالکل جدا ہے۔اور گیارہویں بارہویں سال بعد نبوت ظہور میں آیا ہے جبکہ حضرت خدیجہؓ فوت ہو چکی تھیں اور آپ امّ ہانی کے مکان میں رہتے تھے جیسا کہ متواتر احادیث اور روایات تاریخیہ

سے ثابت ہے۔

واقعاتی شواہد کہ معراج اور اسراء الگ الگ واقعات ہیں تاریخی شہادت کے درج کرنے کے بعد اب میں واقعاتی شواہد سے ثابت کرتا ہوں کہ یہ دونو واقعات الگ الگ ہیں۔

(۱) پہلی گواہی اس بارہ میں خود قرآن کریم کی ہے۔قرآن کریم میں سورۂ نجم میں معراج کے واقعہ کو بیان کیا گیا ہے اوراس میں کوئی ذکر بیت المقدس کی طرف جانے کا نہیں ۔اس کے مقابل پر سورۂ اسرائیل میں بیت المقدس تک جانے کا ذکر ہے۔اورآسمان پر جانے کا کوئی اشارہ تک نہیں۔اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونو واقعات الگ الگ ہیں۔اس لئے ان کے اکٹھا بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ورنہ یہ نہایت قابل تعجب امر ہے کہ ایک ہی واقعہ کا آخری حصہ تو چھ سال پہلے قرآن کریم میں بیان کیا گیا۔اوراس کا پہلا حصہ چھ سال بعد بیان کیا گیا۔

شب اسراء آنحضرتؐ امّ ہانی کے گھر تھے (۲) دوسرا گواہ واقعات میں سے ان دونوں امور کے الگ الگ ہونے کا یہ ہے کہ اس واقعہ کا موقعہ کا گواہ صرف ایک ہے اور وہ امّ ہانی ہیں۔آپ اس رات جب یہ واقعہ پیش آیا ہے امّ ہانی کے ہاں ہی سوئے تھے۔وہ فرماتی ہیں کہ سب سے پہلے مجھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسراء الی بیت المقدس کا واقعہ سنایا تھا اور صبح کے وقت دوسرے لوگوں سے ذکر کرنے سے پہلے سنایا تھا۔اور میں نے اس خیال سے کہ لوگ اس واقعہ کے عجیب ہونے کے سبب اس کا انکار کریں گے اور مخالفت میں ترقی کر جائیں گے آپ کو لوگوں کے سامنے اس کے بیان کرنے سے باز رکھنے کی بھی کوشش کی تھی مگر آپ نے میری یہ بات نہ مانی (خصائص الکبریٰ جلد ۱)۔ یہ گواہ جو موقعہ کا گواہ ہے اور جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلے یہ واقعہ بیان کیا ہے اس سے کم سے کم سات محدثین نے اپنی اپنی کتب میں اس واقعہ کے متعلق روایت کی ہے۔اور چار مختلف راویوں کے ذریعہ روایت نقل کی ہے۔مگر ان چاروں روایتوں میں صرف اتنا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں بیت المقدس تک جا کر راتوں رات واپس آ گیا ہوں۔اگر آپ آسمان پر جانے کا ذکر بھی اس وقت فرماتے تو ام ہانی جو سب سے پہلی گواہ ہیں۔وہ کسی نہ کسی موقعہ پر تو بیت المقدس سے آسمان پر جانے کا ذکر کرتیں۔مگر وہ جب ذکر کرتی ہیں اور جس کے پاس ذکر کرتی ہیں یہی کہتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں بیت المقدس تک جا کر واپس آیا ہوں۔اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ بیت المقدس تک جانے کا واقعہ اَور ہے اور معراج الی السماء کا واقعہ اور ہے۔

(۳) تیسری شہادت واقعات سے یہ ہے کہ وہ راوی جنہوں نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے ان میں سے بعض تو وہ ہیں کہ جنہوں نے سیدھا آسمان پر جانے کا ذکر کیا ہے۔ بیت المقدس تک جانے کا ذکر نہیں کیا۔ اور بعض وہ ہیں۔ کہ جنہوں نے بیت المقدس تک جا کر پھر آسمان پر جانے کا ذکر کیا ہے۔ بعض ایسے ہیں کہ جنہوں نے بیت المقدس تک جانے کا ذکر کیا ہے آگے آسمان تک جانے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ لیکن ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنہوں نے صاف کہا ہے کہ آپ بیت المقدس سے فارغ ہو کر مکہ واپس تشریف لے آئے۔

یہ ظاہر ہے کہ جنہوں نے سیدھا آسمان پر جانے کا ذکر کیا ہے ان کی شہادت بھی یہی ہے کہ معراج کا واقعہ ایک الگ واقعہ ہے۔ کیونکہ اگر آپ گھر سے سیدھے آسمان کی طرف لے جائے گئے تھے تو بیت المقدس راستہ میں پڑ ہی نہیں سکتا۔ یہ راوی انس۔ مالک بن صعصہ اور ابوذر ہیں۔ ابوذر ان صحابہ میں سے ہیں جو ابتدائی ایام میں اسلام لائے تھے اور اس واقعہ کے شروع کے سننے والوں میں سے تھے۔

شب اسراء میں آنحضرتؐ صرف بیت المقدس تک گئے اسی طرح جنہوں نے بیت المقدس تک ہی جانے کا ذکر کیا ہے آگے آسمان پر جانے کا ذکر نہیں کیا۔ ان کی شہادت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی طرف جب اسراء ہوا ہے اس وقت آنحضرت صلعم آسمان پر تشریف نہیں لے گئے ورنہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اسراء کا واقعہ تو وہ لوگ بیان کرتے لیکن اس کے اہم ترین جزو کو یعنے آسمان پر جانے اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے اور اس کا دیدار کرنے کے حصہ کو چھوڑ دیتے۔ اس قسم کی روایت کرنے والے انسؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ ہیں اور عبداللہ بن مسعودؓ بھی ان صحابہ میں سے ہیں جو شروع میں اسلام لائے اور ہر وقت آپ کے ساتھ رہے۔

وہ روایات جن سے ثابت ہے کہ آپؐ صرف بیت المقدس گئے تیسری قسم کی روایتیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ صرف بیت المقدس تک گئے اور پھر واپس تشریف لے آئے۔ وہ تو ظاہر ہی ہے کہ اس امر کی بیّن دلیل ہیں کہ بیت المقدس کے اسراء کے ساتھ آسمان کا معراج نہیں ہوا۔ بلکہ اس بار آپ صرف بیت المقدس تک لے جائے گئے تھے۔ ان احادیث کے راوی عبداللہ بن مسعودؓ۔ ابن عباسؓ۔ شداد بن اوسؓ۔ امّ ہانیؓ۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت امّ سلمہؓ ہیں۔ ان میں سے عبداللہ بن مسعود کا ذکر میں نے اوپر کر دیا ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ۔ حضرت عباس کے لڑکے ہیں جو آنحضرت صلعم کے چچا تھے۔ اور بوجہ اس کے کہ یہ واقعہ گھر میں پیش آیا تھا ان کو اس کے صحیح حالات جاننے کا سب سے بہتر موقعہ تھا۔ حضرت عائشہؓ اور امّ سلمہؓ آنحضرت صلعم کی ازواج مطہرات میں سے ہیں اور اس واقعہ کی بہترین شاہد ہو سکتی ہیں۔ پھر امّ ہانیؓ ہیں جن کے گھر میں یہ واقعہ

گذرا۔اور جن کے سامنے سب سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کا ذکر کیا (بخاری کتاب الصلوٰۃ، مسلم کتاب الایمان باب اسراء بر سول اللہ، الخصائص الکبریٰ جلد ا صفحہ ١٥٤ تا ١٥٩ و ١٧٦ تا ١٧٩، العصابة باب الکنی حرف الذال والعین)۔اس بارہ میں سب راویوں کی روایات درج کرنا تو مشکل ہے۔بعض روایات بیان کر دیتا ہوں۔حضرت امّ ہانیؓ کہتی ہیں کہ اسراء کی صبح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔امّ ہانی میں نے عشاء کی نماز تم لوگوں کے ساتھ پڑھی۔پھر میں بیت المقدس گیا اور وہاں نماز پڑھی۔اور پھر اب تم لوگوں کے ساتھ صبح کی نماز پڑھ رہا ہوں (الخصائص الکبریٰ جلد ا صفحہ ١٧٧)۔

حضرت عائشہؓ کی روایت یہ ہے کہ جب اسراء کا واقعہ ہوا۔لوگ دوڑے دوڑے حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ آپ کو معلوم ہے آپ کا دوست کیا کہتا ہے۔انہوں نے کہا کیا کہتا ہے۔انہوں نے جواب دیا کہ وہ کہتا ہے کہ میں رات بیت المقدس تک ہو کر آیا ہوں اگر معراج کا ذکر ساتھ ہی آپؐ نے کیا ہوتا تو کفار اس حصہ پر زیادہ شور کرتے۔مگر انہوں نے صرف یہ کہا کہ آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ میں رات کو بیت المقدس تک گیا تھا۔ پھر جب حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت صلعم کی تصدیق کی۔تو لوگوں نے کہا ۔کیا آپ اس خلاف عقل بات کو بھی مان لیں گے۔تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا میں تو اس کی یہ بات بھی مان لیتا ہوں کہ صبح و شام اس پر آسمان سے کلام اترتا ہے (الخصائص الکبریٰ جلد ا صفحہ ١٧٦)۔اس جواب سے بھی صاف ظاہر ہے کہ اس واقعہ کے ساتھ آسمان پر جانے کا کوئی ذکر نہ تھا۔ورنہ آسمان پر خود آنے جانے سے کلام کا آنا جانا کسی صورت میں بھی زیادہ عجیب نہیں کہلا سکتا۔اور اس صورت میں حضرت ابوبکرؓ کبھی بھی وہ دلیل نہ دے سکتے تھے جو انہوں نے دی۔اور نہ اس جواب کو سن کر معترض خاموش ہو سکتے تھے۔وہ ضرور جواب دیتے کہ تمہارے آقا تو خود آسمان پر جانے کا دعویٰ کر رہے ہیں اور تم آسمان سے الہام آنے کا اس خبر سے مقابلہ کر رہے ہو۔مگر انہوں نے بھی آگے سے ایسا نہیں کہا۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف بیت المقدس تک جانے کا ذکر کیا تھا۔آسمان پر جانے کا اس واقعہ کے ساتھ کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔

عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں بیت المقدس میں انبیاء کو نماز پڑھانے کے ذکر کے بعد یہ الفاظ ہیں ثُمَّ انْصَرَفْنَا فَاَقْبَلْنَا۔پھر ہم وہاں سے آگئے اور مکہ کی طرف چل پڑے۔(خصائص ص ١٦٢ جلد اول)

چوتھا شاہد واقعات سے اس امر کا کہ واقعہ اسراء الگ واقعہ ہے یہ ہے کہ بعض روایتوں میں جن میں بیت المقدس جانے کے بعد آسمان پر جانے کا ذکر کیا گیا ہے وہاں سے واپسی کے وقت بھی بیت المقدس میں اترنے

کا ذکر آتا ہے اور وہاں سے پھر مکہ واپس آنے کا ذکر ہے۔ (اَخْرَجَهٗ ابْنُ اَبِیْ حَاتِمٍ عَنْ اَنَسٍ منقول از خصائص الکبریٰ جلد اول صفحہ ۱۵۴)

آسمان سے واپسی پر بیت المقدس سے ہوکر آنا خلاف عقل ہے اب ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ بیت المقدس ہوتے ہوئے آسمان پر جانا تو عقل میں آ بھی سکتا تھا۔ کیونکہ اس میں یہ مفید غرض تھی کہ آپ اس مقام پر نماز پڑھ لیں جہاں نبیوں کی ایک بڑی جماعت نے خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچایا تھا۔ مگر جب آپ اس سے فارغ ہو گئے اور آسمان پر تشریف لے گئے تو پھر وہاں سے واپسی کیوں بیت المقدس کو ہوئی اور کیوں بیت المقدس لا کر آپ کو واپس مکہ پہنچایا گیا۔ اگر واپسی کے وقت بھی کوئی ایسا کام بتایا جاتا جو آپ نے بیت المقدس میں کیا تب تو بات سمجھ میں آسکتی تھی کہ وہ کام رہ گیا تھا۔ اس لئے آپ کو پھر بیت المقدس لایا گیا۔ لیکن کسی ایک روایت میں بھی آسمان سے واپسی پر بیت المقدس میں آپ کے کسی کام کے کرنے کا ذکر موجود نہیں۔ پھر اس تکلیف دہی کی غرض کیا تھی۔ اگر تو یہ تسلیم کیا جائے کہ آسمان کو راستہ ہی بیت المقدس سے جاتا ہے اور وہاں کوئی سیڑھی لگی ہوئی ہے تب تو یہ سمجھ میں آ سکتا تھا کہ مجبوراً آپ کو وہاں اتارنا پڑا۔ لیکن اگر یہ بات نہیں ہے اور ہر مسلمان کا عقیدہ یہی ہے کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ آسمان کی طرف صعود سیڑھیوں کا محتاج نہیں ہے تو پھر واپسی کے وقت بغیر کام کے بیت المقدس میں آپ کو اتارنا اور پھر مکہ کی طرف لانا بالکل خلاف عقل ہے۔ میرے نزدیک اس کی ایک ہی تاویل ہوسکتی ہے کہ حضرت انسؓ نے معراج کا اور اسراء الیٰ بیت المقدس کا واقعہ سنایا ہے راویوں میں سے کسی راوی کے ذہن میں دونوں مضمونوں کا خلط ہوکر ایک واقعہ بن گیا۔ ادھر اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اسراء کی روایت میں حضرتؐ نے بیت المقدس جانے کا بھی اور وہاں سے آنے کا بھی ذکر کیا تھا۔ اس وجہ سے اس نے مجبوراً یہ سمجھا کہ معراج میں آسمان سے واپسی کے وقت آپ بیت المقدس ہی میں اترے تھے اور وہاں سے پھر مکہ تشریف لے گئے تھے۔

اسراء اور معراج کے واقعات میں خلط اور اس کی وجہ اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر خلط ہوا کیونکر؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عربی زبان میں خواہ آسمان پر جانے کا ذکر ہو یا زمین پر سفر کرنے کا اگر رات کو کوئی سفر ہو تو اسے اسراء کہیں گے (اقرب)۔ اس وجہ سے معراج کے متعلق بھی اسراء کا لفظ بولا جاتا تھا اور بیت المقدس کی طرف جانے کے واقعہ کے متعلق بھی اسراء کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ یہ دونوں واقعات رات کے وقت ہوئے تھے۔ اب ادہر دونوں کے لئے اسراء کا لفظ بولا جاتا تھا اور ادہر ان دونوں نظاروں کی کئی باتیں آپس میں ملتی جلتی تھیں۔ مثلاً یہی کہ اس میں بھی براق کا ذکر آتا ہے اور اس میں بھی۔ اسراء بیت المقدس میں بھی انبیاء سے ملنے

کا ذکر آتا ہے اور معراج میں بھی۔ اسراء بیت المقدس میں بھی نماز پڑھانے کا ذکر آتا ہے اور معراج میں بھی۔ اسراء کی بعض روایتوں میں بھی دوزخ جنت کے بعض نظارے دیکھنے کا ذکر آتا ہے اور معراج کے واقعہ میں بھی۔ غرض نام اور کام کی تفصیلات میں ایک حد تک اشتراک پایا جاتا تھا اور روحانی عالم کے عجیب وغریب نظاروں کا ذکر تھا۔ اس لئے بعض راویوں کے ذہنوں میں خلط ہو گیا اور انہوں نے دونوں واقعات کو ایک ہی سمجھ کر ملا کر بیان کرنا شروع کر دیا۔ لیکن جن کا حافظہ زیادہ مضبوط تھا انہوں نے اگر معراج کا واقعہ صحابی سے سنا تھا تو روایت شروع ہی اس طرح کی کہ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر سے اٹھا کر آسمان کی طرف لے جایا گیا۔ اور اگر انہوں نے صحابی سے اسراء بیت المقدس کا واقعہ سنا تھا تو انہوں نے بیت المقدس تک کا واقعہ بیان کیا۔ آگے آسمان پر جانے کا ذکر نہیں کیا۔

معراج اور اسراء دونوں کو صحابہ اسراء کے نام سے پکارتے تھے اس کا ثبوت کہ دونوں واقعات کو صحابہ میں اسراء کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ احادیث سے مل جاتا ہے۔ مسند احمد بن حنبل۔ بخاری۔ مسلم اور ابن جریر میں مالک بن صعصہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ اَنَّ نَبِیَّ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَدَّثَہُمْ عَنْ لَیْلَۃِ اُسْرِیَ بِہٖ۔ قَالَ بَیْنَمَا اَنَا فِی الْحَطِیْمِ وَرُبَّمَا قَالَ قَتَادَۃُ فِی الْحِجْرِ مُضْطَجِعٌ اِذَا اَتَانِیْ آتٍ فَجَعَلَ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہِ الْاَوْسَطِ بَیْنَ الثَّلَاثَۃِ فَاَتَانِیْ فَشَقَّ مَابَیْنَ ھٰذِہٖ اِلٰی وَھٰذِہٖ یَعْنِیْ مِنْ ثُغْرَۃِ نَحْرِہٖ اِلٰی شِعْرَتِہٖ فَاسْتُخْرِجَ قَلْبِیْ فَاُتِیْتُ بِطَسْتٍ مِنْ ذَھَبٍ مَمْلُوْءَۃٍ اِیْمَانًا وَحِکْمَۃً فَغُسِلَ قَلْبِیْ ثُمَّ حُشِیَ ثُمَّ اُعِیْدَ ثُمَّ اُتِیْتُ بِدَآبَّۃٍ دُوْنَ الْبَغْلِ وَفَوْقَ الْحِمَارِ یَقَعُ خَطْوُہٗ عِنْدَ اَقْصٰی طَرْفِہٖ فَحُمِلْتُ عَلَیْہِ فَانْطَلَقَ بِیْ جِبْرِیْلُ حَتّٰی اَتٰی بِیَ السَّمَآءِ الدُّنْیَا۔ الخ۔ (مسند احمد بن حنبل مسند الشامیین حدیث مالک بن صعصعۃ)

یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسراء کا واقعہ ایک دفعہ ہمیں سنایا۔ آپ نے فرمایا ایک دفعہ میں حطیم میں سو رہا تھا (خانہ کعبہ کا وہ حصہ جو عمارت سے باہر چھوڑا ہوا ہے۔ مگر طواف کے وقت اسے بھی طواف میں شامل رکھا جاتا ہے) قتادہ جو تیسرے راوی ہیں ان سے اگلا راوی کہتا ہے کہ اب مجھے یہ یاد نہیں کہ قتادہ نے حطیم کا لفظ بولا تھا یا حجر کا (یہ بھی اسی کا نام ہے) خیر تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں وہاں دو آدمیوں کے ساتھ سو رہا تھا کہ میرے پاس ایک شخص آیا اور اپنے ایک ساتھی سے کہنے لگا کہ ان تین سونے والوں میں سے جو درمیان میں سو رہا ہے وہ ہے۔ اس پر وہ آگے بڑھا اور میرے اس حصہء بدن سے اس حصہ بدن تک اس نے ایک شگاف دیا۔ آپ نے اس کے ساتھ جگہ بتانے کے لئے دونوں ہنسلیوں کے درمیان کی نرم جگہ سے لے کر ناف کے نیچے تک

ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اس حد تک انہوں نے شگاف دیا۔ پھر فرمایا کہ شگاف دے کر اس نے میرے دل کو باہر نکالا۔ پھر ایک سونے کی سینی لائی گئی جس میں ایمان اور حکمت بھرے ہوئے تھے۔ پھر اس شخص نے پہلے میرا دل دھویا پھر میرے اندر وہ نور بھر دیا گیا۔ پھر ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر رکھ دی گئی۔ پھر ایک چوپایہ لایا گیا جو گدھے سے اونچا اور خچر سے چھوٹا تھا۔ اس کے قدم اس کی حد نظر تک جا کر پڑتے تھے۔ مجھے اس جانور پر سوار کر دیا گیا اور جبرائیل مجھے لے کر چلے۔ یہاں تک کہ ہم پہلے آسمان پر پہنچ گئے۔

اسی قسم کی روایت بخاری اور ابن جریر میں بھی انسؓ سے بیان کی گئی ہے۔ اس میں بھی کہا گیا ہے کہ اسراء کی رات کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ سے سیدھے آسمان کی طرف لے جائے گئے۔ (خصائص جلد اول ص ۱۵۳)

اس روایت میں صرف یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعہ اسراء ہم سے بیان کیا۔ لیکن آگے بیت المقدس کا کوئی ذکر نہیں بلکہ سیدھا آسمان تک جانے کا ذکر ہے اور ساری حدیث میں معراجِ آسمانی ہی کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کبھی اسراء کا لفظ بولتے تھے اور ان کی مراد صرف معراج ہوتی تھی اس کے برخلاف اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ اسراء کا لفظ وہ صرف بیت المقدس کی طرف جانے کے لئے بولتے تھے۔ چنانچہ حدیثِ جابرؓ میں جو بخاری اور مسلم میں مروی ہے اسراء کا لفظ صرف بیت المقدس تک جانے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ (خصائص جلد اول ص ۱۵۷)

اسی طرح شداد بن اوس کی روایت میں جو طبرانی۔ بیہقی اور کئی کتب حدیث نے بیان کی ہے یہ لفظ صرف بیت المقدس تک جانے اور وہاں سے مکہ واپس آنے کے متعلق بولا گیا ہے۔ (خصائص جلد اول ص ۱۵۸ و ۱۵۹)

ان دونوں قسم کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ میں اسراء کا لفظ دونوں واقعات کی نسبت مستعمل تھا۔ پس اس لفظ کے استعمال اور بعض تفصیلات کے اشتراک کی وجہ سے بعض راویوں کو یہ دھوکا آسانی سے لگ سکتا تھا کہ یہ دونوں واقعات ایک ہی ہیں اور اس کی وجہ سے انہوں نے دونوں قسم کی روایات کو ملا کر بیان کر دیا اور اس سے بعد میں آنے والے لوگوں کو یہ دھوکا لگ گیا کہ شاید یہ ایک ہی واقعہ کی تفاصیل ہیں۔

روایات میں خلط علاوہ ازیں روایات پر تنقیدی نگاہ ڈالنے سے بھی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ان میں خلط ہو گیا ہے۔ کیونکہ جن روایات میں پہلے بیت المقدس جانے اور وہاں سے آسمان پر جانے کا ذکر ہے انہی میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ بیت المقدس میں آپ کو دوسرے انبیاء سے ملایا گیا ان میں آدم بھی تھے اور حضرت موسیٰ بھی اور حضرت عیسیٰ بھی اور حضرت ابراہیم بھی۔ لیکن آسمان پر جانے کے بعد پھر بیان ہوا ہے کہ مختلف آسمانوں پر آپ

نے انہی انبیاء کو دیکھا اور پہچانا نہیں۔ اگر ایک ہی وقت میں یہ دونوں واقعات ہوئے تھے تو اول تو آسمان پر یہ انبیاء رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کس طرح پہنچے۔ اور دوسرے ان کو تھوڑی دیر پہلے دیکھنے کے بعد آپ نے کیوں نہ پہچانا۔ دو مختلف وقتوں کی رؤیتوں میں تو یہ امر سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ایک نظارہ دوسرے سے مختلف ہو۔ لیکن ایک ہی وقت میں دونوں نظاروں کی صورت میں یہ بات بعید از قیاس ہے۔ پس یہ اندرونی شہادت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ دو الگ الگ واقعات کے بارہ میں راویوں کے ذہن میں خلط ہو گیا ہے۔ میرے اس خیال کی تائید بعض پرانے علماء کی آراء سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ خصائص الکبریٰ جلد اول کے ص ۱۸۰ پر لکھا ہے کہ ابونصر قشیری ابن العربی اور اَور بہت سے علماء کا خیال ہے کہ اسراء دو دفعہ ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے احادیث میں اختلاف ہو گیا۔

اس وقت تک میں یہ ثابت کر چکا ہوں کہ تاریخی شہادت سے جس سے دونوں واقعات مختلف زمانوں کے ثابت ہوتے ہیں۔ اور قرآن کریم کی شہادت سے کہ اس میں معراج کا واقعہ الگ اور خالی بیت المقدس تک جانے کا واقعہ الگ بیان کیا گیا ہے۔ اور احادیث کی اندرونی شہادتوں سے یہ امر ثابت ہے کہ یہ دونوں واقعات الگ الگ ہیں۔ اور نام اور تفاصیل کے اشتراک کی وجہ سے دھوکا کھا کر بعض راویان حدیث نے ان کو ایک واقعہ سمجھ لیا ہے اب میں اس اسراء کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کرتا ہوں جس کا اس سورۃ میں ذکر کیا گیا ہے۔

واقعہ اسراء کی تفصیل میرے نزدیک اسراء بیت المقدس کا واقعہ اپنی تفاصیل کے ساتھ حدیث انسؓ میں جو ابن جریر نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہے نہایت صحیح طور پر بیان ہوا ہے اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

عَنْ اَنَسِ ابْنِ مَالِكٍ قَالَ لَمَّا جَاءَ جِبْرَائِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِالْبُرَاقِ إِلَى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَكَأَنَّهَا ضَرَبَتْ بِذَنَبِهَا، فَقَالَ لَهَا جِبْرَائِيْلُ مَهْ يَا بُرَاقُ، فَوَاللهِ إِنْ رَكِبَكَ مِثْلُهُ، فَسَارَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَإِذَا هُوَ بِعَجُوْزٍ نَاءٍ عَنِ الطَّرِيْقِ أَيْ عَلَى جَنْبِ الطَّرِيْقِ فَقَالَ: مَا هٰذِهِ يَا جِبْرَائِيلُ؟ قَالَ سِرْ يَا مُحَمَّدُ، فَسَارَ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ يَسِيْرَ، فَإِذَا شَيْءٌ يَدْعُوْهُ مُتَنَحِّيًا عَنِ الطَّرِيْقِ يَقُوْلُ هَلُمَّ يَا مُحَمَّدُ، قَالَ جِبْرَائِيْلُ سِرْ يَا مُحَمَّدُ، فَسَارَ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ يَسِيْرَ، قَالَ ثُمَّ لَقِيَهُ خَلْقٌ مِنَ الْخَلَائِقِ، فَقَالَ أَحَدُهُمُ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا أَوَّلُ، وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا آخِرُ، وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا حَاشِرُ، فَقَالَ لَهُ جِبْرَائِيْلُ ارْدُدِ السَّلَامَ يَا مُحَمَّدُ، قَالَ فَرَدَّ السَّلَامَ، ثُمَّ لَقِيَهُ الثَّانِيْ، فَقَالَ لَهُ مِثْلَ مَقَالَةِ الْأَوَّلَيْنَ حَتّٰى انْتَهٰى إِلَى بَيْتِ الْمَقْدِسِ فَعُرِضَ عَلَيْهِ الْمَاءُ وَاللَّبَنُ وَالْخَمْرُ فَتَنَاوَلَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللَّبَنَ، فَقَالَ لَهُ جِبْرَائِيْلُ أَصَبْتَ يَا مُحَمَّدُ الْفِطْرَةَ، وَلَوْ شَرِبْتَ الْمَاءَ لَغَرِقْتَ وَغَرِقَتْ

أُمَّتُكَ، وَلَوْ شَرِبْتَ الْخَمْرَ لَغَوَيْتَ وَغَوَتْ أُمَّتُكَ. ثُمَّ بُعِثَ لَهُ آدَمُ فَمَنْ دُوْنَهُ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ، فَأَمَّهُمْ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تِلْكَ اللَّيْلَةَ. ثُمَّ قَالَ لَهُ جِبْرَائِيْلُ أَمَّا الْعَجُوْزُ الَّتِي رَأَيْتَ عَلَى جَانِبِ الطَّرِيْقِ، فَلَمْ يَبْقَ مِنَ الدُّنْيَا إِلَّا بِقَدْرِ مَا بَقِيَ مِنْ عُمُرِ تِلْكَ الْعَجُوْزِ، وَأَمَّا الَّذِي أَرَادَ أَنْ تَمِيْلَ إِلَيْهِ، فَذَاكَ عَدُوُّ اللهِ إِبْلِيْسُ، أَرَادَ أَنْ تَمِيْلَ إِلَيْهِ وَأَمَّا الَّذِيْنَ سَلَّمُوْا عَلَيْكَ، فَذَاكَ إِبْرَاهِيْمُ وَمُوْسَى وَعِيْسَى۔ (ابن جریر زیر آیت ھذا)

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ وَ هٰكَذَا رَوَاهُ الْحَافِظُ الْبَيْهَقِيُّ فِي دَلَائِلِ النُّبُوَّةِ مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ وَهْبٍ وَفِيْ بَعْضِ أَلْفَاظِهِ نَكَارَةٌ وَ غَرَابَةٌ۔ طَرِيْقُ أُخْرٰى عَنْ أَنَسِ ابْنِ مَالِكٍ وَفِيْهَا غَرَابَةٌ وَنَكَارَةٌ جِدًّا وَهِيَ فِي سُنَنِ النَّسَائِي الْمُجْتَنٰى وَلَمْ أَرَهَا فِي الْكَبِيْرِ (ابن کثیر زیر آیت ھذا)

یعنی ابن جریر انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا۔ جب جبرائیلؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس براق لائے تو اس نے اپنی دم ہلائی یعنی کچھ انکار کیا۔ تو اسے جبرائیلؑ نے کہا آرام سے کھڑا رہ۔ اے براق خدا کی قسم تجھ پر ایسا سوار کبھی نہیں بیٹھا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر چڑھ کر روانہ ہوئے۔ تو راستے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بڑھیا راستہ کی ایک جانب کھڑی ہے۔ تو آپ نے کہا اے جبرائیل یہ کون ہے۔ تو جبرائیل نے کہا۔ چلئے چلئے اے محمدؐ! (یعنی موسیٰ کی طرح سوال کرنے سے منع کیا) راوی کہتا ہے پھر آپ چلے جتنا کہ اللہ تعالیٰ کا منشاء تھا۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص راستہ کی ایک جانب سے آپ کو بلا رہا ہے اور کہتا ہے کہ ادھر آیئے اے محمدؐ! اس پر جبرائیل نے پھر آپ کو بولنے سے منع کیا اور کہا کہ اے محمدؐ چلئے چلئے اور کچھ جواب نہ دیجئے۔ پھر آپ آگے چلے جتنا کہ خدا کی مرضی تھی۔ راوی کہتا ہے کہ پھر آپ کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کچھ لوگ ملے۔ تو انہوں نے کہا اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا أَوَّلُ۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اٰخِرُ۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا حَاشِرُ۔ اس پر جبرائیل نے کہا۔ اے محمدؐ ان کو سلام کا جواب دیجئے۔ تو آپ نے ان کو سلام کا جواب دیا۔ پھر آپ کو ایسی ہی ایک اَور جماعت ملی۔ اس نے بھی پہلی جماعت کے الفاظ میں آپ کو سلام کہا۔ (پھر آپ آگے چلے) یہاں تک کہ آپ بیت المقدس تک پہنچے۔ تو آپ کے سامنے حضرت جبرائیل نے تین پیالے پیش کئے ایک پانی کا۔ ایک دودھ کا اور ایک شراب کا۔

اسراء میں دودھ سے مراد فطرت آپ نے دودھ لے کر پی لیا۔ تو آپ کو جبرائیل نے کہا آپ نے فطرت صحیحہ کو پا لیا۔ اگر آپ پانی پی لیتے تو آپ بھی غرق ہوتے اور آپ کی امت بھی غرق ہوتی۔ اور اگر آپ شراب پی لیتے تو آپ بھی گمراہ ہوتے اور آپ کی امت بھی گمراہ ہو جاتی۔ پھر آپ کے سامنے آدم اور دیگر انبیاء لائے گئے اور اس

رات ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی۔

اسراء میں بڑھیا دیکھنے سے مراد دنیا پھر آپ کو جبرائیل نے کہا کہ جو بڑھیا آپ نے رستہ کے ایک جانب دیکھی تھی وہ دنیا تھی۔اور اس کی عمر سے اسی قدر باقی ہے جو کہ اس بڑھیا کی عمر باقی ہے۔اور جو شخص رستہ سے ہٹ کر آپ کو بلاتا تھا۔تا آپ اس کی طرف مائل ہوں وہ خدا کا دشمن ابلیس تھا۔اور وہ لوگ جنہوں نے آپ کو اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ کہا وہ ابراہیم موسیٰ عیسیٰ وغیرہ تھے۔

یہاں تک ابن جریر کی روایت ختم ہوئی۔اس کے بعد ابن کثیر کے حوالے سے جو عبارت لکھی گئی ہے اس کا یہ ترجمہ ہے کہ حافظ بیہقی نے بھی دلائل النبوت میں ابن وہب سے یہی روایت بیان کی ہے مگر اس میں بعض الفاظ قابل اعتراض ہیں اور دوسرے اسناد سے ان کی تصدیق نہیں ہوتی اور ایک اَور سند کے ساتھ انہوں نے انس بن مالک سے یہی روایت کی ہے مگر اس میں بعض ایسی باتیں بیان کی ہیں جن کی دوسری احادیث سے تصدیق نہیں ہوتی۔اور یہ روایت سنن نسائی کی ایک خلاصہ میں بھی میں نے دیکھی ہے۔مگر بڑی سنن نسائی میں وہ حدیث نہیں ملی۔

حدیث اسراء بروایت انس بطور معیار یہ وہ حدیث ہے جو ہمارے لئے معیار کے طور پر ہے کیونکہ میرے نزدیک یہ سب سے زیادہ صحیح اور سچی ہے۔اور اس میں صرف ایک غلطی ہے۔اور وہ یہ کہ جہاں پیالے پیش کرنے کا ذکر ہے وہاں پانی کے بعد دودھ اور پھر شراب کا ذکر کیا ہے مگر ابن کثیر نے اس روایت کو اپنی کتاب کی جلد ششم ص ۸، ۹ پر جس طرح نقل کیا ہے اس میں پانی کے بعد شراب اور پھر دودھ کا ذکر کیا ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نسخوں میں اسی ترتیب سے پیالوں کا ذکر کیا گیا ہے۔میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ اس معمولی تغیر کی اصلاح کیوں ضروری ہے اس وقت صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بعض دوسری روایات میں زور سے اس امر کو بیان کیا گیا ہے کہ پہلے پانی کا پیالہ اور پھر شراب کا پیالہ اور پھر دودھ کا پیالہ پیش کیا گیا تھا۔چنانچہ الطبرانی اور ابن مردویہ نے صہیب بن سنان سے روایت کی ہے جس کے یہ الفاظ ہیں۔

قَالَ لَمَّا عُرِضَ عَلٰى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةَ اُسْرِيَ بِهِ الْمَاءُ ثُمَّ الْخَمْرُ ثُمَّ اللَّبَنُ اَخَذَ اللَّبَنَ (خصائص الکبریٰ باب خصوصیّته صلی اللہ علیہ سلم حدیث صہیب صفحہ ۱۵۹) یعنی صہیب روایت کرتے ہیں کہ جس رات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسراء ہوا تھا۔آپ کے سامنے تین پیالے پیش کئے گئے تھے۔ پہلے پانی کا اس کے بعد شراب کا اور اس کے بعد دودھ کا۔

اس حدیث میں پانی کے بعد شراب اور اس کے بعد دودھ کے پیش ہونے کو بالجزم بیان کیا گیا ہے۔پس اس

حدیث کی بناء پر اور ابن کثیر نے انس کی روایت کو جن الفاظ میں نقل کیا ہے۔ اس کی بناء پر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس روایت میں بھی پہلے پانی۔ پھر شراب پھر دودھ کا ذکر ہے مگر بعض نسخوں میں الٹ لکھا گیا ہے۔ پس میں اس روایت کے جو معانی بیان کروں گا۔ ان میں اس امر کو مدنظر رکھوں گا کہ اس روایت میں بھی پہلے پانی پھر شراب اور پھر دودھ کا ذکر ہے اور اس کے الٹ جو لکھا گیا ہے وہ کسی نسخہ میں کتابت کی غلطی کی وجہ سے سہواً لکھا گیا ہے۔

ابن کثیر کی تصدیق دُرّ منثور سے بھی ہوتی ہے۔ اس میں بھی اس روایت کو بیان کرتے ہوئے پہلے پانی پھر شراب پھر دودھ کے پیش کئے جانے کا ذکر ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے یہ روایت نہایت صحیح ہے اور اس کے صحیح ہونے کی اندرونی شہادت موجود ہے۔ اور وہ شہادت یہ ہے کہ اس میں ذکر ہے کہ پہلے آپ نے ایک بڑھیا دیکھی پھر شیطان دیکھا پھر انبیاء کی جماعتوں کو دیکھا اس کے بعد بیت المقدس پہنچے۔ پھر پانی اور شراب اور دودھ تین چیزیں آپ کے سامنے پیش کی گئیں۔ رسول اللہؐ نے پانی اور شراب کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور دودھ کو لے لیا۔ اس پر جبرائیل نے کہا آپ نے صحیح فطرت کو پا لیا۔ اگر آپ پانی پیتے تو غرق ہو جاتے اور آپ کی امت بھی غرق ہو جاتی۔ اگر شراب پیتے تو آپ گمراہ ہو جاتے اور آپ کی امت بھی گمراہ ہو جاتی۔ اور آپ نے جو دودھ لیا ہے گویا آپ فطرت صحیحہ کے راستہ پر چل پڑے۔ پھر وہ ان نظاروں کی تعبیر کرتے ہیں جو پہلے دیکھے تھے اور کہتے ہیں کہ وہ عورت دنیا تھی۔ جس نے آپ کو بلایا۔ اس کے بعد راستہ سے ہٹ کر کھڑا ہوا شخص جس نے آپ کو بلایا ابلیس تھا۔ اس کے بعد جنہوں نے سلام کیا وہ خدا تعالیٰ کے نبی تھے۔

اسراء میں پانی، دودھ اور شراب پیش کئے جانے کی تعبیر ان تعبیروں کو دیکھو کہ کیسی صحیح ہیں اور قرآن کریم کے مطابق ہیں۔ پانی دنیا کا قائم مقام ہے کیونکہ پانی سے حیات ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ۔ (الانبیاء: ۳۱) پانی جب لَبن کے مقابل میں آئے تو اس سے مراد دنیا کی مال و دولت ہوتی ہے۔ اور شراب شیطانی کاموں پر دلالت کرتی ہے جیسے فرمایا۔ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ۔ (المائدہ: ۹۱)۔ دودھ ماں کی چھاتی سے بنتا ہے اس میں کسی غیر چیز کی ملونی نہیں ہوتی اس لئے وہ فطرت صحیحہ پر دلالت کرتا ہے۔

اس روایت کے واقعات میں طبعی ترتیب ہے اب دیکھو اس میں کیسی ترتیب نظر آتی ہے۔ پھر تعبیر نہایت صاف اور صحیح ہے۔ پہلے آپ نے عورت کو دیکھا تھا۔ اور اس کی تعبیر جبرائیل علیہ السلام نے دنیا بتائی تھی۔ اس کے مقابل پر پہلے پانی کا پیالہ پیش کیا گیا۔ اور اس کی تعبیر بھی دنیا ہی کی گئی۔ قرآن کریم میں بھی پانی کو دنیا سے تشبیہ

دی گئی ہے۔فرماتا ہے۔وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ (الکھف:۴۶) انہیں دنیوی زندگی کی مثال سنا کہ وہ پانی کی طرح ہے جسے ہم اتارتے ہیں۔عورت کے بعد آپ نے شیطان کو دیکھا تھا۔اسی ترتیب سے پانی کے بعد شراب کا پیالہ پیش کیا گیا اور بتایا گیا کہ جس طرح شیطان غاوی ہے اسی طرح شراب بھی غاوی ہے۔اس کے بعد کشف کے پہلے حصہ میں انبیاء کی جماعت کو دیکھا تھا اور انہوں نے سلام کیا تھا۔یعنی سلامتی کی دعا کی تھی۔ اس کے مقابل پر پیالوں میں سے دودھ کا پیالہ تیسرے نمبر پر پیش کیا گیا جس میں اس طرف اشارہ تھا کہ آپ کی امت علوم الٰہیہ سے ہمیشہ حصہ لیتی رہے گی۔اور تباہی سے بچی رہے گی۔پس یہ ترتیب اور تعبیر بتاتی ہیں کہ یہ خبر یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی گئی ہے۔

اسراء کے متعلق اپنی تحقیق اب میں اسراء کے واقعہ کے متعلق جو کچھ قرآن کریم اور علوم روحانیہ سے سمجھتا ہوں بیان کرتا ہوں۔میرے نزدیک اسراء بیت المقدس ایک لطیف کشف تھا اور اس کے ثبوت مندرجہ ذیل ہیں۔

واقعہ اسراء کشف تھا جس کی تعبیر کی گئی اول۔وہی حدیث انسؓ کی جسے میں نے سب روایتوں میں سے تفصیل کے لحاظ سے بہتر قرار دیا ہے۔اس میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ایک بڑھیا کو دیکھا اور پھر ایک اور شخص کو دیکھا۔اور پانی،شراب اور دودھ کے پیالے دیکھے اور ان میں سے دودھ کا پیالہ پیا۔ان تمام امور کی حضرت جبرائیل تعبیر کرتے ہیں۔اگر یہ کشف نہ تھا تو تعبیر کا کیا مطلب؟ اگر آپ کا سفر مادی جسم کے ساتھ تھا تو اول آپ نے دنیا کو عورت کی شکل میں کیونکر دیکھا؟ کیا قرآن وحدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیا اصل میں ایک عورت ہے۔دنیا کو عورت کی شکل میں دیکھنا صاف بتاتا ہے کہ یہ ایک لطیف کشف تھا۔اگر وہ کشف نہ ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوراً جبرائیل سے کہتے کہ اے جبرائیل کس بات کی تعبیر کرتے ہو۔اس عورت کو تو میں نے ابھی ابھی اپنی جسمانی آنکھوں سے دیکھا ہے جسمانی آنکھ سے دیکھی ہوئی چیز کی تم تعبیر کس طرح کرتے ہو۔مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ بھی اسے کشف ہی سمجھتے تھے۔پانی کو ردّ کرنے پر جبرائیل کا خوشی کا اظہار کرنا بھی اسی امر کی تائید کرتا ہے۔کیونکہ جاگتے ہوئے تو آنحضرت صلعم ہمیشہ پانی پیتے تھے۔اگر آپ جسدِ عنصری میں وہاں گئے تھے تو پانی پینے سے آپ کی امت کیوں غرق ہوتی؟

دنیوی زندگی میں آپ نے ہزاروں دفعہ پانی پیا تھا۔اگر اس عمل سے امت نے غرق ہونا تھا تو پھر اس کے بچاؤ کی کیا صورت رہ جاتی ہے۔

قرآن کریم نے بیت المقدس کی طرف جانے کا نام رؤیا ہی رکھا ہے (۲) دوسرا ثبوت اس کا یہ ہے

کہ قرآن کریم نے بھی اس کا نام رؤیا ہی رکھا ہے۔ جیسے اسی سورۃ کے چھٹے رکوع میں فرمایا وَ مَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ (بنی اسرائیل:۶۱)۔ کہ یہ رؤیا لوگوں کے فتنے کے لئے تھی۔ چنانچہ اس آیت کی وجہ سے کئی صحابہ اور سابق علماء نے بھی اسے رؤیا ہی قرار دیا ہے۔ چنانچہ ابن اسحاق اور ابن جریر نے حضرت معاویہؓ سے روایت کی ہے کہ اِذَا سُئِلَ عَنْ مَسْرٰی رسول اللہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قال کَانَتْ رُؤْیَا منَ اللہِ صَادِقَۃً۔ (درمنثور زیر آیت ھذا) یعنی جب حضرت معاویہؓ سے اسراء کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رؤیا تھی جو پوری ہوگئی۔ حضرت عائشہؓ کا بھی یہی مذہب بتایا جاتا ہے۔ (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام ذکر الاسراء حدیث عائشۃ عن مسراہ صلی اللہ علیہ وسلم و زاد المعاد جلد ۳ فصل فی الاسراء و المعراج)

(۳) تیسرا ثبوت اس کا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ بات لوگوں کو سنائی۔ تو لوگوں نے کہا کہ اگر آپ بیت المقدس سے ہو آئے ہیں تو اس کا نقشہ بتائیں۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ میں بالکل بیت المقدس کو نہ جانتا تھا۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم فی الحقیقت ظاہری طور پر بیت المقدس میں گئے تھے تو آپ کو چاہیے تھا کہ آپ نقشہ بتادیتے۔ یہ تو نہ فرماتے کہ میں نہ جانتا تھا۔ پھر آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ ان کے سوال کرنے کے بعد پھر مجھ پر کشف کی حالت طاری ہوئی۔ اور کشف میں بیت المقدس کا نقشہ سامنے کردیا گیا۔ تو میں اس کو دیکھتا جاتا تھا اور پھر لوگوں کو بتاتا جاتا تھا۔ چنانچہ جابر بن عبداللہ کی راویت ہے۔ آپ نے فرمایا۔ فَجَلَّی اللّٰہُ لِیَ الْبَیْتَ الْمَقْدِسِ فَطَفِقْتُ اُخْبِرُھُمْ وَاَنَا اَنْظُرُ اِلَیْہِ۔ کہ اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو میرے سامنے کردیا۔ میں اس کو دیکھتا اور لوگوں کو بتاتا جاتا تھا۔ (ابن کثیر زیر آیت ھذا)

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ چونکہ وہ کشف تھا آپ سمجھتے تھے کہ ممکن ہے جو میں نے دیکھا ہے اس طرح ظاہری طور پر نہ ہو۔ پس آپ نے اس کے بیان کرنے سے ہچکچاہٹ کی۔ مگر چونکہ اس واقعہ کے بیان کرنے سے لوگوں میں مخالفت اور استہزا کا ہیجان پیدا ہوگیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لو اب ہم تم کو اصل صورت میں بیت المقدس دکھا دیتے ہیں۔ چنانچہ دوبارہ کشف ہوا اور آپ نے اس کے مطابق لوگوں کو بیت المقدس کا نقشہ بتادیا۔ جس کی کفار میں سے واقف کار لوگوں نے تصدیق کی۔

متعصب عیسائی مصنف اس موقعہ پر لکھتے ہیں کہ بیت المقدس کے نقشے اس وقت بن چکے تھے (تفسیر قرآن از ویری جلد ۳ صفحہ ۵۶)۔ ممکن ہے یہ درست ہو۔ مگر ذرا یہ مصنف کسی ایسے شہر کے متعلق نقشہ دیکھ کر جوان پر سوال کئے جائیں ان کا جواب تو دے کر دیکھیں۔

کشف اور رؤیا کی تعریف میں فرق اس جگہ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ گو قرآن کریم میں اس کے متعلق رؤیا کا لفظ آیا ہے مگر اس لفظ سے دھوکا کھا کر اسے عام خوابوں کی طرح نہیں سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ عربی میں رؤیا کا مفہوم اَور ہے اور اردو میں اَور۔ اردو میں تو رؤیا اس نظارہ کو کہتے ہیں جو انسان سوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ لیکن عربی میں کشف اور عام خواب دونوں کے لئے رؤیا کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اور کشف عام رؤیا سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ سوتے میں نہیں دیکھا جاتا بلکہ بَین النَّوم والیقظہ کی حالت میں دیکھا جاتا ہے۔ یعنی جبکہ ایک ربودگی کی سی حالت تو انسان پر طاری ہوتی ہے مگر وہ سو نہیں رہا ہوتا۔ بلکہ اس کے ظاہری حواس بھی اس وقت اپنا کام کر رہے ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ دوسرے سے باتیں کرتے کرتے ایک نظارہ نظر آ جاتا ہے۔ انبیاء کا کشف دوسرے لوگوں کے کشوف سے زیادہ لطیف ہوتا ہے اور وہ کشفی نگاہ سے دور دور کے مادی امور کو بعینہٖ معائنہ کر لیتے ہیں۔

کشف کی تین اقسام کشف کی بھی تین قسمیں ہوتی ہیں۔

(۱) ایسا کشف جس میں دکھائے جانے والے نظارے اسی شکل میں دکھائے جاتے ہیں۔ جس شکل میں کہ وہ مادی دنیا میں موجود ہوتے ہیں اور وہ کشف بالکل ایسا ہوتا ہے جیسے دوربین سے دور کی چیز دیکھ لی جاتی ہے۔

(۲) ایسا کشف جس کا کچھ حصہ تو ایسا ہوتا ہے جو اوپر بیان ہوا ہے اور کچھ حصہ تعبیر طلب ہوتا ہے۔

(۳) ایسا کشف جو سارا کا سارا تعبیر طلب ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کشف دوسری قسم کا تھا یعنی بعض حصے تو اسی طرح دکھائے گئے تھے جس طرح کہ مادی دنیا میں واقع ہو رہا تھا۔ اور بعض حصے تعبیر طلب تھے۔ تعبیر طلب حصوں کا ذکر تو میں اوپر کر آیا ہوں۔ ظاہری شکل میں دکھائے جانے والے حصہ کے بارہ میں احادیث میں آتا ہے کہ واپسی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک قافلہ مکہ کی طرف آ رہا ہے۔ اور اس قافلہ والوں کا ایک اونٹ گم ہو گیا ہے جس کی وہ تلاش کر رہے ہیں۔ اور چند دن بعد معلوم ہوا کہ بعینہٖ یہ واقعہ مکہ کے ایک قافلہ سے پیش آیا تھا۔ چنانچہ جب وہ قافلہ مکہ پہنچا تو انہوں نے اس امر کو تسلیم کیا۔ (الخصائص الکبریٰ حدیث شداد بن اوس جلد اول ص ۱۵۸ و ۱۵۹)

کشف کے متعلق ذاتی تجربہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے میں کشوف کے متعلق خود صاحب تجربہ ہوں اور یہ امور اپنے مشاہدہ کی تصدیق سے لکھ رہا ہوں۔

اسراء کے کشف سے غرض ہجرت تھی اب میں یہ بتاتا ہوں کہ اس کشف کا مقصد کیا تھا؟ میرے نزدیک اس کشف میں ہجرت مدینہ کی خبر دی گئی تھی۔ اور بیت المقدس جو آپ کو دکھایا گیا اس سے مراد مسجد نبویؐ کی تعمیر تھی۔

جس کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے بیت المقدس سے بھی زیادہ عزت دی جانے والی تھی۔اور یہ جو دکھایا گیا کہ آپ نے سب انبیاء کی امامت کرائی اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ آپ کا سلسلہ عربوں سے نکل کر دوسری اقوام میں بھی پھیلنے والا ہے اور سب انبیاء کی امتیں اسلام میں داخل ہوں گی۔اور یہ اشاعت مدینہ میں جانے کے بعد ہوگی۔اور اس میں اس طرف بھی اشارہ تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت المقدس کے علاقہ کی حکومت دی جائے گی۔

مسجد کو دیکھنے کی تعبیر چنانچہ تعبیر الرؤیا کی کتب میں لکھا ہے کہ تَدُلُّ رُؤْيَتُهُ كُلِّ مَسْجِدٍ عَلٰى جِهَتِهٖ وَالتَّوَجُّهِ اِلَيْهَا كَالْمَسْجِدِ الْاَقْصٰى وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَسْجِدِ دِمَشْقَ وَمَسْجِدِ مِصْرَ وَمَا شَاكَلَ ذٰلِكَ وَرُبَّمَا دَلَّتْ عَلٰى عُلَمَاءِ جِهَاتِهِمْ اَوْ مُلُوْكِهِمْ اَوْ نُوَّابِ مُلُوْكِهِمْ (تعطیر الانام زیر لفظ مسجد۔جلد دوم) یعنی رؤیا میں مسجد دیکھنے سے مراد کبھی وہ جہت ہوتی ہے اور اس طرف جانا مراد ہوتا ہے۔جیسے مسجد اقصیٰ کو دیکھنا یا مسجد حرام کو دیکھنا یا مسجد دمشق یا مسجد مصر کو دیکھنا۔اور ایسے ہی اور مساجد کو دیکھنا اور کبھی مسجد سے مراد وہاں کے علماء یا بادشاہ یا گورنر ہوتے ہیں۔

آنحضرتؐ کے حق میں تعبیر کس طرح پوری ہوئی اب میں ایک ایک کر کے ان معنوں کو لیتا ہوں کہ وہ کس طرح اور کس دلیل سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں پورے ہوئے۔

پہلی تعبیر میں نے یہ کی تھی کہ مسجد اقصیٰ سے مراد اس جگہ مسجد نبویؐ ہے۔اور یروشلم سے مراد مدینہ ہے اور ادھر جانے سے مراد آپ کی ہجرت ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے سُبْحٰنَ کہہ کر اس رؤیا کا ذکر کیا ہے جس سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ ہجرت اللہ تعالیٰ کی سُبوحیت کا اظہار کرنے والی ہوگی۔یہ سبحان کا لفظ بھی بتاتا ہے کہ اس نظارہ میں ایک پیشگوئی تھی کیونکہ ظاہر میں بیت المقدس کو دیکھنے سے سبوحیت ثابت نہیں ہوتی۔لیکن مدینہ میں جا کر اسلامی حکومت کا قیام چونکہ بہت سی ان پیشگوئیوں کو پورا کرنے والا تھا جو قرآن کریم میں بیان ہو چکی تھیں۔اس واقعہ سے بے شک اللہ تعالیٰ کی سبوحیت ظاہر ہوئی تھی اور اب تک ہو رہی ہے۔

غرض سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى کہہ کر فرمایا کہ پاک ہے وہ جو لے جائے گا اپنے بندہ کو راتوں رات مسجد اقصیٰ یعنی اسی کے مشابہ ایک مسجد کی طرف تا کہ وہ پیشگوئیاں پوری ہوں جن کے لئے ہجرت کرنی ضروری ہے۔اور اللہ تعالیٰ دنیا کو دکھا دے کہ کس طرح اس کی بات پوری ہوا کرتی ہے۔مثلاً جنگ و جہاد وغیرہ کی خبریں جو ہجرت کے ساتھ تعلق رکھتی تھیں۔پھر اسلامی حکومت کی خبر وغیرہ وغیرہ۔

لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا میں بھی ہجرت کی طرف اشارہ ہے لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا بھی اسی امر پر دلالت کرتا ہے کہ

یہ کوئی ایسا سفر ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے خاص نشان ظاہر ہوں گے ۔اور وہ ہجرت ہی کا سفر تھا جس نے اسلام کا مستقبل جو دنیا کی نگاہ سے پوشیدہ تھا ایسے شاندار طور پر ظاہر کر دیا۔

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ میں بھی اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے ۔کیونکہ بیت المقدس کو محض کشف میں دیکھ لینا خدا تعالیٰ کے سمیع و بصیر ہونے کا ثبوت پیش نہیں کرتا لیکن مدینہ کی ہجرت ان دونوں صفات کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ سَمِيْعٌ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ کس طرح اپنے بندوں کی دعائیں سننے والا ہے۔ بَصِيْرٌ اس طرح کہ جن کامیابیوں کی ہجرت کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دی گئی تھی وہ بعینہٖ پوری ہوگئیں۔ نیز اس طرح کہ وہاں پر اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی جس طرح نگہداشت کی وہ ایک بصیر خدا کے وجود کی بیّن شہادت تھی۔

اور یہ جو مسجد نبویؐ کو مسجد اقصیٰ کہا گیا اور مدینہ کو یروشلم کی شکل پر دکھایا گیا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ جو برکات اس شہر کو اور اس مسجد کو ملی تھیں۔ وہی مسجد نبویؐ اور مدینہ منورہ کو ملنے والی تھیں۔

اگر کہا جائے کہ کیوں مسجد نبویؐ کو مسجد حرام سے تشبیہ نہ دی گئی اور مسجد اقصیٰ سے دی گئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو مسجد حرام کو بعض زائد خصوصیات حاصل ہیں جو ارکان حج سے تعلق رکھتی ہیں ۔اور یہ خصوصیات بیت المقدس یا مسجد نبوی کو حاصل نہیں ۔دوسرے بیت المقدس کو کشف میں دکھانے سے یہ بھی بتانا مقصود تھا کہ آپ کی امت ان علاقوں پر قابض ہو جائے گی ۔اور یہ مضمون مسجد حرام کے دکھانے سے ظاہر نہ ہوتا تھا۔پس چونکہ ابھی بعض سیاسی وجوہ کی بناء پر وہ وقت نہ آیا تھا کہ اصل نام ظاہر کیا جاتا۔اس لئے تشبیہاً مسجد نبوی کا نام مسجد اقصیٰ رکھ دیا۔اور مدینہ کو یروشلم کی شکل میں دکھایا۔ یہ پیشگوئی جس رنگ میں پوری کی گئی وہ ذیل کی روایت سے ظاہر ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَاتَشُدُّوا الرِّحَالَ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَةِ مَسَاجِدَ اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَسْجِدِ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ سواری پر چڑھ کر کسی مسجد کی طرف نہ جانا چاہیے ۔سوائے تین مساجد کے ایک مسجد حرام ۔دوسری مسجد اقصیٰ اور تیسری مسجد نبویؐ۔(بخاری کتاب الجمعۃ باب فضلِ الصلوٰۃ فی مسجد مکۃ و المدینۃ)

مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ میں مشابہت اس جگہ مسجد نبوی اور مسجد اقصی کو آپس میں مشابہت دی ہے ۔پس مسجد نبوی کی بنیاد سے مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کی پیشگوئی پوری ہوگئی ۔اس مسجد کی طرف جانے کے علاوہ اس آیت میں ایک اور بات بھی بتائی گئی تھی ۔اور وہ یہ کہ مسجد اقصیٰ وہ جگہ ہے جس کے اردگرد کو بھی برکت دی گئی ہے ۔یعنی جس شہر میں وہ ہے اسے بھی معزز اور مکرم بنا دیا گیا ہے۔اس خبر کے مطابق نہ صرف مسجد نبوی کو برکت دی گئی بلکہ اس کے

اردگرد کے علاقہ یعنی مدینہ کو بھی برکت دی گئی۔اس کے مندرجہ ذیل ثبوت ہیں۔

آنحضرتؐ کی مدینہ میں ترقی کے لئے دعا (۱) بخاری میں روایت ہے کہ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ بِالْمَدِيْنَةِ ضِعْفَيْ مَا جَعَلْتَ بِمَكَّةَ مِنَ الْبَرَكَةِ (بخاری کتاب فضائل المدینۃ باب المدینۃ تنفع الخبث) یعنی حضرت انس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ اے اللہ مکہ میں جو تو نے برکت رکھی ہے اس سے بڑھ کر مدینہ میں برکت رکھ دے۔

(۲) اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ اِلَيْنَا الْمَدِيْنَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ اَوْ اَشَدَّ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَفِيْ مُدِّنَا۔ (بخاری کتاب فضائل المدینۃ باب المدینۃ تنفع الخبث) یعنی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ الٰہی تو مدینہ بھی ہمیں ایسا ہی پیارا بنادے جس طرح ہمیں مکہ پیارا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔اے اللہ اس کے صاع اور مُدّ میں برکت ڈال دے۔یعنی اہل مدینہ کے گذارے کے لئے ان کی زراعت اور تجارت میں برکت دے۔

(۳) عَنْ زَيْدِ بْنِ عَاصِمٍ اَنَّ اِبْرَاهِيْمَ حَرَّمَ مَكَّةَ وَدَعَا لِاَهْلِهَا وَاِنِّيْ حَرَّمْتُ الْمَدِيْنَةَ كَمَا حَرَّمَ اِبْرَاهِيْمُ مَكَّةَ وَاِنِّيْ دَعَوْتُ فِيْ صَاعِهَا وَمُدِّهَا بِمِثْلَيْ مَا دَعَا بِهٖ اِبْرَاهِيْمُ لِاَهْلِ مَكَّةَ (مسلم کتاب الحج باب فضل المدینۃ)۔یعنی زید بن عاصم کہتے ہیں کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ ابراہیمؑ نے مکہ کو محفوظ مقام قرار دیا تھا اور اس کے باشندوں کے لئے دعا کی تھی۔اور میں نے مدینہ کو محفوظ مقام قرار دیا ہے اور میں نے دعا کی ہے کہ مدینہ کے صاع اور مُدّ میں اس سے دگنی برکت رکھ دے جتنی کہ ابراہیم نے مکہ کے لئے طلب کی تھی۔(اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کی فضیلت کے لئے جو دعا ہے وہ دنیوی ترقی کے لئے ہے ورنہ آسمانی برکت کے لحاظ سے مکہ ہی سب دنیا کے شہروں سے افضل ہے)

ان روایات سے ظاہر ہے کہ مسجد اقصیٰ جس کے اردگرد کا علاقہ بھی بابرکت کیا گیا۔اس سے مراد رؤیا میں درحقیقت مسجد نبوی تھی۔اور ہر عقلمند سوچ سکتا ہے کہ مدینہ کو جو برکت ملی ہے کیا اس کا دسواں حصہ بھی یروشلم کو نصیب ہوئی ہے؟

اسریٰ کے لفظ میں بھی مجبوری سے سفر کا ثبوت ملتا ہے یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ سے ظاہر ہوتا ہے کہ چلانے والا کوئی دوسرا تھا۔اور اس میں چلنے والے کا اپنا اختیار نہ تھا۔ہجرت کا واقعہ بھی اسی طرح ہوا کہ آپ رات ہی کو نکلے۔اور یہ نکلنا اپنی مرضی سے نہ تھا بلکہ اس وقت مجبور ہو کر آپ نکلے جبکہ کفار نے آپ کے قتل

کرنے کے لئے آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا تھا۔ پس اس سفر میں آپ کی مرضی کا دخل نہ تھا۔ بلکہ خدا تعالیٰ کی مشیت نے آپ کو مجبور کیا۔ پھر جس طرح رؤیا میں جبریل بیت المقدس کے سفر میں آپ کے ساتھ تھے۔ ہجرت میں ابوبکرؓ آپ کے ساتھ تھے۔ جو گویا اسی طرح آپ کے تابع تھے جس طرح جبریل خدا تعالیٰ کے تابع کام کرتا ہے۔ اور جبریل کے معنے خدا تعالیٰ کے پہلوان کے ہوتے ہیں۔ حضرت ابوبکر بھی اللہ تعالیٰ کے خاص بندے تھے اور دین کے لئے ایک نڈر پہلوان کی حیثیت رکھتے تھے۔

مدینہ کے پہلے نام یثرب کی وجہ تسمیہ مدینہ کو جو برکت دی گئی اس کی ایک ظاہری صورت بھی تھی۔ اس کی حقیقت حضرت عائشہؓ کی ایک روایت سے ظاہر ہوتی ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ مدینہ میں آپ کی آمد سے پہلے بخار کی وباء سخت پھیلا کرتی تھی جب آپ وہاں تشریف لے گئے تو آپ کی دعا کے طفیل سے وہ وباء دور ہو گئی۔ اسی وباء کی وجہ سے پہلے مدینہ کا نام یثرب تھا۔ کیونکہ یثرب کے معنے رونا پیٹنا ہے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی وجہ سے وہ وباء دور ہو گئی اور آئندہ یثرب کی بجائے آپ نے اس کا نام مدینہ رکھا۔ (بخاری کتاب فضائل المدینۃ باب المدینۃ تنفی الخبث)۔

اسلامی حکومت کی ترقی کا راز مدینہ کو مرکز قرار دینا تھا پھر کشف میں جو یہ دکھایا گیا تھا کہ مسجد اقصیٰ میں جا کر آپ نے تمام انبیاء کو نماز پڑھائی۔ یہ خبر بھی مدینہ میں جا کر پوری ہوئی اور اس مقام سے ہی اسلام کی اشاعت ساری دنیا میں ہوئی۔ بلکہ اس امر کو دیکھ کر حیرت آتی ہے کہ جب مدینہ سے اسلامی دارالخلافہ کو بدل دیا گیا، اسی وقت سے اسلام کی ترقی رک گئی۔ تیس سال کے عرصہ میں جس میں مدینہ اسلامی دارالخلافہ تھا اس قدر اسلام کو ترقی ہوئی اور اس قدر اس کی اشاعت ہوئی کہ اس کے بعد تیرہ سو سال میں اس قدر نہیں ہوئی۔

اگر کہو کہ یہ برکات تو خود رسول کریم صلعم نے دی تھیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی برکات کوئی انسان نہیں دے سکتا انسان میں کہاں طاقت ہے کہ ایسی پیشگوئی کرے اور اس کو پورا کر دکھائے۔ آپ نے جو دعا کی وہ اللہ تعالیٰ کی اس پیشگوئی کی تائید میں تھی۔

اسراء میں مسلمانوں کے ملک شام پر قبضہ کرنے کی پیشگوئی (۲) دوسری صورت میں نے یہ بتائی تھی کہ مسجد اقصیٰ سے مراد بنی اسرائیل والی مسجد اقصیٰ بھی ہے اس صورت میں یہ تعبیر ہوگی کہ آپ کو اس ملک پر قبضہ دیا جائے گا۔ چنانچہ یہ تعبیر بھی پوری ہوئی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے خلیفہ کے وقت میں اس جگہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور تیرہ صدیوں تک قبضہ رہا۔ اب عارضی طور پر یہ علاقہ عیسائیوں کے قبضہ میں چلا گیا ہے۔

مگر یہ بھی ایک پیشگوئی کے ماتحت ہے۔اس کا زمانہ ختم ہونے پر پھر یہ ملک واپس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے ہاتھ میں آجائے گا۔خواہ بہت جلد خواہ کچھ وقفہ کے بعد اس صورت میں راتوں رات وہاں جانے کے یہ معنے لئے جائیں گے کہ بیت المقدس کی فتح ظاہری جنگوں کے سبب سے نہ ہوگی بلکہ اس رات کے دیکھے ہوئے نظارہ کی وجہ سے ہوگی۔ چنانچہ واقعہ بھی یہی ہے ورنہ عربوں کا ایک چھوٹا سا لشکر قیصر جیسے بڑے بادشاہ کا مقابلہ کب کرسکتا تھا۔یہ تو الٰہی کلام جو سورۃ اسراء والی رات میں نازل ہوا تھا اسی کا اثر تھا کہ بے سروسامان عربوں کے سامنے قیصر کا باسامان اور فنون حرب کی تعلیم پایا ہوا لشکر اس طرح بھاگتا جاتا تھا جیسے شیر کے سامنے ہوں۔اگر کوئی اعتراض کرے کہ یہ ملک تو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فتح ہوا تھا۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کے اتباع پیشگوئیوں میں اسی کے وجود میں شامل سمجھے جاتے ہیں اور اس کی مثالیں کثرت سے اسلام اور پہلے انبیاء کے لٹریچر میں پائی جاتی ہیں۔

مسجد اقصیٰ کو دیکھنے سے عیسائیت اور یہودیت پر اقتدار کی طرف اشارہ (۴) چوتھی بات تعبیر الرؤیاء کے مطابق میں نے یہ بتائی تھی کہ علاقہ کے علماء بھی مسجد کی شکل میں دکھائے جاتے ہیں اس تعبیر کے مطابق ہم دیکھتے ہیں کہ اس ملک پر نہ صرف سیاسی قبضہ مسلمانوں کو حاصل ہوا بلکہ مذہباً بھی اکثر حصہ ملک کا مسلمان ہوگیا اور تیرہ سو سال میں یروشلم اسلامی علماء کا مرکز بنا رہا ہے۔یہ تغیر پیدا کرنا بھی کسی انسان کی طاقت میں نہ تھا اللہ تعالیٰ ہی ایسا کرسکتا تھا۔

آنحضرتؐ کے واقعہ اسراء اور موسیٰ کے سفر میں فرق یہ عجیب بات ہے کہ موسیٰ کو بھی ایک نظارہ دکھایا گیا تھا اور اس کے متعلق جو الفاظ آتے ہیں وہ بھی اس واقعہ کے الفاظ سے ملتے جلتے ہیں۔حضرت موسیٰ ایک سفر پر تھے کہ انہوں نے ایک جگہ آگ دیکھی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (النمل:۹) کہ جو اس آگ میں پڑے گا وہ بھی بابرکت اور جو اس کے گرد آکر بیٹھے گا وہ بھی بابرکت ہوگا اور وہ آگ محبت الٰہی کی آگ تھی اور پھر جس طرح وہاں سبحان کا لفظ آیا تھا اسی طرح اس جگہ سبحان بھی آیا ہے۔اور جس طرح وہاں حَوْلَهٗ آیا ہے اسی طرح یہاں بھی بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ فرمایا ہے بعض نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آگ سے مراد اللہ تعالیٰ ہے (قرطبی زیر آیت بورک من فی النار) مگر یہ غلط ہے۔کیونکہ آیت کے الفاظ یہ ہیں کہ جو آگ میں ہے اسے برکت دی گئی ہے۔پس آگ سے مراد اللہ تعالیٰ نہیں بلکہ محبت الٰہی ہے اور یہ بتایا ہے کہ جو محبت الٰہی کی آگ میں اپنے آپ کو ڈال دے اُسے برکت دی جاتی ہے محبت کو دنیا کی کل زبانوں میں آگ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔بات یہ ہے کہ جس جگہ اللہ تعالیٰ اپنا جلال دکھاتا ہے اس کو برکت دیتا ہے اور وہاں سے اس کی

سبوحیت کا ظہور ہوتا ہے۔ اور ان دونوں نظاروں میں یعنی اس میں جو موسیٰ نے دیکھا اور اس میں جو آنحضرت صلعم نے دیکھا ان دونوں باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت موسیٰ کا ایک اور واقعہ بھی اس واقعہ سے ملتا ہے اور وہ وہ واقعہ ہے جو اگلی سورۃ کہف میں بیان ہوا ہے اس کی اس واقعہ سے جو مشابہت ہے اس جگہ پر بیان کی جائے گی۔

اسراء میں آنحضرتؐ کی بعثت ثانی کی پیشگوئی میرے نزدیک اس کشف میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک روحانی سفر کی طرف بھی اشارہ ہے اور یہ بتایا ہے کہ جب اسلام پر تاریکی کا زمانہ آئے گا اس وقت اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کے تابع وجود کے واسطہ سے پھر دنیا کی ہدایت کے لئے مقرر کرے گا۔ اور اس تابع کے واسطہ سے وہی برکات مسلمانوں کو پھر ملیں گی جو انبیاء بنی اسرائیل کو اور ان کے اتباع کو ملی تھیں اسی کی طرف سورۂ جمعہ میں بھی اشارہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ وَّ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (الجمعة: ۳، ۴) یعنی خدا ہی ہے جس نے امیوں میں ان میں سے ہی رسول بھیجا ہے جو ان سے اللہ تعالیٰ کے نشانات بیان کرتا ہے اور کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک اور جماعت کو بھی دین سکھائیں گے جو اب تک ان مسلمانوں سے نہیں ملی بلکہ آئندہ زمانہ میں ظاہر ہو گی اور یہ بات اللہ تعالیٰ سے بعید نہیں کیونکہ خدا تعالیٰ غالب ہے اور وہ حکمت والا ہے یعنے یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت تباہ ہو اور وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی بعثت کر کے اس کی اصلاح نہ کرے۔

وَ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ

اور ہم نے موسیٰ کو (بھی) کتاب دی تھی اور اس (کتاب) کو ہم نے بنی اسرائیل کے لئے ہدایت (کا ذریعہ)

اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ؕ ۳

بنایا تھا (اور اس میں انہیں حکم دیا تھا) کہ تم میرے سوا کسی کو (اپنا) کارساز نہ ٹھہراؤ۔

حلّ لغات۔ هُدًى هُدًى هدٰی کا مصدر ہے اور هَدَى کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۲۸۔ يَهْدِي هَدَى سے ہے اور هَدَاهُ الطَّرِيْقَ وَاِلَيْهِ وَلَهٗ کے معنے ہیں بَيَّنَهٗ لَهٗ وَعَرَّفَهٗ بِهٖ۔ راستہ دکھایا، بتایا

اور واضح کیا۔ ھَدٰی فُلَانًا: تَقَدَّمَهٗ اس کے آگے آگے چل کر منزل مقصود تک لے گیا۔ ھَدَاہُ اللّٰہُ اِلَی الْاِیْمَانِ: اَرْشَدَہٗ اِلَیْہِ۔ ایمان کی طرف رہنمائی کی۔ (اقرب)

بنی اسرائیل اِسْرَائِیْلُ حضرت یعقوب کا لقب ہے (پیدائش باب ۳۲۔آیت ۲۸) اور بنو اسرائیل حضرت یعقوب کی اولاد کو کہتے ہیں۔

دُوْن دُوْنَ کے معنی ہیں۔سِوَا۔مزید تشریح کے لئے دیکھو نحل آیت نمبر ۸۷۔

وَ کِیْلًا وَ کِیْلًا کے معنی کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۱۰۹۔

اَلْوَ کِیْلُ الْمَوْکُوْلُ اِلَیْہِ جس کے سپرد کوئی بات کر دی جائے۔ وَقَدْ یَکُوْنُ لِلْجَمْعِ وَالْاُنْثٰی۔ یہ لفظ واحد و جمع ہر دو کے لئے اور اسی طرح مذکر و مؤنث ہر دو کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ وَیَکُوْنُ بِمَعْنٰی فَاعِلٍ اِذَا کَانَ بِمَعْنَی الْحَافِظِ اور جب اس کے معنی حافظ یعنی نگہبان کے ہوں تو اس وقت اسم مفعول کے معنی میں نہیں بلکہ اسم فاعل کے معنی میں ہوتا ہے۔ وُصِفَ بِہٖ اللّٰہُ تَعَالٰی اور انہی معنوں میں یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔ وَقِیْلَ الْکَافِی الرَّازِقُ اور بعض کہتے ہیں کہ جب یہ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے والے اور رازق کے ہوتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ اٰتَیْنَا سے حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کا ذکر اس آیت سے حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کا ذکر شروع کیا ہے ان آیات کا گذشتہ آیت اور پہلی سورۃ سے کئی طرح تعلق ہے (۱) پہلی آیت میں رسول کریم صلعم اور آپؐ کے اتباع کو بیت المقدس دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ شہر اور اس کے گرد کا ملک پہلے الٰہی وعدہ کے مطابق حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کو ملا تھا۔ مگر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پرواہ نہ کر کے اسے کھو دیا۔ پس ان کے واقعہ کو یاد کرا کے مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ موسوی قوم کی اچھی میراث تم کو دی جارہی ہے مگر ہوشیار رہنا۔ ایسا نہ ہو۔ بُری میراث بھی لے لو اور تباہ ہو جاؤ۔

یہود کے عذاب سے بچنے کا ذریعہ اسلام سے وابستگی ہے (۲) سورۂ نحل کے آخر میں یہود سے تعلق پیدا ہونے کی پیشگوئی کی گئی تھی۔ اور ہدایت کی تھی کہ ان سے عمدہ رنگ میں بحث کرنا۔ یعنی وہ ایک اہل کتاب قوم ہے ان سے مسلّمہ اصول کے مطابق اور ان دلائل کے مطابق جو ان کی کتب میں مذکور ہیں بحث کرنا۔ اب اس طریق بحث کی مثال پیش کرتا ہے یعنی ان کی کتاب سے ہی وہ پیشگوئیاں پیش کرتا ہے جن سے ان کے بگڑ جانے کی خبر اور عذاب الٰہی میں مبتلا ہونے کی خبر ملتی ہے۔ اور بتاتا ہے کہ ان حالات میں یہود کے لئے بہترین راستہ یہ ہے کہ وہ

اس نئے عہد کو قبول کر کے اس عذاب کو دور کریں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اگر ارض مقدس بحیثیت یہود ان کے ہاتھ سے نکل گئی ہے تو بحیثیت مسلمان وہ اس میں پھر سے داخل ہو جائیں اس کے سوا ان کے لئے اور کوئی ترقی کی راہ کھلی نہیں ہے۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ

(اور یہ بھی کہا تھا کہ اے) ان لوگوں کی نسل جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی پر) سوار کیا تھا وہ

عَبْدًا شَكُوْرًا ④

یقیناً (ہمارا) نہایت شکر گذار بندہ تھا۔

حلّ لُغات۔ ذُرِّيَّةَ ذُرِّيَّةٌ کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۸۴۔

الذُّرِيَّةُ: اَلصِّغَارُ مِنَ الْاَوْلَادِ وَاِنْ كَانَ قَدْ يَقَعُ عَلَى الصِّغَارِ وَالْكِبَارِ مَعًا فِي التَّعَارُفِ۔ یعنی ذریۃ کے معنی چھوٹی عمر کے بچوں کے ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی عرف عام میں چھوٹے اور بڑے سب بچوں کے لئے مشترک طور پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ وَيُسْتَعْمَلُ لِلْوَاحِدِ وَالْجَمْعِ وَاَصْلُهُ الْجَمْعُ۔ اور یہ لفظ ایک بچہ کے لئے بھی اور زیادہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ گو اصل میں جمع کے لئے ہی یہ لفظ بنا ہے۔ (مفردات)

شکور شَكُوْرٌ شَكَرَ سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اور شکر کے معنی کے لئے دیکھو ابراہیم آیت نمبر ۶۔

شَكُوْرٌ شَكَرَ سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور شَكَرَ کبھی بغیر صلہ اور کبھی ''ل'' کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی شَكَرَهٗ و شَكَرَ لَهٗ اور اگر شَكَرَ کا ''ل'' صلہ آئے تو یہ زیادہ فصیح سمجھا جاتا ہے اور شَكَرَهٗ وَشَكَرَ لَهٗ کے معنے یہ ہوتے ہیں اَثْنٰى عَلَيْهِ بِمَا اَوْلَاهُ مِنَ الْمَعْرُوْفِ۔ کہ کسی کے احسان کے باعث اس کی تعریف کی۔ گویا اقرارِ احسان اظہارِ قدر کے ساتھ شکر کہلاتا ہے اور کثرت کے ساتھ اقرارِ احسان کرنے والے کو شکور کہتے ہیں۔

تفسیر۔ یعنی اس کتاب کے نزول کے بعد ہم نے ان سے کہا کہ اے نوح کے ساتھیوں کی ذرّیت تمہارا دادا نوح تو بڑا شکر گذار بندہ تھا یعنی تم بھی اپنے باپ کے سپوت بننا اور شکر گذار بننے کی کوشش کرنا۔

بعض نے اس قول کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ پر محمول کیا ہے (فتح البیان زیر آیت ھذا)۔ مگر میرے نزدیک یہ موسیٰ کی قوم ہی کے متعلق ہے۔ کیونکہ اس آیت کے بعد بھی پھر موسیٰ کی قوم کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔ ان

الفاظ میں بنی اسرائیل کو اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ جس طرح نوح کو ہم نے طوفان سے بچایا تھا تم کو سمندر سے نجات دی ہے۔ پس نوح اور ان کے ساتھیوں کی طرح تم بھی شکر گذار بنو۔

مسلمانوں کو مخالفت کے طوفان سے نجات دینے کی پیشگوئی اس آیت میں مسلمانوں کو بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ ایک مخالفت کے طوفان سے ہم تم کو نجات دینے والے ہیں۔ تم بھی اس کی قدر کرنا۔ امت محمدیہؐ اور موسوی میں یہ فرق ہے کہ موسیٰ کی امّت نے شکر گذاری سے کام نہ لیا۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع نے شکر گذاری کا بے نظیر نمونہ دکھایا۔ گو کچھ عرصہ بعد میں مسلمانوں نے بھی ناشکری کا نمونہ دکھایا اور اسی کی طرف درحقیقت ان آیات میں توجہ دلائی گئی ہے۔

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي

اور ہم نے اس کتاب میں بنی اسرائیل کو یہ بات (کھول کر) پہنچادی تھی کہ تم یقیناً اس ملک میں دوبار فساد کرو گے۔

الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝۵

اور یقیناً تم بہت بڑی سرکشی (اختیار) کرو گے۔

حلّ لُغات ۔ **قَضَيْنَا** قَضَيْنَا قضٰی (يَقْضِيْ) سے جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور قَضَى الشَّيْءَ کے معنی ہیں اَعْلَمَهٗ وبَيَّنَهٗ۔ کسی چیز کو خوب کھول کر بتایا (اقرب) پس قَضَيْنَا کے معنے ہوں گے۔ اَعْلَمْنَا وَاَخْبَرْنَا۔ ہم نے یہ بات کھول کر بتادی۔ قَضٰی کی مزید تشریح کے لئے دیکھو حجر آیت نمبر ٦۷۔

قَضَيْنَا قَضٰی سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور قَضٰی بَيْنَ الْخَصْمَيْنِ کے معنی ہیں حَكَمَ وَفَصَلَ ۔ مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان جھگڑے کا فیصلہ کردیا۔ قَضَى الشَّيْءَ قَضَاءً: صَنَعَهٗ بِاِحْكَامٍ وَقَدَّرَهٗ ۔ کسی چیز کو عمدہ طور پر بنایا۔ اور اس کا صحیح اندازہ لگایا۔ قَضَى الْاَمْرَ عَلَيْهِ: خَتَمَهٗ وَاَوْجَبَهٗ وَاَلْزَمَهٗ بِهٖ۔ اس کے خلاف بات کو ختم کردیا اور اس پر اس کو واجب کردیا اور اس کا پورا کرنا اس کا فرض قرار دیا۔ الشَّيْءَ: اَعْلَمَهٗ وَبَيَّنَهٗ کسی معاملہ کا اعلان کیا اور اس کو کھول کر بیان کیا۔ قَضٰی لَكَ الْاَمْرَ اَيْ حَكَمَ لَكَ کسی معاملہ کا تیرے حق میں فیصلہ کردیا۔ (اقرب)

وَلَتَعْلُنَّ وَلَتَعْلُنَّ عَلَا (يَعْلُوْ) سے مضارع کا صیغہ ہے۔ اور عَلَا الشَّيْءُ کے معنے ہیں اِرْتَفَعَ ۔ کوئی چیز بلند ہوئی۔ عَلَا فُلَانٌ فِي الْاَرْضِ ۔ تَكَبَّرَ وَتَجَبَّرَ۔ اس نے تکبر اور سرکشی کی ۔ عَلَا فُلَانًا: غَلَبَهٗ وَقَهَرَهٗ کسی پر

غالب آیا۔ عَلَا فُلَانًا بِالسَّیْفِ: ضَرَبَہٗ۔ اسے تلوار ماری۔ عَلَا الْمَکَانَ۔ صَعِدَہٗ۔ کسی جگہ پر چڑھا۔ عَلَا فِی الْمَکَارِمِ۔ شرف خوبیوں میں ممتاز ہوا (اقرب) پس وَلَتَعْلُنَّ کے معنے ہوں گے۔ کہ تم سرکشی کرو گے۔

تفسیر ۔ مسلمانوں کے لئے یہود سے عبرت حاصل کرنے کا موقعہ فرمایا کہ تمہارا نبی مثیل موسیٰ قرار دیا گیا ہے اور اس مشابہت کو پورا کرنے کے لئے اسے بیت المقدس اور اس کے گرد کا علاقہ دیا جانے والا ہے۔ پس تم کو اس امر میں احتیاط کرنی چاہیے کہ جو کچھ بنی اسرائیل سے بعد میں معاملہ ہوا وہ تم سے نہ ہو اور وہ واقعہ یہ بیان فرماتا ہے کہ بنی اسرائیل کے متعلق ہم نے خبر دی تھی کہ دو دفعہ تم دنیا میں عظیم الشان فساد کے مرتکب ہو گے۔ اور سخت مظالم کرو گے اور تم کو اس کی سزا میں تباہ کر دیا جائے گا۔ گو سزا دینے کا یہاں لفظاً ذکر نہیں کیا گیا۔ لیکن اگلی آیت سے یہ مضمون ظاہر ہے۔

اس آیت سے دو امور کا ثبوت اس آیت سے مندرجہ ذیل امور نکلتے ہیں (۱) اس میں قَضَیْنَا فِی الْکِتٰبِ کے الفاظ ہیں۔ جن سے مراد حضرت موسیٰ کی کتاب ہے (۲) اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے دو دفعہ باغی ہو کر الٰہی عذاب میں مبتلا ہونے کی خبر اس کتاب میں پہلے سے دے دی گئی تھی۔ نئے اور پرانے مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں دو غلطیاں کی ہیں۔

اول تو یہ کہ بنی اسرائیل کی تباہی کے بعض واقعات تو درج کر دئے ہیں۔ لیکن قرآنی الفاظ کی صداقت کے اظہار کے لئے وہ پیشگوئی درج نہیں کی۔ جس کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے۔ دوم جنہوں نے پیشگوئی بیان کرنے کی طرف توجہ کی ہے انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ پیشگوئی موسیٰ علیہ السلام کی کتاب میں بیان کی گئی تھی۔ میں نے ان دونوں امور کو مدنظر رکھا ہے اور موسیٰ کی کتب سے پیشگوئیاں بیان کی ہیں اور واقعات تاریخی جمع کر کے لکھے ہیں۔

عَلَا کے معنی عَلَا بمعنے ظلم ہے یعنی تم لوگوں کے اوپر ظلم کرو گے جبر کرنے لگ جاؤ گے اور تکبر کرو گے اور ظلم سے کام لو گے۔ کیونکہ عَلَا (یَعْلُوْ۔ عَلُوًّا) فُلَانٌ کے معنی ہوتے ہیں۔ تَکَبَّرَ وَ تَجَبَّرَ یعنی تکبر کیا اور ظلم سے کام لیا۔ وَعَلَا فُلَانًا بِالسَّیْفِ: ضَرَبَہٗ۔ اس کو تلوار سے مارا۔

یہود کی تباہی کا ذکر بائیبل میں فِی الْکِتٰبِ۔ کہہ کر یہ بتایا ہے کہ اس کا ذکر موسیٰ کی کتاب میں ہے۔ چنانچہ موسیٰ کی کتاب میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے استثناء باب ۲۸۔ آیت ۱۵ میں لکھا ہے ’’لیکن اگر تو خداوند اپنے خدا کی آواز کا شنوا نہ ہوگا کہ اس کے سارے شرعوں اور حکموں پر جو آج کے دن میں تجھے بتاتا ہوں دھیان رکھ کے عمل

کرے تو ایسا ہوگا کہ یہ ساری لعنتیں تجھ پر اتریں گی اور تجھ تک پہنچیں گی۔'' اس کے بعد ان لعنتوں کا ذکر کیا ہے جو نافرمانی کی وجہ سے ان پر اتریں گی۔ چنانچہ فرماتا ہے ''خداوند تجھ کو اور تیرے بادشاہ کو جسے تو اپنے اوپر قائم کرے گا ایک گروہ کے درمیان جس سے تُو اور تیرے باپ دادے واقف نہ تھے لے جائے گا۔'' آیت ۳۶۔ پھر لکھا ہے۔ ''خداوند ایک گروہ دور سے زمین کی انتہا سے ایسا جلد بلکہ جیسا عقاب اُڑتا ہے تجھ پر چڑھالائے گا وہ ایک گروہ ہوگی جس کی زبان تو نہ سمجھے گا وہ ترش رو گروہ ہوگی جو نہ بوڑھے کا ادب نہ جوان پر کرم کرے گی اور وہ تیری مواشی کا پھل اور تیری زمین کا پھل کھا جائے گی یہاں تک کہ تو ہلاک ہو جائے گا۔ اس لئے کہ غلّے اور مَے اور تیل اور تیری گائے بیل کی بڑھتی اور بھیڑ بکری کے گلّوں سے تیرے لئے کچھ نہ چھوڑے گی یہاں تک کہ وہ تجھے فنا کر دے گی اور وہ تجھے تیرے سب پھاٹکوں میں آگھیرے گی یہاں تک کہ تیری اونچی اور محکم دیواریں جن کا تجھے اپنے سارے ملک میں بھروسا تھا گر جائیں گی اور وہ تجھے اس ساری زمین میں جسے خداوند تیرے خدا نے تجھے دیا ہے ہر ایک شہر کے سب پھاٹکوں میں آگھیرے گی۔ اور تو اپنے ہی بدن کا پھل ہاں اپنے بیٹوں اور اپنی بیٹیوں کا گوشت جنہیں خداوند تیرے خدا نے بخشا تھا اس محاصرہ کے وقت اور اس تنگی میں جو تیرے بیریوں کے سبب سے تجھ پر ہوگی کھائے گا وہ شخص جو تم میں نرم دل اور بہت ناز پرورده ہوگا اس کی بھی نظر اپنے بھائی کی طرف اور اپنی ہمکنار جورو کی طرف اور اپنے باقی لڑکوں کی طرف جنہیں اس نے چھوڑ دیا ہوگا بری ہوگی یہاں تک کہ وہ اپنے بچوں کے گوشت میں سے جسے وہ کھائے گا انہیں ان میں سے کسی کو کچھ نہ دے گا کیونکہ اس محاصرے اور تنگی میں جو تیرے دشمنوں کے باعث سے تیرے سارے پھاٹکوں میں تجھ پر ہوگی اس کے لئے کچھ نہ باقی رہے گا اور وہ عورت بھی جو تمہارے درمیان نرم دل اور نہایت نازنین ہوگی ایسی کہ نزاکت اور نرمی سے اپنے پاؤں کا تلوا زمین پر لگانے کی جرأت نہیں رکھتی اس کی نظر اپنے ہمکنار شوہر کی طرف اور اپنے بیٹے کی طرف اور اپنی بیٹی کی طرف بُری ہوگی۔'' آیت ۴۹ تا ۵۶۔ پھر لکھا ہے:۔

''اور یوں ہوگا کہ جس طرح خداوند نے تم سے خوش ہو کر تمہارے ساتھ نیکی کی اور تمہیں بہت کر دیا اسی طرح خداوند تمہاری بابت خوش ہوگا کہ تمہیں ہلاک کرے اور نیست و نابود کر ڈالے اور تو اس سرزمین سے جس کا تو مالک ہونے جاتا ہے جڑھ سے اکھاڑ ڈالا جائے گا۔ اور خداوند تجھ کو سب قوموں کے درمیان زمین کے اس سرے سے اس سرے تک تِتّر بِتّر کرے گا اور وہاں تُو غیر معبودوں کی جو لکڑیاں اور پتھر ہیں جس سے نہ تُو نہ تیرے باپ دادے واقف تھے پرستش کرے گا۔'' آیت ۶۳ و ۶۴۔

ان آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خبردار کیا ہے کہ اگر وہ احکام الٰہی کو توڑ دیں گے تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ ایک غیر قوم دور سے ان پر چڑھ آئے گی۔ اور ان کا محاصرہ کرے گی۔ محاصرہ کے وقت قحط اور وباء پڑیں گے۔ آخر ان کے شہروں کی فصیلیں توڑ دی جائیں گی بادشاہ قید کر کے لے جایا جائے گا۔ اور قوم جلا وطن کر کے دور علاقوں میں بھیج دی جائے گی۔ یہ پیشگوئی ان دو فسادوں میں سے جن کا قرآن کریم نے ذکر کیا ہے پہلے فساد کی نسبت ہے۔

قضا کے معنی یہ جو فرمایا قَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے ایک وحی کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو آئندہ آنیوالی اس مصیبت سے خبر دے دی تھی مگر افسوس کہ وہ پھر بھی ہوشیار نہ ہوئے۔

انسان کو ہوشیار کرنے کے دو مقصد دراصل پہلے بتانے سے غرض ہوشیار کرنا ہی ہوتا ہے اور ہوشیار کرنے کے دو مقصد ہوتے ہیں۔ (۱) انسان کوشش کرے اور بچ جاوے۔ (۲) اگر نہ بچے تو اس پر حجت پوری ہو۔

آنحضرتؐ کا اپنی امت کو ہوشیار کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی امت کے متعلق فرمایا ہے لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ (بخاری کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة باب قول النبی لتتبعن سنن من کان قبلکم) کہ تم پہلے لوگوں کے طریقہ پر عمل کرو گے۔ اور بعض احادیث میں ہے کہ یہود و نصاریٰ کے نقش قدم پر چلو گے مگر افسوس کہ باوجود ہوشیار کر دینے کے مسلمان بھی اس آفت سے نہ بچے۔

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ

اور جب ان دو (بار کے فسادوں) میں سے پہلی (بار) کا وعدہ (پورا ہونے کا وقت) آیا۔ تو ہم نے اپنے بعض ایسے

بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ وَ كَانَ وَعْدًا

بندوں کو (تمہاری سرکوبی کے لئے) تم پر (مستولی کر کے) کھڑا کر دیا۔ جو سخت جنگ جو تھے اور وہ

مَّفْعُوْلًا ۶

(تمہارے) گھروں کے اندر جا گھسے۔ اور یہ (وعدہ بہر حال) پورا ہو کر رہنے والا وعدہ تھا۔

حلّ لُغَات۔ اُوْلِيْ بَاْسٍ اُولُوْ جمع ہے جس کے معنے ذَوُوْ کے ہیں (یعنی فلاں صفت والے) اس کا مفرد

نہیں آتا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ اسم جمع ہے۔ اوراس کا مفرد ذُوْ ہے۔ جیسے غَنَمٌ اسم جمع ہے۔ اور شَاۃٌ اس کا مفرد ہے۔(اقرب) اَلْبَأْسُ: اَلْعَذَابُ۔ عذاب۔ اَلشِّدَّۃُ فِی الْحَرْبِ۔ گھمسان کی لڑائی۔(اقرب) مزید تشریح کے لئے دیکھو سورۃ نحل ۸۲ پس اُوْلِیْ بَأْسٍ کے معنے ہوں گے۔ جنگجو۔

جَاسُوْا جَاسَ (یَجُوْسُ جَوْسًا) اَلشَّیْءَ کے معنی ہیں۔ طَلَبَہٗ بِالْاِسْتِقْصَاءِ۔ کسی چیز کو حاصل کرنے میں انتہائی محنت و کاوش سے کام لیا۔ اور جَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ کے معنے ہیں۔ دَارُوْا فِیْھَا بِالْعَیْثِ وَالْفَسَادِ۔ علاقوں میں فساد اور تباہی مچاتے ہوئے گھس گئے۔ وَفَسَّرَہُ الْجَوْھَرِیُّ بِقَوْلِہٖ اَیْ تَخَلَّلُوْا فَطَلَبُوْا مَا فِیْھَا کَمَا یَجُوْسُ الرَّجُلُ الْاَخْبَارَ اَیْ یَطْلُبُھَا۔ اور جوہری نے جَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ کے معنے یہ کئے ہیں وہ علاقوں میں گھس گئے۔ اور مال و دولت کو حاصل کرنا چاہا۔(اقرب)

دیار دِیَارٌ دَارٌ کی جمع ہے۔ اور دَارٌ کے معنی اَلْمَحَلُّ۔ مکان۔ وَالْعَرْصَۃُ۔ صحن۔ میدان۔ اَلْبَلَدُ۔ شہر ملک۔ علاقہ (اقرب) خِلٰلَ الدِّیَارِ: مَاحَوَالِیْ حُدُوْدِھَا وَمَابَیْنَ بُیُوْتِھَا۔ ملکوں کی حدوں اوران کے گھروں کے درمیان۔(اقرب)

تفسیر۔ اب اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا حال بتاتا ہے اور فرماتا ہے کہ جب پہلے وعدہ کا وقت آ گیا تو اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر ایسے لوگ غالب کردئے جو سخت جنگ کرنے والے تھے۔ وہ آئے اور تمہارے گھروں میں گھس گھس کر انہوں نے تم کو ہلاک کر دیا۔

وَ کَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا۔ وہ وعدہ ہمارا پورا ہو کر رہنے والا تھا۔ یا یہ کہ ہمارا وعدہ پورا ہو ہی گیا ہے۔

آیت میں یہود پر دو عذابوں کا ذکر جن دو عذابوں کے متعلق اس آیت میں خبر دی گئی ہے اس کا ذکر قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ یوں کیا گیا ہے لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ (المائدۃ:۷۹) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت داؤد کے بعد عذاب آیا۔ اور ایک دفعہ حضرت عیسیٰ کے بعد آیا۔

یہود پر پہلے عذاب کا ذکر بائیبل میں پہلے عذاب کا حال بائبل سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہود حضرت موسیٰ کے بعد طاقتور ہو گئے تھے۔ حتی کہ حضرت داؤد کے زمانہ میں ایک زبردست حکومت کی بنیاد پڑ گئی جو ان کے بعد بھی ایک عرصہ تک قائم رہی اور آخر آہستہ آہستہ کمزوری ہوتی گئی اور آخری زمانہ میں بابل کے شمال کے علاقہ میں بسنے والی اشوری قوموں نے ان کو شکست دی یہ قوم نینوا کی بادشاہ تھی۔ انہوں نے یہود کو اپنا باجگذار بنالیا

اس کے بعد ’’نیکو‘‘ ایک مصر کا شہزادہ تھا۔ اس نے اسوریوں کو شکست دی اور وہ نینوا کی بجائے مصریوں کے باجگذار بن گئے۔ ۶۰۰ سال قبل مسیح کے قریب اور حضرت داؤد سے قریباً ۴۰۰ سال بعد یرمیاہ نبی کی معرفت ان کو ان کی خرابیوں پر اللہ تعالیٰ نے پھر متنبہ کیا۔ اور ان کے گناہوں پر انہیں پھر تنبیہ کی اور فرمایا کہ اگر اب بھی توبہ کر لو تو وہ جو تمہارے لئے جلاوطنی کی پیشگوئی تھی ٹلا دی جائے گی مگر وہ باز نہ آئے۔ (یرمیاہ باب ۷)

آخر اللہ تعالیٰ نے بابلیوں کو ان کے عذاب کے لئے مسلّط کیا۔ یہ واقعہ بائبل کی کتاب ۲ سلاسطین باب ۲۵ میں یوں لکھا ہے ’’شاہِ بابل نبوکدنضر نے اور اس کی ساری فوج نے یروشلم پر چڑھائی کی۔‘‘ آیت ۱۔ اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ بہت دیر تک رہا۔ اس وقت یروشلم کا بادشاہ صدقیاہ تھا۔ جب محاصرہ نے طول پکڑا تو شہر کے اندر غلّہ کم ہو گیا لکھا ہے ’’تب شہر ٹوٹا‘‘ آیت ۴ یعنے بابل کی فوج نے فصیل توڑ دی۔ آخر لوگ ایک طرف کا دروازہ کھول کر بھاگے صدقیاہ بادشاہ بھی بھاگا مگر پکڑا گیا اس کی آنکھیں نکالی گئیں اور آنکھیں نکالنے سے پہلے اس کے بیٹوں کو اس کے سامنے ہلاک کر دیا گیا پھر اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر اسے بابل لے گئے آیت ۴ تا ۷۔ اس کے بعد شاہِ بابل نے اپنے ایک افسر بنوزردان کو یروشلم بھجوایا۔ اس نے آ کر ’’خداوند کا گھر اور بادشاہ کا قصر (محل) اور یوروشلم کے سارے گھر ہاں ہر ایک رئیس کا گھر جلا دیا۔ اور کُسدیوں کے سارے لشکر نے جو جلوداروں کے سردار کے ہمراہ تھا ان دیواروں کو جو یروشلم کے گرداگرد تھیں گرادیا اور باقی لوگوں کو جو شہر میں چھوڑے گئے تھے اور ان کو جنہوں نے اپنوں کو چھوڑ کے شاہِ بابل کی پناہ لی تھی تمام جماعت کے بقیّہ کے ساتھ بنوزردان جلوداروں کا سردار پکڑ کر لے گیا‘‘ آیت ۹ تا ۱۱۔

نحمیاہ نبی کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تباہی کا ایک بڑا باعث سبت کی بے حرمتی تھی۔ چنانچہ لکھا ہے ’’تب میں نے یہوداہ کے شریف لوگوں سے تکرار کر کے کہا کہ یہ کیا بُرا کام ہے جو تم کرتے ہو کہ سبت کے دن کو مقدس نہیں جانتے ہو کیا تمہارے باپ دادوں نے ایسا نہیں کیا اور ہمارا خدا ہم پر اور اس شہر پر یہ سب آفتیں نہیں لایا؟ تب بھی تم سبت کے دن کو پاک نہ مان کے اسرائیل پر زیادہ غضب بھڑکاتے ہو؟‘‘ باب ۱۳ آیت ۱۷۔۱۸۔

اسی طرح حزقیل نبی نے بھی اس وقت یہود کو ڈرایا تھا۔ انہوں نے ان کے بہت سے گناہوں کا ذکر کرتے ہوئے ان میں سے ایک گناہ یہ گنایا ہے کہ ’’تُو نے میرے مقدسوں کو ناچیز جانا ہے اور میرے سبتوں کو ذلیل کیا ہے‘‘ حزقیل باب ۲۲ آیت ۸۔ پھر باب ۲۳ آیت ۳۸ میں ہے ’’اس کے سوا انہوں نے مجھ سے یہ کیا ہے کہ اسی دن انہوں نے میرے مقدس کو ناپاک کیا اور میرے سبتوں کو حرمت نہ دی‘‘۔

میں نے سبت کی بے حرمتی کے حوالے اس لئے دئے ہیں کہ اس جگہ صرف سخت عذاب کی خبر بتائی گئی ہے مگر درحقیقت اشارہ سورہ نحل کی آیات کی طرف ہے جن میں کہا گیا تھا کہ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (النحل: ۱۲۵) یعنی سبت کا عذاب ان لوگوں پر نازل کیا گیا تھا جنہوں نے الٰہی کلام میں اختلاف کر کے دین کو نقصان پہنچایا تھا۔ قرآن کریم کے مضامین کی ترتیب کی اس آیت میں ایک زبردست شہادت ہے کہ سورہ نحل جو بعد میں اُتری ہے اس میں سبت کا ذکر ہے سورۂ بنی اسرائیل اس سے پہلے کی نازل شدہ ہے اور اس کے مضامین سورۂ نحل سے اس طرح چسپاں ہو جاتے ہیں گویا سورہ نحل پہلے کی ہے اور اِسراء بعد کی۔ اور اس میں سورہ نحل کے مضامین کے جواب دیئے گئے ہیں اور ان کی تکمیل کی گئی ہے۔

تاریخ سے بابلیوں کی اس چڑھائی کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب یہود کمزور ہو گئے تو اسوریوں نے فلسطین کو فتح کر کے اپنا تابع کر لیا۔ لیکن اس کے بعد ایک مصری بادشاہ فرعون نیکو (Pharaoh Necho) نامی نے اسورین حکومت کو تباہ کر دیا۔ اور فلسطین اسوریوں کی حکومت سے نکل کر مصر کی حکومت تلے آ گیا۔ فرعون مصر نے یوسیاہ کے بیٹے الیاقیم (اس کا نام یہویقیم کر دیا گیا) Eliakim کو وہاں کا بادشاہ بنا دیا۔ لیکن اس دوران میں اسورین کی حکومت کی تباہی کو دیکھ کر اس کے ہمسایہ کلدانی (Chaldean) بادشاہ نے اپنے بیٹے نبوکدنضر (Nebuchadnezzar) کو نیکو کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ اور نبوکدنضر نے مصر کو فتح کر لیا۔ اور فلسطین بابلیوں کے زیر اثر آ گیا۔ مگر فلسطین کا بادشاہ یہویقیم مصر کی طرف مائل رہا۔ اس پر نبوکدنضر نے اس پر چڑھائی کی (یہ چڑھائی نبو کدنضر کے جرنیل نے کی ۵۸۷ ۔ق ۔م ۔جس کا نام بنوزرآدم تھا) مگر اس کے لشکر پہنچنے سے پہلے بادشاہ یہویقیم مر گیا۔ اسکا بیٹا یہویکین (Jehoiachin) تابِ مقابلہ نہ لا کر معافی کا طلبگار ہوا۔ اسے بابل بلا لیا گیا۔ اور صدقیاہ (Zedekiah) (یہ یہویقیم کا بھائی تھا اور اس کا اصل نام متنیاہ Mattaniah تھا) کو فلسطین کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ مگر اس نے بھی مصر کے بادشاہ حوفرا (Hophra) کی طرفداری کی۔ اس پر بابلیوں نے ۵۸۸ قبل المسیح میں فلسطین کے دارالخلافہ کا محاصرہ کر لیا۔ آخر ۵۸۶ قبل مسیح میں شہر کی دیوار توڑ دی گئی۔ صدقیاہ بھاگا۔ مگر گرفتار کر لیا گیا۔ اور بادشاہ کے حکم سے قید کر کے بابل پہنچایا گیا۔ بابلیوں نے یہود کی مقدس عمارات کو جلا دیا۔ اور فصیل کو گرا دیا۔ اور شہر برباد کر دیا۔

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ

پھر ہم نے تمہاری طرف (دشمن پر) دوبارہ حملہ کی طاقت کو لوٹا دیا اور ہم نے کئی قسم کے مالوں اور (نیز) بیٹوں کے

بَنِيْنَ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝

ذریعہ سے تمہاری مدد کی۔ اور ہم نے تمہیں جتھے کے لحاظ سے بھی (پہلے سے) زیادہ کر دیا۔

حلّ لُغات۔ اَلْكَرَّةَ كَرَّ الْفَارِسُ كَرًّا کے معنے ہیں فَرَّ لِلْجَوْلَانِ ثُمَّ عَادَ لِلْقِتَالِ۔ شہسوار نے پہلے میدان جنگ میں چکر لگایا۔ پھر لڑنے کے لئے لوٹا۔ اَلْكَرَّةُ کے معنے ہیں۔ اَلْمَرَّةُ۔ باری۔ دفعہ۔ اَلْحَمْلَةُ فِي الْحَرْبِ۔ لڑائی میں حملہ (اقرب) پس ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ کے معنے ہیں۔ تمہاری طرف دوبارہ حملہ کی طاقت کو لوٹا دیا۔

نَفِيْرٌ اَلنَّفِيْرُ لِمَادُوْنَ الْعَشَرَةِ مِنَ الرِّجَالِ۔ دس سے کم لوگوں پر نَفِيْرٌ کا لفظ بولتے ہیں۔ اَلْقَوْمُ يَنْفِرُوْنَ مَعَكَ وَيَتَنَافَرُوْنَ فِي الْقِتَالِ۔ وہ لوگ جو لڑائی کے لئے گھروں سے اکٹھے نکلیں۔ وَقِيْلَ هُمُ الْجَمَاعَةُ يَتَقَدَّمُوْنَ فِي الْاَمْرِ۔ اور بعض کہتے ہیں۔ کہ نفیر لوگوں کی اس جماعت کو کہتے ہیں جو کسی کام میں پیش قدمی کرے۔ (اقرب)

تفسیر۔ یعنی اس تباہی کے بعد پھر خدا تعالیٰ نے تم کو نجات دی اور طاقت عطا کی اور یہ اس طرح ہوا کہ یہود کی اس تباہی کے بعد میداور فارس کا بادشاہ بابل پر چڑھ آیا اور بنی اسرائیل اپنے نبی کے حکم کے ماتحت اس کے ساتھ مل گئے اور اس نے ان کو قید سے آزاد کر دیا۔ اس کا تفصیلی ذکر سورۃ بقرہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ میں گذر چکا ہے۔

یہود کی پہلی تباہی کے بعد نجات کی خبر بائیبل میں اس واقعہ کی نسبت حضرت موسیٰ نے ان الفاظ میں پیشگوئی کی تھی ’’اور یوں ہوگا کہ جب یہ سب کچھ تجھ پر گذرے گا۔ برکت اور لعنت جنہیں میں نے تیرے آگے رکھا اور تو ان سب گروہوں میں جہاں جہاں خداوند تیرا خدا تجھ کو بھگائے انہیں یاد کرے گا اور تو خداوند اپنے خدا کی طرف پھرے گا۔ اور ان حکموں کے موافق جو آج میں نے تجھے کہے تُو اپنے بال بچوں سمیت اپنے سارے دل اور اپنے سارے جی سے اس کی آواز کو سن لے گا۔ تب خداوند تیرا خدا تیری اسیری کو بدلے گا۔ اور تجھ پر رحم کرے گا۔

اور پھر کے تجھ کو ان سب گروہوں میں سے جن میں خداوند تیرے خدا نے تجھے تتّر بتّر کیا تھا تجھے جمع کرے گا۔ اگر تجھ میں سے کوئی آسمان کی اس انتہا تک بھگایا گیا ہوگا تو خداوند تیرا خدا وہاں سے تجھے جمع کرے گا اور وہاں سے تجھے پھیر لائے گا۔ اور خداوند تیرا خدا تجھ کو اس زمین جس پر تیرے باپ دادے قابض ہوئے لائے گا اور تُو اس کا مالک ہوگا۔ اور وہ تجھ سے نیکی کرے گا اور تیرے باپ دادوں سے زیادہ تجھے بڑھائے گا'' استثنا باب ۳۰ آیت ۱ تا ۵۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے پہلی تباہی کے بعد بنی اسرائیل کی دوبارہ بحالی کی خبر دی تھی اور اسی کی طرف ان آیات میں اشارہ ہے اور اس بحالی کا حال یہ ہے کہ ۵۴۴ قبل مسیح میدا اور فارس کے بادشاہ نے جس نے بابل فتح کر لیا تھا۔ اس صلہ میں کہ یہود نے اس کی مدد کی تھی ان کو واپس یروشلم جانے کی اجازت دے دی۔ یہود کے ایک نبی نحمیاہ کو دوبارہ آباد کرنے کے لئے بھیجا گیا تا وہ یروشلم اور دوسرے یہودی مقامات کو دوبارہ آباد کریں اس بادشاہ کا نام خورس تھا اور انگریزی میں اسے سائرس لکھتے ہیں۔ اس نے نہ صرف یہود کو ان کے وطن میں واپس جانے کی اجازت دی بلکہ وہ سامان جو وہاں سے نبوکدنضر لے گیا تھا وہ بھی ان کو واپس دے دیا۔ (عزرا باب ۱ آیت ۲، ۳، ۷، ۸) (یہ عزرا وہی عزیر ہیں جن کا قرآن کریم میں ذکر آتا ہے کہ یہود انہیں خدا کا بیٹا کہتے تھے)

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۣ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ

(اب) اگر تم نیوکار بنو گے تو نیکوکار بن کر اپنی جانوں کو ہی فائدہ پہنچاؤ گے اور اگر تم برا کرو گے

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَ لِيَدْخُلُوا

تو (بھی) ان (ہی) کے لئے (برا کرو گے) پھر جب دوسری بار والا وعدہ (پورا ہونے کا وقت) آ گیا۔ تا کہ وہ (یعنے

الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ لِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا

تمہارے دشمن) تمہارے معزز لوگوں سے ناپسندیدہ معاملہ کریں اور (اسی طرح) مسجد میں داخل ہوں۔ جس طرح

تَتْبِيْرًا ۸

وہ اس میں پہلی بار داخل ہوئے تھے۔ اور جس چیز پر غلبہ پائیں اسے بالکل تباہ (وبرباد) کر دیں۔

حلّ لُغات۔ لِيَسُوْٓءٗا لِیَسُوْءُ سَاءَ سے مضارع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور سَاءَہٗ (یَسُوْءُہٗ سَوْءًا)

کے معنے ہیں ۔فَعَلَ بِهٖ مَا يَكْرَهُهٗ اَوْ اَحْزَنَهٗ۔اس سے ایسا معاملہ کیا جس کو وہ ناپسند کرتا تھا یا اس کو غمگین کیا (اقرب)

وُجُوْہٌ وُجُوْہٌ وَجْہٌ کی جمع ہے۔اور اَلْوَجْہُ کے معنے ہیں نَفْسُ الشَّیْءِ۔کسی چیز کی ذات۔سَيِّدُ الْقَوْمِ۔ قوم کا سردار۔اَلْجَاهُ۔عزت۔(اقرب)

وَلِيُتَبِّرُوْا وَلِيُتَبِّرُوْا تَبَّرَ سے مضارع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور تَبَّرَهٗ کے معنے ہیں ۔اَهْلَكَهٗ وَدَمَّرَهٗ۔ اس کو ہلاک وتباہ کر دیا۔تَبَّرَ كُلَّ شَيْءٍ۔ كَسَّرَهٗ وَفَتَّتَهٗ۔کسی چیز کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

اَلتَّبَارُ اَلْهَلَاكُ۔ہلاکت (اقرب) وَلِيُتَبِّرُوْا کے معنے ہوں گے ۔کہ وہ ہلاک کر دیں۔

تفسیر ۔یہود کا دوسرا فساد اور اس کی سزا اس آیت میں یہود کے دوسرے فساد کی خبر دی گئی ہے اور پھر اس کی سزا کا ذکر کیا گیا ہے ۔فساد ان کا حضرت عیسیٰؑ کو دکھ دینا تھا۔اور سزا ان کا رومیوں کے ہاتھوں سے تباہ ہونا تھا۔یہ واقعہ صلیب کے واقعہ کے ستر سال بعد کا ہے ۔گویا حضرت عیسیٰ کی زندگی میں ہی یہ واقعہ ہوا۔کیونکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عمر ۱۲۰ سال تھی ۔اور تینتیس سال کی عمر میں وہ صلیب پر لٹکائے گئے تھے (قاموس الکتاب زیر لفظ عہد نامہ کا تواریخی خاکہ)۔

اس عذاب کی تفصیل یہ ہے کہ وسپیین نامی ایک رومی جرنیل تھا اسے بادشاہ روم نے یہود کی سرکشیوں کی وجہ سے ان کی سرکوبی کا حکم دیا تھا۔جب یہ اس حکم کے بجالانے میں مشغول تھا۔اسے ایک کشف نظر آیا جس کی تعبیر اس نے یہ کی کہ مجھے روم واپس جانا چاہیے ۔کیونکہ وہاں سے فسادات کی خبریں آرہی تھیں ۔اس کے واپس لوٹنے پر وہاں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ اسے بادشاہ بنا دیا گیا۔اور اس نے اپنے بیٹے ٹائٹس کو فلسطینی مہم کا افسر مقرر کر دیا۔جس نے یروشلم کو ۷۰ء بعد مسیح فتح کر کے اس کے گرائے جانے کا حکم دیا۔اور شہر کی دیواروں اور مسجد کو گرا دیا گیا اور یہودی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔گو ۱۳۵ء میں یہود نے پھر ایک ناکام بغاوت کی مگر وہ صرف چراغ سحری کے آخری شعلہ کی سی حیثیت رکھتی تھی۔(انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Jew اور ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ)

بائبل میں یہود کی دوسری تباہی کا ذکر اس واقعہ کی نسبت بائبل میں ان الفاظ میں حضرت موسیٰؑ کی پیشگوئی درج ہے ۔’’انہوں نے اجنبی معبودوں کے سبب اسے غیرت دلائی اور وہ اسے نفرتی کاموں سے غصے میں لائے ۔ انہوں نے شیطانوں کے لئے قربانیاں گذرانیں نہ خدا کے لئے ۔ بلکہ ایسے معبودوں کے لئے جن کو آگے وے نہ پہچانتے تھے ۔جو نئے تھے اور حال میں معلوم ہوئے اور ان سے تیرے باپ دادے نہ ڈرتے تھے ۔تو اس چٹان

سے جس نے تجھے پیدا کیا غافل ہوا۔ اور اس خدا کو جس نے تجھی صورت بخشی بھول گیا۔ اور جب خداوند نے یہ دیکھا تو ان سے نفرت کی اس لئے کہ اس کے بیٹوں اور اس کی بیٹیوں نے اسے غصہ دلایا۔ اور اس نے یہ فرمایا کہ میں ان سے اپنا منہ چھپاؤں گا۔ تا کہ میں دیکھوں کہ انجام کیا ہوگا اس لئے کہ وہ کج نسل ہیں۔ ایسے لڑکے جن میں امانت نہیں انہوں نے اس کے سبب سے جو خدا نے مجھے غیرت دلائی اور اپنی واہیات باتوں سے مجھے غصہ دلایا۔ سو میں بھی انہیں اس سے جو گروہ نہیں غیرت میں ڈالوں گا اور ایک بے عقل قوم سے انہیں خفا کروں گا کیونکہ میرے غصے سے ایک آگ بھڑکی ہے جو اسفل جہنم تک جلے گی اور زمین کو اس کے پیداوار سمیت کھا جائے گی اور پہاڑوں کی بنیادوں کو جلا دے گی۔ میں ان کی بلاؤں کو ان کے اوپر بڑھاؤں گا اور ان پر اپنے تیروں کو خرچ کروں گا۔ وہ بھوک سے جل جائیں گے۔ اور سوزندہ گرمی اور کڑوی ہلاکت کے لقمے ہوں گے۔ میں ان پر درندوں کے دانتوں اور زمین کے زہر دار سانپوں کو چھوڑوں گا۔ باہر سے تلوار اور اندر کے مکانوں سے خوف جوان کو اور کنواری کو بھی۔ شیر خوار کو اور سر سفید کو بھی ہلاک کریں گے"۔ استثناء باب ۳۲ آیت ۱۶ تا ۲۵۔ یہ پیشگوئی پہلی پیشگوئی کے بعد بلکہ اس پیشگوئی کے بھی بعد کہ پہلے فساد کے بعد اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو واپس یروشلم میں لے آئے گا۔ بیان ہوئی ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس سے پہلے عذاب کے بعد ایک دوسرے عذاب کی خبر دی گئی ہے۔ اور یہ عذاب وہ دوسرا عذاب ہے جس کا ذکر قرآن کریم نے لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ کے الفاظ میں کیا ہے۔

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَ

(اب بھی) کچھ بعید نہیں کہ تمہارا رب تم پر رحم کر دے اور اگر تم (پھر اپنے اسی رویہ کی طرف) لوٹے تو ہم بھی (اپنی

جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝۹

اسی سنت کی طرف) لوٹیں گے اور (یاد رکھو کہ) جہنم کو ہم نے کافروں کے لئے قید خانہ بنایا ہے۔

حل لغات ۔ اَلْحَصِيْرُ اَلسِّجْنُ ۔ قید خانہ۔ (اقرب)

تفسیر ۔ بنی اسرائیل کے لئے کامل تباہی کے بعد ترقی کی امید قرآن کریم کے ذریعہ

بنی اسرائیل کی کامل تباہی کی خبر دینے کے بعد اب قرآن کریم انہیں امید کا پہلو دکھاتا ہے اور فرماتا ہے کہ بائبل

کا جہاں تک تعلق ہے تم ہمیشہ کے لئے ہلاک کر دئے گئے ہو مگر موسوی مذہب سے باہر ہو کر تمہاری ترقی کی راہ ابھی کھلی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ سے دوبارہ ترقی کرنے کا تمہاری قوم کو موقعہ دیا ہے اس موقعہ سے فائدہ اٹھاؤ اور اللہ تعالیٰ کے فضلوں کے وارث ہو جاؤ۔ لیکن اگر تم نے اس موقعہ سے بھی فائدہ نہ اٹھایا تو اللہ تعالیٰ کی سزائیں دوبارہ تم کو آگھیریں گی اور تم بالکل تباہ ہو جاؤ گے۔

دیکھو ان آیات میں یہودی قوم کو سمجھانے کے لئے کیسا احسن طریق اختیار کیا ہے خود ان کی کتب سے ان کی تباہی کی خبر دی ہے اور بتایا ہے کہ خود یہودی کتب کے مطابق اب کوئی مستقبل یہودیت کے لئے باقی نہیں۔ پس جب خود ان کی کتب ان کی ہلاکت کا فتویٰ دے چکی ہیں تو ان کو اس متروک راستہ کو چھوڑنے میں جسے خدا تعالیٰ چھڑوا چکا ہے عذر نہیں ہونا چاہیے اور اسلام کو قبول کر کے دینی و دنیوی انعامات حاصل کرنے چاہئیں۔ اس نئے راستہ کے متعلق بھی بائبل میں خبر موجود ہے۔

آنحضرتؐ کے متعلق پیشگوئی بائیبل میں استثناء باب ۳۳ آیت ۱ تا ۳ میں فرماتا ہے ”اور یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مردِ خدا نے اپنے مرنے سے آگے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لئے تھی۔ ہاں وہ اس قوم سے بڑی محبت رکھتا ہے۔ اس کے سارے مقدس تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں کے نزدیک نزدیک بیٹھے ہیں اور تیری باتوں کو مانیں گے“۔ یعنی اللہ تعالیٰ فاران سے جلوہ گر ہونے والے نبی کے ذریعہ سے پھر یہود کی برکت کا سامان پیدا کرے گا۔ اگر وہ چاہیں تو ہدایت پا کر ترقی کر سکتے ہیں۔ یہ پیشگوئی تباہی کی خبر کے معاً بعد دوسرے باب میں بیان ہوئی ہے۔

مسلمانوں پر دو دفعہ تباہی آنے کی پیشگوئی یاد رکھنا چاہیے کہ آیات مذکورہ بالا جہاں یہ بتا رہی ہیں کہ یہود کا مستقبل خود ان کی کتب کے رُو سے بالکل تاریک ہے وہاں مسلمانوں کو بھی توجہ دلائی ہے کہ مسلمانوں پر بھی اسی طرح دوبارہ ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے عذاب آئے گا۔

مسلمانوں پر پہلی تباہی یعنی بنوعباس پر خطرناک تباہی کے دن چنانچہ پہلا عذاب خلافت عباسیہ کے خاتمہ پر آیا۔ اس کا موجب بھی وہی تھا جو بائبل نے یہود کی تباہی کا موجب بتایا ہے۔ یعنے فرغانہ کی فتح کے بعد مسلمانوں نے کثرت سے وہاں کی خوبصورت لڑکیوں سے شادیاں کر لیں۔ یہ علاقہ بہت مشرک تھا۔ ان عورتوں کے اثر سے مسلمانوں میں بھی مشرکانہ عقائد پیدا ہونے لگے۔ اور اسلامی غیرت کمزور ہونے لگ گئی۔ آخر ایک وحشی

قوم نے بغداد پر حملہ کر دیا جو اپنی وحشت اور اجنبیت کے لحاظ سے اسلامی ممالک اور ان کی تہذیب سے ویسی ہی بیگانہ تھی جیسی کہ بابل کی قوم جس نے فلسطین پر حملہ کیا تھا اٹھارہ لاکھ مسلمان صرف بغداد اور اس کے گرد و نواح میں قتل کیا گیا (الخلافة العباسية لعبد الفتاح السر نجاوی صفحہ ۲۹۶، ۲۹۷)۔ شاہی خاندان کے تمام لوگوں کو ان کی فہرستیں بنوا بنوا کر اور تلاش کر کر کے قتل کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ صرف ایک شخص بھاگ کر بچ سکا اور اسی کی نسل سے بہاولپور کے والیانِ ریاست ہیں ان کے علاوہ کوئی بھی خاندان ایسا نہیں جو اپنے آپ کو عباس کی طرف منسوب کرے (اس نوٹ لکھنے کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے کہ یوپی میں عباسی خاندان کی بعض شاخیں موجود ہیں ان میں سے ایک نے مجھے اپنا شجرہ نسب بھی بھجوایا ہے)۔

مسلمانوں پر دوسری تباہی دوسری تباہی آخری زمانہ کے وقت مقدر تھی جس کے آثار اب نمودار ہو رہے ہیں۔ عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا۔ العیاذ باللہ

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ وَ یُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ

یہ قرآن یقیناً اس (راہ کی) طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ درست ہے اور مومنوں کو جو مناسب حال کام

الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِیْرًا ۙ﴿۱۰﴾

کرتے ہیں بشارت دیتا ہے کہ ان کے لئے (بہت) بڑا اجر (مقدر) ہے۔

تفسیر۔ مسلمانوں کے لئے ڈرنے کا مقام یہ قرآن کریم یقیناً اس مقصد کی طرف ہدایت کرتا ہے جو پہلے لوگوں کے مقاصد سے بہت اعلیٰ ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کے نتائج بھی ان کتابوں سے اعلیٰ ہی نکلیں اور وہ انعام جو اس کے نتیجہ میں ملیں گے وہ روحانی بھی ہوں گے اور جسمانی بھی۔ پس اس پر عمل کرو۔ اور انعام حاصل کرو۔ اسی طرح اس میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ تم کو پہلے لوگوں سے بڑھ کر اور بہتر انعام ملنے والا ہے۔ پس تم کو ان لوگوں سے زیادہ ہوشیار رہنا چاہیے تا ایسا نہ ہو کہ کسی وقت تمہاری نسلیں انعام پر اترا کر خراب ہو جائیں اور الٰہی عذاب کی مستحق ہو جائیں۔

وَّ اَنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا

اور یہ کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے لئے ہم نے دردناک عذاب

اَلِیْمًا ﴿۱۱﴾ ع

تیار کیا ہے۔

ع ۱

تفسیر ۔اس آیت میں اس مضمون کی طرف جو پہلی آیت میں اشارہ بیان ہوا تھا واضح کیا گیا ہے اور فرماتا ہے کہ جو قوم بھی اپنے انجام سے غافل ہو جائے آخر عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

آخرت کے معنی آخرت کے معنے بعد میں آنے والی چیز کے ہوتے ہیں قرآن کریم میں چونکہ یوم آخرت کا بار بار ذکر ہے لوگوں کے ذہن پر یہ امر مسلط ہو گیا ہے کہ آخرت کے معنے صرف یوم آخرۃ کے ہیں۔ حالانکہ یہ درست نہیں۔ آخرت کے اصل معنے بعد میں آنے والی شئے کے ہیں۔ پس جس موقعہ پر اس لفظ کا استعمال ہو اسی کے مطابق اس کے معنے کئے جانے چاہئیں۔ اس جگہ موقعہ کے لحاظ سے قوموں کے انجام کے معنے نہایت مناسب ہیں اور معنے یہ ہیں کہ جو قومیں اس امر کو بھلا دیتی ہیں کہ ہر کمالے را زوالے۔ اور اپنے انجام کی اصلاح سے غافل ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی ذمہ واریوں کی ادائیگی میں بھی سست ہو جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کی مستحق ہو جاتی ہیں پس ہر قوم کو اپنے انجام کو زیر نظر رکھنا چاہیے اور ہر خرابی کے موقعہ پر اپنی قوم کی اصلاح کر لینی چاہیے تا کہ اسے نئی زندگی ملتی رہے اور خدا تعالیٰ کے عذاب سے وہ بچ جائے۔

اس آیت سے پہلے جو واؤ عاطفہ ہے وہ انہی معنوں پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم مسلمانوں کو ہے اور مسلمان یومِ آخر پر ایمان رکھتے تھے اس کے منکر نہ تھے۔

وَ يَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ؕ وَ كَانَ

اور جس طرح انسان ۱؎ بھلائی کو اپنی طرف بلاتا ہے اسی طرح وہ برائی کو بھی اپنی طرف بلاتا ہے اور انسان بڑا

الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۲﴾

جلد باز (واقع ہوا) ہے۔

۱؎ قرآنی الفاظ میں انسان کا لفظ برائی کو پکارنے کے ساتھ استعمال ہوا ہے اور وہ کی ضمیر بھلائی کو پکارنے کے فقرہ میں استعمال ہوئی ہے لیکن اردو میں چونکہ بھلائی کا ذکر پہلے ہے اور برائی کا بعد میں کرنا پڑا۔ اس لئے انسان کا لفظ مجبوراً بھلائی کے ساتھ اور وہ کی ضمیر برائی کے ساتھ لگانی پڑی۔

حلّ لُغات ۔ يَدْعُ الانسانُ يَدْعُوْ دَعَا سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور دَعَاهُ (يَدْعُوْ دُعَاءً وَدَعْوًا) کے معنے ہیں ۔ رَغِبَ اِلَيْهِ ۔ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ دَعَا زَيْدًا: اِسْتَعَانَهٗ ۔ زید سے مدد طلب کی ۔ دَعَا فُلَانًا: نَادَاهُ وَصَاحَ بِهٖ ۔ اس کو پکارا۔ دَعَاهُ اِلَى الْاَمْرِ: سَاقَهٗ اِلَيْهِ۔ کسی کام کی طرف اسے لے گیا۔ دَعَا فُلَانًا (دَعْوَةً وَمَدْعَاةً) طَلَبَهٗ لِيَاْكُلَ عِنْدَهٗ ۔ اسے کھانے کی دعوت دی (اقرب) دَعَا بِهٖ: اِسْتَحْضَرَهٗ اسے آنے کی دعوت دی (المنجد) كُلُّ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ اِذَا احْتَاجَ اِلٰى شَيْءٍ فَقَدْ دَعَا بِهٖ لِمَنْ اَخْلَقَتْ ثِيَابُهٗ قَدْ دَعَتْ ثِيَابُكَ اَيْ اِحْتَجْتَ اِلٰى اَنْ تَلْبَسَ غَيْرَهَا ۔ جب کسی طرح کسی چیز کی احتیاج دوسری چیز کی طرف معلوم ہو تو اس احتیاج کو ظاہر کرنے کے لئے بھی دعا کا فعل باء کے صلہ کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ کسی پرانے کپڑوں والے کو جب دَعَتْ ثِيَابُكَ کہیں تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اس کے کپڑے اس بات کی ضرورت کو ظاہر کرتے ہیں کہ ان کو اتار کر ان کی جگہ اور کپڑے تبدیل کئے جائیں دَعَا بِالْكِتَابِ کے معنے ہیں ۔ اِسْتَحْضَرَهٗ ۔ کہ کسی کتاب کو حاصل کرنے کی خواہش کی ۔ (تاج)

اَلْخَيْرُ اَلْخَيْرُ کے معنوں کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۱۲ نحل آیت نمبر ۳۱۔

اَلْعَجُوْلُ اَلْعَجُوْلُ عَجَلَ سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور اَلْعَجُوْلُ کے معنی ہیں ۔ اَلْمُسْرِعُ ۔ جلدی کرنے والا۔ اَلْكَثِيْرُ الْعُجْلَةِ ۔ جلد باز ۔ (اقرب)

تفسیر ۔ یہ آیت ان معنوں کی تصدیق کرتی ہے جو میں نے اوپر کی آیت کے کئے ہیں ۔ کیونکہ اس میں

اسی مضمون کی تشریح کی گئی ہے قیامت کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بلکہ اگلی آیتوں میں بھی وہی مضمون بیان ہوا ہے۔

یَدْعُ الْاِنْسَانُ کا مطلب اور دَعَاہُ کے مختلف معنی اس سے پہلے کہ میں اس آیت کا مفہوم بتاؤں۔ میں اس آیت کا ترجمہ سمجھا دیتا ہوں۔ دَعَاہُ کے معنے اسے پکارنے اس کی طرف توجہ کرنے اور اس سے مدد مانگنے کے ہوتے ہیں لیکن دَعَابِہٖ کے معنے اسے اپنے پاس آنے کی دعوت دینے کے ہوتے ہیں۔ پس اس آیت کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ جبکہ انسان ظاہری طور پر خیر کو بلا رہا ہوتا ہے وہ حقیقت میں شر کو بلا رہا ہوتا ہے یا یہ نکلتا ہے کہ خیر کو بلانے کا جو حق ہے اس کی مانند وہ شر کو بلاتا ہے۔

قوموں کو ترقی دینے سے اللہ تعالیٰ کی غرض ان دونوں معنوں کے رو سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب قوموں کو ترقی ملتی ہے وہ اس امر کو بھول جاتی ہیں کہ یہ ترقی انہیں اس لئے ملی ہے کہ تا وہ دین و دیانت کو قائم کریں اور بنی نوع انسان کے لئے امن اور ترقی کے سامان پیدا کر کے خدا کے فضلوں کو حاصل کریں۔ اور وہ دنیاوی نعمتوں کو جمع کرنے میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ اور لوگوں کے حقوق کو نظر انداز کر دیتی ہیں۔ اور دنیوی عیش و آرام کے سامان جمع کر کے یہ سمجھتی ہیں کہ وہ اپنے لئے اور اپنی اولادوں کے لئے خیر کے سامان جمع کر رہی ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں وہ اس ذمہ واری کو بھول کر جو ان کے کندھوں پر رکھی جاتی ہے اپنی تباہی کے سامان پیدا کر رہی ہوتی ہیں اور آخر تباہ ہو جاتی ہیں۔

قوم کی ترقی کا وقت ہی زیادہ نازک ہوتا ہے پس کسی قوم کو ترقی ملنے کا وقت اس کے لئے بہت نازک ہوتا ہے کیونکہ اس کے بعد اصل خیر اس کی نظر سے پوشیدہ ہو جاتی ہے اور شرّ کو خیر سمجھ کر وہ اپنے راستہ سے بھٹک جاتی ہے۔ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ مومن کو جو خیر ملتی ہے وہ تو مرنے کے بعد ملتی ہے۔ اس دنیا کی فتوحات اس خیر کے حصہ کے لئے مواقع بہم پہنچانے کے لئے دی جاتی ہیں لیکن بعض لوگ جلدی کرتے ہیں اور اس دنیا کی ترقی کو اصل خیر سمجھ کر اس کے سمیٹنے میں لگ جاتے ہیں۔ اور خود اپنے اعمال سے اپنی تباہی کے سامان جمع کر لیتے ہیں۔

غرض اس آیت میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر کسی قوم کو ترقی ملے مثلاً حکومت ملے۔ جاہ و ثروت ملے تو اسے ایسے کام کرنے چاہئیں کہ وہ نعمت قائم رہے۔ اور اس کے ذریعہ سے اُخروی خیر کا ذخیرہ جمع ہوتا رہے۔ نہ کہ ایسے کام جس سے وہ جلدی زائل ہو جائے اور اُخروی انعامات کے حصول کے مواقع ہاتھ سے نکل جائیں۔ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ کے ایک معنی تو اوپر بتائے گئے ہیں۔ دوسرے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ انسان شرّ کو اسی طرح بلاتا ہے جس

طرح وہ خیر کو بلا رہا ہوتا ہے۔یعنی انسان بھی عجیب ہے کہ منہ سے تو خیر مانگ رہا ہوتا ہے۔یعنی خواہش تو یہی رکھتا ہے کہ اسے ہر قسم کی خیر مل جائے۔مگر عمل کے لحاظ سے وہ شرّ کو بلا رہا ہوتا ہے۔گویا اپنی نادانی سے ایک ہی وقت میں دو متضاد باتیں طلب کرتا ہے منہ سے خیر اور عمل سے شر۔

ان معنوں کے رو سے اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اصل کامیابی تب ہوتی ہے جب انسان کا دل اور اس کا عمل متفق ہوں۔یعنی اگر دل سے خیر مانگتا ہے تو اعمال سے بھی خیر ہی مانگے۔

(۳) تیسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ۂ کی ضمیر کو انسان کی طرف پھیرا جائے۔اور اسے مفعول کی ضمیر قرار دیا جائے۔اور دعا کا فاعل خدا تعالیٰ کو قرار دیا جائے۔اس صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ انسان شر کو اسی جوش سے بلاتا ہے جس جوش سے اللہ تعالیٰ اس کو یعنی بندہ کو خیر کی طرف بلا رہا ہوتا ہے۔یعنی ہم تو کہتے ہیں کہ اے انسان تُو بھلائی کی طرف آ۔مگر وہ کہتا ہے اے بلا تُو میری طرف آ۔

ان معنوں کے رو سے اس آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم تو انسانوں کے لئے خیر کے سامان مہیا کر رہے ہیں۔مگر ان میں سے بعض اپنے اعمال سے شر کو بلانے میں لگے ہوئے ہیں اور اپنی تباہی کا سامان پیدا کر رہے ہیں۔

عَجُوْلًا کے لفظ میں اس حقیقت کو ظاہر کیا کہ انسان غور و فکر سے کام نہیں لیتا۔اگر وہ غور اور فکر سے کام لے تو ضرور اسے معلوم ہو جائے کہ میں غلطی کر رہا ہوں۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غصے والا انسان اگر ذرا ٹھہر جائے تو اس کا غصہ ضرور کم ہو جائے۔اور اسے سوچنے کا موقعہ ملے۔(مسند احمد مسند ابو ذر غفاری)

تمام بدیوں کی وجہ جلد بازی ہوتی ہے تمام بدیوں کی وجہ جلد بازی ہی ہوتی ہے۔اگر ایک انسان بدی کے وقت ذرا تانّی سے کام لے اور پہلے سوچ لے کہ یہ کام میرے لئے مفید ہے یا مضر۔تو یقیناً وہ اس بدی سے بچ جائے۔

وَ جَعَلْنَا الَّيْلَ وَ النَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَاۤ اٰيَةَ الَّيْلِ وَ جَعَلْنَاۤ

اور ہم نے رات اور دن (کے) دو نشان بنائے ہیں اس طرح پر کہ رات والے نشان کے اثر کو تو ہم نے مٹا دیا اور

اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لِتَعْلَمُوْا

دن والے نشان کو ہم نے بینائی بخشنے والا بنا دیا۔تا کہ تم (آسانی سے) سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کر سکو اور ہم

عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ۝۱۳

نے ہرایک چیز کوخوب کھول کر بیان کردیا ہے۔

حلّ لُغات۔ مُبْصِرَۃً مُبْصِرَۃٌ اَبْصَرَ سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے اور اَبْصَرَہٗ (متعدی) کے معنے ہیں جَعَلَہٗ بَصِیْرًا۔ اس کو دیکھنے والا بنادیا (یعنے دکھایا) اَبْصَرہٗ: رَاٰہُ۔ اس کو دیکھا۔ اَخْبَرَہٗ بِمَا وَقَعَتْ عَیْنُہٗ عَلَیْہِ۔ اس کو وہ بات بتائی جس پر اس کی نظر پڑی تھی۔ اَبْصَرَ الطَّرِیْقُ (لازم) اِسْتَبَانَ وَوَضَحَ۔ راستہ واضح ہوگیا۔ (اقرب) پس مُبْصِرَۃً کے معنے ہوئے بینائی بخشنے والی۔

مَحَوْنَا مَحَوْنَا مَحٰی سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور مَحَا الشَّیْءَ (یَمْحُوْ) کے معنے ہیں۔ اَزَالَہٗ وَاَذْھَبَ اَثَرَہٗ۔ کسی چیز کو مٹادیا اور اس کے اثر کو دور کردیا (اقرب) وَالْمَحْوُ: اَلسَّوَادُ فِی الْقَمَرِ۔ اور محو چاند کے بےنور حصہ کو بھی کہتے ہیں (تاج) پس مَحَوْنَا اٰیَۃَ الَّیْلِ کے معنے ہوں گے کہ رات والے نشان کو ہم نے مٹادیا (۲) بےنور کردیا۔

فَضْلًا اَلْفَضْلُ (فَضَلَ الشَّیْءُ یَفْضُلُ) کا مصدر ہے۔ اور اس کے معنے ہیں۔ ضِدُّ النَّقْصِ۔ خوبی۔ فضیلت۔ اَلْبَقِیَّۃُ۔ بقیہ (حاصل تفریق کو بھی انہی معنوں میں فضل کہتے ہیں) اَلزِّیَادَۃُ۔ زیادتی۔ اَلْاِحْسَانُ۔ احسان۔ وَالْفَضْلُ فِی الْخَیْرِ وَیُسْتَعْمَلُ لِمُطْلَقِ النَّفْعِ۔ نفع۔ (اقرب)

العدد اَلْعَدَدُ اِسْمٌ مِنْ عَدَّ بِمَعْنَی الْاِحْصَاءِ یہ عدّ کا اسم ہے۔ اور اس کے معنے ہیں۔ شمار۔ گنتی۔ اَلْمَعْدُوْدُ۔ شمار کیا ہوا۔ اس کی جمع اعداد آتی ہے۔ (اقرب) پس لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ کے معنے ہوں گے کہ تم سالوں کی گنتی کو معلوم کرسکو۔

تفسیر۔ فَمَحَوْنَآ اٰیَۃَ الَّیْلِ میں فاء تعقیب کی نہیں۔ یعنی یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالیٰ نے پہلے رات اور دن بنائے پھر ان میں سے ایک کو مٹادیا۔ بلکہ یہ فاء تفسیری ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے رات اور دن کو اس صورت میں بنایا ہے کہ رات تو ایک مٹا ہوا نشان ہے۔ اور دن ایک روشن نشان ہے۔ یعنی رات سے مخفی فائدہ پہنچتا ہے اور دن سے ظاہر۔ اور یہ دونوں اپنی اپنی جگہ نفع بخش ہیں۔ چنانچہ دونوں کے ذریعہ تم نفع حاصل کرتے ہو۔ اور تاریخوں کا علم ان کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہو۔ نیز حساب کا فائدہ بھی حاصل کرتے ہو۔ تاریخ کا فائدہ تو ظاہر ہی ہے۔ حساب کا علم اس طرح کہ لمبی تاریخ کو یاد رکھنے سے ہی حساب پیدا ہوتا ہے۔ نیز اس طرح کہ سال کا وقت تجویز کرنے کا تعلق چاند اور سورج سے ہے اور صحیح جنتری سورج کی رفتار کے علم کے بغیر نہیں بن سکتی۔

سورج اور چاند کی گردش کا تعلق حساب سے اسی طرح سورج اور چاند کی گردش کا تعلق بھی حساب سے ہے۔اس پر غور کرتے ہوئے انسان کو باریک در باریک حساب سے واسطہ پڑتا ہے۔ چنانچہ آج تک شمسی حساب کو انسان مکمل نہیں کرسکا۔اور شمسی سال کی تعیین میں غلطیاں کرتا چلا آیا ہے جسے علم حساب کی ترقی کے ساتھ ساتھ دور کیا جارہا ہے۔

رات کی تاریکی اور دن کی روشنی انسان کی جسمانی ترقی کا ذریعہ ہیں اس آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ نشان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ایک ترقی کا نشان ہوتا ہے۔اور ایک مٹنے کا نشان ہے۔پس تم ایسے نشان طلب کرو جن کے ذریعہ سے ترقی ہو۔ایسا نشان نہ مانگو جس سے تم مٹ جاؤ۔اور ترقی اور تنزل دونوں حالتوں کو روحانی کمالات کے حصول کا ذریعہ بناؤ۔جس طرح رات جو تاریکی کا نشان ہے۔اور دن جو روشنی کا نشان ہے۔دونوں کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری جسمانی ترقی کا ذریعہ بنا دیا ہے نہ تکلیف کے وقتوں میں خدا کو بھولو نہ کامیابی کے وقتوں میں اس کو چھوڑو۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ

اور (ہم نے ذمہ وار بنایا ہے) ہر انسان کو (اس طرح کہ) ہم نے اس کی گردن میں اس کے عمل کو باندھ دیا ہے

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۴﴾

اور ہم قیامت کے دن اس (کے اعمال) کی ایک کتاب نکال کر اس کے سامنے رکھ دیں گے جسے وہ (بالکل) کھلی ہوئی پائے گا۔

حلّ لُغَات۔ اَلْزَمْنٰهُ اَلْزَمَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے۔اور اَلْزَمَ الشَّیْءَ کے معنے ہیں۔ اَثْبَتَهٗ وَاَدَامَهٗ۔کسی چیز کو ہمیشہ رکھا۔اَلْزَمَ فُلَانًا الْمَالَ والعَمَلَ اَوْجَبَه عَلَیْه۔اس پر کسی کام کو کرنا یا کسی مال کو ادا کرنا واجب کر دیا۔(اقرب)

طَائِرٌ اَلطَّائِرُ کُلُّ ذِیْ جَنَاحٍ مِنَ الْحَیَوَانِ۔پرندہ۔نیز اس کے معنے ہیں۔اَلْحَظُّ۔نصیب۔رِزْقُ الْاِنْسَانِ۔انسان کی روزی۔عَمَلُهُ الَّذِیْ قُلِّدَهٗ وَطَارَ عَنْهُ مِنْ خَیْرٍ اَوْشَرٍّ۔انسانی اعمال خواہ اچھے ہوں یا برے۔کہتے ہیں هُوَ مَیْمُوْنُ الطَّائِرِ: اَیْ مُبَارَكُ الطَّلْعَةِ۔وہ مبارک چہرے والا ہے۔نیز مسافر کو رخصت

کرتے وقت دعا کے طور پر کہتے ہیں۔ سِرْ عَلَی الطَّائِرِ الْمَیْمُوْنِ۔ کہ مبارک شگون پر چل۔ اور جب ھُوَ سَاکِنُ الطَّائِرِ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں۔ حَلِیْمٌ ھَادِیٌ کہ وہ بردبار متحمل اور سنجیدہ ہے (اقرب) پس اَلْزَمْنٰہُ طٰٓئِرَہٗ فِیْ عُنُقِہٖ کے معنے ہوں گے کہ ہم نے اس کے عمل کو اس کی گردن میں باندھ دیا ہے۔

مَنْشُوْر مَنْشُوْرٌ نَشَرَ سے اسم مفعول ہے اور نَشَرَ الْکِتَابَ کے معنے ہیں۔ بَسَطَہٗ۔ اس کو کھولا (اقرب) پس مَنْشُوْرٌ کے معنے ہوں گے کھولا ہوا۔

تفسیر ۔ اس آیت میں فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کا عمل اس کی گردن میں باندھ دیا ہے۔ یا گردن کے ساتھ چسپاں کر دیا ہے اور قیامت کے دن اسے اس کے سامنے ایک کتاب کی صورت میں نکالیں گے جسے وہ کھلی ہوئی پائے گا یعنی اس کے مطابق اس سے سلوک ہوگا۔ کیونکہ کھاتہ کا رجسٹر یا حساب لکھنے کے لئے کھولا جاتا ہے یا حساب چکانے کے لئے۔

انسان کا کوئی فعل ضائع نہیں ہوتا اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہر انسان کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا کوئی فعل ضائع نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہم نے اس کے ساتھ اس کا عمل گردن میں چسپاں کر دیا ہے۔ گردن میں چسپاں کرنے کے الفاظ یہ بتانے کے لئے استعمال کئے ہیں۔ کہ اس کے ساتھ اس کا تعلق دائمی ہے۔ جب تک وہ رہے گا اس کے اعمال کا اثر بھی رہے گا۔

عمل کے لئے جو طائر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جیسے طائر اڑ جاتا ہے اور نظر نہیں آتا۔ ویسے ہی انسان اپنے عمل کو بھول جاتا ہے بلکہ دوسرے لوگ بھی بھول جاتے ہیں۔ لیکن یہ طائر وہ ہے جو ایک رسی سے انسان کی گردن سے بندھا ہوا ہے۔ اس لئے گو وہ اُڑ جائے اور نظر نہ آئے مگر اس سے تعلق انسان کا نہیں ٹوٹتا۔ ایک نہ ایک دن اس کے نتائج ظاہر ہو کر ہی رہتے ہیں۔

دوسرے یہ بتایا ہے کہ جیسے پرندے کے پاؤں میں لمبی رسی باندھ کر اسے چھوڑ دیا جاتا ہے تو وہ رسی کی حد تک اڑ کر چلا جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی اعمال کا حال ہے کہ بعض دفعہ وہ معمولی نظر آتے ہیں لیکن ان کا اثر دور تک جاتا ہے۔

انسانی اعمال کی بندھے ہوئے پرندے سے مشابہت اس آیت میں انسان کو بتایا ہے کہ انسان کو اپنے اعمال میں بہت ہوشیار اور محتاط رہنا چاہیے۔ کیونکہ جب کیا ہوا عمل اسکے اختیار میں نہیں رہتا۔ اور اس کا اثر بھی بہت وسیع ہے۔ نظروں سے بھی غائب ہے اور ساتھ بھی لگا ہوا ہے۔ تو ان سب باتوں سے معلوم ہوا۔ کہ اس کا مٹانا بہت

مشکل امر ہے۔ پس بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کے عمل کا نتیجہ خواہ جلدی نکلے خواہ دیر سے۔ مگر نکلے گا ضرور۔ کیونکہ گو بعض دفعہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ پرندہ کی طرح اُڑ گیا ہے مگر چونکہ یہ پرندہ گردن سے بندھا ہوا ہے آخر ایک دن واپس آئے گا۔ اور انسان کو اپنے کئے کا مزہ چکھنا پڑے گا۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں فرمایا کہ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (الزلزال:۸،۹) کہ کوئی شخص اگر سرخ چیونٹی کے برابر بھی نیک یا بد عمل کرے گا یا ہوا کے ذرّہ کے برابر بھی نیک یا بد عمل کرے تو وہ اس کا انجام ضرور دیکھ لے گا۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ توبہ قبول نہ ہوگی توبہ تو ضرور قبول ہوگی۔ مگر گناہ کرنے والا پیچھے ضرور رہ جائے گا مثلاً فرض کرلو کہ دو انسان ہیں جو نیکی میں برابر ہیں ان میں سے ایک نے ایک بدی کی۔ اور پھر توبہ کی۔ اس کے گناہ کو تو اللہ تعالیٰ ضرور معاف کردے گا۔ مگر جب اس نے بدی کی۔ دوسرے شخص نے اس کے مقابل نیکی کی۔ تو یہ توبہ کرنے والا تو اسی پہلے درجہ پر رہا۔ مگر دوسرا اس سے آگے نکل گیا۔ پس اس غلطی کرنے والے شخص کو خدا تعالیٰ معاف تو کردے گا۔ لیکن یہ نہ ہوگا کہ اس کو اس دوسرے شخص کے ساتھ ملا دے جس نے بدی نہیں کی تھی۔ وہ تو بہر حال اس سے ایک درجہ بڑھا ہی رہے گا۔ پس ہر عمل کا ایک اثر ہے جو باقی رہتا ہے۔

وائرلیس سے ایک سبق اب تو اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو سمجھانے کے لئے انسان کو وائرلیس ٹیلیگرافی یا ٹیلیفون کا علم بھی بخش دیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ باریک سے باریک حرکت بھی جوّ میں دور تک مرتعش ہوتی چلی جاتی ہے۔

ہر عمل بیج کی طرح بڑھتا رہتا ہے پس انسان کو اپنے اعمال میں بہت محتاط ہونا چاہیے۔ کیونکہ ہر عمل ایک بیج کی طرح ایک نیا پودا پیدا کرتا ہے۔ جو بغیر اس کے علم کے بڑھتا رہتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ ہر عمل کا اثر انسان کے قلب پر ہوتا ہے۔ اگر نیکی کرے تو اس کے قلب پر نور کا ایک نشان پیدا ہوجاتا ہے۔ اور بدی کرے تو ایک سیاہ نشان پڑ جاتا ہے۔ اسی طرح نیکی کرنے والے شخص کے دل پر نیکیوں کا نور بڑھتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا سارا دل روشن ہوجاتا ہے اور وہ نجات پا جاتا ہے اور بدی کرنے والے کے دل پر سیاہ دھبے بڑھتے جاتے ہیں یہاں تک کہ ایک دن سارا دل سیاہ ہوجاتا ہے اور وہ شخص ہلاک ہوجاتا ہے۔ (ابن ماجه کتاب الزهد باب ذکر الذنوب) بعض لوگوں نے طائر کے معنے قسمت کے کئے ہیں (تفسیر قرطبی زیر آیت هذا) مگر یہ معنے اس کے نہیں ہوسکتے کیونکہ طٰٓئِرَهٗ کہہ کر یہ بتایا گیا ہے کہ اپنے عمل کا پیدا کرنے والا خود انسان ہی ہے خدا تعالیٰ نے جو مقرر کردیا۔ وہ تو پتھر کہلائے گا یا طوق طائرہ نہیں کہلا سکتا۔

یہ معنے بھی اس کے ہو سکتے ہیں کہ ہر انسان کی نیک فالی اور بدفالی تو اس کی گردن میں بندھی ہوئی ہے اور وہ دوسری چیزوں میں جا کر فالیں تلاش کرتا پھرتا ہے۔گردن کا لفظ اس لئے استعمال کیا۔کہ انسان جب نیکی کرے تو سر اونچا کر لیتا ہے۔اور جب بدی کرے تو ذلت کی وجہ سے گردن نیچی کر لیتا ہے۔پس اس لفظ کے استعمال سے اس طرف توجہ دلائی کہ انسان اپنے اعمال کا جائزہ اپنی گردن سے کر لیا کرے(ابن ماجہ کتاب الزھد باب ذکر الذنوب) یعنے دیکھے کہ وہ اپنے ہمرازوں اور ہم جلسیوں میں گردن اونچی کر سکتا ہے یا نہیں۔اگر اس کا دل اور اس کے ہمراز اسے بے عیب قرار دیتے ہوں تو سمجھ لے کہ اس کا قدم نیکی پر ہے۔لیکن اگر اس کا اپنا دل اور اس کے ہمراز اس میں سو سو گند پاتے ہوں تو لوگوں میں فخر کرنے سے اسے کیا نفع ہو سکتا ہے۔

وَ نُخۡرِجُ لَهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ كِتٰبًا۔یہاں کتاب سے مراد جزاء ہے کیونکہ عربی میں كَتَبَ عَلَيۡهِ كَذَا کے معنے قَضٰى عَلَيۡهِ كَذَا کے ہوتے ہیں۔اور يَلۡقٰىهُ مَنۡشُوۡرًا سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ وہاں اس کے اعمال کی جزا ظاہر ہونے لگ جائے گی۔وہ بیج کی طرح نہ رہے گی۔بلکہ درخت کی طرح پھیل جائے گی اور پھل پیدا کرنے لگے گی۔

اِقۡرَاۡ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفۡسِكَ الۡيَوۡمَ عَلَيۡكَ حَسِيۡبًا ؕ‏ ﴿۱۵﴾

(اور اسے کہا جائے گا کہ)اپنی کتاب(آپ ہی)پڑھ۔آج تیرا نفس ہی تیرا حساب لینے کے لئے کافی ہے۔

حلّ لُغَات۔اَلۡحَسِيۡبُ اَلۡحَسِيۡبُ وَالۡمُحَاسِبُ : مَنۡ يُحَاسِبُكَ۔اَلۡحَسِيۡبُ کے معنے ہیں حساب لینے والا۔(مفردات)

تفسیر۔**قیامت میں سب اشیاء اعمال سے متمثل ہوں گی** ’’اپنی کتاب کو پڑھ‘‘ کے الفاظ کا یہ مطلب ہے کہ اب اپنی سزا کو بھگتو۔اور یہی سبق دُہراتے رہو۔ كَفٰى بِنَفۡسِكَ الۡيَوۡمَ عَلَيۡكَ حَسِيۡبًا۔تیرا نفس ہی آج تجھ پر کافی حساب لینے والا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سزا باہر سے نہ آئے گی۔بلکہ انسان کے اندر سے ہی پیدا ہو گی۔دوزخ میں جتنی چیزیں ہوں گی وہ انسان کے اعمال سے ہی متمثل ہوں گی۔اور جنت کی چیزیں بھی اسی طرح نیکیوں سے ہی متمثل ہوں گی۔پس گویا کوئی دوسرا انسان کسی کو سزا یا جزاء نہ دے گا۔بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو جزا دینے والا اور خود ہی سزا دینے والا ہو گا۔

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا

(پس یاد رکھو کہ) جو ہدایت کو قبول کرے گا۔تو اس کا ہدایت پانا اسی کی ذات کے لئے ہے اور جو (اسے ردّ

يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَمَا كُنَّا

کر کے) گمراہ ہوگا۔اس کا گمراہ ہونا اسی کے خلاف پڑے گا۔اور کوئی بوجھ اٹھانے والی جان کسی دوسری (جان)

مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ⑯

کا بوجھ نہیں اٹھائے گی اور ہم (کسی قوم پر) ہرگز عذاب نہیں بھیجتے جب تک (ان کی طرف) کوئی رسول نہ بھیج لیں۔

حلّ لُغات۔اِهْتَدٰى اِهْتَدٰى هَدٰى سے باب افتعال ہے۔اور هَدٰى کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۲۸۔(بنی اسرائیل آیت ۳)

ضَلَّ کے لئے دیکھو یونس ۳۰ (النحل آیت نمبر ۸۸)

تَزِرُ وَزَرَ سے مضارع مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔اور وَزَرَهٗ کے معنے ہیں حَمَلَهٗ۔اس کو اٹھایا۔وَفِي اللِّسَانِ حَمَلَ مَا يُثْقِلُ ظَهْرَهٗ مِنَ الْاَشْيَاءِ الْمُثْقَلَةِ اس نے بھاری بوجھ اٹھایا (اقرب) وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى کے معنے ہوں گے۔کوئی بوجھ اٹھانے والی جان دوسری جان کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔اَلْوِزْرُ کی تشریح کے لئے دیکھو نحل آیت نمبر ۲٦۔

تفسیر۔اس آیت میں پہلی آیت کے مضمون کی وضاحت کی گئی ہے۔اور بتایا گیا ہے کہ انسان کے نیک اعمال اس کے فائدہ کا موجب ہوتے ہیں۔اور بد اس کے نقصان کا۔پس جو کچھ انسان کرتا ہے دوسرے کے لئے نہیں کرتا اپنے لئے کرتا ہے۔قاتل دوسرے کو نہیں اپنے آپ کو قتل کرتا ہے۔ظالم دوسرے پر نہیں اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔چور دوسرے کا نہیں اپنا مال چراتا ہے۔اسی طرح صدقہ کرنے والا دوسرے کو نہیں دیتا اپنے آپ کو دیتا ہے۔دوسرے کو تعلیم دینے والا یا ہدایت دینے والا اسے تعلیم نہیں دیتا یا ہدایت نہیں دیتا بلکہ اپنے آپ کو تعلیم دیتا ہے اور اپنے آپ کو ہدایت دیتا ہے۔

اس کے آگے فرماتا ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔کوئی بوجھ اٹھانے والی جان کسی اور جان کا بوجھ نہیں اٹھا

سکتی۔ عیسائی اس آیت سے بڑے خوش ہوتے ہیں کہ لو کفارہ ثابت ہو گیا۔ کیونکہ ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ کہ گناہ گار گناہ گار کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ مگر جو نیک ہے وہ دوسرے کا بوجھ اٹھا سکتا ہے۔ پس مسیح جو نیک تھا۔ اس نے دوسروں کے بوجھ اٹھا لئے اور دوسرا کوئی نیک نہیں۔ پس اور کوئی بوجھ نہیں اٹھا سکا۔

کفارہ کا ردّ میں اس جگہ اس سوال میں نہیں پڑتا کہ مسیحی عقیدہ کے رُو سے مسیح نیک تھا یا نہیں۔ نہ اس سوال میں پڑنا چاہتا ہوں کہ اسلامی عقیدہ کے رو سے مسیح کے سوا بھی کوئی نیک ہے یا نہیں۔ اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ اس وقت ان کے جواب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس آیت میں تو صرف یہ بتایا گیا ہے کہ خواہ انسانی اعمال برے ہوں یا اچھے۔ خود اس کے لئے ہوتے ہیں انہیں کوئی دوسرا نہیں اٹھا سکتا۔ مطلب یہ کہ سزا اجزاء کوئی بیرونی شے نہیں بلکہ ثمرۂ عمل کا نام ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس جگہ بیج بویا گیا ہے وہیں وہ پھل دے گا۔ دوسری جگہ وہ پھل نہیں دے سکتا ایک آم جو لاہور میں لگا ہو امرتسر میں پھل نہیں دے سکتا۔ پس جب سزا اجزاء خود عمل کرنے والے کے نفس سے پیدا ہوتی ہے تو اسے کوئی دوسرا نہیں بانٹ سکتا یا اپنے ذمہ نہیں لے سکتا۔ پس اس مضمون میں کفارہ کا رد ہے نہ کہ اس کی تائید۔ کفارہ کی بنیاد تو اس خیال پر ہے کہ سزا ایک بیرونی بوجھ کی طرح ہے۔ پس دوسرا شخص بھی اسے اٹھا سکتا ہے۔ مگر اس آیت میں اس عقیدہ کو رد کیا گیا ہے۔

عیسائیوں کا دوزخ کو مادی قرار دینا حماقت ہے اسی اعتراض سے بچنے کے لئے مسیحیوں نے دوزخ کو مادی قرار دیا ہے (A Catechism of Christian Doctrine vol:2 p.599)۔ حالانکہ یہ حماقت کی بات ہے کہ جنت تو روحانی ہو۔ اور دوزخ مادی ہو۔ یا دونوں روحانی ہوں گی یا دونوں مادی۔ اگر روحانی ہوں گی تو پھر کوئی شخص کسی دوسرے کی سزا نہیں اٹھا سکتا۔ کیا کوئی شخص دوسرے کی ندامت، حرص، رنج، غضب وغیرہ کو بانٹ سکتا ہے؟ اسی لئے نہیں بانٹ سکتا کہ یہ چیزیں انسان کے اندر سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان کے پیدا کرنے میں خود اس کے نفس کا دخل ہوتا ہے اس قسم کی سزا اسی صورت میں مٹ سکتی ہے جب نفس حقیقتاً فنا ہو جائے یا معنوی طور پر فنا ہو جائے۔ یعنی ندامت کے احساس کے ساتھ اس میں پاکیزگی پیدا ہو جائے۔ اس قسم کی فنا میں کوئی دوسرا شخص کسی طرح بھی شریک نہیں ہو سکتا۔ کوئی معقول آدمی کسی دوسرے کو یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ میاں بہت شرمندہ نہ ہو میں تمہاری جگہ شرمندہ ہو لیتا ہوں۔ ایک فاتر العقل ہی ایسا کہہ سکتا ہے۔ پھر کیوں مسیحی خدا کے برگزیدہ مسیح کے منہ سے یہ الفاظ کہلا کر اس کی ہتک کرتے ہیں۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔ اور ہم سزا نہیں دیا کرتے۔ یہاں تک کہ ہم ایک رسول بھیج لیں۔

اس کے متعلق قرآن کریم میں دوسری جگہ آتا ہے۔ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ۔ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ (الملک: ۹، ۱۰) کہ جب کبھی کوئی گروہ اور قوم جہنم میں ڈالی جائے گی۔ تو ان سے دریافت کیا جائے گا کہ تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا آیا۔ تو وہ کہیں گے کہ ہاں۔ ہمارے پاس نبی آیا۔

اس سے پتہ لگتا ہے کہ ہر قوم میں نبی آئے۔ اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا ہے۔ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَ يُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا (الزمر: ۷۲) کہ کیا تمہارے پاس رسول نہ آتے رہے جو تم کو اس دن کی ملاقات سے ڈراتے تھے۔ ایک اور جگہ فرماتا ہے۔ اَوَ لَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَ جَآءَكُمُ النَّذِيْرُ (الفاطر: ۳۸) کیا تم کو ہم نے اس قدر عمر نہیں دی کہ جس کی سمجھنے کی نیت ہوتی۔ اس میں سمجھ سکتا تھا اور پھر اسی پر بس نہیں کی۔ بلکہ تمہارے پاس ہوشیار کرنے کے لئے رسول بھی بھیجے۔ اسی طرح قصص رکوع ۶ میں فرماتا ہے وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا (آیت: ۶۰)۔ تیرے خدا کی شان کے خلاف ہے کہ وہ اس کے مرکزی مقام میں نبی بھیجے بغیر کسی بستی کو ہلاک کردے۔ اور پھر سورہ قصص ع ۵ میں فرمایا وَ لَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (آیت: ۴۸) یعنی اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ ان لوگوں کو اپنے اعمال کی وجہ سے کوئی عذاب پہنچا۔ تو یہ کہہ دیں گے کہ اے ہمارے رب کیوں نہ آپ نے ہماری طرف رسول بھیجا کہ ہم ذلیل وخوار ہونے سے پہلے آپ کے احکام کی تعمیل کرتے۔ تو ہم ان کو بغیر رسول بھیجے کے ہی عذاب دے دیتے مگر چونکہ یہ عذر ان کا معقول ہوتا۔ ہم نے اس عذر کو توڑ دیا ہے۔ اور ہمیشہ پہلے رسول بھیجتے ہیں۔ پھر اس کے انکار کے بعد عذاب لاتے ہیں۔

ان تمام آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ سنت الٰہی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر رسول بھیجنے کے کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کرتا۔ یعنی اتنے وسیع علاقہ پر جو نبیؑ وقت کا مخاطب ہو اس وقت تک عذاب نہیں آتا۔ جب تک پہلے ایک اور نبی خواہ وہ پہلے نبی کا تابع ہی کیوں نہ ہو ظاہر ہو کر لوگوں کو ہوشیار نہ کردے۔

دنیا میں جن پر حجت تمام نہیں ہوتی ان کے لئے قیامت میں بعثت رسول یہاں سوال ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ جن پر حجت تمام نہیں ہوئی ان کا کیا حال ہوگا۔ تو اس کا جواب مسند احمد بن حنبل کی روایت میں ہے جو ابو ہریرہؓ نے بیان کی ہے اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَرْبَعَةٌ يَحْتَجُّوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ اَصَمُّ لَا يَسْمَعُ شَيْئًا وَرَجُلٌ اَحْمَقُ وَرَجُلٌ هَرَمٌ وَرَجُلٌ مَاتَ فِي فَتْرَةٍ فَاَمَّا الْاَصَمُّ فَيَقُوْلُ رَبِّ لَقَدْ جَآءَ الْاِسْلَامُ وَمَا اَسْمَعُ شَيْئًا وَاَمَّا الْاَحْمَقُ فَيَقُوْلُ جَآءَ الْاِسْلَامُ وَالصِّبْيَانُ يَحْذِفُوْنَنِيْ بِالْبَعْرِ وَاَمَّا

الْھَرَمُ فَيَقُوْلُ رَبِّ لَقَدْ جَاءَ الْاِسْلَامُ وَمَا اَعْقِلُ شَيْئًا وَاَمَّا الَّذِیْ مَاتَ فِی الْفَتْرَةِ فَيَقُوْلُ رَبِّ مَا اٰتَانِیْ لَكَ رَسُوْلٌ فَيَاخُذُ سُبْحَانَهُ مَوَاثِيْقَهُمْ لَيُطِيْعُنَّهُ فَيُرْسِلُ اِلَيْهِمْ رَسُوْلًا اَنِ ادْخُلُوا النَّارَ فَمَنْ دَخَلَهَا كَانَتْ عَلَيْهِ بَرْدًا وَسَلَامًا وَمَنْ لَمْ يَدْخُلْهَا سُحِبَ اِلَيْهَا (روح المعانی زیر آیت ھذا) یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے پاس رسول بھیجے گا پھر اس کی اطاعت کرنے والوں اور اس کو نہ ماننے والوں کی فطرت ظاہر ہو جائے گی۔ اور اس کے مطابق ان کو بدلہ ملے گا۔

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا

اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کریں تو (پہلے) ہم اس کے خودسر لوگوں کو (کچھ) حکم دیتے ہیں جس پر وہ

فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ

اس (بستی) میں نافرمانی (کی راہ اختیار) کرتے ہیں۔ تب اس (بستی) کے متعلق ہمارا کلام پورا ہو جاتا ہے۔

فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿۱۷﴾

اور ہم اسے پوری طرح تباہ کر دیتے ہیں۔

حلّ لُغات۔ **مُتْرَفِيْهَا** اَلْمُتْرَفُ کے معنے ہیں۔ اَلْمُتَنَعِّمُ لَا يُمْنَعُ مِنْ تَنَعُّمِهٖ۔ عیاش۔ اَلْمَتْرُوْكُ يَصْنَعُ مَا يَشَاءُ۔ شریعت سے آزاد شخص۔ اَلْجَبَّارُ۔ خودسر (تاج) مُتْرَفُوْنَ اس کی جمع ہے۔

فسقوا فَسَقُوْا فَسَقَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ تشریح کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۳۴۔

فَسَقَ الرَّجُلُ فِسْقًا: تَرَكَ اَمْرَ اللّٰهِ۔ اللہ کی نافرمانی کی۔ عَصٰی نافرمان ہو گیا۔ جَارَ عَنْ قَصْدِ السَّبِيْلِ۔ درست راہ سے روگردان ہو گیا۔ فَجَرَ۔ بدکردار ہو گیا۔ خَرَجَ عَنْ طَرِيْقِ الْحَقِّ۔ حق کی راہ سے الگ ہو گیا۔ اَلرُّطَبَةُ عَنْ قِشْرِهَا خَرَجَتْ گابھا چھلکے سے باہر آ گیا۔ (اقرب)

دمّرنا: دَمَّرْنَا دَمَّرَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور دَمَّرَهُمْ (وَعَلَيْهِمْ) کے معنے ہیں اَهْلَكَهُمْ یعنے دَمَّرَ جب بغیر صلہ یا علیٰ کے صلہ کے ساتھ استعمال ہو۔ تو اس کے معنے ہوتے ہیں کہ اس کو ہلاک کر دیا (اقرب) پس دَمَّرْنَا کے معنی ہوں گے ہم نے ہلاک کر دیا۔

تفسیر۔ خدا کا عذاب قوموں کے خراب ہونے پر آتا ہے اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جب قومیں خراب ہوجاتی ہیں اور ان کے عذاب کا فیصلہ ہوجاتا ہے تو ان کی طرف ایک رسول بھیجا جاتا ہے جو ان کو ہوشیار کرتا ہے لیکن لوگ اس کی بات کو نہیں مانتے اور رسول سے ٹھٹھا ہنسی کرتے ہیں۔ اور اس کی نافرمانی کرتے ہیں۔ تب خدا تعالیٰ کا عذاب انہیں آ پکڑتا ہے۔

اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا۔ بعض مخالفین اسلام نے اس آیت کے یہ معنے کئے ہیں کہ خدا تعالیٰ بڑے بڑے لوگوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ بدکار ہوجاؤ۔ اور یہ غلط معنے کرکے اس پر اعتراض کیا ہے کہ آپ ہی پہلے گمراہ کیا پھر عذاب میں مبتلا کردیا یہ تو انصاف کے خلاف ہے۔ حالانکہ فسق کے معنے حکم نہ ماننے کے ہیں اور ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جو معنے انہوں نے کئے ہیں ان کی بناء پر آیت کا ترجمہ یوں بنتا ہے کہ خدا تعالیٰ ان کو حکم دیتا ہے کہ تم بدکاری کرو۔ فَفَسَقُوْا فِيْهَا تو وہ اس حکم کی نافرمانی کرنے لگ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر آیت کا مطلب یہ ہو تو اس میں تو ان لوگوں کی تعریف نکلتی ہے کہ باوجود خدا تعالیٰ کے کہنے کے کہ بدکار بن جاؤ وہ بدکار نہیں بنتے۔ بلکہ نیک ہو جاتے ہیں۔ اور یہ معنی بالبداہت غلط ہیں اور اگر یہ معنے کئے جائیں کہ خدا کے بدکار بنانے پر وہ بدکار ہوجاتے ہیں تو فَسَقُوْا کا لفظ درست نہیں رہتا کیونکہ اس صورت میں تو وہ فرمانبردار بن جاتے ہیں ان کو نافرمان نہیں کہا جاسکتا غرض یہ معنے بالبداہت غلط ہیں اور عربی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے کئے گئے ہیں۔ اور اعتراض قرآن کریم پر نہیں پڑتا۔ بلکہ ان لوگوں کے علم پر پڑتا ہے۔ اصل مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ ہم ان کو حکم دیتے ہیں یعنی بعض خاص امور پر چلنے کا حکم دیتے ہیں جو حکم خدا تعالیٰ کی طرف سے ہونے کے سبب سے بہرحال نیکی کا حکم ہوتا ہے۔ مگر وہ نافرمان ہوجاتے ہیں یعنے اس حکم کو نہیں مانتے۔ غرض اس جگہ اَمَرْنَا کا مفعول ثانی محذوف ہے کیونکہ وہ ایک ظاہر بات ہے اور ایسے مواقع پر عربی زبان میں ایک یا دونوں مفعولوں کو محذوف کردینا جائز ہوتا ہے۔ مفعول ثانی کا مضمون ظاہر اس طرح ہے کہ قرآن کریم نے بار بار اس امر کو بیان کیا ہے کہ خدا تعالیٰ جب حکم دیتا ہے نیکی کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ سورۂ نحل رکوع ۱۳ میں ہی فرما چکا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ (النحل:۹۱) یعنے اللہ تعالیٰ عدل اور احسان اور اس نیکی کا جس میں بدلہ کا خیال تک بھی دل میں نہیں ہوتا حکم دیتا ہے اور باطنی بدی اور ظاہری بدی اور ظلم سے روکتا ہے۔ اسی طرح سورۂ اعراف میں ہے۔ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ (الاعراف:۲۹) تُو کہہ دے اللہ تعالیٰ ہرگز بدی کا حکم نہیں دیتا۔ پس چونکہ یہ امر واضح ہوچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکی کا ہی حکم دیتا ہے۔ مفعول ثانی کو محذوف کردیا گیا ہے اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ جب

اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس قوم کو ایک رسول کے ذریعہ سے نیک احکام پر چلنے کا حکم دیتا ہے مگر بجائے اس حکم سے فائدہ اٹھانے کے وہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی میں بڑھ جاتے ہیں۔

مُتْرَفٌ کے معنے یہ جو فرمایا ہے کہ اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا کہ ہم اس بستی کے مترفوں کو حکم دیتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ صرف مالداروں کو خدا کا حکم ملتا ہے بلکہ مترف کے معنے اس جگہ اَلَّذِیْ يَصْنَعُ مَا يَشَآءُ وَلَا يُمْنَعُ کے ہیں یعنی ایسا شخص جو اپنی مرضی پر چلتا ہے اور نیک بات کو نہیں مانتا اور اس لفظ میں سب کے سب وہ لوگ شامل ہیں جو بدی میں مبتلا ہوتے ہیں خواہ غریب ہوں یا امیر۔

اس آیت کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم عام حکم دیتے ہیں مگر مترف یعنی باغی لوگ اس کو نہیں مانتے نیک لوگ مان لیتے ہیں یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ شیطان کے بارہ میں فرمایا ہے کہ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ (الاعراف: ۱۳) کہ تجھے کس چیز نے سجدہ سے روکا تھا۔ جب میں نے تجھے حکم دیا تھا۔ یہاں یہ مراد نہیں کہ خاص اسے ہی حکم تھا بلکہ حکم عام تھا۔ جس میں وہ بھی شامل تھا۔ پس جب نبی آتا ہے تو وہ عام حکم لاتا ہے۔ ماننے والے مان جاتے ہیں اور انکار کرنے والے انکار کرتے ہیں۔

قریہ سے مراد ام القریٰ قریہ سے مراد یہاں پر بستی نہیں بلکہ ام القریٰ مراد ہے یعنی جس بستی کو اس زمانہ کے لئے خدا تعالیٰ نے مرکز تجویز کیا ہو۔ جیسا کہ قرآن میں ایک اور جگہ فرمایا ہے حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا (القصص: ۶۰)۔ کہ ہم عذاب نازل کرنے سے پہلے ام القریٰ میں رسول بھیج لیتے ہیں۔

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ

اور (اسی قانون کے مطابق) ہم نے نوح (کی قوم کو اور اس) کے بعد (یکے بعد دیگرے اور) بہت سی نسلوں کو ہلاک

بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۸﴾

کیا اور تیرا رب اپنے بندوں کے گناہوں پر (اچھی طرح) آگاہی رکھنے والا ہے (اور انہیں) خوب دیکھتا ہے۔

حلّ لُغات۔ القرون اَلْقُرُوْنُ کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۱۴۔

اَلْقُرُوْنُ اَلْقَرْنُ کی جمع ہے۔ اس کے کئی معنی ہیں۔ كُلُّ اُمَّةٍ هَلَكَتْ فَلَمْ يَبْقَ مِنْهُمْ اَحَدٌ ہر ایسی قوم جو تمام کی تمام ہلاک ہوئی اور اس میں سے کوئی بھی باقی نہ رہا۔ اَلْوَقْتُ مِنَ الزَّمَانِ زمانہ کے ایک حصہ کو بھی قَرْنٌ

کہتے ہیں۔ اَھْلُ زَمَانٍ وَّاحِدٍ ایک زمانہ یا ایک نسل کے لوگوں کو بھی قرن کہتے ہیں۔ اُمَّۃٌ بَعْدَ اُمَّۃٍ۔ زمانہ کے دور کو بھی کہتے ہیں۔ اور اس سے یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے بعد آ رہی ہے۔ عربی کا ایک محاورہ قَرْنُ الشَّیْطَانِ بھی ہے اور اس کے بھی دو معنی ہیں۔ اَلْمُتَّبِعُوْنَ لِرَأْیِہٖ۔ شیطانی لوگ۔ تَسَلُّطُہٗ۔ شیطان کا تسلط۔ (اقرب)

تفسیر۔ یعنی اس قسم کی مثالیں تم کو شروع سے دنیا میں نظر آئیں گی نوح سے لے کر اس وقت تک نبی آتے رہے ہیں سب کے زمانہ میں اسی طرح ہوتا چلا آیا ہے۔ وَ کَفٰی بِرَبِّکَ بِذُنُوْبِ عِبَادِہٖ خَبِیْرًۢا بَصِیْرًا کہہ کر یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو خبیر و بصیر ہے بندوں کو غلط راستہ پر چلتے دیکھ کر کس طرح خاموش رہ سکتا ہے۔ یہ فقرہ بھی ان معنوں کو رد کرتا ہے جو اوپر کی آیت کے بعض نادانوں نے کئے ہیں۔ کیونکہ اس میں بتایا ہے کہ معذب لوگ پہلے سے گنہ گار ہوتے ہیں یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ ان کو گنہ گار بناتا ہے۔

مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَۃَ عَجَّلْنَا لَہٗ فِیْھَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ

جو شخص (صرف) دنیا کا خواہاں ہو ہم اسے (یعنی ایسے لوگوں میں سے) جس کے متعلق ہم (کچھ دینے کا) ارادہ

نُّرِیْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَہٗ جَھَنَّمَ ۚ یَصْلٰھَا مَذْمُوْمًا

کر لیتے ہیں۔ اس (دنیا) میں جو کچھ چاہتے ہیں جلد (ہی) دے دیتے ہیں۔ پھر ہم اس کے لئے جہنم کو مخصوص

مَّدْحُوْرًا ﴿۱۹﴾

کر دیتے ہیں جس میں وہ مذموم ہو کر (اور) دھتکارا جا کر داخل ہوگا۔

حلّ لُغَات۔ اَلْعَاجِلَۃُ اَلْعَاجِلَۃُ عَاجِلٌ (اسم فاعل عَجِلَ) سے مؤنث ہے۔ اور عَجِلَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں۔ اَسْرَعَ۔ اس نے جلدی کی۔ نیز اَلْعَاجِلَۃُ کے معنے ہیں اَلدُّنْیَا۔ دنیا (اقرب) قَوْلُہٗ مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَۃَ اَیِ الْاَعْرَاضَ الدُّنْیَوِیَّۃَ آیت مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَۃَ میں اَلْعَاجِلَۃَ سے مراد دنیوی سامان ہیں۔ (مفردات)

جھنّم جَھَنَّمَ کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۱۹۔

جَهَنَّم: دَارُ الْعِقَابِ کا نام ہے۔ یہ ممنوع من الصرف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ لفظ عجمی ہے۔ بعض اسے اصل میں فارسی یا عبرانی قرار دیتے ہیں لیکن یہ درست نہیں کہ عربی کے الفاظ کو غیر زبانوں کی طرف منسوب کیا جائے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ لفظ ایسے قاعدہ سے بنایا گیا ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس وجہ سے اس کو انہوں نے غیر زبان کا قرار دے دیا۔ عربی میں جَهَنَ جُهُوْنًا کے معنے قَرُبَ وَدَنَا کے ہوتے ہیں اور اِس سے جَهَنَّمُ بنا ہے یا یہ لفظ جَهَمَ سے بنا ہے۔ عربی زبان میں زِيَادَةُ نُوْنٍ فِي وَسْطِ الْكَلِمَةِ کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ پس جَهَمَ سے جَهَنَّمُ کا بننا خلاف قواعد نہیں اور جَهَمَ کے معنے ہیں اِسْتَقْبَلَهٗ بِوَجْهٍ مُكْفَهِرٍّ۔ کہ اس کو تیوری چڑھا کر ملا اور تَجَهَّمَهٗ کے معنے ہیں اِسْتَقْبَلَهٗ بِوَجْهٍ كَرِيْهٍ برے چہرے سے ملا۔ (اقرب) پس جَهَنَّمَ کے معنے ہوئے ایک ناپسندیدہ جگہ جو ناراضگی سے لینے کو بڑھتی ہے۔ یہ نام اس کے شعلے مارنے کی وجہ سے رکھا گیا۔

مَدْحورًا مَدْحُوْرًا دَحَرَ (يَدْحَرُ۔ دُحُوْرًا) سے اسم مفعول ہے۔ اور دَحَرَ کے معنے ہیں۔ طَرَدَهٗ۔ اس کو دھتکارا۔ اَبْعَدَهٗ۔ اس کو دور کیا۔ دَفَعَهٗ۔ اس کو ہٹایا۔ (اقرب) پس مَدْحُوْرٌ کے معنے ہوں گے (۱) دور کیا ہوا (۲) دھتکارا ہوا (۳) ہٹایا ہوا۔

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ قریب کے فائدہ کو مدنظر نہیں رکھنا چاہیے۔ بلکہ ایسے فائدہ کو مدنظر رکھنا چاہیے جو بابرکت ہو۔ خواہ بعد میں ہی ملے۔ دوسرے یہ بتایا ہے کہ صرف دنیوی ترقیات کو خدا کا فضل نہیں قرار دینا چاہیے۔ کیونکہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ بعض اقوام کو دنیوی ترقیات دیتا ہے۔ لیکن وہ ان پر خوش نہیں ہوتا۔ فضل الٰہی وہی ترقیات کہلاسکتی ہیں جن کے ساتھ روحانیت میں ترقی ہو۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ

اور جس شخص نے آخرت کی خواہش کی اور اس کے لئے اس کے مطابق کوشش (بھی) کی تو (اس کے متعلق یاد رکھو

فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۲۰﴾

کہ) ایسے ہی لوگ ہیں جن کی کوشش کی قدر کی جائے گی۔

تفسیر۔ سعی مشکور ہی کارگر ہوتی ہے سَعْيَهَا میں هَا کی ضمیر آخرت کی طرف پھرتی ہے۔

اور مطلب یہ ہے کہ ایسی کوشش کرتے ہیں۔ جو آخرت کے حصول کے مناسب حال ہو۔ اس میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ عام کوشش مفید نہ ہوگی۔ بلکہ وہ کوشش فائدہ بخش اور نتیجہ خیز ہوگی جو اخروی کامیابی کے مناسب حال ہوگی۔

وَهُوَ مُؤْمِنٌ کہہ کر یہ بتایا ہے۔ کہ حیات آخرت کا مدار قلب کی صفائی پر ہے۔ دنیوی کام بعض دفعہ بغیر ایمان کے بھی نفع بخشتے ہیں۔ لیکن آخرت کے لئے جو کوشش ہو۔ اس میں وہی کام نفع دیتا ہے جس کے ساتھ ایمان بھی ہو۔

سَعْيٌ مَشْكُورٌ کے معنے مَشْكُورٌ کے معنے مقبول کے ہیں۔ یعنی وہی خدا کے ہاں مقبول ہوگا۔ جس کے ساتھ ایمان شامل ہو۔ وَهُوَ مُؤْمِنٌ کا یہ مطلب نہیں کہ مومن کے سوا کسی کی نیکی قبول نہیں۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ اُخروی جزاء پر ایمان رکھتے ہوئے جو نیک عمل کرے اُسے اُخروی جزا ملے گی۔ جو اس پر ایمان لانے کے بغیر نیک عمل کرے اس کے عمل کا بدلہ اُسے اسی دنیا میں مل جائے گا۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ

هم سب کو مدد دیتے ہیں۔ ان کو بھی اور ان کو بھی (اور یہ مدد) تیرے رب کی عطاؤں میں سے ہے۔ اور تیرے

عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۱﴾

رب کی عطا (کسی خاص گروہ کے لئے) محدود نہیں ہے۔

حلّ لُغَات۔ نُمِدُّ نُمِدُّ اَمَدَّ سے مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور اَمَدَّهٗ کے معنے ہیں۔ اَمْهَلَهٗ اسے مہلت دی۔ اَمَدَّ اَجَلَهٗ: اَخَّرَهٗ۔ اس کی میعاد لمبی کی۔ اَمَدَّ الْجُنْدَ: نَصَرَهُمْ بِجَمَاعَةٍ۔ کمک بھیج کر ان کی مدد کی۔ اَمَدَّ فُلَانًا بِمَالٍ: اَعْطَاهُ۔ اس کو مال دیا۔ اَعَانَهٗ وَاَغَاثَهٗ۔ اَمَدَّ کے ایک معنے مدد کرنے اور فریاد رسی کرنے کے ہیں۔ (اقرب) پس نُمِدُّ کے ایک معنے ہوں گے ہم مدد دیتے ہیں۔

اَلْمَحْظُوْرُ اَلْمَحْظُوْرُ اَلْمَمْنُوْعُ۔ محظور کے معنے ہیں۔ روکا ہوا۔ اَلْمُحَرَّمُ وَمِنْهُ فِي الْقُرْاٰنِ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا اَیْ مُحَرَّمًا اور محظور کے ایک معنے حرام کئے ہوئے کے بھی ہیں۔ اور آیت مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ

مَحْظُوْرًا میں محظور کے معنے یہی لئے گئے ہیں۔وَقِيْلَ مَقْصُوْرًا علٰی طَائِفَةٍ دُوْنَ اُخْرٰی مِنْ حَظَرَ الشَّیءَ اِذَا حَازَهُ لِنَفْسِهِ۔اور بعض نے کہا ہے کہ چونکہ حظر کے ایک معنی کسی چیز کو اپنے نفس کے لئے مخصوص کرنے کے ہیں۔اس لئے محظور کے معنے یہ ہوں گے کہ ایک گروہ کے ساتھ مخصوص کی ہوئی۔(اقرب)

تفسیر۔پہلی آیت سے جو شبہ پیدا ہوتا تھا۔کہ شاید مومن کے بغیر کسی کو نیک جزاء نہیں ملتی۔اس کا ازالہ اس آیت میں کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ نصرت الٰہی دو قسم کی ہوتی ہے۔ایک وہ جو مذہب کے ساتھ تعلق نہیں رکھتی بلکہ عام ہوتی ہے۔جو کام کوئی کرتا ہے اور جس کسی کام کے لئے کوئی کوشش کرتا ہے۔اس کے مطابق اس کو پھل ملتا ہے۔اس میں ہندو۔مسلمان۔عیسائی۔موسائی وغیرہ کی کوئی قید نہیں۔اور ایک ایسی نصرت ہوتی ہے جو مذہب کے نتیجہ میں ہوتی ہے۔وہ صرف مومن کے شامل حال ہوتی ہے اور کافر کو نہیں ملتی۔

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَ لَلْاٰخِرَةُ

دیکھ کس طرح ہم نے (دنیوی سامانوں کی رو سے بھی) ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی (ہوئی) ہے۔

اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۲﴾

اور آخرت (کی زندگی) تو یقیناً (اور بھی) بڑے درجات والی اور زیادہ فضیلت والی (زندگی) ہوگی۔

تفسیر۔**جنت میں مدارج** اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا۔فرمایا آخرت تو درجات اور فضیلت دینے میں بہت بڑی ہے۔مسلم کی ایک حدیث ہے۔عَنْ اَبِیْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَهْلَ الْجَنَّةِ لَيَتَرَاءَوْنَ اَهْلَ الْغُرَفِ مِنْ فَوْقِهِمْ كَمَا تَتَرَاءَوْنَ الْكَوْكَبَ الدُّرِّیَّ الْغَابِرَ مِنَ الْاُفُقِ مِنَ الْمَشْرِقِ اَوِ الْمَغْرِبِ لِتَفَاضُلِ مَا بَيْنَهُمْ (مسلم كتاب الجنة وصفة نعيمها واهلها باب ترائى أهل الجنة أهل الغرف) کہ بڑے بڑے درجات والے اپنے سے اوپر والے جنتیوں کو اسی طرح دیکھیں گے جیسے تم اس ستارہ کو دیکھتے ہو جو دور اُفق میں ہوتا ہے اور یہ ان کے مدارج کے فرق کی وجہ سے ہوگا۔

اس آیت میں پہلی آیت کے مضمون کا ثبوت پیش کیا ہے۔اور بتایا ہے کہ دیکھ لو دنیا میں ہم نے بہت سے لوگوں کو جو مومن نہیں ترقیات دی ہیں یہ ان کے اعمال کے قبول ہونے کے سبب سے ہی ہے انہوں نے دنیا کے لئے محنت کی۔دنیا ہم نے ان کو دے دی۔مگر اس سے یہ دھوکہ نہ کھانا چاہیے کہ غیر مومن بھی اعلیٰ ترقیات حاصل کر لیتے

ہیں کیونکہ یہ اُخروی ترقیات کے مقابل پر حقیر ہیں۔

اس آیت میں مومنوں کو نیکی میں بڑھنے کی تحریص بھی دلائی گئی ہے اور بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ کے ہاں بڑے بڑے انعامات ہیں۔ پس نیکی کے کسی مقام پر کھڑا نہیں ہوجانا چاہیے۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۳﴾ ع

پس اللہ (تعالیٰ) کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنائیو ورنہ تو مذموم ہوکر (اور) نصرت (الٰہی) سے محروم ہوکر بیٹھ جائے گا

تفسیر۔ مشرکین کے ترقی نہ کرسکنے کی وجہ اس میں یہ دلیل ہے کہ کیوں اُخروی نعماء بغیر ایمان کے نہیں ملتیں۔ اور وہ دلیل یہ ہے کہ جو جس کے ساتھ وابستہ ہوگا اسی کے ساتھ جائے گا۔ پس جو خدا تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ آگے آگے بڑھتے جائیں گے۔ لیکن جو اللہ تعالیٰ سے وابستہ نہیں بلکہ جھوٹے معبودوں کے ساتھ وابستہ ہیں وہ وہیں بیٹھے رہیں گے جہاں ان کے معبود ہیں۔ یاد رہے کہ شرک کے ساتھ انسان نیچے ہی نیچے گرجاتا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں کوئی قوم ایسی نہ ملے گی جو شرک کو اختیار کرکے ترقی کر گئی ہو۔ مشرک قوم جب ترقی کرے گی اپنے مذہب سے بیگانہ ہوکر ترقی کرے گی اس کے اصول پر چلتے ہوئے کبھی ترقی نہ کرے گی۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ

تیرے رب نے (اس بات کا) تاکیدی حکم دیا ہے۔ کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور (نیز اپنے) ماں باپ

اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ

سے اچھا سلوک کرنے کا اگر ان میں سے کسی ایک پر یا ان دونوں پر جب کہ وہ تیرے پاس ہوں بڑھاپا آجائے تو

لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا

انہیں (ان کی کسی بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے) اف تک نہ کہہ اور نہ انہیں جھڑک اور ان سے

قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۴﴾

شریفانہ طور پر نرمی سے بات کر۔

حلّ لُغات ۔قضٰی قَضٰی عَلَيْهِ عَهْدًا اَوْصَاهُ۔اس کو تاکیدی حکم دیا ۔قَضَی الْعَهْدَ:اَنْفَذَهُ۔ عہد واقرار کو جاری کیا۔اِلَيْهِ الْاَمْرَ :اَنْهَاهُ وَاَبْلَغَهُ۔اس تک کسی امر کو پہنچایا۔وَفِی الْاَسَاسِ قَضٰی اِلَيْهِ اَمْرًا وَعَهْدًا: وَصَّاهُ بِهٖ وَاَمَرَهُ بِهٖ۔اوراساس میں قضٰی اِلَيْهِ اَمْرًا کے معنے یہ کئے گئے ہیں کہ اسے تاکیدی حکم دیا۔(اقرب)

اُفّ اُفٍّ ناپسندیدگی۔بے قراری اور حقارت کے اظہار کے لئے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔(اقرب)

لَا تَنْهَرْهُمَا لَا تَنْهَرْهُمَا نَهَرَ سے نہی مخاطب کا صیغہ ہے۔اور نَهَرَ السَّائِلَ کے معنی ہیں ۔زَجَرَهُ۔سائل کو جھڑکا (اقرب) پس لَا تَنْهَرْهُمَا کے معنے ہوں گے کہ انہیں نہ جھڑک۔

قولًا کریمًا قَوْلًا كَرِيْمًا ای سھلًا لیّنًا۔نرم پسندیدہ بات۔(اقرب)

تفسیر ۔اب اللہ تعالیٰ وہ ترکیب بتاتا ہے جس کے ذریعہ سے انسان اپنے نظام کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی تعلیم کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ہدایت کے دنوں میں ان احکام کی پابندی کرنا اوران کا خیال رکھنا۔تب ہی تم تنزّل سے بچ سکو گے۔ورنہ ترقیات قائم نہ رہ سکیں گی۔

قرآن مجید نے سب سے مقدم حکم توحید کے قیام اور شرک کے ردّ کا دیا ہے۔جب دنیا میں حکومتیں ملتی ہیں تو ساتھ ہی توہم پرستی اور شرک بھی پیدا ہوجاتے ہیں۔اس لئے جہاں ترقیات کی پیشگوئی کی وہاں آئندہ کے خطرات سے بھی بچنے کا حکم دیا۔اوران سے آگاہ کردیا۔توحید کو اس لئے مقدم رکھا ہے کیونکہ کوئی گناہ بغیر شرک کے پیدا نہیں ہوتا۔

سب گناہ شرک کی شاخیں ہیں میرے نزدیک سب گناہ دراصل شرک ہی کی شاخیں ہیں۔گناہ کا مرتکب انسان اسی لئے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی ذات اور صفات پر کامل ایمان اور توکل نہیں رکھتا۔توحید کا مسئلہ نیکیوں کے لئے بطور ایک بیج ہے۔تمام مذاہب اور تمام اخلاق اسی مرکز کے گرد چکر لگاتے ہیں۔اگر توحید کا عقیدہ نہ اختیار کیا جائے۔تو قانون قدرت اور قانون شریعت دونوں کی بنیاد ہل جاتی ہے۔قانون شریعت کا تعلق تو واضح ہی ہے۔مگر قانون قدرت کی تمام ترقیات اور سائنس کی تمام تر بنیاد بھی توحید پر ہی ہے۔کیونکہ اگر مختلف

خدا مانے جائیں تو ان کے مختلف قانون ہونے چاہئیں ۔ یا پھر کم از کم اس میں مختلف تبدیلیاں ہوتی رہنی چاہئیں ۔اور اگر ایسا ہو یعنی ایک اٹل قانون اور ایک قائم سلسلہ قانون قدرت کا دنیا میں جاری نہ ہو۔ تو تمام علمی ترقیات یک دم بند ہو جائیں گی ۔ کیونکہ سائنس کی ترقی اور ایجادات کی وسعت کی بنیاد اسی پر ہے کہ دنیا میں ایک منظم اور نہ بدلنے والا قانون جاری رہے ۔ اگر انسان کو یہ خیال ہو کہ عالم میں کوئی نظام نہیں ۔ یا یہ کہ نظام بدلتا رہتا ہے تو وہ کبھی بھی قانون قدرت کی باریکیوں کے دریافت کرنے کی طرف توجہ نہیں کرسکتا۔

توحید کے بعد والدین سے حسن سلوک کے ذکر میں حکمت

توحید پر یقین رکھنے کا حکم دینے کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے ۔ کیونکہ وہ بھی خدا تعالیٰ کی طرف ہی توجہ دلاتے ہیں ۔ وہ طبعی قانون کا ایک ایسا ظہور ہیں جو قانون شریعت کی طرف لے جاتا ہے ۔ کیونکہ وہ مبدی (پیدا کرنے والی ذات) پر دلالت کرتے ہیں ۔ والدین کے ذریعہ سے پیدائش بتاتی ہے کہ انسان اتفاقی طور پر پیدا نہیں ہو گیا۔ اس سے پہلے کوئی اور تھا۔ اور اس سے پہلے کوئی اور۔ غرض ایک لمبا سلسلہ تھا۔ جس سے اللہ تعالیٰ کے وجود پر شہادت ملتی ہے۔

بغیر تناسل کے اصول کے انسان کا ذہن مبدا کی طرف جا ہی نہیں سکتا تھا ۔ اگر یہ نظام نہ ہوتا تو انسان کو اس لمبی کڑی کی طرف کبھی توجہ ہی نہ ہوتی ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سلسلہ تناسل یہ بھی بتاتا ہے کہ انسانی پیدائش کی غرض اور اس کا مقصد بہت بڑا ہے ۔ پس توحید کے حکم کے بعد والدین کے متعلق احسان کا حکم دیا۔ کیونکہ ایک احسان کی قدر دوسرے احسان کی قدر کی طرف توجہ کو پھراتی ہے۔

وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا۔ اس کا عطف اَنْ پر ہے ۔ پورا جملہ یہ ہے ۔ اِنِ احْسِنُوا بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک تو یہ حکم دیا ہے کہ خدا کے سوا کسی کو معبود نہ بناؤ۔ اور ایک یہ کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ اس جملہ میں کیا لطیف رنگ اختیار کیا گیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کے احسانات کا انسان بدلہ نہیں دے سکتا۔ اس لئے خدا تعالیٰ کے ذکر میں یہ بیان کیا کہ احسان تو تم کر نہیں سکتے ۔ پس ظلم سے تو بچو۔ لیکن والدین کے احسان کا بدلہ دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ان کے بارہ میں مثبت حکم دیا۔

عِنْدَكَ کے لفظ میں یہ بتایا ہے کہ اگر وہ تمہاری کفالت میں بھی ہوں تو بھی کچھ نہ کہنا۔ کجا یہ کہ وہ الگ رہتے ہوں ۔ اور پھر بھی تمہارے ہاتھوں تکلیف پائیں ۔

کفالت کی خصوصیت اس لئے فرمائی ۔ کہ ہر وقت کے پاس رہنے سے اختلافات زیادہ رونما ہوتے ہیں ۔ اور پھر یہ بھی قاعدہ ہے کہ انسان جس پر خرچ کرتا ہے اس پر اپنا حق بھی سمجھنے لگتا ہے۔

اُفّ۔ کلمۂ ضجر ہے یعنی ناپسندیدگی کا کلام۔ یعنی یہ کہنا کہ مجھے یہ بات پسند نہیں اور نہر ناپسندیدگی کو عملی جامہ پہنانے کو کہتے ہیں۔ یعنی نہ منہ سے نہ عمل سے ان کو دکھ دو۔

والدین کی خدمت کا موقعہ ملنے کے باوجود جنتی نہ بننا بدقسمتی ہے اسلام نے والدین کی خدمت کے لئے خاص ہدایات دی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے فَمَنْ اَدْرَكَ اَحَدَ وَالِدَيْهِ ثُمَّ لَمْ يُغْفَرْ لَه فَاَبْعَدَهُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ رَوَاهُ اَحْمَد (مسند احمد، مسند الکوفیین حدیث ابی من مالک۔ ابن کثیر زیر آیت ھذا) یعنی جس شخص کو اپنے والدین میں سے کسی کی خدمت کا موقعہ ملے اور پھر بھی اس کے گناہ نہ معاف کئے جائیں تو خدا اس پر لعنت کرے مطلب یہ کہ نیکی کا ایسا اعلیٰ موقعہ ملنے پر بھی اگر وہ خدا کا فضل حاصل نہیں کر سکا۔ تو جنت تک پہنچنے کے لئے ایسے شخص کے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ

اور (ان پر) رحم کرتے ہوئے ان کے لئے خاکساری کا بازو جھکا دے اور (ان کے لئے دعا کرتے وقت) کہا کر (کہ

ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ؕ﴿۲۵﴾

اے) میرے رب ان پر (اسی طرح) مہربانی کر کیونکہ انہوں نے (میری) بچپن کی حالت میں میری پرورش کی تھی

حلّ لُغات۔ وَاخْفِض وَاخْفِضْ خَفَضَ سے امر کا صیغہ ہے۔ اور خَفَضَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں ضِدُّ رَفَعَهٗ۔ اس کو نیچا کیا۔ وَفِي الْقُرْاٰنِ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَيْ تَوَاضِعْ لَهُمْ۔ اور قرآن مجید کی آیت وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ میں وَاخْفِضْ کے معنے تواضع کرنے کے ہیں۔ خَفَضَ صَوْتَهٗ کے معنے ہیں۔ اَخْفَاهُ وَغَضَّهٗ۔ آواز کو نیچا کیا۔ خَفَضَ الصَّوْتُ: لَانَ وَسَهُلَ۔ آواز نرم ہوگئی۔ (اقرب)

اَلْجَنَاحُ اَلْجَنَاحُ: مَايَطِيْرُ بِهِ الطَّائِرُ۔ پرندے کا بازو۔ يَدُ الْاِنْسَانِ۔ انسان کا ہاتھ اَلْعَضُدُ۔ بازو اَلْجَانِبُ جانب۔ اَلْكَنَفُ۔ پناہ۔ (اقرب)

الذُّلّ الذُّلُّ اللِّيْنُ وَالسُّهُوْلَةُ۔ ذُلّ کے معنے نرمی اور آسانی کے ہیں۔ وَالتَّوَاضُعُ۔ تواضع۔ اَلْاِنْقِيَادُ۔ فرمانبرداری۔ (اقرب)

تفسیر۔ اور ان کے لئے رحمت کے ساتھ اپنے انکسار کے بازو نیچے گرا دے۔ اور یہ دعا کرتا رہ کہ اے

میرے رب تو ان پر رحم کر۔ کیونکہ انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی ہے۔ اس لطیف تشبیہ میں بتایا ہے کہ تیرا ہاتھ ہر وقت ان کی خدمت میں لگا رہنا چاہیے۔

والدین کے لئے ہمیشہ دعا کرنی چاہیے اس آیت میں یہ بھی اشارہ کر دیا کہ انسان بالعموم والدین کی ویسی خدمت نہیں کر سکتا۔ جیسی کہ ماں باپ نے اس کی بچپن میں کی تھی۔ اس لئے فرمایا کہ ہمیشہ دعا کرتے رہنا۔ کہ اے خدا تُو ان پر رحم کر۔ تا کہ جو کسر عمل میں رہ جائے دعا سے پوری ہو جائے۔ کَ کے معنے تشبیہ کے بھی ہوتے ہیں۔ ان معنوں کی رو سے یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ بڑھاپے میں ماں باپ کو ویسی ہی خدمت کی ضرورت ہوتی ہے جیسے کہ بچہ کو بچپن میں۔

والدین کے لئے یہ دعا اس لئے بھی سکھائی گئی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے گا اسے خود بھی اپنا فرض ادا کرنے کا خیال رہے گا۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ

تمہارا رب جو کچھ (بھی) تمہارے دلوں میں ہو اسے (سب سے) بہتر جانتا ہے اگر تم نیک ہو گے تو (یاد رکھو کہ) وہ

كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۶﴾

بار بار رجوع کرنے والوں کو بہت ہی بخشنے والا ہے۔

حلّ لُغَات۔ اَوَّابِیْنَ اَوَّابٌ کی جمع اَوَّابُوْنَ آتی ہے۔ اور اَوَّابٌ آبَ سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ آبَ اِلَی اللہِ کے معنے ہیں۔ رَجَعَ عَنْ ذَنْبِهٖ وَتَابَ اپنے گناہ سے لوٹ کر اللہ کی طرف رجوع کیا (اقرب) پس اَوَّابٌ کے معنے ہوں گے بار بار رجوع کرنے والا۔

تفسیر۔ یعنی اگر ایسی نیک نیتی اپنے دل میں پیدا کرے جو اوپر بیان ہوئی ہے تو پھر خدا تعالیٰ بھی اس کے عیوب پر پردہ ڈال دیتا ہے یعنی اس کے عمل میں جو کمی رہ جائے اللہ تعالیٰ اسے پوری کر دیتا ہے۔ اس آیت کا مضمون اس حدیث سے بھی ملتا ہے جو اوپر گذر چکی ہے اور جس کا یہ مضمون ہے کہ والدین کی خدمت کا موقع پا کر بھی جس کے گناہ نہ بخشے جائیں اس پر لعنت ہو کیونکہ اس آیت کا مضمون یہی بتاتا ہے کہ جو صالح ہو گا یعنے اوپر کے احکام کے مطابق عمل کرے گا تو اس سے خدا تعالیٰ مغفرت کا معاملہ کرے گا۔

وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا

اور قرابت والے کو اور مسکین کو اور (مسافر) راہرو کو اس کا حق دے

تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۷﴾

اور اسراف کسی رنگ میں (بھی) نہ کر۔

حلّ لُغَات۔ لَا تُبَذِّرْ لَا تُبَذِّرْ بَذَّرَ سے نہی مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور بَذَّرَ الْمَالَ کے معنے ہیں فَرَّقَهٗ اِسْرَافًا (اقرب)۔ مال کے خرچ کرنے میں فضول خرچی سے کام لیا۔ پس لَا تُبَذِّرْ کے معنے ہوں گے۔ تو اسراف نہ کر۔

تفسیر۔ **ہر شخص کے مال میں رشتہ داروں اور مساکین کے حق ہونے کی دلیل** اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ ہر شخص کے مال میں رشتہ داروں۔ مساکین اور مسافروں کا حق ہے رشتے دار انسان کی کمائی میں کئی طرح مدد کا موجب ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کے مال میں ان سب کا حق ہوتا ہے مثلاً والدین نے ایک بیٹے کو پڑھا دیا۔ اور وہ کسی اعلیٰ عہدہ پر پہنچ گیا اور باقی بھائی علم سے محروم رہے تو اس عہدہ دار کے مال میں باقی بھائیوں کا بھی حق ہے کیونکہ جس روپے سے اس کو تعلیم دلائی گئی تھی اس میں ان سب کا حق تھا۔

مساکین اور ابن السبیل کا بھی اللہ تعالیٰ نے حق قرار دیا ہے اور دوسری جگہ کھول کر بھی بتایا ہے وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات: ۲۰) کہ انسان کے اموال میں سائل وغیرہ کا بھی حق ہوتا ہے۔ مساکین کا حق قرار دینے کی ایک تو یہ وجہ ہے کہ دنیا میں امیر غریب بدلتے رہتے ہیں۔ جو آج غریب ہیں کبھی امیر تھے اور جو آج امیر ہیں کبھی غریب تھے اور اس وقت کے امیروں نے ان سے حسن سلوک کیا تھا۔ پس ساری دنیا کو اگر مجموعی نگاہ سے دیکھا جائے تو کسی کا مال اس کا خالص مال نہیں بلکہ اس میں دوسروں کے حقوق شامل ہیں۔ دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ دنیا کی سب اشیاء اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لئے بحیثیت جماعت پیدا کی ہیں نہ کہ زید یا بکر کے لئے۔ پس اگر زید یا بکر کسی وجہ سے زیادہ مالدار ہو گئے ہوں تو اس سے ان باقی لوگوں کا حق باطل نہیں ہو جاتا۔ جو دنیا کی چیزوں کی ملکیت میں زید اور بکر کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ بے شک بوجہ خاص محنت کے زید اور بکر کا زائد حق اسلام تسلیم کرتا ہے لیکن ان کو مالک بلا شرکت غیر نہیں تسلیم کرتا۔

ہر شخص کے مال میں مسافروں کے حق ہونے کی وجہ مسافروں کا حق اس طرح کہ جب یہ دوسری جگہ

کی طرف جاتا ہے تو وہ اس سے حسنِ سلوک کرتے ہیں۔ پس دوسرے مقام کے مسافر کی خدمت کرنا اس کا فرض ہے تا حق ضیافت ادا ہوتا رہے۔ ابن السبیل کے حق کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کسی بستی میں جاؤ تو تین دن تک کی ضیافت کا تم کو حق ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر بستی والے نہ دیں۔ فرمایا چھین کر بھی لے سکتے ہو۔ (ابو داؤد کتاب الاطعمة باب ماجاء فی الضیافة) یہ حکم اس وقت کے لئے ہے جب اسلامی تمدن جاری ہو کیونکہ ان ایام میں دوسرے لوگ اس سے ضیافت کا حق لے سکیں گے۔ اس حکم کو اگر دنیا میں جاری کیا جائے تو بہت سی خرابیاں جو ہوٹلوں اور سراؤں کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں دنیا سے دور ہو جائیں اور غرباء کے لئے بھی دنیا کا سفر جو اعلیٰ تربیت کا ایک ذریعہ ہے آسان ہو جائے گا مگر افسوس کہ خود مسلمانوں نے بھی اس حکم کو بھلا دیا ہے۔

مسافروں سے حسنِ سلوک کا یہ عام حکم دنیا سے بہت سے فتنے مٹانے کا موجب ہے۔ کیونکہ لڑائی جھگڑا منافرت سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس طرح مہمان نوازی کا رواج ہو تو منافرت دور ہو جائے۔ اور گاؤں اور ملکوں کے جھگڑے مٹ جائیں۔ وہ لوگ جو کسی دوسرے ملک کی مہمان نوازی سے فائدہ اٹھا چکے ہوں کبھی بھی جلدی سے ان کے خلاف لڑنے پر آمادہ نہ ہوں گے سوائے خبیث ارواح کے جو نسبتاً تھوڑی ہوتی ہیں۔ نیز اس حکم سے گاؤں اور قصبوں کے نظام کی بنیاد بھی پڑتی ہے کیونکہ مہمان نوازی سارے گاؤں پر واجب کی گئی ہے۔ پس اس حکم کے پورا کرنے کے لئے ہر گاؤں والے ایک ایسے نظام کی پابندی پر مجبور ہوں گے جس کے ماتحت سارا گاؤں مہمانوں کی خدمت کر سکے اور یہ نظام ان کے دوسرے کاموں میں بھی مفید ثابت ہوگا۔

لَا تُبَذِّرْ۔ پھر فرمایا کہ اوپر کے احکام میں مال کو خرچ کرنے کی جو نصیحت کی گئی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہ سمجھنا کہ مال کو لٹا دینا چاہیے ہم نے انہی اخراجات کا حکم دیا ہے جو ضروری ہیں بے فائدہ مال لُٹانے کا حکم نہیں دیا۔

فضول خرچی کی تشریح ابن مسعود کا قول ہے اَلتَّبْذِیْرُ۔ اَلْاِنْفَاقُ فِیْ غَیْرِ حَقٍّ (ابن کثیر زیر آیت ھذا)۔ یعنی ناجائز خرچ کو تبذیر کہتے ہیں۔ پس اس حکم میں دینی انفاق شامل نہیں۔ دین کی کسی ضرورت کے لئے اگر کوئی اپنا سارا مال بھی خدا کی راہ میں دے دے تو وہ مبذر نہ ہوگا۔ کیونکہ اس نے بے جا خرچ نہیں کیا۔

قرآن مجید نے فضول خرچی کی دوسری جگہ تشریح یوں فرمائی ہے۔ وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا (الفرقان: ۶۸) کہ نہ تو اسراف کرنا چاہیے اور نہ کنجوسی سے کام لینا چاہیے مگر میانہ روی اختیار کرنی چاہیے۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ

اسراف کرنے والے لوگ یقیناً شیطانوں کے بھائی ہوتے ہیں اور شیطان

لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۸﴾

اپنے رب کا بہت ہی ناشکر گذار ہے۔

تفسیر ۔فرمایا کہ اگر تم ایسا کرو گے تو ناشکری ہوگی۔ہم نے تمہیں یہ مال اسی لئے دیا ہے کہ تم اس کو برمحل خرچ کرو اب جو تم اس کو یوں پھینکو گے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ مال کے ساتھ جو ذمہ واریاں اللہ تعالیٰ عائد فرماتا ہے ان سے بچنا چاہتے ہو اور یہ ایک گناہ ہے۔

رہبانیت کا ردّ اس آیت میں کس لطیف طریق سے رہبانیت وغیرہ کا رد کیا ہے۔رہبانیت کیا ہے ذمہ واریوں سے بچنے کا ایک ذریعہ ہے اور یہ فعل نیکی نہیں کہلا سکتا بلکہ ایک کھلی بدی ہے اور شیطانی فعل ہے۔اللہ تعالیٰ کے احسان کی ناقدری ہے۔

وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا

اور اگر تو اپنے رب کی طرف سے کسی رحمت کی جستجو میں جس کی تو امید رکھتا ہو ان سے اعراض کرے تو (پھر بھی

فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۹﴾

انہیں سختی سے رد نہ کر بلکہ) انہیں کوئی نرم بات کہہ دو۔

حلّ لُغات۔مَیْسُوْرًا مَیْسُوْرًا کے معنے ہیں مَا يُسِّرَ خِلَافُ الْمَعْسُوْرِ وَهُوَ مَصْدَرٌ عَلٰى مَفْعُوْلٍ بِمَعْنَى الْيُسْرِ ۔مَیْسُوْرٌ اسم مفعول بھی ہے اور مصدر بھی اور اس کے معنی ہیں وہ چیز جو آسان کی گئی ہو یا آسانی۔ السَّهْلُ۔سہولت۔وَمِنْهُ فَقُلْ لَهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا اور فَقُلْ لَهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا میں قَوْلٌ مَیْسُوْرٌ کے معنی نرم بات کے ہیں۔(اقرب)

تفسیر ۔اس آیت کے دو معنے ہیں (۱) جب تم اقرباء مساکین وغیرہ سے اعراض کرو یعنی ان کی مدد نہ

کرسکو۔ تو اس بات کی ضرور نیت کرلو کہ جب اللہ تعالیٰ دے گا تو ضرور دوں گا۔ اور ساتھ ہی تم ان کو یہ بات نرمی سے سمجھا دو کہ توفیق ملنے پر تمہاری ضرور مدد کروں گا۔

(۲) دوسرے معنی یہ ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے فضل کی امید میں یعنی یہ خیال کرتے ہوئے کہ میرا دینا ان کی دینی یا اخلاقی حالت بگاڑ دے گا غرباء کی مدد سے اعراض کرے تو تُو ان کو نرمی سے سمجھا دے گویا اعراض اِبۡتِغَآءَ رَحۡمَةٍ ہونا چاہیے نہ کہ بخل کی وجہ سے۔ مثلاً کوئی ہٹا کٹا آدمی سوال کرے اور جس سے سوال کیا جائے وہ اس نیت سے اس کے سوال کو پورا نہ کرے کہ قوم میں سوال کی عادت نہ پیدا ہو جائے تو یہ جائز ہے۔ مگر اس انکار کا باعث بخل اور کنجوسی نہ ہو۔

سائل سے حسن سلوک کی تاکید اسی طرح مثلاً سائل مسرف ہو یا نشہ شراب افیون کی بد عادت میں مبتلا ہو اس کی مالی مدد سے اگر یہ اس وجہ سے باز رہتا ہے کہ میں نے اس کی امداد کی تو اس کی صحت خراب ہو گی ملک میں بدی ترقی کرے گی اور نہ دینے سے اس کی نشہ کی عادت چھوٹے گی اور ملک کو بھی فائدہ پہنچے گا تو یہ شخص گناہ گار نہ ہو گا۔ بلکہ نیکی کا مرتکب۔ حدیث میں آتا ہے بعض ایسے سائلوں کے آنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہتے یا انہیں سمجھا دیتے تھے۔ (نسائی کتاب الزکوٰۃ باب مسئلۃ القوی المکتسب)

وَلَا تَجۡعَلۡ يَدَكَ مَغۡلُوۡلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبۡسُطۡهَا كُلَّ

اور تو نہ (تو بخل سے) اپنے ہاتھ کو باندھ کر اپنی گردن میں ڈال لے۔ اور نہ (اسراف میں پڑ کر) اسے بالکل کھول

الۡبَسۡطِ فَتَقۡعُدَ مَلُوۡمًا مَّحۡسُوۡرًا ﴿۳۰﴾

دے۔ ورنہ (یا تو) تو ملامت کا نشانہ بن کر (اور یا پھر) تھک کر بیٹھ جائے گا۔

حلّ لُغَات۔ مَغۡلُوۡلَةً مَغۡلُوۡلَةً غَلَّ سے اسم مفعول مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور غَلَّ فُلَانًا کے معنے ہیں: وَضَعَ فِيۡ يَدِهٖ اَوۡ عُنُقِهِ الۡغُلَّ۔ اس کے ہاتھوں یا گردن میں طوق ڈالا۔ (اقرب) پس لَا تَجۡعَلۡ يَدَكَ مَغۡلُوۡلَةً کے معنے ہوں گے تو اپنے ہاتھوں کو باندھ کر اپنی گردن میں نہ ڈال لے۔

مَحۡسُوۡرًا مَحۡسُوۡرًا حَسَرَ سے اسم مفعول ہے اور حَسَرَ الشَّيۡءَ کے معنے ہیں۔ كَشَفَهٗ۔ کسی چیز سے پردہ کو ہٹایا۔ حَسَرَ الۡغُصۡنَ: قَشَرَهٗ۔ ٹہنی کے چھلکے کو اتارا۔ حَسَرَ الۡبَعِيۡرَ: سَاقَهٗ حَتّٰى اَعۡيَاهُ۔ اونٹ کو اتنا چلایا کہ وہ تھک گیا۔ حَسَرَ الۡبَيۡتَ كَنَسَهٗ۔ گھر میں جھاڑو دیا۔ (اقرب) مَحۡسُوۡرٌ کے معنے ہوں گے۔ جھاڑو دیا ہوا۔

ننگا کیا ہوا۔ تھکا یا ہوا۔

تفسیر ۔اس آیت میں بتایا ہے کہ خرچ کے متعلق اس اصل کو مدنظر رکھو کہ نہ تو ہاتھ گردن سے بندھا رہے۔ یعنی ضرورت کے وقت بھی خرچ کرنے سے دریغ ہو اور نہ ہاتھ ہر وقت مال لٹانے کے لئے دراز رہے بلکہ چاہیے کہ تم ضرورت کے مطابق خرچ کرو تا بے ضرورت خرچ تم کو اس وقت کی نیکی سے محروم نہ کردے جبکہ خرچ کرنے کی کوئی صحیح ضرورت پیدا ہو گئی ہو۔

بے ضرورت خرچ کرنے کے نقصان بے ضرورت خرچ کرنے کے دو نقصان بتائے ہیں ایک تو یہ کہ جو شخص بے ضرورت خرچ کرتا ہے ضرورت کے وقت جبکہ اس کے دوسرے ساتھی خرچ کر رہے ہوتے ہیں ۔ یہ منہ دیکھتا رہ جاتا ہے اور قوم اسے ملامت کرتی ہے کہ آج ملک یا قوم کو ضرورت تھی اور آج تم خاموش بیٹھے ہو اور دوسرا نقصان یہ کہ اس طرح انسان محسور یعنی ننگا ہو جاتا ہے یعنی جب ضرورت کے وقت یہ کام نہیں آ سکتا تو قوم پر اس کا عیب ظاہر ہو جاتا ہے اور وہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ بیوقوف ہے اپنے مال کی حفاظت نہیں کر سکا اور یہ بھی کہ یہ دوسروں کا محتاج ہو جاتا ہے۔

حَسَرَ الْبَيْتَ کے معنے گھر میں جھاڑو دے کر اسے صاف کر دیا کے بھی ہیں ۔پس محسور کے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تو اس حالت میں ہو جائے کہ گویا کہ تیرے گھر میں جھاڑو مل گیا۔

إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ

تیرا رب یقیناً جس کے لئے چاہتا ہے رزق کو وسیع کر دیتا ہے اور (جس کے لئے چاہتا ہے) تنگ کرتا ہے وہ یقیناً

بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۳۱﴾ ع

اپنے بندوں (کے حالات) کو جاننے والا (اور) دیکھنے والا ہے۔

تفسیر ۔اس میں یہ بتایا کہ خدا تعالیٰ کسی کو فراخی دیتا ہے اور کسی کے رزق میں تنگی کرتا ہے تا یہ دیکھے کہ جو مالدار ہیں وہ غرباء کی کس طرح مدد کرتے ہیں ۔پس اگر تم دنیا کے اموال کی اس نیت سے حفاظت کرو کہ ان کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کے بندوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکو تو یہ ایک بہت بڑی نیکی ہوگی۔

قرآن کریم کی کیا ہی معجزانہ شان ہے کہ ابھی مسلمان مکہ میں تکلیف اٹھا رہے تھے کہ اس نے مسلمانوں کے لئے وہ احکام بیان کرنے شروع کر دئے جوان کے لئے ترقی کے زمانہ میں ضروری تھے۔ کیا اس کے سوا جو اپنی بات کے پورا کرنے پر کامل طور پر قادر ہو کوئی دوسرا اس طریق کو اختیار کر سکتا ہے۔ اگر یہ کلام انسان کا ہوتا تو مکہ میں اور ان حالات میں جن میں سے مسلمان گذر رہے تھے۔ یہ الفاظ نکالتے وقت اس کا حلق خشک ہو جاتا اور الفاظ حلق میں ہی اٹک کر رہ جاتے۔

وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ

اور تم مفلسی کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل مت کرو۔ انہیں (بھی) ہم ہی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی (ہم ہی دیتے

اِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿۳۲﴾

ہیں) انہیں قتل کرنا یقیناً (بہت) بڑی خطا ہے۔

حلّ لُغات۔ اِمْلَاقٌ اِمْلَاقٌ اَمْلَقَ سے مصدر ہے اور اَمْلَقَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں اَنْفَقَ مَالَهٗ حَتّٰى اِفْتَقَرَ۔ اتنا مال خرچ کیا کہ پھر محتاج و مفلس ہو گیا (اقرب) پس اِمْلَاقٍ کے معنے ہوں گے مال ضائع ہو کر محتاج و مفلس ہو جانا۔

اَلْخِطْأُ اَلذَّنْبُ۔ قصور۔ مَا تَعَمَّدَ مِنْهُ۔ جان بوجھ کر کی ہوئی غلطی۔ (اقرب)

تفسیر۔ پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ احسان تو لوگوں پر کرو لیکن یہ خیال رکھو کہ تمہارا احسان کرنا اس رنگ پر نہ ہو کہ اس کے نتیجہ میں لوگ بدیوں میں بڑھ جائیں یا تم خود بدی میں پڑ جاؤ۔

آیت لَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ الخ کا مطلب اب فرماتا ہے کہ لَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ یعنی اس خوف سے کہ اولاد پر روپیہ خرچ ہوگا ان کو ہلاک نہ کرو یہ حکم لڑکیوں کے قتل کرنے کے متعلق نہیں ہے کیونکہ قرآن کریم میں لڑکیوں کے قتل کی کسی جگہ بھی یہ وجہ بیان نہیں فرمائی کہ لوگ خرچ کے ڈر سے ان کو قتل کر دیتے ہیں۔ بلکہ یہ وجہ بتائی ہے کہ ان کی پیدائش کو اپنے لئے ذلت کا موجب سمجھتے ہیں اس لئے ان کو مار ڈالتے ہیں اسی طرح اس آیت کے یہ معنے بھی نہیں ہو سکتے ہیں کہ بوجہ غربت اور تنگی کے اولاد کو قتل نہ کرو۔ کیونکہ املاق کے معنی غربت اور تنگی کے

نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے معنے مال کے خرچ ہونے کے ہیں۔ اور آیت کے یہ معنے ہیں کہ اس ڈر سے نہ مارو کہ روپیہ خرچ ہوگا۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس ڈر سے کہ روپیہ خرچ نہ ہوکوئی اولاد کو قتل کرتا بھی ہے؟ سو جہاں تک دنیا کا تجربہ ہے اس قسم کے واقعات صحیح الدماغ لوگوں میں تو ملتے نہیں۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جن کے پاس روپیہ نہیں ہوتا وہ بھی اولاد کو نہیں مارتے۔ پس معلوم ہوا کہ اس قتل کا کوئی اور مفہوم ہے۔ اور ہمیں انسانوں میں اس جرم کی تلاش کرنی چاہیے۔ سو جب ہم مختلف انسانوں کی حالتوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ بخل کی وجہ سے اولاد کی صحیح تربیت نہیں کرتے۔ پوری غذا نہیں دیتے یا ایسی غذا نہیں دیتے جو نشوونما کے لئے ضروری ہو ایسے بخیل تو بے شک فاتر العقلوں میں ہی ملتے ہیں جو زہر سے یا گلا گھونٹ کر اپنی اولاد کو اس خوف سے مارتے ہوں کہ ان پر ہماری دولت خرچ ہوگی۔ مگر ایسے بخیل عام صحیح الدماغ لوگوں میں کثرت سے ملتے ہیں کہ پاس روپیہ ہے لیکن بچوں کو بخل کی وجہ سے اچھی غذا نہیں دیتے۔ لباس مناسب نہیں دیتے حتیٰ کہ بعض دفعہ وہ خوراک کی کمی کی وجہ سے بیمار ہوجاتے ہیں۔ بعض دفعہ لباس کی کمی کی وجہ سے نمونیہ وغیرہ کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ دنیا میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ملتے ہیں اور ہر ملک میں ملتے ہیں۔ اسی طرح قتل سے مراد اخلاقی اور روحانی قتل بھی ہوسکتا ہے کہ روپیہ کے خرچ کے ڈر سے اچھی تعلیم نہیں دلاتے اور گویا بچہ کی اخلاقی یا روحانی موت کا موجب ہوجاتے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ مومنوں کو نصیحت کرتا ہے کہ اس فعل سے اجتناب کریں اور وہ اخراجات جو بچوں کی صحت اور اخلاق کی درستی کے لئے ضروری ہیں۔ ان سے کبھی دریغ نہ کیا کریں۔ اور قتل کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ اولاد کو قتل کرنے سے انسان فطرتاً تنفر کرتا ہے پس اس لفظ کے استعمال سے اس کی توجہ اس طرف پھیرائی ہے۔ کہ تم کسی صورت میں بھی اولاد کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنے پر تیار نہیں ہوتے لیکن یہ نہیں سوچتے کہ ایک اور قسم کے قتل کے تم مرتکب ہو رہے ہو۔ یعنی اولاد کی خوراک اور لباس کا خیال نہیں رکھتے اور ان کی صحتوں کو برباد کردیتے ہو۔ یا ان کی تربیت کا خیال نہیں رکھتے اور ان کے اخلاق کو برباد کردیتے ہو۔

لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ میں قتل کے لفظ کے استعمال کی وجہ قتل کا لفظ استعمال کرنے کی میرے نزدیک یہ بھی وجہ ہے کہ اگر صرف یوں کہا جاتا کہ اولاد پر ضرور خرچ کیا کرو۔ تو ان الفاظ میں ان بالواسطہ اثرات کی طرف اشارہ نہ ہوتا جو اولاد کی زندگی پر پڑتے ہیں۔ لیکن ان الفاظ کے استعمال نے تمام بالواسطہ تاثیرات کو بھی اپنے اندر شامل کرلیا ہے۔ مثلاً بیوی کی خوراک اور مناسب لباس کا خیال نہ رکھنا۔ یا دودھ پلانے یا ایام حمل میں اس پر کام

کا بہت بوجھ ڈال دینا۔ یہ سب امور ہیں جن سے اولاد پر برا اثر پڑتا ہے۔ اور یا تو بچے ضائع ہو جاتے ہیں یا ان کی صحتیں کمزور ہو جاتی ہیں۔

لَا تَقْتُلُوْٓا کے الفاظ میں ان سب امور کی مناہی آجاتی ہے اور یہ غرض دوسرے الفاظ سے پوری نہ ہو سکتی تھی۔

اس آیت کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں جو بعض صوفیاء کرتے ہیں۔ کہ اولاد کی پیدائش کو صرف اس خطرہ سے روکنا منع ہے کہ اگر اولاد زیادہ ہو جائے گی تو پھر کھائے گی کہاں سے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اولاد کی پیدائش بند کرنا قتل اولاد کے حکم میں ہے۔ اور قتل اولاد ہر حال میں منع ہے اور برا ہے۔ تو معنے یہ ہوئے کہ املاق کی وجہ سے قتل اولاد (یعنی اس کی پیدائش کو روکنا) منع ہے۔ البتہ بعض اور صورتوں میں جائز بھی ہو سکتا ہے مثلاً عورت بیمار ہو اس وقت جائز ہوگا کہ اولاد پیدا کرنا بند کر دے۔ کیونکہ جس چیز کی وجہ سے قتل اولاد کو روکا گیا ہے۔ وہ غیر محسوس ہے ایسی وجہ کی بناء پر اولاد کی پیدائش کو روکنا ناجائز ہے لیکن کسی محسوس اور مشاہد نقصان کی وجہ سے اولاد کی پیدائش کو روکنا منع نہیں۔

علاوہ پیدائش میں روک ڈالنے کے جو بچہ بن چکا ہو بعض حالات میں اس کا مارنا بھی جائز ہوتا ہے مثلاً کسی حاملہ عورت کے متعلق زچگی کے وقت یہ شبہ ہو کہ اگر بچہ کو طبعی طور پر پیدا ہونے دیا گیا تو والدہ فوت ہو جائے گی اس صورت میں بچہ کو ضائع کر دینا جائز ہے کیونکہ بچہ کے متعلق نہیں کہہ سکتے کہ وہ مردہ پیدا ہوگا یا زندہ۔ یا زندہ رہے گا یا نہیں۔ مگر ماں سوسائٹی کا ایک مفید وجود ہے اس لئے وہمی نقصان سے حقیقی نقصان کو زیادہ اہمیت دی جائے گی اور بچہ کو تلف کر دیا جائے گا۔

لَا تَقْتُلُوْٓا کے بعد خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ لگانے کی وجہ غرض لَا تَقْتُلُوْٓا کے الفاظ استعمال کرنے کے بعد خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ کی شرط لگا کر قرآن کریم نے اولاد کی تربیت، اس کی پرورش، ماں کی پرورش اور اس کی زندگی کی قیمت کے متعلق ایک وسیع مضمون بیان کیا ہے اور ایسے مختصر الفاظ میں کہ اس کی مثال دوسری کتاب میں نہیں مل سکتی بلکہ حق یہ ہے کہ یہ مضمون ایسا اچھوتا ہے کہ دوسری کسی مذہبی کتاب نے اسے چھوا تک نہیں۔

خِطْاً کے معنے اس آیت میں جو خِطْاً کا لفظ استعمال کیا گیا ہے گو اس کا مادہ اور خَطَاً کا مادہ ایک ہی ہے لیکن خِطْاً جو خ کی زیر کے ساتھ ہے اس کے معنوں اور خَطَاً جس میں خ پر زبر ہے اس کے معنوں میں فرق کیا جاتا ہے۔ خِطْاً کے معنے اَلْاِثْمُ مَا تُعُمِّدَ مِنْہُ کے ہیں۔ اور خَطَاً کے معنے مَالَمْ یَتَعَمَّدْ مِنْہُ اَوْ تَعَمَّدَ کے ہیں۔ یعنی اگر خ پر فتح یعنی زبر ہو تو دیدہ دانستہ گناہ اور نادانستہ قصور دونوں معنوں میں مستعمل ہوگا۔ اور اگر خ کے نیچے کسرہ یعنی زیر

ہوتو اس سے مراد صرف وہ گناہو گا۔جس میں ارادہ پایا جائے اس لفظ سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اولاد کا قتل ایک ایسا جرم ہے کہ جس کو فطرت بھی رد کرتی ہے یعنی جس کے احساسات طبعی مر چکے ہوں وہی ایسا فعل کرسکتا ہے ۔دوسرا نہیں کرسکتا ۔اِنَّہٗ کَانَ خِطۡاً کَبِیۡرًا کے الفاظ بھی بتاتے ہیں کہ یہاں وہ قتل مراد نہیں جو زہر یا آلہ سے کیا جاتا ہے کیونکہ یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ قتل کثرت سے پایا جاتا ہے مگر اپنے ہاتھوں بچوں کا قتل ہرگز کسی ملک میں بھی ایسے رنگ میں نہیں پایا جاتا کہ اسے قومی جرم قرار دیا جائے اس امر کا ثبوت کہ یہ عام قتل سے جدا قسم کا قتل ہے یہ بھی ہے کہ قتل کے خلاف حکم آگے چل کر بیان کیا گیا ہے۔اس میں بچوں کا قتل بھی شامل ہے پس ظاہر ہے کہ اس جگہ قتل سے مراد کچھ اور ہے۔

اس آیت میں نَحۡنُ نَرۡزُقُھُمۡ وَ اِیَّاکُمۡ فرما کر اس امر پر زور دیا ہے کہ انسان کے رزق میں اس کی اولاد کا رزق شامل ہے پس اس سے محروم نہیں کرنا چاہیے اسی وجہ سے نَرۡزُقُھُمۡ کو پہلے رکھا اور باپ کے رزق کو بعد میں بیان کیا ہے۔

وَ لَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً ؕ وَ سَآءَ سَبِیۡلًا ﴿۳۳﴾

اور زنا کے قریب (بھی) نہ جاؤ وہ یقیناً ایک کھلی بے حیائی اور بہت برا راستہ ہے۔

حلّ لُغات۔**فَاحِشَۃ** فَاحِشَۃٌ کے معنے ہیں مَایَشۡتَدُّ قُبۡحُہٗ مِنَ الذُّنُوۡبِ ۔ہر وہ غلطی جو بہت بُری ہو۔وَقِیۡلَ کُلُّ مَا نَھَی اللّٰہُ عَنۡہُ۔ ہر وہ بات جس سے اللہ نے روکا ہے۔(اقرب)

تفسیر ۔اس آیت میں زنا سے بچنے کا حکم قتل اولاد کے ذکر کے بعد دیا ہے۔اس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ زنا سے بھی اولاد کا قتل ہوتا ہے ۔کیونکہ اول تو حرام کی اولاد کو عام طور پر ضائع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔دوسرے اگر ضائع نہ بھی ہو تب بھی اس کی تربیت اور پرورش میں مرد کھل کر حصہ نہیں لے سکتا۔اور وہ اولاد بالعموم بغیر والی وارث کے رہ کر تباہ ہو جاتی ہے۔

وَ لَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤی میں لفظ قرب کے استعمال میں حکمت لَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤی کے الفاظ استعمال کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ مواقع زنا پیدا ہی نہ ہونے دو۔یعنی نامحرم عورتوں سے الگ نہ ملو۔ان سے زیادہ خلا ملا نہ رکھو وغیرہ وغیرہ۔قرآن کریم کی یہ بہت بڑی فضیلت ہے کہ وہ نہ صرف گناہ سے روکتا ہے بلکہ گناہ سے بچنے کے ذرائع

بھی بتا تا ہے اور ایسی ہی تعلیم بنی نوع انسان کی حفاظت کر سکتی ہے۔ جو کتاب گناہ سے بچنے کے ذرائع نہیں بتاتی وہ انسان کو ایک پریشانی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اطمینان وہی کتاب پیدا کر سکتی ہے جو کسی بات سے منع کرنے کے ساتھ ہی اس سے بچنے کے ذرائع بھی بتا دے تا انسان کو تسلی ہو کہ میں اس حکم پر عمل کر سکوں گا۔ انجیل کہتی ہے کہ تو کسی عورت کو بدنظری سے نہ دیکھ۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ تو کسی نامحرم عورت کی طرف نظر اٹھا کر ہی نہ دیکھ۔ کیونکہ وہ کشش جو انسان کے دل میں لغزش پیدا کرتی ہے۔ جب اس کے لئے راستہ کھول دیا جائے تو حفاظت ناممکن نہیں تو نہایت مشکل ضرور ہو جاتی ہے۔ اس حکمت کے ماتحت اس جگہ فرمایا ہے کہ تم گناہ کے مقام سے اتنی دور کھڑے رہو۔ کہ جہاں سے تم بدی کا مقابلہ کر سکو۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ تو بزدلی ہے۔ مگر یہ بزدلی نہیں یہ تو احتیاط ہے اور احتیاط کو کوئی عقلمند بزدلی نہیں کہتا۔

ظاہر ہے کہ انسان دو ہی قسم کے ہو سکتے ہیں۔ اول وہ جو گناہ کے پاس جا کر بھی بچ سکتا ہے۔ ایسے شخص کو گناہ کے مقام سے دور رہنے کی اس لئے تاکید کی۔ کہ گو یہ تو بچ سکتا ہے مگر ممکن ہے۔ کہ اس کی طرف دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اس مقام تک چلے جائیں۔ اور اپنی کمزوری کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہو جائیں۔ پس ایسے شخص کو لوگوں کے لئے ٹھوکر کا موجب نہ بننا چاہیے۔

دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو گناہ کے مواقع پیدا ہونے کی صورت میں اس سے بچ ہی نہیں سکتے۔ ان کو اس سے قریب بھی نہ جانے دینے کی حکمت تو ظاہر ہی ہے۔ پس خواہ انسان گناہ کے قریب ہو کر بچ سکتا ہو۔ خواہ نہ بچ سکتا ہو۔ دونوں صورتوں میں اس کو گناہ کے قریب تک بھی نہیں جانا چاہیے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جس مقام کی طرف جانے میں کوئی خاص فائدہ مدنظر ہو اس کی طرف نہ جانا بزدلی کہلا سکتا ہے۔ مگر جس جگہ کی طرف جانا یا نہ جانا کوئی خاص فائدہ نہ رکھتا ہو اس سے الگ رہنا ہرگز بزدلی نہیں کہلا سکتا۔

سَآءَ سَبِيْلًا کے الفاظ میں زنا کے نقصانات کی طرف اشارہ

سَآءَ سَبِيْلًا ان الفاظ سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ علاوہ اخلاقی گناہ ہونے کے زنا میں اور بھی بہت سے نقصانات ہیں۔ جو انسان شادی کرتا ہے وہ ضرور احتیاط کر لیتا ہے کہ ایسی لڑکی سے شادی کرے جس کی صحت اچھی ہو۔ اسے کوئی متعدی مرض نہ ہو۔ عادات و اخلاق اچھے ہوں۔ اسی طرح لڑکی کے رشتہ دار لڑکے کے متعلق سوچ سمجھ لیتے ہیں۔ مگر زنا میں یہ احتیاط نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ زنا ہوتا ہی شہوانی جذبات کے جوش میں آجانے کی صورت میں ہے اور اس وقت انسان کسی قسم کی احتیاط نہیں کر سکتا جس کا نتیجہ کئی قسم کی امراض یا مالی تباہی کی صورت میں نکلتا ہے پس فرمایا شہوانی تقاضوں کے پورا کرنے کا یہ

راستہ نہایت خطرناک ہے۔

یہ امر روزانہ تجربہ میں آ رہا ہے کہ گو بیوی سے جو تعلق خاوند پیدا کرتا ہے اسی قسم کا تعلق زانی، زانیہ سے کرتا ہے۔لیکن باوجود اس کے زنا کے نتیجہ میں جس قسم کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں وہ بیوی کی صورت میں نہیں پیدا ہوتیں یا بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔دنیا میں جس قدر لوگ آتشک یا سوزاک کی مرضوں میں مبتلا ہوتے ہیں ان میں سے کس قدر بیویوں سے اس مرض کو قبول کرتے ہیں؟ شاید سو میں سے ایک بھی نہیں۔بقیہ ننانوے فی صدی یا اس سے زیادہ حصہ ان مریضوں کا زنا سے مرض کو حاصل کرتا ہے۔اور جو مرض میاں یا بیوی کو ایک دوسرے سے لگتی ہے وہ بھی درحقیقت کسی پہلے زنا کے نتیجہ میں ہوتی ہے پس سَآءَ سَبِیْلًا کہہ کر ایک زبردست سچائی کی طرف انسان کو توجہ دلائی ہے جو ہے تو ہر اک کے سامنے لیکن اس کی طرف توجہ بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ

اور جس جان کو (مارنا) اللہ (تعالیٰ) نے حرام ٹھہرایا ہے اسے (شرعی) حق کے سوا قتل نہ کرو اور جو شخص مظلوم مارا جائے

قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی

اس کے وارث کو ہم نے (قصاص کا) اختیار دیا ہے۔پس (اس کے لئے یہ ہدایت ہے کہ) وہ (قاتل کو) قتل کرنے

الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۴﴾

میں (ہماری مقرر کردہ) حد سے آگے نہ بڑھے (اگر وہ حد کے اندر رہے گا تو) یقیناً (ہماری) مدد اس کے شامل حال ہوگی

حلّ لُغات۔سُلْطَان سُلْطَانٌ کے لئے دیکھو ابراہیم آیت نمبر ۱۲۔

السُّلْطَانُ: اَلْحُجَّةُ۔ سلطان کے معنے ہیں دلیل۔اَلتَّسَلُّطُ۔قبضہ وَقُدْرَةُ الْمَلِكِ۔بادشاہ کی طاقت۔ (اقرب)

لَا یُسْرِفْ لَا یُسْرِفْ اَسْرَفَ سے نہی غائب کا صیغہ ہے اور اَسْرَفَ فِیْ كَذَا کے معنے ہیں۔جَاوَزَ الْحَدَّ فِیْهِ وَاَفْرَطَ۔حد سے تجاوز کر گیا۔(اقرب) پس فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ کے معنے ہوں گے کہ وہ قتل کرنے میں مقررہ حد سے آگے نہ بڑھے۔

تفسیر۔ بغیر حق کسی کو قتل کرنا منع ہے اوپر کی دو آیتوں میں قتل کے دونوں مخفی ذرائع بیان کئے تھے۔اب کھلے قتل کے بارہ میں حکم بیان فرمایا گیا ہے۔چنانچہ فرماتا ہے کہ کسی جان کو جس کے قتل کو خدا تعالیٰ نے حرام کیا ہے قتل نہ کرنا چاہیے۔ بِالْحَقِّ اس لئے فرمایا کہ نفس ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو سانس لیتی ہو اور اس لئے سب جاندار اس میں شامل ہیں۔بلکہ آج کل کی سائنس کی تحقیق کے رو سے تو نباتات کے بارہ میں بھی سانس کا لینا ثابت ہے (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Plant)۔پس نفس کے ساتھ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ رکھ دیا۔کیونکہ دوسری چیزوں کا قتل اپنی ذات میں حرام نہیں گو بعض وجوہات سے حرام ہو جاتا ہے مثلاً حرم شریف میں کسی جانور کو قتل نہ کرنا چاہیے۔اسی طرح اگر کوئی جانور کسی دوسرے کی ملکیت میں ہو تو اس کو بھی قتل کرنا حرام ہے۔اسی طرح ذبح کے طریق کے سوا جو حلال جانوروں کے لئے جائز ہے اور بعض طریقوں سے جانوروں کا قتل بھی ناجائز ہے۔پس اِلَّا بِالْحَقِّ کہہ کر ایک تو انسان کو اس حکم کے لئے مخصوص کر دیا۔دوسرے انسانوں میں سے ان کو حکم سے باہر نکال دیا۔جن کا بعض اسباب کے ماتحت مارنا جائز ہو مثلاً قاتل یا جو لوگ دوسرے کو قتل کرنے کے لئے حملہ آور ہوں وغیرہ وغیرہ۔

حق کی تشریح بِالْحَقِّ کے لفظ سے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق ملے اس وقت قتل جائز ہے۔گویا نہی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی اور اجازت بھی اسی کی طرف سے ہونی چاہیے۔اس شرط سے مواقع جنگ کو محدود کر دیا گیا ہے۔اسی طرح حکومت کے اختیارات جان لینے کے متعلق محدود کر دئے گئے ہیں۔

اس شرط کی وجہ سے اگر کوئی دایہ یہ کہے کہ چونکہ بچہ کی والدہ نے کہا تھا کہ بچہ کو مار ڈال اس لئے میں نے مار ڈالا یا کوئی حاکم کسی کو جبراً مروا دے تو وہ جرم سے بری نہیں سمجھے جائیں گے۔کیونکہ قتل اسی صورت میں جائز ہے جبکہ اس جان کو پیدا کرنے والے کی طرف سے قتل کرنے کا حق کسی کو عطا ہوا۔

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ۔اور جو مظلوم قتل کیا جاوے ہم نے اس کے ولی کو غلبہ یا حجت دی ہے۔

ولی کے معنی ولی ہر وہ شخص ہے جو کسی کی وراثت کا حقدار ہو۔اور ایسے شخص کو بھی ولی کہتے ہیں کہ جس کو وہ خود مقرر کر دے۔جیسے کہ مروی ہے کہ جب دشمن حضرت عثمانؓ کے خلاف منصوبے کر رہے تھے۔حضرت معاویہؓ نے ان سے درخواست کی کہ آپ مجھے اپنا ولی بنا دیں تا کہ ان لوگوں پر رعب ہو اور وہ سمجھیں کہ عثمان کے قتل کا بدلہ لینے والا ایک شخص موجود ہے۔تو اس کے جواب میں حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ تمہارے متعلق احتمال ہے کہ تم مسلمانوں پر سختی کرو گے میں تم کو ولی نہیں مقرر کرتا۔اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ ایسا ولی بنانا جائز ہے۔

سلطان سے مراد سُلْطَان سے مراد غلبہ یا حجت ہے یعنی تم نے اس کے ولی کو اختیار دیا ہے کہ وہ گورنمنٹ کے پاس شکایت کرے اور اپنا حق لے لیوے اور پھر حاکم کے فیصلہ کر چکنے کے بعد خواہ قاتل کو قتل کرے خواہ معاف کرے۔لیکن اگر گورنمنٹ سمجھے کہ مقتول کا ولی شرارت سے معافی دے رہا ہے تو پھر اسے بھی حق ہے کہ وہ قتل کی سزا جاری کر دے۔کیونکہ اپنے حقوق کو جائز طور پر ادا نہ کرنے کی صورت میں یا بوجہ خوف ادا نہ کراسکنے کی صورت میں ولایت حکومت کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

قصاص میں ذاتی حق کے علاوہ قومی حق بھی ہوتا ہے تمام قصاص کے مسائل میں یہ حکم جاری ہے اور اس کی ایک عمدہ مثال حضرت علیؓ کے عمل سے ملتی ہے آپ نے ایک دفعہ دیکھا کہ ایک شخص نے دوسرے کو پیٹا ہے۔ حضرت علیؓ نے اس کو روکا اور مضروب کو کہا کہ اب تم اس کو مارو۔مگر مضروب نے کہا کہ میں اس کو معاف کرتا ہوں۔حضرت علیؓ نے سمجھ لیا کہ ڈر کے مارے اس نے اسے مارنے سے انکار کیا ہے کیونکہ وہ مارنے والا بڑا جبار شخص تھا۔اس لئے آپ نے فرمایا تم نے اپنا ذاتی حق معاف کر دیا ہے مگر میں اب قومی حق کو استعمال کرتا ہوں۔اور اُسے اسی قدر پٹوا دیا جس قدر کہ اس نے دوسرے کمزور شخص کو پیٹا تھا۔

قاتل کے حقوق کی حفاظت یہ جو فرمایا کہ فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ اس میں قاتل کے حقوق کی حفاظت کی ہے۔ قصاص میں کئی قسم کی زیادتیاں ہوسکتی ہیں (۱) تکلیف سے قتل کیا جاوے مثلاً کسی کو جلاد مقرر کیا جائے اور وہ کُند آلہ سے قتل کرے (۲) موقعہ معافی کا ہو مگر وہ زور دے کہ نہیں میں ضرور ہی قتل کروں گا۔اسی طرح اور کئی طریقے اسراف کے ہو سکتے ہیں۔

مقتول کے ورثاء کو معاف کرنے کی تلقین لَا يُسْرِفْ کے الفاظ سے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ گو جان کے بدلہ میں جان کا عام قانون ہے۔مگر وارثانِ مقتول کو ہمیشہ قتل کے بعد قتل پر عمل نہیں کرنا چاہیے اور قتل کے فعل کو بڑھانا نہیں چاہیے۔یعنی جہاں تک ہو سکے قاتل کو اگر کسی طرح بھی اس کی اصلاح کی امید کی جاسکتی ہو۔معاف کر دینا چاہیے۔اس حکم سے اسلام نے ملک کے امن کی بنیاد قائم کر دی ہے۔دنیا کا امن دو غلطیوں میں سے ایک کی وجہ سے برباد ہوتا ہے۔یا تو جب قاتلوں کو ان کے کئے کی سزا نہیں ملتی یا جب اندھا دھند سزا دی جاتی ہے۔بعض دفعہ معاف کر دینا ہی آئندہ امن پیدا کرنے کا موجب ہوسکتا ہے۔مگر موجودہ قانون وارثان مقتول کو ایسا کوئی اختیار نہیں دیتا اور ہر قتل کے بدلہ میں قتل ہی کرتا ہے۔اس سے ملک کا امن برباد ہوتا ہے اور دشمنیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ اگر اسلامی تعلیم پر عمل ہوتا تو قتل بہت کم ہو جاتا اور بُغض کم ہو جاتے۔

شرعاً کسی کو آپ ہی مجرم قرار دے دینا منع ہے یہ بھی یاد رہے کہ شرعاً یہ بھی منع ہے کہ کوئی شخص آپ ہی کسی کو مجرم قرار دے کر اُسے سزا دے دے۔ اگر کوئی ایسا کرے تو یہ بھی اسراف فی القتل سمجھا جائے گا۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ قَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اِنْ وَجَدْتُ مَعَ اِمْرَ أَتِیْ رَجُلًا أُمْهِلُهٗ حَتّٰی آتِیَ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ قَالَ نَعَمْ (مسند احمد بن حنبل مسند ابو ھریرۃؓ) ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ اگر میں کسی شخص کو اپنی بیوی کے پاس دیکھوں تو اسے قتل کروں یا انتظار کروں اور چار گواہ لا کر ثبوت بہم پہنچاؤں۔ آپؐ نے فرمایا۔ چار گواہ لاؤ۔ ایک اور حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ اگر تم خود ہی قتل کرو گے تو قتل کے مرتکب سمجھے جاؤ گے۔ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا۔ میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ کیونکہ اس کے معنے ہیں کہ مقتول کے ولی کو حکومت کی طرف سے مدد دی جائے گی اس لئے خود ہی فیصلہ اور خود ہی اجراء نہ کرے بلکہ حکومت کے ذریعہ فیصلہ کرائے۔

اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا کے الفاظ میں لَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ کی دلیل بھی بیان کی گئی ہے۔ یعنی وارث کو یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا میں امن قائم رکھنے کا فرض اس کے ذمہ بھی ہے۔ پس چاہیے کہ وہ بھی ظلم نہ کرے اور یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے حقوق کی حفاظت کی ہے۔ پس اسے بھی دوسروں کے حقوق کا خیال رکھنا چاہیے اور جس حکومت نے اس کے حقوق کی حفاظت کی ہے ظلم کر کے اس کے نظام میں خلل نہیں ڈالنا چاہیے۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى

اور تم اس طریق کے سوا جو (یتیم کے حق میں) زیادہ اچھا ہو (کسی اور طور پر) یتیم کے مال کے پاس (تک بھی) نہ

يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ

پھٹکو یہاں تک کہ وہ اپنی مضبوطی کی عمر کو پہنچ جائے۔ اور (اپنے) عہد کو پورا کرو (کیونکہ) ہر عہد کی نسبت یقیناً

مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۵﴾

(ایک نہ ایک دن) باز پُرس ہوگی۔

حلّ لُغَات۔ اَلْعَهْدُ اَلْعَهْدُ کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۲۱۔

اَلْعَھْدُ۔ اَلْوَصِیَّۃُ۔ وصیت اَلْیَمِیْنُ یَحْلِفُ بِھَا الرَّجُلُ۔ قسم۔ اَلْمَوْثِقُ۔ پختہ بات۔ اَلْمِیْثَاقُ۔ پختہ اقرار۔ اَلَّذِیْ یَکْتُبُہٗ وَلِیُّ الْاَمْرِ لِلْوُلَاۃِ اِیْذَانًا بِتَوْلِیَتِھِمْ۔ بادشاہ اپنے ماتحت افسران کو جوان کی تقرری کا حکم نامہ لکھ کر دیتا ہے۔(اقرب)

تفسیر۔ بچے زیادہ طور پر اتفاقی حادثات کے نتیجہ میں یتیم ہوتے ہیں جن میں قتل، وبائیں وغیرہ شامل ہیں۔ پس قتل کے حکم کے بعد جس سے دو گھروں میں بچے یتیم رہ جائیں گے مقتول کے گھر میں بھی اور قاتل کے گھر میں بھی۔ جب وہ قتل کی سزا میں قتل کیا جائے گا۔ یتامیٰ کے حقوق کو بیان کیا۔

یتامیٰ کے مال کی حفاظت کا طریق اس بارہ میں فرماتا ہے کہ یتامیٰ کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اِلَّا بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ یعنی صرف ایک طریق ایک کے مال پر تصرف کرنے کا ہے کہ اس سے بہتر سے بہتر نتیجہ پیدا کیا جائے۔ یعنی صرف یہی نہیں کہ ان کے مال کو ناجائز طور پر استعمال نہ کرو بلکہ ان کو اس طرح استعمال کرو کہ وہ مال بڑھیں اور یتیموں کا فائدہ ہو اس آیت میں اسلامی نظام کا ایک اور ایسا حکم بیان کیا گیا ہے جس میں اسلام دوسرے مذاہب سے ممتاز اور منفرد ہے یتیموں سے حسن سلوک کا حکم تو سب مذاہب میں ملتا ہے۔ لیکن یہ حکم کہ ان کے اموال کی حفاظت کرواوران کو بڑھانے کی کوشش کرو۔ کسی اور مذہب میں نہیں ملتا۔ گویا اس آیت میں ایک عام کورٹ آف وارڈز مقرر کیا گیا ہے یعنی نابالغوں کی جائداد کی حفاظت کرنے والا محکمہ۔ آج کل مغربی حکومتوں کے ماتحت اس حکم پر عمل ہو رہا ہے۔ مگر اس خیال کی بنیاد اسلام نے ہی آج سے تیرہ سو سال پہلے قائم کی ہے۔

یتیم کی حد جوانی سے مراد حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّہٗ سے یہ مراد نہیں کہ جب وہ جوان ہو جائیں۔ تو ان کے اموال کھانے جائز ہیں۔ کیونکہ اول تو یتیم جب بڑا ہو جائے گا تو وہ اپنا مال کھانے ہی کیوں دے گا۔ دوسرے یہ خلاف عقل ہے کہ جب تک یتیم اپنے مال کو استعمال نہ کر سکتا تھا۔ اس وقت تک تو اس کے مال کو بڑھایا جائے اور جب اس کے استعمال کرنے کا موقعہ آئے تو اس کو کھانا شروع کر دیا جائے۔ اسلام کسی کا مال کھانے کی اجازت نہیں دیتا خواہ وہ یتیم ہو یا غیر یتیم۔ پس اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ جب تک وہ عقل کی اس حد کو نہ پہنچ جائے کہ وہ خود اپنے مال کو سنبھال سکے اس وقت تک حفاظت کرنی چاہیے اور درمیان میں ہی اس کی حفاظت نہ چھوڑ دینی چاہیے۔ مثلاً جب دس بارہ سال کا ہو گیا تو کہہ دیا کہ اب بڑا ہو گیا ہے خود مال سنبھال لے گا۔ غرض جوانی تک پہنچنے کی قید اس لئے نہیں کہ اس کے بعد بے شک اس کا مال کھاؤ۔ بلکہ یہ قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ پوری جوانی سے پہلے جبکہ وہ مال کی حفاظت کے قابل ہو جائے۔ رشتہ داروں یا حکومت کو اس کی امداد چھوڑ نہ دینی چاہیے۔ دوسرے ان الفاظ سے اس

طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب وہ اپنی بلوغت کو پہنچ جاوے اور اپنی اس عقل کو پہونچ جاوے کہ جس میں وہ اپنے مال کی حفاظت کر سکتا ہو تو اس وقت اس کے مال کو یہ کہہ کر کہ ابھی چھوٹا ہے دبا نہیں چھوڑ نا چاہیے۔ غرض حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ نے دونوں صورتوں سے جو یتیم کو نقصان پہنچانے والی ہیں اس کے رشتہ داروں اور حکومت کو روک دیا ہے ایسے بہت سے نظارے دنیا میں ملتے ہیں کہ رشتہ دار ایک مدت تک یتامیٰ کا کام کرنے کے بعد تھک کر کام چھوڑ بیٹھتے ہیں اور یتامیٰ کا نقصان ہوجاتا ہے یا وہ جوان ہوجاتے ہیں لیکن ان کا حق ان کو نہیں دیا جاتا۔ ریاستوں میں ایسے نظارے بہت دیکھنے میں آتے ہیں کہ رئیس جوان ہوجاتا ہے مگر جو افسر ریاست کے انتظام کے لئے مقرر ہوتے ہیں اپنے ذاتی اغراض کو پورا کرنے کے لئے انہیں نابالغ یا غیر عاقل ہی قرار دیتے جاتے ہیں۔

اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ کا یتامیٰ کے ذکر سے تعلق وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ۔ اپنے عہد کو پورا کرو۔ بظاہر تو یہ فقرہ یتامیٰ کے ذکر میں بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یتیم کا عہد سے کوئی خاص تعلق نظر نہیں آتا۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں کیونکہ (۱) عہد کے معنے ذمہ واری کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ فُلَانٌ وَلِيَ الْعَهْدَ۔ یعنی حکومت کی ذمہ واری کا ولی ہے ان معنوں کے رو سے اس جملہ کے معنی ہوں گے۔ کہ یتامیٰ کے متعلق اپنی ذمہ واری کو پورا کرو۔ جب تک ان کے مال کے انتظام کی ضرورت ہے انتظام کرو۔ اور جب ان کا مال ان کے سپرد کرنے کا وقت آئے تو ان کا مال انہیں دے دو۔ دوسرے اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ یتامیٰ کے اموال کی حفاظت کوئی احسان نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا حکم اور اسلامی نظام کا ایک حصہ ہے۔ اس لئے احسان سمجھ کر اس کام کو نہ کرو بلکہ فرض سمجھ کر کرو۔ (۲) چونکہ یتیم اپنے مال کی کمی بیشی کے متعلق کچھ دریافت نہیں کر سکتا اس لئے خدا تعالیٰ نے یتیم کے مال کو اپنے عہد میں شامل کر لیا ہے تا کہ کوئی یہ سمجھ کر مال کو کھا نہ جاوے کہ اگر ہم کھا جائیں گے تو کون پوچھے گا۔ اس لئے فرمایا کہ اگر کوئی ایسا کرے گا تو ہم پوچھیں گے یہ ہمارا عہد ہے۔

(۳) یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یتیم کا ذکر کر کے ان لوگوں کا ذکر بھی ساتھ کر دیا جو یتامیٰ تو نہیں ہوتے مگر یتامیٰ سے مشابہ ہوتے ہیں۔ مثلاً کمزور اقوام جو اپنے آپ کو طاقتور اقوام کی حفاظت میں دے دیتی ہیں۔ پس یتامیٰ کے ذکر کے ساتھ ان کے حقوق کی طرف بھی توجہ دلائی کہ بعض اقوام بمنزلہ یتامیٰ ہوتی ہیں اور ان کے حقوق تمہارے قبضہ میں آجاتے ہیں۔ بیشک تمہارا فرض ہے کہ اس وقت تم ان کے حقوق کی نگہداشت کرو لیکن ہمیشہ کے لئے ان پر تصرف قائم نہ رکھو بلکہ جب ان میں اہلیت پیدا ہوجائے انہیں ان کے مال سپرد کر دو۔ اگر دنیا اس حکم پر عمل کرے تو یہ قومی تنافر جو آج پیدا ہو رہا ہے یکدم دور ہوجائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض وقت ایک زبردست قوم

کمزور قوم کے حقوق کی حفاظت کے لئے اس کی نگرانی کا کام اپنے ہاتھ میں لینے پر مجبور ہو جاتی ہے مگر اس کا فرض ہونا چاہیے کہ اس ماتحت قوم کے اندر صلاحیت پیدا ہو جانے پر جلد سے جلد اسے اپنے اموال میں تصرف دے دے اور اس کی بلوغتِ قومی کے بعد اس کے ملک اور مال پر قبضہ نہ رکھے۔

وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَ زِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ

اور جب تم (کسی کو کچھ) ماپ کر دینے لگو تو ماپ پورا دیا کرو اور (جب تول کر دو تو) سیدھے ترازو کے ساتھ تول کر دو

ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۳۶﴾

یہ بات سب سے بہتر اور انجام کے لحاظ سے سب سے اچھی ہے۔

حلّ لُغات۔ اَلْكَيْلُ کے لئے دیکھو یوسف آیت نمبر ۶۰۔

اَلْكَيْلُ: كَالَ الطَّعَامَ كَيْلًا وَاِكْتَالَهُ بمعنٰی كَيْلُ كَالَ میں سے ہے اور كَالَ اور اِكْتَالَ دونوں کے معنے ہیں۔ ماپا۔

ثعلب امام لغت و دیگر محققین کا اختلاف چنانچہ ثعلب امام لغت کا یہی قول ہے وَقَالَ غَيْرُهُ اِكْتَلْتُ عَلَيْهِ: اَخَذْتُ مِنْهُ اور باقی محققین لغت کہتے ہیں کہ یہ معنی علیٰ کی وجہ سے نہیں۔ اِکْتَالَ کے معنی ہی یہی ہیں اور اس کا صلہ علیٰ ہوتا ہے۔ يُقَالُ كَالَ الْمُعْطِيْ وَاكْتَالَ الْاٰخِذُ. كَالَ کا لفظ ماپ کر دینے کے لئے مخصوص ہے۔ اور اِکْتَالَ کا لفظ لینے کے لئے۔ كَالَهُ طَعَامًا وَ كَالَ لَهُ بِمَعْنًى اور كَالَ بغیر صلہ کے بھی متعدی ہوتا ہے اور صلہ لام کے ساتھ بھی۔ اور دونوں صورتوں میں معنے ایک ہی ہوتے ہیں۔ یعنی ماپ کر دیا۔ وَالْكَيْلُ وَالْمِكْيَلُ: مَا كِيْلَ بِهٖ حَدِيْدًا كَانَ اَوْ خَشَبًا اور کَیْلُ کے ایک معنے لفظ مِکْیَلٌ کی طرح ماپنے کے آلہ کے بھی ہیں خواہ لوہے کا ہو یا لکڑی کا۔ وَكَالَ الدَّرَاهِمَ وَزَنَهَا سکوں کے ساتھ یہ لفظ آئے تو اس کے معنے وزن کرنے کے ہوتے ہیں۔ كُلُّ مَا وُزِنَ فَقَدْ كِيْلَ وزن کرنے کا دوسرا نام کیل بھی ہے۔ اس لئے ہر تولنے کی چیز کے لئے وزن کی بجائے کیل کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے۔ (تاج)

قِسْطَاس قِسْطَاسٌ کے معنے ہیں۔ اَلْمِيْزَانُ۔ ترازو۔ وَاَقْوَمُ الْمَوَازِيْنَ وَقِيْلَ هُوَ مِيْزَانُ الْعَدْلِ سیدھا اور درست ترازو (اقرب)

تفسیر ۔ چونکہ پچھلی آیت میں حقوق کی واپسی کا حکم دیا تھا۔ اس لئے اس کے ساتھ ملتا ہوا حکم اس کے بعد بیان کر دیا اور فرمایا کہ جس طرح یتیم کو اس کا مال ادا کرنے کا حکم ہے اسی طرح آپس کے کاروبار میں ایک دوسرے کا حق پورا ادا کرنے کا بھی ہم حکم دیتے ہیں۔

ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ عمل دینی لحاظ سے بھی بہت بہتر ہے اور دُنیوی انجام کے لحاظ سے بھی۔ کیونکہ جس تاجر کے متعلق لوگوں کو علم ہو جائے کہ وہ کم تولتا ہے یا جس قوم کے متعلق یہ یقین ہو جائے کہ اس کا لین دین اچھا نہیں اس کی تجارت کو آخر نقصان پہنچ جاتا ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ

اور (اے مخاطب) جس بات کا تجھے علم نہ ہو اس کی اتباع نہ کیا کر (کیونکہ) کان اور آنکھ اور دل

الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۷﴾

ان سب کے متعلق پوچھا جائے گا۔

حلّ لُغات ۔ لَا تَقْفُ لَا تَقْفُ قَفَا سے نہی مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور قَفَا أَثَرَهٗ (يَقْفُوْ) کے معنے ہیں۔ تَبِعَهٗ۔ اس کی پیروی کی۔ قَفَا فُلَا نًا بِاَمْرٍ: اٰثَرَهٗ بِهٖ۔ کسی چیز کے متعلق اسے ترجیح دی۔ (اقرب) پس لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ کے معنے ہوں گے اے مخاطب تو اس کی پیروی نہ کر جس کا تجھے علم نہیں۔

تفسیر ۔ **بدظنی کی تشریح** اس سے یہ مطلب نہیں کہ کوئی نیا علم نہ سیکھو اور نئی تحقیقاتیں نہ کرو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بدظنی نہ کرو اور بغیر تحقیق کے دوسروں پر الزام نہ لگاؤ۔ چنانچہ اس کے آگے وہ اسباب جن سے بدظنی پیدا ہوتی ہے بیان کئے ہیں۔ یعنی کان آنکھ اور دل۔ بعض دفعہ انسان دوسرے کے متعلق بات سن کر اس بات کو پلے باندھ لیتا ہے اور بغیر تحقیق دشمنی شروع کر دیتا ہے۔ بعض دفعہ ایک واقعہ دیکھتا ہے اور اس سے غلط نتیجہ نکال لیتا ہے اور یہ تحقیق نہیں کرتا کہ ممکن ہے کہ اس فعل کی کوئی جائز وجہ ہو جسے دیکھ کر اس نے بُرا سمجھ لیا۔ اور بعض آپ ہی آپ اپنے دل میں ایک بات پیدا کر لیتے ہیں۔ ان سب باتوں سے روکا اور فرمایا کہ ظنی باتوں کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے۔

بدظنی کے موجبات بدظنی کے موجبات میں کان سب سے بڑا موجب ہے۔ زیادہ تر لوگوں سے باتیں سن کر

لوگ بدظنی کرتے ہیں۔اس لئے اس کا ذکر پہلے کیا۔اس کے بعد دوسرا بڑا ذریعہ آنکھ ہے اسے دوسرے نمبر پر بیان کیا۔اس کے بعد انتہاء کی بدظنی کرنے والا شخص وہ ہوتا ہے کہ نہ شکایت سنتا ہے نہ کوئی بات مشتبہ دیکھتا ہے بلکہ آپ ہی آپ دل میں ایک وجہ بنا کر دوسروں کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔اس کو سب سے آخر میں رکھا کہ یہ موجب سب سے کم ہے۔کیونکہ خطرناک مریض عام مریضوں سے ہمیشہ کم ہوتے ہیں۔

اِنَّ السَّمْعَ الخ۔اس جملہ سے یہ بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ مت خیال کرو کہ صرف مال وجان کے معاملہ میں ظلم میں گرفت ہوگی بلکہ انسانی عزت پر حملہ کے متعلق بھی پرسش کی جائے گی۔اگر کوئی کان دوسرے کی نسبت وہ بات سنے گا جس کے سننے کا اس کو حق نہ تھا تو اس پر بھی پرسش ہوگی۔اگر آنکھ اس بات کو دیکھنے کی کوشش کرے گی جس کے دیکھنے کا اس کو حق نہیں تو اس کے بارہ میں بھی پرسش ہوگی۔اگر کوئی دل ایسے خیالات رکھے گا جن کے رکھنے کا اسے حق نہیں تو اس کے متعلق بھی پرسش ہوگی۔یہ ایسی اعلیٰ درجہ کی پاکیزگی کی تعلیم ہے کہ اس پر عمل کر کے کسی قسم کا گند انسان میں باقی نہیں رہ سکتا۔

کسی فیصلہ کی بنیاد سوءِ ظن پر نہ ہو اس تعلیم میں اخلاق کے متعلق نہایت اعلیٰ تعلیم دی گئی ہے انسان کو اپنے فیصلوں کی بنیاد ظن پر نہیں رکھنی چاہیے بلکہ علم پر رکھنی چاہیے۔محض کان کی شہادت یا آنکھ کی شہادت یا دل کی شہادت کافی نہیں۔بلکہ تمام ذرائع سے تحقیق کر کے پھر فیصلہ کرنا چاہیے۔حضرت امام ابوحنیفہؒ کا ایک مشہور قول ہے کہ ’’اگر کسی میں ننانوے وجوہ کفر کے ہوں اور ایک وجہ ایمان کی تو اس کو کافر مت کہو‘‘۔اس پُرحکمت ارشاد کا یہی مطلب ہے کہ اگر ننانوے دلائل اس کے کفر کے ہوں اور ایک دلیل ایمان کی ہو تو بھی اسے کافر نہ کہو۔یہ مطلب ہرگز نہیں جیسا کہ بعض احمق خیال کرتے ہیں کہ ننانوے شرعی وجوہ کفر کے ہوں تب بھی اسے کافر نہ کہو۔کفر کے اسباب تو ہیں ہی سات آٹھ۔اللہ کا انکار۔ملائکہ کا انکار۔کتب سماویہ کا انکار۔انبیاء کا انکار۔دعا کا انکار۔قضاوقدر کا انکار اور حشر بعد الموت کا انکار۔پس اگر اس کے یہ معنے لئے جائیں کہ ننانوے اسباب کفر کے ہوں پھر بھی کافر نہ کہو تو کسی دہریہ کو بھی کافر نہیں کہا جاسکتا۔

وَ لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ

اور زمین پر اکڑ کر مت چل۔ تو نہ (تو) زمین کو پھاڑ سکتا ہے

وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۸﴾

اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پا سکتا ہے۔

حلّ لُغات۔ مَرَحًا مَرِحَ الرَّجُلُ (يَمْرَحُ) مَرَحًا کے معنے ہیں۔ اِشْتَدَّ فَرْحُهُ وَنَشَاطُهُ حتّٰى جَاوَزَ الْقَدْرَ وَتَبَخْتَرَ۔ حد درجہ کا خوش ہو کر متکبرانہ چال چلا۔ وَاخْتَالَ۔ اکڑ کر چلا۔ (اقرب) پس لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا کے معنے ہوں گے زمین پر اکڑ کر نہ چل۔

لَنْ تَخْرِقَ لَنْ تَخْرِقَ خَرَقَ سے مضارع واحد مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور خَرَقَ الثَّوْبَ کے معنے ہیں۔ مَزَّقَهٗ فَتَمَزَّقَ۔ کپڑے کو پھاڑا تو وہ پھٹ گیا۔ خَرَقَ الْمَفَازَةَ: قَطَعَهَا حَتّٰى بَلَغَ اَقْصَاهَا۔ جنگل کو طے کیا اور اس کے آخر تک پہنچا۔ (اقرب) پس لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ کے معنے ہوں گے۔ تو زمین کے سفر کو طے کر کے اس کے باہر نہیں نکل سکتا۔

تفسیر۔ پہلے اس وقت تک تو ان اخلاق کا ذکر فرمایا گیا تھا جن کا تعلق خدا تعالیٰ سے یا دوسرے انسانوں سے ہے۔ اب ان اخلاق کے متعلق ارشاد فرماتا ہے جو اس کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ کہ اگر تمہارے اندر کوئی خوبی کی بات ہو تو اس کو تکبر کا ذریعہ نہ بناؤ کیونکہ اس طرح تم نیکیوں سے محروم ہو جاؤ گے اور آئندہ ترقی کی طرف قدم نہ اٹھا سکو گے۔ کیونکہ جو متکبر ہو جاتا ہے وہ یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ میں نے انتہائی عروج پالیا ہے اور اس طرح وہ مزید ترقی سے محروم ہو جاتا ہے۔

دوسرے اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اے انسان تیری کامیابی آخر انسانی کامیابی ہے اس لئے اتنی ہی خوشی کر جو انسانوں کے لئے مقدر ہے اور یہ یاد رکھ کہ تو اپنے کمالات کے باوجود زمین کو نہیں پھاڑ سکتا یعنی اس کے باہر نہیں جا سکتا۔ عربی محاورہ ہے خَرَقَ الْمَفَازَةَ۔ جنگل کو طے کر کے نکل گیا۔ یہی معنے اس جگہ لگتے ہیں اور مراد یہ ہے کہ آخر تو نے اسی دنیا میں رہنا ہے تیری ترقیاں محدود ہیں پس اپنے آپ کو ایسا نہ بنا کہ دوسرے انسانوں سے تیرا گذارہ مشکل ہو جائے۔

متکبر انسان کا مرقع زندگی جن لوگوں کو متکبر لوگوں کے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ متکبر آدمی کی زندگی سخت تلخ گذرتی ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو وہ اپنے آپ کو کوئی عجیب چیز سمجھنے لگتا ہے دوسری طرف اسے اپنے ابناءِ وطن کے ساتھ مل کر رہنا پڑتا ہے۔ پس عجیب متضاد جذبات میں اس کی زندگی بسر ہوتی ہے۔ آجکل کا انگریزی خوان طبقہ جو اپنے آپ کو دوسرے ہندوستانیوں سے اعلیٰ سمجھتا ہے اور یورپین ان کو منہ نہیں لگاتے اسی عذاب میں مبتلا ہے۔ جو اس کے ہیں وہ ان میں رہنا پسند نہیں کرتا اور جن میں وہ رہنا چاہتا ہے وہ اسے حقیر سمجھتے ہیں۔ پس فرمایا کہ آخر اپنے لوگوں میں تو نے رہنا ہے پس دل کی ایسی کیفیت نہ بنا کہ تیری زندگی تجھ پر وبال ہو جائے۔

جبال سے مراد قوم کے سردار اور عالم لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا۔ جبل کے معنے پہاڑ بھی ہوتے ہیں اور سید القوم اور عالم قوم کے بھی (اقرب)۔ یعنی قوم کا سردار اور قوم کا عالم۔ اس جگہ جبال سے مراد دوسرے معنے ہیں یعنی سرداران قوم اور علماءِ قوم۔ اور یہ جو فرمایا کہ تو سرداران قوم اور علماءِ قوم کے برابر نہیں ہو سکتا اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ قوم میں بڑائی خدمت سے ملتی ہے یا علم سے اور یہ دونوں قسم کے لوگ انکسار کا نمونہ ہوتے ہیں۔ جیسے کہ عرب کا محاورہ ہے سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ یعنی قوم کا سردار درحقیقت قوم کا خادم ہوتا ہے۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (الفاطر: ۲۹) اللہ تعالیٰ سے عالم بندے ہی ڈرتے ہیں یعنی جس قدر انسان علم میں ترقی کرتا جاتا ہے اس کی خشیت بڑھتی جاتی ہے۔ پس اس جملہ سے یہ بتایا ہے کہ تکبر کر کے تُو قوم کا سردار نہیں بن سکتا نہ قوم کے علماء میں شامل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ تکبر تو تجھ کو اپنی قوم سے دور کر دیتا ہے اور اسی طرح خدا سے بھی دور کر دیتا ہے پس اگر تو بڑائی کا ہی طالب ہے تو بھی تو تکبر سے اپنا نقصان کرتا ہے کیونکہ اس فعل سے تُو اپنے آپ کو اسی چیز سے محروم کرتا ہے جس چیز کی تیرے دل میں خواہش ہے۔ پس تکبر نہ کر اگر تیرے اندر کوئی دنیوی خوبی ہے تو اس کی مدد سے قوم کو فائدہ پہنچا۔ تا کہ تو قوم کا سردار بن جائے اور اگر کوئی دینی خوبی ہے تو اس کے ذریعہ سے قوم کو فائدہ پہنچا۔ تا کہ تو خدا تعالیٰ کی نظر میں پسندیدہ ہو جائے۔

کس لطیف پیرایہ میں یہاں تکبر سے روکا گیا ہے۔ اس کی نظیر بھی دنیا کی کوئی کتاب پیش نہیں کر سکتی۔

كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿۳۹﴾

ان میں سے ہر ایک (فعل) کی بُری صورت تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔

حلّ لُغات ۔ السَّیِّءُ السَّیِّءُ کے معنے ہیں اَلْقَبِیْحُ۔ بُری صورت۔ (اقرب)

تفسیر ۔ **ہر حکم کی تعمیل میں اعتدال کو ملحوظ رکھنے کی تلقین** اس چھوٹے سے فقرہ میں گو یا دریا کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے۔ فرماتا ہے جس قدر احکام اوپر بیان ہوئے ہیں ان کے بُرے پہلو بھی ہیں اور اچھے بھی۔ جو برے پہلو ہیں ان کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے اچھوں کو نہیں ۔ یعنی کوئی فعل بھی دنیا کا ایسا نہیں جسے ہر حال میں بُرا کہا جا سکے۔ توحید اچھی بات ہے لیکن اگر انسان توحید کو فساد کا موجب بنالے اور دوسری اقوام کے معبودوں پر آوازے کسے تو یہی توحید بری ہو جائے گی ماں باپ کا ادب اچھا فعل ہے لیکن ان کے کہنے پر شرک یا ظلم کرنے لگ جائے تو یہ برا ہو جائے گا۔ قتل برا فعل ہے لیکن دفاع قوم سے یا ضروری قصاص سے جی چرائے تو یہ برا ہوگا ۔ یتیموں کے مال کو ہاتھ نہ لگانا اچھا ہے لیکن اگر گناہ کے ڈر سے ان کے مال کی حفاظت چھوڑ دے تو یہ بھی برا ہوگا۔

دیانتداری کے غلط مفہوم سے بچنے کی تلقین سودے میں دیانت اچھی چیز ہے مگر بددیانتی سے ڈر کر کسب حلال بھی چھوڑ دے تو برا ہوگا ۔ شہوانی قوتوں کو ان کے دائرہ میں رکھنا اچھا ہے لیکن ان کو بالکل نظر انداز کر دینا اور رہبانیت اختیار کر لینا یا ان کو ناجائز طور پر استعمال کرنا برا فعل ہوگا۔ بدظنی نہ کرنا اچھا فعل ہے لیکن ایک پہرہ دار حسن ظنی سے کام لیتے ہوئے دوسروں کو اپنی حفاظت کی اشیاء کے پاس جانے دے تو یہ بُرا ہوگا۔ تکبر نہ کرنا اچھا فعل ہے لیکن بہادری اور جرأت دکھانے کے موقعہ پر انکسار دکھائے تو یہ بھی برا ہوگا۔ پس فرمایا کہ احکام کی حکمتوں کو سمجھو اور موقع اور محل پر ہر قوت کو استعمال کرو۔ اللہ تعالیٰ تم کو اپنی قوتوں کے استعمال سے نہیں روکتا بلکہ ان کے غلط استعمال سے روکتا ہے۔ انسانی اعمال کی یہ تشریح ایسی کامل ہے کہ اس کو نہ سمجھنے سے ہی سب خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مگر کتنے لوگ ہیں جو اس میانہ روی پر کاربند ہیں۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰۤى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ

یہ (تعلیم) اس (علم اور) حکمت میں سے (ایک حصہ) ہے جو تیرے رب نے وحی کے ذریعہ سے تیری طرف بھیجی

وَ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى

ہے۔ اور تو اللہ (تعالیٰ) کے ساتھ کوئی اور معبود مت بنا ورنہ تو ملامت کا نشانہ بن کر (اور)

فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۴۰﴾

دھتکارا جا کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

تفسیر ۔ سبحان اللہ! کیا عجیب ترتیب ہے۔ پہلے سورۃ نحل میں فرمایا تھا کہ حکمت آنے والی ہے اب اس

میں بتایا کہ ان حکمت کی باتوں میں سے چند ایک ہم نے اوپر بیان کی ہیں۔اب لاؤ ان کتابوں کو جو اس قرآن کریم سے پہلے تھیں اور دکھاؤ کہ ان میں ایسی تعلیم کہاں ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے چند ایک امور ایسے بیان فرمائے ہیں کہ جن کو لے کر ہم اہل کتاب سے مباحثہ کر کے ان کو شکست دے سکتے ہیں۔

پہلے رکوع میں فرمایا تھا وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ۔اس کے بعد توحید کے عملی پہلو کو پہلے بیان کیا اور بتایا کہ اسلام کی توحید نے دنیا کو عملی طور پر کیا فائدہ پہنچایا ہے۔اب توحید کا دوسرا پہلو بیان کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ صرف دوسرے معبود کی عبادت سے انسان مشرک نہیں ہوتا بلکہ اگر کوئی شخص اپنے ذہن میں بھی کسی کو خدا کا شریک خیال کرتا ہو تو وہ بھی مشرک ہے۔

تُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ ۔اس کا صرف یہی مطلب نہیں کہ آخرت کو جہنم میں ڈالا جائے گا بلکہ شرک کرنا خود ایک جہنم ہے کیونکہ جب کئی ایک کو معبود بنائے گا تو کس کس کو خوش رکھے گا اور کس کو ناراض کرے گا۔

موحد کے سامنے مشرک ہمیشہ ذلیل ہوتا ہے دوسرے اس طرح بھی یہ جہنم ہو جاتا ہے کہ شرک کی کوئی دلیل نہیں ہوتی اور مشرک ہمیشہ موحدوں کے سامنے ذلیل ہوتا ہے۔

آج عیسائیوں کو ہی دیکھ لو کہ ان کے لئے تثلیث کا مسئلہ کس طرح ایک جہنم بن رہا ہے۔کسی سے پوچھ کر دیکھ لو خواہ کتنا بڑا پادری ہو وہ اس کی کوئی دلیل نہ دے سکے گا۔صرف اور صرف توحید ہی ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کو مان کر انسان آرام میں آجاتا ہے اور اسی سے ٹھنڈک نصیب ہوتی ہے۔

مَلُوْمًا۔میں بتایا کہ مشرک کے سر پر ہمیشہ ملامت ہی رہتی ہے۔ایک معبود کو مانا تو دوسرے کی ملامت سر پر آگئی۔اُس کو مانا تو تیسرے کی ملامت کا ہار گلے میں۔پھر مَدْحُوْرًا کہہ کر بتایا کہ ادھر تو ہر وقت کے دکھ میں مبتلا ہوتا ہے۔ادھر آرام و راحت کے سرچشمہ یعنی خدا تعالیٰ سے بھی دور پھینکا جاتا ہے گویا نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم کی سی حالت اس کی ہو جاتی ہے۔

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَ اتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ

کیا تمہارے رب نے تم کو لڑکوں (کی نعمت) سے مخصوص کر دیا۔ اور (خود) اس نے بعض فرشتوں کو (اپنی) لڑکیاں

اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۱﴾ ع

بنایا ہے۔ تم یقیناً (یہ) بڑی (خطرناک) بات کہتے ہو۔

حلّ لُغات۔ اَفَأَصْفٰكُمْ أَصْفَى فُلَانًا بِكَذَا کے معنے ہیں اٰثَرَهٗ بِهٖ وَاخْتَصَّهٗ۔ کسی چیز کے متعلق اسے ترجیح دی۔ اور اس کو اس کے لئے خاص کیا (اقرب) پس اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ کے معنے ہوں گے کہ کیا تم کو خدا تعالیٰ نے بیٹوں کے ساتھ مخصوص کیا۔

تفسیر۔ اس آیت میں اس ذہنی کش مکش اور شرمندگی کی ایک مثال بیان کی گئی ہے فرماتا ہے کہ مشرکوں کے عقیدوں کو دیکھو کیسے عجیب ہیں۔ مثلاً یہ کہ بعض خدا تعالیٰ کے لئے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں اور اپنے لئے لڑکے۔ پھر ان ہی لڑکیوں کی پوجا کرتے ہیں جن کو وہ ذلیل قرار دیتے ہیں۔ گویا خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر انہیں وجودوں کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔ جن کو ان کے دل ذلیل سمجھتے ہیں۔

قَوْلًا عَظِيْمًا سے مراد بیوقوفی کی بات ہے۔ عظیم بری چیز کے لئے آئے تو اس کے معنے برائی میں زیادتی کے ہوتے ہیں اور اچھے معنوں میں آئے تو اچھی بات میں بڑائی مراد ہوتی ہے۔ اس جگہ اس لفظ سے یہ بتایا ہے کہ مشرک کی عقل بھی ماری جاتی ہے وہ ایسی باتیں کرتا ہے جو کوئی سمجھدار آدمی نہیں کر سکتا۔

مشرک کی ذہنیت کو ظاہر کرنے والا مہاراجہ کا واقعہ اس موقعہ پر ایک لطیف واقعہ مجھے یاد آ گیا وہ مشرک کی ذہنیت کو خوب منکشف کرتا ہے۔ جموں کے ایک سابق مہاراجہ صاحب کے پاس استاذی المکرم حضرت مولوی نورالدین صاحب (اللہ تعالیٰ ان کے مدارج بلند کرے قرآن انہوں نے ہی مجھے پڑھایا تھا اللہ تعالیٰ نے اب مجھے بہت علم بخشا ہے بلکہ وہ خود فرماتے تھے کہ میں نے تم سے ایسے ایسے معارف قرآن کے سنے ہیں جو نہ مجھے معلوم تھے اور نہ پہلی کتب میں درج ہیں۔ لیکن اس کتاب کی چاٹ انہوں نے ہی مجھے لگائی اور اس کی تفصیل کے متعلق صحیح راستہ پر ڈالا اور وہ بنیاد ڈالی جس پر میں عمارت تعمیر کر سکا۔ اس لئے دل ہمیشہ ان کے لئے دعا گو رہتا ہے) بطور طبیب ملازم تھے اور شاہی طبیب کے عہدہ پر فائز تھے بعد میں ان مہاراجہ صاحب کے فوت ہونے پر ان کے

بیٹے مہاراجہ پرتاب سنگھ صاحب نے ان کو جموں سے اس الزام پر نکال دیا کہ موجودہ مہاراجہ صاحب کے والد اور چچا راجہ امر سنگھ صاحب اور راجہ رام سنگھ صاحب سے ان کے گہرے تعلقات ہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی خاطر مجھے زہر دے دیں۔ اس کے بعد وہ قادیان ہجرت کر کے آ گئے اور آخر اپنے تقویٰ اور علم کی وجہ سے جماعت احمدیہ کے پہلے خلیفہ ہوئے۔ دوران ملازمت کا وہ قصہ سنایا کرتے تھے کہ ایک دن مہاراجہ صاحب نے مجھ سے کہا کہ مولوی صاحب آپ بھی کوئی بُت اپنے گھر رکھتے ہیں کہ نہیں۔ فرماتے تھے میں نے کہا مہاراجہ صاحب نہیں ہم بُت نہیں رکھتے ہمارے مذہب میں یہ منع ہے۔ اس پر کچھ حیران سے ہو کر کہنے لگے کہ ایک نصیحت آپ کو کرتا ہوں کہ کالی دیوی کا بُت ضرور رکھ لیں۔ یہ بڑی سخت دیوی ہے اور بڑا نقصان پہنچا دیتی ہے۔ فرماتے تھے میں نے کہا۔ مہاراجہ صاحب ہم تو کالی کو بھی نہیں رکھ سکتے۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ پھر آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ میں نے کہا نہیں مہاراج کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ یہ سن کر وہ کچھ تردّد میں پڑ گئے۔ تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد بولے مولوی صاحب میں سمجھ گیا آپ کو میں جموں کی ریاست میں سزا دینی چاہوں تو دے سکتا ہوں۔ لیکن آپ سیالکوٹ چلے جائیں تو پھر کچھ نہیں کر سکتا۔ یہی معاملہ یہاں ہے۔ ہم تو کالی دیوی کو مان کر اس کے اختیار میں آ گئے ہیں وہ ہمیں سزا دے لیتی ہے۔ لیکن آپ لوگ سرے سے انکار کر کے اس کی حکومت سے نکل گئے ہیں اس لئے وہ آپ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ فرماتے تھے میں نے اس پر کہا مہاراج آپ خوب سمجھے ہم ایک خداوند کو مان کر ان بتوں کے قبضے سے نکل چکے ہیں۔ اس پر مہاراجہ صاحب تو اپنی جگہ خوش کہ میں نے صحیح بات دریافت کر لی اور میں اپنی جگہ خوش کہ توحید نے ہم کو کیسی کیسی لغویات سے بچا لیا ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَمَا يَزِيْدُهُمْ

اور ہم نے اس قرآن میں (ہر ایک بات کو) اس لئے بار بار بیان کیا ہے۔ کہ وہ (اس سے) نصیحت حاصل کریں

اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۲﴾

اور (باوجود اس کے) وہ انہیں (عُجب و) نفرت ہی میں بڑھا رہا ہے۔

حلّ لُغات۔ صَرَّفْنَا صَرَّفْنَا صَرَّفَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے جو صَرَفَ سے مزید ثلاثی ہے اور صَرَفَهٗ (صَرْفًا) کے معنے ہیں رَدَّهٗ عَنْ وَجْهِهٖ اس کے ارادہ سے اسے پھیرا اور صَرَّفَ الْكَلَامَ کے معنے ہیں

اِشْتَقَّ بَعْضَہٗ مِنْ بَعْضٍ کلام کے ایک حصہ کو دوسرے سے مشتق کیا۔ صَرَّفَ اللّٰہُ الرِّیَاحَ: حَوَّلَھَا مِنْ وَجْہٍ اِلٰی وِجْہٍ۔ اللہ تعالیٰ نے ہواؤں کا رخ ادہر سے ادہر پھرایا۔ صَرَّفَ فُلَانًا فِی الْاَمْرِ: قَلَّبَہٗ فِیْہِ وَفَوَّضَہٗ اِلَیْہِ کسی کام میں کسی کو لگایا اور وہ کام اس کے سپرد کیا (اقرب) پس وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ کے معنے ہوں گے۔ ہم نے قرآن مجید میں ہر بات کو بار بار بیان کیا ہے۔

نُفُوْرًا نُفُوْرٌ نَفَرَ کا مصدر ہے۔ اور نَفَرَتْ (تَنْفِرُ) اَلدَّابَّۃُ کَذَا کے معنے ہیں جَزِعَتْ وَ تَبَاعَدَتْ۔ جانور ڈر کر دور بھاگا نَفَرَ الْقَوْمُ نَفْرًا: تَفَرَّقُوْا۔ لوگ پراگندہ ہوگئے نَفَرَ الْقَوْمُ عَنْ کَذَا: اَعْرَضُوْا وَصَدُّوْا لوگوں نے کسی بات سے اعراض کیا اور اس سے رُکے۔ نَفَرَ الْقَوْمُ مِنْ کَذَا۔ اَنِفُوْا وَ کَرِھُوْہُ لوگوں نے اس سے ناک چڑھایا اور اس کو ناپسند کیا۔ (اقرب) پس نُفُوْرٌ کے معنے ہوں گے۔ دور ہونا۔ پراگندہ ہونا۔ اعراض کرنا۔ ناپسند کرنا۔

تفسیر ۔ نُفُوْرًا کے معنے اوپر بتائے جا چکے ہیں۔ کہ دور ہونے۔ پراگندہ ہونے۔ ناپسند کرکے۔ اعراض کرنے کے ہوتے ہیں۔ ان معنوں کے لحاظ سے وَمَا یَزِیْدُھُمْ اِلَّا نُفُوْرًا۔ کے یہ معنے ہوئے کہ نہیں زیادہ کرتا ان کو مگر دور ہونے میں۔ پراگندہ ہونے میں۔ ناپسند کرنے میں یا اعراض کرنے میں۔ یعنی ہم نے قرآن کریم میں قسم قسم کے دلائل بیان کئے ہیں مگر لوگ اس سے فائدہ اٹھانے کی بجائے نفرت ہی کرتے ہیں۔ اس سے اعراض ہی کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں واقعات کے تکرار سے آنے کی وجہ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن شریف میں تکرار ہے (تفسیر القرآن از ویری جلد سوم صفحہ ۶۲)۔ مگر دیکھو قرآن کریم نے خود ہی اس کا جواب دے دیا ہے فرماتا ہے۔ وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ ہم نے اس قرآن میں ہر پہلو سے مسائل کی بحث کی ہے تا کہ کسی پہلو سے ہی لوگ سمجھیں تب بھی لوگ اعراض کر رہے ہیں۔ صَرَّفَ کے معنے کسی چیز کو اچھی طرح سے ردّ کرنے کے بھی ہوتے ہیں اور ادھر سے ادھر پھرانے کے بھی۔ چنانچہ عربی کا محاورہ ہے صَرَّفَ اللّٰہُ الرِّیَاحَ جس کے معنے ہیں حَوَّلَھَا مِنْ وَجْہٍ اِلٰی وَجْہٍ یعنی ہواؤں کا رخ ادھر سے ادھر پھیرا دیا۔ ان دونوں معنوں کو ملحوظ رکھ کر آیت کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ (۱) اللہ تعالیٰ خوب اچھی طرح تمام اعتراضات کو دور کرتا ہے (۲) اللہ تعالیٰ ہر مضمون کو مختلف پہلوؤں سے بیان کرتا ہے۔ یہ دونوں باتیں قرآن کریم میں پائی جاتی ہیں۔ تمام اعتراضات جو قرآن پر وارد ہوتے ہیں ان کو اس میں خوب اچھی طرح ردّ کیا گیا ہے اور تمام ضروری امور کو مختلف پہلوؤں سے کھولا گیا ہے۔ پس جس کلام نے ہر مسئلہ

پر بالاستیعاب بحث کرنی ہولازماً اس میں وہ امور متعدد بار بیان ہوں گے۔اور اسے کوئی عقلمند تکرار نہیں کہہ سکتا۔تکرار تو یہ ہے کہ بے وجہ ایک بات کو دہرایا جاوے۔مگر جب ہر دفعہ دوسرے پہلو سے یا دوسری ضرورت سے بات بیان کی جائے تو یہ تکرار کس طرح کہلا سکتی ہے۔اصل بات یہ ہے کہ لوگ غور کر کے قرآن کے مضمونوں کو سمجھتے نہیں اور یونہی سطحی باتوں کی وجہ سے اعتراض کر دیتے ہیں۔

وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا نے واضح کیا کہ ہمارے بار بار سمجھانے اور پھر بھی ان کے نہ ماننے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شرک کی وجہ سے ان کی عقل ماری گئی ہے۔ورنہ کیا وجہ ہے کہ ہمارے طرح طرح پر سمجھانے کے باوجود بھی وہ نہیں سمجھتے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى

تو کہہ (کہ) اگران کے قول کے مطابق اس کے ساتھ (کوئی) اور معبود (بھی) ہوتے تو اس صورت میں وہ (یعنی

ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ﴿۴۳﴾

مشرکین ان معبودوں کی مدد سے) عرش والے (خدا) تک (پہنچنے کا) کوئی راستہ ضرور ڈھونڈ لیتے

حلّ لُغات۔**ذی العرش** ذِى الْعَرْشِ عرش والا۔اَلْعَرْشُ کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۵۔

عَرَشَ۔عَرَشَ عَرْشًا: بَنٰى بِنَاءً مِنْ خَشَبٍ لکڑی کی عمارت بنائی۔اَلْبَيْتَ: بَنَاهُ تعمیر کیا۔اَلْكَرْمَ: رَفَعَ دَوَالِيَهٗ عَلَى الْخَشَبِ۔بیل کو قرینے سے لگائی ہوئی لکڑیوں پر چڑھایا۔(اقرب) اَلْعَرْشُ سَرِيْرُ الْمَلِكِ اورنگ شاہی۔اَلْعِزُّ۔عزت وغلبہ۔قِوَامُ الْاَمْرِ معاملات اور امور کی درستی کا ذریعہ اور مدار۔رُكْنُ الشَّيْءِ سہارا۔مِنَ الْبَيْتِ: سَقْفُهٗ چھت۔اَلْخَيْمَةُ خیمہ۔اَلْبَيْتُ الَّذِىْ يُسْتَظَلُّ بِهٖ سایہ کا کام دینے والا گھر شِبْهُ بَيْتٍ مِنْ جَرِيْدٍ يُجْعَلُ فَوْقَهُ الثُّمَامُ جھونپڑی۔(اقرب)

تفسیر۔اس تصریف کی مثال بھی معاً دے دی۔شرک کے مضمون کو پھر بیان کیا ہے لیکن اس میں ایک نئی دلیل پیش کی ہے یونہی پہلی بات نہیں دہرادی فرماتا ہے اگر شرک صحیح ہوتا تو کیا مشرک لوگ خدا رسیدہ نہ ہو جاتے۔ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا کے معنے یہی ہیں کہ اگر شرک درست ہوتا تو مشرک لوگ ذی العرش کے ساتھ کوئی تعلق بنا ہی لیتے کیونکہ اس کی بیٹیوں یا بیٹوں سے تعلق پیدا کر کے ان کے لئے قرب کی راہیں کھل جانی چاہیے تھیں۔

ایک دوسری جگہ قرآن کریم میں خود مشرکوں کا دعویٰ بیان کیا ہے کہ وہ بھی اسی غرض یعنی ’’تقرب الی اللہ‘‘ کے لئے ان کی عبادت کرتے تھے۔ جیسے کہ سورۃ زمر میں فرمایا مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزمر:۴) کہ ہم تو ان بتوں کی اس لئے عبادت کررہے ہیں کہ وہ ہمیں خدا کا قرب دلا دیں۔ یہاں ان کے اپنے دعوے کو ان کے شرک کے رد میں پیش کیا گیا ہے کہ جب ان کی غرض یہی ہے کہ ذی العرش تک پہنچیں۔ اور ذی العرش کے مقربین سے انہوں نے تعلق بھی پیدا کرلیا ہے تو پھر تو چاہیے تو تھا کہ وہ خدا تعالیٰ کے مقرب ہوجاتے مگر اس کے کوئی آثار تو ان میں پائے نہیں جاتے۔

قرب الٰہی کے آثار قرآن شریف سے قرب الٰہی کے مندرجہ ذیل آثار معلوم ہوتے ہیں:۔

اول۔ دعا کا قبول ہونا۔ سورۃ بقرہ ع ۲۳ میں فرمایا ہے کہ وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ الآیہ (البقرۃ:۱۸۷)۔ کہ جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق سوال کریں تو کہہ دے کہ میں تم سے قریب ہوں۔ اور میرے قریب ہونے کی یہ علامت ہے کہ پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ یہ ایسی علامت ہے کہ مشرک بھی اس کی صحت کا انکار نہیں کرسکتے۔ مگر یہ علامت کسی مشرک میں نہیں پائی جاتی۔ مشرکوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے قبولیت دعا کا دعویٰ ہو۔ آج تک ایک شخص بھی دنیا میں ایسا نہیں پیدا ہوا جس نے دعویٰ کیا ہو کہ مجھے ان بتوں کے ذریعہ سے خدا مل گیا ہے۔ اور وہ میری دعائیں سنتا اور قبول فرماتا ہے اور دنیا نے اس کی قبولیت دعا کے نشان دیکھے ہوں۔

قرب الٰہی کا دوسرا معیار لغو اور گناہ سے بچنا ہے دوسرا معیار قرب الٰہی کا سورۃ واقعہ میں بیان ہوا ہے۔ وہاں مقربوں کا ذکر کرکے فرماتا ہے۔ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا تَاْثِيْمًا اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (الواقعہ:۲۶،۲۷) یعنی قرب کا مقام وہ ہے جس میں لغو اور گناہ کی بات کوئی نہیں ہوتی۔ اور لوگ ایک دوسرے کے شر سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ اور ہر ایک شخص دوسرے کی سلامتی تلاش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے بھی اسے سلامتی ملتی ہے۔ یہ معیار بھی ایسا نہیں کہ کوئی مشرک اس کا انکار کرسکے۔ ظاہر ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے قریب ہوگا لغو باتوں سے اور گناہ سے بچے گا۔ اور خدا کا بندہ ہوکر اس کے دوسرے بندوں کی بھلائی میں لگا رہے گا فساد نہیں کرے گا۔

یہ علامتیں بھی کسی مشرک میں نہیں پائی جاسکتیں۔ پہلی بات لغو باتوں سے محفوظ ہونا ہے۔ مشرک میں یہ بات کہاں پائی جاسکتی ہے۔ وہ تو شرک کی وجہ سے مضحکہ خیز باتیں کرتا ہے۔ ایک بے خبر اور بے شر چیز کے سامنے سجدے کرتا ہے اس کی عظمت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ عقلمند اس کی حرکات کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ بھلا یہ غوغا جو گائے کے تقدس

کا ہندوستان میں برپا ہے کونسا معقول شخص اسے جائز قرار دے سکتا ہے۔ گائے کے پرستار اس کا دودھ اس کے بچہ سے چھڑا لیتے ہیں۔ آپ غلہ کھاتے ہیں اسے گھاس کھلاتے ہیں۔ اسے باندھ کر رکھتے ہیں۔ نر پر بوجھ لادتے ہیں۔ سواری کا کام لیتے ہیں۔ مارتے پیٹتے ہیں اور پھر وہ ماتا کی ماتا ہے۔ پھر لطیفہ یہ کہ ہندو عیسائیوں پر تمسخر اڑاتے ہیں کہ وہ ایک کمزور بندہ کو خدا بنا رہے ہیں اور وہ ان پر ہنستے رہتے ہیں کہ ایک کمزور جانور کو دیوی سمجھ رہے ہیں۔ ان لغو باتوں کو دیکھ کر ایک موحد بے ساختہ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کہہ اٹھتا ہے۔ دوسری علامت گناہ سے بچنا ہے۔ مشرک شرک کرتے ہوئے گناہ سے بچ ہی نہیں سکتا۔ بے شک مشرکوں میں سے بھی بعض نیک ہیں۔ لیکن ان کی نیکی شرک کی وجہ سے نہیں بلکہ شرک کے باوجود ہے۔ ایسے لوگوں کی فطرت اچھی ہوتی ہے۔ پس شرک ان کے اندر جڑ نہیں پکڑتا۔ مثلاً گائے ہی کو لے لو جو لوگ گائے کو پوجتے ہیں اس کو طرح طرح سے دکھ بھی دیتے ہیں۔ اور اس پر مجبور ہیں۔ کیونکہ گائے خدا تعالیٰ نے انسان کے کام کے لئے بنائی ہے۔ انہیں اس سے کام لینے کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ گائے سے کام بھی لیتے جاتے ہیں اور ساتھ ہی دل میں احساس گناہ بھی بڑھتا جاتا ہے اور ضمیر ناپاک ہوجاتی ہے۔ پھر دیکھو مشرک ہندو دسہرہ مناتے ہیں۔ مگر پھر اس خیال سے کہ راون برہمن تھا اور رام کھتری۔ دسہرہ منا کر ایک دن توبہ کا رکھتے ہیں تا برہمن کی ہتک کا ازالہ ہوجائے۔ عیسائیوں کا بھی یہی حال ہے مسیح کو ایک طرف خدا بناتے ہیں دوسری طرف اپنے گناہ اس پر لادتے ہیں۔ اور شرک کا عقیدہ ان کے لئے ہر بدی کا رستہ کھولتا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ خداوند یسوع نے ہمارے گناہ اٹھا لئے ہیں۔

تیسری علامت قرب الٰہی کی بندہ کی حفاظت ہے تیسری علامت قرب کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرب کو حفاظت ملتی ہے۔ یہ علامت بھی مشرک کو حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہوسکتی ہے۔ جو ان چیزوں کے تابع ہوجاتا ہے جن کو خدا تعالیٰ نے اس کے تابع بنایا تھا اس کے لئے حفاظت کا کونسا ذریعہ باقی رہ جاتا ہے۔

چوتھی علامت قرب الٰہی کی باہمی صلح صفائی ہے چوتھی علامت یہ ہے کہ خدا کا ہو کر اس کے بندوں سے نیک سلوک کرے اور آپس میں صلح صفائی پیدا ہو۔ یہ علامت بھی مشرک میں پیدا نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ توحید ہی دنیا میں امن قائم کرسکتی ہے۔ مختلف خداؤں کی موجودگی میں تفرقہ اور فساد ہی پیدا ہوسکتا ہے۔ قومی دیوتاؤں ہی کی وجہ سے اقوام میں جنگیں ہوتی ہیں۔ ہندو مسیح کو نہیں مان سکتا۔ مسیحی گائے کی پوجا نہیں کرسکتا۔ مگر یہ سب ایک خدا کی پوجا کرسکتے ہیں۔ اور دنیا کا امن اس ذریعہ سے محفوظ ہوسکتا ہے۔

اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا کے یہ بھی معنے ہیں کہ اگر دوسرے معبود سچے ہوتے تو یہ لوگ ان کے ساتھ

تعلق پیدا کر کے کوئی کامیابی کی راہ میرے خلاف ڈھونڈ لیتے اور مجھے نقصان پہنچانے اور تباہ کرنے کا راستہ نکال لیتے اور ان کی معرفت میرے خلاف کوئی تدبیر ہی ذی العرش سے پوچھ لیتے جس سے انہیں کامیابی حاصل ہو جاتی۔ مطلب یہ کہ کمزوری کے باوجود میرا دن بدن بڑھنا اور ان کا ان بتوں کی پرستش کرنے اور ان کی مدد حاصل کرنے کے باوجود گھٹنا اس امر کی علامت ہے کہ شرک کا عقیدہ صحیح نہیں اور نہ اس میں کوئی فائدہ ہے۔

تردید شرک کی واضح دلیل بتوں کا امداد نہ کرنا ہے یہ دلیل بعض بڑے بڑے مشرکوں کے لئے ہدایت کا موجب ہوئی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ فتح مکہ کے موقعہ پر نبی کریم صلعم نے عورتوں کی بیعت لیتے وقت فرمایا کہ اس امر کا اقرار کرو کہ ہم شرک نہیں کریں گی۔ اس موقعہ پر ہندہ ابوسفیان کی بیوی بھی موجود تھی۔ وہ بے اختیار بول اُٹھی کہ یا رسول اللہ! کیا اب بھی ہم شرک کریں گی۔ اگر ان بتوں میں کچھ طاقت ہوتی اور اگر یہ ہماری مدد کر سکتے تو آپ اکیلے ہو کر بھلا ہم پر غالب آ سکتے تھے؟

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴۴﴾

وہ اس بات سے جو وہ (یعنی مشرکین) کہتے ہیں پاک اور بہت ہی بالا ہے

حل لغات۔ تَعٰلٰى تَعٰلٰى: اِرْتَفَعَ۔ تعالیٰ کے معنے ہیں بلند ہوا (اقرب) پس تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ کے معنے ہوں گے وہ اس بات سے بلند و بالا ہے جو وہ کہتے ہیں۔

عُلُوًّا عُلُوًّا عَلَا کا مصدر ہے اور علا کے معنے کے لئے دیکھو سورۃ ہذا آیت نمبر ۵۔

تفسیر۔ اس آیت میں تَعٰلٰى کی تاکید غیر باب سے یعنی عُلُوًّا سے کی گئی ہے۔ قرآن کریم میں اس کی اور مثالیں بھی پائی جاتی ہیں مثلاً فرماتا ہے اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ ایسا کرنے سے تاکید میں زیادتی ہو جاتی ہے (روح المعانی زیر آیت ھذا)۔ کیونکہ اس میں دو چیزیں ایک فعل اور ایک مصدر مقدر نکالنے پڑتے ہیں۔ گویا عبارت یوں ہوگی۔ تَعَالٰى تَعَالِيًا وَعَلَا عُلُوًّا وہ پاک ہے اور بہت ہی بڑا ہے اس بات سے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ یعنی خدا کی شان کے خلاف ہے کہ وہ اپنا قرب کسی کی معرفت دے۔ خود پیدا کر کے پھر اپنی معرفت کے لئے روکیں پیدا کرنا دانائی کے خلاف ہے۔

انبیاء کی آمد کی غرض بندے اور خدا کی درمیانی روک کو دور کرنا ہے اگر کوئی کہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نبی

کیوں بھیجتا ہے اوران کا ماننا کیوں فرض کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی تو صرف اس کام کے لئے آتے ہیں کہ جو روکیں خدا تعالیٰ کی راہ میں ہوں ان کو دور کیا جائے اور خدا تعالیٰ کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا جائے۔ نبی خدا تعالیٰ اور بندہ کے درمیان روک بن کر کھڑا نہیں ہوتا۔ بلکہ نبی کے باوجود ہر بندہ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے براہ راست ہوتا ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَ

ساتوں آسمان اورزمین اور جوان میں (بسنے والے) ہیں اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ اور جو بھی چیز ہے۔ وہ اس کی

اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ

تعریف کرتی ہوئی (اس کی) تسبیح کرتی ہے۔ لیکن (افسوس) تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے وہ یقیناً پردہ پوشی کرنے والا

تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۵﴾

(اور) بہت (ہی) بخشنے والا ہے۔

حلّ لُغات ۔لَا تَفْقَهُوْنَ لَا تَفْقَهُوْنَ فَقِهَ سے مضارع کا صیغہ ہے۔ اور فَقِهَ الشَّيْءَ (يَفْقَهُهٗ فِقْهًا) کے معنے ہیں۔ فَهِمَهٗ اس کو سمجھا۔ وَفَقِهَ الرَّجُلُ (يَفْقَهُ) فَقْهًا کے معنے ہیں۔ عَلِمَ وَكَانَ فَقِيْهًا فلاں شخص عالم ہو گیا۔ (اقرب) پس لَا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ کے معنے ہوں گے کہ تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔

حَلِيْمٌ حَلِيْمٌ حَلُمَ (يَحْلُمُ حِلْمًا) سے صفت مشبّہ کا صیغہ ہے۔ اور حَلُمَ کے معنے ہیں صَفَحَ وَسَتَرَ درگذر کیا اور پردہ پوشی کی۔ (اقرب) پس حَلِيْمٌ کے معنے ہوں گے۔ درگذر کرنے والا اور پردہ پوشی کرنے والا۔

تفسیر ۔اس آیت میں فرمایا کہ دنیا کو اگر مجموعی نظر سے دیکھا جائے تو وہ بھی خدا کے واحد ہونے پر دلالت کرتی ہے اور اس کی ایک ایک چیز کو دیکھا جائے تو وہ علیحدہ علیحدہ بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ خدا واحد ہے۔

اشیاء کی تسبیح سے مراد توحید کا اقرار ہے اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ میں اس کے فرداً فرداً تسبیح کرنے کا ذکر ہے اور پہلے جملے میں مجموعی طور پر توحید ظاہر کرنے کا اشارہ ہے۔ ورنہ اگر تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ میں بھی فرداً فرداً توحید پر دلالت کرنا مقصود ہوتا تو بعد میں یہ جملہ نہ آتا۔ پس اس جملے کا دوبارہ بیان کرنا بتاتا ہے کہ پہلے جملے میں دنیا کی تمام چیزوں کا مجموعی طور پر توحید ثابت کرنا ظاہر کیا گیا ہے۔ اور دوسرے جملے

میں دنیا کی ہر ایک چیز کا علیحدہ علیحدہ توحید کی دلیل ہونا بتایا گیا ہے۔ دنیا کی اشیاء کو دیکھ لو ایک دوسرے سے کیسی وابستہ ہیں۔ بعض چیزیں آپس میں ہزاروں لاکھوں کروڑوں میل پر ہوتی ہیں لیکن سب کا وجود ایک دوسرے سے وابستہ ہوتا ہے اور سب آپس میں ایک نظام میں منسلک ہوتی ہیں۔ پس ان کا ایک ہی قانون سے وابستہ ہونا ظاہر کرتا ہے کہ دنیا میں کوئی دوسرا قانون نہیں ورنہ ضرور خلل ہوتا۔ اور جب دوسرا قانون ہی نہیں تو دوسرے مقنّن کا وجود کس طرح ممکن ہوگا؟

دنیا کی سب چیزیں فرداً فرداً بھی تسبیح کرتی ہیں۔ اس طرح کہ ہر چیز میں خدا کی صفات کی جھلک ہے۔ خدا کی ستاری۔ غفاری۔ اس کی خلق۔ اس کی ملک وغیرہ تمام صفات ہر ایک چیز میں پائی جاتی ہیں یعنی وہ چیز ان باتوں پر عمل کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ دنیا کا کوئی ذرّہ بھی لے لو۔ اس میں یہ سب صفات کام کرتی نظر آئیں گی۔ پس جب ہر چیز خدائے واحد کی صفات کو ظاہر کر رہی ہے تو اسے کسی اور خدا کی طرف کس طرح منسوب کیا جا سکتا ہے۔

وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ سے بعض لوگوں نے یہ مراد لی ہے کہ ان کی علیحدہ علیحدہ بولیاں ہیں جو سمجھ میں نہیں آتیں (التفسیر البغوی زیر آیت ھذا)۔ اگر ہر چیز کی علیحدہ بولی ہوتی اور ہم اسے سمجھ نہ سکتے تو ہمارے لئے یہ امر دلیل کیسے بن سکتا۔ دلیل تو وہ ہوتی ہے جسے ہم سمجھ بھی سکیں۔ پس یہاں پر تَفْقَهُوْنَ سے مختلف اشیاء کی بولی سمجھنا مراد نہیں بلکہ یہ بتایا ہے کہ تم یہ نہیں سمجھتے کہ وہ تسبیح کر رہی ہیں۔ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا وہ حلیم وغفور ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اس کے علم کی وجہ سے تم بجائے فائدہ اٹھانے کے شرارتوں میں بڑھ رہے ہو کیا تم خیال نہیں کرتے کہ ایسے نظام اور دلائل کے ہوتے ہوئے تمہارا ان سے فائدہ نہ اٹھانا بلکہ شرارتوں میں بڑھتے جانا اور فوراً نہ پکڑے جانا خدا تعالیٰ کے علم کی وجہ سے ہی ہے۔ پس شرافت کا جذبہ ظاہر کرو اور اللہ تعالیٰ کے پاس علم کی قدر کرو۔

وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ

اور جب تو قرآن کو پڑھتا ہے تو (اس وقت) ہم تیرے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۶﴾

رکھتے ایک مخفی (اور عام نظروں سے پوشیدہ) پردہ پیدا کر دیتے ہیں

حلّ لُغات۔ حِجَابًا اَلْحِجَابُ (حَجَبَ۔ يَحْجِبُ) کا مصدر ہے۔ اور نیز اس کے معنے ہیں پردہ۔ وَ كُلُّ

مَا احۡتُجِبَ بِہٖ ہر وہ چیز جس کے ذریعے پردہ کیا جائے۔(اقرب)

تفسیر ۔اس آیت کے دو معنے ہیں (۱) کہ جب تو قرآن شریف پڑھتا ہے تو ہم تیرے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے ایک ایسا پردہ ڈال دیتے ہیں کہ وہ پردہ خود بھی چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی وہ حجاب بھی ان کی نظروں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ یہ اس لئے فرمایا تا کوئی بے سمجھ حجاب کے لفظ سے ظاہری پردہ نہ سمجھ لے۔

آنحضرتؐ اور مخالفین کے درمیان حجاب کی تشریح بعض لوگوں نے پردہ سے ایسا پردہ مراد لیا ہے۔کہ جس سے نبی کریم صلعم چھپ جاتے تھے اور انہوں نے زوجہ ابولہب کا قصہ لکھا ہے۔کہ جب سورۃ اللہب اتری تو فِیۡ جِیۡدِہَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ سن کر وہ غصہ میں بھری ہوئی نبی کریم صلعم کو تکلیف پہنچانے کی نیت سے لپکی۔ نبی کریم صلعم نے دعا کی کہ الٰہی! تو مجھے اس کے شر سے بچالے۔تو خدا تعالیٰ نے آپ کے آگے پردہ حائل کر دیا اور اس وجہ سے وہ آپ کو دیکھ نہ سکی (تفسیر کبیر لامام رازی سورۃ اللھب زیر آیت فی جیدھا حبل۔۔)۔ یہ محض خرافات ہیں۔خدا کا وہ رسول جو ساری دنیا سے نہ ڈرا۔اس کمزور عورت سے اس قدر خائف ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کو اسے غائب کرنا پڑا۔اس غیر معقول بات کو کوئی عقلمند تسلیم نہیں کر سکتا۔اس روایت کو پیش کرنے والے یہ بھی نہیں سوچتے۔کہ خدا تعالیٰ تو اس حجاب کو مَسۡتُوۡر قرار دیتا ہے یعنی وہ پردہ نظر نہیں آتا۔مگر یہ لوگ پردے کو ظاہر کر کے نبی کریم صلعم کو مستور قرار دیتے ہیں۔

(۲) دوسرے معنے اس جملہ کے یہ ہو سکتے ہیں۔وہ پردہ بھی آگے ایک اَور پردے کے پیچھے ہوتا ہے۔یعنی ایک پردہ ہی تیرے اور ان کے درمیان نہیں ہوتا بلکہ کئی پردے حائل ہوتے ہیں۔کوئی پردہ قومی غیرت کا۔کوئی مال کا۔کوئی اخلاق کا وغیرہا۔وغیرہا۔یعنی کبھی لوگ اس خیال سے ایمان نہیں لاتے کہ اس کو مانا تو قوم چھوڑنی پڑے گی۔ کبھی یہ خیال حائل ہو جاتا ہے۔کہ مال جاتا رہے گا۔کبھی یہ بات راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے کہ کئی قسم کے بداخلاق جن کی عادت پڑی ہوئی ہے چھوڑنے پڑیں گے۔پس اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ جب تک یہ لوگ ان پردوں کو نہ ہٹائیں گے تجھ تک نہ پہنچ سکیں گے۔مگر مصیبت یہ ہے کہ وہ پردے ایسے ہیں کہ ان کو نظر نہیں آتے۔ان کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔وہ اپنے خیال میں یہ سمجھ رہے ہیں کہ قرآن کریم ہی بُری چیز ہے۔اگر وہ اچھی چیز ہوتی تو جلدی ہی ہمارے دلوں پر اس کی قبولیت کا اثر ہو جاتا۔گویا ان کے دلوں پر ایسے زنگ ہیں کہ ان کو اچھی چیز بری لگتی ہے۔اور بری چیز اچھی لگتی ہے۔اس لئے ایمان کا نصیب ہونا مشکل ہو رہا ہے۔ان معنوں کی تصدیق اگلی آیت وَجَعَلۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ اَکِنَّۃً سے ہوتی ہے کہ ان کے دلوں پر ایک پردہ نہیں بلکہ کئی پردے ہیں۔

وَّ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ

اور ہم ان کے دلوں پر (بھی) کئی پردے ڈال دیتے ہیں تا وہ اس (سچائی کے انکار کی حقیقت) کو سمجھیں اور ان کے

وَقْرًا ؕ وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى

کانوں میں بہرہ پن ہے۔ اور جب تو قرآن میں اپنے رب کو جو ایک ہی ہے یاد کرتا ہے تو وہ نفرت سے

اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۷﴾

(تیری طرف) اپنی پیٹھیں پھیر کر چلے جاتے ہیں۔

حلّ لُغات۔ اَكِنَّة اَلْاَكِنَّةُ اَلْكِنُّ کی جمع ہے۔ اور اَلْكِنُّ کے معنے ہیں وِقَاءُ كُلِّ شَيْءٍ وَسِتْرُهٗ ہر چیز کے اوپر کا پردہ جو اس کے جسم کی حفاظت کرتا ہے۔ (اقرب)

وَقْرًا وَقْرًا وَقَرَ (يَقِرُ) سے ہے اور وَقَرَتْهُ اُذُنُهٗ کے معنے ہیں۔ ثَقُلَتْ اَوْ ذَهَبَ سَمْعُهٗ كُلُّهٗ وَصَمَّتْ اس کے کان بوجھل ہو گئے یا اس کی شنوائی جاتی رہی اور کان بہرے ہو گئے۔ (اقرب) پس وَقْر کے معنے ہوں گے۔ بہرا پن۔ کان کا بوجھ۔

وَلَّوْا وَلَّوْا وَلّٰى سے جمع کا صیغہ ہے۔ اور وَلّٰى هَارِبًا کے معنے ہیں اَدْبَرَ پیٹھ دے کر بھاگ گیا۔ وَلَّى الشَّيْءَ وَعَنِ الشَّيْءِ۔ اَعْرَضَ وَنَاٰى۔ اس نے کسی سے اعراض کیا اور پہلوتہی کی (اقرب) پس وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ کے معنے ہوں گے کہ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے ہیں۔

تفسیر۔ اَنْ يَّفْقَهُوْهُ محذوف مفعول لہ کا متعلق ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ اس کراہت کی وجہ سے ہم نے پردے ڈال دئے ہیں کہ ایسے گندے لوگ جنہوں نے اپنے دلوں کو مختلف ظلمتوں میں چھپا رکھا ہے۔ اسلام میں داخل ہو کر اس کی بدنامی کا موجب نہ ہوں۔

اس اعتراض کا جواب کہ جب پردے خدا نے ڈالے ہیں تو بندوں کا کیا قصور اس پر اعتراض ہوسکتا ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے ہی پردے ڈال دئے ہیں تو وہ کیسے سمجھیں اور ان پر الزام کیسا؟ تو اس کا جواب دوسری جگہ بطور اصول کے بیان فرما دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (البقرۃ:۲۷) کہ اس قسم کے

پردے انسان کے اپنے نفس سے ہی پیدا ہوتے ہیں کوئی باہر سے نہیں آتے۔ تیسری جگہ فرمایا۔ اَمۡ عَلٰی قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُهَا (محمد:۲۵) کہ ان کے دلوں پر قفل ہیں جو ان کے دلوں سے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ پس انسان ہی اپنے لئے پردے اور قفل تجویز کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے اپنے تجویز کئے ہوئے پردوں کو اس کے دل پر ڈال دیتا ہے۔ کیونکہ جب تک دل صاف نہ ہو۔ الٰہی سلسلہ میں داخل ہونے والے کو تو کوئی نفع ہوتا نہیں۔ الٰہی سلسلہ مفت میں بدنام ہو جاتا ہے۔

وَ اِذَا ذَكَرۡتَ رَبَّكَ فِي الۡقُرۡاٰنِ وَحۡدَهٗ وَلَّوۡا عَلٰۤى اَدۡبَارِهِمۡ نُفُوۡرًا اس میں ''وَحۡدَهٗ'' کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے کہ مشرک لوگ خدا تعالیٰ کو تو مانتے ہیں لیکن توحید سے انہیں چڑ ہوتی ہے۔ یہ بھی پردوں میں سے ایک پردہ ہے۔

نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا يَسۡتَمِعُوۡنَ بِهٖۤ اِذۡ يَسۡتَمِعُوۡنَ اِلَيۡكَ وَ اِذۡ

(اور) جب وہ (بظاہر) تیری باتیں سن رہے ہوتے ہیں تو جس غرض سے وہ سن رہے ہوتے ہیں اس (کی حقیقت)

هُمۡ نَجۡوٰۤى اِذۡ يَقُوۡلُ الظّٰلِمُوۡنَ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا

کو ہم (سب سے) زیادہ جانتے ہیں اور (نیز اس کی حقیقت کو بھی) جب وہ باہم سرگوشی کر رہے ہوتے ہیں (اور) جب

مَّسۡحُوۡرًا ﴿۴۸﴾

وہ ظالم (ایک دوسرے سے) کہہ رہے ہوتے ہیں (کہ) تم ایک فریب خوردہ شخص ہی کی پیروی کر رہے ہو۔

حلّ لُغَات۔ **يَسۡتمعون** يَسۡتَمِعُوۡنَ اِسۡتَمَعَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اِسۡتَمَعَ لَهٗ وَاِلَيۡهِ کے معنے ہیں اَصۡغٰی اس نے اس کی طرف کان لگا کر بات سنی۔ (اقرب)

نَجۡوٰى نَجۡوٰى کے معنے ہیں اَلسِّرُّ۔ بھید۔ اَلۡمُسَارُّوۡنَ۔ راز کی باتیں کرنے والے۔ وَهُوَ وَصۡفٌ بِالۡمَصۡدَرِ يَسۡتَوِي فِيۡهِ الۡمُفۡرَدُ وَالۡجَمۡعُ۔ نجوٰی مصدر ہے جو بطور صفت بیان ہوا ہے۔ اس لئے مفرد اور جمع دونو طرح استعمال ہو سکتا ہے۔ (اقرب) پس اِذۡ هُمۡ نَجۡوٰۤى کے معنے ہیں کہ جب وہ باہم سرگوشی کر رہے ہوتے ہیں۔

مَسۡحُور مَسۡحُوۡرٌ کے معنے جس کو دھوکہ دیا گیا جس کو کسی چیز سے روکا گیا۔ جس کی عقل ماری گئی۔ مسلول۔ ان سب معنوں کے لحاظ سے اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا کے یہ معنے ہوں گے کہ تم نہیں اتباع کرتے مگر اس کی

جو دھوکہ خوردہ ہے یا سچائی سے پھیرا گیا ہے یا جس کی عقل ماری گئی ہے یا لاعلاج بیماری میں مبتلا ہے۔قوم کی حالت کے غم میں انبیاء کی صحت عموماً اچھی نہیں رہتی۔اس لئے وہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ کمزور اور بیمار ہے یونہی چند یوم کا شور ہے۔ تھوڑے ہی دن میں مر جائے گا۔

تفسیر ۔اس آیت میں بِہٖ کی بَاء لام کے معنوں میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم اس امر کو خوب جانتے ہیں جس کی خاطر یہ تیری باتیں سنتے ہیں یعنی یہ صرف انکار والزام کی خاطر سنتے ہیں۔ان الفاظ میں **وَقر** کی تشریح کی گئی ہے۔

بِہٖ میں بامصاحبت کی بھی ہو سکتی ہے۔کہ جس چیز کے ساتھ وہ سنتے ہیں اس کو ہم جانتے ہیں یعنی سنتے وقت جو حالت ان کے دل کی ہوتی ہے ہم اس سے واقف ہیں۔وہ قلبی حالت کیا ہے؟ وہ استہزاء اور مخالفت کے خیالات ہیں جو سنتے وقت ان کے دلوں میں پیدا ہو رہے ہوتے ہیں۔

آیت میں چند اَور پردوں کا ذکر کیا گیا ہے فرماتا ہے کہ ایک تو شرک ان کے رستہ میں روک ہے۔دوسرا پردہ یہ ہے کہ یہ غور سے بات سنتے ہی نہیں۔الزام لگانے اور تمسخر کرنے کے خیال سے سنتے ہیں۔جب دل کی یہ حالت ہو تو بات سمجھ کس طرح آئے۔تیسرا پردہ ان کے دل پر یہ پڑا ہوا ہے کہ محمد رسولؐ اللہ کو کمزور سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ زیادہ دن تک یہ بات نہیں چلا سکتا۔پھر اسے مان کر کیوں ذلیل ہوں۔چوتھا پردہ یہ ہے کہ بعض نادان محمد رسولؐ اللہ کو دیوانہ خیال کرتے ہیں۔اس لئے آپ کی بات سن کر توجہ کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔پانچواں پردہ یہ ہے کہ بعض خیال کرتے ہیں کہ اسے دھوکا لگ گیا ہے اور وہ اس خیال میں خوش ہیں کہ ہم نے اس کی حقیقت معلوم کر لی ہے اور غور اور فکر سے آزاد ہو گئے ہیں۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ مسلمانوں پر ظلم کرتے کرتے تھک گئے اور اس طرح کامیابی نہ ہوئی تو وہ چھپ چھپ کر لوگوں کو سمجھانے لگے اور نرمی کا پہلو اختیار کر کے لوگوں کو اسلام سے برگشتہ ہونے کی تلقین کرنی شروع کر دی۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ

دیکھ انہوں نے تیرے متعلق کس طرح باتیں بنائی ہیں۔جس کے نتیجہ میں وہ گمراہ ہو گئے ہیں اور (اب)

سَبِيْلًا ﴿۴۹﴾

وہ (اس گناہ سے بچنے کی) کوئی راہ نہیں پا سکتے۔

تفسیر ۔اس آیت میں اَمْثَال (جمع کا لفظ) رکھ کر بتا دیا کہ اوپر کی آیت میں مَسْحُور کے سارے ہی معنے مراد تھے ورنہ مَثَل کا لفظ چاہیے تھا۔اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کے جو الفاظ کئی معنے رکھتے ہیں جب وہ سیاق وسباق سے مناسبت رکھتے ہوں تو سب کے سب معنے بیک وقت مراد ہوتے ہیں۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا

اور انہوں نے (یہ بھی) کہا ہے (کہ) کیا جب ہم (مر کر) ہڈیاں اور چورا چورا ہو جائیں گے (تو ہمیں از سر نو زندہ کیا

جَدِيْدًا ﴿۵۰﴾

جائے گا اور) کیا واقعی ہمیں ایک نئی مخلوق کی صورت میں اٹھایا جائے گا۔

حلّ لُغات ۔عِظَامًا اَلْعِظَامُ اَلْعَظْمُ کی جمع ہے اور اَلْعَظْمُ کے معنے ہیں۔ہڈی۔(اقرب)

رُفَاتًا اَلرُّفَاتُ کے معنے ہیں اَلْحُطَامُ سوکھی ہوئی چیز کے ٹکڑے۔كُلُّ مَاتَكَسَّرَ وَبَلِيَ۔بوسیدہ اور چورا چیز (اقرب)

تفسیر ۔پیچھے ذکر ترقیات کا تھا اور پھر کفار کے جہنم میں گرائے جانے کا ذکر تھا۔اس کے متعلق جو کفار کو شبہ پیدا ہو سکتا تھا اس آیت میں اس کا ذکر کیا گیا ہے فرماتا ہے کفار ان باتوں کو سن کر اعتراض کرتے ہیں کہ جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا پھر ہماری نئی پیدائش ہو گی۔

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ۝۵۱ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ

تو (انہیں) کہہ (کہ) تم (خواہ) پتھر بن جاؤ یا لوہا۔ یا کوئی اور ایسی مخلوق جو تمہارے دلوں میں عظمت رکھتی ہو

فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ

(تب بھی تم کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا) اس پر وہ ضرور کہیں گے (کہ) کون ہمیں دوبارہ (زندہ کر کے وجود میں)

فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَ

لائے گا تو (انہیں) کہہ (کہ) وہی جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا۔ اس پر وہ لازماً تعجب سے تمہاری طرف

يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى

(دیکھتے ہوئے) اپنے سر ہلائیں گے اور کہیں گے (کہ) وہ (از سر نو زندہ کیا جانا) کب ہوگا (جب وہ ایسا کہیں

اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ۝۵۲

تو) تو (ان سے) کہہ (کہ) بالکل ممکن ہے کہ وہ (وقت اب) قریب (آ چکا) ہو۔

حلّ لُغات۔ فَسَيُنْغِضُوْنَ فَسَيُنْغِضُوْنَ اَنْغَضَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اَنْغَضَ فُلَانٌ رَاْسَهٗ کے معنے ہیں حَرَّكَهٗ كَالْمُتَعَجِّبِ مِنَ الشَّيْءِ اپنے سر کو حرکت دی جیسے کوئی متعجب سر کو حرکت دیتا ہے (اقرب) پس فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ کے معنے ہوں گے کہ وہ تمہاری طرف اپنے سر کو ہلائیں گے۔

تفسیر۔ پہلی آیت میں جو اعتراض پیش کیا گیا تھا اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ تمہارے اندر کتنا ہی تغیر آ جائے۔ پتھر ہو جاؤ یا لوہا یا اس سے بھی بڑی کوئی چیز تو بھی تم خدا کی سزا سے بچ نہیں سکتے۔ یا اس کے معنے یہ ہیں کہ تم اپنے دلوں کو کتنا ہی سخت بنا لو۔ پھر بھی ہمارے رسول کی ترقی ضرور ہوگی۔ تم میں سے بہت سے لوگ مسلمان ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں حشر برپا کر دے گا۔

ممکن ہے کہ انسانی جسم زمین میں ایک لمبا عرصہ تک مدفون ہو کر پتھر بن جائے میں اس آیت

سے نتیجہ نکالتا ہوں کہ ممکن ہے انسانی جسم میں لمبے عرصہ کے بعد ایسا تغیر پیدا ہو جاتا ہو کہ وہ کسی دوسرے مادہ کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہو۔ سائنس کی تحقیقات سے تو ثابت ہے کہ کئی درخت جو کسی وقت زمین میں دب گئے تھے۔ تغیرات زمانہ کے بعد پتھر کا کوئلہ بن گئے (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ coal)۔ اسی طرح یہ کہ ہیرا کوئلہ سے ہی بنا ہے۔ پس یہ تعجب کی بات نہیں۔ کہ انسانی جسم مرنے کے بعد زمین میں ایک لمبا عرصہ دفن رہنے پر پتھر بن جائے گو ابھی تک آثار قدیمہ سے ایسا کوئی نشان نہیں ملا۔ مگر یہ عقل کے خلاف نہیں۔ پس میرے نزدیک اس جملہ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ خواہ انسانی دور حیات پر لاکھوں کروڑوں سال کا عرصہ گزر جائے جس سے انسانی اجزاء کی جو زمین میں دفن ہیں شکل ہی تبدیل ہو جائے تب بھی انسان دوبارہ بعث سے نہیں بچ سکتا بعث ضرور ہوگا۔

مَنْ یُّعِیْدُنَا سے یہ مراد نہیں کہ وہ سنجیدگی سے سوال کرتے ہیں۔ کہ انہیں کون پیدا کرے گا بلکہ یہ تمسخر ہے کہ دکھلاؤ تو سہی جو کہتا ہے کہ ایسا ہوگا۔ جیسے ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ ذرا اس کا منہ تو دکھلاؤ جو ایسا کرنے کا دعویدار ہے مطلب اس سے صرف انکار ہوتا ہے۔

فَسَیُنْغِضُوْنَ اِلَیْكَ رُءُوْسَهُمْ ۔ اَنْغَضَ فُلَانٌ رَاْسَهٗ: حَرَّكَهٗ كَالْمُتَعَجِّبِ مِنَ الشَّیْءِ ۔ یعنی سر کو ہلایا ایسے انسان کی طرح جو کسی بات سے تعجب کر رہا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ سر ہلا ہلا کر تمسخرانہ رنگ میں باتیں کریں گے اور کہیں گے اچھا یہ بات ہے؟ اب ہم سمجھے۔

حشر سے مراد تمام عرب کا مسلمان ہونا ہے عَسٰۤی اَنْ یَّكُوْنَ قَرِیْبًا ۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ جس حشر کا ہم اس سورۃ میں ذکر کر رہے ہیں وہ وہ نہیں جس پر تم اعتراض کرتے ہو ہماری مراد اس سورۃ میں اس حشر سے ہے جو مسلمانوں کے ذریعہ سے اس دنیا میں ہونے والا ہے اور بتایا ہے کہ وہ حشر جس کا ہم نے یہاں ذکر کیا ہے وہ تو بس قریب ہی ہے۔ چنانچہ اس کے کچھ عرصہ بعد عرب کے لوگ مسلمان ہو گئے۔ اور اس سورۃ میں جس حشر کی خبر تھی وہ ظاہر ہو گیا۔

يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَ تَظُنُّوْنَ اِنْ

(یہ وعدہ اس دن پورا ہوگا) جس دن وہ تمہیں بلائے گا تو تم اس کی تعریف کرتے ہوئے اس کا حکم مانو گے (اور فوراً

لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۵۳﴾ ع ۵

حاضر ہو گے) اور تم سمجھ رہے ہو گے کہ تم (دنیا میں) تھوڑا ہی ٹھیرے تھے۔

تفسیر ۔اس آیت نے ظاہر کر دیا کہ وہ حشر جس کا یہاں ذکر ہے۔اسی دنیا میں ہوگا۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ حشر اس دن مقرر ہے جبکہ تم کو خدا تعالیٰ یا اس کا رسولؐ بلائے گا اور تم مردوں کی طرح خاموش نہیں رہو گے جس طرح آج خاموش ہو۔ بلکہ اس دن تم میں سے اکثر محمد رسول اللہؐ کی بات پر لبیک کہتے ہوئے دوڑ پڑیں گے اور تسبیح کرنے لگیں گے اور اس وقت تم حیران ہو گے کہ خواہ مخواہ ہم اسلامی ترقی کے ظہور کے زمانہ کو لمبا سمجھتے رہے۔ اسلامی ترقی کا زمانہ تو بڑی جلدی آ گیا۔

یہ بھی معنے ہو سکتے ہیں کہ جب لوگ ایمان لائیں گے اپنی کفر کی زندگی کو بہت حقیر سمجھیں گے۔ اور سمجھیں گے کہ اصل پیدائش تو ہماری اب ہوئی ہے۔ اسی طرح مومن بھی تکالیف کے ایام کو بھول جائیں گے۔ اور سمجھیں گے کہ یہ دن تو آنکھ جھپکتے گذر گئے۔ غرض آیت میں زمانہ کی لمبائی کا ذکر نہیں بلکہ ان احساسات کا ذکر ہے جو اس وقت پیدا ہوں گے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ لَيْسَ عَلٰى اَهْلِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْشَةٌ فِيْ قُبُوْرِهِمْ وَلَا فِيْ مَنْشَرِهِمْ وَ كَاَنِّيْ بِاَهْلِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ يَنْفُضُوْنَ التُّرَابَ عَنْ رُؤُوْسِهِمْ وَيَقُوْلُوْنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (روح المعانی زیر آیت ھذا بحوالہ ترمذی و طبری و معجم) کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ کہنے والوں کو قبر میں اور حشر میں بھی آرام ہی رہے گا۔ اور ان کی وہ حالت گویا میں اب دیکھ رہا ہوں جبکہ وہ حشر کے دن اٹھیں گے اور اپنے سر سے مٹی جھاڑ رہے ہوں گے اور یہ کہتے جاتے ہوں گے کہ اللہ کا شکر ہے جس نے ہر قسم کے غم ہم سے دور کر دئے۔ گویا راحت اور ترقی کے ملتے ہی سب غم و حزن دور ہو جائیں گے اور اس زمانہ کو وہ نہایت مختصر خیال کرنے لگیں گے۔

وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ

اور تو میرے بندوں سے کہہ (کہ) وہ وہی بات کہا کریں جو (سب سے) زیادہ اچھی ہو

یَنْزَغُ بَیْنَھُمْ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ کَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا

(کیونکہ) شیطان یقیناً ان کے درمیان فساد ڈالتا ہے۔ شیطان انسان

مُّبِیْنًا ﴿۵۴﴾

کا کھلا (کھلا) دشمن ہے۔

حلّ لُغَات ۔یَنْزَغُ یَنْزَغُ نَزَغَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور نَزَغَ کے لئے دیکھو یوسف آیت نمبر ۱۰۱۔

نَزَغَہٗ: طَعَنَ فِیْہِ۔ نزغ کے معنے ہیں طعنہ زنی کی۔ اِغْتَابَہٗ کسی کی غیبت کی۔ وَذَکَرَہٗ بِقَبِیْحٍ۔ اور اس کے متعلق بدگوئی کی۔ اور نَزَغَ بَیْنَ الْقَوْمِ کے معنی ہیں اَغْرٰی وَاَفْسَدَ وَحَمَلَ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ۔ کہ قوم کے درمیان بگاڑ وفساد ڈالا اور ایک کو دوسرے کے خلاف برانگیختہ کیا۔ اور نَزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنَھُمْ انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ شیطان نے ان کے درمیان بگاڑ ڈال دیا۔ (اقرب)

تفسیر ۔ **باوجود سورتوں کے آگے پیچھے نازل ہونے کے پھر بھی مضامین میں ترتیب ہے**

قرآن کریم کو پڑھ کر کیا ہی لطف آتا ہے ایک سورۃ پہلے نازل ہوئی ہے اور دوسری سورۃ بعد میں۔ پھر پہلی کو ترتیب میں بعد میں رکھ دیا گیا ہے اور بعد والی کو پہلے۔ لیکن ان کے مضمون اس طرح ایک جان ہوجاتے ہیں جیسے کہ ایک وقت میں لکھی ہوئی کتاب کے دو باب۔

سورۃ النحل میں فرمایا تھا۔ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَ الْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَ جَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (النحل:۱۲۶)۔ اسی ترتیب کے مطابق سورۃ بنی اسرائیل کو شروع کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک کی تعلیمی خوبیوں کے بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ذٰلِکَ مِمَّآ اَوْحٰٓی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَۃِ (بنی اسرائیل:۴۰) کہ یہ حکمت کی باتیں ہیں۔ اس کے بعد وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ سے کلام شروع کیا اور الْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ والی شق کو پورا کیا۔

طریق گفتگو کے متعلق نرمی کی تاکید تیسری بات یہ فرمائی تھی وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ۔ اس کا جواب

اب قُلْ لِّعِبَادِیْ سے شروع فرمایا۔ اس ترتیب کو دیکھ کر کوئی شخص کیونکر کہہ سکتا ہے کہ قرآن کریم میں کوئی ربط نہیں ہے۔ اس آیت میں نصیحت کی گئی ہے کہ نہایت سوچ سمجھ کر کلام کیا کرو اور دوسرے لوگوں سے ایسے رنگ میں گفتگو کرو جس سے ان کے دلوں پر اچھا اثر ہو۔

اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَھُمْ اس آیت میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ انسان کو تو اپنے دوستوں سے بھی اچھی بات کرنی چاہیے۔ لیکن جبکہ دشمن دوسرے لوگوں کے دلوں میں نفرت اور عداوت پیدا کر رہا ہو۔ تب تو اور بھی زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ پس ایسے طریق سے کلام کرو اور گفتگو میں ایسی راہ اختیار کرو جو دوسروں کو بھی نرم کر لے۔

شیطان سے بدکردار انسان بھی مراد ہو سکتے ہیں اور وہ مخصوص ہستی بھی۔ کیونکہ وسوسہ اندازی اس کا کام ہے۔

اس آیت میں یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ یَوْمَ یَدْعُوْکُمْ والی بعثتِ اسلامی جلد ظہور پذیر ہو تو ایسا طریق اختیار کرو کہ یہ لوگ جلد مسلمان ہوں۔ اس سے یہ بھی پتہ لگ گیا کہ تَسْتَجِیْبُوْنَ بِحَمْدِہٖ سے اسلام قبول کرنا ہی مراد ہے۔

رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِکُمْ ؕ اِنْ یَّشَاْ یَرْحَمْکُمْ اَوْ اِنْ یَّشَاْ

تمہارا رب تمہیں (سب سے) زیادہ جانتا ہے اگر وہ چاہے گا تو تم پر رحم کرے گا اور اگر وہ چاہے گا تو تمہیں عذاب

یُعَذِّبْکُمْ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ عَلَیْھِمْ وَکِیْلًا ﴿۵۵﴾

دے گا اور (اے رسول) ہم نے تجھے ان کا ذمہ وار بنا کر نہیں بھیجا۔

تفسیر۔ فرمایا ہم ہی انسان کی دونو حالتوں کو جاننے والے ہیں۔ نیکی کی حالت کو بھی اور بدی کی حالت کو بھی اور دل کا حال ہمارے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس لئے ہم نے جزا سزا کا معاملہ اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے اور کسی کے ہاتھ میں نہیں دیا۔ حتیٰ کہ رسول اللہ کے سپرد بھی نہیں کیا۔ پس جیسے جیسے تمہاری حالتیں بدلتی جائیں گی ہمارا معاملہ بھی بدلتا جائے گا۔

وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا

اور جو (کوئی بھی) آسمانوں اور زمین میں (بسنے والے) ہیں انہیں تمہارا رب (سب سے) زیادہ جانتا ہے اور ہم

بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۶﴾

نے یقیناً انبیاء میں سے بعض کو بعض (دوسرے انبیاء) پر فضیلت دی ہے اور داؤد کو (بھی) ہم نے ایک زبور دی تھی

تفسیر ۔ پہلی آیت میں انبیاء کے مخاطبین کو جاننے کا ذکر فرمایا تھا اب اس آیت میں فرماتا ہے جس طرح ہم ان کو جانتے ہیں اسی طرح انبیاء کو بھی جانتے ہیں خواہ آسمان پر ہوں یعنی وفات یافتہ ہوں یا زمین پر ہوں یعنی زندہ ہوں۔ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خوب جانتے ہیں اور اس سے پہلے کے نبیوں کو بھی۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کس زمانہ میں کیسے نبی کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی خیال سے ہم نے انبیاء کے بھی مدارج مقرر فرمائے ہیں۔ تا کہ ہر زمانہ کی ضرورت کے مطابق نبی آئے۔

ان انبیاء میں سے داؤد علیہ السلام کا ذکر الگ بھی بیان فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہود کے ذکر میں ان کے دو عذابوں کا ذکر فرمایا تھا۔ ایک حضرت داؤد کے بعد جب کہ یہود میں دولت بہت ہوگئی اور تعیّش پیدا ہو گیا۔ اور دوسرے حضرت مسیحؑ کے بعد ان کے انکار کی وجہ سے۔ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ مثیل موسیٰ ہیں جیسا کہ فرمایا۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (المزمل: ۱۶) ہم نے تم پر گواہ بنا کر تمہارے اندر اپنا رسول بھجوایا ہے اور یہ بعثت ویسی ہی ہے جیسا کہ فرعون کی طرف موسیٰؑ کی بعثت تھی۔ اور تورات میں ایک مثیل موسیٰ کی خبر دی گئی تھی۔ استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸۔ اور اس کے مقابل پر امت محمدیہؐ کے مثیل بنی اسرائیل ہونے کی خبر سورۃ فاتحہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی دی گئی تھی۔ اس لئے اسی مشابہت کی بناء پر حضرت داؤد کا نام مسلمانوں کو نصیحت کرتے وقت خاص طور پر لیا۔ تا انہیں توجہ دلائی جائے کہ اے مسلمانو! ترقی اور کامیابی کے وقت داؤد کا واقعہ یاد رکھنا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح داؤد کے زمانہ میں یہود نے دنیوی ترقیات سے فائدہ کی بجائے نقصان اٹھایا۔ اور دین سے غافل ہو گئے۔ تم بھی کہیں ایسا نہ کرنا اور اس وقت کو خوف اور خشیت سے گذارنا۔

امت محمدیہ کی مماثلت بنی اسرائیل سے باوجود اس انذار کے مسلمان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے

ہی عرصہ کے بعد بگڑے جتنے عرصہ کے بعد بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کے بعد بگڑے تھے۔اور گو اس وقت ان میں داؤد کی طرح نبی نہیں آیا لیکن ایسے نیک بادشاہ ضرور پیدا ہوئے جنہوں نے حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کی طرح نیکی کا نمونہ دکھایا۔مگر اس وقت دولت کے نشہ میں سرشار تھے اور اسلام کی خدمت سے غافل ہو رہے تھے۔چنانچہ قریباً اتنا ہی زمانہ گذرنے پر جتنا حضرت موسیٰ اور یروشلم کی تباہی پر گذرا تھا۔بغداد ہلاکو خان کے ہاتھ سے تباہ ہو گیا۔ اور اسلامی شوکت مٹ گئی۔جس کے بعد اسے کبھی پوری شان کے ساتھ قائم ہونے کا موقعہ نہیں ملا۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ

تو (انہیں) کہہ (کہ) اس کے سوا جن لوگوں کے متعلق تمہارا دعویٰ ہے (کہ وہ الوہیت رکھتے ہیں) انہیں (اپنی مدد

فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ

کے لئے بھلا) پکارو (تو)۔پس (تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ) نہ وہ (تمہاری کسی) تکلیف کو تم سے دور کرنے کا

وَلَا تَحْوِيْلًا ﴿۵۷﴾

اختیار رکھتے ہیں اور نہ (تمہاری حالت میں) کوئی تبدیلی پیدا کرنے کا۔

حلّ لُغَات۔زعمتم زَعَمْتُمْ زَعَمَ سے جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔اور زَعَمَ الرَّجُلُ (يَزْعُمُ) کے معنے ہیں قَالَ قَوْلًا حَقًّا اس نے سچی بات کہی وَ كَذَا بَاطِلًا وَ كِذْبًا (ضِدٌّ) چونکہ یہ لفظ اضداد میں سے ہے اس لئے اس کے معنے جھوٹی بات کرنے کے بھی ہیں۔وَاَكْثَرُ مَا يُقَالُ فِيْ مَا يُشَكُّ فِيْهِ اَوْ يُعْتَقَدُ كِذْبُهٗ اور اس کا اکثر استعمال ان باتوں میں ہوتا ہے جن میں شک وشبہ ہو یا اس کے جھوٹ ہونے پر یقین ہو۔(اقرب)

فلا یملکون فَلَا يَمْلِكُوْنَ مَلَكَ سے مضارع جمع کا صیغہ ہے اور مَلَكَ کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۱۷۔

مَلَكَ کے معنے ہیں اِحْتَوَاهُ قَادِرًا کسی چیز پر قادرانہ طور پر قبضہ کیا۔مَلَكَ عَلَى الْقَوْمِ: اِسْتَوْلٰى عَلَيْهِمْ کسی قوم پر غالب ہوا۔عَلٰى فُلَانٍ اَمْرَهٗ۔کسی کے کام کا متولی ہوا۔اَلْخِشْفُ اُمَّهٗ: قَوِيَ وَقَدَرَ اَنْ يَّتْبَعَهَا۔ہرن کا بچہ توانا و مضبوط ہو کر اس قابل ہو گیا کہ وہ اپنی ماں کے پیچھے چل سکے۔(اقرب) پس لَا يَمْلِكُوْنَ کے معنے ہوں گے وہ قادر نہیں ہو سکتے۔وہ طاقت نہیں رکھ سکتے۔

کشفٌ کَشْفٌ کَشَفَ (یَکْشِفُ) کا مصدر ہے اور کَشَفَ الشَّیْءَ کے معنے ہیں اَظْھَرَہٗ وَرَفَعَ عَنْہُ مَا یُوَارِیْہِ وَیُغَطِّیْہِ۔ کسی چیز سے پردہ ہٹا کر اسے ظاہر ونگا کر دیا۔ کَشَفَ اللّٰہُ غَمَّہٗ۔ اَزَالَہٗ۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے غم کو دور کر دیا۔ (اقرب)

اَلضُّرُّ اَلضُّرُّ کے لئے دیکھو یوسف آیت نمبر ۸۹۔

اَلضُّرُّ: ضِدُّ النَّفْعِ۔ ضر کے معنے ہیں نقصان۔ سُوْءُ الْحَالِ وَالشِّدَّۃُ۔ تنگ حالی وَفِی الْکُلِّیَّاتِ الضَّرُّ بِالْفَتْحِ شَائِعٌ فِیْ کُلِّ ضَرَرٍ وَبِالضَّمِّ خَاصٌّ بِمَا فِی النَّفْسِ کَمَرَضٍ وَھُزَالٍ کلیات میں یوں لکھا ہے کہ ضَرٌّ کے معنے خاص اس تکلیف کے ہیں جو خود نفس میں ہو جیسے بیماری یا لاغر پن وغیرہ لیکن ضُرٌّ کا لفظ عام ہے اور ہر تکلیف پر بولا جاتا ہے۔ (اقرب)

تَحْوِیْلًا تَحْوِیْلٌ حَوَّلَ کا مصدر ہے یہ لفظ لازم اور متعدی دونوں طرح پر استعمال ہوتا ہے۔ حَوَّلَہٗ (متعدی) نَقَلَہٗ مِنْ مَوْضِعٍ اِلٰی اٰخَرَ اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیا۔ حَوَّلَ الشَّیْءَ اِلَیْہِ: قَلَّبَہٗ وَاَزَالَہٗ کسی چیز کو کسی اور صورت میں تبدیل کر دیا۔ حَوَّلَ ھُوَ۔ (لازم) اِنْتَقَلَ کوئی چیز اپنی جگہ سے دوسری جگہ چلی گئی۔ (اقرب)

تفسیر۔ حشر ارواح پچھلی تین چار سورتوں میں یہ مضمون بیان ہوا تھا کہ کفار حشر اسلام کی آیات سن کر یہ دھوکا کھا جاتے ہیں کہ شاید اس سے حشر اجساد مراد ہے اور اس پر اعتراضات کرنے لگ جاتے ہیں۔ لیکن وہ بھی مراد ہو تب بھی ان کا اعتراض درست نہیں۔ لیکن اس موقعہ پر حشر اجساد کا ذکر نہیں بلکہ حشر ارواح کا ذکر ہے۔ اور یہ ذکر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ایک خاص وقت پر اپنے بندوں کو آواز دے گا تو آئمہ کفار کے بنے ہوئے جال ٹوٹ کر تاگہ تاگہ ہو جائیں گے اور ان کے شکار ان میں سے نکل کر محمد رسول اللہ صلعم کی طرف چلے جائیں گے۔ پھر مسلمانوں کو اس ترقی کے زمانہ میں ہوشیار رہنے کا حکم دیا تھا۔ اب پھر پہلے مضمون کی طرف رجوع فرماتا ہے اور کفار سے خطاب فرماتا ہے کہ یہ جو مسلمانوں کی ترقی اور تمہاری ہلاکت کی پیشگوئی کی گئی ہے اسی سے اپنے دین کی سچائی اور شرک کی حقیقت کا پتہ لگا لو۔ ہم کہتے ہیں کہ تم پر عذاب آئے گا تم اپنے معبودوں سے دعائیں کر کے دیکھو کہ کیا وہ تمہاری دعائیں سن سکتے ہیں اور عذاب کو ہٹانا تو الگ رہا۔ کیا اسے کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کرنے کی طاقت بھی رکھتے ہیں۔

چونکہ آئندہ تباہی شرک سے ہونے والی تھی اس لئے اس کی تفصیل بتائی ہے۔ مسلمانوں میں بھی بغداد کی تباہی

کے وقت شرک ہی پیدا ہو گیا تھا۔ مسلمانوں نے فتوحات کے زمانہ میں ایرانی اور ترکی عورتوں سے شادیاں کیں جو کہ خوبصورت تو تھیں مگر ساتھ ہی متعصب مشرکہ بھی تھیں۔ آخر اولاد میں اس کا اثر ظاہر ہو گیا۔ ابن مقنع۔ عبداللہ بن صباح اسی زمانہ میں ہوئے تھے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ

وہ لوگ جنہیں وہ پکارتے ہیں یعنی ان میں سے جو (خدا تعالیٰ کے) زیادہ قریب ہیں وہ (بھی) اپنے رب کا

أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ ۚ إِنَّ

(مزید) قرب چاہتے ہیں اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں تیرے

عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ﴿۵۸﴾

رب کا عذاب یقیناً ایسا ہے جس سے خوف کیا جاتا ہے۔

حلّ لُغات۔ **الوسیلة** اَلْوَسِيْلَة وَسَلَ (يَسِلُ) کا مصدر ہے اور وَسَلَ اِلَى اللهِ بِالْعَمَلِ کے معنے ہیں رَغِبَ و تَقَرَّبَ متوجہ ہوا اور قرب چاہا۔ وَسَّلَ وَتَوَسَّلَ اِلَى اللهِ بِوَسِيْلَةٍ کے معنے ہیں عَمِلَ عَمَلًا تَقَرَّبَ بِهٖ اِلَيْهِ تَعَالٰى نیک عمل کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کا قرب چاہا۔ تَوَسَّلَ اِلٰى فُلَانٍ بِكَذَا کے معنے ہیں تَقَرَّبَ اِلَيْهِ بِحُرْمَةٍ آصِرَةٍ تَعْطِفُهُ۔ کسی شخص تک ایسے مضبوط ذریعہ سے رسائی کی کوشش کی جس سے وہ مہربان ہو جائے۔ اَلْوَسِيْلَةُ مَا يُتَقَرَّبُ بِهٖ اِلَى الْغَيْرِ۔ ذریعہ قرب۔ اس کی جمع وَسَائِلُ آتی ہے۔ (اقرب)

مَحْذُوْرًا مَحْذُوْرًا حَذَر سے اسم مفعول ہے اس کے معنے ہیں مَا يُحْتَرَزُ مِنْهُ جس سے ڈرا اور بچا جائے۔ (اقرب)

تفسیر۔ اُولٰٓئِكَ کا اشارہ اَلنَّبِيِّيْنَ کی طرف ہے۔ یعنی وہ (انبیاء) ایسے لوگ تھے جو بنی نوع انسان کو خدا کی طرف پکارتے تھے یا یہ کہ وہ خدا تعالیٰ کے حضور عجز و انکسار سے دعا کیا کرتے تھے۔

يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ خبر ہے اُولٰٓئِكَ کی۔ اور مطلب یہ ہے کہ انبیاء جن کی صفت ہے کہ وہ تبلیغ میں لگے رہتے ہیں یا یہ کہ دعاؤں میں لگے رہتے ہیں وہ بھی باوجود اس قدر نیک اور عاشق الٰہی ہونے کے صرف اپنے

رب کا قرب تلاش کرتے ہیں۔ دوسرے کسی وجود کو معبود بنا کر اس کا قرب تلاش نہیں کرتے۔

مقربین کے اشتیاق قرب الٰہی میں دوسروں کے لئے سبق اَیُّهُمْ اَقْرَبُ۔ علامہ زمخشری کا قول ہے اور اکثر مفسرین نے اس کی تائید کی ہے کہ اَیٌّ موصولہ ہے اور اَیُّهُمْ اَقْرَبُ کے معنے مَنْ هُمْ اَقْرَبُ کے ہیں اور یہ جملہ یَبْتَغُوْنَ کی ضمیر فاعل کا بدل ہے۔ یعنی یہ قرب حاصل کرنے کی کوشش کرنے والے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ جب زیادہ قرب والے لوگ بھی اللہ تعالیٰ کے مزید قرب کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں تو جن کو قرب حاصل نہیں ان کو تو بہت ہی زیادہ کوشش کرنی چاہیے۔

خلاصہ یہ کہ خدا کا قرب ایسی چیز نہیں ہے۔ جو دوسروں کی پرستش کے ذریعہ سے حاصل ہو سکے۔ اور پھر جب بڑے سے بڑا نبی بھی خدا کے قرب کی تلاش میں ہے اور ابھی وہ قرب الٰہی میں ترقی کی جستجو کر رہا ہے تو وہ تمہارے لئے زعیم اور ٹھیکیدار کیسے بن سکتا ہے۔ فرمایا جو اقرب ترین نبی ہے وہ بھی ابھی اَور قرب حاصل کرنا چاہتا ہے دوسرے تو الگ رہے۔ جب نبیوں تک کی یہ بات ہے تو تمہاری تو ہستی ہی کیا ہے۔

ایک اَور معنے بھی آیت کے ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ اُولٰٓئِكَ کا اشارہ معبودین کی طرف سمجھا جائے اور یَدْعُوْن کا فاعل مشرکوں کو۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ معبود جن کو مشرک بلاتے ہیں وہ تو اپنے رب کے قرب کی تلاش کر رہے ہیں اور اس کا خیال رکھتے ہیں کہ کون خدا تعالیٰ کا زیادہ مقرب ہوتا ہے۔ ان معنوں میں اَیٌّ استفہامیہ سمجھا جائے گا اور اس کا عامل فعل محذوف یا مصدر محذوف سمجھا جائے گا۔ جیسے یَحْرُصُوْنَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ یا یہ کہ بغیّتهم اَیُّهُمْ اَقْرَبُ۔

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ

اور (روئے زمین پر) کوئی ایسی بستی نہیں (ہوگی) جسے ہم قیامت کے دن سے پہلے ہلاک نہ کر دیں

مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ

یا اسے بہت سخت عذاب نہ دیں۔ یہ بات تقدیر (الٰہی) میں

مَسْطُوْرًا ﴿۵۹﴾

(پہلے سے) لکھی ہوئی ہے۔

حل لغات۔ مَسْطُوْرًا مَسْطُوْرًا سَطَرَ سے اسم مفعول ہے۔ اور سَطَرَ الْکَاتِبُ کے معنے ہیں۔ کَتَبَ۔ کاتب نے لکھا۔ (اقرب) پس مَسْطُوْرٌ کے معنے ہوں گے لکھی ہوئی۔

تفسیر۔ جب شرک ساری دنیا میں پھیلے گا تو عذاب بھی ساری دنیا پر آئے گا پہلے فرمایا تھا کہ اپنے معبودوں کو پکارو۔ وہ تمہاری تکلیف کو نہ تو دور کر سکتے ہیں اور نہ اسے بٹا سکتے ہیں۔ اب اس کی ایک مثال بیان فرماتا ہے اور وہ یہ کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ دنیا کے پردہ پر مشرک قوموں کا غلبہ ہو جائے گا اور توحید قریباً مٹ جائے گی۔ اس وقت جب شرک اپنی انتہا کو پہنچ جائے گا۔ ہم ساری دنیا پر عذاب لائیں گے کیونکہ شرک تمام دنیا پر غالب ہوگا۔ اس کو مٹانے کے لئے ساری دنیا کو عذاب میں مبتلا کرنا ہوگا۔ اس وقت ہمارے اس دعوے کی صداقت نہایت واضح ہو جائے گی کیونکہ اس پیشگوئی کے ماتحت ساری دنیا پر عذاب آئے گا۔ لوگ جھوٹے معبودوں کو پکاریں گے مگر کچھ نہ بنے گا۔ اس کی تفصیل آگے سورۃ کہف میں بیان ہوگی۔

اس آیت میں مسلمانوں کو بھی اس دوسرے عذاب سے ہوشیار کیا گیا ہے جس سے بوجہ محمدی سلسلہ اور موسوی سلسلہ میں مشابہت تامہ پائے جانے کے انہیں خطرہ ہو سکتا تھا۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا

اور پہلے لوگوں کی تکذیب کے سوا ہمیں نشانات کے بھیجنے سے کسی امر نے نہیں روکا۔ (پس ہم نشان بھیجنے سے کس

الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ

طرح رک سکتے تھے) اور (جب) ہم نے ثمود کو (صالح کی) اونٹنی ایک روشن نشان کے طور پر دی۔ تو انہوں نے اس

وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴿۶۰﴾

پر ظلم (ہی) کیا۔ اور ہم نشانوں کو (بدانجام سے) ڈرانے کے لئے ہی بھیجا کرتے ہیں۔

حلّ لُغَات۔ ظلموا بھا ظَلَمُوْا بِهَا ظَلَمَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اَلظُّلْمُ کے معنے ہیں۔

اَلتَّصَرُّفُ فِیْ مِلْكِ الْغَیْرِ وَ مُجَاوَزَةُ الْحَدِّ حد سے بڑھ جانا اور دوسرے کی ملکیت پر دست درازی کرنا۔ انہی معنوں کے پیشِ نظر لفظ ظلم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کی جاتی۔ نیز اس کے معنے ہیں وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ غَیْرِ مَوْضِعِہٖ کسی بات یا کام کو بے جا اور بے محل کرنا۔ وَظَلَمَ الْبَعِیْرَ: ظُلْمًا اِذَا نَحَرَہٗ مِنْ غَیْرِ دَاءٍ۔ اور ظَلَمَ الْبَعِیْرَ کے معنے ہیں کہ اونٹ کو بغیر کسی بیماری کے ذبح کر دیا (تاج)

تفسیر۔ آسمانی معجزات کا سلسلہ کسی وقت بھی بند نہ ہوگا اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ کسی زمانہ میں بھی آسمانی معجزات کے متعلق یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ اب ان کا سلسلہ بند ہوگیا ہے۔ یہ مسلمانوں کو نصیحت ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کے لئے بھی خطرہ تھا کہ جب وہ اللہ تعالیٰ سے غافل ہوجائیں اور اس کے تازہ نشانات دیکھنے سے محروم ہوجائیں تو یہ سمجھنے لگیں کہ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نشانات کا آنا بند ہوگیا ہے۔ پس انہیں ہوشیار کردیا گیا کہ ایسا کبھی خیال نہ کرنا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ نشانات دکھاتا رہتا ہے تاکہ اس کے بندوں کے ایمان تازہ ہوتے رہیں۔

دلائل اس بارہ میں کہ نشانات ہمیشہ جاری رہیں گے نشانات کے ہمیشہ جاری رکھنے کے لئے مندرجہ ذیل دلائل بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) نشانات دکھانے کے خلاف صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان نشانوں سے پہلوں نے کیا فائدہ اٹھایا کہ آپ اٹھائیں گے۔ فرماتا ہے کہ اگر یہ وجہ نشان بھیجنے کے خلاف ہوتی تو پہلے نبی کے بعد پھر کوئی نشان ہی ظاہر نہ ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ انبیاء کے دشمن نشانات کا انکار کرتے ہی چلے گئے ہیں اور ہم بھی نشانات بھیجتے چلے گئے ہیں۔ پس کسی وقت بھی اس وجہ سے نشانات کا بھیجنا بند نہیں ہوسکتا۔ آدمؑ کے وقت میں بھی نشانات دکھائے گئے۔ نوحؑ کے وقت میں بھی نشان دکھائے گئے۔ اور پھر باوجود تکذیب ثمود کی قوم کو بھی نشان دکھائے گئے جو آدمؑ اور نوحؑ کے بعد گذری ہے۔

ثمود کی مثال اس لئے دی گئی ہے کہ ثمود عرب قوموں میں سے تھے اور ان کے مٹے ہوئے آثار عرب کے کفار۔ یہود اور نصاریٰ سب کے سامنے موجود تھے۔ اور تینوں قومیں ان کے حالات سے عبرت حاصل کرسکتی تھیں۔

عذاب سے پیشتر نشانات کا بھیجنا ضروری ہوتا ہے اس کے بعد دوسری دلیل یہ دی کہ جب عذاب آئے اس سے پہلے نشانات کا بھیجنا ضروری ہوتا ہے۔ تاکہ جو لوگ عذاب سے بچائے جاسکیں بچا لئے جائیں۔ پس جب ہم یہ خبر دے رہے ہیں کہ آئندہ زمانہ میں شدید عذاب آئیں گے حتّٰی کہ دنیا کی کوئی بستی ان عذابوں سے محفوظ نہ

رہے گی۔تو مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس وقت آسمانی نشانات بھی ضرور دکھائے جائیں گے کیونکہ بغیر تخویف کے عذاب کا بھیجنا ہماری سنت کے خلاف ہے۔

وَ اِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَ مَا جَعَلْنَا

اور جب ہم نے تجھے کہا تھا (کہ) تمہارا رب ضرور ان لوگوں کو ہلاک (کرنے کا فیصلہ) کر چکا ہے۔(تب

الرُّءْيَا الَّتِيْۤ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَ الشَّجَرَةَ

انہوں نے کیا فائدہ اٹھایا) اور جو رؤیا ہم نے تجھے دکھائی تھی۔اسے (بھی) اور اس درخت کو (بھی) جسے قرآن میں

الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ؕ وَ نُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا

ملعون قرار دیا گیا ہے۔ہم نے لوگوں کے لئے صرف امتحان کا ذریعہ بنایا تھا اور (باوجود اس کے کہ) ہم انہیں

طُغْيَانًا كَبِيْرًا ؑ﴿۶۱﴾

ڈراتے (چلے جاتے) ہیں پھر (بھی) وہ (ہمارا ڈرانا) انہیں ایک بہت بڑی سرکشی میں ہی بڑھا رہا ہے۔

حلّ لُغَات ۔اَحَاطَ بِالنَّاسِ اَحَاطَ بِالْاَمْرِ کے معنے ہیں اَحْدَقَ بِهٖ مِنْ جَوَانِبِهٖ کسی امر پر پورے طور پر قابو پالیا۔اُحِيْطَ بِهٖ: دَنَا هَلَاكُهٗ اس کی ہلاکت قریب ہوگئی (اقرب) پس اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ کے معنے ہوں گے کہ (۱) تمہارا رب ان لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے (۲) لوگ ہر رنگ میں اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔

فِتْنَةٌ فَتَنَ سے مصدر ہے اور اس کے معنے ہیں۔اَلْخِبْرَةُ وَالْاِبْتِلَاءُ۔آزمائش اور امتحان۔ اَلضَّلَالُ وَالْاِثْمُ وَالْكُفْرُ۔گمراہی۔گناہ۔کفر۔ اَلْفَضِيْحَةُ۔رسوائی۔ذلت۔اَلْعَذَابُ۔عذاب۔ اَلْمَرَضُ۔مرض۔ اَلْعِبْرَةُ۔عبرت۔اِخْتِلَافُ النَّاسِ فِي الْاٰرَاءِ وَمَا يَقَعُ بَيْنَهُمْ مِنَ الْقِتَالِ۔اختلاف آراء اور اس کی وجہ سے لڑائی جھگڑا۔(اقرب)

طُغْيَان طُغْيَانٌ طَغٰى يَطْغٰى اور طَغِيَ يَطْغٰى کا مصدر ہے۔اور طغی کے معنے ہیں جَاوَزَ الْقَدْرَ وَالْحَدَّ۔

اندازہ اور حد سے بڑھ گیا۔ طَغٰی فُلَانٌ اَسْرَفَ فِی الْمَعَاصِیْ وَالظُّلْمِ گناہوں اور ظلم میں بڑھ جانا۔ (اقرب)

تفسیر ۔ اَحَاطَ بِہٖ ۔ کے معنے کسی چیز کا احاطہ کر لینے کے بھی ہوتے ہیں یعنی اس کے سب اجزاء کو قبضہ میں کر لیا جائے اور اس کے معنے عذاب کامل کے بھی ہوتے ہیں۔ کیونکہ کسی قوم کا احاطہ کر لیا جاوے تو وہ بھاگ کر بچ نہیں سکتی۔ اس جگہ اَحَاطَ کے معنے سب کو گھیر لینے یا ایک حلقہ میں لے آنے کے ہیں۔ فرماتا ہے کہ یاد کرو جب ہم نے تم کو کہا تھا کہ ہم سب دنیا کا احاطہ کرنے والے ہیں یا یہ کہ سب کو ایک حلقہ میں لانے والے ہیں۔

آنحضرتؐ کے سب انبیاء کو نماز پڑھانے کی تعبیر اس سے اشارہ اسی سورۃ کی پہلی آیت کی طرف ہے جس میں اسراء والا کشف بیان کیا گیا ہے۔ اس کشف میں آپ کو دکھایا گیا تھا کہ آپؐ نے سب نبیوں کو نماز پڑھائی ہے جس کی تعبیر یہ تھی کہ سب نبیوں کی امتیں آپ کے دین میں داخل ہوں گی۔

آخری زمانہ کے مصائب کے بعد اسلام کی عالمگیر اشاعت سو اَحَاطَ بِالنَّاسِ کہہ کر اس کشف کے مضمون کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے ذکر کا موقعہ یہ ہے کہ پہلی آیتوں میں بتایا گیا تھا کہ سب دنیا پر عذاب آنے والا ہے اب اس کی وجہ بیان فرماتا ہے کہ اس عذاب کی وجہ یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اس کشف کو پورا کرے جو اسراء کی صورت میں تجھے دکھایا گیا تھا اور اس پیشگوئی کو پورا کرے کہ سب انبیاء کی جماعتیں اسلام میں داخل ہو جائیں گی۔ اس عالمگیر عذاب کے بعد تبلیغ اسلام کا راستہ کھل جائے گا اور سب اقوام کو مذہب کی طرف توجہ ہو جائے گی اور مادیت سے لوگ مایوس ہو جائیں گے تب اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور احسان سے ان کے دل سچائی کے قبول کرنے کے لئے کھول دے گا۔ اور وہ محمد رسول اللہ صلعم کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گے اس موعود عذاب کے آثار اس وقت دنیا میں ظاہر ہو رہے ہیں اور اس کے بعد انشاء اللہ اسلام کے پھیلنے کے سامان بہت کثرت سے پیدا ہو جائیں گے۔

آیت کے اگلے حصہ میں اس مضمون کو واضح کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ یہ نظارہ جو ہم نے دکھایا تھا یہ لوگوں کے لئے امتحان کا ذریعہ تھا یعنی ہم پیشگوئی تو صاف لفظوں میں بھی کر سکتے تھے مگر ہم نے اس نظارہ کو تمثیلی زبان میں اس لئے بیان کیا تا لوگوں کا امتحان بھی لے لیا جائے۔ جو ابوبکری صفات کے تھے انہوں نے اس نظارہ کا ذکر سنا اور اس پر ایمان لے آئے اور جن کے دل تقویٰ سے خالی تھے انہوں نے اس پر اعتراض کرنا شروع کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کے نشان ایک پہلو امتحان کا بھی رکھتے ہیں اس آیت سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نشان ایک پہلو امتحان کا بھی رکھتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود آج مسلمان بھی اس خیال میں مبتلا ہیں کہ پیشگوئیاں جب تک ایسے واضح الفاظ میں نہ ہوں کہ احمق سے احمق بھی ان کا انکار نہ کرے انہیں سچا نہیں کہا جا سکتا۔

شجرہ ملعونہ سے کیا مراد ہے اَلشَّجَرَۃَ الْمَلْعُوْنَۃَ۔فرمایا وہ رویا جو ہم نے تجھ کو دکھائی ہے اسے بھی ہم نے لوگوں کے لئے فتنہ یعنی آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے اور اس شجر کو بھی ہم نے لوگوں کے لئے آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں آتا ہے کہ وہ ملعونہ ہے۔

یہ شجرۂ ملعونہ کیا شے ہے؟ اس بارہ میں مفسرین میں بہت اختلاف ہوا ہے۔بعض کہتے ہیں اس سے مراد شجرۃ الزّقوم ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں تین جگہ آیا ہے یعنی سورۂ واقعہ۔سورۃ صافّات اور سورۃ دخان میں۔ (کشاف، رازی و ابن کثیر زیر آیت ھذا) اور اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ قرآن کریم میں جب یہ بیان ہوا کہ دوزخیوں کا کھانا زقّوم ہے تو کفار نے اس پر ہنسی اڑائی۔کیونکہ یمن کی لغت میں زقّوم اس کھانے کو کہتے ہیں جو مکھن اور کھجور ملا کر تیار کیا جاتا ہے۔کفار نے اس لفظ کو سن کر خوب شور مچایا کہ محمد صلعم ہمیں زقوم کی خبر دیتا ہے یہ تو اعلیٰ درجہ کا کھانا ہے۔ہمیں اور کیا چاہیے۔ان معنوں کے حق میں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ شجرۃ زقوم کے متعلق بھی قرآن کریم میں آتا ہے۔اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ (الصّٰفّٰت:۶۴) ہم نے زقوم کو ظالموں کے لئے فتنہ کا موجب بنایا ہے۔اور یہی الفاظ فتنہ کے شجرۂ ملعونہ کی نسبت آتے ہیں۔مگر انہیں یہ مشکل پیش آئی ہے کہ قرآن میں اس کے ملعون ہونے کا کہیں ذکر نہیں۔اس کا جواب انہوں نے یوں دیا ہے کہ زقوم کی نسبت قرآن کریم میں آتا ہے کہ وہ جہنم میں ہوگا۔اور جو چیز جہنم میں ہو وہ ملعون ہے۔کیونکہ جہنم خدا کے غضب کا مقام ہے۔پھر اس توجیہہ پر خود ہی انہوں نے یہ اعتراض اٹھایا ہے کہ شجرہ کیونکر ملعون ہوسکتا ہے۔ملعون تو نافرمان وجود کہلا سکتا ہے اور شجرہ تو بے جان چیز ہے۔اس کا جواب انہوں نے یہ دیا ہے کہ چونکہ اس کے کھانے والے ملعون ہو گئے۔اس لئے وہ شجرہ بھی ملعون کہلائے گا۔

بعض کے نزدیک شجرہ ملعونہ سے مراد اکاس بیل ہے بعض نے کہا ہے کہ شجرہ ملعونہ سے مراد شجرۂ کشوث ہے (روح المعانی زیر آیت ھذا)۔یعنی وہ بیل جو درختوں پر چڑھتی ہے تو درخت سوکھ جاتا ہے۔ (کشوث افتیمون کے بیجوں کو کہتے ہیں۔افتیمون ایک بیل ہوتی ہے جس کی باریک زرد شاخیں ہوتی ہیں۔جس درخت کے گرد لپٹ جائے۔وہ درخت خشک ہونا شروع ہوجاتا ہے۔اس کی جو قسم ہندوستان میں پائی جاتی ہے اسے اکاس بیل یا امر بیل یا امرلتّہ کہتے ہیں۔پنجاب میں غالباً اسی کا نام کوڑی ویل ہے۔یعنی کڑوی بیل پنجابی میں ایک دعا ہے ''تُو کوڑی ویل دی طرح ودھیں۔'' یعنی اکاس بیل کی طرح جو بہت جلد پھیل جاتی ہے۔تیری ترقی ہو۔اور جس کے تُو مخالف ہو وہ تباہ ہوجائے۔کیونکہ یہ بوٹی جس درخت سے لپٹ جاتی ہے اسے خشک کر دیتی ہے)۔

لیکن ان معنوں کا اتنا بھی ثبوت قرآن کریم سے نہیں ملتا جتنا ثبوت کہ شجرۂ زقوم سے ملتا ہے۔

آنحضرتؐ نے مروان بن الحکم کے خاندان کو بھی شجرہ ملعونہ کہا بعض روایات میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف یہ روایت منسوب کی گئی ہے کہ آپؓ نے مروان بن الحکم سے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے تیرے باپ اور دادا سے کہا کہ اِنَّکُمُ الشَّجَرَۃُ الْمَلْعُوْنَۃُ فِی الْقُرْاٰنِ۔ یعنی قرآن کریم میں جو شجرۂ ملعونہ کا لفظ آتا ہے اس سے مراد تمہارا خاندان ہے (در منثور زیر آیت ھذا)۔ بعض نے اس سے مراد وہ شجرۂ خبیثہ لیا ہے جس کا ذکر سورۂ ابراہیم ع ۵ میں گذر چکا ہے (روح المعانی زیر آیت ھذا)۔ میں خود بھی اس وقت تک یہی معنے کرتا رہا ہوں۔ کیونکہ اس کے سوا باقی جس قدر معنے کئے گئے ہیں ان کا کوئی تعلق آیت قرآنی کے الفاظ سے نہیں معلوم ہوتا۔ میں اس کی تشریح یہ کیا کرتا ہوں کہ خبیث اس چیز کو کہتے ہیں جس میں کوئی خیر نہ ہو۔ اور جس چیز میں کوئی خیر نہ ہو اس کی نسبت قرآن کریم فرماتا ہے کہ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْهَبُ جُفَآءً (الرعد:۱۸)۔ یعنی جو چیز جھاگ کی طرح بے کار ہو اسے پھینک دیا جاتا ہے۔ اور لعنت بھی دور کرنے کو کہتے ہیں۔ پس جس چیز کی نسبت یَذْهَبُ جُفَآءً کہا جائے۔ دوسرے لفظوں میں اسے ملعون بھی کہہ سکتے ہیں۔

مگر اس وقت کہ میں یہ نوٹ لکھنے بیٹھا ہوں مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک اَور معنے بھی سکھائے ہیں اور میں وہ معنے بھی لکھ دیتا ہوں کیونکہ ان معنوں کا آیت کے سیاق و سباق سے زیادہ گہرا ربط معلوم ہوتا ہے۔ ان معنوں کو سمجھنے کے لئے پہلے شَجَرۃ کے معنے سمجھ لینے چاہئیں۔ شجرۃ کے معنے درخت کے بھی ہوتے ہیں اور شجرہ کے معنے خاندان یا قبیلہ کے بھی ہیں۔ چنانچہ لغت میں لکھا ہے شَجَرَۃُ النَّسَبِ مَا یُبْتَدَأُ فِیْهَا مِنَ الْجَدِّ الْاَعْلٰی اِلٰی اَوْلَادِہٖ ثُمَّ اِلٰی اَوْلَادِھِمْ وَهَلُمَّ جَرًّا (اقرب) یعنی شجرۂ نسب اسے کہتے ہیں کہ کسی جدّ اعلیٰ سے لے کر اس کی اولاد اور پھر اس کی اولاد اور پھر ان کی اولاد کا ذکر کیا جائے۔ ان معنوں کے رو سے شجرۂ ملعونہ کے معنے ایسے خاندان کے ہو سکتے ہیں جو کئی پشت تک خدائی لعنت کے ماتحت رہا ہو یا رہنے والا ہو۔ ان معنوں کی سند حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب ہونے والی اس روایت سے بھی مل جاتی ہے جو میں اوپر بیان کر آیا ہوں۔ یہ روایت تو میرے نزدیک غلط ہے لیکن اس سے ہم عربی کے محاورہ کی سند لے سکتے ہیں۔ کیونکہ بہرحال راوی اور جامع حدیث عرب ہیں اور عربی کے محاورہ کو سمجھتے ہیں۔

اس تشریح کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ کیا قرآن کریم میں کسی خاندان کو ایک لمبے عرصہ تک خدائی لعنت کے نیچے آنے والا بتایا گیا ہے کہ نہیں۔ اگر ایسا ہے تو وہی خاندان شجرہ ملعونہ ہے۔

شجرہ ملعونہ سے مراد وہ قوم ہے جس پر خدا کی لعنت ہوگی یعنی بنی اسرائیل قرآن کریم کو دیکھنے سے

معلوم ہوتا ہے کہ ایک قوم اور خاندان کے لوگ ایسے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے ایک لمبے عرصہ کے لئے ملعون قرار دیا ہے۔ اور وہ حوالہ یہ ہے۔ لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ (المائدة:۷۹) بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم نے لعنت کی ہے۔ اسی طرح سورۃ نساء میں یہود کا ذکر کر کے فرمایا ہے کہ اے اہل کتاب محمد رسول اللہؐ پر اس دن سے پہلے ایمان لے آؤ کہ تمہاری قوم پر عذاب آ جائے یا ہم ان پر لعنت ڈالیں جس طرح کہ ان کے باپ دادوں پر سبت کے انکار کی وجہ سے لعنت نازل کی گئی تھی۔ اسی طرح یہود کی نسبت آتا ہے فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ (المائدة:۱۴) یعنی یہود سے وعدہ لیا گیا تھا کہ وہ محمد رسول اللہ صلعم پر جب وہ ظاہر ہوں ایمان لائیں گے لیکن انہوں نے چونکہ اس وعدہ کو پورا نہیں کیا اس لئے ہم نے ان پر لعنت بھیجی ہے اسی طرح سورۂ مائدہ میں یہود کی نسبت آتا ہے مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِيْرَ (المائدة:۶۱) یعنی اے اہل کتاب تم تو وہ قوم ہو۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی اور غضب نازل کیا اور بندر اور سؤر بنا دیا۔ اس سے کچھ آیات آگے چل کر پھر آتا ہے وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا (المائدة:۶۵) یعنی یہودی چندوں اور زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل پر تمسخر کر کے کہتے ہیں۔ خدا ان کو مال نہیں دیتا اس کے ہاتھ بند ہو گئے ہیں ان کے اس گستاخانہ کلام کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس قوم میں بخل پیدا ہو جائے گا اور مال کی محبت بڑھ جائے گی اور ان پر خدا تعالیٰ کی لعنت پڑتی رہے گی۔ اس کے علاوہ اور متعدد مقامات پر یہود کے ملعون ہونے کا ذکر آتا ہے پس بنی اسرائیل جو ایک نسل کے لوگ تھے ان پر متواتر لعنت پڑی اور قرآن کریم نے بھی ان کی قوم پر لعنت ڈالی اور فرمایا کہ اس قوم کو صرف دو طرح امن ملے گا یا تو یہ دوسری زبردست قوموں کی پناہ میں چلی جائے یا پھر مسلمان ہو جائے۔ ان دونوں طریقوں کے سوا ان کو کبھی امن نہ ملے گا۔ پس میرے نزدیک آیت زیر بحث میں شجرۂ ملعونہ سے مراد بنی اسرائیل کی قوم ہے۔ اور چونکہ یہ سورۃ بھی خصوصاً سورۃ بنی اسرائیل کے متعلق ہے۔ حتیٰ کہ اس کا ایک نام رسول کریم صلعم نے سورۂ بنی اسرائیل بتایا ہے (ابن ماجہ کتاب اقامة الصلوٰة باب عدد سجود القرآن) اور چونکہ اس آیت میں بنی اسرائیل ہی کا ذکر ہے کیونکہ اس آیت میں اسراء کا ذکر کیا گیا ہے جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو بنی اسرائیل کے مرکز میں دیکھا اور وہاں نماز پڑھائی۔ پس اسراء والی رؤیا کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرما دیا کہ یہ رؤیا بھی لوگوں کے امتحان کا ذریعہ ہے۔ اور بنی اسرائیل جن کا اس رویا میں خصوصیت کے ساتھ ذکر ہے وہ بھی ایک امتحان ہیں یعنی وہ ہمیشہ اسلام کی بلا وجہ مخالفت کرتے رہیں گے۔ چنانچہ دیکھ لو کہ یہود کو سب سے زیادہ امن اسلامی ممالک میں ملتا ہے اور پھر بھی یہ لوگ اسلام سے دشمنی ہی کرتے چلے جاتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ ان کے امن

کا واحد ذریعہ اسلام ہے یہودی رہ کر وہ دنیا کے ظلموں کا تختۂ مشق ہی بنے رہیں گے۔ آیت کے آخر میں فرمایا کہ ہم تو اس قوم کو ان کا انجام بتا بتا کر ڈراتے ہیں لیکن یہ سرکشی میں اور زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔

اس آیت کا تعلق پہلی آیت سے ہے اس آیت کا تعلق پہلی آیات سے یہ ہے کہ ان میں آخری زمانہ کے خطرناک عذاب کو بطور مثال پیش کیا گیا تھا۔ اب اس آیت میں بتایا ہے کہ وہ عذاب اسراء والے کشف کا طبعی نتیجہ ہے کیونکہ اس عذاب سے اسلام کی ترقی وابستہ ہے اور اس کے بعد اسلام کی وسیع اور عالمگیر اشاعت مقدر ہے۔

موجودہ اور سابقہ جنگ یہود کی دخل اندازی سے ہوئی اور ساتھ ہی یہود کا ذکر کر کے یہ بتایا کہ یہ قوم بھی فتنہ ہے یعنی وہ دوسرا فتنہ اس فتنہ گر قوم کے ذریعہ سے پیدا ہوگا چنانچہ دیکھ لو کہ گزشتہ جنگ عظیم بھی یہود کی دخل اندازی کی وجہ سے ہوئی تھی اور موجودہ جنگ بھی انہی کی وجہ سے ہے۔ پہلی جنگ میں یہود نے منظم طور پر جرمنی قوم کے خلاف کام کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب جرمنوں نے یہود پر ظلم کرنا شروع کیا اور بدلہ لیا۔ انہوں نے پھر ان کے خلاف پروپیگنڈا کیا اور موجودہ جنگ شروع ہوئی۔ روس کے انقلاب میں بھی کہ وہ اس عذاب کا ایک حصہ ہے یہود کا سب سے بڑا دخل ہے اور روس کے کئی بڑے بڑے لیڈر یہودی النسل ہیں۔

پہلی جنگ عظیم سے پہلے بعض اخبارات نے یہود کی بعض تحریرات شائع کی تھیں کہ یہود سازش کر رہے ہیں کہ ایک بڑی جنگ کرا کے فلسطین واپس جانے کے سامان پیدا کریں۔ آئندہ واقعات نے اس کی تصدیق کر دی۔ مگر جیسا کہ قرآن کریم نے بتایا ہے یہود کا فلسطین میں آنا عارضی ہوگا ان کو یہ ملک دائمی طور پر نہیں مل سکتا کیونکہ دائمی طور پر تو یہ مسلمانوں کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ

اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں کو کہا تھا (کہ) تم آدم کے ساتھ (ساتھ) سجدہ کرو تو انہوں نے

قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۚ﴿۶۲﴾

(تو اس حکم کے مطابق) سجدہ کیا۔ مگر ابلیس (نے نہ کیا)۔ اس نے کہا (کہ) کیا میں اس کے ساتھ سجدہ کروں جسے تو نے کیچڑ سے پیدا کیا ہے

حلّ لُغَات۔ لِاٰدَمَ ل جارہ کے بائیس معنے ہیں۔ ان میں سے ایک معنے مَعَ کے ہیں چنانچہ ایک

شاعر کا شعر ہے

فَلَمَّا تَفَرَّقْنَا کَأَنِّیْ وَ مَالِکًا
لِطُوْلِ اجْتِمَاعٍ لَمْ نَبِتْ لَیْلَةً مَعًا

یہاں لِطُوْلِ میں ل کے معنے مَعَ کے کئے گئے ہیں (مغنی اللبیب حرف ا لام) پس وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ کے معنے ہوں گے کہ جب ہم نے فرشتوں کو کہا کہ تم آدم کے ساتھ سجدہ کرو۔

اِبْلِیْسَ ابلیس کے معنی کے لئے دیکھو حجر آیت نمبر ۳۲۔

اَبْلَسَ مِنْ رَحْمَةِ اللّٰہِ کے معنے ہیں۔یَئِسَ۔ناامید ہو گیا۔اور اَبْلَسَ فِیْ أَمْرِہٖ کے معنی ہیں۔تَحَیَّرَ۔حیران ہو گیا۔وَقِیْلَ اِبْلِیْسُ مِنْ اَبْلَسَ بِمَعْنَی یَئِسَ وَتَحَیَّرَ۔یعنی اَبْلَسَ کے معنی ناامید اور حیران ہونے کے ہیں۔اور اِبْلِیْسُ اسی سے بنا ہے۔یعنی ناامید اور حیران۔اس نام سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہو گیا ہے۔اور حیران رہ گیا ہے۔جَمْعُہٗ اَبَالِیْسُ وَ اَبَالِسَةٌ۔اس کی جمع اَبَالِیْسُ اور اَبَالِسَةٌ آتی ہے۔(اقرب)

اَلطِّیْنُ اَلطِّیْنُ تُرَابٌ اَوْ رَمْلٌ وَکِلْسٌ یُجْبَلُ بِالْمَاءِ وَیُطْلٰی بِہٖ۔مٹی یا ریت اور چونہ جس میں پانی ملایا گیا ہو۔اور اس کے ساتھ لپائی کی جائے۔(اقرب)

تفسیر۔چونکہ پہلی آیات میں یہود کی سرکشیوں کا ذکر کیا تھا۔اب اس پر روشنی ڈالنے کے لئے آدم کے واقعہ کو بطور تمثیل پیش کیا ہے کہ انبیاء کی مخالفت ہمیشہ سے ہوتی چلی آئی ہے۔ابوالبشر آدم جو سب سے پہلے نبی تھا۔اس کی بھی ایک ابلیس نے مخالفت کی اور کہا کہ یہ ادنیٰ ہے۔میں اس سے اچھا ہوں۔پھر اس کی اطاعت کیونکر کروں۔یہی ابتلاء یہود کے سامنے ہے۔وہ بھی اپنے آپ کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور ان کی قوم سے افضل سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے دل میں یہ خیال راسخ ہے کہ بنو اسحاق سب ابراہیمی برکات کے وارث ہیں۔اور بنو اسماعیل گویا محروم الارث کئے ہوئے ہیں۔پس یہ تکبر ان کے راستہ میں روک بننے والا ہے۔

قَالَ اَرَءَيۡتَكَ هٰذَا الَّذِىۡ كَرَّمۡتَ عَلَىَّ لَئِنۡ اَخَّرۡتَنِ اِلٰى

(اور نیز) اس نے کہا (کہ تو ہی مجھے) بتا (کہ کیا) یہ (میرا مطاع ہوسکتا) ہے جسے تو نے مجھ پر شرف دے دیا ہے۔

يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ لَاَحۡتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۶۳﴾

اگر تو نے مجھے قیامت کے دن تک مہلت دی تو (مجھے تیری ہی ذات کی قسم ہے کہ) میں اس کی (تمام) اولاد کو قابو میں کرلوں گا سوائے تھوڑے سے لوگوں کے (جنہیں تو بچالے)۔

حلّ لُغات۔ كَرَّمۡتَ عَلَىَّ كَرَّمَهٗ (تَكۡرِيۡمًا وَتَكۡرِمَةً) کے معنے ہیں عَظَّمَهٗ وَنَزَّهَهٗ اس کو اعزاز و شرف دیا اور اس کو پاک ٹھیرایا۔ (اقرب) پس هٰذَا الَّذِىۡ كَرَّمۡتَ عَلَىَّ کے معنے ہوں گے کہ (کیا) یہ (میرا مطاع ہوسکتا) ہے جسے تو نے مجھ پر شرف دے دیا۔

لَاَحۡتَنِكَنَّ لَاَحۡتَنِكَنَّ اِحۡتَنَكَ سے مضارع واحد متکلم کا صیغہ ہے اور اِحۡتَنَكَ الۡفَرَسَ کے معنے ہیں جَعَلَ الرَّسَنَ فِىۡ فِيۡهِ۔ گھوڑے کے منہ میں لگام دیا۔ اور اس کو قابو میں کرلیا۔ اِحۡتَنَكَهٗ: اِسۡتَوۡلٰى عَلَيۡهِ۔ اس پر غالب آ گیا۔ اس پر قابو پالیا۔ اِحۡتَنَكَ زَيۡدًا: اَخَذَ مَالَهٗ كُلَّهٗ۔ زید کا سارا مال لے لیا۔ اِحۡتَنَكَ الۡجَرَادُ الۡاَرۡضَ کے معنے ہیں اَكَلَ مَا عَلَيۡهَا وَاَتٰى عَلٰى نَبَاتِهَا۔ ٹڈیوں نے زمین کی سب چیزوں کو ختم کردیا۔ (اقرب) پس لَاَحۡتَنِكَنَّ کے معنے ہوں گے کہ میں ضرور ان پر قابو پالوں گا۔

تفسیر۔ یعنی شیطان نے زبان حال سے مطالبہ کیا کہ مجھے اس وقت تک موقعہ مل جائے جو ان کی ترقی کے لئے مقدر ہے۔ تو میں ان کے منہ میں لگام دے کر جدھر چاہوں گا لئے پھروں گا [۱]۔ اس آیت میں قیامت سے مراد مومنوں کی ترقی کا وقت ہے کیونکہ اس وقت کافروں کی قیامت بذریعہ تباہی کے۔ اور مومنوں کی قیامت بذریعہ کامیابی کے آجاتی ہے۔

اِلَّا قَلِيۡلًا کے یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ تھوڑے سے آدمی میرے تصرف سے بچیں گے۔ اور یہ بھی کہ ان کے اعمال اکثر میری فرمانبرداری میں ہوں گے۔ تھوڑے اللہ تعالیٰ کے لئے ہوں گے۔

---

[۱] آدم اور شیطان کے واقعہ کے لئے دیکھو سورۃ حجر ۲۷۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ شیطان نے ایک دعویٰ کیا اور اسے پورا کر دکھایا۔ اس نے کہا تھا لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ چنانچہ دنیا میں بدی بہت ہے اور نیکی کم۔ اس کے مقابل خدا تعالیٰ نے ایک دعویٰ کیا مگر اس کو پورا نہ کر سکا۔ اس نے فرمایا تھا۔ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ مگر اکثر انسان خدا کے بندے نہیں شیطان کے بندے ہیں۔

یہ اعتراض قلت تدبّر کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ حقیقتاً بدی نیکی کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہے۔ بڑے سے بڑے جھوٹ بولنے والے کو ہی لے لو۔ اس کی ساری عمر کے کلام کو جمع کرو تو ضرور اس کے سچ زیادہ ہوں گے اور جھوٹ بہت تھوڑے۔ یہی حال دوسری بدیوں کا ہے۔ دنیا میں اکثر انسان نیک نیت ہیں اور اپنی طرف سے نیکی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گو بعض حالات میں جذبات سے دب بھی جاتے ہیں۔ پس یہ غلط ہے کہ شیطان کامیاب ہو گیا۔ میں تو کہتا ہوں کہ تھوڑی سی بدی کا زیادہ مشہور ہو جانا یہ بھی شیطان کی ناکامی کا ثبوت ہے۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی فطرت نیک ہے اور وہ تھوڑے سے گناہ کی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ

(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا چل (دور ہو) کیونکہ (تیری اور) ان میں سے جو بھی تیری پیروی کریں تو جہنم یقیناً تمہاری

جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۴﴾

(اور ان کی) سب کی جزا ہے (یہ) پورا پورا بدلہ (ہے)۔

حلّ لُغَات۔ موفورًا مَوْفُوْرًا وَفَرَ (يَفِرُ) سے اسم مفعول ہے اور اس کے معنے ہیں اَلشَّيْءُ التَّامُّ۔ مکمل چیز جَزَاءٌ مَوْفُوْرٌ۔ لَمْ يُنْقَصْ مِنْهُ شَيْءٌ۔ پورا پورا بدلہ۔ (اقرب)

تفسیر۔ شیءٌ موفورٌ پوری چیز اور وہ چیز جس میں کسی قسم کی کمی نہ ہو۔ یعنی ہر ایک کے لئے اس مقام میں جزاء تام ہوگی۔ یہ مراد نہیں کہ سزا کم نہ ہوگی۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ سزا ایسی چیز ہے کہ انسان اس کی نسبت یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اور چاہیے۔ پس ہر شخص جہنم میں اپنی سزا میں مشغول ہوگا اور طرف توجہ نہ ہو سکے گی ورنہ جیسا کہ قرآن کریم سے ثابت ہے اللہ تعالیٰ سزا کے معاملہ میں ہمیشہ عفو اور رحمت کو مدنظر رکھتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سزا قلبی ہوگی اور ہر ایک اپنے اپنے قلب کی کیفیت کے مطابق سزا پائے گا۔

جیسے درخت زمین سے اپنی حالت کے مطابق غذا حاصل کر لیتا ہے۔ ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ دو انسانوں کے دل بھی پوری طرح مشابہ نہیں۔ حالانکہ کروڑ ہا انسان پیدا ہوئے اور ہوں گے مگر ہر ایک کے دل کی کیفیت و حالت الگ الگ ہے اسی طرح ہر اک کی سزا بھی الگ الگ ہونی ضروری ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ سزا قلبی ہو اور ہر اک اپنے اعمال کے طبعی نتائج کو بھگتے۔

وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ

اور (ہم نے کہا جا) ان میں سے جس پر تیرا بس چلے۔ اسے اپنی آواز سے فریب دے کر (اپنی طرف) بلا۔ اور اپنے

بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ

سواروں اور پیادوں کو ان پر چڑھا لا۔ اور (ان کے) مالوں اور اولادوں میں ان کا حصہ دار بن۔ اور ان سے (جھوٹے)

وَعِدْهُمْ ؕ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۵﴾

وعدے کر (اور پھر اپنی کوششوں کا نتیجہ دیکھ) اور شیطان جو وعدے بھی کرتا ہے فریب کی نیت سے ہی کرتا ہے۔

حلّ لُغَات۔ اِسْتَفْزِزْ اِسْتَفْزِزْ اِسْتَفَزَّ سے امر کا صیغہ ہے۔ اور اِسْتَفَزَّهُ (اَلْخَوْفُ) کے معنے ہیں۔ اِسْتَخَفَّهُ خوف نے اسے حواس باختہ کر دیا۔ اِسْتَدْعَاهُ۔ اسے بلند آواز سے بلایا۔ اَخْرَجَهُ مِنْ دَارِهٖ۔ اس کو گھر سے نکال دیا۔ اَزْعَجَهُ۔ اسے بنیاد سے اکھیڑ دیا وَيُقَالُ خَتَلَهٗ حَتّٰى اَلْقَاهُ فِي مَهْلَكَةٍ۔ بعض کہتے ہیں کہ اِسْتَفَزَّ کے معنے کسی کو دھوکا دے کر ہلاکت میں ڈالنے کے ہیں۔ قَتَلَهٗ۔ نیز اس کے معنے ہیں اس کو قتل کر دیا۔ (اقرب)

وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ اَجْلَبَ سے امر کا صیغہ ہے اور اَجْلَبَ الْقَوْمُ کے معنے ہیں اِخْتَلَطَتْ اَصْوَاتُهُمْ وَضَجُّوْا۔ لوگوں کی آوازیں مختلط ہوگئیں اور انہوں نے شور برپا کیا۔ تَجَمَّعُوْا مِنْ كُلِّ وَجْهٍ لِلْحَرْبِ۔ ہر طرف سے لڑائی کے لئے جمع ہو گئے۔ وَفِي الْقُرْاٰنِ وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ اَیْ صِحْ اور قرآن مجید کی آیت وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ میں اَجْلِبْ کے معنے آواز بلند کرنے کے ہیں۔ (اقرب)

الخیل اَلْخَيْلُ جَمَاعَةُ الْاَفْرَاسِ۔ گھوڑوں کی جماعت۔ اس کا مفرد نہیں آتا۔ وَالْفُرْسَانُ عَلَى الْمَجَازِ اَیْ رِكَابُ الْخَيْلِ اور خیل بول کر سوار مراد لینے مجازی معنے ہیں وَمِنْهُ فِي الْقُرْاٰنِ وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ

اِیْ بِفُزْسَانِكَ وَمُشَاتِكَ اور آیت وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ میں خیل سے مراد سوار اور رَجِل سے مراد پیدل چلنے والے کے ہیں۔ (اقرب) رَجِلٌ رَاجِلٌ کی جمع ہے اور رَاجِلٌ اس شخص کے لئے بولتے ہیں جس کے پاس سواری نہ ہو۔ (اقرب)

تفسیر۔ اسلام کے نزدیک فطرت میں نیکی ہے اِسْتَفْزِزْ کے معنے ہیں اپنی جگہ سے ہٹا لے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان پہلے نیکی کے مقام پر کھڑا ہوتا ہے پھر اگر اس پر شیطان کا اثر ہو جائے۔ تو اپنے اصل مقام کو چھوڑ کر بدی کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس بارہ میں عیسائی تعلیم اور اسلام کی تعلیم میں کتنا بڑا فرق ہے۔ عیسائیت تو کہتی ہے کہ انسان کی فطرت میں بدی اصل ہے۔ اور کفارہ کے ذریعہ اسے بدی سے ہٹا کر نیکی کی طرف لایا گیا ہے (دنیا کا منجی از ماسٹر برکت اے خان صفحہ ۲۰،۲۱)۔ مگر اسلام کہتا ہے کہ اصل مقام نیکی ہے۔ مگر شیطان اس سے ہٹا کر لے جاتا ہے۔

بِصَوْتِكَ میں اس طرف اشارہ ہے کہ بعض طبائع اس قدر کمزور ہوتی ہیں کہ وہ صرف دھمکیاں سن کر ہی ڈر جاتی ہیں یا اعتراض سن کر ہی شک میں پڑ جاتی ہیں۔ ان میں مقابلہ کی جرأت نہیں ہوتی اور نہ تحقیق کی ہمت۔

اس آیت میں شیطانی حملوں کی اقسام بیان فرمائی ہیں۔ بعض کو وہ دھمکا کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی شیطانی لوگ غرباء اور بیکس لوگوں کو ڈرا ڈرا کر نبیوں کے ساتھ شامل ہونے سے روکتے ہیں۔ بعض کو سواروں اور پیادوں کے ذریعے سے نیکی سے روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یعنی انہیں قسم قسم کے دکھ دیئے جاتے ہیں۔ اور بعض کو بدرسوم اور صحبت کے ذریعہ سے تباہ کیا جاتا ہے۔ اور بعض کو مال اور دولت کی لالچ دے کر حق کے ماننے سے روکا جاتا ہے۔ مگر جن کے دل میں ایمان ہوتا ہے وہ ان باتوں سے قابو میں نہیں آتے، وہی لوگ متاثر ہوتے ہیں جن کے دل میں مرض ہوتی ہے۔

یہ جو فرمایا ہے شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ اس کا یہ مطلب ہے کہ شیطانی لوگ انبیاء کے خلاف جتھے بھی بناتے ہیں اور اپنے مالوں اور اولاد کو جمع کر کے متفقہ طور پر نبیوں پر حملہ کرتے ہیں گویا اپنی سب طاقتوں کو جمع کر لیتے ہیں۔

آئمہ کفر کی انبیاء کے خلاف چالوں کی اقسام ان اقسام پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آئمہ کفار تین قسم کی چالیں انبیاء کے خلاف چلتے ہیں۔ جو لوگ کمزور ہوں۔ ان کے لئے ڈرانے اور تکلیف دینے کا ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ جو برابر والے ہوں ان سے جتھہ بازی کے اصول پر اتحاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جو طاقتور ہوں انہیں غنائم کے وعدے دے کر یا لیڈری کی امیدیں دلا کر پھنساتے ہیں۔ نبیوں کے مقابلہ پر ان تینوں

گروہوں کو ان تینوں طریق سے پھنسانے کی مثالیں اس قدر کثرت اور تواتر سے ملتی ہیں کہ اس کے متعلق مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَ کَفٰی بِرَبِّکَ

جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا ہرگز کچھ تسلط نہیں (ہوسکتا) اور (اے میرے بندے) تیرا رب کارساز ہوکر

وَکِیْلًا ﴿٦٦﴾

(تیرے لئے) کافی ہے۔

تفسیر ۔اس آیت میں بتایا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کا بندہ بن جائے۔اس پر شیطان کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا۔کیونکہ شیطان کو صرف یوم قیامت تک کی مہلت حاصل ہوتی ہے۔یعنی جب تک انسان روحانیت میں کمزور رہو شیطان کے حملہ سے دیتا ہے۔جب اس میں روحانی طاقت پیدا ہوجائے اس میں دلیری آجاتی ہے اور وہ دھمکیوں، تکلیفوں اور لالچوں سے نہیں ڈرتا۔

شیطانی حملوں سے بچنے کا گر دوسرے اس آیت میں شیطانی حملوں سے بچنے کا گر بھی بتایا گیا ہے اور وہ یہ کہ انسان اللہ تعالیٰ کا عبد بن جائے۔یعنی اپنے آپ کو اس کے سپرد کردے اور اپنی طاقتوں کی بجائے اس پر توکل کرے۔جس کا خدا تعالیٰ وکیل ہوجائے شیطان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

رَبُّکُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَکُمُ الْفُلْکَ فِی الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ

(اور اے میرے بندو) تمہارا رب وہ (کریم ذات) ہے۔جو تمہارے لئے کشتیوں کو سمندر میں چلاتا ہے تا کہ

فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ کَانَ بِکُمْ رَحِیْمًا ﴿٦٧﴾

تم اس کے فضل کو ڈھونڈو۔وہ یقیناً تم پر بار بار رحم کرنے والا ہے۔

حل لغات ۔یُزْجِیْ یُزْجِیْ اَزْجٰی سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اَزْجَاہ (اِزْجَاءً) کے معنی ہیں زَجَّاہُ یعنی اس کو چلایا اور آہستگی سے آگے کیا۔وَمِنْهُ فِی الْقُرْآنِ رَبُّکُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَکُمُ الْفُلْکَ ۔ اَیْ

یُجْرِیْهِ وَیَسُوْقُهٗ اور آیت یُزْجِیْ الْفُلْكَ الخ میں یُزْجِیْ کے معنے چلانے کے ہیں (اقرب) پس رَبُّكُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِی الْبَحْرِ کے معنے ہوئے۔تمہارا رب وہ ہے جو تمہارے لئے کشتیوں کو سمندر میں چلاتا ہے۔

تفسیر ۔اس میں بتایا ہے کہ حقیقی انعامات تو اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے ہیں۔مگر لوگ ان کی قدر نہیں کرتے۔ خشکی پر تو سامان ہیں ہی سمندر میں کشتیاں بنا کر اس نے باہمی تعلقات کو وسیع کر دیا ہے۔ورنہ جزائر میں بسنے والے لوگ براعظموں کے لوگوں سے اور براعظموں کے لوگ جزائر والوں سے غافل رہتے۔

اسلام عالمگیر مذہب ہے میرے نزدیک یہ مثال اس جگہ اس امر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے دی ہے کہ اسلام عالمگیر مذہب ہے اور سب دنیا میں پھیلے گا اور یہ امر چونکہ جہازوں کے ساتھ وابستہ ہے جن کے بغیر سمندروں کا سفر طے نہیں کیا جا سکتا۔

سمندر کی مثال دے کر مسلمانوں کو جہاز رانی کی طرف توجہ دلائی اس لئے اس جگہ خصوصاً سمندر اور جہازوں کی نعمت کا ذکر فرمایا کہ یہ نعمت مسلمانوں کو خاص طور پر ملنے والی ہے۔چنانچہ مسلمان گو آجکل جہاز رانی میں کمزور ہیں۔لیکن ایک زمانہ ایسا تھا کہ سب دنیا میں مسلمانوں کے جہاز چلتے تھے،بحری نقشے اور راستے سب مسلمانوں کے تیار کئے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی طرف یورپ کے لوگوں کا بحری سفر بھی ایک عرب مسلمان کا ممنون احسان ہے۔جو بھٹکتے ہوئے پرتگیزی جہازوں کو افریقہ کے اوپر سے لا کر ہندوستان تک پہنچا گیا۔

(Arabian Students vol.1 pg:86 to 93)

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ

اور جب سمندر میں (طغیانی پیدا ہونے کی وجہ سے) تمہیں تکلیف پہنچے۔تو اس کے سوا (دوسرے وجود) جن کو تم

اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ

پکارتے ہو (تمہارے ذہنوں سے) غائب ہو جاتے ہیں۔پھر جب وہ تمہیں بچا کر خشکی پر لاتا ہے۔تو تم (اس کی

كَفُوْرًا ﴿۶۸﴾

طرف سے) اعراض کر لیتے ہو۔اور انسان بہت ہی ناشکر گذار ہے۔

تفسیر ۔وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ ۔الآیہ۔اور اگر سمندر میں کسی قسم کی تکلیف ہوتی ہے تو سارے معبودان باطلہ

تمہیں بھول جاتے ہیں۔صرف اس وقت خدا تعالیٰ ہی یاد آتا ہے مگر جب تم کو نجات دے کر خشکی پر پہنچاتا ہے۔ تو پھر اعراض کرنے لگ جاتے ہو۔یعنی انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ ہمیشہ اپنی حالت کو بھول جاتا ہے۔جب مصیبت میں ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ اگر اس سے نجات پا جاؤں گا تو ضرور نیکی کروں گا۔مگر جب وہ تکلیف کی حالت گذر جاتی ہے تو پھر سب قول و قرار بھول جاتا ہے۔اس آیت میں مسلمانوں کو ہوشیار کیا ہے کہ کفار کے طریق کو اختیار نہ کرنا اور ترقی کے زمانہ میں بھی خدا تعالیٰ کو یاد رکھنا تا مصیبت کے وقت وہ تمہاری مدد کا خیال رکھے۔

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ

تو کیا تم اس بات سے بے خوف (اور محفوظ) ہو کہ وہ تمہیں خشکی کے کنارہ پر (ہی زمین میں) دھنسا دے یا تم پر

عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ﴿۶۹﴾

سنگریزے نازل کرے۔(اور) پھر تم اپنا کوئی کارساز (اور چارہ گر) نہ پاؤ۔

حل لغات۔ یخسف یَخْسِفُ خَسَفَ سے مضارع ہے اور اس کے لئے دیکھو نحل ۴۶۔

حَاصِبًا حَاصِبًا حَصَبَ سے اسم فاعل ہے اور حَصَبَهٗ (یَحْصِبُ) کے معنے ہیں رَمَاهُ بِالْحَصْبَاءِ۔اس کو کنکر مارا۔حَاصِبٌ کے معنے ہیں رِيْحٌ شَدِيْدَةٌ تَحْمِلُ التُّرَابَ وَالْحَصْبَاءَ۔سخت ہوا جو مٹی اور کنکر اٹھا کر پھینکے وَقِيْلَ هُوَ مَاتَنَاثَرَ مِنْ دُقَاقِ الثَّلْجِ وَالْبَرَدِ۔بعض کہتے ہیں۔وہ اولے جو ہوا کے ساتھ گرتے ہیں۔ السَّحَابُ لِاَنَّهٗ يَرْمِيْ بِالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ۔بادل کیونکہ وہ بھی اولے برساتے ہیں۔(اقرب)

تفسیر۔فرماتا ہے خشکی میں دلیر ہوتے ہو مگر کیا خدا تعالیٰ تم پر خشکی میں عذاب نہیں بھیج سکتا۔کیا وہ تم کو زمین میں غائب نہیں کر سکتا۔یا پتھروں کا مینہ تم پر نہیں برسا سکتا۔پھر سمندر اور خشکی میں فرق کرنے سے تم کیا فائدہ حاصل کر سکتے ہو۔

جنگ بدر کی پیشگوئی میرے نزدیک اس آیت میں جنگ بدر کی پیشگوئی ہے۔جنگ بدر کے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مٹھی میں کنکر پکڑ کر پھینکے تھے۔اسی وقت ایک تیز ہوا چل پڑی جس کے ساتھ کنکر اڑ اڑ کر کفار کی آنکھوں میں پڑنے لگے۔نیز چونکہ کفار کے سامنے کی طرف سے ہوا آتی تھی کفار کے تیروں کا زور اس ہوا کی وجہ سے کم ہو جاتا تھا۔اور مسلمانوں کے تیروں کا زور بوجہ باد موافق کے بڑھ جاتا تھا (دلائل النبوۃ للبیھقی

باب التقی الجمعن۔۔۔)۔عرب کے بسنے والے کیا مسلمان، کیا یہودی، کیا مسیحی سمندر سے سخت ڈرتے تھے۔اس لئے سمندر کی مثال سے انہیں سمجھایا ہے کہ سمندر میں جاتے ہوتو ذرا سے طوفان سے گھبرا جاتے ہو کہ شائد بداعمالیوں کی وجہ سے عذاب آنے لگا ہے لیکن خشکی پر دلیر ہوتے ہو۔مگر یاد رکھو ہم تم کو خشکی میں تباہ کر دیں گے۔

اس جگہ مسلمانوں کو سمندری سفروں کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ جب خشکی تری دونوں میں خطرات ہیں تو تم اس حماقت میں مبتلا نہ ہونا کہ خشکی پر بیٹھے رہو اور سمندر کے سفر کو نظر انداز کر دو۔

اَمۡ اَمِنۡتُمۡ اَنۡ یُّعِیۡدَکُمۡ فِیۡہِ تَارَۃً اُخۡرٰی فَیُرۡسِلَ

یا تم اس بات سے بے خوف ہو کہ وہ تمہیں (پھر) دوسری بار اس (یعنی سمندر) میں لوٹا لائے۔اور تم پر ایک تند

عَلَیۡکُمۡ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیۡحِ فَیُغۡرِقَکُمۡ بِمَا کَفَرۡتُمۡ ۙ ثُمَّ

ہوا چھوڑ دے اور تمہارے کفر کی وجہ سے تمہیں غرق کر دے۔(اور) پھر اس (عذاب) پر تم ہمارے خلاف

لَا تَجِدُوۡا لَکُمۡ عَلَیۡنَا بِہٖ تَبِیۡعًا ﴿۷۰﴾

اپنا کوئی مددگار نہ پاؤ۔

حلّ لُغَات۔قاصفًا قَاصِفًا قَصَفَ (یَقۡصِفُ) سے اسم فاعل ہے۔اور قَصَفَ الشَّیۡءَ کے معنے ہیں۔ کَسَرَہٗ فَانۡکَسَرَ کسی چیز کو توڑا تو وہ ٹوٹ گئی۔قَصَفَ الرَّعۡدُ: اِشۡتَدَّ صَوۡتُہٗ بجلی کی کڑک کی آواز سخت ہوگئی اور رَعۡدٌ قَاصِفٌ کے معنے ہیں اَیۡ صَیِّتٌ۔خوب گرجنے والی بجلی۔رِیۡحٌ قَاصِفٌ اَیۡ شَدِیۡدَۃٌ تَکۡسِرُ مَامَرَّتۡ بِہٖ مِنَ الشَّجَرِ وَغَیۡرِہٖ اور رِیۡحٌ قَاصِفٌ اس ہوا کو کہیں گے کہ جس درخت یا اور کسی چیز پر وہ گزرے تو اس کو توڑ دے۔(اقرب)

تَبِیۡعًا تَبِیۡعًا اَلتَّبِیۡعُ کے معنے ہیں اَلنَّاصِرُ۔مددگار۔اَلتَّابِعُ۔تابع۔(اقرب)

تفسیر۔**فتح مکہ کی پیشگوئی** اَنۡ یُّعِیۡدَکُمۡ فِیۡہِ تَارَۃً اُخۡرٰی۔اس میں میرے نزدیک فتح مکہ کے وقت کی خبر دی ہے اس وقت بہت سے کفار مکہ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔اور کشتیوں میں سوار ہو کر یمن یا حبشہ کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔مگر سمندر میں طوفان آ گیا۔اور بہت سے غرق ہو گئے۔عکرمہ بن ابی جہل بھی بھاگنے والوں میں

سے تھے۔ مگر ان کو جہاز نہ ملا اور پیچھے رہ گئے۔ اتنے میں ان کی بیوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کے لئے معافی حاصل کر لی۔ اور ساحل پر جا کر واپس لے آئی (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام ذکر الاسباب الموجبۃ المسیر الی مکۃ۔۔۔ اسلام عکرمۃ و صفوان)۔

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ

اور ہم نے بنی آدم کو (بہت) شرف بخشا ہے۔ اور ان (کو اور ان کے سامانوں) کو خشکی اور تری میں اٹھایا ہے

رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ

اور انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا ہے۔ اور جن (اقسام کی مخلوقات) کو ہم نے پیدا کیا ہے۔ ان میں سے

خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۟ؑ (۷۱) ع

بہتوں پر ہم نے انہیں بڑی فضیلت دی ہے۔

تفسیر۔ قوموں کو ایک دوسرے پر تفاخر نہیں کرنا چاہیے اس میں بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کو عزت بخشی ہے۔ نہ کہ خاص اقوام کو پس قوموں کو ایک دوسرے پر تفاخر نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے یہود اور قریش کو نصیحت کی ہے جو اپنے آپ کو دوسروں سے معزز سمجھتے تھے۔ اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر اک قوم کو عزت دی ہے۔ مگر بعض اقوام اس عزت سے فائدہ نہیں اٹھاتیں اور خدا تعالیٰ کے کھولے ہوئے راستوں کو اپنے لئے بند کر لیتی ہیں۔

سمندر اور خشکی یکساں طور پر انسانی ترقی کے لئے مقدر ہے وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ سمندر اور خشکی کو یکساں طور پر اللہ تعالیٰ نے انسانی ترقی کے لئے مقرر کیا ہے۔ پس اگر کوئی قوم عزت حاصل کرنا چاہے تو اسے یکساں طور پر دونوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بنایا ہوا ہے (ستیارتھ پرکاش باب ۱۴ دین اسلام)۔ کیا یہ باتیں جو اس جگہ بیان ہوئی ہیں۔ ایک عرب کے رہنے والے کے منہ سے نکل سکتی ہیں۔ خصوصاً اس کے منہ سے جس نے کبھی کشتی میں سفر تک نہیں کیا۔

افسوس کہ مسلمانوں نے چند گذشتہ صدیوں سے اس نصیحت کو بھلا دیا۔ اوران کی طاقت کمزور ہوگئی۔ اگر وہ سمندری بیڑوں کا خیال رکھتے تو اسلام کبھی اس قدر کمزور نہ ہوتا جس قدر کہ اب ہے۔

فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا سے بعض لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ انسان بعض قسم کی مخلوق سے افضل ہے۔ سب قسم کی مخلوق سے نہیں (تفسیر البغوی زیر آیت ھذا)۔ مگر یہ استدلال غلط ہے کیونکہ اس جگہ بنی آدم کا ذکر بہ حیثیت جماعت ہے۔ اوراس میں کیا شک ہے کہ سب انسان تو سب مخلوق سے افضل نہیں ہیں۔ انسانوں میں بعض تو نہایت گندے ہیں اور جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ بعض معمولی بھلے مانس ہیں۔ اور جانوروں سے اچھے ہیں۔ بعض بہت اچھے ہیں۔ اور عام فرشتوں سے بھی اچھے ہیں۔ بعض اعلیٰ مقام پر ہیں اور اعلیٰ فرشتوں سے بھی اعلیٰ ہیں۔ غرض انسان سب مخلوق سے افضل نہیں۔ بلکہ بعض انسان سب مخلوق سے اچھے ہیں۔ اور انسان بحیثیت انسان کے اکثر مخلوق سے اچھا ہے۔ کیونکہ سورج، چاند، ستارے، گھوڑے، بیل، اونٹ، بکریاں یہ کافر و مومن سب ہی کے کام کررہی ہیں اور سب ہی کی خدمت پر لگائی گئی ہیں۔ پس انسان بلحاظ جنس کے اکثر مخلوق سے افضل ہے۔ اور انسان بلحاظ کامل فرد کے سب مخلوق سے افضل ہے۔

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ

اور (اس دن کو بھی یاد کرو) جس دن ہم ہر ایک گروہ کو ان کے پیشوا سمیت بلائیں گے۔ پھر جن کے دائیں ہاتھ میں

بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ

ان (کے اعمال) کی کتاب دی جائے گی۔ وہ (بڑے شوق سے) اپنی کتاب کو پڑھیں گے۔ اور ان پر ذرّہ

فَتِيْلًا ﴿۷۲﴾

بھر (بھی) ظلم نہیں کیا جائے گا۔

حلّ لُغات۔ فتیلًا اَلْفَتِيْلُ: اَلْمَفْتُوْلُ۔ بٹی ہوئی چیز۔ حَبْلٌ دَقِيْقٌ مِنْ خَزَمٍ اَوْ لِيْفٍ کھجور کے ریشوں کی باریک بٹی ہوئی رسی۔ اَلسَّحَاةُ الَّتِيْ فِيْ شَقِّ النَّوَاةِ۔ گٹھلی کے شگاف کا پردہ۔ مَافَتَلْتَهٗ بَيْنَ اَصَابِعِكَ مِنَ الْوَسَخِ۔ وہ قلیل سی میل جو ہاتھوں کے درمیان بٹی جائے (اقرب) آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان پر ذرہ

پھر بھی ظلم نہ کیا جاوے گا۔

تفسیر۔ قیامت کے دن ہر ایک امت کو اپنے امام کے ساتھ بلائے جانے کا مطلب

مفسرین نے بِاِمَامِهِمْ کے معنے کِتَابِهِمْ کے لئے ہیں (تفسیر البغوی زیر آیت ھذا)۔یعنی ہر ایک کو اس کے نامۂ اعمال کے ساتھ بلایا جائے گا۔مگر ہم کہتے ہیں ۔جب ہر امت میں امام گذرا ہے تو پھر امام کے لفظ کے وہی معروف معنے کرنے چاہئیں جن معنوں میں یہ لفظ اکثر استعمال ہوتا ہے۔اور آیت کا مفہوم یہی ہے کہ ہر قوم کو اس کے نبی کے نام سے بلایا جائے گا کہ فلاں نبی کی قوم آئے ۔اور فلاں کی امت آئے (مسند احمد مسند ابو سعید خدری)۔کیونکہ انہیں شہادت دینی ہوگی کہ ہم نے تبلیغ وغیرہ کر دی۔جیسے قرآن کی دوسری جگہ سے ثابت ہوتا ہے اور حدیثوں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ نبی کے نام سے بلایا جائے گا۔

فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۔اس میں کِتٰبَهٗ سے مراد اعمال نامہ ہے۔جیسے دوسری جگہ میں فرمایا۔يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ۔ وَ لَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ (الحاقة:۲٦،۲۷) یعنی کاش مجھے میری کتاب نہ دی جاتی اور مجھے یہ معلوم ہی نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے۔

دائیں ہاتھ میں کتاب دیئے جانے میں حکمت

دائیں ہاتھ کو اسلام نے برکت کا نشان قرار دیا ہے۔ اور بائیں کو سزا کا نشان ۔انسانی خلقت میں بھی دائیں کو بائیں پر فوقیت معلوم ہوتی ہے۔کیونکہ دائیں طرف کے اعضاء میں بالعموم کام کی طاقت زیادہ ہوتی ہے۔پس دائیں ہاتھ میں حساب کی نقل دینے سے یہ مراد ہے کہ ایسے لوگوں کا حساب بابرکت ہوگا۔

دائیں ہاتھ کے استعمال کے متعلق ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی شہادت بالاجماع موجود ہے۔یہ کوئی مذہبی حکم نہیں کہ اسے مصنوعی فعل سمجھا جائے۔ بلکہ ہر مذہب وملت کے آدمی مہذب یا غیر مہذب دائیں ہاتھ کا استعمال خاص طور پر کرتے چلے آئے ہیں ۔ایشیاء کے لوگ ہوں یا یورپ کے یا افریقہ کے یا امریکہ کے جاہل ہوں یا تعلیم یافتہ کسی مذہب کے پابند ہوں یا ہر مذہب سے آزاد۔سب ہی آدمی جو بیمار نہیں یا کسی غیر طبعی اثر کے نیچے نہیں ۔دائیں ہاتھ سے کام کرتے ہیں ۔اسی طرح تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ دائیں آنکھ بائیں سے بالعموم زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ عادت کی وجہ سے دائیں کو انسان ترجیح دیتا ہے۔مگر سوال یہ ہے کہ یہ عادت کیوں پڑی ۔شروع میں انسان کو اس عادت کے ڈالنے پر کس نے مجبور کیا۔آخر پہلے انسانوں نے طبعاً دائیں ہاتھ سے کام لینا شروع کیا تو تبھی آئندہ نسلوں کو عادت پڑی۔پھر کیوں نہ کہا جائے کہ جس طرح ابتدائی انسانوں کو طبعی تقاضیٰ کے ماتحت دائیں

ہاتھ سے کام کرنے کا خیال پیدا ہوا۔اسی طرح آئندہ نسلوں کو ہوا۔

بعض ڈاکٹر دائیں ہاتھ کے استعمال کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ چونکہ دل بائیں طرف ہے بائیں طرف کے حصہ دماغ کی طرف خون نسبتاً زیادہ جاتا ہے۔اور وہ زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔اور چونکہ دائیں طرف کا دماغ بائیں طرف کے اعصاب سے کام لیتا ہے۔اور بائیں طرف کا دماغ دائیں طرف کے اعصاب سے۔پس بائیں طرف کے دماغ کی زیادتی کی وجہ سے دائیں طرف کے اعصاب مضبوط ہوتے ہیں اور اس وجہ سے انسان دائیں طرف کے اعضاء سے کام لینے کی طرف طبعاً راغب ہوتا ہے۔یہ توجیہ درست ہو یا غلط ہمیں اس سے تعلق نہیں۔ہمیں تو بس اتنی بات سے تعلق ہے کہ دائیں کو بائیں پر سب دنیا ترجیح دیتی آئی ہے۔اور دائیں بازو سے کام لینا ایک طبعی تقاضا ہے۔

دائیں بائیں کے فرق کے متعلق ایک اور عجیب بات بھی قابل غور ہے۔علم اعداد وشمار سے معلوم ہوا ہے کہ صحیح الدماغ لوگوں میں سے صرف چار سے آٹھ فیصدی تک بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے لوگ ہیں۔باقی سب دائیں ہاتھ سے کام لیتے ہیں۔لیکن مجنونوں میں یہ نسبت بہت بڑھ جاتی ہے۔اس سے بھی اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ قانون قدرت نے دائیں کو بائیں پر فضیلت دی ہے۔(انسائیکلو پیڈیا برٹینکا جلد گیارہ زیر لفظ ہینڈڈنس)

اوپر کے حوالہ جات سے یہ امر ثابت ہوجاتا ہے کہ دایاں ہاتھ کام کرنے کے لئے زیادہ موزوں ہے۔اور اکثر افراد عالم اسی ہاتھ سے کام کرتے ہیں۔پس دایاں بازو قوت عملیہ کا نشان قرار دیا جاسکتا ہے۔اور قرآن کریم میں نیک لوگوں کے دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دینے کا جہاں جہاں ذکر ہے درحقیقت اس سے اسی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ وہ لوگ کام کرنے والے،محنت کرنے والے اور قربانی کرنے والے تھے۔اور بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دینے کا جہاں جہاں ذکر ہے۔اس سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ لوگ نکمے قربانی سے بچنے والے اور سست تھے۔کیونکہ بایاں ہاتھ بہت کم کام کرتا ہے۔

ایک اور بات بھی یاد رکھنی چاہیے۔کہ دایاں ہاتھ اسلامی شریعت نے پاکیزہ کاموں کے لئے،اور بایاں ہاتھ گندگی کی صفائی وغیرہ کے لئے تجویز کیا ہے۔پس دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دینے سے یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ تم لوگ پاکیزہ کام کرتے تھے۔اور بائیں میں اعمال نامہ دینے سے مراد ہے کہ تم ناپاک کام کرتے تھے۔

دائیں کے لفظ سے ایک اور امر کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔قرآن کریم میں خدا تعالیٰ کے متعلق لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ آتا ہے (الحاقة:۴۶) جس کے معنے مفسرین نے کئے ہیں۔بِالْقُدْرَةِ وَالطَّاقَةِ۔یعنی ہم اس کو

مضبوطی سے پکڑ لیں گے (قرطبی سورۃ الحاقۃ لاخذنا منه بالیمین)۔ پس دائیں ہاتھ سے اعمال نامہ دینے سے اس طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے مضبوطی سے نیکی کو پکڑا تھا اس لئے نجات پا گئے۔ اور جن کے بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا، انہیں یہ بتایا جائے گا کہ تم نے نیکی اور تقویٰ کے لئے پورے زور سے کوشش نہ کی تھی۔ اور گویا بایاں ہاتھ جو کمزور ہوتا ہے استعمال کیا تھا۔ اس لئے آج تمہارا انجام خراب ہوا ہے۔ علاوہ ازیں یُمن برکت کو بھی کہتے ہیں۔ (اقرب) حدیث میں خدا تعالیٰ کے متعلق آتا ہے۔ کِلْتَا یَدَیْ رَبِّیْ یَمِیْنٌ کہ میرے رب کے دونوں ہاتھ برکت والے ہیں۔ اس کا کوئی شمال نہیں۔ پس دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دینے سے اس طرف اشارہ ہوگا کہ تمہارا انجام بابرکت ہوا۔

فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ سے مراد یہ ہے کہ جسے انعام ملتا ہے وہ خوب شوق سے اپنے فیصلہ کو پڑھتا ہے لیکن جسے سزا ملتی ہے وہ اپنے فیصلے کو پڑھنے کی تاب نہیں لاتا۔ اور حتی الوسع اس کے پڑھنے سے گریز کرتا ہے۔

وَ لَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا۔ فتیل تاگہ کو بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ بٹا جاتا ہے۔ اور کھجور کی گٹھلی کے سوراخ میں جو جھلی ہوتی ہے اس کو بھی کہتے ہیں۔ استعارۃً تھوڑی سی چیز کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان پر ذرہ بھر ظلم بھی نہ کیا جائے گا۔

وَ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ

اور جو اس (دنیا) میں اندھا رہے گا وہ آخرت میں (بھی) اندھا (ہوگا) اور (اسی طرح وہ) اپنے (طورو) طریق

اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۷۳﴾

میں سب سے بڑھ کر بھٹکا ہوا ہوگا۔

تفسیر۔ دل کے اندھے قیامت کے دن دیدار الٰہی سے محروم رہیں گے جو اس جگہ اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ یعنی جس شخص نے یہاں پر روحانی آنکھوں سے کام نہیں لیا وہاں پر بھی اسے روحانی آنکھیں نہیں ملیں گی اور دیدار الٰہی سے محروم ہوگا۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا ہے۔ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَ مَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا (انعام: ۱۰۵) کہ تمہارے پاس دلائل تمہارے رب کی طرف سے آ گئے ہیں جو دیکھے گا فائدہ پائے گا۔ اور جو نہ دیکھے گا وہ نقصان اٹھائے گا۔ پھر فرمایا وَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ

لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا (الفرقان: ۷۴) یعنی مومن وہ ہوتے ہیں کہ جب ان کے سامنے ان کے رب کی آیات کا ذکر کیا جائے تو وہ ان کی طرف بہرے اور اندھے ہوکر توجہ نہیں کرتے بلکہ کان اور آنکھیں کھول کر اللہ تعالیٰ کی آیات کو سنتے ہیں۔اس آیت میں ان کو بھی اندھا کہا ہے جو کسی بات کو بغیر تحقیق کے مان لیتے ہیں۔پھر فرمایا ہے وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (طٰہٰ: ۲۵) یعنی کسی شخص کا آیات سے منہ پھیرنا ہی اس کا اندھا ہونا ہے۔

غرض اعمٰی وہ ہے جو حقیقت اور ان بصائر کو جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں۔نہ دیکھے تو ایسا شخص وہاں بھی خدا تعالیٰ کا دیدار نہ کر سکے گا اور اندھا رہے گا۔کیونکہ اس نے دنیا میں اپنی مرضی سے اپنے لئے اندھا ہونا پسند کیا تھا۔

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ دنیاوی اندھے اگلے جہان میں بھی اندھے ہوں گے جسمانی نقص تو بعث بعد الموت کے وقت سب کے سب دور ہو جائیں گے۔کیونکہ پہلا جسم ہی یہاں رہ جائے گا۔پس اس سے مراد روحانی اندھا پن ہے۔

وَ اِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ

اور قریب تھا کہ وہ اس (کلام) کی وجہ سے جو ہم نے تجھ پر وحی سے نازل کیا ہے تجھے (سخت سے سخت) عذاب میں

لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ‏ۖ وَ اِذًا

مبتلا کرتے، تاکہ تو (ان سے ڈر کر) اس (کلام) کے سوا کچھ اور (اپنے پاس سے) گھڑ کر ہماری طرف منسوب

لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿۷۴﴾

کرے۔اور (اگر تم ایسا کرتے تو) اس صورت میں وہ یقیناً تجھے (اپنا) گہرا دوست بنا لیتے۔

حلّ لُغات۔خلیل خَلِيْلٌ کے معنی ہیں اَلصَّدِيْقُ الْمُخْتَصُّ۔خاص کیا ہوا دوست۔وَقِيْلَ هُوَ الَّذِيْ صَادَقْتَهٗ بَعْدَ اِذْ جَرَّبْتَهٗ اور بعض کہتے ہیں کہ خلیل اس دوست پر بولتے ہیں کہ جس کا تجربہ کر لینے کے بعد اس سے دوستی ڈالی جائے۔(اقرب)

تفسیر۔اس آیت کی تفسیر میں مفسرین بعض روایات لکھتے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ کفار نے رسول کریم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خواہش ظاہر کی کہ اگر آپ ہمارے بتوں کو ادب سے چھولیں تو ہم آپ کے ساتھ ہو جائیں گے اس پر نعوذ باللہ من ذالک رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل میں خیال گذرا کہ اللہ تعالیٰ کو تو میرے توحید کے عقیدہ کا علم ہے۔ اگر میں اس طرح کر لوں اور قوم کو ہدایت ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ (فتح البیان زیر آیت ھذا)

یہ معنے اس آیت سے ہرگز نہیں نکلتے اور نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان کے مطابق یہ معنے ہیں اور علاوہ ازیں اگلی آیات اس مضمون کے بالکل الٹ مضمون کو بیان کر رہی ہیں۔

کَادَ کے لفظ کا استعمال اس آیت میں کَادَ کا لفظ آیا ہے۔ کاد کا لفظ جب استعمال کیا جائے تو اگر وہ مثبت ہو تو معنے یہ ہوتے ہیں کہ کَادَ کے بعد کا فعل نہیں ہوا۔ اور اگر کاد سے پہلے نفی کا حرف آئے تو کاد کے بعد کے فعل کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ فعل ہو گیا (مفردات)۔ اس آیت میں کاد مثبت استعمال ہوا ہے۔ اس لئے کاد کے بعد کے فعل کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ وہ فعل صادر نہیں ہوا۔

اس آیت میں کَادَ کے بعد لَیَفْتِنُوْنَکَ کے الفاظ ہیں۔ پس کاد کے استعمال کے مطابق اس آیت کا یہ مطلب ہو گا کہ فتنہ کا فعل صادر نہیں ہوا۔ فتنہ کے معنے ابتلاء میں ڈالنے کے بھی ہوتے ہیں (اقرب)۔ اور اس کے معنے عذاب میں مبتلاء کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ اگر اس کے معنے ابتلاء میں ڈالنے کے لئے جائیں تو آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ قریب تھا کہ کفار تجھے ابتلاء میں ڈال دیتے۔ مگر وہ ڈال نہ سکے اور اگر فتنہ کے معنے عذاب کے کئے جائیں تو معنے یہ ہوں گے کہ قریب تھا کہ یہ لوگ تجھ کو عذاب میں ڈال دیتے مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ابتلاء کے معنوں سے اس طرف بھی اشارہ نکلتا ہے کہ گویا قریب تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے دباؤ کو مان کر قرآن میں تبدیلی کرنے پر تیار ہو جاتے۔ گو آپ نے ایسا کیا نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ معنے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف ہیں۔ کسی شریف آدمی کی نسبت یہ کہنا کہ قریب تھا کہ وہ چوری کر لیتا۔ قریب تھا کہ وہ ظلم کرتا۔ قریب تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کو پیٹتا یقیناً اس کی ہتک کرنے والا فقرہ ہے پس خدا کے رسول کی نسبت یہ کہنا کہ قریب تھا کہ وہ خدا پر افتراء کر لیتا بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے۔ مفسرین کا اس امر پر خوش ہو جانا کہ آپ نے ایسا کیا تو نہیں کافی نہیں۔ کیونکہ خدا کے نبی بدی کے قریب بھی نہیں جاتے۔ اور خدا تعالیٰ پر افتراء تو ایسا فعل ہے کہ ایک ادنیٰ مومن کے متعلق بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا ارتکاب تو الگ رہا اس کے قریب بھی جائے گا۔ پس میرے نزدیک اس قسم کے معنے کرنے میں قدیم وجدید مفسرین نے سخت غلطی کی ہے۔

اس آیت کے معنی آنحضرتؐ کی شان کے مطابق میرے نزدیک اس آیت میں فتنہ کے معنے عذاب

کے ہیں اور عن کا لفظ تعلیل کے معنوں میں آیا ہے چنانچہ قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ پر بھی ان معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے فرماتا ہے کفار نے کہا کہ وَ مَا نَحْنُ بِتَارِکِیْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ (ھود: ۵۴) ہم تیرے کہنے کی وجہ سے اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑ سکتے۔عن کے یہ معنے لے کر آیت کا یہ مطلب بنے گا کہ قریب تھا کہ کفار تجھ کو اس کلام کی وجہ سے جو تجھ پر وحی کیا گیا ہے عذاب میں مبتلا کرتے۔اور ان کی غرض ایسا کرنے کی یہ ہوتی۔کہ تو ہم پر افتراء کر کے قرآن کی تعلیم کے خلاف کوئی اور تعلیم بیان کرے۔ان معنوں کے رو سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان پر کوئی حرف نہیں آتا بلکہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کفار کے ارادے تیرے متعلق بڑے بڑے سخت تھے وہ چاہتے تھے کہ تجھے پکڑ کر سخت عذابوں میں مبتلا کریں اور ان عذابوں سے تجھے مجبور کریں کہ تو قرآن کو چھوڑ کر ان کے مطلب کی بات بیان کرے۔اس سارے مضمون میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فعل یا ارادہ فعل کا ذکر نہیں بلکہ سارا کا سارا فعل کفار کا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کلام سے پھرانا تو ان کی طاقت میں نہ تھا۔اس غرض سے عذاب دینے کے ارادہ سے بھی وہ روکے گئے۔اور اس ارادہ میں بھی خدا تعالیٰ نے ان کو ناکام رکھا۔قرآن کریم میں کفار کے ان ارادوں کا ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں ذکر آیا ہے۔ وَ اِذْ یَمْکُرُ بِكَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْ یُخْرِجُوْكَ ؕ وَ یَمْکُرُوْنَ وَ یَمْکُرُ اللّٰہُ ؕ وَ اللّٰہُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ (الانفال: ۳۱) یعنی یاد کر اس وقت کو کہ کفار تیرے متعلق یہ ارادے کر رہے تھے کہ تجھے قید کر دیں یا تجھے قتل کر دیں یا تجھے نکال دیں۔وہ تیرے ذلیل کرنے کی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیروں میں لگا ہوا تھا اور اللہ ہی بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔یعنی آخر خدا تعالیٰ کی تدبیر کامیاب ہوئی اور کفار کے ارادے باطل ہوئے۔اس آیت سے ظاہر ہے کہ کفار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر دباؤ ڈالنے کے لئے قید، قتل اور جلاوطنی کے ارادے کر رہے تھے۔مگر خدا تعالیٰ نے ان کو ناکام رکھا۔اسی مضمون کی طرف یہاں اشارہ ہے اور یہاں بھی یہی بتایا گیا ہے کہ کفار عذاب دینے کے ارادہ میں ناکام رہے۔

کفار مکہ اپنے سب ارادوں میں ناکام رہے اس جگہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ قید اور قتل کے ارادوں میں تو وہ ناکام ہوئے مگر اخراج کے ارادہ میں تو کامیاب ہو گئے۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس ارادہ میں بھی وہ ناکام رہے کیونکہ کفار کا ارادہ یہ نہ تھا کہ آپؐ کو صرف وہاں سے نکال دیں۔کیونکہ اس سے ان کی غرض پوری نہ ہوتی تھی۔ان کا ارادہ تو یہ تھا کہ ذلیل کر کے نکالیں تا دنیا میں آپ کی بدنامی ہو۔مگر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو قبل از وقت خبر دے دی اور آپ خود ہجرت کر گئے اور یہ امر ان کی سازش کے مطابق نہ تھا۔بلکہ خلاف تھا۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جب معلوم کیا کہ آپ عزت کے ساتھ ہجرت کر گئے ہیں تو آپ کا تعاقب کیا اور جب خود پکڑنے میں کامیاب نہ ہوئے

تو آپ کو پکڑ کر لانے والے کے لئے سو اونٹ کا انعام مقرر کیا۔(بخاری کتاب المناقب باب ھجرۃ النبی صلعم) اگر صرف نکال دینا ان کے ارادوں میں شامل ہوتا تو آپؐ کے جانے پر وہ لوگ خوش ہوتے۔نہ یہ کہ آپ کا تعاقب کرتے اور پھر آپ کے پکڑ لانے والے کے لئے انعام مقرر کرتے۔ پس کفار کا آپؐ کی ہجرت کے بعد کا فعل بتاتا ہے کہ وہ آپ کے نکل جانے کو کافی نہ سمجھتے تھے بلکہ چاہتے تھے کہ آپ کو اس طرح ذلیل کر کے نکالیں کہ یا تو آپ نعوذ باللہ اپنی تعلیم سے باز آجائیں یا آپ کی ایسی سُبکی ہو کہ جس جگہ جائیں وہ داغ آپ کے ساتھ جائے اور اس ارادہ میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ناکام رکھا۔

خلاصہ کلام یہ کہ یہ سورۃ ہجرت کے قریب کی ہے جس وقت کفار مقابلہ سے ہر طرح عاجز آکر مایوسی کے جوش میں اس بات پر تُل گئے تھے کہ قید کر کے قتل کی دھمکی دے کر یا ذلیل کر کے نکالنے کا ڈراوا دے کر آپ کو قرآن کی تعلیم سے پھرائیں اور اگر اس کا اثر نہ ہو تو پھر اپنے بدارادوں کو مکمل کر کے آپ کی جسمانی یا اخلاقی زندگی کا خاتمہ کر دیں۔مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو اس ارادہ میں بری طرح ناکام رکھا اور اسی ناکامی کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے نہ اس امر کی طرف کہ نعوذ باللہ من ذالک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی کمزوری آسکتی تھی یا آنے کا امکان تھا۔

وَاِذًا لَّا تَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا میں یہ بتایا ہے کہ اگر یہ عذاب دے کر تجھے سچائی سے پھرانے میں کامیاب ہو جاتے تو تجھے اپنا دوست بنا لیتے۔اس میں بھی کفار کی ہی اخلاقی حالت کو بیان کیا گیا ہے نہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی کمزوری کو۔کفار بار بار کہتے تھے کہ اگر محمد رسول اللہ صلعم اپنی تعلیم میں کفار کی خاطر کچھ بھی نرمی کر لیں تو وہ انہیں اپنا سردار بنا لیں گے۔چنانچہ ایک دفعہ ان کا وفد آپ کے چچا ابوطالب کے پاس آیا اور یہ تجویز کی کہ ہم اب بھی یہ نہیں کہتے کہ محمد (صلعم) شرک کرے بلکہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے معبودوں کو بُرا نہ کہے۔اگر یہ اتنا ہی کر دے تو ہم اسے اپنا سردار بنا لیں گے(السیرۃ النبویۃ لابن ھشام باب مباداۃ رسول اللہ قومہ و ما کان منھم)۔

انہی واقعات کی طرف اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ جب لالچ دے کر کامیاب نہ ہو سکے تو انہوں نے ظلم کر کے تجھے مجبور کرنے کا ارادہ کیا۔مگر خدا تعالیٰ نے اس میں بھی انہیں ناکام رکھا۔اور ناکام رکھے گا۔مگر ان کے یہ ارادے خود ان کے اخلاق پر جو روشنی ڈالتے ہیں وہ ان کے لئے کیسی شرمناک ہے۔ان کی یہ کوششیں بتاتی ہیں کہ انہیں تیری عظمت کا اقرار ہے۔تبھی تو کسی نہ کسی صورت سے تیری تائید حاصل کرنا چاہتے ہیں۔مگر اس قسم کی تائید پر خوش ہونا نہایت پست اخلاق پر دلالت کرتا ہے۔

وَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ ثَبَّتۡنٰکَ لَقَدۡ کِدۡتَّ تَرۡکَنُ اِلَیۡهِمۡ شَیۡـًٔا قَلِیۡلًا ﴿۷۵﴾

اور (تیرا تو یہ حال ہے کہ) اگر ہم تجھے (قرآن دے کر) ثبات نہ بخشتے (اور وحی بھی تجھ پر نازل نہ ہوتی) تو تُو (اس صورت میں بھی اپنی فطرت کی پاکیزگی کی وجہ سے) قریب ہوتا کہ ان کی طرف کچھ (چھوٹی چھوٹی) باتوں میں جھک جاتا (مگر عملاً پھر بھی ان کے ساتھ شامل نہ ہوتا)۔

حلّ لُغات۔ ثَبَّتْنَاكَ ثَبَّتَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ ثَبَتَ کے لئے دیکھو ابراہیم آیت نمبر ۲۸۔ یَثْبِتُ ثَبَتَ کا مضارع ہے۔ جس کا مجرد ثَبَتَ ہے اور ثَبَتَ الْاَمْرُ عِنْدَ فُلَانٍ کے معنے ہیں تَحَقَّقَ وَ تَأَكَّدَ۔ کوئی امر کسی کے نزدیک یقینی طور پر ثابت ہوگیا۔ ثَبَتَ فُلَانٌ عَلَى الْاَمْرِ۔ دَاوَمَهُ۔ کسی کام پر دوام اختیار کیا۔ وَاَثْبَتَهُ وَثَبَّتَهُ: جَعَلَهُ ثَابِتًا فِي مَكَانِهٖ لَا يُفَارِقُهُ۔ اور اَثْبَتَهُ اور ثَبَّتَهُ کے معنے ہیں اس کو اس کی جگہ پر ایسے طور پر ثبات بخشا اور مضبوط رکھا کہ وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکے۔ سو ثابت کے معنے ہوں گے اپنی جگہ پر مضبوط رہنے والا۔ (اقرب)

ترکن تَرْكُنُ رَكَنَ سے واحد مخاطب کا صیغہ ہے اور رَكَنَ اِلَيْهِ کے معنے ہیں مَالَ اِلَيْهِ اس کی طرف مائل ہوا۔ (اقرب) پس كِدْتَّ تَرْكَنُ کے معنے ہوں گے کہ تو مائل ہو جاتا ہے۔

تفسیر۔ یہ آیت اس تشریح کی تائید کرتی ہے جو میں نے اوپر بیان کی ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر ہم نے تجھے ثبات نہ بخشا ہوتا تو پھر ممکن تھا کہ تُو تھوڑا سا ان کی طرف مائل ہو جاتا۔ یعنی ثبات اگر حاصل نہ ہوتا تب بھی تو ان لوگوں کے ساتھ پوری طرح نہ مل سکتا تھا بلکہ ایک خفیف سا اشتراک تیرے اور ان کے خیالات کا ہو سکتا تھا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کے رو سے ثَبَّتْنٰكَ کے کیا معنے ہیں۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ فرماتا ہے۔ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ (ابراھیم: ۲۸) یعنی اللہ تعالیٰ مومنوں کو قول ثبات یعنی وحی کے ذریعہ سے اس دنیا کی زندگی اور آخری زندگی کے اعمال پر ثابت قدم رکھتا ہے۔ اسی طرح سورۃ فرقان میں فرماتا ہے۔ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ (الفرقان: ۳۳) یعنی کفار اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن یکدم کیوں

نازل نہ ہوا۔فرمایا ٹھیک ہے قرآن یکدم نازل نہیں ہوااوراس کی غرض یہ ہے کہ ہم اپنے رسول کے دل کو مضبوط کریں اورقرآن کریم کو آہستہ آہستہ نازل کر کے اس کے دل کے گوشوں میں رچادیں ۔ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تثبیت کا ذریعہ کلام الٰہی کا نزول ہے ۔پس لَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ کے معنے یہ ہوں گے کہ اگرقرآن نازل کر کے ہم نے تیرے دل کوایمان پر ثبات نہ بخشا ہوتا توممکن تھا کہ تو کچھ تھوڑا سا ان کی طرف جھکتا۔

آنحضرتؐ کسی وقت بھی کفار کی طرف مائل نہیں ہو سکتے اس تشریح کے بعد یہ امر آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اس آیت میں یہ ذکر نہیں کہ قرآن کریم کے نزول کے بعد آپ کفار کی طرف مائل ہو سکتے تھے۔ بلکہ بتایا یہ گیا ہے کہ قرآن کے نزول کے بعد تو تیرا ان کی کوئی بات ماننا ناممکن ہے۔اگر قرآن نہ بھی نازل ہوا ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے منشاء کا کامل علم تجھے نہ ہوتا تب بھی تیری فطرت اتنی پاک تھی کہ مشرکانہ باتوں میں توان کے ساتھ شریک نہ ہوسکتا تھا۔ہاں ممکن تھا کہ وحی کی روشنی کے نہ ہونے کے سبب سے بعض چھوٹی چھوٹی باتوں میں توان کے طریق پر عمل کر لیتا۔پس یہ آیت تو انتہائی مدح کے مقام پر ہے اوراس میں یہ بتایا ہے کہ بغیر قرآن کے بھی کفار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ساتھ کامل اتفاق کی امید نہیں کر سکتے تھے۔پھر قرآن کے نزول کے بعد وہ ایسی امید کیونکر رکھتے ہیں۔

اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿۷۶﴾

اوراگر (جیسا کہ ان کا خیال ہے تو ہم پر افتراء باندھنے والا ہوتا) تواس صورت میں ہم تجھے زندگی کا بڑا عذاب

اور موت کا بڑا عذاب چکھاتے (اور) پھر تو ہمارے مقابل پر اپنا کوئی (بھی) مددگار نہ پاتا۔

حلّ لُغات۔ ضِعْفُ الْحَيٰوةِ ضِعْفُ الْحَيٰوةِ وَضِعْفُ الْمَمَاتِ عربی میں کبھی درمیانی مضاف الیہ کو حذف کر کے دوسرے مضاف الیہ کی طرف مضاف کی اضافت پھیر دیتے ہیں اس قانون کے مطابق یہاں ضِعْفُ عَذَابِ الْحَيٰوةِ اور ضِعْفُ عَذَابِ الْمَمَاتِ کے جملوں کو درمیانی مضاف الیہ کو محذوف کر کے ضِعْفُ الْحَيٰوةِ اور ضِعْفُ الْمَمَاتِ کی صورت میں بدل دیا گیا ہے (اعراب القرآن للدرویش) نیز ضعف کسی چیز کی مثل یا اس سے دگنی یا تگنی وغیرہ کو کہتے ہیں ۔کم سے کم ایک مثل اورزیادہ خواہ کتنے گنے ہو۔چونکہ اردو میں اس کا ترجمہ نہیں

ہوسکتا۔ اس لئے زیادتی پر دلالت کرنے کے لئے بڑے کے لفظ سے ضعف کا ترجمہ کر دیا گیا ہے۔

تفسیر ۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اگر تو رسول نہ ہوتا اور بعض چھوٹی باتوں میں اپنی قوم کے ساتھ شامل ہو جاتا تو پھر ان کو کیا فائدہ ہوتا۔ اس وقت تو ان کی نجات کا موجب تو نہیں ہوسکتا تھا بلکہ خود عذاب کا مستحق ہوتا۔ پھر ان کو تیری تائید سے کیا فائدہ تھا۔ مطلب یہ کہ نبی کی سب عظمت کلام الٰہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ کفار اس امر کو محسوس نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی خاص لیاقت کا آدمی ہے اگر اپنی تعلیم میں تبدیلی کرے اور ہمارے ساتھ مل جائے تو ہماری قوم شائد خاص ترقی کر جائے۔ حالانکہ ان کا یہ خیال باطل ہے۔ نبی کو کمال وحی سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ وحی جاتی رہے تو وہ بھی دوسرے آدمیوں کی طرح ہو جائے پس ایسی خواہشات محض لغو اور بے فائدہ ہیں۔

یہاں پر ضعف کے معنے مثل کے ہیں اور مضاف حذف کر دیا گیا ہے گویا اصل یوں ہے ۔مِثْلُ عَذَابِ الْحَیٰوۃِ مِثْلُ عَذَابِ الْمَمَاتِ یعنی جس طرح دوسروں کو دنیا کا عذاب اور آخرت کا عذاب ملتا ہے۔ ویسا ہی اگر نبی خدا تعالیٰ کی وحی سے ہدایت پا کر خدا تعالیٰ کی رضا حاصل نہ کرے ۔تو وہ بھی باقی قوم کی طرح عذاب میں پکڑا جائے۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَ

اور وہ یقیناً تجھے اس ملک سے نکالنے پر تلے ہوئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ وہ تجھے نکال ہی دیں گے۔ اور اس

اِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۷۷﴾

صورت میں وہ تیرے بعد (خود بھی) تھوڑا (عرصہ) ہی (یہاں) رہیں گے۔

تفسیر ۔اِسْتَفَزَّهٗ مِنَ الْاَرْضِ کے معنے زمین سے نکال دینے کے ہیں۔ پس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ قریب تھا کہ یہ لوگ تجھے اس زمین سے نکال دیتے ۔مگر اس کے آگے فرماتا ہے ’’تا کہ یہ تجھے نکال دیں‘‘۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ استفزاز کے معنے کچھ اور ہیں ورنہ تکرار فضول لازم آتا ہے ۔لیکن اگر لِيُخْرِجُوْكَ کے معنے معنوی اخراج کے لئے جائیں تو تکرار نہیں رہتا۔ اس صورت میں آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ یہ لوگ قریب تھا کہ تجھے ملک سے اس طرح نکال دیتے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ تو ان کی قومی زندگی سے نکل جاتا یعنی تجھے ذلیل کر کے

نکال دیتے جس کی وجہ سے تیرا اثر عرب پر سے اٹھ جاتا اور گویا تیرا معنوی طور پر خاتمہ ہو جاتا۔ یہ معنے پہلی آیات کے ساتھ بالکل مطابق آتے ہیں اور میرے نزدیک یہی مراد ہے اور بتایا یہ گیا ہے کہ اگر یہ اس ارادے میں کامیاب ہو جاتے کہ ہتک کر کے تجھے مکہ سے نکالتے تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ تیرے بعد جلد ہی عذاب میں مبتلا کر کے ان کو تباہ کر دیا جاتا مگر اللہ تعالیٰ نے فضل کر کے تجھے آپ ہی ہجرت کا حکم دے دیا اور ان کو تیری ہتک کے گناہ سے بچا کر شدید سزا سے محفوظ کر دیا اور تیری عزت کو قائم رکھ کر اپنی محبت کا ثبوت دیا۔

سُنَّةَ مَنۡ قَدۡ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ مِنۡ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ

(اور تجھ سے بھی) ان (گذشتہ انبیاء) کی طرح (سلوک ہوتا) جنہیں ہم نے تجھ سے پہلے (رسول بنا کر) بھیجا تھا۔

لِسُنَّتِنَا تَحۡوِيۡلًا ۝۷۸ ع ۸

اور تو ہماری سنت میں کوئی تبدیلی نہ پائے گا۔

تفسیر۔ مخالفین کے ہتک آمیز سلوک سے ان پر توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ ہماری یہ قدیم سے سنت ہے کہ جب کسی نبی کو اس کی قوم ہتک آمیز سلوک کر کے نکالتی ہے تو اس پر توبہ کا دروازہ قریباً بند ہو جاتا ہے اور سخت تباہ کر دینے والے قومی عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال قوم صالح ہے جنہوں نے صالح کی اونٹنی کو مار کر ان کے تبلیغی سفروں کو بند کر دیا یا پھر یہود ہیں کہ انہوں نے مسیح کو صلیب پر لٹکایا اور اس کے بعد حضرت مسیحؑ کو ملک چھوڑنا پڑا۔ یہ دونوں قومیں بالکل برباد کر دی گئیں۔ قوم صالح تو ظاہری طور پر تباہ ہو گئی اور یہود اخلاقی اور سیاسی موت میں مبتلا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے چونکہ عربوں کو ایسی موت سے بچانے کا فیصلہ کیا تھا ان کو اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہونے دیا اور اس طرح اس عذاب سے بچا لیا۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ

تو سورج کے ڈھلنے (کے وقت) سے لے کر رات کے خوب تاریک ہو جانے (کے وقت) تک (کی مختلف گھڑیوں

وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ

میں) نماز کو عمدگی سے ادا کیا کر۔ اور صبح کے وقت (قرآن) کے پڑھنے کو بھی (لازم سمجھ) صبح کے وقت

كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۹﴾

(قرآن) کا پڑھنا یقیناً (اللہ تعالیٰ کے حضور میں ایک) مقبول (عمل) ہے۔

حلّ لُغَات۔ دُلُوك دَلَكَتِ الشَّمْسُ دُلُوْكًا: غَرَبَتْ۔ سورج غروب ہو گیا۔ اِصْفَرَّتْ سورج زرد ہو گیا۔ وَقِيْلَ مَالَتْ وَزَالَتْ عَنْ كَبِدِ السَّمَاءِ بعض نے کہا ہے کہ دَلَكَتِ الشَّمْسُ کے معنی سورج ڈھلنے کے ہیں۔ (اقرب)

غَسَق غَسَقَتْ عَيْنُهُ غَسُوْقًا۔ دَمَعَتْ وَقِيْلَ انْصَبَّتْ۔ وَقِيْلَ اظْلَمَتْ۔ اس کی آنکھ ڈبڈبا آئی۔ بعض محققین لغت کے نزدیک اس کے معنی آنکھ کے بہنے یا آنکھ پر تاریکی چھا جانے کے ہوتے ہیں۔ غَسَقَ اللَّيْلُ غَسَقًا اِشْتَدَّ ظُلْمَتُهُ یعنی رات سخت تاریک ہو گئی۔ اَلْغَسَقُ۔ ظُلْمَةُ اَوَّلِ اللَّيْلِ اَوْ دُخُوْلُ اَوَّلِهٖ حِيْنَ يَخْتَلِطُ الظَّلَامُ۔ غسق رات کے پہلے حصے کی تاریکی کو کہتے ہیں یا رات کی ابتداء میں تاریکی شروع ہونے کو غسق کہتے ہیں۔ (اقرب)

مشهودا مَشْهُوْدًا یہ شَهِدَ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ شَهِدَ کا لفظ کسی جگہ پر حاضر ہونے اور اس پر اطلاع پانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہتے ہیں شَهِدَ الْمَجْلِسَ شُهُوْدًا: حَضَرَهٗ، وَاطَّلَعَ عَلَيْهِ کہ وہ مجلس میں حاضر ہوا۔ اور اس نے اسے دیکھا۔ شَهِدَ اللّٰهُ اَيْ عَلِمَ اللّٰهُ وَقَبِلَ اللّٰهُ جب اللہ تعالیٰ کے لئے شَهِدَ کا لفظ استعمال ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جانا اور اسے قبول فرمایا۔ وَقِيْلَ كَتَبَ اللّٰهُ۔ بعض کے نزدیک اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عمل کو لکھ لیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ ان آیات میں مسلمانوں کو آنے والی خطرناک مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کیا گیا ہے۔

ایک طرف ہجرت کے بعد ان قوموں سے مقابلہ ہونے والا تھا۔ جو ظاہر میں عبادت گذار تھیں۔ اور مسلمانوں کی سستی انہیں اعتراض کا موقعہ دے سکتی تھی۔ دوسری طرف مسلمانوں کو جلد فتوحات ملنے والی تھیں جس سے عبادات میں سستی ہو جاتی ہے۔ پس دونوں امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کو ہوشیار کیا۔ کہ دشمن کے طعن کا نشانہ اسلام کو نہ بنانا۔ اور نہ سست ہو کر خدا تعالیٰ کے فضلوں کو کھو دینا۔

پانچوں نمازوں کے اوقات کا ذکر اس آیت میں اس آیت میں پانچوں نمازوں کے اوقات بتائے گئے ہیں۔ دلوک کے تین معنی ہیں۔ اور ہر ایک معنی کے رو سے ایک ایک نماز کا وقت ظاہر کر دیا گیا۔

(۱) مَالَتْ وَزَالَتْ عَنْ كَبِدِ السَّمَاءِ یعنی زوال کو دلوک کہتے ہیں۔ اس میں ظہر کی نماز آ گئی (۲) اِصْفَرَّتْ۔ جب سورج زرد پڑ جائے تو اس کو بھی دلوک کہتے ہیں اسمیں نماز عصر کا وقت بتا دیا گیا۔ (۳) تیسرے معنی غَرَبَتْ یعنی غروب شمس کے ہیں اس میں نماز مغرب کا وقت بتایا گیا ہے (۴) غَسَقِ الَّيْلِ کے معنی ظُلْمَةُ اَوَّلِ اللَّيْلِ کے ہیں۔ یعنی رات کے ابتدائی حصہ کی تاریکی۔ اس میں نماز عشاء کا وقت مقرر کر دیا گیا۔ (۵) قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کہہ کر صبح کی نماز کا ارشاد فرمایا۔ اس کے سوا کوئی اور تلاوت صبح کے وقت فرض نہیں ہے۔

اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا۔ احادیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ کہ صبح کی نماز کے وقت دن کے فرشتے آتے ہیں اور رات کے فرشتے چلے جاتے ہیں۔ وہ فرشتے جب خدا کے پاس جاتے ہیں۔ تو دریافت کرنے پر کہتے ہیں۔ کہ ہم جب دنیا میں گئے۔ تو تیرے بندوں کو نماز پڑھتے ہی دیکھا اور واپس آئے ہیں تو نماز پڑھتے ہی چھوڑ کر آئے ہیں۔ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَشْهَدُهُ مَلَائِكَةُ اللَّيْلِ وَمَلَائِكَةُ النَّهَارِ۔ (الترمذی کتاب التفسیر باب سورۃ بنی اسرائیل) اس کا مطلب یہ ہے کہ صبح کی نماز خاص طور پر اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ اور خاص ہی طور سے مقبول ہوتی ہے کیونکہ اس وقت انسان میٹھی نیند کو چھوڑ کر اٹھتا ہے۔ صبح کی نماز دراصل عام مسلمان کی تہجد ہی کی نماز ہے۔ بلاشبہ جو انسان صبح کی نماز پڑھے گا۔ اگر اس نے وہ نماز ایمانداری سے پڑھی ہوگی تو باقی نمازیں بھی اس کے لئے آسان ہو جائیں گی۔

وَ مِنَ الَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖۗ عَسٰۤى اَنۡ يَّبۡعَثَكَ

اور رات کو بھی تو اس (یعنی قرآن) کے ذریعہ سے کچھ سو لینے کے بعد شب بیداری کیا کر۔ جو تجھ پر ایک زائد انعام

رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ﴿۸۰﴾

ہے (اس طرح پر) بالکل متوقع ہے۔ کہ تیرا رب تجھے حمد والے مقام پر کھڑا کر دے۔

حلّ لُغات۔ فَتَهَجَّدۡ هَجَدَ يَهۡجُدُ هُجُوۡدًا سے باب تفعّل کا واحد مذکر امر کا صیغہ ہے۔ هَجَدَ الرَّجُلُ: نَامَ بِاللَّيۡلِ آدمی رات کو سویا۔ وَسَهِرَ رات کو بیدار رہا۔ وَفِي اللِّسَانِ تَهَجَّدَ الۡقَوۡمُ: اِسۡتَيۡقَظُوۡا لِلصَّلٰوةِ اَوۡ غَيۡرِهَا۔ لسان العرب میں لکھا ہے۔ کہ تَهَجَّدَ الۡقَوۡمُ کے معنی لوگوں کے سونے کے بعد نماز وغیرہ کے لئے بیدار ہونے کے ہیں۔ (اقرب)

نافلةً نَفَلَ۔ (يَنۡفُلُ نَفۡلًا) الرَّجُلُ فُلَانًا: اَعۡطَاهُ نَافِلَةً مِنَ الۡمَعۡرُوۡفِ مِمَّا لَا يُرِيۡدُ ثَوَابَهٗ مِنۡهُ یعنی ایک شخص نے دوسرے پر ایسی بخشش کی جس کے بدلے کا اس سے خواہش مند نہیں۔ نَفَلَ الۡاِمَامُ الۡجُنۡدَ: جَعَلَ لَهُمۡ مَا غَنِمُوۡا۔ امام نے لشکر کو مال غنیمت دے دیا۔ لفظ نافلہ نفل سے اسم فاعل مؤنث بمعنی مفعول ہے۔ یعنی دی ہوئی چیز۔ دیا ہوا انعام اَلنَّافِلَةُ کے معنی (۱) اَلۡغَنِيۡمَةُ۔ غنیمت۔ (۲) اَلۡعَطِيَّةُ۔ بخشش۔ (۳) مَا تَفۡعَلُهُ مِمَّا لَا يَجِبُ۔ فرض سے زائد عمل کرنا۔ (۴) وَلَدُ الۡوَلَدِ۔ پوتا۔ اس کی جمع نَوَافِلُ آتی ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ تَهَجَّدۡ بِهٖ میں ہٖ کی ضمیر قرآن کریم کی طرف پھرتی ہے اور مراد یہ ہے کہ اس نماز میں تلاوت قرآن پر خاص زور ہونا چاہیے۔

تہجد کے معنے سو کر اٹھنے کے ہوتے ہیں۔ اس لئے تہجد کی نماز سے پہلے سونا ضروری ہے۔ جو لوگ ساری رات جاگنے کے چلّے کھینچتے ہیں۔ وہ عبادت نہیں کرتے۔ شریعت کے منشاء کو باطل کرتے ہیں۔ ایسی عبادت قرآن کریم کے منشاء کے خلاف ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہمیشہ پہلی رات سوتے تھے۔ اور آخر رات میں اٹھ کر تہجد پڑھتے تھے (بخاری کتاب التهجد باب من نام اول اللیل و احیا اخرہ)۔

نماز محبوب کی زیارت ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ عبادت کا موقعہ دینا ایک احسان الٰہی ہے۔ مگر افسوس ان لوگوں پر جو نماز کو چٹّی سمجھتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز اپنے رب کی زیارت

ہے۔اور زیارت الٰہی ایک انعام ہے۔اور کوئی عقلمند انسان اپنے محبوب کی زیارت کو چٹی نہیں سمجھے گا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تو عبادت کی شان ہی یہ بتائی ہے کَاَنَّكَ تَرَاهُ وَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ (مسلم کتاب الایمان باب الاسلام ماھو و بیان خصالہ) یعنی صحیح نماز یہ ہے کہ تو خدا تعالیٰ کو دیکھ لے۔ یا کم سے کم نماز کے وقت یہ یقین ہو کہ خدا تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے۔پس اتنے بڑے انعام کو چٹی سمجھنا سخت ظلم ہے نماز اللہ تعالیٰ کے بڑے انعامات میں سے ہے۔میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ انسان ایک نماز بھی چھوڑے تو وہ نمازی نہیں کہلا سکتا۔کیونکہ حکم اقامۃ الصلوٰۃ کا ہے۔اور وہ دوام کو چاہتا ہے۔جب ایک بھی نماز چھوڑ دی گئی تو دوام نہ رہا۔

نَافِلَةً لَّكَ سے اس بات کا اظہار کیا گیا ہے۔کہ عبادت کا موقعہ دینا ہمارا ایک احسان ہے۔یا ممکن ہے کہ تہجد کی نماز پہلے انبیاء پر واجب نہ کی گئی ہو۔اس صورت میں اس کے یہ معنی ہوں گے۔کہ یہ عبادت کا موقعہ خاص تیرے لئے انعام ہے۔

مَقَامًا مَّحْمُوْدًا میں عظیم الشان پیشگوئی مَقَامًا مَّحْمُوْدًا میں ایک بہت بڑی پیشگوئی کی گئی ہے۔دنیا میں کسی شخص کو بھی اتنی گالیاں نہیں دی گئیں۔جتنی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دی گئیں ہیں۔ڈاکو، بدکار، بدمعاش، فاسق سے فاسق انسان کو ان گالیوں کے کروڑویں حصہ کے برابر بھی گالیاں نہیں دی جاتیں۔جتنی کہ آج تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دی گئی ہیں۔مقام محمود عطا فرما کر اللہ تعالیٰ نے ان گالیوں کا آپ کو صلہ دیا ہے۔فرماتا ہے جس طرح دشمن گالیاں دیتا ہے۔ہم مومنوں سے تیرے حق میں درود پڑھوائیں گے اسی طرح عرش سے خود بھی تیری تعریف کریں گے۔اس کے مقابل پر دشمن کی گالیاں کیا حیثیت رکھتی ہیں۔

مقام محمود سے مراد شفاعت بھی ہے مقام محمود سے مراد مقام شفاعت بھی ہے۔کیونکہ جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے۔سب اقوام کے لوگ سب نبیوں کے پاس سے مایوس ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس شفاعت کی غرض سے آئیں گے۔اور آپ شفاعت کریں گے (بخاری کتاب التفسیر باب قولہ تعالیٰ ذریۃ من حملنا مع نوح)۔اس طرح گویا ان سب اقوام کے مونہہ سے آپ کے لئے اظہار عقیدت کروا دیا جائے گا۔جو اس دنیا میں آپ کو گالیاں دیتی تھیں۔اور یہ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا مقام محمود ہے۔

مقام محمود سے مراد خروج مہدی بھی ہے مقام محمود سے مراد میرے نزدیک خروج مہدی بھی ہے۔کیونکہ اس کے ظہور کا وقت وہی بیان ہوا ہے۔جب مسلمانوں کے اسلام سے روگردان ہو جانے کی اور کافروں کے کفر میں ترقی کر جانے کی خبر دی گئی ہے۔ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ کے اس پہلوان کا ظہور جو ان گالیوں کی رو کو تعریف

سے بدلوادے۔مقام محمود کا ہی ایک کرشمہ ہے۔میں نے اسی خدمت میں حصہ لینے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حالات بیان کرنے کے لئے سال میں ایک دن مقرر کیا ہوا ہے جس میں ہر مذہب وملت کے لوگ اپنے ان تاثرات کو بیان کرتے ہیں۔جو آپ کے حالات پڑھنے سے ان کے دلوں پر پڑتے ہیں۔اقم الصلوٰۃ الآیتین۔ نماز پنجگانہ اور تہجد کے ذکر کے بعد جو مقام محمود کا ذکر کیا ہے۔اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس شخص کے دشمن زیادہ ہوں اور بدگولوگوں کی تعداد بڑھ جائے اس کا یہ علاج نہیں۔کہ وہ ان سے الجھتا پھرے۔بلکہ ایسے وقت میں انابت الی اللہ اور بارگاہ الٰہی میں فریاد کرنا ہی ان فتنوں کو دور کرتا ہے۔بلکہ اگر انابت بہت بڑھ جائے تو مذمت تعریف سے اور گالیاں دعاؤں سے بدل جاتی ہیں چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ایسا ہی ہوا۔کہ جو لوگ آپ کو گالیاں دیتے تھے ایک دن عاشق صادق ہوگئے۔عمرو بن عاص۔خالد۔عکرمہ۔مردوں میں سے اور ہندہ عورتوں میں سے اس کی زبردست مثالیں ہیں۔یہ لوگ آپ کی دعاؤں سے ہی کھنچ کر آ گئے۔ورنہ جس قدر عداوت ان کے دل میں تھی۔اس کا دور کرنا انسانی بس کی بات نہ تھی۔

آنحضرتؐ کی زندگی کا ہر واقعہ تاریخ میں موجود ہے بعض نادان کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی میں (نعوذ باللہ من ذالک) کوئی نقص تھا تب ہی تو آپ کو اتنی گالیاں دی جاتی ہیں۔میں کہتا ہوں یہ بات نہیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو گالیاں کسی عیب کی وجہ سے نہیں۔بلکہ حضور کی خوبیوں کی وجہ سے دی جاتی ہیں۔دنیا کے کسی اور نبی کو تمام انسانوں کے لئے اسوہ حسنہ نہیں بنایا گیا تھا۔اس لئے کسی نبی کی زندگی کے مکمل سوانح محفوظ نہیں کئے گئے۔اگر دنیا کے مذہبی پیشواؤں میں سے کسی پیشوا کی زندگی کے حالات تفصیلاً موجود ہیں۔تو وہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔آپ کی زندگی کا ہر واقعہ تاریخ میں موجود ہے۔ آپ کا کھانا۔آپ کا پینا۔آپ کا چلنا پھرنا اور بولنا اور بیٹھنا غرض ہر حرکت وسکون آپ کا محفوظ کرلیا گیا ہے۔گویا جس طرح سے کسی شخص کی تلاشی لی جاتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضور کے اعمال وخیالات کو اکٹھا کر کے دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔اس کے باوجود آپ کے دشمنوں کے سامنے میدان میں جمے رہنا اور عقل سے کام لینے والوں کی نگاہ میں عزت پا جانا کوئی معمولی معجزہ نہیں۔اور اگر یہ عزت جو پورے امتحان کے بعد حاصل ہوئی ہے مقام محمود نہیں کہلاسکتی تو پھر کوئی اور عزت مقام محمود نہیں کہلاسکتی۔حق یہ ہے کہ آپ کی زندگی کے صرف ایک دن کے واقعات کے برابر بھی دوسرے نبیوں کی عمر بھر کے واقعات محفوظ نہیں۔پس ایسے مخفی وجودوں کی زندگی پر کوئی جرح کرے تو کیا کرے۔پس کسی قوم کا اس پر خوش ہونا کہ اس کے نبی پر اس قدر اعتراض نہیں ہوتے کوئی معقول خوشی نہیں۔

پہلا مقام محمود آنحضرتؐ کا مدینہ تشریف لے جانا ہے میرے نزدیک آپ کے لئے جو مختلف مقاماتِ محمودہ مقرر ہیں۔ان میں سے سب سے پہلا مقام محمود جو اس آیت کے نزول کے بعد آپ کو ملا۔مدینہ منورہ تھا۔وہاں کی زندگی سے آپ کی حمد وستائش دنیا میں پھیل گئی چنانچہ دعا مندرجہ آیت میں اسی طرف اشارہ ہے۔

وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ

اور کہہ (کہ) اے میرے رب مجھے ظاہراً و باطناً اچھے طور پر (ہی) داخل کر اور ظاہراً و باطناً اچھے طور پر (ہی اس

صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ﴿۸۱﴾

سے) باہر لا۔اور مجھے اپنے حضور سے کامل نصرت والا غلبہ عطا کر۔

حلّ لُغات ۔ مُدْخَلَ صِدْقٍ۔لفظ مُدْخَلٌ دَخَلَ سے باب افعال کا مصدر میمی۔اسم مفعول اور ظرف زمان و مکان ہے۔اس کے معنی داخل ہونا۔داخل کیا ہوا۔داخل ہونے کا وقت اور داخل ہونے کی جگہ کے ہیں۔(تاج)

صدق کے معنی ہیں۔(۱) نَقِیْضُ الْكَذِبِ۔سچائی۔(۲) اَلْفَضْلُ۔فضیلت۔(۳) اَلصَّلَاحُ۔خوبی اور اچھائی۔(۴) اَلْجِدُّ۔سنجیدگی۔(۵) الشِدَّةُ وَالصَّلَابَةُ۔سختی اور مضبوطی۔فَاِذَا اَضَفْتَ اِلَیْهِ قُلْتَ رَجُلُ صِدْقٍ اَیْ نِعْمَ الرَّجُلُ اگر لفظ صدق مضاف الیہ واقع ہو تو مضاف کی ہر رنگ کی خوبی پر دلالت کرتا ہے۔چنانچہ رَجُلُ صِدْقٍ کے معنی ہوں گے۔ہر لحاظ سے خوبیوں والا شخص (اقرب) وَیُعَبَّرُ عَنْ كُلِّ فِعْلٍ فَاضِلٍ ظَاهِرًا وَ بَاطِنًا بِصِدْقٍ فَیُضَافُ اِلَیْهِ ذَالِكَ الْفِعْلُ الَّذِیْ یُوْصَفُ بِهٖ کسی فعل کی ظاہری و باطنی خوبی کا اظہار کرنے کے لئے اسے لفظ صدق کی طرف مضاف کیا جاتا ہے۔(مفردات) مزید تشریح کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۳۔

اَلصِّدْقُ یُعَبَّرُعَنْ كُلِّ فِعْلٍ فَاضِلٍ ظَاهِرًا وَبَاطِنًا بِالصِّدْقِ فَیُضَافُ اِلَیْهِ ذٰلِكَ الْفِعْلُ الَّذِیْ یُوْصَفُ بِهٖ نَحْوُ قَوْلِهٖ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ وَاَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ (مفردات) صدق سے مراد ہر وہ فعل ہوتا ہے جو ظاہر و باطن میں خوبی رکھتا ہو۔اور جس فعل کی صدق کو صفت بنانا ہو اس کو صدق کی طرف مضاف کر دیتے ہیں۔جیسے کہ قرآن کریم میں ہے۔فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ (القمر:۵۶) فلاں شخص ظاہر و باطن طور پر اچھی جگہ میں ہے۔یا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ انہیں ظاہر و باطن طور پر اچھا درجہ حاصل

ہے۔ یا وَ اجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ۔ (الشعراء:۸۶) مجھے ظاہر و باطن طور پر اچھی تعریف حاصل ہو۔ یعنی میرا ذکر خیر کے ساتھ صرف لوگوں کی زبان پر ہی نہ ہو بلکہ واقع میں بھی میرے نیک کام دنیا میں قائم رہیں۔ اور میری تعریف جھوٹی نہ ہو یعنی لوگ غلو کر کے مجھ سے شرک نہ کرنے لگ جائیں۔ یا فرمایا ہے کہ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ مجھے اس طرح کا داخلہ عطا ہو جو ظاہر و باطن میں اچھا ہو اور میں اس طرح اپنے شہر سے نکلوں کہ جو ظاہر و باطن میں اچھا ہو۔ یعنی اس میں بزدلی اور کمزوری ایمان کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ اور اس کے نتائج نہایت اعلیٰ ہوں۔

پس مُدْخَلَ صِدْقٍ کے معنے ہوں گے ظاہراً و باطناً اچھے طور پر داخل کرنا۔

تفسیر ۔ صِدْقٍ کے معنی بتائے جا چکے ہیں یعنی اندرونی و بیرونی دونوں حالتیں یکساں طور سے اچھی ہوں اس آیت میں دعا اور انابت کے جواب میں جو مقام محمود رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ملنے والے تھے۔ ان میں سے پہلے مقام محمود کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اب تجھے اسراء کی خبر کے ماتحت مکہ سے نکال کر ہم ایک اور جگہ کی طرف جو مقام محمود ہے لے جائیں گے۔ اس لئے اس کے متعلق ابھی سے دعائیں شروع کر دے۔ اور کہہ کہ اے خدا مجھے اس شہر میں ظاہری اور باطنی خوبیوں کے ساتھ داخل کر اور اس مقام سے بھی جس میں میں اس وقت ہوں یعنی مکہ سے ظاہری اور باطنی خوبیوں کے ساتھ نکال یعنی کفار جو ارادہ کر رہے ہیں۔ کہ مجھے ذلت سے نکالیں۔ جس سے میرا رعب اور اثر جاتا رہے۔ اس میں وہ کامیاب نہ ہوں۔ چنانچہ یہ دونوں دعائیں قبول ہوئیں۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو کفار اپنی مرضی کے مطابق نہ نکال سکے بلکہ خدا تعالیٰ کے علم دینے سے آپ خود ہی مناسب موقعہ پر مکہ سے ہجرت کر گئے۔ اسی طرح آپ کا دخول مقام محمود میں بھی نہایت اعلیٰ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے وہاں آپ کی شمع رخ کے ہزاروں پروانے پیدا کر دیئے۔ جو آپ کے مونہہ کی طرف ہر وقت دیکھتے رہتے تھے۔ اور جن کو آپ سے وہ عشق تھا۔ کہ اس عشق کی نظیر دنیا میں اور کہیں نہیں ملتی۔

ان معنوں پر ایک اعتراض ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ خروج مکہ پہلے ہوا ہے۔ اور دخول مدینہ بعد میں۔ پھر قرآن کریم نے دخول کو پہلے کیوں بیان فرمایا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خروج کی خبر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو لازماً تکلیف ہونی تھی۔ اور یہ خیال پیدا ہونا تھا کہ مکہ سے نکل کر ہم کہاں جائیں گے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی محبت کی وجہ سے اس امر کا پہلے ذکر فرمایا کہ عنقریب تجھ کو ایک مبارک مقام ملنے والا ہے اور مکہ سے نکلنے کے ذکر کو اس کے بعد رکھا۔ تا کہ تسلی پہلے مل جائے اور غم کی خبر بعد میں ملے۔

دوسرے معنی اس آیت کے یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ دخول سے مراد آپ کا دوبارہ مکہ میں واپس آنا ہے۔

اورخروج سے مراد آپ کی ہجرت ہے ۔اس صورت میں بھی ترتیب کے متعلق اعتراض پڑے گا۔ کہ ہجرت پہلے تھی ۔اور فتح مکہ بعد میں ۔لیکن اس کا بھی وہی جواب ہے ۔ جو پہلے بیان ہوا۔ کہ مکہ سے نکلنے کے صدمہ کواس خبر سے کم کر دیا۔ کہ آپ پھر مکہ میں آنے والے ہیں ۔اوراس کے بعد مکہ سے نکلنے کا ذکر کیا۔ تا تسلی پہلے ہوجائے ۔اورغم کی خبر بعد میں بتائی جائے ۔اس صورت میں مقام محمود کے معنی یہ ہوں گے کہ فتح مکہ کے بعد دشمنوں کے سب اعتراضات دور ہوجائیں گے ۔اورعربوں پر آپ کی سچائی ظاہر ہوجائے گی ۔ چنانچہ ایساہی ہوا۔سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا مجھے اپنے پاس سے ایسا غلبہ دے ۔ جو کہ نصیر ہو۔یعنی وہ میرے کاموں میں میرا مدو معاون ہو مضر نہ ہو کیونکہ بعض غلبے انسان کے لئے بجائے فائدہ پہنچانے کے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں ۔یعنی مجھے غلبہ تو ملے ۔مگر ایسا نہ ہو جس کا انجام میرے کاموں کی تباہی ہو۔

یہ دعا اسراء کے ان معنوں کی تائید کرتی ہے ۔ جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں اوراس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسراء کے کشف کی ایک تعبیر مدینہ کی طرف ہجرت کرنا تھی ۔

وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۲﴾

اور (سب لوگوں سے) کہہ دے (کہ بس اب) حق آ گیا ہے ۔اور باطل بھاگ گیا ہے اور باطل تو ہے ہی بھاگ جانے والا ۔

حلّ لُغَات ۔زهق زَهَقَ الْبَاطِلُ کے معنے ہیں اِضْمَحَلَّ ۔ باطل کمزور ہوگیا ۔الشَّیْءُ: بَطَلَ وَ هَلَكَ ۔کوئی چیز بے اثر ہوگئی مٹ گئی ۔(اقرب)

تفسیر ۔اس میں یہ اشارہ کیا گیا ہے ۔ کہ مدنی زندگی کے شروع ہونے کے ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طاقت مضبوط ہوتی ۔اور بڑھتی جائے گی ۔اوردشمن کی کمزوری اورضعف و ناتوانی کے سامان پیدا ہوتے جائیں گے ۔ یہاں تک کہ آخر باطل کمزور پڑتے پڑتے فنا ہوجائے گا ۔اور مکہ کی فتح کے وقت عرب سے بت پرستی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائے گا ۔

زھوق کا لفظ استعمال کرنے میں حکمت قرآن کریم کا یہ بے نظیر کمال ہے کہ وہ ہر موقعہ کے لئے ایسے الفاظ چنتا ہے جو ایک لمبے مضمون پر دلالت کرتے ہیں۔اس آیت میں زَھَقَ کا لفظ رکھا ہے۔اس کی جگہ ھَلَكَ اور بَطَلَ وغیرہ الفاظ بھی رکھے جاسکتے تھے۔مگر ان سے باطل کی تباہی کی اس تدریج کا علم نہ ہوتا۔جو زھوق کے الفاظ سے بتائی گئی ہے۔زھوق کے معنی کمزور ہوجانے اور ہلاک ہوجانے کے ہیں۔اوراسی طرح مکہ والوں سے گزری یہ نہیں کہ وہ یکدم تباہ ہو گئے۔بلکہ کمزور ہونے شروع ہوئے پھر آہستہ آہستہ وہ وقت آیا کہ بالکل فنا ہو گئے۔پس زھوق کے لفظ نے ہلاکت کی تفصیل بھی بتادی۔

جب مکہ فتح ہوااور خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کوتوڑ توڑ کر پھینکا گیا۔اس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہی آیت پڑھتے جاتے تھے۔ایک ایک بت پر ضرب لگاتے اور فرماتے جاتے تھے۔جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (بخاری کتاب المغازی باب این رکز النبی الرایۃ یوم الفتح)۔یہ بھی قرآن کا معجزہ ہے کہ اس نے کعبہ سے بتوں کے دور کئے جانے کے موقعہ کے لئے جو آیت رکھی ہے۔وہ شعر کی طرح موزوں ہے۔اس قسم کی خوشی کا موقعہ انسانی طبیعت کو شعر کی طرف راغب کرتا ہے۔قرآن شعر نہیں مگر اس کی آیات کے بعض ٹکڑے شعر کی سی موزونیت رکھتے ہیں۔یہ آیت بھی اگر اس کے شروع سے قل کا لفظ اڑادیا جائے تو شعر کی طرح موزوں ہوجاتی ہے۔جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ایک مصرعہ اور اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔دوسرا مصرعہ ہوتا ہے۔قل نے اس کو شعر کی تعریف سے نکال دیا۔لیکن جب اس کے پڑھنے کا موقعہ آیا تو چونکہ اس آیت کو قل کے بغیر پڑھنا تھا اس وقت یہ آیت اپنے شاندار معانی کے علاوہ ایک موزوں کلام کا بھی کام دیتی تھی۔اوراس خوشی کے موقعہ کے عین مناسب حال تھی۔جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت پڑھتے دیکھ کر صحابہ کس طرح لہریں لے لے کر اس آیت کو پڑھتے ہوں گے اور کس طرح ان کے ایمان ہر لحظہ اور ہر منٹ بڑھتے ہوں گے۔اس کا اندازہ اصحاب ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ

اور ہم قرآن میں سے آہستہ آہستہ وہ (تعلیم) اتار رہے ہیں جو مومنوں کے لئے (تو) شفاء اور رحمت (کا موجب)

وَ لَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۳﴾

ہے۔ اور جو ظالموں کو صرف خسارہ میں بڑھاتی ہے۔

حل لغات۔ خسارًا خَسَارًا اخَسِرَ کا مصدر ہے خَسِرَ التَّاجِرُ فِيْ بَيْعِهِ کے معنے ہیں تاجر کو اپنی تجارت میں گھاٹا ہوا۔ خَسِرَ الرَّجُلُ۔ ضَلَّ گمراہ ہو گیا۔ هَلَكَ۔ ہلاک ہو گیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی چیز مختلف نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ اور جیسی کسی کی فطرت ہوتی ہے۔ ایسا ہی وہ دوسری چیزوں کو سمجھتا ہے۔ کتنا ہی اعلیٰ اور پاک کلام کیوں نہ ہو۔ لیکن گندے دل والے انسان کو اس میں گند ہی نظر آتے ہیں۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ پنڈت دیانند صاحب کو قرآن مجید کے ابتداء سے لے کر آخر تک اعتراض ہی اعتراض نظر آئے۔ اور انہیں کوئی خوبی اس میں دکھائی نہ دی (ستیارتھ پرکاش باب ۱۴) یہی معنی اس آیت کے ہیں۔ کہ ظالم اس پر نکتہ چینیاں کر کے اور بھی اپنے گناہوں کو بڑھاتے ہیں۔

ان عام معنوں کے علاوہ میرے نزدیک اس آیت کے یہ معنی بھی ہیں کہ اس جگہ قرآن سے مراد وہ خاص حصہ ہے جو پہلے اتر چکا ہے۔ یعنی مومنوں کی ترقی اور کامیابی کی پیشگوئیاں اور دشمنوں کی بربادی اور تباہی کی خبریں۔ فرمایا کہ ان خبروں کے پورا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ ان پیشگوئیوں کے نتیجہ میں مسلمانوں کے زخمی دلوں کو شفا حاصل ہوگی۔ اور ان کے زخم مندمل ہوں گے۔ ان کے ترقی کے سامان پیدا ہوں گے مگر یہی پیشگوئیاں کافروں کے حق میں نقصان اور تباہی کے سامان ساتھ لائیں گی۔

وَ اِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَ اِذَا

اور جب ہم انسان پر انعام کریں تو وہ روگرداں ہو جاتا ہے اور اپنے پہلو کو (اس سے) دور کر لیتا ہے۔ اور جب اسے

مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿۸۴﴾

تکلیف پہونچے تو وہ بہت ہی مایوس ہو جاتا ہے۔

حلّ لُغَات۔ نَاٰ بِجَانِبِهٖ نَاٰ کے معنے ہیں بَعُدَ دور ہوا۔ ب لازم فعل کو متعدی بنانے کے لئے ہے پس نَاٰ بِجَانِبِهٖ کے معنی ہوں گے اس نے اپنے پہلو کو دور کر لیا۔ (اقرب)

يَـُٔوْسًا۔ يَـُٔوْسًا یہ يَئِسَ سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ يَـُٔوْسٌ کے معنی ہیں بہت مایوس ہونے والا (اقرب)۔

تفسیر۔ اس میں بتایا کہ مومن اور کافر میں بڑا فرق ہے۔ مسلمانوں نے متواتر تیرہ سال تک مشکلات اور مصائب برداشت کئے۔ ماریں کھائیں اور عذاب سہے مگر اف تک نہ کی۔ لیکن ان کافروں پر جب عذاب شروع ہوگا اور مومنوں کی ترقی کے سامان ہوں گے تو یہ کفار اسی دن ہتھیار ڈال دیں گے اور ناامید ہو جائیں گے۔ چونکہ کافر کو خدا پر ایمان نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ ذراسی تکلیف سے بھی گھبرا جاتا ہے۔ مگر مومن خدا کے لئے سب کچھ دلیری اور جرأت سے برداشت کرتا ہے۔

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ

تو (انہیں) کہہ (کہ ہم میں سے) ہر ایک (فریق) اپنے (اپنے) طریق پر عمل کر رہا ہے پس (اپنے رب پر ہی

اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۵﴾ ع

ع ۹ / ۷ / ۹

فیصلہ چھوڑ دو۔ کیونکہ) تمہارا رب اسے جو زیادہ صحیح راستہ پر ہے بہتر جانتا ہے (اس لئے اس کا فیصلہ سچے کی سچائی کو ضرور روشن کر دے گا)۔

حلّ لُغَات۔ شَاكِلَتِهٖ شَاكِلَةٌ اس کا مادہ شَكَلَ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں اَلشَّكْلُ۔ صورت۔ شکل۔ اَلنَّاحِيَةُ۔ طرف۔ اَلنِّيَّةُ۔ نیت۔ اَلطَّرِيْقَةُ۔ طریق۔ اَلْمَذْهَبُ۔ راستہ۔ مذہب۔ اَلْحَاجَةُ۔ ضرورت (اقرب)

تفسیر ۔فرماتا ہے منکرین سے کہہ دے کہ ہر شخص اپنے اپنے طریق پر اور اپنی اپنی شکل وصورت اپنی اپنی قابلیت ۔اپنے اپنے دین اور اپنی اپنی نیت کے مطابق عمل کرتا ہے ۔مومن کی نیت چونکہ خدا تعالیٰ کا حصول ہوتی ہے ۔اس لئے وہ دنیا کے چلے جانے پر گھبراتا نہیں ۔بلکہ سب ابتلاؤں کا دلیری سے مقابلہ کرتا ہے۔لیکن کافر چونکہ دنیا پرست ہوتا ہے اور اس کا سارا عمل دنیا کی خاطر ہوتا ہے جب وہ دنیا کو جاتے دیکھتا ہے تو گھبرا کر ہتھیار ڈال دیتا ہے۔فرمایا تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون ہدایت کی راہ پر عمل کر رہا ہے۔یعنی خدا تعالیٰ بھی اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتا ہے۔جیسی کہ اس شخص کی نیت ہوتی ہے ۔فرمایا ہم عمل کو بھی دیکھیں گے اور نیت کو بھی ۔اور پھر دونوں کے مطابق معاملہ کریں گے ۔جو خدا تعالیٰ کی رضا کو مدنظر رکھیں گے اور اس کے دین کے لئے قربانیاں کریں گے ۔ان کی تائید ونصرت کی جائے گی۔

میں نے پچھلی آیات کی تفسیر میں کفار مکہ کو مدنظر رکھا ہے لیکن یہی مضمون یہود کے متعلق بھی چسپاں ہوتا ہے۔اور وہ بھی اس میں شامل ہیں ۔انہوں نے بھی مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کیا۔اور آخر تباہ وبرباد ہوئے ۔اور خیبر کی جنگ کے بعد ان کا عرب سے صفایا ہو گیا (تاریخ الخمیس جلد ۲ صفحہ ۵۲)۔اور انہوں نے بھی دعوے تو بڑے کئے مگر جب مسلمان مجبور ہو کر دفاع کے لئے کھڑے ہو گئے تو اس طرح بزدلی سے ہتھیار ڈال دئے کہ ہمیشہ تاریخ ان کی بزدلی کی داستان بطور مثال قائم رکھے گی۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَاۤ

اور وہ تجھ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں تو (انہیں) کہہ (کہ) روح میرے رب کے حکم سے (پیدا ہوئی) ہے

اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۶﴾

اور تمہیں (اس کے متعلق) علم سے کم ہی (حصہ) دیا گیا ہے۔

حل لغات۔الرُّوح الرُّوح کے لئے دیکھو حجر آیت نمبر ۳۰۔

تفسیر ۔**روح کے متعلق مفسرین کے اقوال** یہ روح جس کے متعلق سوال کیا گیا ہے کیا چیز ہے؟ مفسرین نے اس کی مختلف تاویلیں کی ہیں بعض نے اس سے جبرائیل مراد لیا۔اور بعض نے اس سے مراد قرآن کریم کو لیا ہے ۔کیونکہ اس سے پہلے بھی اور بعد میں بھی قرآن کریم کا ذکر ہے (بحر محیط زیر آیت ھذا) بعض نے وہ

فرشتہ مراد لیا ہے جس کے سپرد دنیا کی پیدائش ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ہر ایک فرشتہ کو روح کہتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک ایک خاص فرشتہ ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے صرف اپنی تسبیح کے لئے پیدا کیا ہے بعض نے تو اس روایت کو صحابہ رضوان اللہ علیہم تک پہونچایا ہے کہ اس کے سوسر ہیں۔ ہر ایک سر میں سومونہہ ہیں۔ اور ہر ایک مونہہ میں سوزبان ہے۔ اور ہر ایک زبان سوسو بولی میں خدا تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے (تفسیر ابن جریر زیر آیت ھذا)۔ انہوں نے غالباً اس روایت کو بیان کر کے سمجھ لیا ہے کہ شاید اس طرح خدا کی تسبیح کا حق پورا ہو جائے گا۔ حالانکہ اس تسبیح سے زیادہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی امت ہی اللہ تعالیٰ کی تعریف کر رہی ہے۔ ساری دنیا میں مسلمان پھیلے ہوئے ہیں۔ ہزاروں بولیاں بولتے ہیں۔ اور ہر زبان میں آپ کی تعریف کر رہے ہیں۔ استاذی المکرم حضرت مولوی نورالدین صاحبؓ اس جگہ روح کے معنی کلام الٰہی کیا کرتے تھے (تصدیق براہین احمدیہ جلد ۱ صفحہ ۱۱۵) اور یہ معنی اوپر کے تمام معنوں سے اچھے ہیں اور زیادہ صحیح ہیں۔ کیونکہ اس سے پہلے اور اس آیت کے بعد بھی قرآن کریم کا ہی ذکر ہے۔

حضرت مسیح موعود کے نزدیک اس جگہ روح سے مراد روح انسانی ہے مگر حضرت مسیح موعودؑ بانی سلسلہ احمدیہ نے نہایت وضاحت سے اس آیت پر بحث کی ہے۔ اور اس کے معنی انسانی روح ہی کے لئے ہیں۔ اور فرمایا ہے کہ اس آیت میں روح کے متعلق بہت بڑے معارف بیان کئے گئے ہیں (چشمہ معرفت روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۱۵۹)۔

اس آیت میں جو یہ فرمایا ہے کہ لوگ سوال کرتے ہیں کہ روح کیا ہے۔ اس کے متعلق احادیث میں مختلف روایات آتی ہیں۔ بعض میں تو لکھا ہے۔ کہ یہ سوال یہود نے مدینہ میں کیا تھا (ترمذی ابواب التفسیر باب سورۃ بنی اسرائیل)۔ مگر اس کے خلاف یہ بات پیش کی جاتی ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ اس کا جواب وہ لوگ یہ دیتے ہیں کہ اس سورۃ کی بعض آیتیں مدنی ہیں (مگر جیسا کہ میں اوپر بیان کر آیا ہوں یہ درست نہیں)۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ سوال پہلے مکہ میں ہوا تھا۔ اور پھر دوبارہ مدینہ میں ہوا (مسند احمد مسند عبداللہ بن مسعودؓ و عبداللہ بن عباسؓ) عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ یہ سوال مدینہ میں ہوا تھا (ترمذی ابواب التفسیر باب سورۃ بنی اسرائیل)۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ وہی اس بات کے راوی ہیں۔ کہ یہ سورۃ مکی ہے (قرطبی)۔ اس کا جواب بعض علماء نے یہ دیا ہے کہ یہی سوال دوبارہ پھر مدینہ میں ہوا ہوگا۔

جو لوگ اس کو مکہ کی روایت قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ مکہ کے بعض لوگ مدینہ گئے تھے۔ اور وہاں جا کر انہوں نے یہود سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ذکر کیا اور کہا کہ اس طرح پر ایک مدعی نبوت ہم میں کھڑا ہوا ہے ہم اس سے کیا سوال کریں۔ جس سے اس کا جھوٹ کھل جائے۔ انہوں نے جواب دیا کہ روح اور اصحاب کہف

اور ذوالقرنین کے متعلق اس سے سوال کرو۔ اس پر ان لوگوں نے مکہ میں واپس آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا۔ اور یہ آیت نازل ہوئی (روح المعانی زیر آیت ھذا)۔

یہ آیت مکی ہے میرے نزدیک پہلی دفعہ سوال مکہ میں ہی ہوا ہے۔ اور وہیں اس کا جواب ملا ہے۔ ممکن ہے مدینہ میں بھی یہود نے سوال کیا ہو۔ بلکہ اغلب ہے کیونکہ جب یہود کی انگیخت سے یہ سوال ہوا تھا تو انہوں نے بھی ضرور یہ سوال کیا ہوگا۔ مگر یہ درست نہیں کہ دوبارہ یہ آیت اتری۔ بلکہ جب مدینہ میں یہ سوال ہوا ہوگا۔ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ آیت جواب میں پڑھ دی ہوگی۔ اس واقعہ کو کسی راوی نے بیان کیا۔ اور بعد کے راویوں میں سے کسی نے سمجھ لیا کہ شائد اس سوال کے جواب میں یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی تھی۔

سوال کی حقیقت بیان کرنے کے بعد میں جواب کو لیتا ہوں۔ مفسرین لکھتے ہیں۔ کہ اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق سوالوں کے جواب تو اللہ تعالیٰ نے تفصیلاً دیئے۔ اور اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ روح خدا کے حکم سے ہوتی ہے۔ اور تم کو اس بارہ میں بہت ناقص علم دیا گیا ہے۔ اس لئے تم اس کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے ہم تفصیل سے جواب نہیں دیتے اس پر یہود شرمندہ اور خاموش ہو گئے (روح المعانی زیر آیت ھذا)۔

اس جواب پر آریہ مصنفین نے بہت اعتراض کئے ہیں۔ اور لکھا ہے کہ اس جواب سے یہود کو شرمندہ ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ کونسا مدلل و مسکت جواب دیا گیا تھا کہ وہ شرمندہ ہو جاتے (کلیات آریہ مسافر تکذیب براہین احمدیہ صفحہ ۷)۔

حضرت خلیفۃ المسیح اوّل کے نزدیک روح سے مراد جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں۔ استاذی المکرم حضرت مولوی نورالدین صاحب اس کے یہ معنی کرتے تھے۔ کہ روح سے مراد اس جگہ کلام الٰہی ہے۔ اور جواب یہ دیا گیا ہے کہ کلام الٰہی حکم الٰہی سے نازل ہوتا ہے۔ اور اس کی ضرورت یہ ہے کہ تم کو بہت کم علم دیا گیا ہے۔ پس انسانی علم کے ناقص ہونے کی صورت میں ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ انسان کے علم کو روحانیت کے بارہ میں مکمل کرتا۔ سو اس ضرورت کے ماتحت اس نے اپنا کلام نازل کیا ہے۔ جیسا کہ میں بحر محیط کے حوالہ سے اوپر لکھ آیا ہوں پرانے مفسروں میں سے بھی بعض نے روح سے قرآن کریم مراد لیا ہے (البحر المحیط زیر آیت ھذا)۔ اور ان کی تفسیر حضرت استاذی المکرم کی تفسیر سے ملتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ظاہر ہے کہ روح سے صرف قرآن کریم مراد لینا اس قدر واضح نہیں جس قدر کہ کلام الٰہی کا مراد لینا۔ اس لئے اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت استاذی المکرم کا قول زیادہ واضح اور موقعہ کے مناسب ہے۔

حضرت مسیح موعودؑ کے نزدیک الروح میں روح انسانی کی طرف اشارہ ہے

میں ایک عرصہ تک انہی معنوں پر حصر کیا کرتا تھا۔مگر جب میں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام بانی سلسلہ احمدیہ کی بعض تحریرات کو غور سے پڑھا۔تو مجھے اپنے خیال میں کچھ تبدیلی کرنی پڑی۔اور تسلیم کرنا پڑا کہ روح انسانی کی طرف بھی اس میں اشارہ ہے۔اور ان معنوں سے آیت کا مضمون بہت وسیع اور بہت لطیف ہو جاتا ہے۔آپ تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی خلق دو طرح کی ہے۔(۱) ابتدائی خلق جو بغیر مادہ کے ہوتی ہے۔(۲) بعد کی خلق جو پہلے سے پیدا کئے ہوئے مادہ سے ہوتی ہے۔جس خلق میں اللہ تعالیٰ دنیوی اسباب سے کام لیتا ہے۔یعنی ایسے ذرائع کو استعمال کرتا ہے۔جو کسی چیز کی پیدائش سے پہلے موجود ہوں۔اس کا نام خلق رکھا جاتا ہے۔اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ بغیر ان ذرائع کے جو پہلے سے موجود ہوں پیدا کرتا ہے اس کا نام امر رکھا جاتا ہے۔جس کی طرف كُنْ فَيَكُوْن کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے اس آیت میں اسی قسم کی تخلیق کے متعلق جواب دیا گیا ہے۔جو اذن الٰہی سے ہوتی ہے۔آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی آریہ اس پر اعتراض کرے گا اور میرے مقابل آئے گا تو میں ایک رسالہ لکھوں گا جس میں بتاؤں گا کہ قرآن کریم نے روح کے اندر کیا کیا قوتیں اور طاقتیں بیان فرمائی ہیں (سرمہ چشمہ آریہ روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۲۳۳)۔ مگر افسوس کہ کوئی آریہ مقابل پر نہ آیا۔اور ہم اس قیمتی خزانہ سے محروم رہ گئے۔جو ہم کو مفت میں ملنے والا تھا۔مگر پھر بھی آپ کی بعض کتب سے رہنمائی حاصل کر کے ہم ایک کافی علم اس بارہ میں حاصل کرتے ہیں۔اور شاید اللہ تعالیٰ نے بقیہ علم کو کسی حکمت کے ماتحت کسی اور زمانہ کے لئے محفوظ رکھ چھوڑا ہو۔

اب میں ان معنوں کی بناء پر جو بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السلام نے کئے ہیں۔اس آیت کی تشریح اپنی سمجھ کے مطابق کرتا ہوں۔اور مجھے یقین ہے کہ جو شخص بھی تعصب سے خالی ہو کر ان معنوں پر غور کرے گا۔وہ محسوس کرے گا کہ اس آیت میں یہود کے سوال کو بے جواب نہیں چھوڑا گیا بلکہ اس کا نہایت لطیف اور مسکت جواب دیا گیا ہے۔ اس جواب سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ جن لوگوں نے اس جگہ روح کے معنی کلام الٰہی کے کئے ہیں۔یا قرآن کریم کے کئے ہیں۔انہوں نے بھی غلطی نہیں کی۔بلکہ صداقت ہی کو بیان کیا ہے۔

بات یہ ہے کہ پہلی آیات میں قرآن کریم کی فضیلت اور اس کی ضرورت کو بیان کیا گیا تھا۔بلکہ پہلی دو سورتوں میں تو اسی مضمون پر سارا زور تھا۔سورۃ حجر اور سورۃ نحل جیسا کہ میں ثابت کر آیا ہوں۔قرآن کریم کی طاقت اور اس کی قوت کے متعلق ہی دلائل بیان کرتی ہیں۔اس سورۃ میں بھی یہی بیان کیا گیا ہے کہ جب تک یہود کلام الٰہی سے وابستہ رہے ترقی کرتے رہے جب انہوں نے کلام الٰہی کو چھوڑ دیا۔تو ان پر عذاب نازل ہوا۔یہود چونکہ اپنے خیال میں یہ

سمجھ رہے تھے کہ ہم پر سبت کی بے حرمتی کی وجہ سے عذاب آیا ہے انہیں یہ مسئلہ عجیب معلوم ہوا بلکہ برا بھی لگا۔ خصوصاً اس لئے کہ عیسائی لوگ مسیح کو کلمۃ اللہ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ پس یہ الفاظ کہ خدائی کلام کے انکار کی وجہ سے ان پر عذاب آیا۔ انہیں بہت دکھ دیتے تھے۔

جھوٹے تصوف کی طرف رجحان کلام الٰہی کے بند ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے ادھر یہود میں ایک اور نقص بھی پیدا ہو گیا تھا۔ جو مایوس اقوام میں عام طور پر پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جب وہ کلام الٰہی سے محروم ہو گئے۔ اور نبوت کا سلسلہ ان میں بند ہو گیا۔ تو وہ جھوٹے تصوف کی طرف راغب ہو گئے۔ اور خاص خاص مشقوں کے ذریعہ سے بزعم خود اپنی روحانی قوتوں کے بڑھانے میں مشغول ہو گئے۔ کوئی تو ذکر اذکار کے ذریعہ سے اپنی قوتوں کو بڑھاتا۔ اور کوئی اسم اعظم کو قابو میں لا کر اپنی روحانیت کو ترقی دیتا تھا۔ اور یہ سب لوگ خیال کرتے تھے کہ جو کمی وحی الٰہی کے نہ آنے سے پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اس طرح انہوں نے دور کر لی ہے۔ یہ مرض حضرت داؤد کے زمانہ سے پیدا ہوئی اور حضرت مسیح کے نزول کے وقت تک بہت ترقی کر گئی۔ ان کا خیال تھا کہ ارواح کو قابو میں لا کر یا اپنی روح کو جلا دے کر انسان بہت بڑے بڑے معجزات دکھا سکتا ہے۔ اور علوم غیبیہ کو پا سکتا ہے۔

یہود کے نزدیک روح کی دو قسمیں اسم اعظم اور بعل سے متعلق اور وہ اس علم کو دو حصوں میں تقسیم کرتے تھے ایک جائز علم جسے وہ اسم اعظم سے وابستہ کرتے تھے۔ اور ایک ناجائز جسے وہ بعل سے تعلق کا نتیجہ بتاتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت مسیح علیہ السلام نے دعویٰ کیا اور معجزات دکھائے تو انہوں نے ان کے معجزات کی یہی تشریح کی۔ کہ اس کا بعل کے ساتھ تعلق ہے۔ چنانچہ اس کا ذکر انجیل میں ان لفظ میں آتا ہے۔ ’’فقیہہ جو یروشلم سے آئے تھے یہ کہتے تھے کہ اس کے ساتھ بعلز بول ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ بدروحوں کے سردار کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہے۔ وہ انہیں پاس بلا کر تمثیلوں میں ان سے کہنے لگا۔ شیطان کو شیطان کس طرح نکال سکتا ہے۔‘‘ (مرقس باب ۳ آیت ۲۲۔ ۲۳)

(یہی ذکر متی باب ۹ آیت ۳۴ و باب ۱۰۔ ۲۵۔ لوقا باب ۱۱۔ ۱۵ اور یوحنا باب ۷۔ ۲۰ اور باب ۸۔ ۴۸۔ ۵۲ و باب ۱۰۔ ۲۰ میں بھی آتا ہے) بعل زبو یا بعل زبول یا بعل زبوب درحقیقت ایک ہمسایہ قوم کا دیوتا تھا۔ چونکہ اس کی نسبت لوگوں میں معجزات مشہور تھے۔ یہود میں جب جادو کا خیال پیدا ہوا تو وہ اس کے متعلق یہ خیال کرنے لگے کہ یہ بعل سفلی دنیا کا سردار ہے۔ اور اس سے تعلق پیدا کر کے کفار لوگ معجزات دکھاتے ہیں۔ (انجیل کے مذکورہ بالا حوالہ جات نیز انسائیکلو پیڈیا ببلیکا نیز جوئش انسائیکلو پیڈیا زیر لفظ بیل زبول Beelzebul) اس کے

برخلاف جو روحانی طاقتیں بزعم خود وہ آپ حاصل کرتے تھے انہیں اسم اعظم کا نتیجہ بتاتے تھے۔ اور اس جادو کو جائز جادو سمجھتے تھے۔ جوئش انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے۔ کہ مسیح سے کم سے کم تین سو سال پہلے سے اسم اعظم کا رواج یہود میں پایا جاتا ہے۔

اسم اعظم کی طرف توجہ حضرت داؤد کے زمانہ سے ہوئی (میں بتا چکا ہوں کہ میری تحقیق میں حضرت داؤد کے زمانہ سے ان میں یہ خیال پیدا ہو چکا تھا۔ حضرت سلیمان کے زمانہ میں اور ترقی کر گیا)۔ وہ اسم اعظم کی نسبت یہ مشہور کرتے تھے۔ کہ وہ نہ بولا جا سکنے والا نام ہے (جوئش انسائیکلو پیڈیا زیر لفظ Names of God) یہود میں جو جادوگر تھے۔ وہ اس کا نام خاص طور پر اشاروں میں لکھتے تھے۔ یہ لوگ خصوصاً مصر میں پائے جاتے تھے۔ (حوالہ متذکرہ بالا)

سیاہ جادو اور سفید جادو کی تشریح یہود کا خیال تھا کہ سیاہ جادو اور سفید جادو دونوں حق ہیں۔ سیاہ جادو شیطانوں سے تعلق کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اور سفید جادو اسماء الٰہی سے تعلق کی وجہ سے۔ سیاہ جادو منع ہے۔ اور سفید جادو جائز ہے۔ لکھا ہے کہ علماء یہود سیاہ جادو کے مخالف تھے۔ مگر سیاہ جادو کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ سفید جادو کے استعمال میں ہرج نہ دیکھتے تھے۔ علماء یہود میں (بقول ان کے) اس جادو کے ذریعہ سے اس قدر طاقت پیدا ہو جاتی تھی۔ کہ وہ ایک نظر ڈال کر دشمن کو بھسم کر دیتے تھے۔ یا اسے ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ بنا دیتے تھے۔ بیماروں کو اچھا کرتے تھے۔ ان امور کا ان میں اس قدر رواج تھا کہ یونانی اور رومی لوگ یہود کو جادوگر کہا کرتے تھے۔ (جوئش انسائیکلو پیڈیا زیر لفظ میجک یعنی جادو جلد ۸)

اس کے علاوہ یہود کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ مردہ ارواح سے تعلق پیدا کر کے غیب کے علوم معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ تورات میں بھی اس کا ذکر ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے۔ استثناء باب ۱۸۔۱۱ میں بھی اس کا ذکر آتا ہے۔ اور اور بہت سی آیات میں بھی۔ اسی طرح یسعیاہ باب ۸۔۱۹ میں بھی ایسے لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ارواح سے تعلق پیدا کر کے غیب کا حال معلوم کرتے تھے۔ اور ان سے تعلق پیدا کرنا منع کیا گیا ہے۔ یسعیاہ کہتے ہیں کہ جب لوگ تجھے ایسے لوگوں سے تعلق پیدا کرنے کو کہیں تو ان سے کہہ کہ ’’کیا زندوں کی نسبت مردوں سے سوال کریں‘‘۔ جوئش انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے بنی اسرائیل نے غالباً یہ فن ایرانیوں سے سیکھا تھا۔ اور ان میں کثرت سے اس کا رواج پایا جاتا تھا۔ (جلد ۹ زیر لفظ نیکرومنسی یعنی علم الارواح Necromancy) خلاصہ یہ کہ یہود کا عقیدہ تھا کہ ارواح سے تعلق پیدا کر کے غیب کے علوم دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ اور گو ان کو اس سے منع کیا گیا تھا۔ مگر پھر بھی

وہ کثرت سے اس علم کو سیکھتے اور اس پر عمل کرتے تھے۔

موجودہ زمانہ میں بھی اس کا بہت رواج ہے۔ یورپ میں اس علم والوں کو سپر چولسٹ کہتے ہیں۔یعنی روحانیین تھیاسوفیکل سوسائٹی کی بنا ہی اس علم پر ہے۔موجودہ تھیاسوفی کی بانی مسز اینی بسنٹ کا یہ عقیدہ تھا۔کہ ارواح سے وہ بہت کچھ سیکھتی ہیں۔اور وہ اس کے ماتحت غیب کی خبریں بھی بتاتی تھیں۔ چنانچہ بزعم خود انہوں نے اس علم سے کام لے کر ایک بڑے اوتار کے آنے کی خبر دی تھی۔جس کی نسبت ان کا خیال تھا کہ کرشنا مورتی اس کا مصداق ہے(انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس زیر لفظ Theosophy)۔اب یہ نوجوان جو تعلیم دیتا ہے۔وہ قریباً دہریت کی تعلیم ہے۔

گزشتہ جنگ یورپ میں جب بہت سے گھرانوں کے نوجوان مارے گئے۔اس کی طرف خاص توجہ ہوگئی۔ اور سر کینن ڈائل مشہور مصنف نے اپنی آخری عمر اپنے ایک لڑکے کی یاد میں اس علم میں گزار دی۔مشہور ادیب اور سیاستدان ڈبلیو ٹی سٹڈ بھی اسی خیال کے تھے۔اور انہوں نے اپنے تجربوں کی کتاب بھی شائع کی ہے۔مشہور سائنسدان سر آلیور لاج بھی آخری عمر میں اس عقیدہ کے ہوگئے تھے۔کہ ارواح سے تعلق پیدا کیا جاسکتا ہے اور انہوں نے بھی کئی کتب اس بارہ میں لکھی ہیں(کینن ڈائل صفحہ ۱۴۰۔۱۵۰انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ لاج Lodge)۔

ہندوؤں کا یوگا علم الارواح ہندوؤں میں یوگا کے نام سے یہ علم رائج ہے۔اور ان کے ایک شاستر میں جسے پتنجلی کا یوگ شاستر کہتے ہیں اس مضمون پر خاص بحث کی گئی ہے (انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس زیر لفظ یوگا Yoga)۔مسلمان صوفیاء نے بھی تنزل کے زمانہ میں اس علم کی طرف توجہ کی۔اور علم اشراق اور حاضرات وغیرہ کے نام سے بہت کچھ رطب و یابس اس پر لکھا ہے اور کہا ہے اور اس نام نہاد علم کو استعمال کیا ہے (التبیان فی مسائل السلوک والاحسان المعروف بدلائل السلوک صفحہ ۱۵۱۔۱۶۹)۔

خلاصہ یہ کہ علم الارواح ایک قدیم علم ہے۔اور یہود میں اس کا خاص رواج تھا۔خصوصاً جب ان کا تعلق دین سے کم ہوا اور الہام کا دروازہ بند ہوا تو وہ اس کی طرف بہت متوجہ ہوگئے۔حضرت مسیح ناصری کے وقت میں ان میں اس کا رواج بہت بڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ حضرت مسیح کے وقت میں ایک فرقہ یہود کا اسینیوں کے نام سے تھا۔جن کی نسبت انجیل میں فریسیوں کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔

یہود کے فرقہ اسینیوں کے حالات بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت مسیح اسی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے چنانچہ ایک پرانا نسخہ کتاب کا جرمنی میں ملا ہے۔جس میں ایک اسینی نے دعویٰ کیا ہے کہ مسیح ہمارے فرقہ کے ایک آدمی

تھے۔اور مسیح کی زندگی کے حالات عجیب پیرایہ میں اس میں لکھے ہیں۔اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ صلیب پر سے زندہ اتر آئے تھے۔دیکھو The Crucifixion by an eye witness یہ کتاب میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔اس فرقہ کی نسبت انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں لکھا ہے۔کہ یہ لوگ روزے رکھتے۔اور بڑی پاک زندگی بسر کرتے تھے۔اور غیب کی خبریں بتاتے تھے۔اور معجزے دکھاتے تھے۔چنانچہ فائلو philo ان کی نسبت لکھتا ہے۔کہ غیر قوموں کے جادوگروں سے مرعوب نہ ہونا چاہیے۔ہمارے اندر بھی ایسے لوگ موجود ہیں اور اس نے مثال کے طور پر اسینیوں کو پیش کیا ہے۔جوزیفس مشہور یہودی مصنف بھی ان کے ذکر میں لکھتا ہے کہ وہ پیشگوئیاں کرتے تھے۔اور غیب کی خبریں بتاتے تھے ان کی نسبت لکھا ہے کہ عبادت کے وقت مراقبہ کرتے تھے۔تا ان کی ارواح کا تعلق آسمانی باپ سے پیدا ہو جائے اور ان کے لیڈر اسم اعظم کے جاننے کا دعویٰ کرتے تھے جو بقول ان کے بیالیس حرفوں کا ہے۔یہ لوگ عورتوں سے الگ رہنے کو پسند کرتے تھے۔تا کہ ’’مزید الہام ان پر نازل ہو‘‘۔(انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Essenes) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کے یہود اسی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

عبداللہ بن صیاد ارواح سے تعلق کی وجہ سے غیب کا دعویدار تھا کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ مدینہ کے یہود میں سے ایک شخص عبداللہ بن صیاد پیشگوئیاں کیا کرتا تھا جب اس کی خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی تو آپ اس کا امتحان کرنے کے لئے گئے۔اور چونکہ وہ غیب کے علم کا دعویٰ کرتا تھا۔آپ نے اس سے پوچھا۔کہ میں نے اپنے ذہن میں ایک لفظ رکھا ہے۔تم بتاؤ کہ وہ کیا ہے۔آپ نے سورہ دخان کی آیت فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ (الدخان:۱۱) ذہن میں رکھی تھی۔اس نے سوچ کر جواب دیا۔دُخ۔دُخ اور آگے خاموش ہو گیا۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔لَنْ تَعْدُوَ قَدْرَكَ تو جس حیثیت کا ہے۔اس سے آگے نہ بڑھے گا۔یعنی تیرا علم دماغی ہے۔تو الٰہی اخبار کو نہیں بتا سکتا۔اس شخص کے متعلق صحابہ کو خیال تھا کہ یہ دجال ہے۔چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا۔مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے آپ کو یہ کہہ کر منع فرمایا۔کہ اگر یہ دجال ہے تو تم اس کو مار نہیں سکتے۔اور اگر یہ دجال نہیں تو اس کا مارنا ناجائز ہے (مسلم کتاب الفتن باب ذکر ابن صیاد)۔بہرحال اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کے یہود میں اس قسم کے لوگ موجود تھے۔جو ارواح سے تعلق رکھنے کے مدعی تھے۔اور یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ اسینی فرقہ کے لوگوں سے تعلق رکھتے تھے۔

کفار کے آنحضرتؐ سے روح کے متعلق سوال کرنے کی وجہ اس تمہید کے بعد میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جب قرآن کریم نے غیب کی خبریں بتائیں۔اور کفار نے جواب سے عاجز آکر یہود سے اس بارہ میں مدد چاہی

تو انہوں نے ان سے کہا کہ اس شخص سے روح کے متعلق سوال کرو یعنی روح میں کیا کیا قوتیں ہیں۔اس سوال کے جواب سے وہ پکڑا جائے گا۔ان کا خیال تھا کہ اگر تو آپ یہ جواب دیں گے۔کہ روح میں بڑی بڑی طاقتیں ہیں۔ جن سے وہ علم غیب معلوم کر لیتی ہے۔تو ہم کہیں گے کہ پھر قرآنی علوم کو ہم خدا تعالیٰ کی طرف سے کیوں سمجھیں۔ کیوں نہ اسے آپ کی بعض روحانی مشقوں کا نتیجہ قرار دیں۔اور اگر آپ یہ جواب دیں گے کہ روح میں کوئی ایسی طاقت نہیں ہے۔تو ہم آپ کے اس جواب پر آپ کی جہالت کو ثابت کریں گے۔گویا ان کے نزدیک قرآنی علوم محض ایک دماغی مشق کا نتیجہ تھے۔

اس امر کا ثبوت کہ یہود میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں ارواح سے تعلق پیدا کرنے کا خیال پایا جاتا تھا۔قرآن کریم سے بھی ملتا ہے۔چنانچہ سورۂ جن میں ایک ایسی جماعت کا ذکر کر کے جو موسیٰ پر ایمان لائی تھی اور جن کی نسبت میں پہلے ثابت کر آیا ہوں۔کہ وہ انسان ہی تھے۔ان کا یہ قول نقل فرمایا ہے۔ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ (الجن:۱۰) کہ ہم آسمانی خبروں کو معلوم کرنے کے لئے آسمان کی طرف توجہ کر کے بیٹھا کرتے تھے۔یعنی مراقبہ کیا کرتے تھے۔

اگر یہود ایسا سوال نہ کرتے تب بھی قرآن کریم میں اس سوال پر روشنی ڈالنی ضروری تھی۔کیونکہ یہ عقیدہ درحقیقت سب سچے مذہبوں پر حملہ ہے۔اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے بتائے بغیر بھی انسان ارواح کی مدد سے ہدایت کے اصول دریافت کر سکتا ہے۔جیسا کہ تھیا سوفی والے ظاہر کرتے تھے۔اور اس عقیدہ کے رو سے ہر شخص جو بعض نام نہاد روحانی مشقیں کرے۔علوم غیبیہ سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ظاہر ہے کہ اگر یہ عقیدہ صحیح ہو تو مذہب کے بارہ میں امن بالکل اٹھ جاتا ہے۔

روح کے امر ربی ہونے کی تشریح قرآن کریم اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ۔ اے محمد! رسول اللہ تو ان سے کہہ دے کہ روح کامل یعنی جو روح خدا تعالیٰ سے صحیح تعلق رکھتی ہے اور بعض علوم غیبیہ سے آگاہ کی جاتی ہے مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے تیار ہوتی ہے۔بغیر امر رب کے کوئی روح کامل نہیں ہو سکتی۔اور جس قسم کی مشقوں اور جادوؤں اور یوگا کو تم روح کے کامل کرنے کا ذریعہ بتاتے ہو۔یہ بالکل غلط خیال ہے۔روح صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے حکم سے کامل ہوتی ہے گویا اس جگہ الروح سے مراد کامل روح ہے جو سب روحانی صفات کو اپنے اندر رکھتی ہو۔جیسے کہ قرآن کریم کے شروع میں ہی آتا ہے۔اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کامل حمد جس میں حمد کی سب ضروری صفات پائی جائیں اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے۔انہی معنوں میں الروح کا لفظ اس جگہ استعمال ہوا ہے۔

اور یہ بتایا گیا ہے کہ روح کو کامل کرنے کا کام اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ بغیر اذن الٰہی کے کوئی روح کامل نہیں ہوسکتی۔ خواہ اس کے کامل کرنے کے لئے کتنے ہی یوگ استعمال کئے جائیں۔ اور کتنی ہی مشقیں کی جائیں۔ اس دعوے کی ایک تازہ مثال کرشنا مورتی کا وجود ہے۔ مسز اینی بیسنٹ نے اس نوجوان کو اور ان کے ایک اور بھائی کو خاص طور پر یوگا کے اصول کے ماتحت پالا تھا۔ اور بڑے بڑے ماہر فن ان کی تربیت پر مقرر کئے تھے۔ کہ روزانہ توجہ سے ان کے خیالات کو درست رکھیں۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ جو بڑا بھائی تھا وہ تو ہر وقت شکایت کرتا تھا کہ ہم قیدیوں کی طرح ہیں۔ اور خواہ مخواہ ہم پر جبر کیا جاتا ہے۔ اور چھوٹا بھائی جسے بڑے کی بغاوت کی وجہ سے چنا گیا۔ اب علی الاعلان مسز اینی بیسنٹ کے خیالات کی تردید کر رہا ہے (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ کرشنا مورتی Krishana murti)۔

اگر کہا جائے کہ قرآن کریم کا یہ جواب تو ایک دعویٰ ہے جواب کہلانے کا مستحق نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حد تک تو صرف اصل بتایا گیا ہے۔ سوال کا جواب آیت کے اگلے حصہ سے شروع ہوتا ہے وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا کہہ کر یہ ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ روح کی قوتوں کو نشوونما دینے کے لئے جو مشقیں انسانوں نے بنائی ہیں گو ان کے نتیجہ میں بعض قوتیں روح کو حاصل ہوجاتی ہیں۔ مگر وہ حقیقی قوتوں کے مقابلہ میں بالکل ناقص اور تھوڑی ہیں۔ پس ان کی بناء پر کلام الٰہی کا انکار عقل کے خلاف ہے۔ ناقص شے کامل کی قائم مقام کسی صورت میں نہیں ہوسکتی۔

علم الارواح کے ناقص ہونے کا ثبوت اس سے حاصل شدہ خبروں میں شدید اختلاف اس امر کا ثبوت کہ یہ علم بالکل ناقص ہے میں ہمیشہ یہ دیا کرتا ہوں۔ کہ مختلف مذاہب کے لوگ جو اس علم کی مدد سے روحانی باتیں دریافت کرتے ہیں۔ ان کی معلوم ہوئی خبروں میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ اگر روحانی مشقوں سے سابق ارواح سے حقیقی طور پر علوم دریافت کئے جاسکتے۔ تو یہ اختلاف کبھی نہ ہوتا۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی روح ایک ہندو یوگی کو کچھ اور بتا جاتی ہے۔ اور ایک مسیحی روحانی کو کچھ اور بتا جاتی ہے۔ اور ایک یہودی کو کچھ اور بتا جاتی ہے۔

جو لوگ اس علم کے ماہر ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب مسٹر انکسنس امریکن جو بہت سی کتب کے مصنف ہیں صاف لکھتے ہیں کہ ہم کو بری اور منذر باتوں کا علم ہوجاتا ہے۔ اور آئندہ کی اچھی خبریں نہیں ملتیں۔ یہ گویا اپنے مونہہ سے اقرار ہے کہ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۔ حالانکہ انبیاء کی نسبت قرآن شریف یہ فرماتا ہے۔ وَمَا نُرْسِلُ

الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ (الکھف:۵۷) رسولوں کا پہلا کام وہ اخبار غیبیہ بتانا ہے۔ جو بشارتوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور دوسرا کام انذاری خبروں کا بتانا ہے۔

وَ لَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا

اور اگر ہم چاہیں تو یقیناً جو (کلام الٰہی) ہم نے تجھ پر وحی (کے ذریعہ سے نازل) کیا ہے۔ اسے (دنیا سے) اٹھالیں

تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ﴿۸۷﴾

پھر تو اس امر میں اپنے لئے ہمارے خلاف کوئی کارساز نہیں پاسکے گا۔

تفسیر ۔ اس آیت میں گو خطاب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہے۔ مگر مراد انسان ہے۔ کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نہ تو کوئی اعتراض تھا نہ سوال ۔ جن کا سوال تھا انہی کو جواب دیا گیا ہے پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب صرف مضمون پر زور دینے کے لئے ہے۔

فرماتا ہے کہ روح بغیر امر الٰہی کے ایسی ناقص شے ہے۔ کہ علوم روحانیہ کا براہ راست لے آنا تو بڑی بات ہے جو علوم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہو چکے ہیں ۔ وہ اگر مٹ جائیں تو ان کو بھی روحانی لوگ واپس نہیں لا سکتے خواہ کتنے لوگ مل کر کوشش کریں ۔ مثلاً قرآن کریم ہی ہے اس کے علوم کو اگر ہم مخفی کر دیں ۔ تو کوئی ان علوم کو واپس نہیں لاسکتا ۔ شائد کوئی کہے کہ یہ ایک دعویٰ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دعویٰ نہیں بلکہ زبردست ثبوت ہے کیونکہ قرآن کریم آسمان پر تو جائے گا نہیں ۔ مگر جن کے دماغوں میں قرآنی برکات نہیں ان کے لئے ان کے لئے قرآنی علوم ویسے ہی ہیں جیسے کہ دنیا سے چلے گئے ۔ وہ لوگ اگر چاہیں ۔ کہ قرآنی تعلیم جیسی کوئی تعلیم پیش کر دیں ۔ تو وہ ایسا نہیں کر سکتے ۔ چنانچہ اگلی ہی آیت میں اس شبہ کا بھی ازالہ کر دیا گیا ہے۔

قرآن کریم کی حقیقت کے مٹنے کی پیشگوئی اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ قرآن کریم زمین سے اٹھ جائے گا۔ اور احادیث میں بھی یہ ذکر آتا ہے ۔ ابن مسعود اور ابن عمر سے ابن مردویہ نے روایت کی ہے کہ قرآن کریم دنیا سے اٹھ جائے گا۔ اور صرف لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رہ جائے گا۔ اسی طرح بیہقی اور ابن ماجہ نے حذیفہ سے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام اور قرآن دنیا سے اٹھ جائیں گے (ابن ماجہ

کتاب الفتن باب ذهاب القرآن والعلم، شعب الایمان للبھیقی باب فی نشر العلم)۔ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں ایک پیشگوئی بھی کی گئی ہے۔اور بتایا گیا ہے کہ ایک وقت میں صرف قرآن کریم کے الفاظ رہ جائیں گے۔مگر حقیقت مٹ جائے گی۔اور جھوٹے صوفی جو ارواح سے تعلقات کے دعوے کرتے ہیں قرآن کے معارف کو واپس نہ لاسکیں گے۔

میرا ہمیشہ یہ طریق ہے کہ ان جھوٹے صوفیوں کے بارہ میں یہ کہا کرتا ہوں کہ قرآن کریم کی مشکل آیات میں ان کے سامنے رکھتا ہوں وہ اپنی ارواح سے ان کے مطالب حل کر کے ہمیں بتادیں۔اگر قرآنی علوم انہوں نے معلوم کر لئے تو سچے ورنہ جھوٹے۔مگر یہ کام نہ آج تک کوئی کرسکا نہ کرسکتا ہے۔

إِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ إِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ﴿۸۸﴾

اپنے رب کی (خاص) رحمت کے سوا (کہ وہی اسے واپس لاسکتی ہے۔مگر یہ قرآن مٹ نہیں سکتا کیونکہ) تجھ پر تیرے رب کا یقیناً (بہت) بڑا فضل ہے

تفسیر ۔تیرے رب کا فضل تجھ پر بڑا ہے۔جب قرآن کریم دنیا سے اٹھ جائے گا۔تو پھر تیرا رب ہی اس کو لائے گا۔اس سے مراد یہ ہے۔کہ اس کی مثل لانا تو الگ رہا اس کے علوم کے مخفی ہونے پر کوئی شخص بغیر الٰہی مدد کے ان کو ظاہر بھی نہیں کرسکتا۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ

تو (انہیں) کہہ (کہ) اگر تمام انسان (بھی) اور جن (بھی اس کی نظیر لانے کے لئے) جمع ہو جائیں۔

هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ

تو (پھر بھی) وہ اس کی مثل نہیں لاسکیں گے۔خواہ وہ ایک دوسرے کے

لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۹﴾

مددگار (ہی کیوں نہ) بن جائیں۔

حل لغات ۔ظھیر ظَهِيْرٌ ظَهَرَ سے صفت مشبہ ہے۔اور ظَهَرَ عَلَيَّ کے معنی ہیں۔اَعَانَنِيْ اس نے

میری مدد کی۔ظَهَرَ فُلَانًا بِفُلَانٍ وَعَلَيْهِ: غَلَبَهُ۔اس پر غالب آیا۔ظَهَرَ بِزَيْدٍ: أَعْلَى بِهٖ وَرَفَعَ مَرْتَبَتَهُ۔زید کو ترقی دی اور اس کا مرتبہ بلند کیا۔اَلظَّهِيْرُ الْمُعِيْنُ مدگار معاون۔(اقرب)

تفسیر ۔ **قرآن کی مثل لانے سے عجز دعویٰ کی سچائی کا ثبوت ہے** اس آیت سے روز روشن کی طرح ثابت ہوجاتا ہے کہ جو معنی میں نے اوپر کی آیات کے کئے تھے وہی صحیح ہیں۔کیونکہ اس میں آ کر اسی دلیل کو جو میں نے اوپر دی تھی مکمل کیا گیا ہے۔فرماتا ہے کہ تم کہتے ہو کہ بعض روحانی مشقوں سے ترقی کر کے انسان سابق ارواح سے روحانی تعلیمات حاصل کرسکتا ہے۔اگر تمہارا یہ دعویٰ سچا ہے تو اے انسانو تم سب کے سب اکٹھے ہوجاؤ۔اور ان مخفی ارواح کو بھی اپنی مدد کے لئے بلالو۔جن کی نسبت تمہارا خیال ہے کہ تم کو علوم آسمانی سے خبردار کرتی ہیں۔اور سب مل کر قرآن کی مثل کوئی کتاب پیش کردو۔اور اگر تم نے اس کی مثل پیش کردی۔تب تو بے شک تمہارا دعویٰ سچا ہوگا۔ورنہ صاف ظاہر ہے کہ تم اس دعویٰ میں جھوٹے ہو۔جب تم سب کے سب مل کر اور تمہاری ساری مخفی ہستیاں مل کر بھی قرآن کی مثل نہیں لاسکتیں۔تو یہ کہنا کہ محمد رسول اللہ نے بعض روحانی مشقوں سے ان علوم کو حاصل کرلیا ہے۔کتنا جھوٹا دعویٰ ہے۔

اس آیت میں جن سے مراد ارواح ہیں اَلْجِنُّ سے اس جگہ مراد وہ ارواح ہیں جن کی مدد سے علوم روحانی سیکھنے کا یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں۔چونکہ وہ ارواح بقول ان کے نظروں سے غائب ہیں۔ان کو جنات کے نام سے اس جگہ یاد کیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ز

اور ہم نے اس قرآن میں یقیناً ہر ایک (ضروری) بات کو مختلف پیرایوں سے بیان کیا ہے۔پھر (بھی) اکثر لوگوں

فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۰﴾

نے (اس کے متعلق) کفر (کی راہ اختیار کرنے) کے سوا ہر بات سے انکار کردیا ہے

تفسیر ۔فرمایا یہ لوگ مثال لائیں گے کہاں سے۔ان کے دماغ محدود ہیں۔جس قسم کی یہ تربیت پائیں گے۔اسی قسم کی بات پیش کرسکیں گے اور باقی باتیں ان سے رہ جائیں گی۔لیکن اس قرآن کریم میں سیاسیات کے متعلق سائنس کے متعلق۔اخلاق تمدن اور اقتصادیات کے متعلق سیر کن بحثیں ہیں۔پھر مختلف مذاہب کے اختلافات کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ان کو تو ان باتوں کے سمجھنے کی بھی قابلیت نہیں یہ مثل کس طرح لاسکتے ہیں۔ہاں اپنی

ضد کی وجہ سے انکار کرنا خوب جانتے ہیں۔ سو مختلف بہانے اور اعتراض بنا بنا کر انکار کرتے چلے جائیں۔ آخر ایک دن نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ

اور انہوں نے (یہ بھی) کہا ہے (کہ) ہم ہرگز تیری (کوئی) بات نہیں مانیں گے۔ جب تک (ایسا نہ ہو کہ)

يَنْۢبُوْعًا ﴿٩١﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ

تو ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ جاری کرے یا تیرا کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو اور تو اس کے اندر خوب

فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿٩٢﴾

(کثرت سے) نہریں جاری کرے۔

حلّ لُغَات ۔ **تفجر** تُفَجِّرُ فَجَّرَ سے مضارع واحد مذکر مخاطب کا صیغہ ہے۔ اس کا مادہ فَجَرَ ہے۔ فَجَرَ الْمَاءَ کے معنی ہیں بَجَسَهٗ وَفَتَحَ لَهٗ طَرِيْقًا فَجَرٰى۔ پانی کو کھود کر نکالا۔ اور اس کے بہنے کے لئے راستہ بنایا۔ فَجَّرَ میں عربی زبان کے قاعدہ کے مطابق ان معنوں میں تشدید کے ساتھ زیادہ زور پیدا ہو گیا۔ (اقرب)

ينبوعا يَنْبُوْعًا کے معنی ہیں عَيْنُ الْمَاءِ پانی کا چشمہ ہے۔ اَلْجَدْوَلُ الْكَثِيْرُ الْمَاءِ بہت پانی والی نہر۔ اس کی جمع يَنَابِيْعُ آتی ہے۔ (اقرب)

تفسیر ۔ جب یہود کے بتائے ہوئے اعتراض کا ایسا دندان شکن جواب دیا گیا۔ تو اب انہوں نے پہلو بدلا۔ اور یہ اعتراض کیا۔ کہ اچھا قرآن میں ہر علم موجود ہے؟ اگر ایسا ہے تو زمین میں چشمہ پھوڑ کر دکھاؤ یا باغ اگا کر دکھاؤ جس میں نہریں چلتی ہوں۔ اپنی طرف سے کفار نے یہ بہت بڑا اعتراض سوچا۔ حالانکہ یہ اعتراض اعتراض کرنے والے کی عقل کی کوتاہی کا ثبوت ہے۔ اس اعتراض کی وجہ جیسا کہ میں اوپر بتا آیا ہوں۔ یہود اور دوسرے جاہل لوگوں کا یہ خیال تھا۔ کہ ارواح سے تعلق رکھنے والے یا اسم اعظم جاننے والے جادو یا اسم کے زور سے جو چاہیں کر سکتے ہیں۔

اس زمانہ میں بھی بعض علماء نے یہ طریق اختیار کر رکھا تھا۔ کہ بانی سلسلہ احمدیہ کے پاس آدمی بھجواتے کہ جا کر

دو چار لاکھ روپے مانگو۔ اور جب وہ انکار کریں تو کہنا کہ مسیح کی نسبت آتا ہے کہ دولت لٹائیں گے۔ آپ کا دعویٰ بھی مسیح ہونے کا ہے۔ کیا آپ چند لاکھ روپیہ بھی نہیں دے سکتے۔

اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ

یا جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے تو ہم پر آسمان کے ٹکڑے گرائے یا اللہ (تعالیٰ) اور فرشتوں کو (ہمارے)

بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿۹۳﴾

آمنے سامنے لا کھڑا کرے۔

حلّ لُغات ۔ **کِسَفًا** یہ کِسْفَةٌ کی جمع ہے۔ اس کے معنے ہیں۔ اَلْقِطْعَةُ مِنَ الشَّیْءِ۔ کسی چیز کا ٹکڑا۔ (اقرب)

قبیلا اَلْقَبِیْلُ کے معنی ہیں اَلْجَمَاعَةُ مِنَ الثَّلَاثَةِ فَصَاعِدًا تین یا تین سے زیادہ آدمیوں کی جماعت اور رَأَیْتُهُ قَبِیْلًا کے معنے ہیں رَأَیْتُهُ عِیَانًا وَمُقَابَلَةً کہ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے آمنے سامنے دیکھا۔ (اقرب)

تفسیر ۔ یعنی انعامات نہیں لا سکتے چلو عذاب ہی سہی۔ آسمان ہم پر گرا دو، خدا اور فرشتوں کو سامنے لاؤ کہ آ کر ہمیں تباہ کر دیں۔

کفار کے مطالبات مندرجہ آیت بطور تمسخر ہیں استاذی المکرم حضرت خلیفہ اولؓ فرمایا کرتے تھے کہ یہ وعدے قرآن کریم میں موجود ہیں اس لئے وہ ان کا مطالبہ کرتے ہیں مگر میرے نزدیک وہ مطالبہ نہیں کرتے بلکہ تمسخر کے رنگ میں یہ باتیں پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ ان معنوں میں سے اکثر مدنی سورتوں میں بیان ہوئے ہیں اور یہ مکی سورۃ ہے۔ دراصل کفار تمسخر کے رنگ میں کہتے ہیں کہ جب سب کچھ قرآن میں موجود ہے تو اس کے زور سے چشمے چھوڑ دو اور باغ لگاؤ یا عذاب ہی لاؤ۔ کیونکہ ان کے ذہن میں یہ وہم سمایا ہوا تھا کہ جادو اور کلام کے زور سے ان باتوں کو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ یہود کا بھی یہی خیال تھا جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔

اَوۡ يَكُوۡنَ لَكَ بَيۡتٌ مِّنۡ زُخۡرُفٍ اَوۡ تَرۡقٰى فِى السَّمَآءِ ؕ وَ

یا تیرا سونے کا کوئی گھر ہو۔ یا تو آسمان پر چڑھ جائے۔ اور ہم تیرے (آسمان پر) چڑھ جانے پر بھی نہیں مانیں گے

لَنۡ نُّؤۡمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيۡنَا كِتٰبًا نَّقۡرَؤُهٗ ؕ

جب تک کہ تو (اوپر جا کر) ہم پر کوئی کتاب (نہ) اتارے۔ جسے ہم (خود) پڑھیں۔ تو (انہیں) کہہ (کہ)

قُلۡ سُبۡحَانَ رَبِّىۡ هَلۡ كُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوۡلًا ﴿۹۴﴾ ع

میرا رب (ایسی بے ہودہ باتوں کے اختیار کرنے سے) پاک ہے میں (تو) صرف بشر رسول ہوں۔

ع ۱۰/۹

حلّ لُغات۔ **الزخرف** اَلزُّخْرُفُ: اَلذَّهَبُ سونا کَمَالُ حُسْنِ الشَّیْءِ انتہائی خوبصورتی (اقرب)

ترقٰی۔ تَرْقٰی رَقِیَ سے مضارع واحد مذکر مخاطب ہے رَقِیَ کے معنے ہیں۔ صَعِدَ اوپر چڑھا مصدر رَقْیٌ اور رُقِیٌّ آتا ہے لیکن رُقِیٌّ۔ یَرْقِیْ کا مصدر بھی ہے۔ جس کے معنے منتر اور جھاڑ پھونک کرنا ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ یعنی ہم کو کچھ نہیں دیتے چلو اپنے لئے ہی کچھ کرو۔ فرعون نے بھی کہا تھا کہ موسیٰ کے ہاتوں میں سونے کے کڑے نہیں ہیں اس لئے سچا نہیں۔ انہوں نے ترقی کر کے کہہ دیا کہ سونے کا گھر ہو تب سچا ہو سکتا ہے۔ اَوْ تَرْقٰى فِى السَّمَآءِ ؕ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ اس میں انہوں نے معراج کے واقعہ پر اعتراض کیا ہے کہ اس قسم کا قصہ نہ سنا دینا ہم تو تب مانیں گے کہ تو آسمان پر چڑھ جائے اور تو وہیں رہے اور کتاب ہماری طرف پھینک دے تا کہ ہمیں تسلی ہو جائے کہ تو واقعہ میں آسمان پر چڑھا ہے فرماتا ہے قُلْ سُبْحَانَ رَبِّىْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ تو ان کو جواب دے کہ میرا رب اس قسم کے تماشوں اور لغو باتوں سے پاک ہے۔ خدا کا کلام جس طرح رسولوں پر نازل ہوتا رہا ہے اسی طرح مجھ پر نازل ہوتا رہا ہے۔ اور جو معاملہ رسولوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کرتا ہے وہی میرے ساتھ بھی کرے گا۔ مگر جن باتوں کا تم مطالبہ کرتے ہو وہ اس کی شان کے بھی خلاف ہیں اور میری رسالت اور بشریت کے بھی خلاف ہیں دوسرے اس کے یہ معنے ہیں کہ جو باتیں تم پیش کرتے ہو۔ ان میں سے بعض تو تماشے کے طور پر ہیں جو خدا کی شان کے خلاف ہیں۔ اس قسم کی باتوں سے اللہ تعالیٰ پاک ہے وہ تو روحانیت کی ترقی کے لئے کلام نازل کرتا ہے اور بعض باتیں بشریت اور رسالت کے خلاف ہیں مثلاً آسمان

پر جانا اور وہاں سے کتاب کا پھینکنا۔ باوجود اس آیت کے مسلمان مانتے ہیں کہ عیسیٰؑ آسمان پر ہیں۔ حالانکہ وہ بشر رسول تھے نہ کہ ملائکہ میں سے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ

اور ان لوگوں کو جو ان کے پاس ہدایت پہنچی ایمان لانے سے صرف اس بات نے روکا کہ انہوں نے (اپنے دلوں

اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾

میں) کہا (کہ) کیا اللہ (تعالیٰ) نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیج دیا ہے۔

تفسیر ۔پہلی آیت میں بتایا تھا کہ میں تو بشر رسول ہوں۔اس سے زیادہ میرا کوئی دعویٰ نہیں۔

انبیاء کے بشر رسول ہونے کے اعتراض کا جواب اب اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ انبیاء پر جو بڑے بڑے اعتراض ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بشر رسول ہیں۔ یہ اعتراض ایک نہیں بلکہ ان الفاظ میں کئی قسم کے اعتراض آجاتے ہیں۔بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو بڑی شان کا ہے بشر کو رسول بنا ہی کیونکر سکتا ہے۔ یہ لوگ کلام الٰہی کے نزول ہی کے منکر ہوتے ہیں۔بعض لوگ بشر رسول کے منکر تکبر اور ضد کی وجہ سے ہوتے ہیں۔یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم بھی ایسے ہی انسان ہیں۔جیسا کہ یہ ہے اگر اللہ تعالیٰ نے کلام بھیجنا تھا۔ تو ہم سب پر نازل کرتا۔اسے کیوں مخصوص کیا گیا۔اس لئے ہم اسے نہیں مان سکتے۔ یہ لوگ کلام الٰہی کے نزول کو ناممکن قرار نہیں دیتے بلکہ اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے یہ نہیں تسلیم کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ ان جیسے بڑے آدمیوں کی طرف بقول ان کے ایک گھٹیا درجے کے انسان کو پیغام دے کر کیوں بھجوائے گا۔ایک تیسرا گروہ بشر رسول کا انکار اس وجہ سے کرتا ہے کہ اس کے نزدیک بشر اپنی ذات میں کامل ہے۔اور کسی بشر کو الہام کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اپنی جبلّی طاقتوں کی وجہ سے وہ اپنے لئے خود صحیح راستہ تلاش کر سکتا ہے۔ایک چوتھا گروہ بشر رسول پر اس لحاظ سے معترض ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک رسول کے لئے بشریت سے زیادہ طاقتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ان کے سامنے ایک کمزور سے کمزور وجود کو یہ کہہ کر پیش کر دو کہ یہ مافوق الانسانیت طاقتیں رکھتا ہے۔تو فوراً اس کے ماننے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔لیکن قوت قدسیہ اور قوت عملیہ کا عملی نمونہ دکھانے والا انسان جو جھوٹے فخر اور جھوٹے دعووں سے بچتا ہو۔ان کے نزدیک ہرگز قابل اعتنا نہ ہوگا۔ کیونکہ ان کی طبائع عجوبہ پسندی کا شکار ہوتی ہیں۔

ایسے لوگ بعض دفعہ بعض پہلے نبیوں کو بھی مانتے ہیں لیکن نئے نبی کے آنے پر ان کی طبیعت کے اس نقص کا ظہور بتا دیتا ہے کہ پہلے نبی پر بھی ان کا ایمان محض رسمی اور ورثہ کا ایمان تھا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ

تو (انہیں) کہہ (کہ) اگر زمین پر فرشتے (بستے) ہوتے جو زمین پر اطمینان سے چلتے پھرتے تو (اس صورت میں)

لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۶﴾

ہم ضرور ان پر آسمان سے کسی فرشتہ کو (ہی) رسول بنا کر اتارتے۔

تفسیر ۔ ملائکہ سے مراد فرشتہ خصلت انسان ہیں اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ سے مراد فرشتہ خصلت انسان ہیں۔ ورنہ فرشتے پر دوسرا فرشتہ آنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس آیت میں اس قسم کے لوگوں کے خیال کا جواب دیا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بڑے لوگ ہیں۔ اور ان کو براہ راست الہام ہونا چاہیے تھا۔ فرماتا ہے کہ فرشتہ فرشتہ خصلت پر اترتا ہے غیر جنس پر نہیں۔ تم فرشتے بن جاتے تو تم پر بھی فرشتے اترتے پر تم تو شیطان بن گئے ہو تم پر فرشتے کس طرح اتریں۔ دوسرے ان لوگوں کو جواب دیا ہے جو یہ سمجھتے ہیں۔ کہ بشر سے بڑی طاقتوں والے وجود کی ضرورت تھی۔ بشر کام نہیں دے سکتا۔ انہیں یہ بتایا ہے۔ کہ ہر جنس کے لوگوں کو ان کا ہم جنس ہی نجات دے سکتا ہے۔ کیونکہ نمونہ وہی ہو سکتا ہے جو ان میں سے ہو۔ پس بشر کے سوا دوسری جنس بطور رسول انسانوں میں نہیں آسکتی۔ کیونکہ وہ ان کے لئے نمونہ نہیں بن سکتی۔ ان معنوں کے رو سے رسول کے معنی صرف وحی لانے والے کے نہیں ہوں گے بلکہ رسالت کی وہ سب شرائط جن کے ساتھ بشر رسول آتے ہیں مراد لی جائیں گی۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ

تو (انہیں) کہہ (کہ) میرے درمیان اور تمہارے درمیان گواہ کے طور پر اللہ ہی کافی ہے۔ وہ اپنے بندوں کو

بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۹۷﴾

جاننے والا (اور) دیکھنے والا ہے۔

تفسیر ۔ **انسان کو حقیر نا قابل الہام سمجھنے والے معترضین کو جواب** اس میں اس اعتراض کے دوسرے پہلوؤں کا جواب دیا ہے ۔ یعنی ان کو بھی جو انسان کو حقیر سمجھتے ہیں اور الہام کے نا قابل ۔ اور ان کو بھی جو انسان کو کامل سمجھتے ہیں اور الہام سے مستغنی ۔ اور جواب یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خوب سمجھتا ہے کہ وہ کتنے کمزور ہیں یا کتنے طاقتور ہیں ۔ پس جب اس نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے تو تمہارا یہ تو حق ہے کہ اس امر کی تحقیق کرو کہ میں نبی ہوں یا نہیں ۔ اور اس کے لئے میں خدا تعالیٰ کی عملی گواہی پیش کرتا ہوں ۔ جب قول کے ساتھ اس کا عمل شامل ہے تو تم میرے دعویٰ کو جھوٹا کس طرح کہہ سکتے ہو ۔ مگر بہر حال تم یہ دو اعتراض معقولیت کو چھوڑے بغیر نہیں کر سکتے ۔ کیونکہ اگر یہ ثابت ہو جائے ۔ کہ مجھے خدا نے بھیجا ہے ۔ تو ماننا پڑے گا ۔ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہ تو انسان اس قدر حقیر ہے کہ اسے وہ مکالمہ مخاطبہ کا فخر نہیں دے سکتا ۔ اور نہ اس قدر کامل کہ اسے الٰہی کلام کی احتیاج ہی نہیں ۔

وَ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ

اور جسے اللہ (تعالیٰ) ہدایت دے وہی ہدایت پر ہوتا ہے ۔ اور جنہیں وہ گمراہ کرے تو تُو اس کے (یعنی اللہ کے)

لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَ نَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى

مقابل پر اس کا کوئی بھی مددگار نہیں پائے گا ۔ اور قیامت کے دن ہم انہیں ان کے مقاصد کے مطابق اندھے اور

وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا

گونگے اور بہرے ہونے کی حالت میں جمع کریں گے ۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا ۔ جب بھی وہ (ذرا)

خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿۹۸﴾

ٹھنڈی ہو گی تو ہم ان پر آگ (کا عذاب اور بھی) بڑھا دیں گے۔

لے اولیاء - اَوْلِيَآءُ جمع وَلِیٌّ کی ہے جس کے ایک معنی مددگار کے ہیں لیکن ترجمہ میں جمع کی جگہ مفرد ترجمہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ اردو میں ایسے موقعہ پر مفرد ہی بولا جاتا ہے۔

حلّ لُغات - **وجوھھم** وُجُوْہٌ وجہٌ کی جمع ہے۔ اور وَجْہٌ کے معنے ہیں۔ اَلْقَصْدُ وَالنِّيَّةُ۔ مقصد۔ اَلْمَرْضَاۃُ۔ پسندیدہ طریق۔ (اقرب)

خَبَتْ خَبَتِ النَّارُ وَالْحَرْبُ وَالْحِدَّۃُ کے معنے ہیں سَکَنَتْ و خَمَدَتْ وَطَفِئَتْ۔ آگ۔ جنگ یا تیزی دھیمی یا ٹھنڈی پڑ گئی۔ کمزور ہو گئی۔ بجھ گئی۔ (اقرب)

سعیرا اَلسَّعِيْرُ کے معنے ہیں اَلنَّارُ وَلَهَبُهَا۔ آگ۔ شعلے۔ (اقرب)

تفسیر - انجام ہی فیصلہ کن ہوتا ہے چونکہ پچھلے سوالوں اور جوابوں سے کفار کی کج بحثی کا ثبوت ملتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو تسلی دلائی کہ ان باتوں سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ ہدایت اور گمراہی کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ جو مستحق ہدایت ہو اسے ہدایت مل جاتی ہے خواہ درمیان میں کتنی روکیں پیدا ہوں۔ اور جو مستحق ہدایت نہ ہو وہ گمراہ ہی رہتا ہے یا آخر گمراہ ہو جاتا ہے خواہ بظاہر اس کے لئے سہولتیں میسر ہوں پس ان ظاہری حالات سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ بعض دفعہ شدید مخالف اور بظاہر کج بحث لوگ آخر میں ایمان لے آتے ہیں۔ اور اخلاص کا نہایت اعلیٰ نمونہ دکھاتے ہیں۔ اصل تو انجام کو دیکھنا چاہیے۔ جس کا انجام خراب ہو خطرہ تو اس کے لئے ہے۔

خَبَتِ النَّارُ وَالْحَرْبُ وَالْحِدَّۃُ سَکَنَتْ وَخَمَدَتْ وَطَفِئَتْ۔ یعنی آگ، لڑائی اور تیزی کے متعلق خَبَتْ آتا ہے جس کے معنے ہیں جوش جاتا رہا۔ کم ہو گیا۔ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔

قیامت کے دن مونہوں کے بل گھسیٹے جانے سے مراد عَلٰی وُجُوْهِهِمْ کے متعلق قرآن کریم میں دوسری جگہ آتا ہے يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ (القمر: ۴۹) جس دن وہ مونہوں کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈالے جائیں گے۔ اس آیت کا بھی یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ کفار مونہوں کے بل گھسیٹ کر ڈالے جائیں گے۔

بخاری اور مسلم میں انسؓ سے روایت ہے کہ اِنَّ الَّذِيْ اَمْشٰهُمْ عَلَى اَرْجُلِهِمْ قَادِرٌ عَلٰی اَنْ يُّمْشِيَهُمْ

عَلٰی وُجُوْھِھِمْ (مسند احمد مسند المکثرین من الصحابة مسند أنس بن مالک) کہ جس خدا نے ان کو پاؤں کے بل چلایا ہے۔ وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ ان کو مونہوں کے بل چلائے۔ پھر ایک روایت میں ہے کہ تین طرح حشر ہوگا۔ کچھ سوار ہوں گے۔ کچھ پیدل اور اور بعض مونہوں کے بل (روح المعانی زیر آیت ھذا) ایک اور روایت میں ہے تُجَرُّوْنَ عَلٰی وُجُوْھِکُمْ۔ دوزخیوں کو ان کے مونہوں کے بل گھسیٹا جائے گا۔ (روح المعانی زیر آیت ھذا)

معلوم ہوتا ہے کہ سوار تو انبیاء ہیں اور پیدل چلنے والے مومن ہیں اور مونہوں کے بل گھسیٹے جانے والے کافر ہیں۔

چونکہ آخرت میں ہر چیز ایک انعکاسی رنگ رکھے گی۔ اس لئے ان کے وہ اعمال جن کو وہ دنیا میں کرتے ہوئے خدا تعالیٰ کی طرف نظر نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ سفلی اور ارضی اغراض پر ان کی نظر ہوتی تھی۔ قیامت کے دن ان پر اس رنگ میں متمثل ہوں گے کہ اوندھے منہ زمین پر چلیں گے۔

منہ کے بل چلنے کے معنے دوڑنے کے بھی ہیں

(۲) عربی کا ایک اور محاورہ ہے۔ مَرَّ الْقَوْمُ عَلٰی وُجُوْھِھِمْ اَیْ اَسْرَعُوْا۔ یعنی وہ قوم دوڑ کر چلی گئی۔ اس محاورہ کے رو سے آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ قیامت کے دن جب ہم ان کا حشر کریں گے تو وہ دوڑ رہے ہوں گے جیسے دوسری جگہ فرماتا ہے مُھْطِعِیْنَ مُقْنِعِیْ رُءُوْسِھِمْ (ابراھیم: ۴۴) کہ کفار سر اٹھائے ہوئے دوڑے چلے جائیں گے۔ اس میں گھبراہٹ کی کیفیت کا اظہار کیا ہے۔ یعنی اس وقت ان میں بے اطمینانی اور گھبراہٹ پائی جائے گی۔

انسان کو نیت کے مطابق اجر

(۳) اَلْوَجْهُ کے معنے عربی زبان میں مَا یَتَوَجَّهُ اِلَیْهِ الْاِنْسَانُ مِنْ عَمَلٍ وَّ غَیْرِہٖ۔ اَلْقَصْدُ وَالنِّیَّةُ کے بھی ہوتے ہیں۔ یعنی وہ کام جن کی طرف انسان توجہ کرتے ہیں اور قصد اور نیت کو بھی وجہ کہتے ہیں۔ ان معنوں کی رو سے آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ ان کے مقاصد اور نیتوں کے مطابق ہم ان کا حشر کریں گے۔ اگر ان کا مقصد الٰہی سلسلوں سے دشمنی کرنا تھا۔ تو وہاں بھی وہ خدا تعالیٰ سے دور اور اس کے دشمنوں کے ساتھ رکھے جائیں گے۔ گویا ہر انسان اپنی اپنی نیت کے مطابق جزاء پائے گا۔ چونکہ اگلے جہان کے متعلق کفار کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ اس لئے فرمایا کہ وہ وہاں اندھے گونگے اور بہرے ہوں گے۔

خَبَتْ سے یہ مراد نہیں کہ آگ بجھ جائے گی۔ بلکہ بعض دفعہ کوئی مصیبت زیادہ دیر رہے تو حس مٹ جاتی ہے۔ اسی جگہ ایسی ہی کیفیت کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ جب عذاب محسوس کرنے کی حس کمزور ہو جائے گی۔ ہم ان کی حس کو تیز کر دیں گے جیسے فرمایا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ (النساء: ۵۷)

جب ان کے چمڑے پک جائیں گے اور عذاب کی حس کم ہو جائے گی تو ہم ان کی جلدیں بدل دیں گے تا کہ عذاب کا مزہ چکھتے رہیں۔ تو آگ کا ٹھنڈا ہونا کفار کی حس کے لحاظ سے ہے نہ کہ خود آگ کی تیزی یا کمی کے لحاظ سے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کہتے ہیں کہ پرنالہ چلتا ہے۔ حالانکہ پرنالہ نہیں چلتا بلکہ پرنالہ میں سے پانی بہہ رہا ہوتا ہے۔

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا

یہ (آگ) ان (ہی کے اعمال) کی جزا ہوگی کیونکہ انہوں نے ہمارے نشانوں کا انکار کیا۔ اور کہا (کہ) کیا جب ہم

عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ

(مرکر) ہڈیاں اور چورا چورا ہو جائیں گے (تو ہمیں از سر نو زندہ کیا جائے گا اور) کیا واقعی ہمیں ایک نئی مخلوق کی

خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۹۹﴾

صورت میں اٹھایا جائے گا۔

تفسیر۔ یعنی یہ عذاب کلام الٰہی کے انکار کے سبب سے ہوگا۔ اور یہ کلام الٰہی کا انکار درحقیقت بعد الموت زندگی پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

قرآن کریم نے اس امر پر بہت ہی زور دیا ہے کہ مذہب کے انکار یا اس کی تخفیف کی اصل وجہ بعد الموت زندگی کا انکار ہے۔ اس میں واعظوں اور استادوں اور اماموں اور مربّیوں کے لئے ایک بہت بڑا سبق ہے۔ بچپن سے بعث بعد الموت کے دلائل نوجوانوں کے ذہن نشین کرنے چاہئیں۔ اس کے بغیر کبھی صحیح اور عمدہ تربیت نہیں ہوسکتی۔ یہ آیات یہود پر بھی چسپاں ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان میں سے اکثر بعث بعد الموت کے منکر تھے۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ

کیا وہ (ابھی تک) سمجھ نہیں سکے کہ وہ (ہستی) جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ اس بات پر (بھی) قادر

عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَ جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ

ہے۔ کہ وہ ان جیسے (اور لوگ) پیدا کرے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے ان کے لئے ایک میعاد مقرر کر دی

فِيْهِ ؕ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ۝۱۰۰

ہے پھر (بھی) ان ظالموں نے کفر (کی راہ اختیار کرنے) کے سوا ہر بات سے انکار کر دیا ہے۔

تفسیر۔ مسلمانوں کی ترقی قیامت کا ثبوت ہے ان کے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ تم کو اللہ تعالیٰ دوبارہ پیدا کر سکتا ہے کیونکہ یہ صرف دعویٰ ہوتا جس کے پیش کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ پس جواب میں یہ فرمایا کہ کیا تم اس پر یقین رکھتے ہو کہ تم کو ہلاک کر کے خدا تعالیٰ تمہاری شان و شوکت کسی دوسری قوم کو دے دے۔ پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ کفار اس بات پر کبھی یقین نہ کریں گے بلکہ بڑی شدت سے اس کا انکار کریں گے پس یہی دلیل ہم ان کے سامنے بعث بعد الموت کی پیش کرتے ہیں کہ قرآن کریم جو بعث بعد الموت کی خبر دیتا ہے۔ اس نے یہ خبر بھی دی ہے کہ دشمنان اسلام کی حکومت مٹا دی جائے گی اور ان کی جگہ مسلمانوں کو دے دی جائے گی۔ اگر یہ بات پوری ہو جائے تو ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ دوسری بات بھی عالم الغیب اور قادر خدا کی طرف سے ہے۔ یہ بات کس شان سے پوری ہوئی؟ عرب، ایران، روم اور مصر چند سالوں میں یکے بعد دیگرے اسلامی ضرب کی تاب نہ لا کر سرنگوں ہو گئے اور فاقہ کش مزدور دنیا کے بادشاہ ہو گئے۔ اس حشر کا پیدا کرنے والا کیا دوسرے حشر سے عاجز آ سکتا ہے بعث بعد الموت کو عجیب سمجھنے والے وقوع سے پہلے کیا اس خبر کو بھی ویسا ہی عجیب نہ سمجھتے تھے۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا

تو (انہیں) کہہ (کہ) اگر تم میرے رب کی رحمت کے (غیر متناہی) خزانوں کے (بھی) مالک ہوتے تو (بھی) تم

لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ۝۱۰۱ ع ۱۱

(ان کے) خرچ ہو جانے کے ڈر سے (انہیں) روک ہی رکھتے۔ اور انسان بڑا ہی کنجوس ہے۔

حلّ لُغات۔ اَمْسَكْتُمْ اَمْسَكْتُمْ یہ اَمْسَكَ سے جمع کا صیغہ ہے۔ اَمْسَكَ الشَّیْءَ بِیَدِہٖ: قَبَضَہٗ کسی چیز کو ہاتھ سے پکڑا۔ اَمْسَكَ الْمَتَاعَ عَلٰی نَفْسِہٖ۔ مال اپنے لئے روک رکھا۔ اَمْسَكَ عَنِ الْاَمْرِ: كَفَّ عَنْہُ وَامْتَنَعَ۔ کسی امر سے رک گیا۔ (اقرب)

قتورًا قَتُوْرًا یہ قَتَرَ سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ قَتَرَ عَلٰی عَیَالِہٖ: ضَیَّقَ عَلَیْھِمْ فِی النَّفَقَةِ۔ اہل وعیال

کے خرچ میں تنگی کی۔ قَتَرَالشَّیْءَ ۔ضَمَّ بَعْضَهُ اِلَی بَعْضٍ۔ کسی چیز کو اکٹھا کیا اور جوڑ جوڑ کر رکھا ۔ اَلْقَتُوْرُ اَلْمُضَیِّقُ عَلٰی عِیَالِهٖ فِی النَّفَقَةِ ۔ اپنے خانگی خرچ میں بخل کرنے والا۔ اَلْبَخِیْلُ ۔ کنجوس (اقرب)

الانفاق اَنْفَقَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں اِفْتَقَرَ وَ فَنِیَ زَادُهٗ ۔ وہ مفلس ہو گیا ۔ اور اس کا خرچ ختم ہو گیا۔ اَنْفَقَ مَالَهٗ ۔صَرَفَهٗ وَ اَنْفَدَهٗ ۔ اس نے اپنا مال خرچ کر کے ختم کر دیا۔ (اقرب) پس اَلْاِنْفَاقُ کے معنے ہوں گے (۱) مفلس ہو جانا (۲) مال خرچ کر دینا (۳) مال کا خرچ ہو جانا۔

تفسیر ۔ یہاں پھر قُلِ الرُّوْحُ والے مضمون کی طرف رجوع کیا ہے ۔ اور بتایا ہے۔ کہ خدائی الہام اور روحانیوں میں یہ فرق ہے کہ خدا کا کلام لانے والے تو بے دریغ آسمانی خزانے لٹاتے ہیں ۔ اور انہیں حکم ہوتا ہے کہ بَلِّغْ بَلِّغْ ۔ لیکن یہ روحانی کہلانے والے اسراء اور اشاروں میں عمر بسر کرتے ہیں قسمیں لے لے کر اپنے شاگردوں کو گر بتاتے ہیں یہ لوگ دنیا کے لئے ہادی اور راہنما کس طرح ہو سکتے ہیں ۔ یہ مرض آج کل کے صوفیاء میں بھی پیدا ہو گیا ہے ۔ ایک دفعہ میں نے ذکر الٰہی کے متعلق تقریر کی ۔ اور اس کے بہت سے طریقے اور فائدے بیان کئے ۔ ایک صاحب نے دوران تقریر میں رقعہ لکھا کہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں ۔ ان میں سے ایک ایک نکتہ صوفیاء دس دس سال خدمت لے کر بتایا کرتے تھے ۔ آپ ایک ہی مجلس میں سب راز کھولنے لگے ہیں ۔

حق یہ ہے کہ مذہب میں کوئی راز نہیں ۔ اللہ تعالیٰ اپنے سب بندوں کے متعلق یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کے قرب کے اعلیٰ درجوں کو حاصل کریں اور اسے بندوں کی ترقیات میں روک ڈالنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں کیونکہ وہ غیر محدود ہے ۔ اور اس تک پہنچنے کی منازل بھی غیر محدود ہیں اسے یہ ڈر نہیں کہ ایک دن علم ختم ہو جائے گا ۔ اور پھر میرے پاس بنانے کو کچھ نہ رہے گا ۔ اور میں اور میرے بندے برابر ہو جائیں گے ۔ لیکن یہ نام نہاد روحانی ایک محدود علم رکھتے ہیں جس کا اکثر حصہ جھوٹا ہوتا ہے ۔ وہ اگر اپنی سب باتیں بتا دیں تو دوسرے ہی دن ان کو پوچھنے والا کوئی نہ رہے ۔ چنانچہ آئے دن یہ نظارے نظر آتے ہیں کہ ایک پیر نے دوسرے کو خلیفہ بنایا اور اس نے جھٹ جا کر الگ گدی بنالی ۔ مگر خدا رسیدہ شخص کا کوئی شاگرد اس پر ایمان رکھتے ہوئے جدا نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا علم جو خدا سے آتا ہے کبھی ختم نہیں ہو سکتا ۔ اس لئے اس سے جدائی اپنے علم کی ترقی روکنے کے مترادف ہے ۔ غرض نام نہاد روحانی لوگ سالہا سال خدمت لے کر ایک اسم یا نقش اسی لئے بتاتے ہیں کہ جانتے ہیں کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے جلد ختم ہو جائے گا ۔ مگر اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علوم اول تو ختم نہیں ہوتے اور اگر ہو جائیں تو وہ اور پیدا کر دیتا ہے ۔ اس لئے یہ جسمانی کسب الہام کا قائم مقام کسی صورت میں نہیں ہو سکتا ۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ

اور ہم نے موسیٰ کو یقیناً نو روشن نشان دیئے تھے۔ چنانچہ تو بنی اسرائیل سے (ان حالات کو پوچھ)

اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى

جب وہ ان (یعنی اہل مصر) کی طرف آیا تھا۔ تو فرعون نے اس سے کہا تھا (کہ) اے موسیٰ

مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۲﴾

میں یقیناً تجھے فریب خوردہ سمجھتا ہوں۔

حلّ لُغات۔ مَسْحُوْرًا مَسْحُوْرًا یہ سَحَرَ سے اسم مفعول ہے۔ سَحَرَہٗ: عَمِلَ لَهُ السِّحْرُ وَخَدَعَهٗ، سَحَرَہٗ کے معنے ہیں اس پر جادو کیا۔ اسے فریب دیا۔ سَحَرَہٗ عَنِ الْاَمْرِ: صَرَفَهٗ۔ اس کو کسی بات سے ہٹا دیا۔ سَحَرَ بِكَلَامِهٖ وَالْحَاظِهٖ: اِسْتَمَالَهٗ وَسَلَبَ لُبَّهٗ۔ اسے باتوں اور نظروں سے اپنی طرف مائل کرلیا۔ اور اس کی عقل کو لُبھا لیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ **بنی اسرائیل کے نو نشانوں کی تفصیل** تِسْعَ اٰيٰتٍ۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ ان نشانوں کی تفصیل موجود ہے اور وہ یہ ہیں۔

(۱) عصا۔ جیسا کہ فرماتا ہے فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ (الاعراف: ۱۰۸) (۲) ید بیضاء جیسے کہ فرماتا ہے وَّ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ (الاعراف: ۱۰۹) (۳) قحط جیسا کہ فرماتا ہے وَ لَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ (الاعراف: ۱۳۱) (۴) پلوٹھوں کی موت۔ جیسے فرماتا ہے وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (الاعراف: ۱۳۱) اس جگہ ثمرات سے مراد ثمرۂ قلب یا ثمرۂ فؤاد ہے جس نام سے بیٹوں کو پکارا جاتا ہے۔ (۵) طوفان (۶) ٹڈی (۷) جوئیں یا کھٹمل کا عذاب (۸) مینڈکوں کا عذاب (۹) خون کا عذاب۔ یعنی ایسی امراض کا عذاب جن سے انسان کا خون ضائع یا خراب ہو۔ جیسے نکسیروں کا پھوٹنا۔ اور ایک خاص مرض بھی اس وقت پیدا ہوا تھا۔ یعنی ایک قسم کے پھوڑے نکلتے تھے جن میں سے کثرت سے خون بہتا تھا۔ جیسا کہ فرماتا ہے فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ۔ (الاعراف: ۱۳۴)

بائیبل میں ان نو عذابوں کی عجیب وغریب تشریح لکھی ہے۔ جس کے ماننے اور جاننے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ ہمیں صرف اس امر سے تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نو نشان عطا فرمائے جو وقفہ وقفہ کے بعد ظاہر ہوئے جیسا کہ مفصّلات کے لفظ سے ظاہر ہے۔

حضرت موسیٰ اور ان کے نشانات کا ذکر کر کے یہود کو توجہ دلائی ہے کہ جس طرح فرعون کو نشان دکھائے گئے تھے یہود کو بھی نشان دکھائے جائیں گے۔ مگر جس طرح فرعون نے فائدہ نہ اٹھایا وہ بھی نہ اٹھائیں گے اور آخر معنوی طور پر غرق کئے جائیں گے۔

اس آیت سے اس امر کی طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہود پر بھی نو قسم کے عذاب نازل ہوں گے یا نو نشان دکھائے جائیں گے۔ مگر مجھے اب تک تاریخ پر اس بارہ میں غور کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ

اس نے کہا (کہ) تجھے یقیناً علم ہو چکا ہے کہ ان (نشانات) کو آسمانوں اور زمین کے رب نے ہی بصیرت بخشنے

الْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۳﴾

والا بنا کر اتارا ہے۔ اور اے فرعون میں تیری نسبت یقین رکھتا ہوں کہ تو ہلاک ہو چکا ہے۔

حلّ لُغَات ۔ بَصَآئِرَ بَصَائِرُ یہ بَصِیْرَۃٌ کی جمع ہے اَلْبَصِیْرَۃُ کے معنے ہیں ۔ اَلْعَقْلُ۔ عقل ۔ اَلْفِطْنَۃُ۔ ذہانت ۔ مَایُسْتَدَلُّ بِہٖ جس سے راہنمائی اور بصیرت حاصل ہو۔ اَلْحُجَّۃُ۔ دلیل ۔ اَلْعِبْرَۃُ۔ عبرت ۔ اَلشَّاھِدُ۔ گواہ۔ (اقرب)

مَثْبُوْرًا مَثْبُوْرًا یہ ثَبَرَ سے اسم مفعول ہے ثَبَرَہٗ کے معنے ہیں ۔ خَیَّبَہٗ۔ اسے نامراد و ناکام کیا ۔ لَعَنَہٗ۔ اس پر لعنت کی ۔ طَرَدَہٗ۔ اسے دھتکارا۔ ثَبَرَہٗ عَنِ الْاَمْرِ : مَنَعَہٗ وَصَرَفَہٗ اسے روک دیا۔ ہٹا دیا۔ ثَبَرَ اللّٰہُ زَیْدًا : اَھْلَکَہٗ اِھْلَاکًا دَائِمًا لَا یَنْتَعِشُ بَعْدَہٗ۔ اللہ نے اسے ایسا تباہ کیا کہ پھر وہ سنبھلنے کے قابل نہ رہا۔ (اقرب)

تفسیر ۔ موسیٰ نے کہا اے فرعون تیرا دل جانتا ہے۔ کہ ان نشانات کو آسمان و زمین کے خدا نے بصیرت کے طور پر نازل کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تو ہلاک کیا جائے گا۔ یا یہ کہ تو نے جو مجھے مسحور کہہ کر بدنام اور کمزور کرنے

کی تدبیر سوچی ہے۔خدا تجھے اس میں کامیاب نہ کرے گا بلکہ تو اس ارادہ میں خائب و خاسر ہوگا۔کیونکہ مثبور کے ایک معنے ناکام و نامراد کے بھی ہیں۔اس ذکر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جس طرح تم نشان پر نشان دیکھتے ہو مگر فریبی اور دھوکا باز کہتے جاتے ہو۔ایسا ہی اس سے پیشتر فرعون نے موسیٰ کو کہا تھا۔مگر جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوا تھا؟

فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ

اس پر اس نے ان (کی بنیادوں) کو اس ملک سے اکھاڑ دینے کا ارادہ کر لیا۔تو ہم نے اسے اور جو اس کے ساتھ

جَمِيْعًا ۙ﴿۱۰۴﴾

تھے سب کو غرق کر دیا۔

تفسیر ۔یعنی اس نے بھی چاہا تھا کہ ان کو ملک سے ذلیل کر کے نکال دے۔مگر خود غرق ہو گیا۔اہل کتاب نے کفار سے سازش کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قیصر کی فوج سے لڑانے کے لئے بھجوا دیا تھا مگر خدا نے ان کی تدبیر کو ناکام کیا۔اور آپؐ تبوک سے بغیر کسی نقصان کے باعزت واپس آئے (تاریخ الخمیس جلد ۲ غزوۃ تبوک)۔

وَّ قُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ

اور اس کے (ڈوب مرنے کے) بعد بنی اسرائیل کو ہم نے کہہ دیا (کہ) تم اس (موعود) ملک میں (جا کر آرام سے)

وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ؕ﴿۱۰۵﴾

رہو۔پھر جب پچھلی بار کا وعدہ (پورا ہونے کا وقت) آئے گا۔تو ہم تم (سب) کو جمع کر کے لے آئیں گے

حلّ لُغات ۔لَفِيْفًا لَفِيْفًا یہ لَفَّ سے فعیل کے وزن پر بمعنی مفعول ہے۔لَفَّهٗ کے معنے ہیں۔ضَمَّهٗ سمیٹا۔جَمَعَهٗ اس کو جمع کیا۔لَفَّ الشَّيْءَ بِالشَّيْءِ :ضَمَّهٗ اِلَيْهِ وَ وَصَلَهٗ بِهٖ ایک چیز کو دوسری سے ملا دیا۔لَفَّ الْكَتِيْبَتَيْنِ :خَلَطَ بَيْنَهُمَا فِي الْحَرْبِ۔جنگ میں دو دوستوں کو آپس میں ملا دیا۔اَللَّفِيْفُ: اَلْمَجْمُوْعُ۔جمع کیا ہوا۔مَا اجْتَمَعَ مِنَ النَّاسِ مِنْ قَبَائِلَ شَتّٰى۔مختلف قوموں کے آدمیوں کی جماعت۔(اقرب)

تفسیر ۔اُسْكُنُوا الْاَرْضَ۔اس سے مراد مصر کی سرزمین نہیں۔کیونکہ مصر میں تو وہ نہیں آباد ہوئے اس سے

مراد ملک کنعان ہے یعنے وہ ملک جس کا تمہیں وعدہ دیا گیا ہے۔ گویا الارض سے مراد معہود ذہنی ہے۔

آنحضرتؐ کی فضیلت موسیٰ پر وطن واپس ملنے کے ذریعہ سے رسول کریم صلعم کو موسیٰ علیہ السلام پر یہ فضیلت ہے کہ ان کو جو جگہ ملی وہ مصر کے قائم مقام تھی۔ مصر نہیں ملا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عین وہ جگہ ملی جو آپ کا وطن تھا اور پھر دشمنوں کے ملک بھی ہاتھ آئے۔ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ۔ یعنی اب تم کنعان میں جاؤ۔ لیکن ایک وقت کے بعد تم کو وہاں سے نکلنا پڑے گا پھر خدا تعالیٰ تم کو واپس لائے گا پھر تم نافرمانی کرو گے اور دوسری دفعہ عذاب آئے گا اس کے بعد تم جلاوطن رہو گے یہاں تک کہ تمہاری مثیل قوم کے متعلق جو دوسری تباہی کی خبر ہے اس کا وقت آجائے اس وقت پھر تم کو مختلف ملکوں سے اکٹھا کر کے ارض مقدس میں واپس لایا جائے گا۔

مسلمانوں کی مماثلت بنی اسرائیل سے ترقی اور تنزل کے لحاظ سے اس آیت سے ظاہر ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل کے لئے دو تباہیوں کی خبر اس سورۃ کے شروع میں دی گئی تھی ویسی ہی خبر مسلمانوں کے لئے بھی دی گئی ہے کیونکہ مسلمانوں کو بنی اسرائیل کا مثیل قرار دیا گیا ہے۔ جس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو موسیٰؑ کا مثیل قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ سورۃ کے شروع میں دو وعدوں کا ذکر ہے اور دونوں عذاب کے وعدے ہیں۔ ایک بخت نصر شاہ بابل کے ہاتھوں پورا ہوا۔ اور دوسرا ٹائیٹس شاہ روم کے ہاتھ سے پورا ہوا۔ (دیکھو رکوع اول) ان دونوں وعدوں میں بنی اسرائیل کے اکٹھا کرنے کا ذکر نہیں بلکہ ان کے پراگندہ ہونے کا ذکر ہے۔ اس کے برخلاف اس آیت میں یہ ذکر ہے کہ دوسرے وعدے کے وقت بنی اسرائیل کو پھر ارض مقدس میں لایا جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ دوسرا وعدہ کوئی اور ہے اور اس دوسرے وعدے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دوسرے وعدے کے ساتھ کوئی پہلا وعدہ بھی ہے۔ اب ہم غور کرتے ہیں تو ان دو وعدوں کا ذکر قرآن کریم میں صرف اس طرح ملتا ہے کہ محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مثیل موسیٰ قرار دیا گیا ہے۔ اور سورۃ فاتحہ میں مسلمانوں کے ایک حصہ کے متعلق یہ خبر دی ہے کہ وہ اہل کتاب کے نقش پر چلیں گے۔ پس ان دونوں باتوں کو ملا کر ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔ کہ بنی اسرائیل کی طرح دو عذاب کے وعدے مسلمانوں کے لئے بھی کئے گئے ہیں۔ اور اس جگہ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ سے مراد مسلمانوں کے دوسرے عذاب کا وعدہ ہے۔ اور بتایا یہ ہے کہ مسلمانوں پر جب یہ عذاب آئے گا۔ کہ دوسری دفعہ ارض مقدس کچھ عرصہ کے لئے ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی تو اس وقت اللہ تعالیٰ پھر تم کو اس ملک میں واپس لے آئے گا۔ چنانچہ دیکھ لو اسی طرح واقعہ ہوا ہے۔ جس طرح بخت نصر کے وقت میں پہلی دفعہ ارض مقدس یہود کے ہاتھ سے نکلی۔ اسی طرح صلیبی جنگوں کے وقت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلی (دی نیو انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Crusade)۔ پھر جس

طرح موسیٰ سے تیرہ سو سال بعد حضرت مسیحؑ کے صلیب کے واقعہ کے بعد جبکہ گویا وہ بظاہر اس ملک کے لوگوں کے لئے مر گئے تھے۔ بنی اسرائیل کو ارض مقدس سے دوبارہ بے دخل کر دیا گیا۔ اسی طرح اس زمانہ میں جبکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر اتنا ہی عرصہ گذرا ہے مسلمانوں کی حکومت پھر ارض مقدس سے جاتی رہی ہے۔ اور جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا تھا مسلمانوں کا یہ دوسرا عذاب یہود کے لئے ارض مقدس میں واپس آنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔

تفسیر فتح البیان کے مصنف اس آیت کے متعلق لکھتے ہیں کہ بعض علماء کے نزدیک وَعْدُ الْاٰخِرَۃِ سے اس جگہ مسیح موعود کا نزول مراد ہے ان علماء کا یہ قول میری تفسیر کی تائید کرتا ہے۔

وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴿۱۰۶﴾

اور اس (قرآن) کو ہم نے حق (وحکمت) کے ساتھ ہی اتارا ہے۔ اور حق (وحکمت) کے ساتھ ہی یہ اُترا ہے اور ہم نے تجھے صرف بشارت دینے والا اور (عذاب سے) آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔

تفسیر۔ یعنی یہ خبر ضرور پوری ہو کر رہے گی۔ چونکہ موسیٰؑ کی پیشگوئی کے سلسلہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشگوئی کا ذکر بھی آ گیا۔ کہ مسلمانوں پر بھی دو کٹھن زمانے آنے والے ہیں۔ اس لئے اس آیت سے اس مضمون کی تائید کی گئی ہے۔

آنحضرتؐ کی وحی میں دخل شیطان کی تردید اس آیت سے ضمناً اس خیال کی بھی تردید ہوتی ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی میں شیطان دخل دے دیتا تھا۔ کیونکہ فرماتا ہے کہ ہم نے قرآن کو حق سے اتارا ہے اور وہ محمد رسول اللہ تک حق سے ہی اُترا ہے۔ پس جبکہ قرآن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک حق سے اتر آیا تو شیطان کو دخل دینے کا موقعہ کب ملا۔

آخر میں فرمایا کہ تجھے بھی موسیٰ کی طرح بشیر و نذیر بنا کر ہم نے بھجوایا ہے۔ پس جس طرح اس کی قوم نے ترقی کی۔ اسی طرح تیری قوم بھی ترقی کرے گی۔ اور جس طرح اس کے دشمن ہلاک ہوئے تیرے دشمن ہلاک ہوں گے۔

وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ

اور (اسے) قرآن بنا کر (اُتارا ہے) اس حال میں کہ ہم نے اسے (کئی) ٹکڑوں میں تقسیم کیا ہے تا کہ تُو اسے

تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۷﴾

(سہولت اور) آہستگی کے ساتھ لوگوں کو پڑھ کر سنا سکے اور ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے۔

حلّ لُغات۔ فَرَقْنٰهُ فَرَقَ بَيْنَهُمَا: فَصَلَ اَبْعَاضَهُمَا۔ دو چیزوں کے ٹکڑوں کو علیحدہ علیحدہ کیا۔ فَرَقَ لَهٗ عَنِ الشَّيْءِ: بَيَّنَهٗ۔ اسے کھول کر بات بتائی (اقرب) وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ اَیْ بَيَّنَّا فِيْهِ الْاَحْكَامَ وَ فَصَّلْنٰهُ۔ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ کے معنے ہیں ہم نے اس میں احکام بیان کئے ہیں۔ اور اس کے جدا جدا حصے بنائے ہیں۔ وَقِيْلَ اَنْزَلْنٰهُ مُفَرَّقًا اور فَرَقْنٰهُ کے یہ معنی بھی کئے گئے ہیں۔ کہ ہم نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُتارا ہے۔ (مفردات)

مُكْثٍ مُكْثٍ مَكَثَ يَمْكُثُ کا مصدر ہے۔ مَكَث کے معنی ہیں۔ لَبِثَ۔ رُکا۔ ٹھہرا۔ رَزُنَ۔ آہستہ و باوقار رہا۔ (اقرب) اَلْمُكْثُ۔ ثُبَاتٌ مَعَ اِنْتِظَارٍ۔ ایسا توقف جس میں انتظار بھی ہو۔ (مفردات)

تفسیر۔ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ کے معنے ہیں کہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے نازل فرمایا ہے۔ یعنی ایک ہی وقت میں کئی کئی سورتوں کی آیات اُترتی رہتی ہیں۔ اور پھر پہلی اتری ہوئی سورۃ پیچھے کر دی جاتی ہے اور بعد کی پہلے۔ اس پر جو اعتراض پڑتا تھا اس کا جواب دیا ہے کہ ایسا اس لئے کیا گیا ہے کہ تُو اسے اپنی جگہ ٹھہر کر پڑھ سکے یعنی تیرے اندر بے اطمینانی اور گھبراہٹ پیدا نہ ہو۔ یہ جواب دیکھو اعتراض کرنے والوں کے لئے کیسا مسکت ہے۔

تنزیل قرآن میں عارضی اور مستقل ضرورت دونوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب دو قسم کے تھے۔ ایک عارضی یعنی اس وقت کے کفار اور ایک مستقل یعنی مومن اور بعد میں آنے والے لوگ۔ مستقل ضرورت کے لئے قرآن کریم کی اَور ترتیب چاہیے تھی اور عارضی ضرورت کے لئے اور۔ مستقل ضرورت کے لئے جن سورتوں کو آخر میں نازل کرنا چاہیے تھا۔ عارضی ضرورت کے لئے ان کی فوری ضرورت تھی۔ اسی طرح ایک سورۃ کے بعض مضامین کی ضرورت آخر میں تھی بعض کی شروع میں۔ اگر عارضی ضرورت کو مدنظر نہ رکھا جاتا تو سالہا سال تک مسلمان کفار کو صحیح جواب نہ دے سکتے۔ اور اگر مستقل ضرورت کو نظر انداز کر دیا جاتا۔

تو قرآن آئندہ زمانہ میں ایسا مفید نہ ہوتا جیسا اب ہے۔ پس فرمایا ہم نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اتارا۔ جوں جوں ضرورت تھی اُتارتے گئے۔ بعد والے مضمون کو پہلے۔ پہلے کے مضمون کو بعد میں۔ تا کہ وقتی ضرورت پوری ہو جائے۔ اور بعد میں حکم دے کر مستقل ضرورت کے مطابق اس کی ترتیب کر دی۔ جیسے دوسری جگہ فرماتا ہے۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ (القیامة:۱۸) کہ اس کی آخری ترتیب ابھی نہیں ہوئی جب یہ وحی کے متفرق ٹکڑے اُتر چکیں گے۔ تو ہم از سر نو اس کتاب کو ترتیب دیں گے۔ اور پھر وہ اس ترتیب کے مطابق پڑھی جائے گی۔

اس آیت میں اس شبہ کا جواب دیا گیا ہے کہ اس سورۃ میں بعض ایسے مضامین کا جواب ہے جو بعد میں نازل ہونے والی سورتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ

تُو (انہیں) کہہ (کہ) تم اس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ۔ جن لوگوں کو اس (کے نزول) سے پہلے (الہامی صحیفوں یا فطرت

قَبْلِهٖۤ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ

صحیحہ کے ذریعہ سے) علم دیا جا چکا ہے جب ان کے سامنے (اسے) پڑھا جاتا ہے تو وہ (اسے سن کر) کامل

لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ﴿۱۰۸﴾

فرمانبرداری اختیار کرتے ہوئے ٹھوڑیوں کے بل گر جاتے ہیں۔

حلّ لُغَات۔ الاذقان اَلْاَذْقَانُ ذَقَنٌ کی جمع ہے۔ اور ذَقَنٌ کے معنے ٹھوڑی کے ہیں۔ ذَقَنَ کا لفظ عربی محاورہ کے رُو سے تذلل پر دلالت کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ کہتے ہیں۔ مُثْقَلٌ اِسْتَعَانَ بِذَقَنِهٖ۔ يُضْرَبُ لِمَنِ اِسْتَعَانَ بِأَذَلَّ مِنْهُ۔ کہ فلاں نے اپنے سے بھی ذلیل انسان سے مدد چاہی (اقرب) پس يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ میں انتہائی تذلل کا اظہار کیا گیا ہے کہ وہ ٹھوڑیوں کے بل گر جاتے ہیں۔

تفسیر۔ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ سے مراد اس جگہ مسلمان ہیں جن کو پہلے سے یعنی آیت کے نزول سے قبل علم مل چکا تھا اور وہ اسلام کی سچائی کے قائل ہو چکے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ آئندہ دنیا کی ترقی قرآن مجید سے ہو گی۔ اس جگہ اُوْتُوا الْعِلْمَ سے اہل کتاب مراد نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہی تو اس سورۃ میں سب سے اہم مخاطب ہیں۔

یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ۔ذَقَنٌ۔ٹھوڑی کو کہتے ہیں۔اور ٹھوڑی نیچے کی طرف ہوتی ہے۔پس ٹھوڑی کے لئے گرنے یا ٹھوڑی پر گرنے سے مراد نیچے کی طرف جھکنے یا سجدہ کرنے کے ہوتے ہیں۔

اظہار خشوع کے لئے اسلامی طریق کا فرق عیسائیوں سے اس آیت میں خشوع وخضوع کے اظہار کا اسلامی طریق بتایا گیا ہے۔بعض قومیں مثلاً عیسائی وغیرہ سجدہ کے موقعہ پر نیچے کو جھکتے ہیں۔مگر منہ کو اوپر کی طرف اٹھاتے ہیں۔چنانچہ عیسائیوں کی تصویروں میں جہاں پر حضرت مسیح یا حضرت مریم کو عبادت کی حالت میں دکھایا ہے۔وہاں پر ان کا منہ آسمان کی طرف دکھایا گیا ہے۔

وَّ یَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ

اور وہ کہتے ہیں (کہ) ہمارا رب (ہر ایک عیب سے) پاک ہے (اور یہ کہ) ہمارے رب کا وعدہ

رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۹﴾

ضرور پورا ہو کر رہنے والا ہے۔

تفسیر۔اس آیت میں صاف ظاہر کر دیا کہ اس سے پہلے مومنوں کے لئے ترقیات کے وعدے دیئے گئے ہیں اور ’’اسراء‘‘ کا ذکر صرف ایک خبر ہی نہ تھا بلکہ مومنوں کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی کا وعدہ تھا۔

سورۃ کے شروع میں بھی اسراء کے ذکر پر ’’سُبْحٰنَ الَّذِيْۤ اَسْرٰى ‘‘رکھا اور یہاں بھی ’’سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ ‘‘فرما کر بتایا کہ اس مقام میں مسلمانوں کی ترقی اور کامیابی کا وعدہ کیا گیا ہے۔پھر سُبْحٰنَ کے لفظ سے یہ اشارہ کرنا بھی مقصود ہے کہ مسلمان ضرور کامیاب ہوں گے اور تم ضرور تباہ و برباد کئے جاؤ گے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو خدا تعالیٰ کی قدوسیت پر حرف آتا ہے۔

وَ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْكُوْنَ وَ یَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۱۰﴾ السجدۃ

السجدۃ ۶

اور وہ روتے ہوئے ٹھوڑیوں کے بل گر جاتے ہیں۔اور وہ (یعنی قرآن) ان کی فروتنی کو (اور بھی) بڑھاتا ہے۔

تفسیر۔اس میں مومن کے سجدہ کے وقت کی قلبی کیفیت بیان فرمائی ہے کہ وہ انابت کے اعلیٰ مقام

پر ہوتا ہے اس کا سجدہ دکھاوے کا نہیں ہوتا۔ بلکہ جبکہ وہ سجدہ کر رہا ہوتا ہے اس کے آنسو آپ ہی آپ بہنے لگ جاتے ہیں۔ پھر اس میں یہ صفت بھی پائی جاتی ہے کہ عبادت اسے متکبر نہیں بناتی۔ بلکہ اس کا سجدہ کرنا اسے خشوع وخضوع میں اور بڑھا دیتا ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ

تو (انہیں) کہہ (کہ) تم (خدا تعالیٰ کو) اللہ (کہہ کر) پکارو یا رحمٰن (کہہ کر) جو (نام لے کر) بھی تم (اسے)

الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ

پکارو (پکار سکتے ہو) کیونکہ تمام (بہتر سے) بہتر صفات اسی کی ہیں۔ اور تُو اپنے دعائیہ الفاظ اونچی آواز سے نہ کہا کر

بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۱﴾

اور نہ انہیں (بہت) آہستہ کہا کر۔ اور اس کے درمیان (درمیان) کوئی راہ اختیار (کیا) کر۔

حلّ لُغات۔ لا تجهر لَا تَجْهَرْ جَهَرَ سے نہی کا صیغہ ہے۔ اور جَهَرَ الْكَلَامَ وَبِالْكَلَامِ کے معنے ہیں۔ اَعْلَنَهٗ۔ کسی بات کا اعلان کیا۔ جَهَرَ الصَّوْتَ: اَعْلَاهُ۔ آواز کو اونچا کیا۔ (اقرب) پس وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا کے معنے ہوں گے کہ تو اپنے دعائیہ الفاظ اونچی آواز سے نہ کہا کر اور نہ آہستہ۔

لا تخافت لَا تُخَافِتْ خَافَتَ سے فعل نہی ہے اور خَفَتَ سے نکلا ہے۔ خَفَتَ اَوْ خَافَتَ بِكَلَامِهٖ کے معنے ہیں۔ اَسَرَّ مَنْطِقَهٗ۔ پوشیدہ بات کی۔ خَفَتَ بِصَوْتِهٖ: خَفَضَهٗ وَاَخْفَاهُ وَلَمْ يَرْفَعْهُ بہت ہی آہستہ بولا۔ آواز کو نیچا کیا۔ اور بلند نہ ہونے دیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ **سجدہ میں دعا کا طریق** پہلی آیات میں چونکہ سجدہ اور عبادت کا ذکر کیا گیا تھا (جس کی مسلمانوں سے ترقیات کے زمانہ میں امید کی جاتی تھی) اب سجدہ میں دعا کا طریق بیان فرماتا ہے کہ ان سجدوں میں اللہ تعالیٰ سے اس کے وعدوں کے پورا ہونے کے متعلق اور اپنی اصلاح کے متعلق اس طریق پر دعا کرو۔ جو ہم بتاتے ہیں۔ اس حکم کی تفصیل یہ ہے۔

مختلف صفات الٰہیہ کا تعلق دعا سے قرآن مجید میں اور حدیث میں مختلف دعائیں اور ان کے مواقع کا ذکر

ہے اس لئے فرماتا ہے کہ فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ہر کام کے لئے اس کے مناسب حال اللہ تعالیٰ کا ایک نام ہوتا ہے۔ اس کے مطابق دعا کیا کرو۔ جب تمہیں رحمانیت کی صفت کو جوش دلانے کی ضرورت ہو تو صفت الرحمٰن کو پیش کر کے دعا کرو۔ جب تمہیں رحیمیت۔ رزاقیت اور وہابیت کے متعلق کوئی مشکل درپیش ہو تو اللہ تعالیٰ کو اس وقت اسی نام سے پکارو۔ کیونکہ سارے اچھے نام اسی کے ہیں۔ جیسا موقعہ ہو ویسی ہی قسم کی صفت کے ساتھ دعا کرنی چاہیے۔ میرا تجربہ ہے کہ اس طریق پر دعا نہایت مؤثر ہوتی ہے۔ بعید نہیں کہ اس آیت میں یہود کے اسم اعظم والے دعویٰ کا بھی جواب دیا گیا ہو۔ اور بتایا ہو کہ کسی ایک نام کو اسم اعظم کہنا غلطی ہے۔ حصول مقاصد کے لئے خدا تعالیٰ کے اس نام کو لینا چاہیے جو موقعہ کے مناسب ہو۔ اور اگر وہ نام ذہن میں نہ آئے تو اللہ تعالیٰ کے سب نام ہی بڑے ہیں کسی نام کو لے کر دعا کر لو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دل کی کیفیت کو دیکھ کر دعا سن لے گا۔

وَ لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَ لَا تُخَافِتْ بِهَا وَ ابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا۔ صلوٰۃ کے معنے نماز کے بھی ہوتے ہیں۔ اور دعا کے بھی۔ اس جگہ چونکہ دعا کا ذکر ہے اس لئے دعا ہی کے معنے زیادہ مناسب ہیں۔

فرمایا۔ اپنی دعا بہت بلند آواز سے نہ مانگا کرو اور نہ ہی بالکل دھیمی بلکہ درمیان کا راستہ اختیار کرو۔

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم چند صحابہ کے پاس سے گذرے تو آپؐ نے دیکھا کہ وہ پکار پکار کر دعا کر رہے تھے۔ آپ نے ان کو منع فرمایا اور کہا کہ تمہارا خدا بہرہ نہیں، اس قدر اونچے پکارتے ہو وہ تو چیونٹی کے چلنے کی آواز کو بھی سنتا ہے۔ قرآن مجید نے بالکل آہستہ دعا کرنے سے بھی منع کیا ہے۔ کیونکہ اس سے توجہ قائم نہیں رہتی۔ دعا اس طرح کرنی چاہیے کہ انسان کو کلمات زبان سے نکلتے ہوئے محسوس ہوں تا کہ اس کی توجہ بھی قائم رہے۔

غرض دعا بہت بلند آواز سے مانگنے سے تو خدا تعالیٰ کی شان کو مدنظر رکھتے ہوئے منع فرمایا ہے اور نہایت آہستہ دعا مانگنے سے انسان کی کمزوری کو مدنظر رکھتے ہوئے منع فرمایا ہے۔

وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ

اور (سب دنیا کو سنا سنا کر) کہہ (کہ) کامل تعریف اللہ (تعالیٰ) کے لئے (ہی) مخصوص ہے جو نہ (تو) اولاد رکھتا

شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ

ہے اور نہ حکومت میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ (اس کے) عجز کی وجہ سے اس کا کوئی دوست (بنا) ہے۔ (بلکہ جو

تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۲﴾

بھی اس کا دوست ہوتا ہے اس سے مدد لینے کے لئے ہوتا ہے) اور اس کی خوب (اچھی طرح) بڑائی بیان کر۔

تفسیر ۔اس میں اسراء کے انجام کی خبر دی ہے یعنی وہ خدا اپنے اس وعدہ کو ضرور پورا کرے گا۔ اور اسی واحد لاشریک خدا کی تعریف کے گیت گائے جائیں گے اگر اس کا کوئی بیٹا ہوتا جیسا کہ بیت المقدس والوں کا خیال ہے تو مسلمانوں کو کس نے پوچھنا تھا ایسا ہی اگر اس کے شریک ہوتے جیسا کہ مکے والے کہتے ہیں تو مسلمانوں کو حکومت کون دیتا یعنی یہ دونوں قومیں جو مشرک ہیں مسلمانوں کی دشمن تھیں اگر شرک صحیح ہوتا تو مسلمان دنیا میں ہرگز کامیاب نہ ہو سکتے۔ لیکن جب اس خدا نے باوجود انتہائی کمزوریوں کے مسلمانوں کو ان سب پر غالب کر دیا تو یقیناً سمجھا جائے گا کہ وہ خدا واحد اور لاشریک ہے۔

مِنَ الذُّلِّ دوست دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک دوست جو رحم کی وجہ سے اور احسان کرنے کے لئے بنایا جاتا ہے ایسے دوست اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہیں یہ اس کی شان کے خلاف نہیں دوسرے وہ دوست جو امداد اور موقعہ پر کام آنے کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ ایسے دوست اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہیں۔

مسلمانوں کی ترقی شرک کی تردید ہے كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا کہہ کر سورۃ کو ختم کیا گیا ہے۔ اور اس میں گویا پھر اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مسلمانوں کو اہل کتاب پر غلبہ ملے گا اور جس طرح اہل مکہ پر غلبہ بتوں کے جھوٹے ہونے کی علامت ہوگا اہل کتاب پر غلبہ ان لوگوں کے جھوٹا ہونے کی دلیل ہوگا جو مسیح ابن اللہ یا عزیر ابن اللہ کہتے ہیں اور اس غلبہ کے ذریعہ سے خدائے واحد کی توحید تمام ملک میں پھیلا دی جائے گی۔ اور خدا کا بیٹا ماننے والے یا اس کا شریک قرار دینے والے سب کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی میں داخل کر دیا جائے گا اور کمزور

اور ناتوان انسان کو طاقت بڑائی اور غلبہ دے کر ظاہر کیا جائے گا کہ وہ خدا تمام طاقتوں سے بڑا اور بلند ہے۔ اسی وجہ سے آخر میں فرمایا کَبِّرْہُ تَکْبِیْرًا۔

آؤ ہم بھی امتثال امر کے طور پر کہیں اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!

سُوْرَۃُ الْکَھْفِ مَکِّیَّۃٌ

سورہ کہف ۱؎ یہ سورۃ مکی ہے۔

وَھِیَ مَعَ الْبَسْمَلَۃِ مِائَۃٌ وَاِحْدٰی عَشَرَۃَ اٰیَۃً وَاِثْنَا عَشَرَ رُکُوْعًا

اور بسم اللہ سمیت اس کی ایک سو گیارہ آیتیں ہیں اور بارہ رکوع ہیں۔

یہ سورۃ مکی ہے ۱؎ ابن عباسؓ اور ابن زبیر کے نزدیک یہ سورۃ سب کی سب مکی ہے (درمنثور) تمام مفسرین کا بھی اس امر پر اتفاق معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف مکی ہے بلکہ ابتدائی ایام کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل، کہف، اور مریم ابتدائی سورتوں سے ہیں اور میرے پرانے مال میں سے ہیں (بخاری کتاب التفسیر سورۃ بنی اسرائیل)۔

یہ سورۃ یکدم نازل ہوئی بعض کے نزدیک یہ سورۃ ان سورتوں میں سے ہے جو یکدم نازل ہوئی ہیں۔ دیلمی نے انسؓ سے یہی روایت کی ہے کہ یہ سورۃ یکدم نازل ہوئی تھی اور ستر ہزار فرشتہ ساتھ تھا اور اس کی خاص طور پر حفاظت کی گئی تھی (فردوس الاخبار از دیلمی حدیث نمبر ۷۰۷)۔

سورۃ کے یکدم نازل ہونے اور اس کے ساتھ فرشتوں کے نزول کا مطلب ان روایات کا یہ مطلب نہیں کہ بعض سورتوں کی حفاظت کم ہوئی ہے اور بعض کی زیادہ۔ کیونکہ اگر یہ تسلیم کیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بعض سورتوں کا محفوظ ہونا زیادہ یقینی ہے اور بعض کا کم۔ لیکن یہ امر بالبداہت غلط ہے پس جہاں جہاں حدیثوں میں آتا ہے کہ فلاں سورۃ کی حفاظت کے لئے اتنے فرشتے اترے۔ اس سے نزول کے وقت کی حفاظت مراد نہیں۔ بلکہ نزول کے بعد کی حفاظت مراد ہوتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ ہر سورۃ کسی خاص مضمون کے بارہ میں ہوتی ہے اور بعض دفعہ اس میں پیشگوئیاں ہوتی ہیں جن کے پورا ہونے پر اس سورۃ کی سچائی کا انحصار ہوتا ہے۔ یہ پیشگوئیاں بعض دفعہ طبعی تغیرات کے متعلق ہوتی ہیں اور بعض دفعہ انسانی اعمال کے متعلق۔ انسانی اعمال کے متعلق جو پیشگوئیاں ہوتی ہیں وہ اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتی ہیں کہ جن کے عذاب کی ان پیشگوئیوں میں خبر ہو۔ وہ اس عذاب کو ٹالنے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور چونکہ پیشگوئیاں بالعموم غیر معمولی طور پر مخالف حالات میں کی جاتی ہیں۔ اس لئے دنیوی سامانوں کے لحاظ سے ان کا پورا ہونا بظاہر ناممکن یا غیر اغلب نظر آتا ہے اور اسی وقت ان کے پورا ہونے کی کوئی صورت پیدا ہوسکتی ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی امداد کا انتظام کیا جائے۔ پس جس سورۃ میں اس قسم کی

پیشگوئیاں ہوں جن کے باطل جانے کے متعلق زبردست قوموں نے زور لگانا ہو ان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان ملائکہ کو جو دنیا کے مختلف کاموں پر بطور مدبّر مقرر ہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ ایسے سامان پیدا کریں کہ وہ پیشگوئیاں بغیر روک کے پوری ہو جائیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جس قدر وسیع الاثر پیشگوئی ہوگی اسی قدر وسیع اس کے مخالفوں کی تعداد ہوگی اور اسی قدر وسیع ذرائع اس کے باطل کرنے کے لئے دشمن استعمال کرے گا۔ اور اس کے مقابل پر اسی قدر وسیع ذرائع اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تائید میں استعمال کئے جائیں گے۔ پس چونکہ دنیا کے تمام اسباب ملائکہ کے سپرد ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ان کے لئے بطور مدبّر ہیں اس لئے جب کوئی ایسی پیشگوئی کی جاتی ہے۔ اسی قدر ملائکہ کو جن کے زیر تدبیر سامانوں سے اس کے پورا ہونے کا تعلق ہو حکم دیا جاتا ہے کہ تم اس سورۃ کے مضمون کی حفاظت کرو یعنی ان تدابیر میں لگ جاؤ جو اس پیشگوئی کے پورا کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ پس حفاظت آسمان سے زمین کے نزول تک نہیں ہوتی بلکہ حفاظت کا اصل کام نزول کے بعد شروع ہوتا ہے اور اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ اس سورۃ میں بیان کردہ پیشگوئیاں پوری نہ ہو جائیں ورنہ شیطانی یا انسانی دخل اندازی کے لحاظ سے ہر سورۃ ہر آیت ہر لفظ بلکہ ہر حرف اور حرکت قرآن کریم کی یکساں محفوظ ہے اور اس کی یکساں حفاظت کی جاتی ہے اور کسی سورۃ یا کسی آیت یا کسی حرف یا حرکت کو دوسری سورتوں یا دوسری آیتوں یا دوسرے حرفوں اور حرکات سے امتیاز حاصل نہیں۔

غرض اس سورۃ کے ساتھ ستر ہزار فرشتے اتارنے کا یہ مطلب ہے کہ چونکہ اس میں یاجوج ماجوج جیسی طاقتور قوموں اور آخری مسیحی فتنہ کے استیصال کی خبر دی گئی ہے اس لئے ہزاروں فرشتوں کو اس پیشگوئی کے پورا کرنے کے لئے نزول قرآن کے زمانہ سے لگا دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول مسیحی مصنف اس کے نزول کا زمانہ قریباً نبوت کے چھٹے سال میں قرار دیتے ہیں (تفسیر ویری جلد ۳ صفحہ ۷۷)۔ مگر میرے نزدیک یہ چوتھے یا پانچویں سال کی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی مذکورہ بالا روایت سے ایسا ہی ثابت ہوتا ہے۔

اس سورۃ کا اسراء سے تعلق اس کا تعلق پہلی سورۃ سے مفسرین یہ قرار دیتے ہیں کہ یہود نے تین سوال کئے تھے۔

(۱) روح کے متعلق۔ (۲) اصحاب کہف کے متعلق (۳) ذوالقرنین کے متعلق۔ ان تین سوالوں میں سے ایک کا جواب دیر سے آیا (یعنی روح القدس کے متعلق) اور وہ سورۃ اسراء میں درج ہوا۔

دوسرے دو سوالوں کا جواب جلدی اور اکٹھا آ گیا۔ اس لئے ان دونوں کو ایک ہی سورۃ یعنے کہف میں اکٹھا بیان کر دیا (بحر محیط) لیکن یہ جواب کافی نہیں۔ کیونکہ اس سورۃ میں اور بھی کئی واقعات ہیں۔ مثلاً دو باغ والوں کی تمثیل موسیٰ کا سفر وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ ان واقعات کو یہاں کیوں بیان کیا گیا ہے۔ مفسرین اس کے جواب میں خاموش ہیں

پادری ویری اپنی تفسیر میں اس سورۃ کے واقعات کی بناء پر لکھتے ہیں کہ اس سورۃ کو سورۃ العجائب کہنا چاہیے۔ (تفسیر ویری جلد ۳ صفحہ ٦ ۷)۔

مفسرین کے بیان کردہ تعلق پر بحث میرے نزدیک نہ مفسرین کی توجیہہ صحیح ہے اور نہ ویری کا اعتراض معقول۔ یہ توجیہہ بھی اور یہ اعتراض بھی سورۃ کا مضمون اور اس کی غرض نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔

چونکہ بعض نامکمل یا کمزور روایات کی وجہ سے مفسرین کے دماغوں میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ یہود نے آنحضرت صلعم سے تین عجیب سوال کئے تھے اور یہاں ان کا جواب دیا گیا ہے اس لئے انہوں نے کسی اور پہلو پر غور کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اور ان کا خیال ان کمزور روایات میں ہی الجھا رہا۔ حالانکہ یہ امر بالکل ماننے کے قابل نہیں کہ قرآن کریم میں کوئی واقعہ یہود کے سوال کی وجہ سے نازل ہوا ہو۔ قرآن کریم تو ایک مکمل ہدایت نامہ ہے اسے اس سے کیا تعلق کہ کوئی سوال کرتا ہے یا نہیں۔ اس نے تو بہرحال ہر وہ علم جو اخلاق۔ عبادت۔ روحانیت۔ تقویٰ۔ تمدن۔ اقتصاد اور سیاست وغیرہا کے متعلق ہو بیان کرنا ہی تھا۔ پس اگر ان واقعات کا دین اور دیانت سے کوئی تعلق ہے تو انہوں نے بہرحال بیان ہونا تھا۔ اور اگر نہیں تو یہودی لاکھ سوال کرتے ان کے بیان کرنے کی قرآن کریم کو کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہ امر بھی ناقابل تسلیم ہے کہ ان واقعات کو اس لئے اکٹھا بیان کیا گیا ہے کہ یہود نے اکٹھا سوال کیا تھا۔ ایک وقت میں انسان مختلف مضامین کے متعلق سوال کر دیتا ہے اس مجلس میں اس ترتیب سے ان کا جواب دینا تو معقول ہو سکتا ہے لیکن ایک مستقل کتاب میں جس کا تعلق کسی خاص قوم یا زمانہ سے نہیں۔ ان سوالوں کا جواب اکٹھا دینا قطع نظر اس کے کہ ان کا آپس میں کوئی جوڑ بھی ہو یا نہ ہو ہرگز پسندیدہ امر نہیں کہلا سکتا۔ پس میرے نزدیک یہ خیالات قلت تدبر سے پیدا ہوئے ہیں یا شاید اس وقت ابھی ان سوالات کے حل ہونے کا زمانہ نہ آیا تھا۔

میرے نزدیک یہ امر بھی بالکل خلاف عقل ہے اور قرآن کریم کی شان کے خلاف ہے کہ دو سوالوں کا جواب جلدی آ گیا اس لئے اسے کہف میں رکھ دیا اور ایک کا جواب بعد میں آیا اس لئے اسے سورۃ اسراء میں بیان کر دیا کیونکہ اس جواب پر یہ معقول اعتراض ہوتا ہے کہ کیوں دو سوالوں کے جواب پہلے آ گئے۔ بعض مفسرین نے اس

فرق کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ دوسوالوں کا جواب چونکہ دیا گیا ہے اور ایک کے جواب سے لاعلمی ظاہر کی گئی ہے اس لئے جن کا جواب دیا گیا تھا انہیں ایک سورۃ میں بیان کر دیا۔ اور جس سوال کے جواب سے معذوری ظاہر کی اسے سورۂ اسراء کے ساتھ شامل کر دیا۔ اول تو یہ جواب جواب دینے والے کی لاعلمی پر دلالت کرتا ہے۔ قرآن کریم نے ہرگز کسی معذوری یا لاعلمی کا اظہار نہیں کیا بلکہ روح کے متعلق جو سوال تھا اس کا مکمل جواب دیا ہے دوسرے یہ جواب بھی اس خیال پر مبنی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی آخری اور جامع کتاب کے مضامین کے لئے یہود کے سوالوں کا محتاج تھا۔ یا مجبور تھا کہ وہ سوال کریں تو ان کا جواب دے۔ قرآن کریم میں یہود و مشرکین کے سارے ہی شبہات کا جواب ہے مگر اس طرح نہیں کہ انہوں نے سوال کیا اور قرآن نے جواب دیا۔ بلکہ جو مضمون قرآن میں بیان ہوتا ہے اس کے متعلق جو شبہات اور وسوسے پیدا کئے جا سکتے ہیں وہ ان کا جواب اس جگہ دے دیتا ہے خواہ عملاً کفار و مشرکین نے وہ وسوسے پیش کئے ہوں یا نہ کئے ہوں اور کسی اور وقت پیش کئے ہوں یا اس وقت پیش کئے ہوں۔ درحقیقت قرآن ان عارضی موجبات کی ذرّہ بھر بھی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ تو اپنے مضمون سے کام رکھتا ہے کیونکہ وہ صرف اس زمانہ کے لوگوں کے لئے نہیں اُترا تھا بلکہ ہر زمانہ کے لوگوں کے لئے اُترا تھا۔ پس اس کے جوابات صرف اس مضمون پر پڑنے والے اعتراضات کے متعلق ہوتے ہیں جو وہ بیان کر رہا ہوتا ہے۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ مفسرین نے اپنے خیالات کی بنا جن روایتوں پر رکھی ہے وہ خود عقلاً اور نقلاً مجروح معلوم ہوتی ہیں وہ روایتیں یہ ہیں (۱) مکہ والوں نے ایک وفد مدینہ کے یہود کی طرف بھجوایا کہ مکہ میں ایک مدعی پیدا ہوا ہے اس کے بارہ میں ہمیں مشورہ دو کہ ہم کیا کریں انہوں نے جواب دیا کہ اس سے تین سوال کرو اگر وہ جواب دے دے تو سچا ہے ورنہ جھوٹا ہے ان لوگوں نے واپس آکر وہ تین سوال رسول کریم صلعم پر کئے۔ (الف) اصحاب کہف کون تھے (ب) ذوالقرنین کے واقعات کیا ہیں (ج) روح کیا چیز ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں کل جواب دوں گا۔ مگر دس پندرہ دن تک وحی نہ آئی آپؐ بہت گھبرائے اور کفار بہت خوش ہوئے۔ آخر جبریل وحی لائے اور آپ نے ان سے شکایت کی کہ اس قدر دیر کیوں کی۔ انہوں نے کہا کہ آپ نے چونکہ انشاء اللہ نہ کہا تھا اللہ تعالیٰ نے سزا دی ہے اور تینوں سوالوں کے جواب بتا دیئے جن میں سے دو سورہ کہف میں بیان ہوئے ہیں اور ایک سورۃ اسراء میں بیان کیا گیا ہے یہ روایت ابن عباسؓ کی طرف منسوب کر کے بیان کی گئی ہے (در منثور بحوالہ ابن اسحاق ابن جریر وغیرہما) دوسری روایت بھی حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہے اور وہ یہ ہے کہ کفار نے ایک وفد مدینہ کے یہود کی طرف بھجوایا اور ان سے آپؐ کے بارہ میں مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ اس

سے تین سوال پوچھو کہ اصحاب کہف ۔ذوالقرنین اور روح کیا ہیں ۔ان میں سے پہلے دو کا جواب اگر وہ دے دے اور تیسرے کے جواب سے معذوری ظاہر کرے تو وہ سچا ہے اور اگر تینوں کا جواب وہ نہ دے یا روح کے متعلق بھی وہ کوئی جواب دے دے تو وہ جھوٹا ہے اور یہ بھی کہا کہ ہم نے مسیلمہ کذاب سے بھی یہ سوال کیا تھا مگر وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔آگے پہلی روایت کی طرح کی روایت ہے سوائے اس کے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب کہف اور ذوالقرنین کی بابت سوالوں کا جواب تو دے دیا۔لیکن روح کے بارہ میں یہ کہا کہ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (الاسراء:۸۶) اور اس طرح معذوری ظاہر کر دی (درمنثور بحوالہ دلائل النبوۃ ابو نعیم)۔

اول تو یہ روایتیں حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہیں جو اس واقعہ کے تین چار سال بعد پیدا ہوئے تھے اگر یہ واقعہ اہم نہ ہوتا تو ہم کہتے کہ باقی صحابہؓ نے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی یا کوئی گھر کا معاملہ ہوتا تو بھی ہم سمجھتے کہ گھر کے کسی فرد کو اس کا بہتر علم ہو سکتا تھا لیکن اہم تو وہ اس قدر ہے کہ مکہ کے لوگ ایک وفد تین سو میل مدینہ کی طرف بھجواتے ہیں پھر وہ لوگ آ کر رسول کریم صلعم پر سوال کرتے ہیں پھر کئی دن تک جواب نہ آنے کے سبب سے مکہ کے لوگ خوش اور رسول کریم صلعم غمگین ہوتے ہیں لیکن اس زمانہ کے صحابہ میں سے ایک بھی اس واقعہ کو بیان نہیں کرتا۔اگر کرتا ہے تو وہ شخص جو اس وقت پیدا بھی نہ ہوا تھا۔

دوسرا اعتراض ان روایات پر یہ ہے کہ دونوں ہی روایات حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ایک روایت تو کہتی ہے کہ اگر ان تین سوالوں کا جواب اس شخص نے نہ دیا تو وہ جھوٹا۔دوسری یہ کہتی ہے کہ اگر ان تین سوالوں میں سے دو کا جواب اس نے دیا تو سچا اور اگر تیسرے سوال کا جواب بھی دے دیا تو جھوٹا۔اب ہم کس روایت کو مانیں جو روایت یہ کہتی ہے کہ تینوں کا جواب دیں تو سچے ہیں یا جو یہ کہتی ہے کہ تینوں کا جواب دیں تو جھوٹے ہیں۔اگر اس روایت کو مانا جائے جو کہتی ہے کہ تینوں کا جواب دیں تو سچے ہیں تو جو لوگ کہتے ہیں کہ تیسرے سوال کا جواب نہیں ملا وہ کیا کریں کیا اس حدیث کو جھوٹا کہیں یا (نعوذ باللہ من ذالک) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو۔اور اگر اس حدیث کو سچا کہا جائے جو یہ بتاتی ہے کہ اگر روح کے متعلق سوال کا جواب محمد (رسول اللہ صلعم) دے دیں تو وہ جھوٹے ہیں تو بتاؤ کہ جو شخص قرآن کریم کے اس جواب کو کہ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ کو ایک مکمل اور شافی جواب سمجھتا ہے وہ اس حدیث کو جھوٹا کہے یا نعوذ باللہ محمد رسول اللہ صلعم کو۔میرے نزدیک تو چونکہ دونوں حدیثوں میں جو دعویٰ پیش کیا گیا ہے وہ خلاف عقل ہے اس لئے دونوں ہی جھوٹی ہیں خدا کا رسول بہرحال سچا ہے۔

یہ روایات خلاف عقل اس طرح ہیں کہ جن سوالات کا ان میں ذکر ہے سوال یہ ہے کہ ان کے جواب یہود جانتے تھے یا نہیں۔ اگر وہ جانتے تھے تو کیا اس سے احمقانہ طریق بھی کسی نبی کے پرکھنے کا ہوسکتا ہے کہ اس سے ایک ایسے امر کے متعلق سوال کیا جائے جسے سینکڑوں ہزاروں لوگ جانتے تھے۔ فرض کرو کسی کذاب کو بھی ان باتوں کا یہود سے سن کر علم ہوتا۔ تو کیا ان سوالوں کا جواب دے کر وہ سچا نبی ہو جاتا۔ اگر مذکورہ بالا سوال کا جواب یہ ہے کہ یہود ان سوالوں کا جواب نہیں جانتے تھے تو پھر بھی اس سے زیادہ احمقانہ طریق کسی مدعی کے پرکھنے کا کیا ہوسکتا ہے۔ جب وہ جواب جانتے ہی نہ تھے تو انہیں کس طرح معلوم ہوتا کہ جو جواب دیئے گئے ہیں وہ غلط ہیں یا صحیح اور کیا محض جواب دے دینے سے مدعی کی سچائی ثابت ہوسکتی تھی۔ یہی اعتراضات کم سے کم دوسری روایت کے دو سوالوں کے بارہ میں بھی پیدا ہوتے ہیں اور چونکہ ان سوالات کا کوئی معقول جواب نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ روایات بعض وضاعین کی بنائی ہوئی ہیں۔

تیسرا اعتراض دوسری روایت پر یہ پڑتا ہے کہ اس میں لکھا ہے کہ ہم نے مسیلمہ کذاب سے بھی پوچھا ہے وہ بھی جواب نہیں دے سکا۔ یہ حصہ روایت کا روایت کو جھوٹا ثابت کرنے کیلئے کافی ہے۔ کیونکہ گو مسیلمہ بنو حنیفہ میں معزز آدمی تھا مگر تاریخ سے ثابت ہے کہ بنو حنیفہ اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہوئے اور مسلمان ہونے کے بعد مسیلمہ مرتد ہو کر مدعی نبوۃ بنا۔ اور یہ خود مدینہ آیا اسلام لایا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قوم کو حکم دیا کہ واپس جا کر اپنے گرجا کو مسجد بناؤ اور نمازوں کے پابند رہو۔ (زرقانی وفد الخامس اور لائف آف محمد مصنفہ سر میور باب ۳۰ صفحہ ۴۷۳) اب یہ ظاہر ہے کہ جس شخص نے نبوۃ کا دعویٰ رسول کریم صلعم کی مدنی زندگی کے آخری سالوں میں کیا۔ اس سے مدینہ کے یہود اس وقت یہ سوال کہاں سے کرنے گئے تھے جبکہ رسول کریم صلعم ابھی مکہ میں تھے اور اس شخص نے نبوت کا دعویٰ ہی اس وقت تک نہ کیا تھا۔

خلاصہ یہ کہ یہ روایات بالکل غلط اور باطل ہیں۔ اور ان پر کسی صورت میں بھی تفسیر کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔

جب یہ روایات غلط ثابت ہوگئیں تو اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ قرآن کریم سے اس سورۃ کے مضامین کی ترتیب کی کیا وجوہ معلوم ہوتی ہیں اور ایسی روایات کی طرف ہمیں توجہ ہی نہیں کرنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علم کے مطابق اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے تعلق اب میں بتاتا ہوں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس بارہ میں کیا علم دیا ہے اور اس کے مطابق سورۃ کہف کا جوڑ پہلی سورۃ سے کیا ہے اور جو واقعات اس میں بیان ہیں ان کا سورۂ بنی اسرائیل سے کیا تعلق ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیے کہ جیسا کہ سورۂ نحل میں ثابت کیا جاچکا ہے۔

سورۂ نحل میں یہود و نصاریٰ سے مقابلہ کی پیشگوئی کی گئی تھی اور سورۂ اسراء میں اس کی مزید تشریح اس طرح کی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلعم کو ایک ایسے علاقہ میں لے جائے گا جہاں ان کا تعلق یہود و نصاریٰ سے پیدا ہوگا اور وہ بھی آپ کی مخالفت کریں گے اور شکست کھائیں گے اور ساتھ ہی ایک کشف کا ذکر کیا گیا تھا جس میں خبر دی گئی تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان علاقوں پر قابض ہو جائیں گے جو یہود کے لئے موعود تھے اور یہ کہ یہود کے لئے مقدر ہو چکا ہے کہ وہ دو بغاوتیں کریں گے۔ ایک بغاوت حضرت داؤد کے بعد جس کے نتیجہ میں وہ اپنے ملک سے نکالے جائیں گے لیکن اس کے بعد توبہ کر کے اپنے ملک میں واپس آنے کی توفیق پائیں گے۔ دوسری بغاوت وہ مسیح کے زمانہ میں کریں گے جس کے نتیجہ میں پھر ان کے معبد گرائے جائیں گے اور انہیں اپنے موعود وطن سے نکال دیا جائے گا۔ ان پیشگوئیوں میں موسوی سلسلہ کی پہلی کڑی کے حالات بتائے گئے تھے اب ایک سوال تو یہ رہ جاتا تھا کہ موسوی سلسلہ کی دوسری کڑی تو موجود ہے جو ان عذابوں میں پہلی کڑی یعنے یہود کے شریک حال نہیں پس کیوں نہ سمجھا جائے کہ یہود کی تباہی کے بعد وہ ان پیشگوئیوں کے مصداق بنیں گے جو موسوی سلسلہ کی ترقی کی نسبت پہلی کتب میں بیان ہو چکی ہیں اور دوسرا سوال یہ رہ جاتا تھا کہ مسلمانوں کو جو ہوشیار کیا گیا ہے کہ تم یہود کے نقش قدم پر چل کر اپنے آپ کو یہود کی طرح ان دو عذابوں میں مبتلا نہ کر لینا۔ اس کے متعلق آئندہ کیا ہونے والا ہے؟ ان دونوں سوالوں کا جواب سورۂ کہف میں دیا گیا ہے اور موسوی سلسلہ کی دوسری کڑی کے حالات بیان کئے گئے ہیں اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ مسلمان جو یہود کے نقش قدم پر چلیں گے ان کے ساتھ کیا معاملہ گذرے گا اور کس طرح گذرے گا۔

رہا یہ سوال کہ اصحاب کہف اور دو باغوں کی تمثیل سے اور موسیٰ کے اسراء کے واقعہ اور پھر ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج کے ذکر کا ان امور سے کیا تعلق ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ ان واقعات میں مسیحی قوم کی ابتداء اور انتہاء کا ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ان مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے جو مسلمانوں پر ان کی بے دینی کی وجہ سے مسیحی اقوام کی طرف سے پیش آنے والی تھیں۔

اصحاب کہف وہ ابتدائی مسیحی ہیں جنہوں نے دین کی خاطر بڑی بڑی تکالیف اٹھائیں اور آخر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی قربانیوں کا بدلہ ملا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان پر فضل کر کے دینی اور دنیوی ترقیات انہیں دیں۔ یہ واقعات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے گزر چکے تھے کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت نصاریٰ بھی سچے راستہ کو چھوڑ چکے تھے ان کے ذکر سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب یہود نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے لئے اصحاب کہف یا دوسرے لفظوں میں ابتدائی مسیحیوں کو جو راستی پر

قائم تھے اپنے فضلوں کے لئے چن لیا۔ اس کے بعد مضمون کا گریز اس طرف ہونا چاہیے تھا کہ پھر ان پر سے فضل کو کیوں ہٹایا گیا تو اس کا جواب دو باغوں والے کی تمثیل سے دیا کہ موسوی سلسلہ کو ہم نے دو باغ دئے تھے یعنے یہود کی ترقی کا باغ۔ اور مسیح کی امت کی ترقی کا باغ۔ جن دونوں میں سے ایک کا ذکر سورۂ اسراء میں کیا گیا۔ اور دوسرے کا ذکر اصحاب کہف کے ذکر سے کیا گیا ہے پھر یہ بتایا کہ ان دو باغوں کی ملکیت سے یہ قوم منکر ہوگئی اور خدا تعالیٰ کو بھول گئی اور اپنے بھائیوں یعنے بنو اسماعیل کو حقیر سمجھنے لگ گئی اور یہ سمجھ بیٹھی کہ گویا اس پر یہ فضل کسی ذاتی حق کی بناء پر نازل ہو رہے ہیں تب اللہ تعالیٰ نے مظلوموں اور ان کی جو حقیر سمجھے گئے تھے فریاد کو سنا۔ اور موسوی سلسلہ کے باغوں کو جلا دیا۔ یعنے دونوں قوموں کی شان وشوکت کو توڑ دیا اور اسمٰعیلی نسل پر جو حقیر سمجھی گئی تھی فضل کر کے ان سے اچھے باغ ان کو دے دیئے۔

اس تمثیل کے بعد مضمون کو اور واضح کرنے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک اسراء کا ذکر فرمایا جس میں انہیں موسوی سلسلہ کی ترقیات اسی طرح دکھائی گئی تھیں جس طرح محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ اسراء میں بیان شدہ اسراء میں محمدی سلسلہ کی ترقیات دکھائی گئی تھیں اور اس اسراء کے ذکر سے وضاحت سے اس مضمون کو بیان کیا کہ موسوی سلسلہ کی ترقی جسے اسراء کی شکل میں دکھایا گیا تھا کس طرح ہوگی اور کس مقام پر پہنچ کر وہ ترقی رک جائے گی اور اسمٰعیلی نسل کی طرف برکات منتقل ہو جائیں گی۔ اس امر کے بیان کرنے کے بعد اس ذکر کو شروع کیا کہ اسمٰعیلی نسل کی طرف برکات سماوی کے منتقل ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ ان نافرمانوں کو جو محمدی سلسلہ میں سے دین سے غافل ہو جائیں گے موسوی سلسلہ کی بگڑی ہوئی دوسری کڑی کے ہاتھوں سے سزا دلوائے گا اور یہ سزا یاجوج ماجوج کے ذریعہ سے ہوگی جو نصرانی دین کے پابند ہوں گے اور ایک دن سب دنیا پر چھا جائیں گے۔ اور یہ سمجھانے کے لئے کہ یہ اقوام اب بھی موجود ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ نے ابھی ان کو پھیلنے اور ترقی کرنے سے روکا ہوا ہے۔ ان وجوہ کو بیان کیا جو ان اقوام کو روک رہی ہیں اور یاجوج ماجوج کے ایک عرصہ تک باقی دنیا سے الگ رہنے کا سبب ایک وجود کو بتایا جس کا نام ذوالقرنین بیان فرمایا ہے اور اس طرح نصرانی قوم کے دونوں حصوں کے واقعات بیان کر دیئے ایک وہ جو اصحاب کہف کی شکل میں سچے اور اصل نصرانی تھے۔ اور ایک وہ جو اصحاب کہف کی روح کے کچلے جانے کے بعد مسیحیت کو قبول کریں گے اور وہ نصرانی دین پر صرف ظاہر میں قائم ہوں گے در حقیقت وہ اس دین کی روح سے بالکل بے خبر ہوں گے۔

آخر میں بتایا کہ آخر اللہ تعالیٰ اپنے عذاب بھیج کر اس یاجوجی ماجوجی فتنہ کو کچل دے گا۔ اور ایک ذوالقرنین ثانی

کے ذریعہ سے مسلمانوں کی نجات کے سامان پیدا کرے گا۔

سورۃ کا خلاصہ مضمون خلاصہ یہ کہ اس سورۃ میں مسیحی سلسلہ کے دو دوروں کا ذکر کیا گیا ہے اس دور کا بھی جو نیکی کا دور تھا اور اس کا بھی جو بدی کا دور تھا۔ اور بتایا ہے کہ ان دونوں دوروں کے درمیان محمدی سلسلہ کا قیام مقدر ہے اور محمدی سلسلہ کے نافرمانوں کی سزا کے لئے اللہ تعالیٰ نے عیسوی سلسلہ کے بے دین لوگوں کو چھپا رکھا ہے ایک دن وہ ظاہر ہوں گے اور اسلامی شوکت کو توڑ دیں گے مگر پھر اللہ تعالیٰ فضل کرکے اسلام کو فتنہ سے محفوظ کرلے گا۔

یہ خلاصہ ہے۔ باقی تفصیلات سورۃ کے مختلف حصوں میں ساتھ کے ساتھ بیان کی جائیں گی۔

سورۃ اسراء کے آخر اور کہف کے ابتدائی مضمون کا تعلق یہ ترتیب تو وہ ہے جو اس سورۃ کے دوسری سورتوں سے تعلق کو مدنظر رکھ کر بیان کی گئی ہے۔ باقی رہا اس سورۃ کی ابتداء کا تعلق پہلی سورۃ کے آخر سے سو وہ بھی ظاہر ہے۔ اسراء کے آخر میں فرمایا تھا وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا اور اس سورۃ کے شروع میں فرماتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم پر قرآن ہم نے جن اغراض سے نازل کیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وَ يُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا۔ پس پہلی سورۃ کو ختم اس ذکر سے کیا تھا کہ خدا کا کوئی بیٹا نہیں اور اس سورۃ کو شروع اس ذکر سے کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قوم کی تباہی کی خبر دیتے ہیں جو خدا کا بیٹا تجویز کرتی ہے۔ اسی طرح پہلی سورۃ کے آخر میں فرمایا تھا کہ علم والے لوگ وہ ہوتے ہیں جو خدا تعالیٰ کی عبادتیں کرتے اور اس کے وعدوں پر یقین رکھتے ہیں اور کہف کے شروع میں یہ بتایا ہے کہ جو خدا تعالیٰ کا بیٹا تجویز کرتے ہیں وہ علم والے نہیں کہلا سکتے۔ گویا پہلی سورۃ میں علم کی تشریح کی۔ اور دوسری میں جہالت کی۔

تیسرا تعلق سورۃ اسراء کے آخری حصہ اور سورۃ کہف کے ابتدائی حصہ میں یہ ہے کہ سورۃ اسراء کے آخر میں تو یہ بیان فرمایا ہے کہ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ اللہ تعالیٰ کا حکومت میں کوئی شریک نہیں۔ اور سورۃ کہف کے شروع میں یہ بیان فرمایا ہے کہ لِيُنْذِرَ بَأْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ قرآن محمد رسول اللہ صلعم کو اس لئے ملا ہے تا کہ لوگوں کو اس عذاب سے ڈرائیں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے یعنے جو لوگ اپنی حکومتوں پر گھمنڈ کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ دنیوی سامانوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کا مقابلہ کرنے والا اور انہیں تباہ کرنے والا کوئی نہیں ان کو بتا دے کہ تباہیاں ایسے ذرائع سے بھی ہوا کرتی ہیں جو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتے۔ پس اس خدا کے عذاب سے مطمئن نہ رہو جو اس دنیا کا اصل بادشاہ ہے۔ چوتھا تعلق دونوں سورتوں کے آخری اور ابتدائی حصوں میں

یہ ہے کہ سورہ اسراء کے آخری الفاظ یہ تھے کہ کَبِّرْهُ تَکْبِیْرًا خدا تعالیٰ ہی کی بڑائی بیان کرو اور اس سورۃ کی شروع کی آیات میں خدا کا بیٹا بنانے والوں کا ذکر کر کے فرماتا ہے کَبُرَتْ کَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۔ یہ بہت بڑی بات ہے جو ان کے مونہوں سے نکل رہی ہے۔ یعنی بڑائی تو اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور یہ ظلماً وہ حق اس کی ناچیز مخلوق کو دے رہے ہیں۔

نصاریٰ کے متعلق اس سورۃ کے ہونے کا ثبوت احادیث سے اب میں بعض احادیث درج کرتا ہوں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس سورۃ کو نصاریٰ کے متعلق ہی کہا ہے اور انہیں پر چسپاں کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل ابوالدرداءؓ سے روایت کرتے ہیں کہ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلعم مَنْ حَفِظَ عَشْرَ اٰیَاتٍ مِنْ اَوَّلِ سُوْرَةِ الْکَهْفِ عُصِمَ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ ۔ یعنی جس شخص نے دس آیتیں سورۂ کہف کی ابتداء سے یاد کر لیں وہ دجال کے فتنہ سے بچایا جائے گا۔ (مسند احمد بن حنبل مسند بقیة حدیث ابی الدرداء)

اس حدیث سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ دجال کے فتنہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اور احمد اور مسلم اور نسائی نے ابوالدرداء سے روایت کی ہے کہ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ مَنْ قَرَءَ عَشْرَ الْاَوَاخِرِ مِنْ سُوْرَةِ الْکَهْفِ عُصِمَ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ ۔ کہ جس شخص نے سورۂ کہف کی آخری دس آیتیں یاد کر لیں وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ ہو جائے گا (مسند احمد بن حنبل مسند بقیة حدیث ابی الدرداء)۔

سورۃ کہف میں نصاریٰ کا ذکر ہے ان احادیث سے ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورۃ کو دجال کے فتنہ کے متعلق سمجھا ہے لیکن دجال کا نام اس سورۃ میں نہیں آیا۔ ہاں پہلی آیات میں خدا کا بیٹا بنانے کا ذکر ہے جو عیسائیوں کا عقیدہ ہے اور آخری آیات میں اسی قوم کا ذکر ہے جو رات اور دن دنیا کی ترقیات کی سعی میں خرچ کر دیں گے اور ایجادات اور اختراعات میں اس طرح لگ جائیں گے کہ انہیں خیال ہو جائے گا کہ شائد اب کائنات کا راز ہم دریافت کر لیں گے لیکن جس قدر ایجادات وہ کریں گے اسی قدر یہ بات کھلتی جائے گی کہ ہر راز قدرت کے بعد ایک اور راز قدرت موجود ہے اور اللہ تعالیٰ کے کاموں کی کوئی حد بندی نہیں کر سکتا۔ اور یہ نقشہ بھی مسیحی اقوام کا ہے پس جب پہلی اور پچھلی سورتوں میں مسیحی مذہب اور مسیحی ترقیات کا ذکر ہے۔ تو یہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بھی پہلی دس اور آخری دس آیتیں سورہ کہف کی پڑھے گا دجال کے فتنہ سے محفوظ ہو جائے گا اس کے یہی معنے بنتے ہیں کہ آپؐ نے بگڑی ہوئی مسیحیت کا نام ہی دجال رکھا ہے۔ اور اگر یہ نہ سمجھا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نعوذ باللہ من ذالک۔ یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ آپؐ نے دجال کے فتنہ سے بچنے

کے لئے بالکل بے جوڑ آیتیں بتائیں لیکن آپ کی شان ایسے فعل سے بلند و بالا ہے۔

خلاصہ سورۃ اس سورۃ کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب اس لئے اتاری ہے کہ پہلی کتب کی غلطیوں کو دور کرے۔اور خدا کا بیٹا بنانے والوں کو ڈراوے۔ان لوگوں کو بہت کچھ ترقی ملے گی اور وہ اسلام سے بہت کچھ تنفّر کریں گے۔لیکن ان کی ابتداء اس قسم کی نہ تھی جس قسم کی انتہاء ہوگی۔ابتداء میں یہ لوگ نہایت کمزور تھے اور ان کو بہت سخت تکالیف دی جاتی تھیں۔لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم کیا اور ان کو مصائب سے بچایا۔اور ترقی کا راستہ دکھایا مگر وہ ترقی حاصل کر کے شرک میں مبتلا ہو گئے اور بجائے دین کی طرف جھکنے کے دنیا کی طرف جھک گئے اور اسی میں مشغول ہو گئے۔پس مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ اس قوم کے حالات سے عبرت حاصل کرتے ہوئے اپنی ترقی کے زمانے میں تین مفاسد سے بچیں (١) عبادت میں سستی نہ ہو (٢) دنیوی اموال کی طرف حد سے زیادہ رغبت نہ ہو۔(٣) عیش و عشرت کو اختیار نہ کریں۔

پھر فرمایا اس وقت مسلمانوں اور ان کے اہل کتاب بھائیوں کی مثال ایک دولتمند اور غریب بھائی کی طرح ہو گی۔ایک بھائی تو دولت پر غرور کرے گا اور دوسرا خدا کی طرف توجہ کرے گا۔آخر تکبر کا سر نیچا ہوگا اور بغیر انسانی ذرائع کے ایسے سامان پیدا ہوں گے کہ دولتمند کی قوت زائل ہو جائے گی۔

پھر ان تفصیلات کو بیان کیا۔جو ان تغیرات کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلے سے بتا دی گئی تھیں اور اس سلسلہ میں یہ بتایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس اسراء میں یہ بتا دیا گیا تھا کہ ان کے سلسلہ کی ترقی ایک اور شخص کی ترقی کے بالمقابل بہت کم اور ادنیٰ ہوگی۔اور وہ آنے والا ان تمام امور کی تکمیل کرے گا جن کو موسیٰ نہ کر سکیں گے۔پس اسراء کی تعبیر کے مطابق مسیحی قوم کے زوال کے وقت اسلام کو فتح ہوگی۔اور پھر اس فتح کے بعد کے حالات بیان فرماتا ہے کہ آخر ایک وقت مسلمان بھی دین کو بھول جائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو سزا دینے کے لئے پھر مسیحیوں کو ترقی دے گا۔اور یہ ان اقوام کے ذریعہ سے ہوگا۔جن کو کچھ زمانہ پہلے جنوبی اور مشرقی علاقوں کی طرف بڑھنے سے روک دیا گیا تھا۔اس وقت دنیا پر سخت تباہی آئے گی۔اور سب اقوام دو بڑی نسلوں یا دو بڑے اصولوں کے تابع ہو جائیں گی۔اور ظلم بڑھ جائے گا۔اس وقت اللہ تعالیٰ پھر ایسے سامان پیدا کرے گا۔کہ اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک دیا جائے گا۔اور اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ اس سیلاب کو روکنے میں پھر اس قوم کا حصہ ہوگا۔جس نے ایک دفعہ پہلے یاجوج ماجوج کے سیاسی زور کو توڑا تھا۔

سورۃ کہف سورۃ اسراء کا تتمہ ہے غرض یہ سورۃ سورہ اسراء کا تتمہ ہے اور اس کے واقعات بے جوڑ نہیں

ہیں جیسا کہ بعض مفسرین نے سمجھا ہے بلکہ یہ سورۃ نہایت اعلیٰ ترتیب پر مشتمل ہے اور پہلی سورتوں سے اس کا گہرا تعلق ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۱﴾

میں اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر (شروع کرتا ہوں) جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡ

کامل تعریف اللہ (تعالیٰ) کے لئے (ہی) ہے جس نے یہ کتاب اپنے (اس) بندہ پر اتاری ہے اور اس میں کوئی کجی

لَّہٗ عِوَجًا ؕ﴿۲﴾ سکتۃ قَیِّمًا لِّیُنۡذِرَ بَاۡسًا شَدِیۡدًا مِّنۡ لَّدُنۡہُ وَ

نہیں رکھی (اور اس نے اسے) اس حال میں (اتارا ہے) کہ وہ سچی ہے اور صحیح راہنمائی کرنے والی ہے تاکہ وہ

یُبَشِّرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ

(لوگوں کو) اس کی (یعنی اللہ تعالیٰ کی) طرف سے (آنے والے) ایک سخت عذاب سے آگاہ کرے اور ایمان

اَنَّ لَہُمۡ اَجۡرًا حَسَنًا ۙ﴿۳﴾ مَّاکِثِیۡنَ

لانے والوں کو جو نیک (اور مناسب حال) کام کرتے ہیں بشارت دے کہ ان کے لئے (خدا تعالیٰ کی طرف

فِیۡہِ اَبَدًا ۙ﴿۴﴾

سے) اچھا اجر (مقدر) ہے وہ اس (اجر کے مقام) میں ہمیشہ رہیں گے۔

حلّ لُغات۔ العَبۡدُ اَلۡعَبۡدُ کے لئے دیکھو سورۃ بنی اسرائیل آیت نمبر ۲۔

عِوَجًا اَلۡعِوَجُ ۔عَوِجَ (یَعۡوَجُ عَوَجًا) سے اسم ہے اور اس کے معنے ہیں ٹیڑھا ہونا۔کجی۔جسموں کے ٹیڑھا ہونے کے لئے عَوَجٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔معانی وصفات کی کجی اور نادرستی کے لئے عِوَجٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔(اقرب) مزید تشریح کے لئے دیکھو ہود آیت نمبر ۲۰۔

عِوَجُ الطَّرِيْقِ :زَيْغُهٗ۔راستے کا ٹیڑھا پن۔عِوَجُ الدِّيْنِ وَالْخُلُقِ:فَسَادُهٗ۔دین اوراخلاق کی خرابی۔(تاج)

اَلْعِوَجُ اِسْمٌ لِضِدِّ الْاِسْتِقَامَةِ ٹیڑھا ہونا۔اَلْاِنْحِنَاءُ کجی۔وَالْعَوَجُ بِالْفَتْحِ فِي الْأَجْسَادِ وَالْعِوَجُ بِالْكَسْرِ فِي الْمَعَانِي جس طرح جسموں کے ٹیڑھا ہونے کے لئے عِوج کا لفظ ہوتا ہے اسی طرح معانی وصفات کی کجی اور نادرستی کے لئے عَوج کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔(اقرب)

قَيِّمًا قَيِّمُ الْاَمْرِ کے معنے ہیں مُقِيْمُهٗ کسی کام کو سنبھالنے والا۔وَاَمْرٌ قَيِّمٌ: مُسْتَقِيْمٌ۔درست امر۔ وَخُلُقٌ قَيِّمٌ۔اچھے اخلاق۔وَدِيْنٌ قَيِّمٌ: مُسْتَقِيْمٌ لَا زَيْغَ فِيْهِ۔ایسا درست مذہب جس میں کوئی کجی نہ ہو۔ وَكُتُبٌ قَيِّمَةٌ : مُسْتَقِيْمَةٌ۔تُبَيِّنُ الْحَقَّ مِنَ الْبَاطِلِ صحیح کتب جو حق کو باطل سے واضح اور جدا کر دیں۔ اَلْقَيِّمُ:السَّيِّدُ وَسَائِسُ الْاَمْرِ۔سردار اور کسی کام کا متولی(تاج)دِيْنًا قَيِّمًا کے معنے ہیں ثَابِتًا مُقَوِّمًا لِاُمُوْرِ مَعَاشِهِمْ وَمَعَادِهِمْ۔دائم رہنے والا۔اور دنیا اُخرت کے امور کو درست کرنے والا دین۔(مفردات)

لینذر لِيُنْذِرَ اَنْذَرَ سے مضارع کا صیغہ ہے اَنْذَرَهٗ کے معنے ہیں کسی امر کی حقیقت سے اسے آگاہ کیا۔ (۲)اس امر کے نتائج ظاہر ہونے سے پہلے اسے ہوشیار کر دیا(۳)خبر دیتے ہوئے اچھی طرح ہوشیار کرنے کو بھی اِنْذَارٌ کہتے ہیں۔(اقرب)تفصیل کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۳۔

اس کی مصدر اِنْذَارٌ ہے اور الفاظ نَذْرٌ، نُذْرٌ، نُذُرٌ اور نَذِيْرٌ بھی اس معنی میں آتے ہیں۔کہتے ہیں اَنْذَرَهٗ بِالْاَمْرِ : اَعْلَمَهٗ وَحَذَّرَهٗ مِنْ عَوَاقِبِهٖ قَبْلَ حُلُوْلِهٖ یعنی کسی امر کی حقیقت سے اسے آگاہ کیا۔اوراس امر کے نتائج کے ظاہر ہونے سے پہلے اسے ہوشیار کر دیا اور کہتے ہیں اَنْذَرَهٗ:خَوَّفَهٗ فِي اِبْلَاغِهٖ يُقَالُ اَنْذَرْتُ الْقَوْمَ سَيْرَ الْعَدُوِّ اِلَيْهِمْ فَنَذِرُوْا یعنی اَنْذَرَهٗ کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ خبر پہنچاتے ہوئے خوب ہوشیار کیا چنانچہ جب کہتے ہیں اَنْذَرْتُ الْقَوْمَ سَيْرَ الْعَدُوِّ تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ میں نے قوم کو دشمن کی پیش قدمی سے خوب ہوشیار کیا۔اوراس کا فعل لازم یا مطاوع نذر ہے جس کے معنی ہیں وہ ہوشیار ہو گیا۔(اقرب)

البأس اَلْبَأْسُ کے معنے ہیں اَلْعَذَابُ۔عذاب۔وَالْبَأْسُ:اَلشِّدَّةُ فِي الْحَرْبِ۔گھمسان کی جنگ۔ وَقَالَ ابْنُ سِيْدَهٗ اَلْبَأْسُ:اَلْحَرْبُ ثُمَّ كَثُرَ حَتّٰى قِيْلَ لَا بَأْسَ عَلَيْكَ اَيْ لَا خَوْفَ۔ابن سیدہ نے کہا ہے کہ بأس کے اصل معنے تو لڑائی کے ہیں لیکن اس کا استعمال اس کے علاوہ دوسرے معنوں میں بھی بکثرت ہوتا ہے۔

چنانچہ لَا بَأْسَ عَلَيْكَ بول کر یہ معنے مراد لیتے ہیں کہ لَا خَوْفَ عَلَيْكَ یعنی کوئی خوف نہیں۔(تاج)

یُبَشِّرُ یُبَشِّرُ بَشَّرَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور بَشَّرَ کے لئے دیکھیں نحل آیت نمبر ۵۹۔

اجر اَجْرٌ کے لئے دیکھو سورۃ یوسف آیت نمبر ۵۷۔

اَلْاَجْرُ: اَلثَّوَابُ۔ اجر کے معنے ہیں ثواب بدلہ (اقرب) اَلْاَجْرُ: وَالْاُجْرَةُ مَا يَعُوْدُ مِنْ ثَوَابِ الْعَمَلِ دُنْيَوِيًّا كَانَ اَوْ اُخْرَوِيًّا۔ دنیوی یا اخروی کام کے بدلہ میں جو کچھ ملے اس کو اجر اور اجرت کہتے ہیں جیسے قرآن کریم میں ہے اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ اور اٰتَيْنَاهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا۔(مفردات)

مَاکثین مَاكِثِيْنَ مَكَثَ سے اسم فاعل مَاكِثٌ آتا ہے اور مَاكِثُوْنَ اس کی جمع ہے۔ مَكَثَ بِالْمَكَانِ (يَمْكُثُ مَكْثًا) کے معنے ہیں لَبِثَ وَاَقَامَ کسی جگہ ٹھہرا۔(اقرب)

اَبَدًا اَلْاَبَدُ کے معنے ہیں اَلدَّهْرُ لمبا زمانہ۔ اَلدَّائِمُ۔ ہمیشہ رہنے والا۔ اَلْقَدِيْمُ۔ قدیم۔ اَلْاَزَلِيُّ۔ ازلی (اقرب) اَلْاَبَدُ عِبَارَةٌ عَنْ مُدَّةِ الزَّمَانِ۔ اَلْمُمْتَدِّ الَّذِيْ لَا يَتَجَزَّءُ غیر معین زمانہ۔(مفردات)

تفسیر ۔ قَيِّمًا......الخ وہ بطور داروغہ کے ہے (۱) پچھلی کتابوں پر تا کہ ان کی غلطیوں کو دور کرے (۲) نیز داروغہ ہے آئندہ زمانے کے لوگوں پر کیونکہ انہیں ان اعمال کی اطلاع دیتی ہے جو انہیں کرنے چاہئیں یہی وجہ ہے کہ قیماً کا حال نہیں بیان کیا۔ تا کہ دونوں زمانوں کے متعلق حکم سمجھا جائے۔

اس کتاب کا پہلا کام لغت میں قَيِّمُ الْاَمْرِ کے معنے متولی کے لکھے ہیں یعنی قیّم الامر وہ ہے جس کے سپرد نگرانی اور تربیت ہو۔ ان معنوں کے رو سے آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ یہ کتاب آنے والے لوگوں کے لئے مربی ہے اور پہلوں کے لئے نگران۔

لِيُنْذِرَ بَأْسًا شَدِيْدًا کا مطلب لِيُنْذِرَ بَأْسًا شَدِيْدًا عربی زبان میں بُؤس کے معنے تنگی اور فقر کے ہوتے ہیں اور بأس کے معنے بہادری اور طاقت کے یا خوف۔ عذاب اور جنگ کے ہوتے ہیں۔ اس جگہ خوف اور عذاب کے معنے ہیں۔

وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا۔ اس آیت میں مومنوں سے اجرِ حسن کا وعدہ کیا گیا ہے اجر حسن سے مراد صرف یہ نہیں کہ انہیں انعامات ملیں گے کیونکہ یہ معنے خالی اجر سے بھی نکل آتے ہیں۔ چنانچہ کئی جگہ قرآن کریم میں صرف اجر کا لفظ مومنوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اس سورۃ میں آگے چل کر فرماتا ہے اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا (الکھف: ۳۱)۔ ہم نیکوں کے اجر کو ضائع نہیں کریں گے یہاں موقعہ

کے لحاظ سے اجر کے معنے اچھے اجر کے ہیں اسی طرح اس آیت میں بھی خالی اجر کا لفظ استعمال کیا جاتا تو اس کے معنی موقعہ کے مطابق اچھے اجر کے ہی ہوتے۔ پس اَجْرًا حَسَنًا کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ اجر نیک نتیجہ پیدا کرنے والا ہوگا۔ اس کے ملنے سے مومن بگڑیں گے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اچھے طور پر استعمال کر کے مزید ثواب اپنے لئے جمع کریں گے۔

مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے یعنی ان کا وہ اجر کبھی ختم نہ ہوگا۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ کسی صورت میں بھی ختم نہ ہوگا بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ مومن رہیں گے اجر ملتا رہے گا۔ یہ معنے اس صورت میں ہیں کہ اس آیت کو ان انعامات کے متعلق سمجھا جائے جو مومنوں کو دنیا میں ملنے والے ہیں لیکن اگر اخروی انعامات لئے جائیں تو پھر یہی معنے ہوں گے کہ وہ ہمیشہ اس اجر سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے کبھی بھی ان کا اجر ختم نہ ہوگا اس آیت میں اشارہ کیا ہے کہ اگر دائمی فضل چاہتے ہو تو ایمان کو کبھی ہاتھ سے نہ دینا۔

وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ﴿۵﴾

اور (نیز اس نے اس لئے اسے اتارا ہے کہ) تا وہ ان لوگوں کو آگاہ کرے جو کہتے ہیں (کہ) اللہ (تعالیٰ) نے

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ

(فلاں شخص کو) بیٹا بنالیا ہے۔ انہیں اس بارہ میں کچھ بھی تو علم (حاصل) نہیں اور نہ ان کے بڑوں کو (اس بارہ میں

كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ

کوئی علم) تھا۔ یہ بہت بڑی (خطرناک) بات ہے۔ جو ان کے مونہوں سے نکل رہی ہے (بلکہ)

يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ﴿۶﴾

وہ محض جھوٹ بول رہے ہیں۔

حلّ لُغَات۔ اَلْوَلَدُ وَلَدٌ کے اصل معنے اولاد کے ہیں۔ خواہ نر ہو یا مادہ۔ لیکن چونکہ اس جگہ بیٹا مراد ہے۔ ترجمہ میں بیٹے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ (اقرب)

اَلْكَلِمَةُ اَلْكَلِمَةُ کے معنے ہیں لفظ یا جو کچھ بولیں خواہ مفرد ہو یا مرکب۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو یونس

آیت نمبر ۴ تا ۷ و ۹۔

اَلْکَلِمَۃُ اللَّفْظُ لفظ کُلُّ مَا یَنْطِقُ بِہِ الْاِنْسَانُ مُفْرَدًا کَانَ اَوْمُرَکَّبًا جو کچھ بولا جائے خواہ مفرد ہو یا مرکب (اقرب) اَللَّفْظَۃُ منہ سے بولا ہوا مفرد لفظ۔ ہر وہ بات جو انسان بولے۔ خواہ مفرد ہو۔ خواہ مرکب۔ وَالْعَشْرُ کَلِمَاتٍ وَصَایَا اللّٰہِ الْعَشْرُ۔ عشر کلمات اللہ تعالیٰ کے دس حکموں کو کہتے ہیں۔ اَلْخُطْبَۃُ وَالْقَصِیْدَۃُ۔ کبھی خطبہ اور قصیدہ کو بھی کلمہ کہتے ہیں۔ (اقرب)

الکذب اَلْکَذِبُ کَذَبَ کا مصدر ہے۔ اور کَذَبَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں۔ اَخْبَرَ عَنِ الشَّیْءِ بِخِلَافِ مَاھُوَمَعَ الْعِلْمِ بِہٖ ضِدُّ صِدَقَ۔ کسی چیز کے متعلق باوجود علم کے خلاف واقعہ خبر دینا کذب کہلاتا ہے اور یہ لفظ صدق کے مخالف معنوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ وَسَوَاءٌ فِیْہِ الْعَمْدُ وَالْخَطَأُ اور اس صورت میں جان بوجھ کر خلاف حقیقت بات کہنا یا غلطی سے کہنا دونوں کذب میں شامل ہوتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس کتاب کا دوسرا کام دوسرا کام اس کتاب کا یہ ہے کہ ان لوگوں کو ڈراوے جنہوں نے کہا ہے کہ خدا نے بیٹا بنالیا ہے (العیاذ باللہ)

عجیب بات ہے کہ پہلے کتاب کا کام انذار بتایا پھر مومنوں کو بشارت دینا اس کا کام بتایا۔ اس کے بعد پھر انذار کا ذکر کیا۔ اور یہ انذار خاص اس قوم کے متعلق بتایا جو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بناتے ہیں۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں انذار کا ذکر اکٹھا نہ رکھا اور بشارت کا ذکر بعد میں نہ رکھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس ترتیب سے قرآن کریم نے ان زمانوں کا بھی اظہار کر دیا ہے جن میں قرآن کریم کا انذار تبشیر اور پھر دوسرا انذار ظاہر ہوگا۔ پہلے انذار سے مکے والوں اور دوسری تمام ان اقوام کا انذار مراد ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسلام کی مخالف تھیں۔ چنانچہ قرآن کریم کے اس انذار کے نتیجے میں وہ اقوام تباہ کی گئیں۔ اس کے بعد مومنوں کی بشارت کا ذکر کیا چنانچہ مخالفین اسلام کی تباہی کے بعد مسلمانوں کو انعام ملے۔

مَا کِثِیْنَ فِیْہِ اَبَدًا کے ماتحت مسلمانوں کی حکومت اور مَا کِثِیْنَ فِیْہِ اَبَدًا کے حکم کے ماتحت مسلمانوں نے صدیوں تک دنیا میں حکومت کی۔ اس کے بعد صرف مسیحی قوم کے انذار کا ذکر کیا۔ جس سے اس طرف اشارہ ہے کہ اسلامی ترقی کے بعد پھر مسیحیت زور پکڑے گی اور دنیا پر اس طرح چھا جائے گی کہ گویا وہی ایک قوم اسلام کے مخالف رہ جائے گی اس وقت قرآن کا انذار خصوصیت سے مسیحی اقوام کے لئے ہوگا اگر اس طرح انذار کو دو ٹکڑوں میں تقسیم نہ کیا جاتا اور مسلمانوں کے انعامات کو درمیان میں بیان نہ کیا جاتا تو یہ لطیف معنے جو عذاب کے

اوقات اور آئندہ زمانے کے سیاسی تغیرات کو بھی ظاہر کر رہے ہیں پیدا نہ ہو سکتے تھے۔

کَبُرَتْ کَلِمَۃً وہ بڑی بات ہے جوان کے منہ سے نکلتی ہے یہ کلمہ تمیز واقعہ ہوا ہے یعنی کَبُرَت ھِیَ کلمۃً۔ یعنی یہ بات کہنے کے لحاظ سے بہت ہی بڑی ہے یا دوسرے لفظوں میں اس بات کا تو منہ پر لانا بھی بڑا اخطرناک ہے اور نیز خلاف عقل ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ نہایت گستاخی کا عقیدہ ہونے کے علاوہ اس عقیدے کو تو انسانی عقل بھی رد کرتی ہے یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک انسان پھانسی پر چڑھایا جائے اور پھر وہ خدا کا بیٹا کہلائے۔

انذار کی خبر دیتے ہوئے مسیحیت پر کاری ضرب انذار کی خبر دیتے ہوئے مسیحیت پر ایک کاری ضرب بھی لگا دی فرماتا ہے کہ بیٹا تو خدا کا بناتے ہیں لیکن بیٹا بنانے کی کوئی دلیل ان کے پاس موجود نہیں نہ ان کے باپ دادوں کے پاس تھی۔ یعنی باپ دادوں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ مسیح کے حواری اور ان کے شاگرد موحد تھے شرک بعد میں پیدا ہوا ہے اسے خدا کا بیٹا بنا دیا اور ان کے پاس اعلیٰ توحید کی تعلیم اسلام نے پیش کر دی ہے اور مشرکانہ خیالات کا پوری طرح قلع قمع کر دیا ہے مگر نہ پہلوں نے اپنی آنکھوں دیکھی باتوں سے فائدہ اٹھایا۔ اور نہ بعد میں آنے والوں نے اسلام کے دلائل سے نفع حاصل کیا۔ دونوں گروہوں نے بغیر دلیل اور بغیر ثبوت کے اپنے رب کو چھوڑ کر ایک انسان کو خدا بنالیا۔

اِلَّا کَذِبًا کہہ کر بتایا کہ خود مسیح بھی اس قسم کی ابنیّت سے منکر ہے چنانچہ موجودہ اناجیل سے بھی مسیح کے خدا کا بیٹا ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا بیشک مسیح علیہ السلام کی نسبت بیٹے کے الفاظ آتے ہیں۔ لیکن یہ الفاظ دوسرے انسانوں کے لئے بھی آتے ہیں چنانچہ خروج باب ۴ آیت ۲۲ میں لکھا ہے۔ کہ ’’خداوند نے یوں فرمایا ہے کہ اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پلوٹھا بیٹا ہے‘‘۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا

تو کیا اگر وہ اس عظیم الشان کلام پر ایمان نہ لائیں تو

بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝۷

تُو ان کے پیچھے شدت غم سے اپنی جان کو ہلاکت میں ڈال دے گا۔

حلّ لُغات۔ لَعَلَّ لَعَلَّ کے لئے دیکھو سورہ ہود آیت نمبر ۱۳۔

لَعَلَّ طَمَعٌ وَاِشْفَاقٌ کہ لَعَلَّ طمع اور خوف ہر دو کے لئے آتا ہے۔ وَلَعَلَّ وَاِنْ کَانَ طَمَعًا فَاِنَّ ذٰلِكَ يَقْتَضِىْ فِىْ كَلَامِهِمْ۔ تَارَةً طَمَعَ الْمُخَاطَبِ وَتَارَةً طَمَعَ الْمُخَاطِبِ وَتَارَةً طَمَعَ غَيْرِهِمَا فَقَوْلُه تَعَالٰى فِيْمَا ذَكَرَ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ فَذٰلِكَ طَمَعٌ مِنْهُمْ وَقَوْلُهُ فِىْ فِرْعَوْنَ لَعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى فَاِطْمَاعٌ لِمُوْسٰى مَعَ هَارُوْنَ وَمَعْنَاهُ فَقُوْلَا لَهُ قَوْلًا لَيِّنًا رَاجِيَيْنِ اَنْ يَّتَذَكَّرَ اَوْ يَخْشٰى وَقَوْلُهُ تَعَالٰى فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ اَىْ يَظُنُّ بِكَ النَّاسُ ذٰلِكَ۔ اور جب یہ لفظ طمع کے معنوں میں ہو تو عربی زبان کے محاورہ میں اس کے کئی مفہوم ہوتے ہیں۔ کبھی اس سے مخاطب کے دل کی طمع کا اظہار یا اس کے دل میں طمع کا پیدا کرنا مراد ہوتا ہے۔ کبھی مخاطب یعنی بولنے والے کی طرف سے طمع مراد ہوتی ہے۔ اور کبھی ان دونوں کے سوا دوسروں کی طمع کا ذکر ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں جو فرعون کی قوم کا قول آتا ہے کہ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ۔ اس میں فرعون کی قوم نے اپنی طمع کا اظہار کیا ہے کہ کیا اچھا ہو کہ یہ جیت جائیں۔ اور ہم ان کی اتباع کریں اور جو خدا تعالیٰ کا یہ قول فرعون کے بارہ میں آتا ہے کہ لَعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى۔ اس میں موسیٰ اور ہارون کو جو مخاطب ہیں اللہ تعالیٰ نے طمع دلائی ہے کہ شاید فرعون ہدایت پا جائے۔ اور یہ جو آیت ہے لَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ۔ اس میں دوسروں کی طمع کا ذکر ہے کہ دوسرے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید تو ان کے اعتراضوں سے ڈر کر خدا کے کلام کے بعض حصوں کو چھپا دے۔ (مفردات)

بَاخِعٌ بَاخِعٌ بَخَعَ سے اسم فاعل ہے۔ اور بَخَعَ نَفْسَهٗ کے معنے ہیں قَتَلَهَا مِنْ وَجْدٍ اَوْ غَيْظٍ کہ اپنے نفس کو غم یا غصہ سے ہلاک کر دیا (اقرب) نیز تاج العروس میں ہے بَخَعَ نَفْسَهٗ: قَتَلَهَا غَمًّا۔ اپنے نفس کو غم کی وجہ سے ہلاک کر دیا۔ بَخَعَ لَهٗ بِالْحَقِّ بُخُوْعًا: اَقَرَّ بِهٖ وَخَضَعَ لَهٗ۔ صداقت کا اقرار کیا اور اس کے لئے سر تسلیم خم کیا۔ بَخَعَ لَهٗ نُصْحَهٗ اَىْ اَخْلَصَهٗ وَ بَالَغَ۔ اس کے لئے اپنی نصیحت کو خالص کیا اور نصیحت میں کوئی کمی نہ رہنے دی اور فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ کے معنی ہیں مُهْلِكُهَا مُبَالِغًا فِيْهَا حِرْصًا عَلٰى اِسْلَامِهِمْ۔ کہ شائد تو اپنے نفس کو ان کے اسلام میں داخل ہونے کی شدید خواہش سے ہلاکت میں ڈال دے گا۔ (تاج)

اٰثَار اٰثَارٌ اَثَرٌ کی جمع ہے۔ اور اَلْاَثَرُ کے معنے ہیں۔ مَا بَقِىَ مِنْ رَسْمِ الشَّىْءِ۔ کسی چیز کا باقی ماندہ نشان۔

اَسَفًا اَسَفًا اَسِفَ سے مصدر ہے اور اَسِفَ عَلَيْهِ کے معنے ہیں: حَزِنَ اَشَدَّ الْحُزْنِ وَتَلَهَّفَ۔ وہ سخت رنجیدہ اور غمزدہ ہوا۔ (اقرب)

تفسیر ۔ **مسیحیت کی ترقی کے بعد زوال کی پیشگوئی** اس آیت میں بتایا ہے کہ جس طرح یہود کی تباہی کی خبر پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں درد اٹھا تھا (نحل ع ۱٦)

اسی طرح اس قوم کی تباہی کی خبر پر بھی آپ کو سخت صدمہ ہوگا۔ پس اللہ تعالیٰ صدمہ پہنچنے سے پہلے ہی آپ سے اظہار ہمدردی فرماتا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتا ہے کہ اب اس خبر کو سن کر بھی تیرے دل کو ایسا صدمہ ہوگا کہ گویا تو اپنی جان کو ہلاک کرنے لگا ہے لیکن تو صبر سے کام لے کہ یہ تیرے رب کی مشیت ہے۔ دیکھ لو اس جگہ دوسرے مشرکین کا کوئی ذکر نہیں صرف عیسائیوں کا ذکر ہے

مسیحی قوم کی تباہی پر آنحضرتؐ کو غم پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جس غم کی اس آیت میں خبر دی گئی ہے وہ عیسائیوں کی تباہی پر ہی ہوسکتا تھا۔ لیکن کیسے افسوس کی بات ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اس عذاب پر جو مسیحیوں پر تیرہ سو سال بعد آنا تھا ایسا غم محسوس کرتے ہیں کہ گویا اپنی جان کو ہلاک کر دیتے ہیں مگر مسیحیوں کے بعض مصنف اپنے محسن کو رات دن گالیاں نکالتے رہتے ہیں۔

بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ قرآن کریم تو اپنی صداقت کی آپ ہی دلیل ہے اور مسیحی اقوام کو جو مشکلات پیش آنے والی ہیں ان کا حل اس میں موجود ہے۔ پس تجھے اس کا سخت صدمہ ہوگا کہ اس علاج کی موجودگی کے باوجود یہ قوم جو دنیوی شان و شوکت میں خاص طور پر ترقی کر چکی ہوگی اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے گی اور اس کا انکار کر کے تباہ ہو جائے گی۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ

جو کچھ (روئے) زمین پر (موجود) ہے اسے یقیناً ہم نے اس کی زینت (کا موجب) بنایا ہے۔ تا کہ ہم ان کا

اَحْسَنُ عَمَلًا ﴿۸﴾

امتحان لیں (کہ) ان میں سے سب سے اچھے کام کرنے والا کون ہے۔

تفسیر ۔ فرماتا ہے ہم نے دنیا میں ہزاروں چیزیں پیدا کی ہیں اور غرض یہ ہے کہ انسان کے لئے ایک شغل پیدا کریں تا وہ ان اشیاء کو دریافت کرلے پھر ان سے کام لے اور زِيْنَةً کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ دنیا کی ہر چیز کوئی نہ کوئی فائدہ رکھتی ہے۔ کوئی بھی ایسی چیز نہیں جس میں کوئی فائدہ نہ ہو۔ اسی ایک لفظ سے کس طرح اس نکتہ کو

واضح کردیا گیا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز لغو نہیں اگر بَعْضَهَا زِيْنَةً ہوتا تو یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ بعض اشیاء مفید ہیں اور بعض غیر مفید۔ مگر اللہ تعالیٰ سب اشیاء کو جو دنیا پر ہیں دنیا کے لئے زینت کا موجب قرار دیتا ہے پس معلوم ہوا کہ اسلام کے نزدیک دنیا کی ہر شے میں فوائد ہیں اور وہ ایک حسن یعنی خوبی اپنے اندر رکھتی ہے۔ اور کوئی چیز بھی نہیں کہ جو دنیا کا حسن بڑھانے والی نہ ہو۔ افسوس کہ اس حکم سے مسلمانوں نے فائدہ اٹھانا چھوڑ دیا اور تحقیق اور ایجاد کے کام کو نظر انداز کر دیا۔ اور یورپ والوں نے باوجود قرآن کریم کو نہ ماننے کے اس حکم پر عمل کیا اور علوم میں اس قدر ترقی کہ ساری دنیا پر غالب آ گئے۔

لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ الخ سے دنیا کی اشیاء کی تحقیقات کرنے کی طرف اشارہ

لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دنیا کی اشیاء اس لئے پیدا کی گئی ہیں تا کہ لوگ ان کے متعلق تحقیق کریں دنیا کی حالت کو سدھاریں۔ اس حصے کے متعلق مسیحیوں سے کوتاہی ہوئی ہے انہوں نے دنیا کے راز تو دریافت کئے مگر اچھے عمل کا نمونہ نہ دکھایا یعنی اس تحقیق اور تدقیق کے نتیجہ میں انہوں نے دنیا میں ظلم اور فساد کی بنیاد رکھ دی اور غالباً اس طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

وَ اِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۟ؕ۹

اور جو کچھ اس (زمین) پر (موجود) ہے اسے ہم یقیناً (ایک دن مٹا کر) ویران سطح بنا دیں گے۔

حلّ لُغَات۔ صَعِيْدًا صَعِيْدٌ کے معنے ہیں۔ اَلتُّرَابُ۔ مٹی۔ وَقِيْلَ وَجْهُ الْاَرْضِ تُرَابًا كَانَ اَمْ غَيْرُهُ۔ زمین کی سطح خواہ مٹی کی ہو یا کسی اور چیز کی۔ اَلْمُرْتَفِعُ مِنَ الْاَرْضِ۔ بلند زمین۔ وَقِيْلَ هُوَ مَا لَمْ يُخَالِطْهُ رَمْلٌ وَلَا سَبَخَةٌ اور بعض نے صعید اس مٹی کو قرار دیا ہے جس میں ریت اور کلّر نہ ہو۔ اَلطَّرِيْقُ۔ رستہ۔ اَلْقَبْرُ۔ قبر (اقرب)۔ کہتے ہیں صَارَتِ الْحَدِيْقَةُ صَعِيْدًا۔ باغ چٹیل میدان ہو گیا یعنی اس میں کھیتی نہ رہی۔

جُرُزًا جَرَزَهٗ (يَجْرُزُ) کے معنے ہیں قَطَعَهٗ اسے کاٹا۔ جَرَزَ الزَّمَانُ زَيْدًا: اِجْتَاحَهٗ۔ زمانے نے اس کو تباہ کر دیا۔ اَرْضٌ جَرْزٌ و جُرُزٌ کے معنی ہیں اَلَّتِيْ لَا تَنْبُتُ اَوْ اُكِلَ نَبَاتُهَا اَوْ قُطِعَ وہ زمین جس میں کوئی چیز نہ اُگے یا اس کی نباتات کاٹ کر استعمال کر لی گئی ہو۔ اور پھر وہ چٹیل رہ جائے۔ (اقرب) نیز صَعِيْدًا جُرُزًا کے معنے ہیں اَيْ مُنْقَطِعُ النَّبَاتِ۔ چٹیل میدان جس میں کوئی سبزی نہ ہو۔ (مفردات)

تفسیر ۔فرمایا وہ دنیا کا سامان تو ایک عارضی چیز اور عارضی سامان ہے ۔حقیقی نہیں ۔صرف قومی مقابلہ کا ایک ذریعہ خدا تعالیٰ نے بنایا ہے تا بنی نوع انسان کی خدمت کر کے ثواب حاصل کریں ۔لیکن مسیحی لوگ اس غرض کو پوری نہ کریں گے خدا کے پیدا کئے ہوئے سامانوں کی جستجو تو کریں گے لیکن ان کو حسن عمل کا ذریعہ نہ بنائیں گے اور لڑائی جھگڑے کا ذریعہ بنالیں گے ۔پس چونکہ ہمارا مقصد تو ان اشیاء کے پیدا کرنے سے دنیا کو زینت دینا ہے چونکہ وہ مقصد ان کی تحقیقاتوں اور ایجادوں سے پورا نہ ہوگا ۔ہم ان کے کام کو مٹادیں گے غرض اس جگہ سب دنیا کی تباہی مراد نہیں بلکہ ان کاموں کی تباہی مراد ہے جو اللہ کا بیٹا بنانے والی قوم کرے گی ۔

اس آیت کے الفاظ میں نہایت لطیف طور پر ایک تمثیل کی طرف جو اس سورۃ میں آگے چل کر بیان ہوئی ہے اشارہ فرمایا گیا ہے اور وہ اشارہ صَعِيْدًا جُرُزًا کے الفاظ میں ہے ۔

صعید کے معنے اس زمین کے ہوتے ہیں جس میں سے درخت وغیرہ کٹ جائیں ۔چنانچہ عرب کا محاورہ ہے صَارَتِ الْحَدِيْقَةُ صَعِيْدًا باغ اُجڑ گیا اس کے درخت فنا ہو گئے ۔اور جرز کے معنے بھی اس زمین کے ہوتے ہیں جس کی سبزی تباہ ہو گئی ہو آگے چل کر جہاں دو باغوں کی تمثیل دی گئی ہے (کہف ع ۵) وہاں بھی متکبر باغوں والے کو اس کا ناصح بھائی کہتا ہے کہ تو تکبر نہ کر ایسا نہ ہو کہ آسمانی عذاب نازل ہو کر تیرے باغوں کو صعیدًا زَلَقًا بنادے ۔ صَعِيْدًا کا لفظ تو وہی ہے جو یہاں استعمال ہوا ہے ۔جُرُزًا کی جگہ وہاں زَلَقًا کا لفظ رکھا گیا ہے اور اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ جہاں کوئی کھیتی نہ ہو ۔عرب کہتے ہیں کہ اَرْضٌ زَلَقٌ ایسی زمین جس پر کوئی کھیتی نہ ہو ۔پس اس آیت سے اس طرف اشارہ ہے کہ آگے جو تمثیل بیان کی گئی ہے مسیحی قوم بھی اس میں شامل ہے اور اللہ تعالیٰ ان کے لگائے ہوئے باغوں کو تباہ کر دے گا ۔

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ

کیا تو سمجھتا ہے کہ کہف اور رقیم والے (لوگ) ہمارے نشانوں میں سے کوئی اچنبھا (نشان) تھے

اٰيٰتِنَا عَجَبًا ﴿۱۰﴾

(جن کی نظیر پھر کبھی نہ پائی جاسکتی ہو) ۔

حلّ لغات ۔الکھف اَلْكَهْفُ كَالْبَيْتِ الْمَنْقُوْرِ فِي الْجَبَلِ ۔گھر کی شکل پر پہاڑ میں کھود کر بنایا

ہوا مکان۔ اس کی جمع کُھُوْفٌ آتی ہے۔ غار اور کہف میں یہ فرق ہے کہ کہف وسیع ہوتی ہے اور غار تنگ۔ اَلْکَھْفُ اَیْضًا اَلْوَزَرُ۔ حفاظت کی جگہ۔ اَلْمَلْجَاءُ۔ پناہ کی جگہ۔ (اقرب)

رقیم رَقِیْمٌ رَقَمَ (یَرْقُمُ رَقْمًا) کے معنے ہیں کَتَبَهٗ۔ اس کو لکھا۔ رَقَمَ الْکِتَابَ۔ اَعْجَمَهٗ وَبَیَّنَهٗ۔ کسی کتاب یا خط کے الفاظ کو واضح طور پر لکھا۔ رَقَمَ الثَّوْبَ۔ خَطَّطَهٗ وَاَعْلَمَهٗ۔ اس پر لکیریں ڈالیں اور شاندار کیا۔ کسی چیز پر تصویر بنانا۔ لکھنا۔ نقش بنانا۔

اَلرَّقِیْمُ اَلْکِتَابُ۔ اَلْمَرْقُوْمُ۔ لکھی ہوئی چیز۔ اَصْحَابُ الرَّقِیْمِ کے معنے ہوں گے۔ نقش یا تصویریں بنانے والے لوگ۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ پتھر یا لوہے پر کھودنے والے لوگ (تفسیر ابن جریر و اقرب)۔ تو اس لحاظ سے یہ معنی ہوں گے پتھروں پر یا کاغذوں پر لکھنے والے یا نقش و نگار کرنے والے یا تصویریں بنانے والے یا کھودنے والے۔ رَقِیْمٌ بمعنے مَرْقُوْمٌ بھی ہوسکتا ہے اس لحاظ سے اصحاب الرقیم کے معنے ہوں گے جن کے پاس لکھی ہوئی چیزیں ہوں۔ یعنی کتابیں یا سامان جن پر نام لکھا ہوا ہو یا کتبوں والے وغیرہ وغیرہ۔

العجب اَلْعَجَبُ (۱) جب کوئی ایسا امر پیش آئے کہ اس کے ماننے میں طبیعت کو انقباض اور انکار ہو۔ تو اس انکار کی حالت کو عجب کہتے ہیں (۲) پیش آمدہ امر کے پسند کرنے کو بھی عجب کہتے ہیں (۳) اس حالت رعب کو بھی عجب کہتے ہیں جو انسان پر کسی چیز کو بہت ہی بڑا سمجھنے کے وقت طاری ہوتی ہے۔ (اقرب) تفصیل کے لئے دیکھو سورۂ یونس آیت نمبر ۳۔

اَلْعَجَبُ اِنْکَارُ مَا یَرِدُ عَلَیْكَ یعنے جب کوئی ایسا امر پیش آئے کہ اس کے ماننے میں طبیعت کو انقباض اور انکار ہو تو اس حالت انکار کو عجب کہتے ہیں۔ اِسْتِطْرَافُهٗ۔ پیش آمدہ امر کو پسند کرنے کو بھی عجب کہتے ہیں۔ رَوْعَةٌ تَعْتَرِی الْاِنْسَانَ عِنْدَ اِسْتِعْظَامِ الشَّیْءِ۔ یعنی اس حالت رعب کو بھی عجب کہتے ہیں جو انسان پر کسی چیز کو بہت ہی بڑا سمجھنے کے وقت طاری ہوتی ہے۔ وَمِنَ اللّٰہِ: اَلرِّضٰی اور جب اللہ کی طرف اس لفظ کو منسوب کیا جاوے تو اس کے معنی پسندیدگی کے ہوتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر ۔ کیا لطیفہ ہے بلکہ رونے کا مقام ہے کہ خدا تعالیٰ تو کہتا ہے کہ اصحاب کہف کوئی عجوبہ چیز نہ تھے بلکہ اور آیتوں کی طرح یہ بھی ایک آیت ہی تھے۔ مگر ہمارے مسلمان اس کو ایک عجوبہ بنا رہے ہیں (اصحاب کہف کی تفصیل کے لئے دیکھو اگلی آیات)

اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَاۤ

جب وہ (چند) نوجوان وسیع غار میں پناہ گزین ہوئے اور (دعا کرتے ہوئے) انہوں نے کہا (کہ) اے ہمارے

اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ

رب ہمیں اپنے حضور سے (خاص) رحمت عطا کر۔ اور ہمارے لئے ہمارے (اس) معاملہ میں

اَمْرِنَا رَشَدًا ⑪

درست روی کا سامان مہیا کر۔

حلّ لُغات۔ اَوٰى اَوَى اِلٰى مَنْزِلِهٖ وَمَنْزِلَهٗ کے معنے ہیں نَزَلَ بِهٖ لَيْلًا اَوْ نَهَارًا وہ اپنے مقام میں رات کو یا دن کو اترا۔ (اقرب)

اَلْفِتْيَةُ اَلْفِتْيَةُ اَلْفَتٰى کی جمع ہے اور اَلْفَتٰى کے معنے ہیں اَلشَّابُ الْحَدَثُ۔ نوجوان۔ اَلسَّخِيُّ الْكَرِيْمُ۔ فیاض اور سخی۔ (اقرب)

الرّحمة الرَّحْمَةُ رِقَّةُ الْقَلْبِ وَالْاِنْعِطَافِ يَقْتَضِي التَّفَضُّلَ وَالْاِحْسَانَ وَالْمَغْفِرَةَ۔ رقت قلب جو ترس احسان اور بخشش کی مقتضی ہوتی ہے۔ نیز رحمت کے معنے مغفرت کے بھی ہوتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ رشد کے معنی ہدایت کے ہیں مگر رَشد زیادہ تر دینی امور میں اور رُشد دینی اور دنیوی امور کی ہدایت کے لئے آتا ہے (اقرب)۔ پس دعا کا مطلب یہ ہوا کہ اے اللہ ہمارے لئے اس معاملہ میں آزادی اور کامیابی کا رستہ نکال۔

فَضَرَبْنَا عَلٰۤى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ⑫

جس پر ہم نے اس وسیع غار میں چند گنتی کے سالوں کے لئے انہیں (بیرونی حالات کے) سننے سے محروم کر دیا۔

حلّ لُغات۔ ضَرَبَ عَلٰى اُذُنِهٖ مَنَعَهٗ اَنْ يَسْمَعَ۔ اس کو سننے سے روک دیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ ضَرَبْنَا عَلٰۤى اٰذَانِهِمْ کے معنے ہیں ہم نے ان کو سننے سے روک دیا۔ یعنی کچھ سال تک ان کو کہف

میں رکھ کر باقی لوگوں کے حال سے ناواقف رکھا۔ ان کو معلوم نہ ہوتا تھا کہ زمانہ کا کیا حال ہے۔ (اصحاب کہف کون تھے اس کے لئے دیکھو اگلی آیت)

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا

پھر ہم نے انہیں اٹھایا تا کہ ہم جان لیں کہ جتنی مدت وہ (وہاں) ٹھہرے رہے تھے اسے دونوں گروہوں میں سے

اَمَدًا ﴿۱۳﴾ ع ۱/۱۳ ۱۳

زیادہ محفوظ رکھنے والا کون سا گروہ ہے۔

حلّ لُغَات۔ بَعَثْنَا بَعَثْنَا بَعَثَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور بَعَثَ کے لئے دیکھو حجر ۳۲۔

يُبْعَثُوْنَ بَعَثَ سے جمع مذکر غائب مجہول کا صیغہ ہے۔ اور بَعَثَهٗ (يَبْعَثُ بَعْثًا) کے معنے ہیں اَرْسَلَهٗ اس کو بھیجا۔ بَعَثَهٗ بَعْثًا: آثَارَهٗ وَهَيَّجَهٗ۔ اس کو اُٹھایا اور جوش دلایا۔ بَعَثَ اللّٰهُ الْمَوْتٰى: اَحْيَاهُمْ اللہ نے مردوں کو زندہ کیا۔ بَعَثَهٗ عَلَى الشَّيْءِ حَمَلَهٗ عَلٰى فِعْلِهٖ۔ اس کو کسی کام کے کرنے پر اُکسایا۔ اَلْبَعْثُ۔ اَلنَّشْرُ اُٹھانا۔ (اقرب)

الْحِزْبَيْنِ اَلْحِزْبَيْنِ اَلْحِزْبُ سے تثنیہ کا صیغہ ہے اور الحزب کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۳۶۔

اَلْحِزْبُ کے معنے ہیں اَلطَّائِفَةُ۔ گروہ۔ جَمَاعَةُ النَّاسِ لوگوں کی جماعت۔ جُنْدُ الرَّجُلِ وَاَصْحَابُهُ الَّذِيْنَ عَلٰى رَأْيِهٖ۔ ایسے دوست اور ساتھی جو ہم خیال اور ہم رائے ہو۔ اَلنَّصِيْبُ۔ حصہ۔ كُلُّ قَوْمٍ تَشَاكَلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاَعْمَالُهُمْ فَهُمْ اَحْزَابٌ وَاِنْ لَمْ يَلْقَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا۔ تمام وہ لوگ جن کے اعمال اور دل آپس میں مشابہ ہوں۔ اگرچہ وہ آپس میں ملے نہ ہوں۔ احزاب کہلاتے ہیں۔ (اقرب)

الامد اَلْاَمَدُ کے معنے ہیں اَلْغَايَةُ۔ آخری حد غایت وانتہاء (اقرب)۔ اَلْاَمَدُ وَالْاَبَدُ يَتَقَارَبَانِ لٰكِنِ الْاَبَدُ عِبَارَةٌ عَنْ مُدَّةِ الزَّمَانِ الَّتِيْ لَيْسَ لَهَا حَدٌّ مَحْدُوْدٌ وَلَا يَتَقَيَّدُ۔ وَالْاَمَدُ مُدَّةٌ لَهَا حَدٌّ مَجْهُوْلٌ۔ اَمد اور ابد تقریباً ایک جیسے ہی معنے رکھتے ہیں لیکن ابد اس زمانہ کو کہتے ہیں جو غیر محدود ہو۔ اور امد اس مدت کو کہتے ہیں جس کی انتہاء معلوم نہ ہو۔ وَالْفَرْقُ بَيْنَ الزَّمَانِ وَالْاَمَدِ أَنَّ الْاَمَدَ يُقَالُ بِاِعْتِبَارِ الْغَايَةِ وَالزَّمَانُ عَامٌّ فِي

الْمَبْدَاِ وَالْغَایَۃِ۔ وَلِذٰلِکَ قَالَ بَعْضُھُمُ الْمَدٰی وَالْاَمَدُ یَتَقَارَبَانِ۔ اور زمان اور امد کے لفظ کے درمیان یہ فرق ہے کہ امد کا لفظ انتہاء کا اعتبار کرتے ہوئے بولا جاتا ہے۔ اور زمانہ عام ہے۔ وہ مبداء پر بھی اور انتہاء پر بھی بولا جاتا ہے۔ اس فرق کے پیش نظر بعض نے مدی اور امد کو متقارب المعنی قرار دیا ہے۔ (مفردات)

تفسیر۔ اصحاب کہف کون تھے کہاں تھے؟ اصحاب کہف کون تھے؟ کہاں تھے اور ان کے حالات کیا ہیں؟ یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جو صدیوں سے مفسرین کے دلوں میں ہیجان پیدا کرتا چلا آیا ہے۔

میں اس سوال کو حل کرنے کے لئے سب سے پہلے بعض روایات بیان کرتا ہوں جو اصحاب کہف کے متعلق پرانے مفسروں نے بیان کی ہیں۔

اصحاب کہف کے حالات (۱) مشہور مؤرخ ابن اسحاق اور بعض دوسرے مصنفوں نے یہ لکھا ہے کہ جب مسیحیوں میں شرک پیدا ہو گیا۔ بتوں کی پوجا اور ان کے لئے قربانی شروع ہوگئی تو ان میں سے کچھ لوگوں کو جو موحد تھے یہ امر برا لگا۔ اس زمانہ میں دقیانوس نامی مسیحی بادشاہ تھا۔ بعض روایات میں اس کا نام دقیوس آیا ہے۔ یہ بادشاہ موحد نصاریٰ کو قتل کرتا تھا انہی ایام میں موحد نصاریٰ میں سے کچھ امراء نوجوانوں کو جو افیوس یا بعض روایات میں لکھا ہے کہ طرسوس کے رہنے والے تھے شاہی سپاہیوں نے پکڑ لیا اور بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ اس نے انہیں بتوں کو سجدہ نہ کرنے پر ڈانٹا۔ مگر وہ توحید پر قائم رہے۔ اس پر بادشاہ نے ان کو کچھ مہلت دی کہ اس عرصہ میں سوچ لو۔ انہوں نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور وہاں سے بھاگ کر ایک غار میں چھپ گئے جس کا نام مخلوس تھا۔ باقی تو عبادت میں مشغول ہو گئے اور اپنے میں سے ایک کو جس کا نام یملیخا تھا۔ سودا سلف لانے پر مقرر کر دیا۔ وہ بھیس بدل کر شہر میں جاتا اور سودا لے آتا۔ ایک دن اسے معلوم ہوا کہ بادشاہ جو باہر کسی مہم پر گیا ہوا تھا واپس آ گیا ہے اور اس نے ان نوجوانوں کو پھر طلب کیا ہے۔ وہ روتا ہوا آیا اور سب کو اس کی خبر دی۔ انہوں نے خوب رو رو کر دعائیں کرنی شروع کیں۔ جب دعائیں ختم ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سلا دیا۔ ان کا سامان ان کے سرہانے پڑا تھا اور کتا دہلیز پر تھا۔ بادشاہ نے ان کا پتہ لے کر ان کا پیچھا کیا۔ مگر جب غار میں بعض لوگوں کو بھیجا تو کوئی غار میں نہ جا سکا۔ اس پر ایک مصاحب نے کہا کہ اے بادشاہ آپ کی غرض ان کو مارنا ہی تو ہے۔ آپ اس غار کے دروازہ پر دیوار کھنچوا دیں آپ ہی بھوکے پیاسے مر جائیں گے۔ بادشاہ نے اس کے مشورہ کے مطابق دیوار کھنچوا دی۔ اس کے بعد وہ کچھ گذرا جو اللہ تعالیٰ نے اگلی آیات میں بیان فرمایا ہے۔ (روح المعانی زیر آیت ھذا بحوالہ ابن اسحاق)

(۲) بعض نے لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے ایک حواری تھے وہ سفر کرتے ہوئے ایک ایسے شہر میں پہنچے جس کا

بادشاہ بت پرست تھا۔اوراس نے حکم دے رکھا تھا کہ جو شہر میں داخل ہو پہلے دروازہ پر نصب کئے ہوئے بت کو سجدہ کرے انہوں نے ایسا نہ کیا۔اور شہر کے باہر ایک حمام میں ٹھیر گئے اور وہیں تبلیغ شروع کردی۔جس کی وجہ سے کئی لوگ ان کے ہم خیال ہو گئے۔ایک دن بادشاہ کا لڑکا ایک فاحشہ کو لے کر حمام کرنے کے لئے آیا۔اس حواری نے اسے نصیحت کی۔وہ اس دن رک گیا۔دوسری دفعہ پھر آیا تو انہوں نے اسے ڈانٹا اس نے بات نہ مانی اور اس فاحشہ سمیت حمام میں چلا گیا۔صبح کے وقت وہ مردہ پایا گیا۔بادشاہ کو لوگوں نے کہا کہ حمام والے نے مار دیا ہے۔بادشاہ نے تحقیق شروع کی۔حمام والا بھاگ گیا اور اس کے سب دوست بھی۔کچھ نوجوان جو مسیحی ہو چکے تھے وہ بھی ڈر کر بھاگے اور ایک زمیندار کے پاس جوان کا دوست تھا گئے وہ بھی ان کا ہم خیال تھا۔وہ ان کو لے کر ایک غار میں جا چھپا۔بادشاہ کو علم ہوا تو وہ پکڑنے گیا۔اس سے آگے وہی لوگوں کے ڈرنے اور بادشاہ کے دیوار بنانے کا واقعہ ہے۔(أخرجہٗ عبدالرزاق وابن المنذر عن وھب بن منبہ۔روح المعانی زیر آیت ھذا)

ابن المنذر اور ابن ابی شیبہ اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ رومیوں کے مقابلہ پر جہاد کے لئے گیا تھا۔اس سفر میں ہم نے اصحاب کہف کی غار دیکھی۔معاویہؓ نے کچھ لوگ اس غار کو دیکھنے کے لئے بھیجے مگر آندھی آگئی اور وہ لوگ اندر نہ جا سکے۔(درمنثور زیر آیت ھذا)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے اصحاب کہف کی ہڈیاں دیکھیں۔وہ تین سو سال کی پرانی تھیں (درمنثور زیر آیت ھذا)

اصحاب کہف کے متعلق تفاسیر کے واقعات ان کے انجام کے متعلق مندرجہ ذیل روایات کتب تفسیر میں بیان کی گئی ہیں۔(۱) ایک لمبے عرصہ تک اللہ تعالیٰ نے ان کو سلائے رکھا پھر جگا دیا۔انہوں نے اپنے میں سے ایک شخص کو کھانا لینے بھیجا۔اس نے دوکاندار کو جو سکہ دیا۔اسے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کیونکہ وہ سکہ پرانا تھا۔اس نے اَور دکانداروں کو دکھایا۔سب اس سکہ کو دیکھ کر حیران ہوئے کہ یہ کس ملک کا سکہ ہے۔آخر بادشاہ تک معاملہ پہنچا جس کا نام تندوسیس تھا۔بادشاہ نے اس نوجوان سے سب واقعہ سنا اور اس کے ساتھ غار تک آیا۔وہاں سب اصحاب کہف سے ملا اور ان سے بغلگیر ہوا۔کچھ دیر باتیں ہوئیں۔پھر اصحاب کہف نے اس کو نصائح کیں اور لیٹ گئے اور اسی وقت مر گئے۔(روح المعانی و ابن کثیر سورۃ الکھف زیر آیت و کذالک اعثرنا علیھم)

(۲) بعض دوسری روایات میں آتا ہے کہ جب لوگ غار پر پہنچے تو وہ لوگ اسی وقت مر گئے۔اور وہ ان کو زندہ نہ دیکھ سکے۔اور جو کھانا لینے گیا تھا وہ بھی وہاں پہنچ کر مر گیا۔(عبدالرزاق و ابن ابی حاتم عن عکرمۃؓ درمنثور زیر آیت ھذا)

دقیس والا واقعہ مسیحی کتب میں بھی لکھا ہوا ہے۔ مشہور انگریز مؤرخ گبن اپنی کتاب ’’رومن حکومت کی ترقی اور تباہی‘‘ میں لکھتا ہے کہ ایک کہانی سات سونے والوں کے متعلق طورس کے پادری گریگوری نے لکھی ہے جسے میں لکھ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ کہانی شامی مسیحیوں میں مشہور تھی۔ اوران کی کتب سے گریگوری نے نقل کی ہے۔ گبن نے آگے جو کہانی نقل کی ہے۔ وہ ابن اسحاق کی روایت سے بہت ملتی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ دقیس بادشاہ کے وقت یہی افسیس شہر کے چند امراء نوجوان جو مسیحی تھے انہوں نے مسیحیوں پر بادشاہ کا ظلم دیکھ کر اپنے آپ کو ایک غار میں چھپا دیا۔ بادشاہ نے غار کا منہ بند کروا دیا۔ ایک سواسی سال تک اللہ تعالیٰ نے ان کو سلائے رکھا ایڈولیس جس کے پاس وہ علاقہ تھا اس کے غلاموں نے کسی ضرورت کے لئے غار کے منہ پر سے پتھر ہٹائے اور سورج کی شعاع اندر جانے پر اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کر دیا۔ وہ جاگے تو سمجھے کہ چند گھنٹے ہم سوئے ہیں۔ ان کو بھوک لگی تو انہوں نے اپنے ایک ساتھی جیمبلیکس کو خوراک لینے بھجوایا۔ اس نے شہر کو بدلا ہوا پایا اور دروازہ پر صلیب دیکھی تو اس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ نان پز کو جب اس نے سکہ دیا تو اس کے لباس اور عجیب سکہ کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اور یہ سمجھ کر کہ اسے کوئی خزانہ ملا ہے اسے قاضی کے سامنے پیش کیا۔ جب انہوں نے واقعہ سنا تو بادشاہ تھیوڈوسیس اور سب امراء مل کر غار پر گئے۔ جہاں اصحاب کہف نے انہیں برکت دی اپنا قصہ سنایا اور فوت ہو گئے۔ (جلد اول ص ۱۹۷)

علامہ ابوحیان بحر محیط میں لکھتے ہیں کہ سپین میں ایک جگہ لوشا ہے اس میں ایک غار ہے وہاں اصحاب کہف کی لاشیں بتائی جاتی ہیں اور اس میں ان کا کتا بھی ہے۔ ابن ابی عطیہ کہتے ہیں کہ میں نے وہ جگہ دیکھی ہے۔ چار پانچ سوسال سے وہاں ان کی لاشیں پڑی ہیں (بحر محیط) اسی طرح وہ لکھتے ہیں کہ غرناطہ کے پاس ایک اجڑا ہوا شہر ہے۔ جسے دقیوس کا شہر کہتے ہیں جو بڑے بڑے پتھروں سے بنا ہوا ہے۔ اس میں عجیب عجیب قبریں ہیں۔

مفسرین نے اصحاب کہف کے نام بھی لکھے ہیں۔ چنانچہ ابن عباسؓ سے مروی ہے وہ یہ نام بتاتے ہیں۔ میکسل مینا تملیخا، مرطونس، کشطونس، بیرونس، ویلنموس، بطونس اور قایوس۔ (ابن کثیر زیر آیت کہف: ۲۲)

اصحاب الرقیم کے متعلق تفاسیر کے واقعات رقیم کے متعلق بھی مختلف روایات ہیں بعض کہتے ہیں کہ تانبے اور پتھر کی لوح پر ان کے نام لکھے تھے۔ اس لئے ان کا نام رقیم ہو گیا۔ بعض کے نزدیک ان کے شہر کا نام رقیم تھا۔ بعض کے نزدیک درہموں کا نام تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ان کے کتے کا نام تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ان کی شریعت کا نام تھا۔ اور بعض کے نزدیک ان کی وادی کا نام تھا۔ اور بعض کے نزدیک پہاڑ کا نام تھا۔ جس پر وہ غار تھی (قرطبی زیر آیت ان اصحاب الکھف۔۔۔)۔

ان روایات سے جو مسلمانوں کی کتب اور مسیحیوں کی کتب میں آئی ہیں یہ بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے اصحاب کہف کے قصے سے ملتے ہوئے واقعات لوگوں میں مشہور تھے۔ لیکن ان میں اس قدر اختلاف تھا کہ جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے ان پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ جھوٹ سچ ان میں ملا ہوا تھا۔

ان روایات کے علاوہ مفسرین نے ایسی بہت سی روایات بھی لکھی ہیں جن میں کتے کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ کہا گیا ہے کہ جنت میں صرف دو حیوان ہوں گے ایک اصحاب کہف کا کتا اور ایک بلعم کا گدھا۔

صاحب فتح البیان اس قسم کی بعض روایات نقل کر کے لکھتے ہیں لَا اَدْرِیْ اَیَّ تَعَلُّقٍ لِهٰذَا التَّدْقِيْقِ وَالتَّحْقِيْقِ بِتَفْسِيْرِ الْكِتَابِ الْعَزِيْزِ وَمَا الَّذِيْ حَمَلَهُمْ عَلٰى هٰذَا الْفُضُوْلِ الَّذِيْ لَامُسْتَنَدَلَهٗ فِي السَّمْعِ وَلَافِي الْعَقْلِ (زیر آیت وتحسبهم ایقاظا و هم۔۔۔) یعنی میں نہیں سمجھتا کہ اس نام نہاد تدقیق اور تحقیق کا تعلق قرآن کریم کی تفسیر کے ساتھ کیا ہے۔ اور ان مفسرین کو ان لغویات کے نقل کی طرف جن کا نہ کوئی عقلی ثبوت ہے نہ نقلی۔ کیوں رغبت ہوئی ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ کی تحقیقات اصحاب کہف کے متعلق سابق مفسرین کے خیالات لکھنے کے بعد میں استاذی المکرم حضرت مولوی نورالدین خلیفہ اول جماعت احمدیہؓ کی تحقیق اس بارہ میں لکھتا ہوں۔ آپ کا خیال تھا کہ اصحاب کہف ابتدائی زمانہ کے مسیحیوں میں سے ایک موحد جماعت تھی۔ ان لوگوں نے شرک کی اشاعت سے ڈر کر کسی دوسرے ملک کا سفر کیا۔ اور وہاں مدتوں تک گمنامی میں پڑے رہے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے انہیں ترقی دی اور سب دنیا میں پھیلا دیا۔ آپ کا خیال تھا کہ اس واقعہ میں یوسف آرمیتیا کے ایک سفر کی طرف اشارہ ہے جب کہ وہ اپنے بعض ساتھیوں کو لے کر انگلستان چلے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے پہلے مسیحی گرجا کی بنیاد رکھی (حقائق الفرقان زیر آیت اذاوی الفتیۃ۔۔۔)۔ آپ کا اشارہ اس روایت کی طرف ہے جو انگلستان میں صدیوں سے مشہور چلی آتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ فلپ حواری نے یوسف آرمیتیا اور چند اور لوگوں کو انگلستان تبلیغ کے لئے بھجوایا تھا۔ وہاں انہوں نے Glastonbury کے مقام پر ایک گرجا بنایا اور عیسائیت کی تبلیغ شروع کی (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Glastonbury) یہ قصہ ''گلاسٹنبری کے گرجا کی قدامت'' نامی کتاب میں مذکور ہے جو ولیم نامی ایک شخص نے جو مالمس بری Malmes Bury کا باشندہ تھا گیارہ سو پچیس عیسوی میں لکھا تھا۔ لیکن اس کے اس نسخہ میں جو اس نے

خود لکھا اس واقعہ کا ذکر نہیں بلکہ یہ لکھا ہے کہ معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کے ایک بادشاہ لوسیئس (Lucuis) کے کہنے پر پوپ نے ۱۶۶ء میں ایک تبلیغی مشن انگلستان بھجوایا تھا جس نے یہ گرجا بنایا۔ ساتھ ہی اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ ایک روایت اس گرجے کو اس سے بھی پہلے کا بتاتی ہے۔ مگر میں اس روایت کی تصدیق نہیں کر سکتا۔ ولیم کے مرنے کے بعد اس کی ایک کتاب کو دوبارہ لکھوایا گیا تو اس میں اوپر والا واقعہ درج کر دیا گیا۔ گویا یہ واقعہ ولیم کے بعد اس کتاب میں کسی اور نے لکھ دیا ہے اور اس کی سند اس نے کوئی نہیں دی۔

یہ جو کہف کا لفظ قرآن کریم میں آتا ہے اس کے متعلق حضرت مولوی صاحبؓ کا خیال تھا کہ اس سے مراد وہ (Cape) ہے جو گلاسٹنبری کے پاس ساحل پر ہے جہاں تک کیپ کے لفظ کا تعلق ہے میرے نزدیک آپ کی رائے درست نہیں کیونکہ کیپ انگریزی کا لفظ فرانسیسی لفظ Cap اور لاطینی Capute سے بنا ہے جن کے معنے سر کے ہیں۔ اور خشکی کا ایک حصہ جس کی نوک سمندر میں آگے نکلی ہوئی ہو اسے کیپ (Cape) کہتے ہیں۔ لیکن عربی لفظ کہف کے معنے وسیع غار کے ہیں۔ جو پہاڑی جگہ پر ہو یا پتھریلی زمین میں ہو اور اسے کیپ سے جسے عربی جغرافیہ نویس رأس کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ (جیسے ہندوستان کی ایک کیپ کا نام رأس کماری ہے) دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ میرے نزدیک جس حد تک اصحاب کہف کے واقعہ کا تعلق یوسف آرمیتیا کے سفر سے ہے۔ میں اس کے متعلق بھی آپ کی تحقیق سے متفق نہیں۔ کیونکہ یوسف آرمیتیا کا یہ سفر محض کہانی کی طور پر انگلستان میں مشہور رہا ہے۔ اور سوا گیارہ سو سال بعد مسیح اس کا ذکر پہلی دفعہ ولیم کی کتاب میں ملتا ہے اور وہ بھی ایک نامعلوم شخص نے اس کی موت کے بعد اس کتاب میں لکھ دیا ہے۔ ایسے اہم امور کے متعلق تو ایک صدی کی خاموشی بھی شبہ ڈال دیتی ہے۔ کجا یہ کہ ایک ہزار سال تک دنیا میں اس بارہ میں کوئی روایت نہ ہو اور ہزار سال کے بعد جا کر یہ روایت لکھی جائے۔ اگر آج کوئی شخص ایک نئی روایت جو کتب احادیث اور تاریخ میں موجود نہ ہو۔ لوگوں کی زبانی روایات پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کرے تو ایک شخص بھی اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوگا۔ جب تک کہ کوئی ایسے تاریخی شواہد اس کی تائید میں نہ ملیں جو اس واقعہ کو دوسرے ثابت شدہ واقعات کی کڑی میں اس طرح پرو دیں کہ انکار کی گنجائش نہ رہے۔

نیز اہل انگلستان جن کو اس قسم کی روایات پر فخر ہونا چاہیے اور ایسی جھوٹی روایتوں کو بھی سچا بنانا ان کے فائدہ کا موجب ہے وہ بھی تحقیق کر کے ان امور کو غلط قرار دے چکے ہیں۔ چنانچہ ولیم آف مالمسبری کے بعد اس گرجا کے قدیم کاغذات ملے ہیں جن کو پڑھ کر یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ یہ گرجا اس وقت سے زیادہ سے زیادہ تین ساڑھے تین

سوسال پہلے بنا تھا۔یعنی اس کی تعمیر کا وقت زیادہ سے زیادہ آٹھویں صدی مسیحی کے آخر میں تجویز کیا جاسکتا ہے اوران کاغذات میں بھی اس روایت کا کوئی ذکر نہیں ۔اس لئے تحقیقات کے بعد انگریز مؤرخوں نے لکھا ہے کہ ’’بہرحال یہ تاریخی واقعہ نہیں ہاں ایک شاعرانہ خیال ضرور ہے‘‘(انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Joseph do qrimathea)

ان معمولی اختلافات کے اظہار کے بعد جوصرف افراد اورابتدائی مقام کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جہاں تک اصحاب کہف کا تعلق گذرے ہوئے واقعات سے ہے۔ان کے بارہ میں حضرت مولوی صاحب ؓ کی تحقیق ایک ایسی شمع ہدایت ہے جس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔اور بغیر اس روشنی کے جوانہوں نے اس مضمون پر ڈالی ہے یہ حصہ قرآن کریم کا تاریخی طور پر حل نہیں ہوسکتا تھا۔فجزاہ اللہ احسن الجزاء

اصحاب کہف کے واقعات میں حضرت مسیح موعود کے لئے پیشگوئی ہے میں جوتشریح آگے بیان کروں گا وہ جزئی اختلاف کو چھوڑ کر مقام اورقوم اورزمانہ کے سوا ایک حد تک حضرت مولوی صاحب کی تحقیق پر مبنی ہوگی ۔ہاں ایک حصہ جوان آیات کے اصل مقصد کے ساتھ وابستہ ہے آپ کی تحقیق سے باہر رہ گیا تھا اس کی طرف ہم کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بانی سلسلہ احمدیہ نے توجہ دلائی ہے اوروہ یہ کہ اس پیشگوئی میں مسیح موعود کے دوبارہ نزول کے متعلق خبریں ہیں اور مسلمانوں کو بتایا ہے کہ ویسے ہی حالات آئندہ زمانہ میں مسلمانوں کی ایک جماعت کو بھی پیش آنے والے ہیں (الحکم ۱۰؍اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۲ کالم ۲)۔

اصحاب کہف کے متعلق اپنی تحقیق ان تمہیدوں کے بعد میں اب اصحاب کہف کے بارہ میں اپنی تحقیق بیان کرتا ہوں میں نے جب یہ دیکھا کہ یوسف آرمیتیا کا واقعہ ایک قصہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔تو میں نے اصحاب کہف کے بارہ میں مزید تحقیق شروع کی۔اس تحقیق کے دوران میں میرے خسر ڈاکٹر خلیفہ رشید الدین صاحب مرحوم ایک کتاب میرے پاس لائے اور کہا کہ اس کتاب میں جوواقعات بیان ہوئے ہیں وہ اصحاب کہف کے واقعات سے ملتے ہیں۔اس کتاب کا نام روم کے کیٹا کومبز Catacombs of Rome تھا۔میں نے وہ کتاب لے کر پڑھی اورمیری بھی یہ رائے ہوئی کہ اس میں بیان کردہ روایات پر اصحاب کہف کی تحقیق کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔اس کتاب کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ مسیحی ابتدائی زمانہ میں مشرک نہ تھے اوراس کا ثبوت اس نے یہ پیش کیا ہے کہ روم کے پاس ایسے غار ملے ہیں جن میں ابتدائی زمانہ میں مسیحی لوگ رومی حکومت کے ظلم سے بچنے کے لئے چھپ جایا کرتے تھے۔وہاں بہت سے کتبے پائے گئے ہیں جن میں اس وقت کے حالات ہیں۔اوران سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع عیسائیت میں شرک کا نام نہ تھا۔اوروہ لوگ مسیح علیہ السلام کو صرف ایک نجات دہندہ نبی سمجھتے تھے۔

یہ ظلم اس کتاب کے بیان کے مطابق صدیوں تک ہوتا رہا اور جب ظلم زیادہ ہوتا وہ لوگ ان مقامات میں جا کر چھپ جاتے اور خفیہ طور پر رسد جمع کر کے وہاں رہتے۔ حتی کہ بعض دفعہ انہیں کئی کئی سال تک وہاں چھپنا پڑا آخر تین سو سال کے بعد جب روم کا ایک بادشاہ عیسائی ہو گیا۔ تو عیسائیوں کی تکلیف دور ہوئی اس کے بعد گاتھ قوم نے روم پر حملہ کیا اور ان تہ خانوں کو لوٹ لیا اور توڑ دیا جس کی وجہ سے آہستہ آہستہ ان کا ذکر مٹ گیا۔ مگر آثار قدیمہ کے بعض محققین نے روم کے کھنڈرات کی تلاش کرتے ہوئے ان کو معلوم کیا اور ایک ہزار سال بعد پھر یہ چھپا ہوا تاریخی مواد دنیا کو معلوم ہوا۔

میں نے جب یہ کتاب پڑھی تو میں نے یہ سمجھا کہ ہماری تفسیروں میں جو امور بیان کئے گئے ہیں گو وہ بہت کچھ رطب و یابس پر مشتمل ہیں مگر ان واقعات کی موجودگی میں انہیں اصل واقعہ سے کلی طور پر مختلف نہیں کہا جا سکتا اور میں نے نئے سرے سے تفسیروں کے بیان کردہ واقعات پر غور کیا چنانچہ میں نے اوپر جو تین روایات بیان کی ہیں۔ ایک ابن اسحاق کی اور دو کتب احادیث کی ان کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ صداقت کا بیج ان روایات میں موجود ہے۔

تفصیلی واقعات جن کا ذکر اصحاب کہف کے متعلق روایات میں آتا ہے

اگر اس تفسیر کو پڑھنے والے ایک دفعہ پھر ان روایات کو پڑھ کر دیکھیں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ ان روایات میں یہ امور بیان ہوئے ہیں (۱) یہ واقعہ مسیحیوں کی ایک قوم سے گذرا ہے (۲) یہ مظالم رومیوں کے ہاتھ سے ہوئے ہیں (۳) ایک روایت کہتی ہے کہ ایک حواری رومی بادشاہ کے دارالحکومت میں گیا تھا اس وقت وہاں یہ واقعہ گذرا ہے (۴) دوسری روایت کہتی ہے کہ دقیوس جس کا دوسرا نام عربوں اور ہندوستانیوں میں دقیانوس بھی مشہور ہے۔ اور جسے لاطینی میں دسیس Decuis کہتے ہیں۔ اس کے زمانہ میں اصحاب کہف کا واقعہ ہوا ہے اور اس سے ڈر کر کچھ مسیحی غار میں چلے گئے تھے (۵) سب روایات متفق ہیں کہ وہ قوم جس نے مظالم کئے تھے بت پرست تھی۔ (۶) ایک روایت جسے میں نے لکھا نہیں یہ بھی کہتی ہے کہ اس ملک کے بادشاہ اپنے بتوں کے آگے سجدہ کرنے اور ان پر قربانیاں چڑھانے کے لئے مجبور کرتے تھے (۷) حضرت ابن عباسؓ کی روایت بتاتی ہے کہ ان کے زمانہ سے تین سو سال پہلے یہ واقعہ گزرا ہے (۸) ایک روایت بتاتی ہے کہ تندوسیس کے زمانہ میں اصحاب کہف غار سے باہر نکلے تھے یہ تندوسیس بھی ایک رومی بادشاہ تھا۔ اور اس کا نام لاطینی میں Theodosis لکھتے ہیں۔

کیٹا کومبز کی تاریخ پڑھنے کے بعد یہ روایات بجائے ہمارا دماغ پریشان کرنے کے ہماری رہنمائی کا موجب

ہو جاتی ہیں۔اور وہ اس طرح کہ کیٹا کومبز اور کلیسیا کی تاریخ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فرداً فرداً مسیحیوں پر ظلم تو حضرت مسیح کے واقعہ صلیب سے شروع ہوا تھا۔مگر بحیثیت جماعت نیرو کے زمانہ سے روم میں مسیحیوں پر ظلم شروع ہوئے ہیں۔اور نیرو بادشاہ حواریوں کا ہم عصر ہے۔اس کا زمانہ حکومت ۵۴ سنہ بعد مسیح سے ۶۸ سنہ بعد مسیح تک ہے (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Nero)۔ پرانے عیسائیوں میں یہ عام خیال پایا جاتا ہے کہ پطرس کو اس کے زمانہ میں پھانسی دیا گیا۔ہمیں کوئی شک نہیں کہ جدید ناقدین تاریخ جو ہر تاریخی واقعہ میں شک پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں انہوں نے اس بارہ میں شک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔لیکن پوری تنقید کے بعد بھی وہ اسے رد نہیں کر سکے کہ پطرس روم گیا اور وہاں ہی مرا۔پرانے مسیحی لٹریچر سے قریباً ۱۷۰ء بعد صلیب کی ایک تحریر بشپ ڈایونیسیس کی ملتی ہے جو پیٹر کے روم جانے کی خبر دیتی ہے۔چونکہ پطرس واقعہ صلیب کے بعد ساٹھ سے ستر اسی سال تک زندہ رہا ہے یہ تحریر کوئی اسی سے سو سال تک پطرس کی وفات کے بعد لکھی گئی ہے اور اتنے قریب کے زمانہ کی شہادت معمولی شہادت نہیں ہو سکتی۔خصوصاً جبکہ اس کا لکھنے والا گرجے کا بڑا پادری ہے (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا زیر لفظ Simon Peter)

اصحاب کہف کے واقعہ کا تعلق روم کے ملک سے ہے انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں لکھا ہے کہ یہ امر تاریخ سے ثابت ہے کہ واقعہ صلیب کے دو سو سال کے بعد کے زمانہ میں روم میں پیٹر کی قبر زائروں کو دکھائی جاتی تھی اور یہ کہ ۲۵۸ سنہ ء میں اس کی ہڈیاں کیٹا کومبز میں منتقل کی گئی تھیں۔یہ کہ واقعہ میں وہ قبر اور ہڈیاں پیٹر کی تھیں یا نہیں (زیر لفظ Simon Peter)۔انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا اس بارہ میں لکھتا ہے کہ اس کی تحقیق کا سامان ہمارے پاس موجود نہیں۔مگر یہ ظاہر ہے کہ جو سامان اَور باتوں کی تحقیقات کے ہیں وہ یہاں بھی ہیں۔قریب زمانہ کے لوگ اس واقعہ کو بیان کرتے ہیں اور اس کی وفات کے صرف سوا سو سال کے بعد کے زمانہ کا تاریخی ثبوت موجود ہے۔کہ روم میں اس کی قبر دکھائی جاتی تھی۔غرض یہ امر کہ اسے نیرو نے قتل کیا یا نہ کیا۔اگر ثابت بھی نہ ہو تب بھی یہ امر ثابت ہے کہ پطرس روم میں گیا اور وہیں مرا اور یہ کہ اس زمانہ میں مسیحیوں پر سختیاں ہوتی تھیں اور ان کو ادھر ادھر بھاگ کر جانیں بچانی پڑتی تھیں۔(سٹوری آف روم مصنفہ مسٹر نارووڈ ینگ)۔

پھر ہم کو تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ڈیسس یا دقیانوس کے زمانہ میں مسیحیوں پر سختیاں بہت بڑھ گئی تھیں اور قانون بنا کر انہیں سزا دی جاتی تھی۔اور جو بتوں کو سجدہ نہ کرتے تھے ان کو مسیحی سمجھ کر قید یا قتل کیا جاتا تھا۔(انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ ڈیسیس نیز زیر لفظ تاریخ کلیسیا)، ڈیسیس کا زمانہ حکومت ۲۴۹ سنہ ء ۲۵۱ سنہ ء تھا۔اور اس نے ۲۵۰ سنہ و ۲۵۱ سنہ ء میں مسیحیوں کے خلاف سختی کے قانون پاس کئے تھے۔

پھر تاریخ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ۳۱۱ء میں گالیس بادشاہ روم نے مرتے وقت مسیحیوں کے خلاف جو قانون تھا اسے منسوخ کیا (دی ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈز زیر عنوان The age of diocletian and constantine) قسطنطین شاہ روم ۳۳۷ء میں عیسائی ہوا۔ اور تھیوڈوسیس مشرقی رومی حکومت کے وقت میں مسیحیت بہت پھیل گئی اور پبلک کی طرف سے بھی اسے امن حاصل ہو گیا (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ کونسٹنٹائن)۔

ان تاریخی شواہد سے ہم پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہیروڈیٹس کے واقعہ سے فلسطین میں اور نیرو کے زمانہ سے لے کر ۳۱۱ء تک روم میں مسیحیوں پر سخت ظلم ہوئے اور یہ کہ مظالم کے زمانہ میں وہ وہاں سے بھاگ کر ادھر ادھر غاروں میں پناہ لیا کرتے تھے۔

اصحاب کہف ابتدائی زمانہ کے رومی مسیحی تھے ان واقعات پر نظر ڈال کر ہم کو آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ اصحاب کہف ابتدائی زمانہ کے رومی مسیحی تھے۔ نیز سینکڑوں سال تک ان پر ظلم ہوتا رہا۔ جس کی ابتدا ایک مسیح کے حواری کے زمانہ میں ہوئی ڈیسیس کے زمانہ میں ظلم انتہا کو پہنچا اور گالیس کے زمانہ میں ان کو معاف کیا گیا قسطنطین کے زمانہ میں ان کے مظالم قانونی طور پر روکے گئے اور تھیوڈسیس کے زمانہ میں انہیں عام ترقی حاصل ہو گئی۔

اب اگر ان واقعات کی روشنی میں مفسرین کی روایات کو دیکھیں تو اس مبالغہ کو نظر انداز کر کے جو مسیحی اور یہودی راویوں نے کئے ہوں گے وہ روایات اصحاب کہف کا صحیح پتہ ہمیں دے دیتی ہیں اور ان میں اختلاف بھی کوئی نہیں۔ اختلاف صرف اس وجہ سے معلوم ہوتا تھا کہ لوگ اصحاب کہف کے واقعہ کو کسی ایک جماعت کا واقعہ سمجھتے تھے۔ لیکن یہ واقعہ درحقیقت ایک جماعت سے یا ایک زمانہ میں نہیں گذرا۔ بلکہ کئی جماعتوں سے مختلف زمانوں میں گذرا ہے۔ یہ واقعہ نیرو کے وقت میں بھی ہوا جبکہ پطرس روم میں موجود تھے۔ اور ابن اسحاق کی روایت اسی وقت کے متعلق ہے اور یہ واقعہ ڈسیس کے وقت میں بھی ہوا۔ اور ابن المنذر کی روایت اس کے متعلق ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ تین سو سال تک مسیحیوں پر ظلم ہوتا رہا اور وہ ظلم کے خاص ایام میں غاروں میں چھپ کر گذارا کیا کرتے تھے۔ ان کی قربانیوں کے کئی واقعات لوگوں میں مشہور ہو گئے تھے۔ کسی کو پطرس کے زمانہ کا واقعہ معلوم ہوا تو اس نے سمجھ لیا کہ اصحاب کہف کا واقعہ بس اتنا ہی ہے۔ کسی کو ڈسیس کے وقت کا کوئی واقعہ معلوم ہوا تو اس نے سمجھ لیا کہ یہی واقعہ اصحاب کہف کا ہے۔ غرض مختلف زمانوں کے مظالم اور مسیحیوں کی قربانیوں کی داستانوں کو مظالم کی ساری تاریخ قرار دینے سے اختلاف پیدا ہوا ہے۔ جب روایات کو مختلف واقعات سمجھا جائے تو پھر عام مبالغہ کو خارج کر کے جو ایسی روایات میں ہو جایا کرتا ہے۔ وہ سب ہی روایات درست معلوم ہوتی ہیں اور ابتدائی مسیحیوں کی پُردرد

داستان کا ایک مختصر نقشہ ہیں۔

روم کے کیٹا کومبز کے تاریخی حالات اب میں کہف کے بارے میں مختصراً بعض واقعات بتاتا ہوں۔جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں کہف سے مراد کیٹا کومبز ہیں جو زمین دوز تہ خانوں کا نام ہے۔رومیوں اور یہود میں رواج تھا کہ وہ مردوں کو کمروں میں رکھتے تھے۔رومی حکومت کے بڑے بڑے شہروں میں شہروں سے باہر ایسی جگہیں بنی ہوئی تھیں اور کیٹا کومبز کہلاتی تھیں۔جب مسیحیوں پر ظلم ہوئے تو انہوں نے جان بچانے کے لئے ان قبرستانوں میں پناہ لینی شروع کی جس کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔ایک تو یہ کہ زمین دوز کمروں میں وہ آسانی سے چھپ سکتے تھے۔اور بیٹھنے۔سونے اور موسم کی شدت سے محفوظ رہنے کا بھی سامان ہوتا تھا۔دوسرے اس لئے بھی کہ عام طور پر لوگ قبرستانوں سے ڈرتے ہیں۔اور اس طرح لوگوں کی نظروں سے بچنے کا وہاں امکان زیادہ تھا۔یہ کیٹا کومبز روم کے پاس۔اسکندریہ جو مصر کا شہر ہے اس کے پاس۔سسلی میں۔مالٹا میں۔نیپلز کے پاس اس وقت تک دریافت ہوئے ہیں (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Catacombs)۔مسٹر بنجمن سکاٹ اپنی کتاب ''دی کیٹا کومیز آیٹ روم'' میں لکھتے ہیں۔کہ ''میری رائے ہے کہ اس ابتدائی زمانہ میں بھی (جب پولوس روم گیا ہے) عیسائی اپنی حفاظت کے خیال سے لوگوں کے غصہ اور یہودیوں کے ظلموں اور رومی حکومت کے مظالم سے بچنے کے لئے ان تہ خانوں میں پناہ لیا کرتے تھے''۔(ص ۶۳) پھر وہ ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں۔''وہ یقیناً مجبور تھے کہ ان گڑھوں اور زمین دوز غاروں میں پناہ لیتے''۔اس جگہ مصنف نے ان تہ خانوں کے لئے کیو (Cave) کا لفظ استعمال کیا ہے۔جو عربی زبان کے لفظ کہف کا ہی بگڑا ہوا ہے۔گویا اس طرح اس انگریز مصنف نے عین وہی لفظ استعمال کر دیا ہے جو قرآن کریم نے کیا ہے۔یہ کہ ان کو ایسا کرنے کی ضرورت تھی رومی مؤرخ ٹسیٹس Tacitus کی شہادت سے ثابت ہو جاتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ نیرو نے لوگوں کو خوش کرنے کے لئے مسیحیوں کو زندہ جلانے۔کتوں سے پھڑوانے۔اور صلیب دینے کے مختلف طریق اختیار کر رکھے تھے۔اور اس غرض سے اس نے اپنا شاہی باغ دیا ہوا تھا۔جس قوم پر اس قدر اور عام ظلم ہوگا۔ظاہر ہے کہ وہ ادھر ادھر بچ کر پناہ لے گی (The Aunals and the histories pg.257.258)۔

جب مسیحیوں نے ان جگہوں پر پناہ لینی شروع کی تو پناہ کے دنوں میں انہوں نے زیادہ حفاظت کی خاطر ان کے اندر اور کمرے بنانے شروع کر دئے۔اسی طرح جو لوگ شہید ہوتے تھے ان کی لاشوں کو بے حرمتی سے بچانے کے لئے بھی وہ ان تہ خانوں میں لا کر دفن کرتے تھے۔اور چونکہ یہ سلسلہ تین سو سال تک چلا گیا۔اس لئے یہ تہ خانے اس کثرت سے ہو گئے کہ بعض لوگوں کے اندازے کے مطابق وہ پندرہ میل کی لمبائی تک چلے گئے ہیں۔

چونکہ ظلم یکساں نہیں چلتا۔ درمیان میں بعض بادشاہ نرمی کرنے لگ جاتے تھے اور مسیحی پھر واپس شہر میں آجاتے تھے۔ پھر جب سختی کا دور آتا تو بھاگ کر ان جگہوں میں چھپ جاتے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ انہیں وہاں مہینوں یا سالوں رہنا پڑتا تھا۔ کیونکہ ان کے اندر سکولوں اور گرجوں کی کمرے بھی پائے گئے ہیں۔

کیٹا کومبز کے چشم دید حالات یہ تہ خانے تین منزل میں بنے ہوئے ہیں۔ اور ۱۹۲۴ء میں انگلستان جاتے ہوئے روم میں میں نے خود ان کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ پہلی منزل کے کمروں کو تو انسان بغیر زیادہ تکلیف کے دیکھ سکتا ہے۔ دوسری منزل میں بہت دم گھٹتا ہے۔ اور تیسری منزل یعنی سب سے نیچے کے تہ خانہ میں جانا تو نمی اور تاریکی کی وجہ سے قریباً ناممکن ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان تہ خانوں کو مسیحیوں نے اپنی ضرورت کے مطابق اس طرح بنا لیا تھا جیسے بھول بھلیاں ہوتی ہیں۔ اور حفاظت کے مندرجہ ذیل طریق ان میں استعمال کئے گئے ہیں۔

(۱) وہ لوگ دروازوں پر کتے رکھتے تھے تا اجنبی آدمی کے آتے ہی ان کو اس کے بھونکنے سے علم ہو جائے (۲) زمین دوز کمرے جن میں وہ رہتے تھے جہاں سے ان میں زمین کی سطح پر سے داخل ہونے کا راستہ تھا۔ وہاں مٹی کی سیڑھی نہ ہوتی تھی۔ بلکہ لکڑی کی سیڑھی رکھتے تھے تا کہ اپنا آدمی اترنے کے بعد وہاں سے سیڑھی ہٹا دی جا سکے اور تا کہ دشمن آئیں تو فوراً کمروں میں نہ پہنچ سکیں۔ (۳) لیکن اگر وہ کود کر یا سیڑھیاں اپنے ساتھ لا کر اتر ہی آئیں۔ تو اس کے آگے حفاظت کا یہ علاج کیا گیا تھا کہ ہر کمرہ سے چار راستے بنا دیئے گئے تھے۔ ان میں سے ایک راستہ تو اگلے کمرہ کی طرف جاتا تھا اور باقی راستے کچھ دور جا کر بند ہو جاتے تھے۔ اس کا یہ فائدہ تھا کہ عیسائی تو واقف ہونے کی وجہ سے جھٹ اگلے کمرے کی طرف دوڑ جاتے تھے اور تعاقب کرنے والے غلط راستہ کی طرف چلے جاتے اور آگے راستہ بند دیکھ کر پھر دوسرے راستہ کی طرف لوٹتے۔ اس طرح بار بار غلط راستوں کی طرف جانے کی وجہ سے بھاگنے والے عیسائیوں سے بہت پیچھے رہ جاتے۔ اول تو یہ تعاقب ہی پولیس کو پریشان کر دیتا تھا۔ لیکن اگر آخری حد تک تعاقب کر بھی لیتے تو (۴) مسیحی دوسری منزل یعنی نچلے تہ خانوں میں چلے جاتے جو پہلوں سے زیادہ تنگ زیادہ تاریک اور زیادہ پیچیدہ ہیں اگر بالفرض یہاں تک بھی کامیاب تعاقب کیا جاتا تو (۵) ان سے نیچے تیسرے تہ خانے موجود تھے۔ جن میں ہم لوگ تو دو چار منٹ بھی نہیں ٹھیر سکے۔ گو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کہ اب وہ گر گر کر بہت زیادہ نمناک ہو گئے ہیں۔ مگر بہرحال وہ بھیانک جگہیں ہیں جہاں غالباً صرف تعاقب کے وقت میں تھوڑی دیر کے لئے مسیحی پناہ لیتے تھے۔ چونکہ سارے راستوں کی لمبائی کئی سو میل تک جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان جگہوں میں عیسائیوں کا پکڑنا آسان کام نہ ہوتا تھا۔ مگر گورنمنٹ آخر گورنمنٹ ہوتی ہے کئی دفعہ پولیس پکڑ بھی لیتی

تھی۔ اور وہیں ان لوگوں کو قتل کر دیتی تھی۔ میں نے ایسے شہداء کی بہت سی قبریں وہاں دیکھی ہیں۔ ہم نے بعض کتبے پادری سے پڑھوا کر معلوم کیا۔ کہ ان میں وہ دردناک واقعات بیان کئے گئے ہیں جو شہادت کے وقت ان کو پیش آتے تھے۔

قریب زمانہ میں جو نئی قبریں اور کتبے دریافت ہوئے ہیں۔ ان میں ان لوگوں کی قبریں بھی ملی ہیں جن کے پاس پطرس ٹھیرے تھے یا جن کا بائبل میں ذکر ہے۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ کیٹا کومبز)

ڈسیس کے وقت میں چونکہ قانون بنا دیا گیا تھا کہ مسیحی بتوں کو سجدہ کرنے پر مجبور کئے جائیں اور بہت سختی سے مسیحیوں کو مارا جاتا تھا۔ یہ زمانہ قریباً سارا کا سارا عیسائیوں نے کیٹا کومبز میں گذارا۔ سوائے ان کے جنہوں نے ڈر کر مذہب کو ظاہراً خیر باد کہہ دیا۔ اس لئے اس زمانہ میں اصحاب کہف نے ایک نہایت شاندار مثال قربانی کی پیش کی تھی۔

کیٹا کومبز کے کتبوں سے جن حالات کا پتہ ملتا ہے ان کتبوں سے جو کیٹا کومبز میں لگے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مسیحیوں میں شرک نہ تھا۔ ان کتبوں میں کوئی لفظ شرک کا نہیں۔ مسیح کو خدا کا بیٹا نہیں بلکہ محض ایک گڈریے کی شکل میں دکھایا جاتا ہے۔ ان کی والدہ کے لئے کوئی غیر معمولی عزت کا نشان نہیں ملتا۔ زیادہ تر یونس نبی کے واقعہ کو اور حضرت نوح کے طوفان کے آخر میں جو کبوتر اس بات کی خبر لایا تھا کہ پانی ہٹ کر زمین ننگی ہوگئی ہے اس واقعہ کو تصویروں میں دکھایا جاتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نامہ قدیم کو ان لوگوں نے نہیں چھوڑا تھا اور مسیح کو صرف ایک نبی اور روحانی گڈریا خیال کرتے تھے (کیٹا کومبز کے واقعات کے لئے دیکھو انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا۔ دی کٹا کومبز ایٹ روم مصنفہ بنجمین سکاٹ اور ڈاکٹر میٹ لینڈ کی کتاب وغیرہ)

خلاصہ یہ کہ اصحاب کہف کے واقعہ میں مسیحیوں کے ابتدائی زمانہ کے حالات کو پیش کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ مسیحی قوم کی ابتداء تو اس طرح ہوئی تھی کہ وہ بت پرستی کے خلاف جہاد کرتے تھے اور شرک سے بچنے کے لئے انہوں نے صدیوں تک بڑی بڑی قربانیاں کیں۔ لیکن انتہاء اس طرح ہوئی ہے کہ اصلی دین کا کوئی نشان بھی اب مسیحیوں میں نہیں پایا جاتا۔

نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ نَبَاَهُمۡ بِالۡحَقِّ ؕ اِنَّهُمۡ فِتۡيَةٌ اٰمَنُوۡا

ہم ان کی اہم خبر بالکل صحیح طور پر تیرے پاس بیان کرتے ہیں۔ وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر (حقیقی) ایمان

بِرَبِّهِمۡ وَ زِدۡنٰهُمۡ هُدًى ۖۗ ﴿۱۴﴾

لائے تھے اور انہیں ہم نے ہدایت میں (اور بھی) بڑھایا تھا۔

حلّ لُغات۔ نَقُصُّ نَقُصُّ قَصَّ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اس کے لئے دیکھو یوسف آیت نمبر ۴۔

قَصَّ يَقُصُّ قَصًّا وقَصَصًا اَثَرَهٗ: تَتَبَّعَهٗ شَيْئًا بَعْدَ شَيْءٍ۔ اس کا نشان تلاش کرتے ہوئے اس کے پیچھے گیا۔ وَمِنْهُ فَارْتَدَّا عَلٰى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا۔ اَيْ رَجَعَا فِي الطَّرِيْقِ الَّتِيْ سَلَكَاهَا يَقُصَّانِ الْاَثَرَ۔ اور انہی معنوں میں قرآن کریم کی آیت فَارْتَدَّا عَلٰى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ قَصَّ عَلَيْهِ الْخَبَرَ وَالرُّؤْيَا: حَدَّثَ بِهِمَا عَلٰى وَجْهِهِمَا بات کو بے کم وکاست بیان کیا۔ ٹھیک طور پر بیان کیا۔ وَمِنْهُ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ۔ اَيْ نُبَيِّنُ لَكَ اَحْسَنَ الْبَيَانِ۔ اور انہی معنوں میں سورہ یوسف کی آیت نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ میں یہ لفظ آیا ہے۔ یعنی ہم تیرے سامنے ٹھیک ٹھیک بات بیان کرتے ہیں۔ (اقرب)

نَبَاٌ نَبَاٌ کے لئے دیکھو یوسف آیت نمبر ۳۸۔

نَبَّأَهُ الْخَبَرَ وَبِالْخَبَرِ: خَبَّرَهٗ۔ خبر دی۔ آگاہ کیا۔ وَيُقَالُ نَبَّأْتُ زَيْدًا عَمْرًا مُنْطَلِقًا۔ بتایا۔ علم دیا۔ النَّبَأُ: اَلْخَبَرُ۔ خبر۔ وَقَالَ فِي الْكُلِّيَاتِ النَّبَأُ وَالْاَنْبَاءُ لَمْ يَرِدَا فِي الْقُرْاٰنِ اِلَّا لِمَا لَهٗ وَقْعٌ وَشَأْنٌ عَظِيْمٌ۔ اور کلیات ابوالبقاء میں ہے کہ نبأ کا لفظ یا انباء کا لفظ جہاں بھی قرآن کریم میں آیا ہے کسی ذی عظمت اور ذی شان چیز یا بات کی خبر کے متعلق ہی آیا ہے۔ (اقرب)

اَلْحَقُّ کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۱۵۔

اَلْحَقُّ۔ حَقَّ کا مصدر ہے۔ اور حَقَّهٗ حَقًّا کے معنے ہیں غَلَبَهٗ عَلَى الْحَقِّ۔ حق کی وجہ سے اس پر غالب آیا۔ وَالْاَمْرَ: اَثْبَتَهٗ وَاَوْجَبَهٗ۔ کسی امر کو ثابت کیا اور واجب کیا۔ كَانَ عَلٰى يَقِيْنٍ مِنْهُ۔ کسی معاملہ پر یقین سے قائم تھا۔ اَلْخَبَرَ: وَقَفَ عَلٰى حَقِيْقَتِهٖ اور حَقَّ الْخَبَرَ کے معنے ہوں گے اس کی حقیقت سے آگاہ ہوا اور الحقُّ کے معنے

ہیں ضِدُّ الْبَاطِلِ سچ۔ اَلْاَمْرُ الْمَقْضِیُّ فیصلہ شدہ بات۔ اَلْعَدْلُ۔ عدل۔ اَلْمِلْکُ۔ ملکیت۔ اَلْمَوْجُوْدُ الثَّابِتُ۔ موجود و قائم۔ اَلْیَقِیْنُ بَعْدَ الشَّکِّ۔ یقین۔ الْمَوْتُ۔ موت الْحَزْمُ دانائی۔ (اقرب)

تفسیر ۔ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْکَ نَبَاَھُمْ بِالْحَقِّ ۔ یعنی ہم تیرے سامنے ان کے واقعات جس طرح ہوئے ہیں اسی طرح بیان کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو پرانے قصے تھے وہ صحیح نہ تھے۔ اور یہ بھی پتہ لگا کہ اس وقت کچھ قصے ان کے متعلق ضرور مشہور تھے۔

اس امر کا ثبوت کہ ان کے بارہ میں کچھ قصے ضرور مشہور تھے پہلی آیات سے بھی ملتا ہے۔ کیونکہ قرآنی واقعہ تو اس آیت سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے جو بیان کیا گیا تھا معلوم ہوتا ہے وہ اس وقت کی مشہور روایتوں کا صحیح خلاصہ تھا۔

فتیٰ کے معنے اِنَّھُمْ فِتْیَۃٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّھِمْ ۔ وہ نوجوانوں یا شریف اور سخی لوگوں کی ایک جماعت تھی جو اپنے رب پر ایمان لائی فَتًی کے معنے سخی۔ شریف۔ لوگوں کے لئے مال خرچ کرنے والا۔ یا نوجوان کے ہیں (اقرب)۔ کیونکہ دینی کاموں میں نوجوان ہی زیادہ حصہ لیتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے سوائے چند کے باقی سب آپ سے عمر میں کم تھے۔

وَ زِدْنٰھُمْ ھُدًی ۔ اور ہم نے ہدایت میں ان کو زیادہ کر دیا تھا۔ یعنی ان کی قربانیوں کی وجہ سے ہم نے ان کے ایمانوں کو بہت بڑھا دیا تھا۔

اِنَّھُمْ فِتْیَۃٌ میں خاص پارٹی کا ذکر فِتْیَۃٌ سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ مختلف پناہ لینے والی پارٹیوں میں سے کسی خاص پارٹی کا جو سب سے زیادہ قربانی کرنے والی تھی۔ اس جگہ ذکر کیا گیا ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس آیت میں کسی خاص جماعت کا ذکر نہ ہو۔ بلکہ یہ مراد ہو کہ شریف مسیحی جو اپنے دین میں پکے ہوتے تھے۔ ایسا کیا کرتے تھے۔ اور اس طرح اس آیت میں تین سو سال کے عرصہ میں جس قدر لوگوں نے قربانیاں کی تھیں۔ سب ہی کا ذکر ہو۔ میں ذاتی طور پر ان آخری معنوں کو ترجیح دیتا ہوں۔

وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ

اور جب وہ (اپنے وطن سے نکلنے کے لئے) اٹھے تو ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا تب انہوں نے (ایک

وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا

دوسرے سے) کہا (کہ) ہمارا رب (وہ ہے جو) آسمانوں اور زمین کا (بھی) رب ہے ہم اس کے سوا کسی اور معبود کو

شَطَطًا ﴿۱۵﴾

ہرگز (کبھی) نہیں پکاریں گے ورنہ ہم ایک حق سے دور بات کہنے والے ہوں گے۔

حلّ لُغَات۔ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ رَبَطَ الشَّیْءَ (یَرْبِطُ وَیَرْبُطُ) کے معنے ہیں۔ اَوْثَقَهٗ وَ شَدَّهٗ۔ کسی چیز کو مضبوط طور پر باندھ دیا۔ رَبَطَ جَاْشُهٗ (رَبَاطَةً) کے معنے ہیں: اِشْتَدَّ قَلْبُهٗ اس کا دل مضبوط ہوگیا۔ رَبَطَ اللّٰهُ عَلٰى قَلْبِهٖ: صَبَّرَهٗ۔ اللہ نے مصائب کے برداشت کی اسے طاقت دی اور قدم نہ لڑکھڑانے دیا۔ (اقرب)

شَطَطًا شَطَّ (شَطَطًا) کے معنے ہیں: جَارَ۔ ظلم کیا۔ اَفْرَطَ۔ زیادتی کی۔ شَطَطَ فِیْ سِلْعَتِهٖ شَطَطًا۔ جَاوَزَ الْقَدْرَ الْمَحْدُوْدَ اپنے سامان میں مقرر اندازہ سے بڑھ گیا۔ تَبَاعَدَ عَنِ الْحَقِّ۔ حق سے دور ہوگیا۔ شَطَّ فِی السَّوْمِ: غَالٰى فِی الثَّمَنِ۔ قیمت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ نیز شَطَطٌ کے معنے ہیں مُجَاوَزَةُ الْقَدْرِ وَالْحَدِّ۔ حد اور اندازہ سے آگے گذر جانا۔ (اقرب)

تفسیر۔ باوجود اس کے کہ بادشاہ اور رعایا سب ہی ان کے مخالف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کو طاقت دی اور صبر بخشا۔ اور وہ سب کے مقابل پر کھڑے ہو کر اپنے عقیدہ کا اظہار کرتے رہے۔

هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوْ لَا يَاْتُوْنَ

ان لوگوں نے یعنی ہماری قوم نے اس (معبود برحق) کو چھوڑ کر (اپنے لئے) اور (اور) معبود بنا لئے ہیں وہ ان کے

عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى

ثبوت میں کیوں کوئی روشن دلیل نہیں لاتے۔ پھر (وہ کیوں نہیں سمجھتے کہ) جو شخص اللہ (تعالیٰ) پر جھوٹ باندھے

اللّٰهِ كَذِبًا ﴿۱۶﴾

اس سے بڑھ کر ظالم کون (ہوسکتا) ہے۔

حلّ لُغَات۔ سُلْطٰنٌ سُلْطٰنٌ کے لئے دیکھو ابراہیم آیت نمبر ۱۱۔

السُّلْطَانُ: اَلْحُجَّةُ۔ سلطان کے معنے ہیں دلیل۔ اَلتَّسَلُّطُ۔ قبضہ وَقُدْرَةُ الْمَلِكِ۔ بادشاہ کی طاقت۔ (اقرب)

بَيِّنٍ اَلْبَيِّنُ: اَلْوَاضِحُ الْجَلِيُّ۔ بالکل واضح۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک جس قوم میں سے اصحاب کہف نکلے تھے وہ بت پرست تھی اور کئی معبود انہوں نے بنائے ہوئے تھے۔ یہی حال رومیوں کا تھا۔ ان میں بھی کئی بت پوجے جاتے تھے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ موحدوں کی جماعت کوئی پراگندہ نوجوان نہ تھے۔ بلکہ ایک مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور آپس میں ملتے رہتے تھے۔ کیونکہ اس آیت کا مضمون بتاتا ہے کہ وہ لوگ یہ باتیں باہم علیحدگی میں کیا کرتے تھے۔

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى

اور (اب اس وقت) جب (کہ) تم نے ان سے اور (نیز) اللہ (تعالیٰ) کے سوا جس چیز کی (بھی) وہ پرستش کرتے

الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ

ہیں اس سے کنارہ کشی کر لی ہے تو (اب) تم اس وسیع پہاڑی پناہ گاہ میں پناہ لو (ایسا کرو گے تو) تمہارا رب اپنی

مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿۱۷﴾

رحمت (کی کوئی راہ) تمہارے لئے کھول دے گا اور تمہارے لئے تمہارے (اس) معاملہ میں کوئی سہولت کا سامان مہیا کر دے گا۔

حلّ لغات۔ يَنْشُرْ يَنْشُرُ نَشَرَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور نَشَرَ الثَّوبَ

وَالْكِتَابَ کے معنے ہیں بَسَطَهٗ خِلَافَ طَوَاهُ کسی کتاب کو کھولا اور کپڑے کو پھیلایا۔ نَشَرَتْ اَوْرَاقُ الشَّجَرِ: اِمْتَدَّتْ وَانْبَسَطَتْ۔ درخت کے پتے پھیل گئے۔ نَشَرَ الْخَبَرَ نَشْرًا۔ اَذَاعَهٗ۔ کسی خبر کو پھیلایا۔ (اقرب)

مِرْفَقًا رَفَقَ بِهٖ وَعَلَيْهِ وَلَهٗ (يَرْفُقُ مِرْفَقًا) کے معنے ہیں لَطُفَ وَلَمْ يُعَنِّفْ۔ اس پر نرمی کی اور سختی سے کام نہ لیا۔ (اقرب) پس مِرْفَقٌ کے معنے ہوئے نرمی۔

تفسیر۔ الکھف سے خاص جگہ کی طرف اشارہ یہاں پر جو اَلْكَهْفِ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان لوگوں کے ذہن میں کوئی خاص جگہ تھی۔ ورنہ وہ اِلٰی كَهْفٍ کہتے کہ کسی غار کی طرف چلے جانا۔ مگر وہ اِلٰی كَهْفٍ نہیں کہتے۔ بلکہ اِلَی الْكَهْفِ کہتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاقہ میں کوئی خاص کہف (غار) تھی۔ جو مشہور تھی۔ اور اس کی طرف اشارہ کرنے سے ہر ایک شخص اس مقام کو پہچان جاتا تھا۔

دوسرے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کہف میں جانے سے پہلے دیر سے ان پر ظلم ہو رہا تھا اور انہوں نے آپس میں یہ سکیم کر رکھی تھی کہ جب ظلم حد سے بڑھ جائے اور باہر رہنا مشکل ہو تو اس کہف میں چلے جائیں گے کیونکہ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ بتاتا ہے کہ ان کا بائیکاٹ ہو چکا تھا اور وہ اپنی قوم سے الگ اپنے جتھے میں رہتے تھے۔

اس کہف (غار) کی شہرت پہلے سے اس وجہ سے تھی کہ رومی غلاموں پر جب ان کے آقا بہت ظلم کیا کرتے تھے تو وہ بھاگ کر وہاں چلے جایا کرتے تھے۔ وہ بھی ان کی مثال پر عمل کرنا چاہتے تھے۔ پس انہوں نے باہم مشورہ کر کے فیصلہ کر لیا کہ اگر ظلم بڑھ جائے اور باہر رہنا دین کے لئے مضر ہو تو اس غار میں چلے جائیں جہاں غلام بھاگ کر جایا کرتے تھے۔ اگرچہ وہ غار انہی لوگوں نے بہت کچھ بڑھائی لیکن وہ پہلے بھی بہت وسیع تھی۔

وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ

اور (اے مخاطب) تو سورج کو دیکھتا ہے کہ جب وہ چڑھتا ہے تو ان کی وسیع جائے پناہ سے دائیں طرف کو ہٹ کر

الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ

گذرتا ہے اور جب وہ ڈوبتا ہے تو ان سے بائیں طرف کو ہٹ کر گذرتا ہے اور وہ اس (کہف) کے اندر ایک فراخ

فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ

جگہ میں (رہتے) ہیں۔ یہ بات اللہ (تعالیٰ کی نصرت) کے نشانوں میں سے (ایک نشان) ہے جسے

الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ

اللہ (تعالیٰ ہدایت کا) راستہ دکھائے وہی ہدایت پر ہوتا ہے اور جسے وہ گمراہ کرے اس کا تو (کبھی) کوئی دوست

وَلِيًّا مُّرْشِدًا ؑ ⁽¹⁸⁾

(اور) راہ نما نہیں پائے گا۔

ع ۲ / ۵ / ۱۴

حلّ لُغات۔ تَزْوَرُ تَزْوَرُ اصل میں تَتَزَاوَرُ ہے اور تَزَاوَرَ سے مضارع مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اور تَزَاوَرَعَنْهُ کے معنے ہیں عَدَلَ وَاِنْحَرَفَ منحرف ہوگیا۔ اور علیحدہ ہوگیا (اقرب) باب تفاعل سے پہلے جو مضارع کی تاء آتی ہے بوجہ دو ''ت'' جمع ہوجانے کے۔ ان میں سے پہلی ''ت'' کو حذف کر دینے کی عربی میں اجازت ہے۔

تَقْرِضُهُمْ۔ تَقْرِضُهُمْ قَرَضَ سے مضارع مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ قَرَضَ الشَّیْءَ (يَقْرِضُ قَرْضًا) کے معنے ہیں قَطَعَهٗ کسی چیز کو کاٹا۔ قَرَضَ الْوَادِيَ: جَازَهٗ۔ وادی کو طے کیا۔ قَرَضَ الْمَكَانَ: عَدَلَ عَنْهُ وَتَنَكَّبَهٗ کسی چیز سے علیحدہ اور ایک طرف ہوگیا۔ (اقرب)

اَلْفَجْوَةُ اَلْفُرْجَةُ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ دو چیزوں کے درمیان کشادہ جگہ۔ مَا اتَّسَعَ مِنَ الْاَرْضِ۔ وسیع زمین۔ سَاحَةُ الدَّارِ گھر کا صحن۔ (اقرب)

مُرْشِدًا مُرْشِدًا اَرْشَدَ سے اسم فاعل ہے اور ارشد کے معنے ہیں ھداہُ اسے راستہ دکھایا۔ ۲۔ بتایا اور واضح کیا۔ ۳۔ اور اس کے آگے چل کر منزل مقصود تک لے گیا۔ ۴۔ ایمان کی طرف راہنمائی کی۔ (اقرب)

تفسیر۔ اصحاب الکہف کے غار کا جائے وقوع اس آیت میں غار کا مقام بتایا گیا ہے۔ آیت میں جو علامات بتائی گئی ہیں ان سے ظاہر ہے کہ یہ قوم اونچے شمالی علاقوں میں بسنے والی تھی کیونکہ جب شمال کی طرف جائیں اور مشرق کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوں تو سورج دائیں طرف رہتا ہے اور جب جنوب میں آئیں اور مشرق کی طرف منہ کریں تو بائیں طرف رہتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس غار کا منہ شمال مغرب کی طرف تھا۔ جو عمارت

شمالی رخ ہوگی اس سے سورج دائیں سے بائیں کو ہی گزرے گا۔

فَجْوَةٌ سے پتہ لگتا ہے کہ اندر وسیع علاقہ تھا۔ چنانچہ ان غاروں کے دیکھنے سے تصدیق ہوجاتی ہے کیونکہ وہ بہت ہی وسیع جگہ ہے۔ بعض نے اس کی گلیوں اور اوپر نیچے کے تہ خانوں کا مجموعی اندازہ ۸۷۰ میل تک کا لگایا ہے (یعنی اگر سب گلیوں اور کمروں کو ایک دوسرے کے آگے رکھتے چلے جائیں) اور یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ وہاں روشنی بہت کم پڑتی تھی۔ ورنہ لوگ پکڑے جاتے۔ انہوں نے غار کو ایسی طرز پر بنایا کہ ہوا بھی آئے اور ان کا پتہ بھی نہ لگے۔ چنانچہ سینٹ جیرون چوتھی صدی میں لکھتا ہے کہ وہ کمرے اس قدر تاریک ہیں کہ حیرانی ہوتی ہے۔ کہیں سے عمارت پھٹی ہوئی ہی ہو تو سورج کی کوئی شعاع پڑ سکتی ہے ورنہ نہیں (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Catacombs of Rome)۔

اس کی جائے وقوع بتانے سے یہ مقصد تھا کہ شمال میں کوئی مسلمانوں کا دشمن ہے مسلمان اس سے ہوشیار رہیں مگر مسلمانوں کی غلطی ہے کہ انہوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ اور پھر مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ میں یہ بتایا ہے کہ ہم نے اشارہ تو کر دیا ہے مگر سمجھ وہی سکتا ہے جو ہدایت پر ہو۔ یعنی ان قوموں سے جو دوستانہ سلوک کرے گا وہ ہلاک ہوگا اور جو آپس میں اتفاق کریں گے کامیاب ہوں گے مگر مسلمانوں نے آپس میں لڑائیاں کیں لیکن روم کے بادشاہوں سے صلح رکھی۔ سوائے ابتدائی زمانہ کے کہ جب رومی بادشاہ نے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی جنگ کی خبر معلوم کر کے اسلامی مملکت پر حملہ کرنا چاہا تو حضرت معاویہؓ نے اسے لکھا کہ ہوشیار رہنا ہمارے آپس کے اختلاف سے دھوکا نہ کھانا اگر تم نے حملہ کیا تو حضرت علیؓ کی طرف سے جو پہلا جرنیل تمہارے مقابلہ کے لئے نکلے گا وہ میں ہوں گا۔

اس کے برخلاف جب مسلمان اسلام سے دور جا پڑے تو بغداد کے بادشاہوں نے سپین کو نقصان پہنچانے کے لئے مشرقی رومی حکومت سے جو بازنطینی حکومت کہلاتی تھی صلح کی۔ اور سپین کے مسلمان بادشاہوں نے بغدادی حکومت کے خلاف مدد لینے کے لئے پاپائے روم کو تحفے بھیجے اور اس سے صلح کی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ اس نکتہ کی طرف مجھے قرآنی حروف مقطعات الٓمّٓرٰ نے توجہ دلائی اور مسلمانوں کی یہ دردناک اور عبرتناک غلطی مجھے معلوم ہوئی۔

وَ تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ ۖۗ وَّ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ

اور (اے مخاطب) تو انہیں بیدار سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ سوتے ہیں۔ اور ہم انہیں

الْيَمِيْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ ۖۗ وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ

دائیں طرف (بھی) پھرائیں گے اور بائیں طرف (بھی) اور ان کا کتّا (بھی ان کے ساتھ ساتھ) صحن میں ہاتھ

بِالْوَصِيْدِ ؕ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ

پھیلائے (موجود) رہے گا۔ اگر تو ان کے حالات سے آگاہ ہو جائے تو تو اُن سے بھاگنے کے لئے پیٹھ پھیر لے

لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ⑲

اور ان کی وجہ سے رعب سے بھر جائے۔

حلّ لُغات۔ تَحْسَبُهُمْ تَحْسَبُهُمْ حَسِبَ (يَحْسَبُ) سے مضارع کا صیغہ ہے۔ اور حَسِبَهٗ کے معنے ہیں ظَنَّهٗ اس کے بارے میں گمان کیا۔ (اقرب)

اَيْقَاظًا یہ يَقِظٌ وَيَقُظٌ وَيَقْظَانٌ کی جمع ہے اور يَقِظٌ وَ يَقُظٌ وَيَقْظَانٌ صفت مشبہ کے صیغے ہیں اور يَقِظَ الرَّجُلُ (يَقَظًا) کے معنے ہیں: ضِدُّ نَامَ وَتَنَبَّهَ لِلْاُمُوْرِ وَحَذِرَ وَفَطِنَ۔ وہ بیدار رہا۔ معاملات میں محتاط ہوا۔ چوکس ہوا، سمجھدار رہا۔ (اقرب)

رُقُوْدٌ رُقُوْدٌ رَاقِدٌ کی جمع ہے۔ اور یہ رَقَدَ سے اسم فاعل ہے اور رَقَدَ الرَّجُلُ (يَرْقُدُ۔ رَقْدًا وَرُقُوْدًا وَ رُقَادًا) کے معنے ہیں: نَامَ۔ سو گیا۔ رَقَدَ الْحَرُّ: سَكَنَ۔ گرمی ہٹ گئی۔ رَقَدَ عَنِ الْاَمْرِ: غَفَلَ۔ کسی کام سے غافل ہوا۔ رَقَدَ الثَّوْبُ: اَخْلَقَ۔ کپڑا بوسیدہ ہو گیا۔ اور اَلرَّاقِدُ کے معنے ہیں۔ اَلنَّائِمُ۔ سویا ہوا۔ اس کے علاوہ اس کی جمع رُقَّدٌ بھی آتی ہے۔ (اقرب)

نُقَلِّبُهُمْ نُقَلِّبُهُمْ قلَّبَ (باب تفعیل) سے مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے اور قَلَّبَهٗ کے معنے ہیں حَوَّلَهٗ عَنْ وَجْهِهٖ۔ اس کو اصل مقصد سے پھیر دیا۔ قَلَّبَ الشَّیْءَ: حَوَّلَهٗ وَجَعَلَ اَعْلَاهُ اَسْفَلَهٗ۔ کسی چیز کو اس طرح تبدیل کیا کہ اس کے نیچے کی سطح اوپر آ گئی۔ قَلَّبَ الشَّیْءَ لِلْاِبْتِيَاعِ: تَصَفَّحَهٗ فَرَاٰی دَاخِلَهٗ وَبَاطِنَهٗ۔ کسی چیز کو

خرید نے کے لئے اس کے متعلق پوری واقفیت اور پورا علم حاصل کرلیا۔ قَلَّبَ الْاَمْرَ ظَهْرًا لِبَطْنٍ۔ اِخْتَبَرَهٗ۔ معاملہ کا امتحان کیا۔ قَلَّبَ الْقَوْمَ: صَرَفَهُمْ۔ لوگوں کو رخصت کیا۔ (اقرب)

وَصِيْدٌ وَصِيْدٌ: اَلْفِنَاءُ گھر کا صحن۔ اَلْعَتَبَةُ۔ دروازہ کی دہلیز۔ بَيْتٌ كَالْحَظِيْرَةِ يُتَّخَذُ مِنَ الْحِجَارَةِ لِلْمَالِ اَيِ الْغَنَمِ وَغَيْرِهَا فِي الْجِبَالِ۔ باڑے کی طرح کا چھوٹا سا مکان جو پتھروں سے پہاڑی جگہوں میں جانوروں کے لئے بناتے ہیں۔ اَلْجَبَلُ۔ پہاڑ۔ اَلنَّبَاتُ الْمُتَقَارِبُ الْاُصُوْلِ۔ چھوٹے تنوں والے پودے۔ اَلضَّيِّقُ وَالْمُطْبَقُ۔ تنگ۔ (اقرب)

تفسیر۔ میرے نزدیک اس آیت میں اصحاب کہف کے ابتدائی ایام کا ذکر نہیں بلکہ ان کی اس وقت کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو قرآن کریم کے وقت میں تھی اور یہ بتایا گیا ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ یہ شمالی اقوام جاگ رہی ہیں۔ وہ جاگ نہیں رہیں اس وقت وہ سو رہی ہیں۔ آئندہ زمانہ میں جاگیں گی۔ گویا ان کی موجودہ حالت آئندہ کی حالت کے مقابل پر ایسی ہے کہ ان کو سوتے ہوئے سمجھنا چاہیے۔ اس سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ان دنوں میں تم ان کے زور کو توڑ دو تو آئندہ ان کے شر سے محفوظ رہو گے۔ مگر افسوس حضرت عثمانؓ کے بعد سے اس قوم کی طرف مسلمانوں کی توجہ کم ہوگئی۔ اگر اس وقت مسلمان حملہ کر کے بازنطینی حکومت کو تباہ کر دیتے اور اس کا ان کو حق تھا۔ کیونکہ رومیوں نے حملہ کرنے میں پہل کی تھی۔ تو یقیناً آج دنیا کا نقشہ مختلف ہوتا۔

وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ میں بتایا ہے کہ ان کو آئندہ زمانہ میں ہم دنیا پر پھیلانے والے ہیں وہ وقت ان کی بیداری کا ہوگا۔ پس اس وقت کے آنے سے پہلے مسلمانوں کو اپنی حفاظت کے لئے تدابیر کر لینی چاہئیں۔

اصحاب کہف کے کتے کی تشریح وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ سے رومی بازنطینی حکومت کی طرف اشارہ ہے جو بحیرہ مارمورہ کے دونوں جانب یورپ کی حفاظت کر رہی تھی۔ اگر بحیرہ مارمورہ کو دیکھا جائے تو بالکل یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کتا دائیں بائیں لاتیں پھیلائے پہرہ دے رہا ہے۔ ترکوں نے اس علاقہ کو فتح کیا مگر اس وقت تک مقابلہ کا اصل موقعہ نکل چکا تھا اور شمالی قومیں طاقت پکڑ چکی تھیں۔ جن کا ترک مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ اگر بغداد اور سپین کی حکومتیں مل کر اپنے زمانہ میں شمالی ملکوں میں پھیل جاتیں تو وہ ایک زریں موقعہ تھا۔ یقیناً اس وقت اسلام ان ممالک میں پھیل جاتا اور آج کے تاریک دن دیکھنے میں نہ آتے۔

کہا جا سکتا ہے کہ الٰہی تقدیر کو کس طرح روکا جا سکتا تھا لیکن یہ اعتراض الہامی کلام کی حقیقت کی نافہمی سے پیدا ہوگا۔ الٰہی قانون یہ ہے کہ انذاری پیشگوئیاں ٹل بھی جاتی ہیں۔ کم سے کم اسلام کو جو ضعف آج پہنچ رہا ہے۔

ان حالات میں وہ ایسا شدید نہ ہوتا اور یورپ میں اسلام کے ہمدرد اور مددگار موجود ہوتے جو مسیحی حملہ کی شدت کو بہت کم کر دیتے۔

یہ جو فرمایا کہ اگر تجھے ان کا علم ہو تو تُو ان سے مرعوب ہو جائے۔ اس کا تعلق اس وقت سے ہے جبکہ ان کو شمال اور جنوب میں پھیلا دیا جائے گا۔ چنانچہ دیکھ لو۔ اس وقت ان شمالی قوموں کا کس قدر رعب ہے۔ دنیا کی دوسری حکومتیں اگر کوئی ہیں بھی تو ان کے رحم پر ہیں۔ اور ان کا رعب سب دنیا پر چھایا ہوا ہے۔

وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ سے اس طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ ان قوموں میں کتے رکھنے کا بہت رواج ہوگا۔ چنانچہ دیکھ لو یوروپین قومیں عام طور پر کتے رکھتی ہیں جو ان کے گھروں کے پہرے دیتے ہیں اور پہلا خوف ان کی کوٹھیوں پر جانے والے کے لئے ان کے کتوں سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مخاطب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ یہ نُقَلِّبُهُمْ کے بعد کی حالت کے اثر کا بیان ہے۔ پس اس میں ہر سننے والا ہی مخاطب ہوسکتا ہے۔ یعنی ہر ایک پر اُن کا رعب طاری ہو جائے گا۔ چنانچہ کچھ عرصہ پیشتر تو ساری دنیا میں ہی اس قوم کا رعب مانا جاتا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے اس قوم کی تباہی کے سامان پیدا کر کے دنیا سے اس کے رعب کو کم کر دیا ہے۔ ورنہ اس قوم کا پہلے اس قدر رعب تھا کہ لوگ ریل گاڑی کے اول و دوم درجہ میں بیٹھنے تک سے بھی خوف کھاتے تھے۔ اور یوروپین لوگوں کی شکل تک دیکھنے سے مرعوب ہو جاتے تھے۔

وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ

اور اسی طرح ہم نے انہیں (بے کسی کی حالت سے) اٹھایا اس پر وہ آپس میں (حیرت سے) ایک دوسرے سے سوال

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ

کرنے لگے (اور) ان میں سے ایک کہنے لگا (کہ) تم (یہاں) کتنی دیر ٹھہرے رہے ہو (جو اس کے مخاطب تھے)

بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ

انہوں نے کہا (کہ) ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے ہیں۔ (تب) انہوں نے (یعنی دوسروں نے) کہا (کہ)

فَابۡعَثُوۡۤا اَحَدَکُمۡ بِوَرِقِکُمۡ ھٰذِہٖۤ اِلَی الۡمَدِیۡنَۃِ

جو (عرصہ) تم (یہاں) ٹھہرے رہے ہو اسے تمہارا رب (ہی) بہتر جانتا ہے پس (اس بحث کو چھوڑو اور) یہ اپنے

فَلۡیَنۡظُرۡ اَیُّہَاۤ اَزۡکٰی طَعَامًا فَلۡیَاۡتِکُمۡ

روپے دے کر اپنے میں سے کسی ایک کو اس شہر کی طرف بھیجو اور وہ (جا کر) دیکھے کہ اس (شہر) میں سے کس کا غلہ

بِرِزۡقٍ مِّنۡہُ وَ لۡیَتَلَطَّفۡ وَ لَا یُشۡعِرَنَّ

سب سے اچھا ہے پھر (جس کا غلہ سب سے اچھا ہو) اس سے کچھ کھانے کا سامان لے آئے اور وہ ہوشیاری سے

بِکُمۡ اَحَدًا ﴿۲۰﴾

(لوگوں کی) راز کی باتیں معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ اور تمہارے متعلق کسی کو ہرگز (کوئی) علم نہ ہونے دے۔

حلّ لُغات۔ بِوَرِقِکُمۡ اَلۡوَرِقُ: اَلدَّرَاھِمُ الۡمَضۡرُوۡبَۃُ۔ سرکاری مہر والے سکے۔ (اقرب)

اَزۡکٰی زَکَا الشَّیۡءُ (یَزۡکُوۡ) نَمَا۔ کوئی چیز بڑھ گئی۔ زَکَا الرَّجُلُ: صَلُحَ وَتَنَعَّمَ وَکَانَ فِیۡ خِصۡبٍ۔ کسی شخص کی حالت درست ہوگئی۔ اور وہ آسودہ حال ہو گیا اور خوب عیش سے رہنے لگا (اقرب) الزَّکَاۃُ کے معنے: الطَّھَارَۃُ۔ پاکیزگی۔ والنَّمَاءُ وَالۡبَرَکَۃُ۔ ہر چیز کا بڑھنا اور اس میں برکت کا ہونا۔ (تاج)

اَلطَّعَامُ الطَّعَامُ: اِسۡمٌ لِمَا یُؤۡکَلُ۔ خوراک۔ کھانا۔ وَقَدۡ غَلَبَ الطَّعَامُ عَلَی الۡبُرِّ۔ اور زیادہ گندم پر طعام کا لفظ بولا جاتا ہے۔ وَرُبَّمَا اُطۡلِقَ عَلَی الۡحُبُوۡبِ کُلِّھَا۔ اور بسا اوقات تمام قسم کے دانوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ (اقرب)

الرِّزق الرِّزۡقُ: مَا یُنۡتَفَعُ بِہٖ۔ ہر وہ چیز جس سے نفع اٹھایا جائے۔ مَا یُخۡرَجُ لِلۡجُنۡدِیِّ رَأۡسَ کُلِّ شَھۡرٍ۔ ہر ماہ کے اخیر پر تنخواہ جو سپاہی کو دی جائے۔ (اقرب)

وَلۡیَتَلَطَّفۡ وَلۡیَتَلَطَّفُ تَلَطَّفَ۔ (باب تفعّل) سے امر کا صیغہ ہے اور تَلَطَّفَ الۡاَمۡرَ وَفِی الۡاَمۡرِ کے معنے ہیں تَرَفَّقَ فِیۡہِ۔ اس نے کسی معاملہ میں نرمی کی۔ تَخَشَّعَ۔ عاجزی کی۔ تَلَطَّفَ بِفُلَانٍ: اِحۡتَالَ لَہٗ حتّٰی

اِطَّلَعَ عَلٰی اَسْرَارِہٖ اس نے حیلوں کے ذریعہ سے اس کے بھیدوں پر اطلاع پائی۔ (اقرب)

وَلَا یُشْعِرَنَّ بِکُمْ یُشْعِرَنَّ شَعَرَ کے باب افعال کا صیغہ مضارع واحد مذکر غائب ہے۔ شَعَرَ کے لئے دیکھو سورۂ یوسف آیت نمبر ۱۰۸۔

شَعَرَ بِہٖ عَلِمَ بِہٖ۔ معلوم کیا۔ لِکَذَا: فَطِنَ لَہٗ۔ اس کو سمجھا۔ عَقَلَہٗ۔ اس کو پہچانا۔ اَحَسَّ بِہٖ۔ محسوس کیا۔ (اقرب)

تفسیر ۔ اس جگہ بھی ان اصحاب کہف کا ذکر نہیں جو ابتدائی ایام میں غاروں میں چھپتے تھے۔ بلکہ نُقَلِّبُھُمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ کے وقت کا حال بتایا ہے اور بَعَثْنٰھُمْ سے مراد آئندہ زمانہ میں شمالی اقوام کی ترقی کا جو مسیحی ہو چکی ہوں گی ذکر کیا گیا ہے۔ ماضی کے صیغہ سے آئندہ کی خبر دینا قرآن کریم کا عام محاورہ ہے اور جیسا کہ متعدد بار پہلے ثابت کیا جا چکا ہے۔ ماضی کے صیغہ سے آئندہ کی خبر دینے سے اس کے یقیناً واقع ہو جانے کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ اَتٰۤی اَمْرُ اللّٰہِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْہُ (النحل: ۲) وغیرہ بہت سی آیات ہیں۔ اسی طریق کلام کو یہاں اختیار کیا گیا ہے۔

اصحاب کہف کی بعثت سے مراد غرض اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہم ایک دن ان قوموں کو جو اس وقت سو رہی ہیں بیدار کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ آپس میں یہ سوال کریں گی کہ تم کس قدر عرصہ تک سوتے رہے ہو یعنی اب بیدار ہونا چاہیے۔ چنانچہ صلیبی جنگوں کے وقت ان اقوام میں بیداری پیدا ہوئی اور انہوں نے اسلام کے خلاف جتھہ بازی کی اور اسلامی ممالک پر حملہ شروع کیا۔

اصحاب کہف کے عرصہ قیام کی تشریح یہ جو فرمایا ہے کہ لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ ان کو شک تھا کہ ہم دن یا دن کا کوئی حصہ سوتے رہے ہیں۔ بلکہ اس کے معنے عربی محاورہ میں غیر معین اور لمبی مدت کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ قیامت کے دن کفار کے سوال و جواب میں بھی یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ فرماتا ہے قیامت کے دن ہم کفار سے پوچھیں گے کہ کَمْ لَبِثْتُمْ فِی الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِیْنَ بتاؤ کہ تم دنیا میں کس قدر عرصہ رہے۔ اس کے جواب میں کفار کہیں گے لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّیْنَ۔ ہم دن یا دن کا کچھ حصہ رہے۔ پس آپ ان سے پوچھیئے جو گننے پر مقرر ہیں۔ (المومنون: ۱۱۳، ۱۱۴) ان آیات میں سوال کی عبارت سے بھی اور اس جواب سے بھی ظاہر ہے کہ ان کی مراد یہ ہے کہ ایک غیر معین عرصہ تک ہم رہے۔ یہی معنے اس جگہ ہیں۔ کہ ایک غیر معین

عرصہ تک ہم سوئے رہے۔ایک اور جگہ قرآن کریم میں اس عرصہ کو ایک ہزار سال بتایا گیا ہے۔سورۃ طٰہٰ میں فرماتا ہے یَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا۔ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا (طٰہٰ:۱۰۳، ۱۰۴) یعنی جب صور پھونکا جائے گا اور ہم مجرموں کو ہوشیار کر کے کھڑا کر دیں گے جو نیلی آنکھ والے رومی قوم کے ہوں گے وہ آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کریں گے اور کہیں گے کہ تم دس تک سوتے رہے۔دس سے مراد دس صدیاں ہیں یعنی ہزار سال تک سوتے رہے۔

زُرْقٌ کا لفظ جو آیت میں آیا ہے اس کے معنے نیلی آنکھوں والوں کے ہیں۔یوروپین لوگوں کی آنکھیں بوجہ رنگ کی سفیدی کے نیلی ہوتی ہیں اور عرب لوگ رومیوں کو ازرق کہتے تھے یعنی نیلی آنکھوں والے۔چنانچہ لغت میں لکھا ہے أَزْرَقٌ کے معنے دشمن کے بھی ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ روم اور دیلم کی آنکھیں نیلی ہوتی ہیں اور عرب لوگ ان کو اپنا بڑا دشمن سمجھتے تھے اس لئے آہستہ آہستہ اس لفظ کے معنے عربوں میں دشمن کے ہو گئے (اقرب)

خلاصہ یہ کہ اس آیت کا یہ مفہوم نہیں کہ انہیں شبہ تھا کہ وہ شاید تھوڑی دیر تک اس غفلت کی حالت میں رہے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک لمبا غیر معین عرصہ اس حالت میں رہے ہیں۔سورۃ طٰہٰ میں اس عرصہ کی مقدار ایک ہزار سال بتائی ہے۔چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے ایک ہزار سال کا عرصہ شمار کیا جائے تو حساب یوں بنتا ہے۔رسول کریم صلعم کی پیدائش مطابق شمار سر ولیم میور ۵۷۰ء میں ہوئی۔(لائف آف محمد باب ۱ صفحہ ۵) دعویٰ نبوت چالیس سال بعد ہوا۔پس دعویٰ کی تاریخ ہوئی ۶۱۱ء۔اس میں ہزار سال جمع کئے جائیں تو ۱۶۱۱ء یا ۱۶۱۲ء بنتے ہیں۔اور یہی وہ تاریخیں ہیں جن میں ہندوستان میں انگریزوں کے قدم جمے ۱۶۱۱ء میں مغلیہ حکومت نے خلیج بنگال میں کام کرنے کی انگریزوں کو اجازت دی۔اور ۱۶۱۲ء میں سُورتؔ میں پہلا کارخانہ کھولنے کی اجازت دی (مارچ آف مین March of Man مطبوعہ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا سوسائٹی) دنیا جانتی ہے کہ یورپ کی ترقی اور اس کے دنیا میں پھیلنے کی یہ پہلی بنیاد تھی۔یورپ نے انگریزوں کے نقش قدم پر اور ان کے سہارے پر ترقی کی ہے۔اور انگریزوں کی ترقی کا راز ہندوستان میں ان کا وارد ہونا ہے۔ہندوستان ہی میں قدم جمنے پر انہوں نے دوسرے ایشائی ممالک پر اور افریقہ پر قبضہ کیا۔اور ان کے اس طرح اقتدار حاصل کرنے پر دوسری یوروپین اقوام نے دنیا میں ترقی کی۔

شاید کوئی کہے کہ ذکر تو رومیوں کا تھا انگریزوں کا ان امور سے کیا تعلق؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یورپ کا موجودہ تمدن رومی اثر کا ہی نتیجہ ہے اور سب یورپ روم کا شاگرد ہے اور اسی کی تہذیب کی یادگار۔اور یورپ میں

عیسائیت بھی روم کے ہی ذریعہ سے قائم ہوئی ہے اس لئے شاخوں کا کام جڑ ہی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

اَزۡکٰی کے معنے اَصۡلَحَ کے ہوتے ہیں۔یعنی مناسب حال۔اوراس کے معنے اعلیٰ درجہ کے بھی ہیں یورپ کی قوموں کے پھیلنے کی بڑی وجہ یہی ہوئی ہے کہ ان کے ملکوں میں غلہ کافی نہیں ہوتا اور وہ غلے اور مصالحے ایشیا سے لے جاتے تھے۔پہلے عربوں کی معرفت وہ چیزیں خریدتے تھے۔لیکن جب ہندوستان کا راستہ دریافت ہو گیا تو انہوں نے براہ راست ان اشیاء کی تجارت اپنے ہاتھ میں لے لی۔اور آہستہ آہستہ دوسری چیزوں کی تجارت بھی ان کے ہاتھ میں آ گئی۔

طَعَامٌ کے معنے اس جگہ پکے ہوئے کھانے کے نہیں۔عربی زبان میں طعام ہر کھانے کی چیز کو کہتے ہیں۔خصوصاً گندم کو۔اور جب تک امریکہ نے گندم کی پیداوار میں کوشش نہیں کی جو بالکل قریب زمانہ کی بات ہے دوسو سال تک یورپ کو ہندوستان ہی گندم مہیا کرتا رہا ہے۔

گویا انہوں نے اس غلہ خریدنے والے کو ہدایت کی کہ چونکہ ہم نے اس غلہ کو ذخیرہ کرنا ہے اور دیر تک جمع رکھنا ہے اس لئے مناسب طعام دیکھ کر لانا۔

یہ جو فرمایا ہے وَلۡیَتَلَطَّفۡ یہ مغربی قوموں کا خاصہ ہے۔ان کے باہر جانے والے افسروں کو خاص ہدایت ہوتی ہے کہ وہ بہت میٹھے طور پر باتیں کریں اور تاجر بھی ایسے میٹھے رہتے ہیں کہ لوگوں میں جوش پیدا نہیں ہوتا۔

وَلَا یُشۡعِرَنَّ بِکُمۡ اَحَدًا اس آیت میں گو اَحَدًا کا لفظ آیا ہے۔اور ضمائر بھی مفرد کے استعمال ہوئے ہیں۔لیکن میرے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ ایک ہی آدمی کا بھجوایا جانا یہاں مراد ہو۔قرآن کریم میں حضرت آدم کے قصے میں ابلیس کا ذکر آتا ہے اور سب باتیں اسی کو مخاطب کر کے کہی گئی ہیں۔لیکن دوسرے مقامات پر اس کے ساتھ اور جماعت بھی تسلیم کی گئی ہے۔جیسے کہ فرماتا ہے بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہوں گے اسی طرح بعض دوسرے مقامات پر ابلیس کی ذریت کا بھی ذکر کیا ہے۔پس گو لفظ اَحَدَ کُمۡ کا استعمال ہوا ہے مگر مراد یہ ہے کہ اپنے میں سے بعض کو سودا خریدنے کے لئے بھجواؤ اور مفرد کا لفظ میرے نزدیک اس نظام پر دلالت کرنے کے لئے رکھا گیا ہے کہ ایک نظام کے ماتحت جائیں اور ذمہ دار اور جوابدہ ایک ہی شخص ہو۔

کسی کو تمہارا علم نہ ہونے سے یہ مراد ہے کہ اپنے وجود کو محسوس نہ ہونے دینا اور یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ تمہاری قوم کی نیت ان ممالک میں نفوذ پیدا کرنے کی ہے۔بلکہ ایسی طرح معاملہ کرنا کہ تمہاری آمد کی اغراض کو لوگ تاڑ نہ جائیں اور تمہارے اصلی منشاء کو نہ پہچانیں۔

اوراس میں مشورہ دینے والوں کے لئے اور جن کو مشورہ دیا گیا ہے ان کے لئے جو جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اس سے میرے نزدیک اس طرف اشارہ ہے کہ یہ وفد بھیجے والی ایک کمپنی ہوگی کوئی بادشاہ یہ کام نہ کرے گا۔ چنانچہ انگریزی وفد جو ہندوستان آیا۔ یا فرانسیسی وفود جو آئے یہ سب کمپنیوں کی طرف سے تھے۔ ان کا آقا کوئی ایک فرد نہ تھا بلکہ کمپنیاں تھیں (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ India)۔

اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ

(کیونکہ) اگر وہ تم پر غلبہ پا لیں تو یقیناً تمہیں سنگسار کردیں گے یا (جبراً) تمہیں واپس اپنے مذہب میں داخل کرلیں

مِلَّتِهِمْ وَ لَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۱﴾

گے اوراس صورت میں کبھی (بھی) کامیاب نہیں ہوگے۔

حلّ لُغات۔ يَظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ ظَهَرَ (يَظْهَرُ عَلَيْهِ): غَلَبَهٗ۔ اس پر غالب آیا۔ ظَهَرَ فُلَانٌ عَلٰى سِرِّهٖ: اِطَّلَعَ عَلَيْهِ۔ کسی بھید پر مطلع ہوا۔ (اقرب)

يَرْجُمُوْكُمْ: يَرْجُمُوْكُمْ رَجَمَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ رجم کے معنے کے لئے دیکھو سورۃ حجر آیت نمبر ۱۸۔

رَجِيْمٌ رَجَمَ میں سے ہے۔ اور رَجَمَهٗ رَجْمًا کے معنے ہیں: رَمَاهُ بِالْحِجَارَةِ۔ اس پر پتھر برسائے۔ قَتَلَهٗ اس کو قتل کیا۔ قَذَفَهٗ۔ اس پر تہمت لگائی۔ لَعَنَهٗ۔ لعنت کی۔ شَتَمَهٗ۔ گالی دی۔ هَجَرَهٗ۔ چھوڑ دیا۔ ترک کردیا۔ اَلْقَبْرَ: عَلَّمَهٗ۔ قبر پر نشان لگایا۔ جَاءَ يَرْجُمُ کے معنے ہیں۔ اِذَا مَرَّ وَهُوَ يَضْطَرِمُ فِيْ عَدْوِهٖ۔ تیزی سے دوڑتا ہوا گزرا۔ اَلرَّجُلُ: تَكَلَّمَ بِالظَّنِّ ظنی بات کی۔ (اقرب)

اَلرَّجْمُ اَيْضًا اَنْ يَّتَكَلَّمَ بِالظَّنِّ۔ رجم کے معنے غیر یقینی بات کرنے کے بھی ہیں جیسے آیت رَجْمًا بِالْغَيْبِ میں رجم کے معنے ہیں۔ لَا يُوْقَفُ عَلٰى حَقِيْقَتِهٖ۔ یعنی بات کی حقیقت سے واقف نہ تھا۔ اِسْمُ مَا يُرْجَمُ بِهٖ جس چیز سے مارا جائے اس کو بھی رجم کہتے ہیں۔ اس کی جمع رُجُوْمٌ آتی ہے۔ (اقرب)

اَلرِّجَامُ اَلْحِجَارَةُ۔ رِجَامٌ کے معنے پتھروں کے ہیں۔ اور اَلرَّجْمُ کے معنے ہیں۔ اَلرَّمْيُ بِالرِّجَامِ کسی کو پتھر مارنا۔ جب کسی پر پتھراؤ کیا جائے تو رُجِمَ بصیغہ مجہول استعمال کرتے ہیں۔ وَيُسْتَعَارُ الرَّجْمُ لِلرَّمْيِ بِالظَّنِّ۔

اور استعارۃً رجم کا لفظ خیالی اور غیر یقینی بات کے کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔وَالتَّوَھُّمِ وَلِلشَّتْمِ وَالطَّرْدِ۔نیز یہ لفظ وہم سے بات کرنے۔گالی دینے اور دھتکارنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور اَلشَّیْطَانُ الرَّجِیْمُ کے معنے ہیں اَلْمَطْرُوْدُ عَنِ الْخَیْرَاتِ۔نیکیوں سے دور خوبیوں سے محروم و عاری۔وَعَنْ مَنَازِلِ الْمَلَأِ الْاَعْلٰی فرشتوں کے مقامات سے دور کیا ہوا (مفردات) اور مجمع البحار میں ہے وَرُجُوْمًا لِلشَّیَاطِیْنِ وَعَلَامَاتٍ ھُوَجَمْعُ رَجْمٍ مَصْدَرٌ سُمِّیَ بِہٖ۔ رجم کا لفظ مصدر ہے جو اسم کے طور پر استعمال ہوا ہے۔اور رُجُوْمٌ اس کی جمع ہے۔ وَیَجُوْزُ کَوْنُہٗ مَصْدَرًا لَاجَمْعًا اور یہ بھی ہوسکتا ہے۔کہ رجوم مصدر ہو نہ کہ جمع۔ وَمَعْنَاہُ اَنَ الشُّھَبَ الَّتِیْ تَنْقَضُّ مُنْفَصِلَۃً مِنْ نَارِ الْکَوَاکِبِ وَنُوْرِھَا لَا اَنَّھُمْ یُرْجَمُوْنَ بِاَنْفُسِ الْکَوَاکِبِ لِاَ نَّھَا ثَابِتَۃٌ لَا تَزُوْلُ کَقَبَسٍ تُؤْخَذُ مِنْ نَارٍ۔یعنی وہ شہب جو ستاروں کی آگ سے علیحدہ ہو کر ٹوٹتے ہیں۔وہ خود ستارے نہیں ہوتے۔ بلکہ ستاروں سے روشنی گرتی ہے کیونکہ ستارے اپنی جگہ پر قائم ہیں اور شہب کا گرنا اسی طرح ہوتا ہے جیسے ایک چنگاری آگ سے لی جاتی ہے۔وَقِیْلَ اَرَادَ بِالرُّجُوْمِ الظُّنُوْنَ الَّتِیْ تُحْزَرُ وَمِنْہُ یَقُوْلُوْنَ خَمْسَۃٌ سَادِسُھُمْ کَلْبُھُمْ رَجْمًا بِالْغَیْبِ۔اور بعض محققین نے یہ کہا ہے کہ رُجُوْمٌ سے مراد وہ خیالات ہیں جو اپنے قیاس سے بغیر دلیل کے انسان بنالیتا ہے اور انہی معنوں میں قرآن میں لفظ رَجْمًا بِالْغَیْبِ استعمال ہوا ہے۔یعنی وہ غیب کے متعلق صرف اندازے لگاتے ہیں۔

الملّۃ اَلْمِلَّۃُ اس کے لئے دیکھو ابراہیم آیت نمبر ۱۴۔

اَلْمِلَّۃُ: اَلشَّرِیْعَۃُ اَوِ الدِّیْنُ۔ شریعت اور دین کو ملت کہتے ہیں۔ وَقِیْلَ الْمِلَّۃُ وَالطَّرِیْقَۃُ سَوَاءٌ۔ بعض کہتے ہیں کہ ملت اور طریقہ ہم معنے لفظ ہیں۔ وَھِیَ اِسْمٌ مِنْ اَمْلَیْتُ الْکِتٰبَ ثُمَّ نُقِلَتْ اِلٰی اُصُوْلِ الشَّرَائِعِ بِاِعْتِبَارِ اَنَّھَا یُمْلِیْھَا النَّبِیُّ اور ملت اسم ہے جو اَمْلَیْتُ الْکِتَابَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے پھر وہ شریعت کے اصول کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔کیونکہ شریعت کے اصول نبی لکھاتا ہے۔وَقَدْ تُطْلَقُ عَلَی الْبَاطِلِ کَالْکُفْرِ مِلَّۃٌ وَاحِدَۃٌ اور کبھی یہ لفظ جھوٹے مذہبوں پر بھی بولا جاتا ہے۔جیسے اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَاحِدَۃٌ کے محاورہ سے ظاہر ہے۔وَلَا تُضَافُ اِلَی اللہِ وَلَا اِلٰی اُحَادِ الْاُمَّۃِ۔اور یہ اللہ کی طرف منسوب نہیں ہوتا۔اور نہ امت کے کسی فرد کی طرف۔یعنی دِیْنُ اللہِ تو کہہ سکتے ہیں مگر مِلَّۃُ اللہِ نہیں کہہ سکتے۔اسی طرح قوم کی ملت کہیں گے زید یا بکر کی ملت کا لفظ نہیں بولیں گے۔(اقرب)

تفسیر۔اس میں بتایا گیا ہے کہ اگر ان اقوام کو جن کی طرف تم وفد بھیج رہے ہو تمہارا علم ہو گیا (ظَھَرَ عَلٰی

السِّرِّ کے معنے ہوتے ہیں اس کو راز معلوم ہو گیا) یا یہ کہ اگر جھگڑا ہو گیا اور قدم جمانے سے پہلے ان سے لڑائی ہو گئی اور تم مغلوب ہو گئے تو وہ تم کو اپنے ملکوں سے نکال دیں گے۔(رجم کے معنے دھتکار دینے کے بھی ہوتے ہیں) (اقرب) یا اگر نہ نکالیں تو تم کو مجبور کریں گے کہ ان کے مذاہب میں داخل ہو جاؤ اور اگر ایسا ہوا یعنی تم کو انہوں نے ملک سے نکال دیا۔ یا یہ کہ تم کو اپنے مذاہب میں داخل کر دیا۔ تو تمہارا زور ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جائے گا اور پھر کبھی ترقی نہ کر سکو گے۔ چنانچہ دیکھ لو کہ یوروپین قومیں سیاسی اغراض کی وجہ سے ہمیشہ عیسائی مذہب کی مدد کرتی ہیں اور دوسری اقوام کے خیالات اپنے اندر پھیلنے سے روکنے کے لئے ہر قسم کی تدابیر اختیار کرتی رہتی ہیں۔

وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ

اور اسی طرح ہم نے (لوگوں کو) ان (کے حالات) سے آگاہ کیا ہے تا انہیں معلوم ہو کہ اللہ (تعالیٰ) کا وعدہ

اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ

پورا ہو کر رہنے والا ہے اور (یہ بھی) کہ اس (موعودہ) گھڑی (کے آنے) میں کچھ بھی شک نہیں (اور اس وقت کو بھی

اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ؕ

یاد کرو) جب وہ اپنے کام کے متعلق آپس میں گفتگو کرنے لگے اور انہوں نے (ایک دوسرے سے) کہا (کہ) تم ان

قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰۤى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ

(کے رہنے کے مقام) پر کوئی عمارت بناؤ۔ ان کا رب ان (کے حال) کو سب سے بہتر جانتا تھا۔ (آخر) جنہوں

مَّسْجِدًا ﴿۲۲﴾

نے اپنے قول میں غلبہ حاصل کر لیا انہوں نے کہا (کہ) ہم (تو) ان (کے رہنے کے مقام) پر مسجد (ہی) بنائیں گے

حلّ لُغَات۔ اَعْثَرْنَا اَعْثَرْنَا اَعْثَرَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور اَعْثَرَ فُلَانًا عَلَى السِّرِّ وَغَيْرِهٖ کے معنے ہیں: اَطْلَعَهٗ۔ اس کو بھیدوں پر مطلع کیا۔ اَعْثَرَ فُلَانًا عَلٰى اَصْحَابِهٖ: دَلَّهٗ عَلَيْهِمْ۔ کسی کو اپنے دوستوں کے متعلق آگاہ کیا۔ اَعْثَرَ بِهٖ عِنْدَ السُّلْطَانِ: قَدَحَ فِيْهِ وَ طَلَبَ تَوْرِيْطَهٗ وَاَنْ يَقَعَ فِيْ عَاثُوْرٍ۔ بادشاہ کے ہاں اس پر

جرح کی اور اس کے مرتبہ کو گرایا (اقرب)

الساعۃ اَلسَّاعَۃُ کے لئے دیکھو سورۃ نحل آیت نمبر ۶۲۔

رَیْب رَیْبٌ رَابَ (یَرِیْبُ رَیْبًا) کا مصدر ہے اور رَابَ کے معنے ہیں اَوْقَعَہٗ فِی الرَّیْبِ وَاَوْصَلَ اِلَیْہِ الرِّیْبَۃَ۔ اسے شک میں ڈالا نیز اَلرَّیْبُ کے معنے ہیں اَلظِّنَّۃُ وَالتُّھْمَۃُ۔ ظن۔ تہمت۔ الشَّکُّ۔ شک۔ اَلْحَاجَۃُ۔ حاجت۔ (اقرب)

یتنازعون یَتَنَازَعُوْنَ تَنَازَعَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور تنازَعُوْا کے معنے ہیں اِخْتَلَفُوْا۔ انہوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ تَنَازَعُوْا فِی الشَّیْءِ: تَخَاصَمُوْا۔ کسی چیز میں جھگڑا کیا۔ (اقرب)

بنیانًا بُنْیَانًا بَنٰی کا مصدر ہے اور بَنَاہُ (یَبْنِیْہِ بُنْیَانًا) کے معنے ہیں: نَقِیْضُ ھَدَمَہٗ۔ کسی چیز کو بنایا۔ بَنَی الْاَرْضَ: بَنٰی فِیْھَا دَارًا اَوْ نَحْوَھَا۔ کسی زمین میں مکان بنایا۔ (اقرب)

المسجد اَلْمَسْجِدُ وَ الْمَسْجَدُ: اَلْمَوْضِعُ الَّذِیْ یُسْجَدُ فِیْہِ۔ وہ جگہ جہاں سجدہ کیا جائے۔ کُلُّ مَوْضِعٍ یُتَعَبَّدُ فِیْہِ۔ ہر وہ جگہ جہاں عبادت کی جائے۔ وَقِیْلَ اِنَّ الْمَسْجِدَ بِالْکَسْرِ اِسْمٌ لِمَوْضِعِ الْعِبَادَۃِ یُسْجَدُ فِیْہِ اَوْلَمْ یُسْجَدْ۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مَسْجِدٌ (بِکَسْرِ جِیْمٍ) مطلق عبادت کی جگہ کو کہتے ہیں۔ خواہ اس میں سجدہ کیا جائے یا نہ۔ (اقرب)

تفسیر ۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ یہ اقوام جو عرصہ تک دنیا سے الگ رہی تھیں۔ اس طرح پھر دنیا سے روشناس ہو گئیں اور دنیا کو معلوم ہو گیا کہ مسیحی اقوام کے آخری ایام میں غلبہ کی جو خبر ہم نے دی تھی وہ بالکل سچی تھی اور یہ کہ وہ موعود گھڑی جس سے ہم ڈرا رہے تھے ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

عیسائیوں میں مردوں کے نام گرجے بنانے کی عادت اِذْ یَتَنَازَعُوْنَ سے پھر اصحاب کہف کی ابتدائی حالت کا کچھ ذکر فرمایا اور ان کی ایک علامت بتائی۔ فرماتا ہے کہ اس قوم نے جب سے ہوش سنبھالی ہے ان میں یہ عادت ہے کہ اپنے وفات یافتوں کے نام پر مساجد یعنی معابد بناتے ہیں۔ جو ان کے بزرگ گذرے ہیں ان کی یاد میں ہر جگہ گرجے بناتے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو مسیحی ہی ایک قوم ہے جن میں بزرگوں کے نام پر گرجے بنائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی مسجد کسی بزرگ کے نام پر نہیں بنائی جاتی اور نہ یہود میں ایسا ہوتا ہے۔ مگر مسیحیوں کے ہزاروں گرجے بزرگوں کی یاد میں ہیں بلکہ گرجوں میں یہ لوگ مردوں کو دفن بھی کرتے ہیں۔ ابتدائی اصحاب کہف کی یادگار میں بھی کیٹا کومبز میں بہت سے گرجے بنے ہوئے ہیں (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Catacombs)۔

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ

وہ (لوگ جو حقیقت حال سے بے خبر ہیں ضرور) غیب کے متعلق نشانہ بازی کرتے ہوئے (کبھی) کہیں گے (کہ وہ

سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ

صرف) تین (آدمی) تھے جن کے ساتھ چوتھا ان کا کتا تھا اور (کبھی) کہیں گے (کہ وہ) پانچ تھے جن کے ساتھ

ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ

چھٹا ان کا کتا تھا۔ اور (ان میں سے بعض یوں بھی) کہیں گے (کہ وہ) سات تھے اور ان کے ساتھ آٹھواں ان

اِلَّا قَلِيْلٌ ۫ۗ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۖ وَّلَا

کا کتا تھا تو (انہیں) کہہ (کہ) ان کی (صحیح) گنتی کو اللہ (تعالیٰ ہی) بہتر جانتا ہے (اور) تھوڑے لوگوں کے سوا

تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ۟ؑ (۲۳)

انہیں کوئی نہیں جانتا۔ پس تو ان کے متعلق مضبوط بحث کے سوا کوئی بحث نہ کر اور ان کے بارہ میں ان میں سے کسی سے حقیقت حال دریافت نہ کر۔

حلّ لُغات۔ رَجْمًا بِالْغَيْبِ اَلرَّجْمُ: اَنْ يُّتَكَلَّمَ بِالظَّنِّ۔ يُقَالُ "رَجْمًا بِالْغَيْبِ" اَیْ لَا يُوْقَفُ عَلٰى حَقِيْقَتِهٖ۔ رجم کے معنے ظنی طور پر بات کرنے کے ہیں۔ اور رَجْمًا بِالْغَيْبِ انہی معنوں میں ہے کہ اس نے بات تو کی لیکن اس کی حقیقت سے بے خبر تھا۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو سورہ حجر آیت نمبر ۳۰ یا الکھف آیت نمبر ۲۰۔

تُمَارِ مَارَاهُ (مُمَارَاةً وَمِرَاءً) کے معنے ہیں جَادَلَهٗ وَنَازَعَهٗ۔ اس نے اس سے جھگڑا کیا۔ وَلَاجَّهٗ وَطَعَنَ فِيْ قَوْلِهٖ تَزْيِيْفًا لِلْقَوْلِ وَتَصْغِيْرًا لِلْقَوْلِ۔ اس نے نہایت سختی سے جھگڑا کیا اور مدمقابل کی بات کو ساقط قرار دیتے ہوئے طعنہ زنی کی اور کلام کی اہانت کی۔ (اقرب)

لَاتَسْتَفْتِ لَاتَسْتَفْتِ اِسْتَفْتٰى سے نہی کا صیغہ ہے اور اِسْتَفْتٰى فُلَانٌ الْعَالِمَ فِيْ مَسْئَلَةٍ

(اِسۡتِفۡتَاءً) کے معنے ہیں سَاَلَهٗ اَنۡ يُّفۡتِيَهٗ فِيۡهَا۔اس نے کسی عالم سے چاہا کہ وہ اس کے متعلق اسے واقفیت بہم پہنچائے۔(اقرب)

تفسیر۔اصحاب کہف کی گنتی کوصرف اللہ ہی جانتا ہے اس آیت میں پھر ابتدائی اصحاب کہف کی نسبت ایک اور بحث کا ذکر فرمایا ہے کہ کوئی ان کو تین بتا تا ہے کوئی پانچ ،کوئی چار کوئی پانچ ،مگر یہ سب ظنی باتیں ہیں اور کوئی کہتا ہے کہ سات ہیں آٹھواں ان کا کتا ہے۔

بعض نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سات تھے۔کیونکہ پہلے اعداد کے ساتھ تو فرمایا یہ ظنی باتیں ہیں اور اس آخری تعداد کو بعد میں بیان کیا ہے معلوم ہوا یہ قول درست ہے۔حالانکہ یہ قول بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب نہیں کیا۔بلکہ دوسروں کی طرف منسوب کیا ہے اور اس کے بعد فرمایا ہے کہ تو ان سب لوگوں سے کہہ دے کہ اللہ ان کی گنتی کو جانتا ہے۔اگر یہ آخری گروہ صحیح اندازہ بیان کرنے والا ہوتا تو ان کو یہ کیوں کہا جاتا کہ اللہ تعالیٰ ان کی گنتی کو جانتا ہے۔پھر تو یہ کہنا چاہیے تھا کہ تُو ان لوگوں سے کہہ دے کہ تمہارا بیان صحیح ہے۔پس درحقیقت اس قول والوں کی بھی تردید کی گئی ہے کیونکہ اصحاب کہف پانچ سات نہ تھے۔بلکہ وہ تو مختلف اوقات میں غاروں میں چھپتے رہے اور ہزاروں کی تعداد میں تھے۔پس اصل بات یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ان کی گنتی کوئی نہیں جانتا۔مَا يَعۡلَمُهُمۡ اِلَّا قَلِيۡلٌ۔کے یہ معنے نہیں کہ تھوڑے سے لوگوں کو ان کی گنتی معلوم ہے۔بلکہ یا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی گنتی کوئی بھی نہیں جانتا۔کیونکہ قلیل کا لفظ عربی میں اسی طرح نفی کے لئے آتا ہے جس طرح انگریزی میں فیو Few کا لفظ نفی کے لئے آتا ہے۔چنانچہ کہتے ہیں قَلِيۡلٌ مِّنَ الرِّجَالِ يَقُوۡلُ ذَالِكَ اور اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ کوئی یہ نہیں کہتا(اقرب) یا پھر اس آیت میں چونکہ گنتی کا لفظ نہیں اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ اصحاب کہف کی حقیقت کو تھوڑے آدمی جانتے ہیں۔یعنی وہ جو صحیح تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ ابتدائی مسیحی لوگ تھے جو کیٹا کومبز میں چھپا کرتے تھے۔باقی لوگ ان کے بارہ میں مختلف قصوں سے دھوکا کھا رہے ہیں۔چنانچہ ان قلیل کے علم کا ہی نتیجہ ہے کہ آخر ان کی اصل حقیقت ظاہر ہوگئی۔

آگے فرمایا کہ ان کے بارہ میں سوائے اصولی بات کے اور کوئی بات نہ کرو۔یعنی تفاصیل دنیا کو معلوم نہیں ہیں۔پس صرف اصولی باتیں کرو اور تفاصیل میں نہ پڑو۔اور یہ کہہ کر کہ لوگوں سے ان کے بارہ میں سوال نہ کرو یہ بتایا ہے کہ تاریخ کا یہ حصہ مٹ گیا ہے کوئی بھی پوری تفصیل اس واقعہ کی نہیں بتا سکتا۔اس لئے اگر تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہو گے تو غلطی کرو گے۔مگر افسوس کہ مسلمانوں نے اس حکم کے باوجود کتے کا رنگ اور اس کا قد تک یہود

ونصاریٰ سے پوچھنے کی کوشش کی اوراس طرح تفاسیر میں بے ثبوت روایات کا وہ ذخیرہ جمع کر دیا کہ اسے پڑھ کر رونا آتا ہے۔

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۴﴾

اور تُو کسی بات کے متعلق (دعویٰ سے) ہرگز نہ کہہ (کہ) میں کل یہ (کام) ضرور کروں گا۔ سوائے اس (صورت)

اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۫ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ

کے کہ اللہ (تعالیٰ کسی امر کے متعلق ایسا کہنا) پسند کرے۔ اور جب (کسی وقت) تو بھول جائے تو (یاد آجانے پر)

وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ

اپنے رب کو یاد (کیا) کر اور (لوگوں سے) کہہ دے (کہ مجھے کامل) امید ہے کہ میرا رب مجھے اس (راستہ)

مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۵﴾

پر چلائے گا جو ہدایت پانے کے لحاظ سے اس (میرے موجودہ طریق) سے (بھی تکمیل کے) زیادہ قریب ہوگا۔

حلّ لُغَات۔ الغد اَلْغَدُ کے معنے ہیں اَلْيَوْمُ الَّذِيْ يَأْتِيْ بَعْدَ يَوْمِكَ عَلٰى اَثَرِ ثُمَّ تَوَسَّعُوْا فِيْهِ حَتّٰى اُطْلِقَ عَلَى الْبَعِيْدِ الْمُتَرَقَّبِ۔ کل۔ دوسرا دن۔ آئندہ زمانہ کا کوئی دن جس کا انتظار ہو۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں پھر اس قوم کی ترقی کے زمانہ کے متعلق ایک خبر دی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس قوم کے مقابلہ پر دعویٰ نہ کرنا اور یہ نہ کہنا کہ بس ہم کل ان کو تباہ کر دیں گے سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ تم کو ان کے متعلق کوئی خبر دے یعنی الہام سے بتائے کہ ان سے اب فلاں سلوک ہونے والا ہے۔

بعض لوگوں نے اس آیت کے یہ معنے کئے ہیں کہ اے محمد رسول اللہ کوئی بات بغیر اِنْ شَآءَ اللّٰهُ کے نہ کہا کرو۔ اور اس حکم کے متعلق بعض نہایت افسوسناک روایات نقل کی ہیں جن میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح ہتک ہے (ابن کثیر و القرطبی زیر آیت ھٰذا)۔ حالانکہ آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یہاں اِنْ شَآءَ اللّٰهُ کہنے کا کوئی ذکر نہیں۔ اگر وہ مضمون ہوتا تو الفاظ یوں چاہیے تھے اِلَّآ اَنْ تَقُوْلَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ۔ مگر یہاں تو

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۔ یعنے اوپر والا فقرہ اس وقت تک نہ کہیو جب تک کہ اللہ تعالیٰ تجھے اس فقرہ کے کہنے کا حکم نہ دے۔ پس آیت کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ اس قوم کا مقابلہ مسلمان اپنی طاقت سے نہ کرسکیں گے۔ بلکہ وہ ان کا مقابلہ کر سکے گا جسے اللہ تعالیٰ اپنی مشیت سے ان کے مقابلہ کے لئے کھڑا کرے گا۔

مسلمانوں کی موجودہ حالت کی طرف اشارہ اس آیت میں مسلمانوں کی اس وقت کی حالت کی طرف اشارہ ہے جب وہ ان اقوام کی ترقی کو دیکھ کر جوش میں آئیں گے اور ان کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں کریں گے۔لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوں گے۔ دوسرے اس زمانہ کے مسلمانوں کی حالت بتائی ہے کہ وہ کام کی بجائے کل کی امیدوں پر آجائیں گے اور ہمیشہ یہ کہیں گے کہ ہم کل یہ کر دکھائیں گے یعنی قوت عملیہ مفقود ہوجائے گی اور ڈراوے اور دھمکیاں رہ جائیں گی اور ہمیشہ کل کا لفظ بولتے رہیں گے کبھی وہ کل آج کی صورت اختیار نہ کرے گا۔ چنانچہ دیکھ لو کہ اس زمانہ میں یہ صداقت ساری مسلمان اقوام کے اعمال سے اس طرح ظاہر ہورہی ہے کہ افسوس بھی آتا ہے اور تعجب بھی۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ کہہ کر یہ بتایا کہ اگر کبھی جوش میں آکر ان قوموں کے مقابلہ کا خیال تمہارے دل میں پیدا ہو تو اللہ تعالیٰ کے وعدوں کو یاد کرلیا کرو کہ خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ایک دن مسلمانوں کو ان کے حملہ سے بچائے گا اور غیب سے مسلمانوں کی نجات کے سامان پیدا کرے گا۔اس لئے الٰہی تدابیر کے سوا دوسری تدابیر کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے۔

مسلمانوں کو نصیحت کہ خدا کے فضل سے ہی اس قوم کے فتنوں سے بچو گے وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا میں بھی یہ سبق دیا کہ تمہاری ظاہری تدابیر تو سینکڑوں سالوں میں ان اقوام کو تباہ نہیں کرسکتیں۔لیکن اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے بہت جلد ایسے سامان پیدا کردے گا کہ تم ان فتنوں سے محفوظ ہوجاؤ۔

افسوس مسلمانوں نے اس نصیحت سے بھی فائدہ نہ اٹھایا اور یوروپین اقوام کے مقابل پر بار بار جہاد کے اعلانات کرکے اسلام کے رعب کو اور بھی مٹا دیا۔ بلکہ جن خیرخواہوں نے ان کو اس قسم کی باتوں سے روکا ان کو اسلام کا دشمن قرار دیا اور یہ نہ سمجھے کہ جو قرآن کریم کی تعلیم کی طرف بلاتے ہیں وہ اسلام کے دشمن نہیں بلکہ وہ دشمن ہیں جو باوجود قرآن کریم کے منع کرنے کے پھر بھی غلط طریقہ کو استعمال کرتے چلے جاتے ہیں۔

وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا

اور (یہ بھی کہتے ہیں کہ) وہ (اس) اپنی وسیع پہاڑی پناہ گاہ میں تین سو سال تک رہے تھے اور (اس عرصہ پر)

تِسْعًا ﴿۲۶﴾

نو (سال) انہوں نے اور بڑھائے تھے۔

تفسیر۔ اصحاب کہف کے قیام غار کے عرصہ تین سو نو سال کا ثبوت اس آیت میں قدیم اصحاب کہف کی مصیبتوں کا زمانہ بتایا ہے جس زمانہ تک کہ ان پر ظلم ہوتے رہے اور ان کو بار بار غاروں میں جا کر چھپنا پڑا۔ فرماتا ہے کہ وہ تین سو نو سال کا زمانہ ہے۔ تاریخ سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ مصائب کا زمانہ حضرت مسیحؑ کے صلیب پانے کے وقت سے شروع ہوتا ہے اور پورا امن کانسٹنٹائن (بانی قسطنطنیہ) کے عیسائی ہوجانے کے وقت حاصل ہوا ہے۔ کانسٹنٹائن ۳۳۷ء میں عیسائی ہوا ہے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Constantine) بظاہر یہ زمانہ قرآنی بیان کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب ہم مسیحی تاریخ پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاریخ غلط ہے۔

مسیحی کیلنڈر کی غلطی اصل سال جس میں کانسٹنٹائن بادشاہ روم عیسائی ہوا ۳۰۹ء ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ خود مسیحی جغرافیہ نویسوں نے تسلیم کیا ہے کہ مسیحی کلنڈر میں غلطی ہوگئی ہے چنانچہ آرچ بشپ اشرز (Ussher) نے اپنی کتاب علم تاریخ (Chronology) میں اور ڈاکٹر کٹو Kittoo نے اپنی کتاب ''ڈیلی بائبل السٹریشنز'' میں ثابت کیا ہے کہ جو تاریخ مسیحی کلنڈر میں واقعہ صلیب کی دی گئی ہے وہ غلط ہے اور یہ غلطی ۲۵ء میں لگی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تاریخ سے صرف چار یا چھ سال پہلے مسیح پیدا ہوئے تھے۔ پس اس وقت ان کی عمر صرف چار سے چھ سال تک کی ہوتی ہے لیکن وہ صلیب پر تینتیس سال کی عمر میں لٹکائے گئے تھے۔ اب اس بیان کے مطابق اگر چار اور چھ کی اوسط نکالی جائے تو پانچ بنتی ہے۔ چونکہ مسیح کو صلیب تینتیسویں سال میں دیا گیا تھا اس لئے مسیحی سن میں سے اٹھائیس سال منہا کرنے پڑیں گے کیونکہ مسیحی کلنڈر سے اٹھائیس سال بعد صلیب کا واقعہ ہوا ہے۔ اب اٹھائیس سال کو ۳۳۷ء میں سے نکالو تو پورے ۳۰۹ء سال ہوتے ہیں۔ یہ تو مسیحی روایات کو صحیح تسلیم کر کے ہے ورنہ اگر یہ شہادت نہ بھی ہوتب بھی قرآن کریم جس کی سب خبریں بائبل کے مقابل میں صحیح ثابت ہوتی ہیں اس کی بات

کو بہر حال مقدم رکھنا ہوگا۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ لمبے مصائب سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ہم سے پہلے مسیحی جماعت کو تین سو نو سال تک دکھ دیئے گئے۔لیکن انہوں نے صبر سے کام لیا اور آخر اس صبر کا نہایت شیریں پھل کھایا۔پس تم کو جلدی نہیں کرنی چاہیے بلکہ اپنے کام میں لگے رہنا چاہیے اور استقلال سے مصائب کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

قُلِ اللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا لَبِثُوۡا ۚ لَهٗ غَيۡبُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ

تو (انہیں) کہہ (کہ) جو (عرصہ) وہ ٹھہرے رہے تھے اسے اللہ (تعالیٰ) بہتر جانتا ہے۔آسمانوں اور زمین کا غیب

اَبۡصِرۡ بِهٖ وَاَسۡمِعۡ ؕ مَا لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّلِىٍّ ۖ وَّلَا

(کا علم) اسی کے لئے (مسلّم) ہے۔وہ خوب ہی دیکھنے والا اور خوب ہی سننے والا ہے۔ان (لوگوں) کا اس کے

يُشۡرِكُ فِىۡ حُكۡمِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۷﴾

سوا کوئی بھی مددگار نہیں ہے۔اور وہ اپنے حکم (اور اپنے فیصلوں) میں کسی کو (اپنا) شریک نہیں بناتا۔

حل لغات۔اَلْغَیْبُ غَیْبٌ غَابَ کا مصدر ہے اور غَیْبٌ کے معنے کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۱۰۔
غَابَتِ الشَّمْسُ وَغَیْرُھَا: اِذَا اسْتَتَرَتْ عَنِ الْعَیْنِ غَابَ کا لفظ سورج کے لئے یا کسی اور چیز کے لئے اس وقت بولتے ہیں کہ جب سورج غروب ہو جاوے۔یا کوئی اور چیز آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔وَاسْتُعْمِلَ فِیْ کُلِّ غَائِبٍ عَنِ الْحَاسَةِ جو بات حواس سے بالا اور پوشیدہ ہو اس پر بھی غیب کا لفظ اطلاق پاتا ہے۔اور شہادۃ کا لفظ غیب کے بالمقابل بولا جاتا ہے۔(مفردات) پس غیب اور شہادت کے دو معنی ہیں۔(۱) شہادۃ جو لوگ ظاہر کرتے ہوں۔اور غیب جسے وہ چھپاتے ہوں۔(۲) جو حواس ظاہری سے معلوم ہو سکے وہ شہادت ہے اور جو باتیں حواس سے بالا اور پوشیدہ ہیں وہ غیب ہے۔

اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ دونوں فعل تعجب ہیں۔یعنی وہ کیا ہی خوب دیکھنے والا ہے۔اور کیا ہی خوب سننے والا ہے۔

تفسیر۔قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا کہہ کر بتایا کہ مسیحیوں کی تاریخیں اس بیان کی مخالفت کریں گی جیسے کہ ان کے ہاں ۳۰۷ء کی مدت لکھی ہے۔لیکن ان کی بات کا اعتبار نہ کرنا اللہ جانتا ہے کہ ان کی غلطی ہے۔چنانچہ بعد کی

تحقیق نے ان کی غلطی ثابت بھی کر دی۔

اگر کہا جائے کہ اس جگہ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا آیا ہے اس سے تو پتہ لگتا ہے کہ پہلی بات غلط تھی اس کا جواب یہ ہے کہ اگر پہلا قول لوگوں کا ہوتا تو اس فقرہ سے اس کی تردید نکلتی۔لیکن پہلی آیت میں چونکہ کفار کا قول نقل نہیں کیا بلکہ بغیر ان کے حوالہ کے زمانہ بتایا ہے اس لئے اس جملہ سے تردید نہیں نکلے گی بلکہ تاکید نکلے گی اور مطلب یہ ہوگا کہ اس زمانہ کے بارہ میں لوگ اختلاف کریں گے مگر وہ غلطی پر ہوں گے صحیح زمانہ یہی ہے۔

اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ۔ وہ خوب دیکھنے والا اور سننے والا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ کا بیان درست ہے دوسروں کا نہیں۔ نیز ان الفاظ سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ انسانوں کے حالات کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جب تک انسان شرک سے پاک رہیں وہ ان کی مدد کرتا ہے جب شرک میں مبتلا ہو جائیں اللہ تعالیٰ کی نصرت جاتی رہتی ہے۔

وَ اتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ

اور تیرے رب کی کتاب میں سے جو (حصہ) تجھ پر وحی (کے ذریعہ سے نازل) ہوتا ہے اسے پڑھ (کر لوگوں

لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۸﴾

کوسنا) اس کی باتوں کو کوئی بھی تبدیل کر سکنے والا نہیں ہے اور اسے چھوڑ کر تو کوئی پناہ کی جگہ نہیں پائے گا۔

حل لغات۔ اُتْلُ اُتْلُ تَلَا يَتْلُوْ سے امر کا صیغہ ہے اور تَلَا الْكَلَامَ تِلَاوَةً کے معنے ہیں قَرَأَهٗ۔ اس کو پڑھا۔(اقرب) پس اُتْلُ کے معنے ہیں پڑھ۔

اَلْمُلْتَحَدُ اَلْمُلْتَحَدُ: اَلْمَلْجَأُ۔ پناہ گاہ۔(اقرب)

تفسیر۔اصحاب کہف کا واقعہ بطور پیشگوئی ہے اس آیت میں یہ مضمون آ کر کھول دیا کہ اس واقعہ کو ہم بطور قصہ نہیں بیان کر رہے بلکہ اسی طرح تیری امت کے ساتھ بھی ہونے والا ہے۔اور یہ بھی کہ جو مضمون اوپر بیان ہوا ہے اس کے بعض حصے پیشگوئی کے طور پر ہیں اور بعض اخبار صادقہ ہیں۔اس مضمون کا اشارہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ کے الفاظ سے نکلتا ہے۔اگر یہ پیشگوئی نہ ہوتی تو یہ کیوں فرماتا کہ خدا کی باتوں کو کوئی نہیں بدل سکتا۔سابق کے واقعات کے بدلنے یا نہ بدلنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔پس اس آیت نے میری اوپر کی تفسیر کی تصدیق کر دی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنہوں نے اوپر کی آیات کو صرف ماضی کا ایک واقعہ سمجھا ہے انہوں نے غلطی

کی ہے۔ان میں کچھ سابق کے واقعات ہیں اور کچھ اصحاب کہف کے قائم مقاموں اوران کی آئندہ نسل کے متعلق پیشگوئیاں ہیں۔

ایک اور رنگ میں بھی یہ آیات پیشگوئیوں پر مشتمل ہیں۔اور وہ اس طرح کہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اس قصہ کے بتانے میں یہ بھی حکمت ہے کہ ایسے ہی واقعات مسلمانوں کے ایک حصہ کو بھی پیش آنے والے ہیں۔یعنی ان کو بھی اللہ تعالیٰ کے کلام پر ایمان لانے کی وجہ سے تکالیف دی جانے والی ہیں۔چنانچہ اس کی تصدیق حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے آپ فرماتے ہیں قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اَصْحَابُ الْکَھْفِ اَعْوَانُ الْمَھْدِیِّ (درمنثور زیر آیت الکھف ۹۔۱۲ بحوالہ ابن مردویہ) یعنی اصحاب کہف مہدی کے مرید اور اس پر ایمان لانے والے لوگ ہیں۔اب اس کے یہ معنے نہیں کہ پہلے کوئی اصحاب کہف نہیں گذرے۔کیونکہ خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اصحاب کہف کی ہڈیاں تک دیکھی ہیں (جیسا کہ اوپر روایت گذر چکی ہے) بلکہ اس کے صرف یہ معنے ہیں کہ اصحاب کہف کا سا معاملہ مہدی پر ایمان لانے والوں سے بھی گذرے گا اور ان کو بھی خدا کے کلام پر ایمان لانے کی وجہ سے تکالیف دی جائیں گی۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ

اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ رکھ جو اپنے رب کو اس کی خوشنودی چاہتے ہوئے صبح وشام

الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ

پکارتے ہیں اور ورلی زندگی کی زینت چاہتے ہوئے تیری آنکھیں ان سے آگے نہ بڑھیں۔

زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ

اور جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہو اور اس نے اپنی گری ہوئی خواہش کی پیروی اختیار کی ہو

ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۹﴾

اور اس کا معاملہ حد سے بڑھا ہوا ہو اس کی فرمانبرداری مت کر۔

حل لغات۔اِصْبِرْ وَاصْبِرْ صَبَرَ سے امر کا صیغہ ہے۔اور صَبَرَ نَفْسَهٗ عَلٰى كَذَا کے معنے ہیں

حَبَسَهَا۔ نفس کو کسی بات پر روکے رکھا (اقرب) مزید تشریح کے لئے دیکھو رعد ۲۳

صَبْرٌ کے معنے ہیں تَرْكُ الشَّكْوٰى مِنْ اَلَمِ الْبَلْوٰى لِغَيْرِ اللّٰهِ لَا اِلَى اللّٰهِ کہ مصیبت کے دکھ کا شکوی خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کے پاس نہ کرنا۔ فَاِذَا دَعَا اللّٰهَ الْعَبْدُ فِیْ کَشْفِ الضُّرِّ عَنْهُ لَا يُقْدَحُ فِیْ صَبْرِهٖ۔ اگر بندہ اپنی رفع مصیبت کے لئے خدا تعالیٰ کے پاس فریاد کرے تو اس کے صبر پر اعتراض نہ کیا جائے گا۔ وَقَالَ فِی الْكُلِّيَّاتِ اَلصَّبْرُ فِی الْمُصِيْبَةِ۔ اور کلیات میں لکھا ہے کہ صبر مصیبت کے وقت ہوتا ہے۔ وَصَبَرَ الرَّجُلُ عَلَى الْاَمْرِ نَقِيْضُ جَزِعَ اَیْ جَرُؤَ وَشَجُعَ وَتَجَلَّدَ اور صبر جزع یعنی شکوی کرنے اور گھبرانے کے مقابل کا لفظ ہے اور صبر کے معنے ہوتے ہیں دلیری دکھائی۔ جرأت دکھائی۔ ہمت دکھائی۔ اور صَبَرَ عَنِ الشَّیْءِ کے معنے ہیں اَمْسَكَ عَنْهُ کسی چیز سے رکا رہا۔ اَلدَّابَّةَ حَبَسَهَا بِلَا عَلَفٍ۔ اور صبر کا مفعول دابة ہو تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ جانور کو بغیر چارہ دینے کے روکے رکھا۔ صَبَرْتُ نَفْسِیْ عَلٰى كَذَا کے معنے ہیں میں نے اپنے نفس کو کسی چیز پر قائم رکھا یا کسی چیز سے روکے رکھا۔ چنانچہ انہی معنوں میں صَبَرْتُ عَلٰى مَا اَكْرَهُ وَصَبَرْتُ عَمَّا اُحِبُّ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے کہ تکلیف دہ حالت پر میں نے نفس کو استقلال سے قائم رکھا اور پسندیدہ امور سے نفس کو باز رکھا۔

گویا صبر کے تین معنے ہوئے گناہ سے بچنا اور اپنے نفس کو اس سے روکے رکھنا۔ (۲) نیک اعمال پر استقلال سے قائم رہنا۔ (۳) جزع فزع سے بچنا۔ (اقرب)

الغَدٰوة اَلْغَدَاةُ کے معنے صبح۔ صبح کی نماز سے لے کر سورج کے طلوع ہونے تک کا وقت۔ اس کی جمع غُدُوٌّ ہے۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۱۶

اَلْغَدَاةُ اَلْبُكْرَةُ صبح اَوْمَا بَيْنَ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَطُلُوْعِ الشَّمْسِ صبح کی نماز سے لے کر سورج کے طلوع ہونے تک کا وقت اس کی جمع غدو ہے۔ (اقرب)

العشیّ اَلْعَشِیُّ: اٰخِرُ النَّهَارِ وَقِيْلَ مِنْ صَلٰوةِ الْمَغْرِبِ اِلَى الْعَتَمَةِ۔ دن کے آخری حصہ کو عشی کہتے ہیں بعض کے نزدیک مغرب سے عشا تک کا وقت عشیّ کا ہے (اقرب)

الوجہ اَلْوَجْهُ: نَفْسُ الشَّیْءِ۔ خود وہی چیز۔ اَلْوَجْهُ مِنَ الدَّهْرِ: اَوَّلُهٗ۔ زمانہ کی ابتداء۔ سَيِّدُ الْقَوْمِ قوم کا سردار۔ اَلْجَاهُ۔ عزت۔ اَلْجِهَةُ۔ طرف۔ مَا يَتَوَجَّهُ اِلَيْهِ الْاِنْسَانُ مِنْ عَمَلٍ وَغَيْرِهٖ۔ مطمح نظر۔ اَلْقَصْدُ وَالنِّيَّةُ۔ قصد اور ارادہ۔ اَلْمَرْضَاةُ۔ رضامندی۔ (اقرب)

لَا تَعْدُ لَا تَعْدُ عَدَا (يَعْدُ وَعَدْوًا) سے نہی مخاطب کا صیغہ ہے اور عَدَى فُلَانًا عَنِ الْاَمْرِ کے معنے ہیں صَرَفَهٗ وَشَغَلَهٗ۔اس کو کسی کام سے ہٹایا اور روکے رکھا۔ عَدَا الْاَمْرَ وَعَنِ الْاَمْرِ جَاوَزَهٗ وَتَرَكَهٗ۔کسی کام کو ترک کر دیا اور چھوڑ دیا۔(اقرب)

اَغْفَلْنَا اَغْفَلْنَا اَغْفَلَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور اَغْفَلَ الشَّیْءَ بِمَعْنٰی غَفَلَ عَنْهُ (تَرَكَهٗ وَسَهَا عَنْهُ) کسی چیز کو ترک کر دیا۔اور اسے بھول گیا۔(اقرب)

اَلْهَوٰى اَلْهَوٰى اِرَادَةُ النَّفْسِ۔نفس کا ارادہ خواہش۔اَلْعِشْقُ يَكُوْنُ فِي الْخَيْرِ وَالشَّرِّ۔کسی عمدہ یا بری چیز کی خواہش کی شدت۔اَلْمَهْوِيُّ مَحْمُوْدًا كَانَ اَوْ مَذْمُوْمًا ثُمَّ غَلَبَ عَلٰى غَيْرِ الْمَحْمُوْدِ۔جس سے محبت کی جائے خواہ وہ محبوب پسندیدہ ہو یا ناپسندیدہ۔لیکن آہستہ آہستہ اس کا استعمال برے معنوں میں ہونے لگ گیا ہے۔ اور جب فُلَانٌ اتَّبَعَ هَوَاهُ کا محاورہ بولتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنی خواہشات کے پیچھے لگا رہا۔ اور یہ بول کر مذمت مقصود ہوتی ہے۔(اقرب)

فُرُطًا اَلْفُرُطُ: اَلظُّلْمُ وَالْاِعْتِدَاءُ۔ظلم اور زیادتی۔اَلْاَمْرُ الْمُجَاوَزُ فِيْهِ عَنِ الْحَدِّ۔حد اور انتہاء سے بڑھا ہوا اَلْاَمْرُ الْمَتْرُوْكُ۔چھوڑا ہوا کام۔جیسے کہتے ہیں۔كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔وَقِيْلَ اِسْرَافًا وَ تَضْيِيْعًا۔اور بعض نے فرط کے معنے اسراف اور تضییع کے کئے ہیں۔(اقرب)

تفسیر۔اس آیت کا مخاطب ہر پڑھنے والا ہے نہ کہ آنحضرت صلعم اس آیت نے اوپر کے معنوں کو اور واضح کر دیا ہے۔اس آیت کے مخاطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں۔بلکہ قرآن کریم کے پڑھنے والے وہ شخص ہیں جن کو اس زمانہ کے دیکھنے کا موقعہ ملے۔ورنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو خود نمازیں پڑھایا کرتے تھے۔ان کو کس طرح کہا جا سکتا تھا کہ جو صبح و شام نمازیں پڑھ رہے ہیں تو ان کے ساتھ رہ۔

اصل میں یہاں یہ بتایا ہے کہ مسیحی اقوام کی ترقی کے وقت ایک ایسی جماعت ہوگی جو اسلام پر قائم ہوگی اور ان کے ساتھ لوگوں کو ملنے کا حکم دیا گیا ہے۔اس آیت کے مخاطب یقیناً وہ مسلمان ہیں جو اس زمانہ میں اسلام کی ترقی کو سیاسی اسباب کے ساتھ وابستہ قرار دیتے ہوں گے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس غلطی میں مبتلا نہ ہونا بلکہ ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو جانا جو صبح شام نمازوں میں دعائیں کر رہے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے فضل کو دعاؤں کے ذریعہ سے بلا رہے ہوں گے۔پھر فرماتا ہے اس نمازی جماعت سے اپنی نظریں ہٹا کر اور طرف نہ لے جانا کیونکہ گو دنیا کی زینت اور اس کی ترقی کے سامان ان سے باہر ملیں گے لیکن اس میں خدا تعالیٰ کی رضا تو حاصل نہ ہوگی۔پس دنیاوی

لالچوں کی وجہ سے اس بظاہر حقیر نظر آنے والی جماعت کو حقیر مت جاننا اور ان لوگوں کی پیروی نہ کرنا جو ذکر الٰہی اور تبلیغ سے غافل ہوں گے اور ڈنڈے کے زور سے ان قوموں کو سیدھا کرنا چاہیں گے اور افراط و تفریط کی مرض اور سیاسیات کی ہوا و ہوس میں مبتلا ہوں گے۔

اس آیت میں اس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اس زمانہ میں تین باتیں مسلمانوں کے مصائب کا موجب ہوں گی۔ایک تو لوگ عبادت سے غافل ہو جائیں گے عبادت کی طرف توجہ نہ رہے گی۔دوسری بات یہ ہے کہ لوگوں کے دل میں دنیا کے اموال کی محبت بڑھ جائے گی تیسری بات یہ ہے کہ عیش و عشرت کا بڑا زور ہوگا۔ایسے وقت میں مومن کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ عبادت میں مشغول رہے اور مال کی طرف رغبت نہ کرے اور اپنی جائز ضروریات پوری کر کے باقی حصہ مال کا دین کی اشاعت میں خرچ کرے۔

وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ

اور (لوگوں کو) کہہ دے (کہ) یہ سچائی تیرے رب کی طرف سے ہی (نازل ہوئی) ہے پس جو چاہے (اس پر)

فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ

ایمان لائے اور جو چاہے (اس کا) انکار کر دے (مگر یہ یاد رکھے کہ) ہم نے ظالموں کے لئے یقیناً ایک آگ تیار

سُرَادِقُهَا ؕ وَ اِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ

کی ہے جس کی چار دیواری نے (اب بھی) انہیں گھیرا ہوا ہے۔اور اگر وہ فریاد کریں گے تو ایسے پانی سے ان کی

يَشْوِي الْوُجُوْهَ ؕ بِئْسَ الشَّرَابُ ؕ وَ سَآءَتْ مُرْتَفَقًا ۝۳۰

فریاد رسی کی جائے گی جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگا (اور) چہروں کو جھلس دے گا۔وہ بہت بُری پینے کی چیز ہوگی۔اور وہ (یعنی آگ) بُرا ٹھکانا ہے۔

حل لغات۔سُرَادِقٌ سُرَادِقٌ کے معنے ہیں (۱) وہ سائبان جو صحن پر لگایا جاتا ہے (۲) پردہ یا قنات یا خیمہ کے چاروں طرف کا پردہ (۳) کپڑے کا خیمہ (۴) غبار (۵) دھوئیں کا بگولہ۔(اقرب)

اَلْمُھْلُ اَلْمُھْلُ مہل سب معدنیات کو کہتے ہیں مثلاً چاندی لوہے وغیرہ کو۔ (۲) پتلا تیل۔ سیّال چیز جس میں جل اٹھنے کا مادہ ہوتا ہے۔ (۳) زہر (۴) پیپ (۵) خصوصاً مردہ کی پیپ (۶) پگھلا ہوا تانبا (۷) تیل (۸) تلچھٹ یعنی تیل کی میل جو اس کی تہ میں بیٹھ جاتی ہے۔ (اقرب)

یَشْوِیْ یَشْوِیْ شَوٰی سے مضارع ہے اور شَوَی اللَّحْمَ کے معنی ہیں جَعَلَہٗ شِوَاءً گوشت کو بھُونا۔ اَلْمَاءَ: اَسْخَنَہٗ۔ پانی کو گرم کیا۔ (اقرب)

مُرْتَفَقًا اِرْتَفَقَ الرَّجُلُ: طَلَبَ رَفِیْقًا۔ اس نے کسی ساتھی کی تلاش کی۔ اِسْتَعَانَ۔ مدد مانگی۔ اِتَّکَأَ عَلٰی مِرْفَقٍ وَقِیْلَ عَلَی الْمِخَدَّۃِ۔ کہنی یا تکیہ پر ٹیک لگائی۔ اِرْتَفَقَ الْاِنَاءُ: اِمْتَلَأَ۔ برتن (پانی وغیرہ سے) بھر گیا۔ اِرْتَفَقَ الْقَوْمُ: تَرَافَقُوْا فِیْ سَفَرٍ۔ لوگ سفر میں ایک دوسرے کے رفیق بنے۔ اَلْمُرْتَفَقُ اِرْتَفَقَ سے اسم مفعول ہے اس کے معنے ہیں اَلْمُتَّکَأُ۔ تکیہ اور سہارا لگانے کی چیز۔ (اقرب)

تفسیر۔ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ۔ تو کہہ دے کہ یہ بات جو میں نے بتائی ہے یعنی مسلمانوں کی ترقی اور ان قوموں کی تباہی۔ یہ ہو کر رہے گی۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہ پیشگوئی ہے۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ الآیۃ یعنی دین کے معاملہ میں زبردستی تو ہے نہیں۔ جو شخص جس بات کو چاہے اختیار کرے وہ اپنے عمل کا نتیجہ بھگتے گا مگر اسے جبراً نہیں منوایا جائے گا۔

اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ جہاد کا زمانہ نہ ہوگا۔ بلکہ تبلیغ کا زمانہ ہوگا۔ لوگوں کے سامنے صداقت رکھنا مسلمانوں کا فرض ہوگا آگے کوئی مانے یا نہ مانے۔ کسی سے جنگ کرنی جائز نہ ہوگی۔

یورپین اقوام کی تباہی جنگ کے ذریعہ مقدر ہے چونکہ یہ سوال ہو سکتا تھا کہ اگر جنگ اور جہاد نہ ہوگا تو مسلمانوں کی کمزور حالت کس طرح بدلے گی۔ اس کا جواب یہ دیا کہ ہم اس کے سامان خود پیدا کریں گے اور یوروپین اقوام کو جنگ کا عذاب گھیر لے گا۔ اور گویا جنگ ان کے گھروں کے گرد خیمے لگا لے گی۔ اور جس قدر وہ امن کے لئے کوشش کریں گے اور امن امن کہہ کر چلّائیں گے۔ اسی قدر پگھلتا ہوا لوہا اور تانبہ ان کے مونہوں پر ڈالا جائے گا۔ یعنی امن کی پکار تو ہوگی لیکن نتیجہ توپوں کے گولے اور بم ہی نکلے گا۔ اور ان کے ملک رہائش کے قابل نہ رہیں گے۔ بلکہ بر اٹھکانہ بن جائیں گے۔

اِرْتَفَقَ کے معنے تعاون اور رفاقت کے بھی ہوتے ہیں ان معنوں کے رو سے معنے یہ ہوں گے کہ قومیں امن کی خاطر دوسری قوموں سے دوستیاں کریں گی۔ لیکن ان دوستیوں کا نتیجہ جنگ ہی نکلے گا نہ کہ صلح۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۚ﴿۳۱﴾

(ہاں) یقیناً جولوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک (اور مناسب حال) عمل کئے ہیں (وہ بڑے اجر پائیں گے) جنہوں نے اچھے کام کئے ہوں ہم ان کا اجر ہرگز ضائع نہیں کیا کرتے۔

تفسیر ۔یعنی اس کے مقابل پر جولوگ خدا کے کلام پر ایمان لائیں گے اور اس ایمان کے مطابق عمل کریں گے ان کے اجر ضائع نہ ہوں گے یعنی باوجود اس کے وہ ظاہر شان وشوکت سے محروم ہوں گے پھر بھی ان کے اعمال آہستہ آہستہ دنیا میں امن کی صورت پیدا کرتے چلے جائیں گے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ يَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ؕ نِعْمَ الثَّوَابُ ؕ وَ حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ۧ﴿۳۲﴾

ان لوگوں کے لئے دائمی رہائش کے باغات (مقدر) ہیں (ان میں) ان کے (اپنے انتظام کے) نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان کے لئے ان میں سونے کے کنگنوں کی قسم کے زیور بنوائے جائیں گے اور وہ باریک ریشم کے اور موٹے ریشم کے سبز کپڑے پہنیں گے۔ان (بہشتوں) میں آراستہ پلنگوں پر تکئے لگائے (ہوئے بیٹھے) ہوں گے۔ یہ کیا ہی اچھا اجر ہے اور وہ بہت ہی اچھا ٹھکانا ہے۔

حلّ لُغَات ۔يُحَلَّوْنَ حَلّٰى سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ يُحَلُّوْنَ ہے اور يُحَلَّوْنَ اس سے مجہول کا صیغہ ہے۔اور حَلَّى الْمَرْأَةَ تَحْلِيَةً کے معنے ہیں اَلْبَسَهَا حُلْيًا ۔عورت کو زیور پہنائے۔(اقرب)

ثیابًا ثِیَابًا ثَوْبٌ کی جمع ہے اور ثَوْبٌ کے معنے ہیں۔اَللِّبَاسُ مِنْ کِتَّانٍ وَقُطْنٍ وَصُوْفٍ خَزٍّ وَفِرَاءٍ۔روئی۔اون۔ریشم۔پوستین وغیرہ کے کپڑے۔(اقرب)

سُندُس سُنْدُسٌ کے معنے ہیں نہایت باریک اور نفیس ریشمی کپڑا یا دیبائے نازک۔اور کلیات میں اس کے معنی ریشمی گدیلے اور بستروں کے کئے ہیں۔(اقرب)

اِستبرق اِسْتَبْرَقٌ:اَلدِّیْبَاجُ الْغَلِیْظُ۔موٹا ریشم۔اسے معرّب یعنی غیر عربی زبان کا قرار دیا گیا ہے۔(اقرب)

اَلْاَرَائِکُ اَلْاَرَائِکُ اَرِیْکَۃٌ کی جمع ہے اور اَرِیْکَۃٌ کے معنے ہیں۔سَرِیْرٌ مُنَجَّدٌ مُزَیَّنٌ فِیْ قُبَّۃٍ اَوْبَیْتٍ۔ایسا مزین تخت جو کسی قبّہ یا خیمہ میں لگایا گیا ہو۔(اقرب)

تفسیر۔سونے کے کڑے اور ریشمی کپڑے پہننے سے مراد سونے کے کڑوں پر اعتراض ہوتا ہے کہ مردوں کے لئے سونے کے کڑے پہننے ناجائز ہیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تو اس سے مراد دنیا ہو تو اس سے مراد یہ لی جائے گی کہ ان کو بادشاہتیں ملیں گی۔سونے کے کنگن پہننے سے مراد بادشاہت ہے۔پرانے زمانہ میں سونے کے کنگن بادشاہ پہنا کرتے تھے۔پس یہاں بتایا ہے کہ مسلمانوں کو بادشاہ بنایا جائے گا اور اگر اس سے مراد اگلا جہان ہو تو اس جہاں کی ہر شے روحانی ہے۔وہاں سونے کے کڑوں سے مادی سونے کے کڑے مراد نہیں ہوسکتے۔بلکہ خاص قسم کے اعزاز مراد لئے جائیں گے۔

مِنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ یعنی جیسے ریشمی کپڑا پہننے سے آرام اور لذت محسوس ہوتی ہے۔اسی طرح وہاں بھی ایسا لباس ملے گا جس سے لذت اور آرام محسوس ہوگا اور اس کے یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں۔کہ یہ چیزیں جن کے لائق ہوں گی ان کو پہنائی جائیں گی۔جیسے حضرت عمرؓ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ریشمی کپڑا دیا تو انہوں نے کہا یارسول اللہ مجھے آپ نے یہ کیسے دیا۔مردوں کے لئے تو ریشم پہننا ناجائز ہے اس پر آنحضرت صلعم نے فرمایا تم اسے اپنی بیوی کو پہنا سکتے ہو۔(مسلم کتاب اللباس و الزینۃ باب تحریم لبس الحریر و غیر ذالک للرجال)

نِعْمَ الثَّوَابُ وَ حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا۔یعنی قرآن کریم پر سچا ایمان لانے والوں کو جو انعامات ملیں گے وہ تباہی کی طرف نہ لے جائیں گے بلکہ ان کے نتیجہ میں امن اور اطمینان پیدا ہوگا اور حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا سے یہ بتایا کہ قرآنی تعلیم پر چل کر جو دوستیاں اور رفاقتیں ہوں گی وہ چونکہ اخلاص پر مبنی ہوں گی اور ذاتی اغراض ان کے پیچھے پوشیدہ نہ ہوں گی۔ان دوستیوں کے نتیجہ میں لڑائیاں نہیں ہوں گی بلکہ امن حاصل ہوگا۔

وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلًا رَّجُلَيۡنِ جَعَلۡنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيۡنِ

اور تو ان کے سامنے ان دوشخصوں کی حالت بیان کر جن میں سے ایک کو ہم نے انگوروں کے دو باغ دیئے تھے

مِنۡ اَعۡنَابٍ وَّحَفَفۡنٰهُمَا بِنَخۡلٍ وَّجَعَلۡنَا بَيۡنَهُمَا زَرۡعًا ؕ﴿۳۳﴾

اور انہیں ہم نے کھجوروں کے درختوں سے (ہر طرف سے) گھیر رکھا تھا۔ اور ہم نے ان کے درمیان کچھ کھیتی (بھی)

كِلۡتَا الۡجَنَّتَيۡنِ اٰتَتۡ اُكُلَهَا وَلَمۡ تَظۡلِمۡ مِّنۡهُ شَيۡـًٔا ۙ وَّ

پیدا کی تھی ان دونوں باغوں نے اپنا (اپنا) پھل (خوب) دیا۔ اور اس میں سے کچھ (بھی) کم نہ کیا۔ اور ان

فَجَّرۡنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۙ﴿۳۴﴾

کے درمیان ہم نے ایک نہر جاری کی (ہوئی) تھی۔

حلّ لُغَات۔ وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَثَلًا کے معنی ہیں ان کے سامنے مثال بیان کر مزید تشریح کے لئے دیکھو ابراہیم آیت نمبر ۲۵۔

اَلۡمَثَلُ کے معنے ہیں اَلشِّبۡهُ وَالنَّظِيۡرُ۔ مشابہ۔ اَلصِّفَةُ بیان۔ اَلۡحُجَّةُ۔ دلیل۔ يُقَالُ اَقَامَ لَهٗ مَثَلًا اَیۡ حُجَّةً۔ اَقَامَ لَهٗ مَثَلًا کہہ کر مثل سے مراد دلیل لیتے ہیں۔ اَلۡحَدِيۡثُ عام بات۔ اَلۡقَوۡلُ السَّائِرُ ضرب المثل اَلۡعِبۡرَةُ عبرت۔ اَلۡاٰيَةُ۔ نشان۔ (اقرب)

اور ضَرَبَ لَهٗ مَثَلًا کے معنے ہیں وَصَفَهٗ وَقَالَهٗ وَبَيَّنَهٗ مثل کو بیان کیا۔ اور اچھی طرح سے واضح کیا۔

جَنَّتَين جَنَّتَيۡنِ جَنَّةٌ کا تثنیہ ہے مزید تشریح کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۲۴۔

اَلۡجَنَّةُ جَنَّ میں سے ہے۔ وَاَصۡلُ الۡجَنِّ سَتۡرُ الشَّیۡءِ۔ جَنَّ کے اصل معنے کسی چیز کو ڈھانپنے کے ہیں۔ يُقَالُ جَنَّهُ اللَّيۡلُ چنانچہ جَنَّهُ اللَّيۡلُ کا محاورہ انہی معنوں میں مستعمل ہے کہ رات نے اس کو ڈھانپ لیا۔ وَالۡجَنَّةُ: كُلُّ بُسۡتَانٍ ذِیۡ شَجَرٍ يَسۡتُرُ بِاَشۡجَارِهِ الۡاَرۡضَ۔ اور جنت ہر اس باغ کو کہتے ہیں جس میں کثرت سے درخت ہوں اور وہ درختوں کے جھنڈ سے زمین کو ڈھانپ لے۔ وَقَدۡ تُسَمَّى الۡاَشۡجَارُ السَّاتِرَةُ جَنَّةً اور ڈھانپنے اور چھپانے والے یعنی گھنے درختوں کو بھی جَنَّةٌ کہتے ہیں۔ وَسُمِّيَتِ الۡجَنَّةُ اِمَّا تَشۡبِيۡهًا بِالۡجَنَّةِ فِی الۡاَرۡضِ وَاِنۡ

كَانَ بَيْنَهُمَا بَوْنٌ۔ وَاِمَّا لِسَتْرِهِ نِعَمَهَا عَنَّا الْمُشَارَ اِلَيْهِ بِقَوْلِهٖ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا اُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ۔
اور جنت کو اس لئے جنت کے نام سے پکارا گیا ہے کہ یا تو وہ دنیاوی باغات کے مشابہ ہے اگرچہ ان میں اور اس میں بہت فرق ہے۔ یا اس وجہ سے کہ اس کی نعمتیں ہم سے پوشیدہ ہیں جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ میں فرمایا ہے کہ جنت کی نعماء کا کسی کو علم نہیں۔ (مفردات)

حَفَفْنٰهُمَا حَفَفْنَا حَفَّ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور حَفَّهُ الْقَوْمُ وَبِهٖ وَحَوَالَيْهِ کے معنی ہیں اَحْدَقُوْا بِهٖ وَاَطَافُوْا اَوِاسْتَدَارُوْا لوگوں نے اسے ہر طرف سے گھیر لیا اور اس کے ارد گرد حلقہ بنا لیا (اقرب) پس حَفَفْنٰهُمَا کے معنی ہوں گے کہ ان دونوں کو ہم نے گھیر رکھا تھا۔

وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئًا۔ تَظْلِمُ ظَلَمَ سے واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اور ظَلَمَ فُلَانًا حَقَّهٗ کے معنے ہیں نَقَّصَهٗ اِيَّاهُ اسے اس کے حق سے کم دیا۔ اور لَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئًا کے معنی ہیں۔ لَمْ تَنْقُصْ۔ کہ اس نے کچھ بھی کم نہ دیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ بعض نے کہا ہے کہ اس آیت میں کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ یہ ایک مثال ہے۔ جنہوں نے اس کو واقعہ کہا ہے ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ دو آدمی یہود میں سے تھے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ عرب میں سے تھے (القرطبی و فتح البیان زیر آیت ھذا)۔ لیکن دو باغ کی حیثیت والا کوئی آدمی اس رتبہ کا نہیں سمجھا جا سکتا۔ جس کا ذکر تاریخ میں کیا جائے۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ یا تو یہ تسلیم کیا جائے کہ اس قسم کے فخریہ کلمات دنیا میں اور کوئی شخص نہیں کہتا۔ بس اسی شخص نے کہے تھے۔ اور یا یہ تسلیم کیا جائے۔ کہ اس زمانہ میں دنیا بھر میں کوئی درخت نہ تھے بس ایک اس شخص کے دو باغ تھے۔ اس لئے اس کے واقعہ کو تاریخ میں محفوظ رکھا گیا۔

اس مثال کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ہمیں کچھ سمجھانا مقصود ہے۔ ورنہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

میرا خیال ہے کہ الہامی کتابوں میں جب کوئی ایسی مثال ہو جو ادبی نہ ہو بلکہ اس میں کسی باریک مضمون کی طرف اشارہ ہو تو اس کی حقیقت معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ یہی ہے۔ کہ اپنی عقل سے کام لینے کی بجائے ہم تعبیر رویا کے علم سے مدد لیں کیونکہ خواب بھی ایک تمثیلی زبان ہے اور ضروری ہے کہ دونوں قسم کی تمثیلیں جن کا منبع ایک ہے آپس میں مشابہت رکھتی ہوں۔

باغ کی تمثیل کی تشریح باغ کی تشریح ہم دنیاوی لحاظ سے مال و دولت سے کر سکتے ہیں۔ اور درختوں سے یہ مراد لے سکتے ہیں کہ وہ کھیت کی حفاظت کرتے تھے۔ کیونکہ زمینداروں کے کھیت کی حد بندی درختوں سے اچھی طرح ہو سکتی ہے۔ بے شک یہ بھی ایک تعبیر ہے۔ جو ہم اپنے ذہن سے کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم کیوں نہ علم تعبیر سے مدد لیں۔ اور پھر قرآن کریم کو دیکھیں۔ کہ کیا وہ ان معنوں کی تصدیق کرتا ہے یا نہیں۔

علم تعبیر الرویا میں باغ دیکھنے کے متعلق لکھا ہے۔ وَرُبَّمَا دَلَّ الْبُسْتَانُ عَلَى الزَّوْجَةِ وَالْوَلَدِ وَالْمَالِ وَطِيْبِ الْعَيْشِ وَزَوَالِ الْهُمُوْمِ ..... عَلَى دَارِ السُّلْطَانِ الْجَامِعَةِ لِلْجُيُوْشِ وَالْجُنُوْدِ (تعطیر الانام زیر لفظ بستان) یعنے اگر کوئی خواب میں باغ دیکھے تو اس سے مراد بعض دفعہ بیوی، اولاد، مال، زندگی کے اچھے سامان غموں کا دور ہونا ہوتا ہے اور بعض دفعہ شاہی محل مراد ہوتا ہے جس میں فوج اور لشکر جمع ہوتے ہیں۔ یعنی چھاؤنیاں یا ہیڈ کوارٹرز۔ اور انگور خواب میں دیکھنا رزق حسن پر دلالت کرتا ہے اور ایسے دائم و وسیع رزق پر جس کا ذخیرہ رکھا جائے۔ اور اس نفع پر جو عورتوں کے ذریعے پہونچے۔ (تعطیر الانام زیر لفظ عنب)

کھجور کی تعبیر کھجور کے متعلق لکھا ہے کہ مَنْ مَلِكَ نَخْلًا كَثِيْرًا فَإِنَّهُ يَتَوَلَّى عَلَى رِجَالٍ بِقَدْرِ ذَالِكَ وَإِنْ كَانَ تَاجِرًا اِزْدَادَتْ تِجَارَتُهُ (تعطیر الانام زیر لفظ نخل) یعنی جو خواب میں دیکھے کہ وہ کھجور کا مالک ہوا تو اسی تعداد میں آدمیوں پر وہ حکومت کرے گا۔ اور اگر وہ تاجر ہو تو اس کی تجارت میں زیادتی ہوگی۔ پھلوں کے متعلق لکھا ہے وَالثِّمَارُ كَرَامَةٌ جَدِيْدَةٌ طَرِيَّةٌ یعنی تازہ بتازہ عزت کے سامان ملنا۔ وَمَنْ رَأَى اَنَّهُ قَدْ زَرَعَ فِيْ اَرْضٍ فَهُوَ لِلسُّلْطَانِ سَعَةٌ فِيْ مَمْلِكَتِهٖ ... وَالزَّرْعُ يَدُلُّ عَلَى الْعَمَلِ یعنی جو دیکھے کہ اس نے کسی زمین میں کھیتی کی ہے۔ تو اگر وہ بادشاہ ہے تو اس کی حکومت وسیع ہوگی۔ اور باقی لوگوں کے لئے کھیتی سے مراد عمل ہوتا ہے (تعطیر الانام زیر لفظ زرع)۔

نہر کے متعلق لکھا ہے کہ اس سے مراد عالیشان انسان ہوتا ہے۔ (تعطیر الانام زیر لفظ نہر) اسی طرح لکھا ہے کہ جو خواب میں دیکھے کہ اس کے گھر سے نہر نکلی ہے۔ اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ وہ نیک تعلیم دے گا جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں گے۔

تو اب یہ معنی ہوں گے کہ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ ہم نے ان میں سے ایک کے لئے دو باغ بنائے تھے یعنی مال اور اولاد عطا کی تھی۔ اور مِنْ اَعْنَابٍ کے معنی دائم رہنے والے کے بھی ہیں۔ پس مراد یہ ہے کہ ان کے مال اور اولاد کی ترقی لمبی ہوگی۔ چنانچہ قرآن کریم اس کی تصدیق کرتا ہے جیسا کہ آگے فرمایا اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا۔ کہ میں مال اور تعداد میں تجھ سے زیادہ ہوں۔ حالانکہ پہلی آیات میں تعداد کا کوئی ذکر ہی نہ تھا وَ حَفَفْنٰهُمَا

بِنَخۡلٍ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ نخل سے مراد آقا کے غلام ہوتے ہیں۔ پس انگور کے باغ کا احاطہ نخل سے کرنے کے یہ معنی ہوں گے۔ کہ فوجی طاقت سے وہ اپنے مال اور اولاد اور ملک کی حفاظت کرے گا۔

وَ جَعَلۡنَا بَیۡنَہُمَا زَرۡعًا۔ زرع کے معنی عمل کے ہوتے ہیں۔ پس دونوں باغوں کے درمیان عمل ہوگا کے یہ معنی ہوں گے کہ ادھر بھی بادشاہت ہوگی جس کی حفاظت فوجیں کر رہی ہوں گی۔ اور ادھر بھی بادشاہت ہوگی جس کی حفاظت فوجیں کر رہی ہوں گی اور ان دونوں کے درمیان زرع ہوگی۔ یعنی درمیان میں معمولی حیثیت کی جائداد ہوگی جو بے حفاظت ہوگی۔

وَ کِلۡتَا الۡجَنَّتَیۡنِ اٰتَتۡ اُکُلَہَا۔ یعنی یہ دونوں باغ اپنے اپنے وقت پر پھل دیتے رہے۔

وَ لَمۡ تَظۡلِمۡ مِّنۡہُ شَیۡـًٔا۔ اور کبھی انہوں نے اپنے پھل دینے میں کمی نہیں کی۔

یہ عبارت بھی بتا رہی ہے کہ اس جگہ باغ تمثیلی ہیں معروف باغ مراد نہیں۔ کیونکہ یہ قانون قدرت ہے کہ پھل کسی سال زیادہ آتا ہے۔ کسی سال کم آتا ہے۔

دونوں باغوں کے لئے مفرد کی ضمیر لانے میں حکمت نیز اس آیت سے ایک اور بات بھی معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ گو دو باغوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن باوجود ان کے ایک جہت سے دو ہونے کے دوسری جہت سے وہ ایک بھی تھے۔ کیونکہ ان باغوں کے لئے ضمیر مفرد کی استعمال کی ہے۔ یعنی اٰتَتَا کی جگہ اٰتَتۡ فرمایا ہے۔ اور لَمۡ تَظۡلِمَا کی جگہ لَمۡ تَظۡلِمۡ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور یہ دونوں واحد مونث کے صیغے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس فرق سے یہی مضمون پیدا کرنا مقصود ہے کہ بظاہر دو باغ ہیں۔ لیکن اصل میں ایک ہی باغ ہے۔ یا یوں کہو کہ ایک باغ کے دو حصے ہیں (اس میں کوئی شک نہیں کہ کِلۡتَا کی طرف لفظاً ضمیر واحد مونث بھی پھرائی جا سکتی ہے۔ لیکن معناً ضمیر تثنیہ کی آنی چاہیے۔ علامہ بیضاوی نے لکھا ہے۔ وَفِی الۡحَاشِیَۃِ السَّعۡدِیَۃِ فَاِنَّہٗ اِسۡمٌ مُفۡرَدُ اللَّفۡظِ عِنۡدَ الۡبَصۡرِیِّیۡنَ وَمُثَنَّی الۡمَعۡنَی وَمُثَنَّی لَفۡظًا وَمَعۡنًی عِنۡدَ الۡبَغۡدَادِیِّیۡنِ (حاشیہ القونوی علی تفسیر البیضاوی جلد ۱۲ صفحہ ۷۹ زیر آیت ھذا) کہ حاشیہ سعدیہ میں ہے کہ بصریوں کے نزدیک کِلۡتَا کا لفظ بلحاظ معنی تثنیہ ہے۔ اور بلحاظ لفظ کے مفرد ہے مگر بغدادیوں کے نزدیک کِلۡتَا لفظاً اور معناً دونوں طرح تثنیہ ہے۔

القونوی علی البیضاوی میں لکھا ہے۔ کہ حریری نے درّہ الغواص میں کہا ہے کہ یَقُوۡلُوۡنَ کِلَا الرَّجُلَیۡنِ خَرَجَا وَ کِلۡتَا الۡمَرۡأَتَیۡنِ حَضَرَتَا۔ یعنی عرب کِلَا اور کِلۡتَا کے بعد فعل تثنیہ لاتے ہیں۔

پس بغدادی ائمہ لغت کے مذہب کی بناء پر تو قرآنی آیت میں اٰتَتَا آنا ضروری تھا۔ اور حریری کے قول کے

مطابق بھی اسی کو ترجیح حاصل ہے صیغہ تثنیہ کالانا بہر حال جائز تو ہے۔ پس میرا استدلال یہ ہے کہ اول تو تثنیہ کا صیغہ استعمال کرنا انسب تھا کم سے کم جائز تھا۔ اور لفظی طور پر انسب کو چھوڑ کر دوسرے طریق کو اختیار کرنا قرآن کریم کے مسلمہ اصول کے مطابق ضرور کوئی معنوی حکمت رکھتا ہے۔ اور اس کی مثالیں کثرت سے قرآن کریم میں پائی جاتی ہیں۔ کہ وہ جائز اور صحیح الفاظ اور ضمائر کے انتخاب میں بھی حکمتوں اور نئے مضمونوں کو مدنظر رکھتا ہے۔

وَّ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ

اور اسے بہت پھل حاصل (ہوتا) تھا۔ اسی وجہ سے اس نے اپنے ساتھی کو اس سے باتیں کرتے ہوئے (فخریہ

مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۵﴾

طور پر) کہا (کہ دیکھ) تیری نسبت میرا مال زیادہ اور جتھا معزز ہے۔

حلّ لُغات۔ ثَمَرٌ ثَمَرٌ کے لئے دیکھو ابراہیم آیت نمبر ۳۸۔

الثَّمَرَاتُ الثَّمَرَةُ۔ حَمْلُ الشَّجَرِ۔ درخت کا پھل۔ اَلنَّسْلُ۔ نسل۔ اَلْوَلَدُ۔ لڑکا۔ ثَمَرَةُ الْقَلْبِ۔ اَلْمَوَدَّةُ۔ دوستی۔ خُلُوْصُ الْعَهْدِ۔ خالص عہد۔

يُحَاوِرُهٗ يُحَاوِرُهٗ حَاوَرَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور حَاوَرَهٗ (مُحَاوَرَةً) کے معنی ہیں جَادَبِهٖ اس سے بات چیت کی۔ رَاجَعَهُ الْكَلَامَ اس کی بات کا جواب دیا۔ (اقرب)

اَعَزُّ اَعَزُّ یہ عَزَّ سے اسم تفضیل ہے اور عَزَّہٗ (يَعُزُّ۔ عَزًّا) کے معنی ہیں۔ قَوَّاهُ۔ اس کی طاقت بڑھائی۔ اسے تقویت دی۔ غَلَبَهٗ۔ اس پر غالب آ گیا۔ اور عَزَّ (يَعِزُّ عِزًّا) کے معنی ہیں صَارَ عَزِيْزًا وہ معزز ہو گیا زبردست ہو گیا۔ قَوِيَ بَعْدَ ذِلَّةٍ کمزور ہونے کے بعد طاقتور ہو گیا۔ ضَعُفَ۔ چونکہ یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ اس لئے اس کے معنی کمزور ہو جانے کے بھی ہیں۔ (اقرب)

نفرًا اَلنَّفَرُ: اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ تمام لوگ مِنْ ثَلَاثَةٍ اِلٰى عَشَرَةٍ وَقِيْلَ اِلٰى سَبْعَةٍ مِنَ الرِّجَالِ تین سے دس مردوں تک کا گروہ اور بعض کے نزدیک تین سے سات اشخاص تک کے گروہ کو نفر کہتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ۔ یعنی اس کی محنت کے بڑے بڑے نتیجے پیدا ہو رہے تھے۔ اس حالت کو دیکھ کر

اس نے اپنے ساتھی سے کہا کہ میرا مال تجھ سے زیادہ ہے۔اور قوم کے لحاظ سے بھی تجھ سے زیادہ معزز ہوں۔

اب میں اس تمثیل کی حقیقت بیان کرتا ہوں۔سورۃ کے شروع میں بتایا گیا تھا۔کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مکہ والوں کو خدا کا پیغام پہونچایا۔اور یہود کو پہنچانے والے ہیں۔اسی طرح آپ مسیحیوں کو بھی بیدار کرنے والے ہیں اور پھر مسیحی قوم کی ابتدائی تاریخ بتائی کہ یہ قوم ان حالات میں شروع ہوئی تھی۔کہ توحید کے لئے انہوں نے سخت سے سخت تکلیفیں اٹھائیں۔مگر بعد میں مشرک ہوگئی اور دنیا کے پیچھے پڑ گئی۔

اس تمثیل میں باغ سے مراد مسیحی قوم ہے اب اس تمثیل کے ذریعہ سے مسلمانوں اور مسیحیوں کے مقابلہ کا ذکر آتا ہے۔اس تمثیل میں باغ والے سے مراد مسیحی قوم ہے۔اور انگوروں کے باغ کی تمثیل اس لئے دی ہے کہ مسیحی قوم کو انگور کا باغ خود حضرت مسیح ناصری نے قرار دیا ہے۔اور اس باغ کی تمثیل ان آیات کی تمثیل سے ملتی ہے۔ حضرت مسیح کہتے ہیں ''ایک شخص نے انگور کا باغ لگایا۔اور اس کے چاروں طرف گھیرا اور کولھو کی جگہ کھودی۔اور ایک بُرج بنایا۔اور اسے باغبانوں کے سپرد کر کے پردیس گیا۔پھر موسم میں اس نے ایک نوکر کو باغبانوں کے پاس بھیجا۔ تا کہ وہ باغبانوں سے انگور کے باغ کے پھل میں سے کچھ لے۔انہوں نے اسے پکڑ کے مارا۔اور خالی ہاتھ بھیجا۔ اس نے دوبارہ ایک اور نوکر کو ان کے پاس بھیجا انہوں نے اس پر پتھر پھینکے۔اس کا سر پھوڑا۔اور بے حرمت کر کے پھیر بھیجا۔پھر اس نے ایک اور کو بھیجا۔انہوں نے اسے قتل کیا۔پھر اور بہتیروں کو ان میں سے بعضوں کو پیٹا اور بعضوں کو مار ڈالا۔اب اس کا ایک ہی بیٹا تھا جو اس کو پیارا تھا۔آخر کو اس نے اسے بھی اس کے پاس یہ کہہ کر بھیجا کہ وے میرے بیٹے سے دبیں گے۔لیکن ان باغبانوں نے آپس میں کہا یہ وارث ہے۔آؤ ہم اسے مار ڈالیں۔تو میراث ہماری ہوجائے گی۔او انہوں نے اسے پکڑ کر قتل کیا۔اور انگور کے باغ کے باہر پھینک دیا۔پس باغ کا مالک کیا کہے گا۔وہ آوے گا اور ان باغبانوں کو ہلاک کر کے انگوروں کا باغ اوروں کو دے گا۔کیا تم نے یہ نوشتہ نہیں پڑھا۔کہ وہ پتھر جسے معماروں نے ناپسند کیا وہی کونے کا سرا ہوا'' (مرقس باب ۱۲ آیت ۱ تا ۱۰)

اس تمثیل میں حضرت مسیح نے مذاہب کو انگور کے باغ سے تشبیہ دی ہے۔اور باغ کا مالک خدا تعالیٰ کو بتایا ہے۔ باغ کے متعلق وہی تشریح ہے جو قرآن کریم میں ہے۔کہ بیچ میں انگور اور چاروں طرف باڑ۔صرف یہ فرق ہے کہ قرآن کریم نے باڑ کے درختوں کا نام بھی بتایا ہے جس سے زائد معنی پیدا کر دیئے ہیں۔غرض حضرت مسیح نے نبیوں کی مخاطب امتوں کو باغ بتایا ہے۔اور ان کی نگرانی کرنے والے علماء اور بادشاہوں کو مالی۔وہی معنی قرآن کریم میں ہیں۔باغ سے مراد عیسائیت ہے اور انگور سے مراد مال اور دولت اور اولاد کی زیادتی ہے۔اور کھجوروں سے مراد یہ

ہے کہ مسیحیت اپنی ترقی کے زمانہ میں فوجوں پر انحصار رکھے گی۔ اور اپنی حفاظت کے زبردست سامان کرے گی۔ اور باغ کو ایک لحاظ سے دو اور ایک لحاظ سے ایک اس لئے قرار دیا ہے۔ کہ سابق قوموں کے برخلاف مسیحیت کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کی ترقی دو زمانوں میں ہوئی ہے۔ ایک اسلام سے پہلے اس کی ترقی کا زمانہ تھا۔ اور دوسرا زمانہ اسلام کے تین سو سال بعد شروع ہوا اور سات سو سال میں جا کر تکمیل کو پہونچا۔ یعنی سترھویں صدی میں ان ترقی کے دو زمانوں کے درمیان ان کی حالت زرع کی سی رہی۔ کہ وہ جانوروں کے پاؤں تلے روندے جانے اور اکھیڑے جانے کے خطرہ میں ہوتی ہے۔ اور ان دونوں زمانوں کے درمیان جو مسیحیت کے باغ کہلانے کے مستحق تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک نہر چلا دی تھی۔ یعنی اسلام کا زمانہ رکھ دیا تھا۔ جس نے مسیحی قوم کے دونوں باغوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا تھا۔ ان دونوں زمانوں کے درمیان ایک عظیم الشان انسان پیدا ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ نے امر معروف کا سلسلہ جاری کیا۔

پھر بتایا ہے کہ جب اسلام دنیا میں آ گیا۔ تو دونوں باغوں کے مالک نے یعنی عیسائی قوم کے لیڈروں نے مسلمانوں کو طعنہ دینا شروع کیا۔ کہ تمہاری کیا طاقت ہے۔ ہم کو تو غیر معمولی طور پر دو زمانوں میں حکومت ملی ہے۔ خصوصاً وہ زمانہ ترقی کا جو مسلمانوں کے زمانہ میں آیا۔ وہ تو بہت ہی شاندار ہوگا۔ اس پر انہیں خاص ناز ہوگا۔ کیونکہ اسی سے مسلمانوں کا مقابلہ ہوگا۔

وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ

اور (ایک دفعہ) وہ اپنی جان پر ظلم کرتے ہوئے اپنے باغ میں داخل ہوا۔ (اور وہ اس طرح کہ) اس نے (اپنے

تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ۙ﴿۳۶﴾

ساتھی سے) کہا (کہ) میں نہیں سمجھتا کہ یہ کبھی تباہ ہو۔

حل لغات۔ تَبِیْدُ تَبِیْدُ بَادَ سے مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اور بَادَ (يَبِيْدُ بُيُوْدًا) کے معنی ہیں ھَلَكَ کوئی چیز ہلاک ہوگئی۔ (اقرب) پس مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا کے معنی ہوں گے کہ میں خیال نہیں کرتا کہ وہ کبھی تباہ و ہلاک ہو۔

تفسیر۔ **عیسائی قوم کو اپنی آخری زمانہ کی ترقی پر ناز ہوگا** اب فرماتا ہے کہ وہ اپنی حکومتوں اور

شان وشوکت پر بہت ناز کریں گے اور سخت بے دین ہوں گے کیونکہ ظَالِمٌ لِنفسہٖ کا یہی مطلب ہوتا ہے۔ اور پھر ان کو یہ خیال ہوگا کہ ہماری حکومت کبھی تباہ نہ ہوگی۔ اس جگہ جنت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ حالانکہ باغ دو تھے۔ کیونکہ گو مسیحی قوم کو ناز اپنی پہلی تاریخ پر بھی ہے۔ مگر اصل ناز ان کو آخری زمانہ کی ترقی پر ہے۔ اور اسلام کے مقابل پر وہ اسی کو پیش بھی کرتے ہیں۔ اس لئے اب اس جگہ سے دو باغوں کا ذکر ترک کر کے سب مفرد کے صیغے ہی استعمال کئے گئے ہیں۔ جنتین کی جگہ جنت کہنے سے یہ بھی مراد ہوسکتی ہے۔ کہ ان دونوں جنتوں کو ایک لحاظ سے ایک ہی سمجھنا چاہیے کیونکہ درحقیقت یہ ترقی ایک ہی قوم کی ہے گو ایک وقفہ پڑ جانے کی وجہ سے دو حصوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ ان معنوں کے رو سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ جو میں اوپر بیان کر آیا ہوں کہ کِلْتَا کے لئے باوجود تثنیہ کی ضمیر کے استعمال کی اجازت ہونے کے جو مفرد کی ضمیر پھیری گئی ہے اس سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ کہ من جہۃٍ وہ دونوں باغ ایک ہی باغ سمجھے جانے چاہئیں۔

وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ

اور میں نہیں سمجھتا کہ وہ (موعودہ) گھڑی (کبھی) آنے والی ہے۔ اور اگر (بالفرض) مجھے میرے رب کی طرف

لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۷﴾

لوٹا (بھی) دیا جائے تو میں (وہاں بھی) یقیناً اس سے بہتر ٹھکانا پاؤں گا۔

حل لغات۔ظَنٌّ اَظُنُّ ظَنَّ سے مضارع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور ظَنَّ الشَّیْءَ کے معنی ہوتے ہیں: عَلِمَهٗ کسی چیز کو جاننا۔ وَاسْتَيْقَنَهٗ کسی چیز کے متعلق یقین کرلیا۔ وَتَأْتِيْ ظَنُّ لِلدَّلَالَةِ عَلَى الرُّجْحَانِ۔ اور بعض اوقات راجح خیال کو ظاہر کرنے کے لئے بھی ظَنَّ کا فعل استعمال کرتے ہیں (اقرب) پس مَآ اَظُنُّ کے معنی ہوں گے میں یقین نہیں کرتا۔ میں نہیں سمجھتا۔

الساعۃ اَلسَّاعَةُ کے لئے دیکھو سورہ ہذا آیت نمبر ۲۲۔

منقلبًا مُنْقَلَبًا یہ اِنْقَلَبَ سے مصدر میمی ہے اور ظرف مکان بھی ہے۔ اِنْقَلَبَ کے معنی ہیں اِنْكَبَّ الٹ گیا۔ رَجَعَ۔ لوٹا۔ (اقرب)

تفسیر ۔اس میں اشارہ کیا ہے کہ اس قوم میں دو خیالات کے لوگ ہوں گے ایک تو وہ جو قیامت کے قائل نہ ہوں گے۔سب کچھ اسی دنیا کو سمجھیں گے ۔اور دوسرا گروہ قیامت کا قائل ہوگا ۔مگر اس کا یہ خیال ہوگا ۔کہ اگلے جہان کے انعامات بھی انہی کے لئے مقرر ہیں ۔چنانچہ یہی حال مسیحیوں کا ہے ۔کچھ ان میں سے اس امر کے قائل ہیں کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں ۔بلکہ قومی ارتقاء کے معنی ہی جنت کے ہیں اور یہ مسیحیوں کو مل گئی ہے ۔اور مل جائے گی اور بعض بعث بعد الموت کے تو قائل ہیں ۔لیکن ان کا یہ خیال ہے کہ چونکہ مسیح نے ہمارے گناہ اٹھا لیئے ہیں اور دوسروں کے گناہ اٹھانے والا کوئی نہیں ۔اس لئے ہم تو نجات پا جائیں گے دوسرے سب لوگ دوزخ میں جائیں گے۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ

اس کے ساتھی نے اس سے سوال و جواب کرتے ہوئے کہا (کہ) کیا تو نے اس (ہستی) کا انکار کر دیا ہے جس نے

مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ؕ ﴿۳۸﴾

تجھے (اوّلاً) مٹی سے (اور) پھر نطفہ سے پیدا کیا۔(اور) پھر اس نے تجھے پورا آدمی بنایا۔

حلّ لُغات۔نطفة نُطْفَةٌ کے معنی کے لئے دیکھو نحل آیت نمبر ۵۔

سَوَّاكَ رَجُلًا سَوَّى الشَّيْءَ کے معنی ہیں جَعَلَهٗ سَوِيًّا کسی چیز کو ٹھیک اور مکمل بنا دیا (اقرب) پس سَوّٰىكَ رَجُلًا کے معنی ہوں گے تجھے پورا مکمل آدمی بنا دیا۔

سَوَّى الشَّيْءَ کے معنی ہیں جَعَلَهٗ سَوِيًّا اس کو سوی یعنی بے عیب و بے نقص بنا دیا۔غُلَامٌ سَوِيٌّ: اَیْ لَادَاءَ بِهٖ وَلَا عَيْبَ۔جب یہ لفظ انسان کے لئے بولا جائے ۔تو اس کے معنے ہوتے ہیں کہ جسمانی طور پر بھی اس میں کوئی نقص نہیں ہے اور اخلاقی لحاظ سے بھی اس میں نقص نہیں ہے۔چنانچہ غُلَامٌ سَوِيٌّ ایسے لڑکے پر بولتے ہیں جس میں اخلاقی اور جسمانی کوئی نقص اور عیب نہ ہو۔وَمِنْهُ رَزَقَكَ اللّٰهُ ولدًا سويًّا۔اور انہی معنوں میں یہ فقرہ بطور دعا کے کہا جاتا ہے۔کہ تمہیں اللہ تعالیٰ بے عیب لڑکا عطا فرماوے۔(اقرب)

تفسیر ۔ یہ تمثیلی زبان میں مسلمانوں کی طرف سے جواب دیا ہے۔ یعنی اس مثال میں ایک اور بھی شخص تھا۔ اس نے اس تکبر کرنے والے کو نصیحت کی۔ اور کہا کہ کیا تم خدا تعالیٰ کا انکار کرتے ہو۔ جس نے تم کو پیدا کیا۔ پھر ادنیٰ حالت سے ترقی دے کر کمال تک پہونچا دیا۔ یعنی تمہاری حالت عملاً اللہ تعالیٰ کے انکار کے مترادف ہے۔ ورنہ خدا تعالیٰ پر حقیقی ایمان رکھتے ہوئے کوئی ایسے خیالات نہیں رکھ سکتا جیسے کہ تمہارے ہیں۔

قرآن کریم کا یہ عام طریق ہے کہ جب کسی کو یہ کہتا ہے۔ کہ اپنی ترقی پر غرور نہ کر تو اس کی ابتدائی حالت کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ جس طرح مسلمانوں کو کہا ہے کہ تم مایوس نہ ہو۔ یہ جو اس وقت کی ترقی یافتہ قومیں ہیں یہ بھی پہلے کمزور تھیں۔ اب عیسائیوں کو فرمایا۔ کہ تم یہ خیال نہ کرو۔ کہ مسلمان کمزور ہیں۔ تم اپنی پہلی حالت کو دیکھو کہ وہ کس قدر کمزور تھی۔ اور جسمانی پیدائش بھی انسان کی مٹی اور پھر نطفہ سے ہی ہوتی ہے۔

اس تمثیل میں دونوں اشخاص کی گفتگو کے ساتھ یہ فرمایا ہے کہ وَھُوَ یُحَاوِرُہٗ جس سے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ ان دونوں قوموں میں مباحثات ہوں گے۔ اور مباحثات کے دوران میں مسیحی لوگ مسلمانوں کی کمزوری اور اپنی قوت کو اپنے سچا ہونے کی دلیل قرار دیا کریں گے۔

لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ﴿۳۹﴾

(تمہارا تو یہ حال ہے) لیکن (میں تو یہ کہتا ہوں کہ) حق تو یہ ہے کہ اللہ (تعالیٰ) ہی میرا رب ہے اور میں کسی کو (بھی) اپنے رب کا شریک نہیں بناتا۔

تفسیر ۔ یعنی میرا سہارا اور اطمینان اپنی تدبیر پر نہیں مجھے تو جو کچھ دے گا خدا تعالیٰ ہی دے گا۔ ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اور ہمیں اسی نہ ہونے پر فخر ہے کہ تازہ بتازہ خدا تعالیٰ کے نشانات دیکھتے رہتے ہیں۔ وَلَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا میں کیا لطیف بات بیان فرمائی ہے کہ خدا تعالیٰ نے تم کو دیا ہے۔ اور پھر تم اس کے ساتھ شریک ٹھیراتے ہو۔ لیکن خدا تعالیٰ نے مجھے دنیا کا مال نہیں دیا۔ پھر بھی میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ٹھہراتا۔ یعنی شبہ تو مجھے ہو سکتا تھا۔ کہ شائد دو خدا ہوں۔ کہ تمہارے خدا نے تم سے حسن سلوک کیا۔ اور میرے خدا نے نہ کیا۔ مگر میں تو غربت میں بھی ایک ہی خدا کا ماننے والا ہوں۔

وَ لَوْ لَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ

اور جب تو اپنے باغ میں آیا تھا تو کیوں نہ تو نے کہا (کہ وہی ہوگا) جو اللہ (تعالیٰ) چاہے گا (کیونکہ) اللہ (تعالیٰ)

اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ

ہی (کے فضل) سے ہر ایک قوت (حاصل ہوتی) ہے۔ اگر تو مجھ (ناچیز) کو اپنی نسبت مال اور اولاد میں

مَالًا وَّ وَلَدًا ۚ﴿۴۰﴾

کم سمجھتا ہے۔

تفسیر۔ مسلمان کے دل میں پھر بھی ہمدردی ہے۔ وہ اسے کہتا ہے کہ کیوں تو نے باغ میں داخل ہوتے ہوئے یہ نہ کہا۔ کہ سب قوت اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔ اور اپنے آپ کو طاقتور سمجھا۔

یہ جو فرمایا ہے مَا شَآءَ اللّٰهُ اس میں مّا موصولہ ہے۔ اور اس سے پہلے مبتداء محذوف ہے۔ جو اَلْاَمْرُ کا لفظ ہے اور ترجمہ یہ ہے کہ جب تو باغ میں داخل ہوا تھا تو نے یہ کیوں نہ کہا کہ ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔

اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا۔ اس جملہ کا مضمون اگلی آیت سے مل کر مکمل ہوتا ہے۔ اور درحقیقت یہ دونوں آیتیں مل کر پورا مطلب دیتی ہیں۔ شرط تو اس آیت میں بیان ہوئی ہے اور جزا اگلی آیت میں۔

فَعَسٰى رَبِّيْۤ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَ يُرْسِلَ

تو بالکل ممکن ہے کہ میرا رب مجھے تیرے باغ سے کوئی بہتر (باغ) دے دے۔ اور اس (تیرے باغ) پر اوپر سے

عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ۙ﴿۴۱﴾

کوئی آگ کا شعلہ گرائے۔ جس کی وجہ سے وہ ایک صاف اور چٹیل میدان ہو جائے۔

حلّ لُغات۔ حُسْبَانًا حُسْبَانٌ حَسَبَ (يَحْسُبُ) کا مصدر ہے۔ حَسَبَ الشَّيْءَ کے معنی ہیں۔ عَدَّهٗ اسے شمار کیا۔ اور حُسْبَانٌ کے معنی ہیں اَلْحِسَابُ حساب کرنا۔ اَلْعَذَابُ۔ عذاب۔ اَلْبَلَاءُ وَالشَّرُّ۔ آفت

مصیبت اَلْعَجَاجُ۔غبار۔اَلْجَرَادُ۔ٹڈی دل۔اَلنَّارُ۔آگ۔(تاج)

صعیدًا صَعِیْدًا کے معنی کے لئے دیکھو سورۃ ہذا آیت نمبر ۹۔

زَلَقًا اَلزَّلَقُ :مَوْضِعُ الزَّلَقِ لَایَثْبُتُ عَلَیْہِ قدمٌ پھسلنے کی جگہ جہاں پاؤں جم نہ سکے۔اَرْضٌ زَلَقٌ اَیْ مَلْسَاءُ لَیْسَ بِھَا شَیْءٌ۔چٹیل میدان بے آب وگیاہ زمین۔(اقرب)

تفسیر۔اس آیت میں بھی جنت کا لفظ جو ایک باغ پر دلالت کرتا ہے استعمال ہوا ہے۔اور اس کے بعد یُرْسِلَ عَلَیْھَا فرمایا ہے عَلَیْھِمَا نہیں فرمایا۔کیونکہ ایک باغ اسلامی زمانہ سے پہلے ہلاک ہو چکا تھا اس پر فخر تو اس رنگ کا تھا۔جیسے کہ لوگ اپنے آباء کی بڑائی پر فخر کرتے ہیں۔اصل فخر موجودہ زمانہ کے باغ پر ہے۔اس لئے فرمایا کہ اگر تو مجھے ادنیٰ حالت میں دیکھتا ہے اور اس پر نازاں نہ ہو۔کیونکہ یہ بات ناممکن نہیں۔کہ میرا رب تیرے باغ سے بہتر باغ مجھے دے دے۔اور صرف یہی نہیں بلکہ آسمانی عذاب نازل کر کے تیرے باغ کو جلا دے۔اور تیرے ہمیشہ حکومت کرنے کے دعاوی دھرے کے دھرے رہ جائیں۔

اس جگہ صَعِیْدًا زَلَقًا کے الفاظ آئے ہیں۔یہ وہی لفظ ہیں جو شروع سورۃ میں خدا تعالیٰ کا بیٹا بنانے والوں کی نسبت آچکے ہیں جس سے ظاہر ہو گیا۔کہ اس قوم کے متعلق اس جگہ مثال بیان کی گئی ہے۔

یاجوج ماجوج سے لڑنے کی کسی کو طاقت نہ ہوگی مِنَ السَّمَآءِ میں یہ بتایا ہے۔کہ زمینی تدابیر سے اس قوم کا مقابلہ نہ ہو سکے گا چنانچہ یاجوج ماجوج کے متعلق جو مسیحیت کی دنیاوی ترقی کے دو ظہور ہیں لکھا ہے کہ لَایَدَانِ لِاَحَدٍ بِقِتَالِھِمْ (مسلم کتاب الفتن باب ذکر الدجال) کہ ان سے لڑنے کی کسی کو طاقت نہ ہوگی۔ان کا مقابلہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوگا۔

اَوْ یُصْبِحَ مَآؤُھَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِیْعَ لَہٗ طَلَبًا ﴿۴۲﴾

یا اس کا پانی خشک ہو جائے (اور) پھر تو اس کی تلاش کی (بھی) طاقت نہ پائے (چنانچہ ایسا ہی ہوا)

حلّ لُغَات۔**غَوْرًا** غَارَ الْمَاءُ غَوْرًا کے معنی ہیں ذَھَبَ فِی الْاَرْضِ وَسَفَلَ فِیْھَا پانی زمین میں جذب ہو کر نیچے چلا گیا۔اَلْغَوْرُ غَارَ کا مصدر ہے۔نیز اس کے معنی ہیں اَلْمَاءُ الْغَائِرُ ایسا پانی جو زمین میں جذب ہو کر خشک ہو گیا ہو۔(اقرب)

تفسیر ۔اس آیت سے ظاہر ہوگیا کہ نہر سے مراد مسیحی باغ کا پانی نہ تھا۔کیونکہ اس آیت کی نسبت فرماتا ہے کہ اس کے باغ کا پانی زمین میں ہی غائب ہوجائے۔اور نہروں کا پانی زمین میں غائب نہیں ہوتا۔بلکہ باہر سے آتا ہے۔پس ان باغوں کا پانی الگ تھا۔جو ان باغوں میں موجود تھا۔اور اس کے زمین میں ہی غائب ہونے کی خبر دی گئی ہے یعنی اس قوم کی اندرونی طاقتیں تباہ ہوجائیں گی اور وہ ذہنی قوتیں جو پہلے باغوں کو آباد کرنے کا موجب تھیں۔خشک چشموں کی طرح ہوکر باغ کے اجڑنے کا موجب بن جائیں گی۔

وَ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَاۤ اَنْفَقَ فِيْهَا

اور اس کے (تمام) پھلوں کو تباہ کر دیا گیا۔اور وہ اس حال میں کہ وہ (یعنی باغ) اپنی ٹٹیوں پر گرا ہوا تھا اس

وَ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ

(مال) پر جو اس نے اس (باغ کی ترقی) کے لئے خرچ کیا تھا اپنے دونوں ہاتھ ملنے لگا اور کہنے لگا (کہ)

اُشْرِكْ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ﴿۴۳﴾

اے کاش میں کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بناتا۔

حلّ لُغات۔اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ اُحِيْطَ بِهٖ کے معنی ہیں۔دَنَا هَلَاكُهٗ۔اس کی ہلاکت کا وقت آپہونچا۔(اقرب) نیز جب محاورہ بولیں۔اَلسَّنَةُ الْمُجْدِبَةُ: الشَّدِيْدَةُ تُحِيْطُ بِالْاَمْوَالِ تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں تُهْلِكُهَا کہ قحط سالی نے مالوں کو تباہ کر دیا (تاج) پس اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ کے یہ معنی ہوں گے کہ اس کے پھل کو تباہ کر دیا گیا۔

اَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ اَيْ يَتَنَدَّمُ جب اَصْبَحَ يُقَلِّبُ کا محاورہ بولیں تو یہ مراد ہوتی ہے کہ وہ نادم ہوگیا۔(اقرب)

خَاوِيَةٌ خَاوِيَةٌ خَوِيَ يَخْوَى یا خَوَى يَخْوِيْ سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے۔خَوَتِ الدَّارُ کے معنی ہیں اَقْوَتْ وَسَقَطَتْ وَتَهَدَّمَتْ مکان اجڑ گیا۔گر گیا منہدم ہوگیا۔خَوِيَتِ الدَّارُ کے معنی ہیں خَلَتْ مِنْ اَهْلِهَا گھر رہنے والوں سے خالی ہوگیا۔(اقرب)

عُرُوْشٌ عُرُوْشٌ عَرْشٌ کی جمع ہے اور اَلْعَرْشُ مِنَ الْبَیْتِ کے معنی ہیں سَقْفُہٗ گھر کی چھت۔ (اقرب) پس خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا کے معنی ہوں گے کہ وہ اپنی چھتوں پر گرا ہوا تھا۔

تفسیر۔ اُحِیْطَ بِثَمَرِہٖ یعنی جو نتائج پہلے ان کی محنتوں کے نکلے تھے پھر نہ نکلیں گے۔ اور وہ افسوس کرنے لگ جائیں گے کہ اس قدر روپیہ خرچ کر کے جو سامان تیار کئے تھے۔ اب کسی کام کے نہیں رہے۔ جو اقوام دنیوی شان وشوکت پر روپیہ خرچ کرتی ہیں ان کے اندر تباہی کے وقت سخت حسرت پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ وہی عمارتیں جن پر وہ فخر کرتے تھے۔ اب ان کی مرمتیں بھی ان کے لئے مشکل ہو جاتی ہیں۔ لیکن جو قومیں اپنے اموال اپنی قوم کی علمی اور اخلاقی ترقی کے لئے خرچ کرتی ہیں۔ ان کا خرچ ان کے لئے کبھی حسرت کا موجب نہیں ہوتا۔ وَھِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا کہہ کر بتایا کہ ان میں بڑی بڑی عمارتیں تیار کرنے کا مرض ہوگا۔ وَھِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا باغ کے لئے نہیں آ سکتا۔

اس وقت ان میں افسوس پیدا ہوگا کہ کیوں شرک کیا اور توحید کو قبول کر کے اور ناصح کی نصیحت کو مان کر ہم اس عذاب سے نہ بچ گئے۔

خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ان پر ایسے عذاب آئیں گے کہ شہر برباد ہو جائیں گے اور عمارتیں گرا دی جائیں گی۔

وَلَمْ تَکُنْ لَّہٗ فِئَۃٌ یَّنْصُرُوْنَہٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَمَا کَانَ

اور (اس وقت) کوئی جماعت بھی اس کے ساتھ نہ ہوئی جو اللہ (تعالیٰ) کو چھوڑ کر اس کی مدد کرتی۔ اور نہ وہ (اس

مُنْتَصِرًا ﴿۴۴﴾

کا کوئی) انتقام ہی لے سکا۔

حلّ لُغات۔ اَلْفِئَۃُ اَلْفِئَۃُ اَلطَّائِفَۃُ۔ گروہ۔ اَلْجَمَاعَۃُ۔ جماعت۔ (اقرب)

مُنْتَصِرٌ مُنْتَصِرٌ اِنْتَصَرَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اور اِنْتَصَرَ کے معنی ہیں اِنْتَقَمَ مِنْہُ اس سے انتقام لیا۔ اِنْتَصَرَ عَلَیْہِ: اِسْتَظْھَرَ اس پر غالب آیا (اقرب) پس مُنْتَصِرٌ کے معنی ہیں انتقام لینے والا۔

تفسیر۔ یعنی اس قوم کو مسیح کی تائید پر بہت بھروسہ ہوگا۔ لیکن اس دن مسیح بھی ان کی کوئی مدد نہ

کر سکیں گے۔

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ

اس موقعہ پر مدد اللہ (تعالیٰ) کی ہی (مفید) ہوتی ہے۔ جو معبود حقیقی ہے۔ اور وہ بدلہ دینے میں (بھی) سب سے

عُقْبًا ﴿۴۵﴾ ع

اچھا ہے اور (اچھا) انجام (پیدا کرنے کی) رو سے بھی سب سے اچھا ہے۔

تفسیر۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہو گیا۔ کہ اس جگہ پیشگوئی کا ذکر ہے۔ کیونکہ فرماتا ہے۔ اس موقعہ پر حکومت اللہ تعالیٰ ہی کی ہو جائے گی اور وہ ان لوگوں پر فضل کرے گا جو اس کے موحد بندے ہوں گے۔ اور دنیا کی بجائے آخرت کی طرف توجہ کرنے والے ہوں گے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ

اور تو ان کے سامنے اس ورلی زندگی کی حالت (بھی کھول کر) بیان کر (کہ وہ) اس پانی کی طرح (ہے) جسے ہم نے

السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا

بادل سے برسایا پھر اس میں زمین کی روئیدگی مل گئی۔ پھر (آخر) وہ (بھوسے کا) چورا بن گئی۔ جسے ہوائیں اڑاتی

تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۶﴾

(پھرتی) ہیں اور اللہ (تعالیٰ) ہر بات پر خوب قدرت رکھنے والا ہے۔

حلّ لُغات۔ اختلط اِخْتَلَطَ کے معنی ہیں اِمْتَزَجَ مل گیا۔ (اقرب)

الھشیمُ هَشِيْمٌ کے معنی ہیں اَلْمَهْشُوْمُ ٹوٹا ہوا نَبْتٌ يَابِسٌ مُتَكَسِّرٌ خشک شکستہ پودہ يَابِسُ كُلِّ كَلَأٍ وَشَجَرٍ۔ ہر خشک گھاس درخت۔ (اقرب)

تَذْرُوْهُ تَذْرُوْهُ ذَرَا سے مضارع مونث غائب کا صیغہ ہے۔ اور ذَرَتِ الرِّيْحُ التُّرَابَ کے معنی ہیں

فَرَّقَتْهُ وَاَطَارَتْهُ وَاذْهَبَتْهُ ہوا نے مٹی کو اڑا کر بکھیر دیا (اقرب) پس تَذْرُوْهُ کے معنی ہوں گے اسے ہوائیں اڑاتی ہیں۔

مُقْتَدِرًا مُقْتَدِرٌ اِقْتَدَرَ (جو قَدَرَ سے نکلا ہے) سے اسم فاعل ہے اِقْتَدَرَ عَلَيْهِ کے معنی ہیں قَوِيَ عَلَيْهِ وَتَمَكَّنَ مِنْهُ۔ اس پر پوری قدرت پائی۔ اس پر قابو پالیا (اقرب) پس مُقْتَدِرًا کے معنی ہوں گے خوب قدرت والا۔

تفسیر۔ سابق تمثیل کے مضمون کی مزید وضاحت اس زندگی کی مثال میں سابق تمثیل کے مضمون کو ایک اور تمثیل سے واضح فرمایا گیا ہے۔ فرماتا ہے کہ دنیوی زندگی پہلے نہایت خوبصورت نظر آتی ہے۔ مگر اس کا انجام بڑا بدنما ہوتا ہے۔ اور اس کے بالمقابل دینی زندگی پہلے بظاہر بدنما ہوتی ہے۔ مگر اس کا انجام نہایت خوش شکل ہوتا ہے۔

جب مادی پانی آسمان سے اترتا ہے تو کسی قدر سبزی اس سے پیدا ہوتی ہے۔ اور ٹہنیاں کثرت کی وجہ سے ایک دوسری میں گھسی جاتی ہیں۔ لیکن پھر سب سبزہ خشک ہو کر ہوا میں اڑتا پھرتا ہے۔ لیکن اس کے مقابل پر روحانی پانی سے جو کھیتی تیار ہوتی ہے۔ وہ کبھی بھی خشک نہیں ہوتی۔ بظاہر اس مثال پر یہ اعتراض پڑتا ہے۔ کہ کھیتی تو خشک ہو کر ہی کھانے کے کام آتی ہے۔ مگر اس جگہ کھانے والے کی تمثیل نہیں دی۔ کھیتی کی تمثیل دی ہے۔ بتایا ہے کہ دنیاوی ترقی کے وقت قومیں بہت لہلہاتی نظر آتی ہیں۔ مگر زوال کے وقت ان کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ اس کے برخلاف جو قومیں دین کی طرف توجہ کرتی ہیں۔ اگلے جہان میں تو ان کو عزت ملے گی سو ملے گی۔ اس دنیا میں بھی ان کی عزت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ نوح کی کوئی قوم باقی نہیں۔ مگر دیکھو نوحؑ کی آج بھی عزت ہے۔ یہی حال ابراہیم کا ہے۔ یہودی ذلیل ہوئے ہیں مگر موسیٰ کی عزت بدستور ہے۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی دیناوی فتوحات جاتی رہیں۔ لیکن ان کی دینی خدمات کی وجہ سے آج بھی ان میں سے ادنیٰ سے ادنیٰ کے نام پر جانیں قربان کرنے والے لوگ موجود ہیں۔

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ

مال اور بیٹے اس ورلی زندگی کی زینت ہیں۔اور باقی رہنے والے نیک (اور مناسب حال) کام (ہی جوان چیزوں

الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا ﴿٤٧﴾

سے لئے جائیں) تیرے رب کے نزدیک بدلہ کے لحاظ سے (بھی) بہتر ہیں۔اور امید کے لحاظ سے (بھی) بہتر ہیں

حلّ لُغات۔اَلْاَمَلُ اَلْاَمَلُ کے لئے دیکھو حجر آیت نمبر ۴۔

اَلْاَمْلُ وَالْاَمَلُ اس کی جمع اٰمَالٌ ہے۔اور اَلْاَمَلُ کے معنے ہیں۔الرَّجَاءُ۔امید۔تَاَمَّلْتُ الشَّیْءَ اَیْ نَظَرْتُ اِلَیْہِ مُسْتَثْبِتًا لَہٗ۔تَأَمَّلْتُ الشَّیْءَ کے معنے ہیں اسے غور سے دیکھا۔ٹکٹکی لگا کر دیکھا۔(اقرب)

تفسیر۔اس جگہ پر بھی تشریح فرمادی کہ نَبَاتُ الْاَرْضِ سے کیا مراد ہے۔پہلی تمثیل میں باغ بیان کر کے اس کی تشریح میں اس صاحب الجنۃ کا یہ قول بیان کیا تھا اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا کہ میرے پاس مال زیادہ ہے۔اور میری تعداد بھی زیادہ ہے۔اس جگہ پر نَبَاتُ الْاَرْضِ بیان فرما کر اس کی تعبیر میں فرمایا۔اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔جس سے ظاہر ہے کہ جنت سے یہی مراد تھی۔

اس آیت میں بتایا ہے کہ مال اور اولاد بے شک دنیا کی زینت ہیں لیکن اگر انہیں صحیح طور پر استعمال کیا جائے یعنی دین میں مال خرچ ہوں۔اور دین کی خدمت کے لئے اولاد لگادی جائے۔تو پھر اللہ تعالیٰ ان کو بھی دوام بخش دیتا ہے روپیہ خرچ ہو جاتا ہے لیکن اس کا نیک اثر باقی رہ جاتا ہے اولاد مر جاتی ہے لیکن ان کا ذکر خیر بھی باقی رہ جاتا ہے۔اور ان کی وجہ سے ان کے ماں باپ کا ذکر خیر بھی زندہ رہتا ہے۔

اَلْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ كُلُّ عَمَلٍ صَالِحٍ نیک اور اچھے کام باقیات صالحات کہلاتے ہیں۔

آیت خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ الخ کے دو معنی خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا اس کے دو معنی ہیں (۱) نیک کام کا دنیا میں نتیجہ نکلتا ہے اور اس کے متعلق آئندہ بھی اچھی امیدیں ہوتی ہیں۔گویا ثوابًا دنیا کے نتیجہ کے متعلق ہے۔اور اَمَلًا آخرت کے متعلق ہے۔(۲) ثوابًا سے مراد خود اس عمل کرنے والے کی ذات کے متعلق بہتر نتائج کا پیدا ہونا ہے۔اور املاً سے مراد آئندہ نسل کے لئے بہترین امیدوں کا ہونا ہے۔مطلب یہ کہ نیک کاموں کا نتیجہ تم کو بھی نیک ملے گا۔اور تمہاری اولادوں کو بھی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ نیک کی اولاد کو بھی فائدہ پہونچاتا ہے۔

وَ يَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَ تَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّ

اور (اس دن بھی ان کے بہتر نتائج نمودار ہوں گے) جس دن ہم ان پہاڑوں کو (اپنی اپنی جگہ سے) چلا دیں گے

حَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ۚ﴿۴۸﴾

اور تو سب (اہل) زمین (کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں) نکلتا ہوا دیکھے گا۔ اور ہم ان (سب) کو اکٹھا کریں گے اور ان میں سے کسی کو (بھی باقی) نہیں چھوڑیں گے۔

حلّ لُغات ۔بَارِزَةٌ بَارِزَةٌ بَرَزَ (يَبْرُزُ ۔بُرُوْزًا) سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے ۔بَرَزَ کے معنی ہیں خَرَجَ نکل آیا۔(اقرب) پس بَارِزَةٌ کے معنی ہوں گے نکلنے والی۔

حَشَرْنٰهُمْ حَشَرْنٰهُمْ حَشَرَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور حَشَرَ کے لئے دیکھو سورۂ حجر آیت نمبر ۲۶۔

حَشَرَ النَّاسَ کے معنے ہیں جَمَعَهُمْ ۔لوگوں کو جمع کیا۔وَيَوْمُ الْحَشْرِ: يَوْمُ الْبَعْثِ وَالْمَعَادِ وَهُوَ مَأْخُوْذٌ مِنْ حَشَرَ الْقَوْمَ اِذَا جَمَعَهُمْ ۔اور یوم البعث کو یوم حشر انہی معنوں کی رو سے کہتے ہیں کہ اس دن اگلے پچھلے لوگوں کو جمع کیا جائے گا۔وَالْحَاشِرُ اِسْمٌ مِنْ اَسْمَاءِ نَبِيِّ الْمُسْلِمِيْنَ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ایک نام حاشر بھی ہے۔(اقرب)

لَمْ نُغَادِرْ نُغَادِرُ غَادَرَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور غَادَرَهُ کے معنی ہیں تَرَكَهُ وَاَبْقَاهُ اس کو چھوڑ دیا اور باقی رکھا۔(اقرب) پس لَمْ نُغَادِرُ کے معنی ہوں گے کہ ہم باقی نہیں رکھیں گے۔ہم نہیں چھوڑیں گے۔

تفسیر ۔جبل کے معنی بڑے آدمی کے بھی ہوتے ہیں اور سیّر کے معنی چلانے کے (اقرب)۔اس جگہ جبال سے مراد بڑے لوگ ہی ہیں۔کیونکہ اس جگہ آدمیوں کا ذکر ہے پہاڑوں دریاؤں کا ذکر نہیں۔اور بتایا گیا ہے کہ یہ سب پیشگوئیاں اس دن پوری ہوں گی۔جب بڑے بڑے لوگ جنگوں کے لئے نکل کھڑے ہوں گے۔ اور تو ساری زمین کو یعنی سب اہل زمین کو دیکھے گا کہ جنگ کے لئے ایک دوسرے کے مقابل پر کھڑے ہو جائیں گے اور ایسی جنگ ہوگی کہ گویا ان میں سے ایک بھی نہ بچے گا۔

اس واقعہ کی طرف انجیل میں بھی اشارہ ہے۔حضرت مسیح فرماتے ہیں کہ آخری زمانہ میں قوم قوم پر اور بادشاہت بادشاہت پر چڑھائی کرے گی۔'' (متی باب ۲۴ آیت ۷)

اَلۡاَرۡضَ سے مراد اہل ارض اَلۡاَرۡضَ سے مراد اہل ارض (اہل زمین) ہیں۔ عربی زبان کا محاورہ ہے کہ بعض دفعہ مضاف کو محذوف کر دیا جاتا ہے جیسا کہ سورۂ یوسف میں آتا ہے وَ سۡـَٔلِ الۡقَرۡیَۃَ الَّتِیۡ کُنَّا فِیۡہَا وَ الۡعِیۡرَ الَّتِیۡۤ اَقۡبَلۡنَا فِیۡہَا (یوسف: ۸۳) یہاں القریۃ اور العیر سے مراد اہل قریہ اور اہل عیر ہیں۔

الارض، الجبل سے مراد ڈکٹیٹرز اور ڈیما کریسز ہوسکتا ہے کہ اَلۡاَرۡضَ سے ادنیٰ طبقہ کے لوگ مراد ہوں۔ اور اَلۡجِبَالَ سے مراد بڑے لوگ یعنی اس دن ایک طرف سے جبال یعنی بڑے لوگ یا دوسرے لفظوں میں ڈکٹیٹرز نکلیں گے۔ اور دوسری طرف سے ارض یعنی ڈیما کریسز کے حامی اور حکومت عوام کے نمائندے نکلیں گے۔ اور آپس میں خوب جنگ ہوگی۔

حَشَرۡنٰہُمۡ ۔حَشَرَ کے معنی کھڑا کر دینے کے ہوتے ہیں۔ اور حَشۡرٌ لشکر کے لئے بھی آتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ فرمایا ہم ان سب کو ایک دوسرے کے مقابل پر کھڑا کر دیں گے اور سب کو سزا دیں گے۔

وَ عُرِضُوۡا عَلٰی رَبِّکَ صَفًّا ؕ لَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا

اور وہ صف باندھے ہوئے تیرے رب کے سامنے پیش کئے جائیں گے (اور ان سے کہا جائے گا کہ) تم (اب)

کَمَا خَلَقۡنٰکُمۡ اَوَّلَ مَرَّۃٍۭ ۫ بَلۡ زَعَمۡتُمۡ اَلَّنۡ نَّجۡعَلَ

یقیناً (اسی طرح بحالت ناچارگی) ہمارے پاس آئے ہو جس طرح (کی حالت میں) ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا

لَکُمۡ مَّوۡعِدًا ﴿۴۹﴾

(اور تم یہ امید نہیں رکھتے تھے) بلکہ تمہیں دعویٰ تھا کہ ہم تمہارے لئے کوئی وعدہ (کے پورا ہونے) کی ساعت مقرر نہیں کریں گے۔

تفسیر ۔ وہ اپنے رب کے حضور صفیں باندھ کر کھڑے کئے جائیں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ان کے متعلق جاری کیا جائے گا خدا کے حضور پیش ہونے میں باطنی صفیں باندھنا ہی مراد ہے ظاہری صفوں کا ہونا مراد نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کی تباہی کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ اس کی قیامت ہی ہوتی ہے۔

لَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا کَمَا خَلَقۡنٰکُمۡ اَوَّلَ مَرَّۃٍۭ ۫ بَلۡ زَعَمۡتُمۡ اَلَّنۡ نَّجۡعَلَ لَکُمۡ مَّوۡعِدًا تم ہمارے پاس آئے ہو۔ جیسا

کہ ہم نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔یعنی پھر تم ماتحت ہو گئے ہو کیا تمہارا خیال تھا کہ ہم نے تمہارے لئے کوئی وعدہ مقرر نہیں کیا تھا۔یعنی تمہاری تباہی کا وقت مقرر نہ تھا۔

اس آیت سے بھی ظاہر ہے کہ یہ دوسری تمثیل پہلی کی شرح ہے۔کیونکہ پہلی تمثیل میں بھی یہ کہا گیا تھا۔مَآ اَظُنُّ اَنۡ تَبِیۡدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا۔

وَوُضِعَ الۡكِتٰبُ فَتَرَى الۡمُجۡرِمِيۡنَ مُشۡفِقِيۡنَ مِمَّا فِيۡهِ وَ

اور (ان کے اعمال کی) کتاب (ان کے سامنے) رکھ دی جائے گی۔پس (اے مخاطب) تو ان مجرموں کو اس کی وجہ

يَقُوۡلُوۡنَ يٰوَيۡلَتَنَا مَالِ هٰذَا الۡكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيۡرَةً وَّ

سے جو اس میں (لکھا) ہوگا ڈرتے دیکھے گا۔اور (اس وقت) وہ کہیں گے کہ اے (افسوس) ہماری تباہی (سامنے

لَا كَبِيۡرَةً اِلَّاۤ اَحۡصٰٮهَا‌ ۚ وَوَجَدُوۡا مَا عَمِلُوۡا حَاضِرًا‌ ؕ وَ

کھڑی ہے) اس کتاب کو کیا (ہوا) ہے (کہ) نہ کسی چھوٹی بات کو اس کا احاطہ کئے بغیر چھوڑتی ہے اور نہ کسی بڑی

لَا يَظۡلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۞ ۵۰ ع

بات کو اور جو کچھ انہوں نے کیا (ہوا) ہوگا۔اُسے (اپنے سامنے) حاضر پائیں گے۔اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

حلّ لُغات۔مُشفقین اَشفَقَ سے اسم فاعل مُشۡفِقٌ آتا ہے۔اور مُشۡفِقُوۡنَ اس کی جمع ہے اَشۡفَقَ عَلَيۡهِ کے معنی ہیں: خَافَ وَحَاذَرَ۔ڈرا اور اس نے بچاؤ کیا۔(اقرب)

اَحۡصٰهَا اَحۡصَی الشَّیۡءَ اِحۡصَاءً کے معنی ہیں عَدَّهٗ اسے شمار کیا۔(اقرب)

تفسیر۔**وضع کتاب کے معنی** وُضِعَ الۡكِتٰبُ۔کتاب کے رکھا جانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ ان میں جاری ہو جائے گی۔یعنی اس کا فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔وَضَعۡنَا السَّيۡفَ فِيۡهِمۡ کے معنی ہوتے ہیں کہ تلوار نے ان میں اپنا کام کرنا شروع کر دیا۔یعنی خوب قتل کرنے لگ گئی۔

فَتَرَى الۡمُجۡرِمِيۡنَ۔یعنی ان اقوام کے دل سے وہ خیال مٹ جائے گا کہ ہماری حکومت ہمیشہ رہے گی بلکہ دلوں

میں ڈر پیدا ہو جائے گا۔ کہ جس تہذیب پر ہم کو اس قدر ناز تھا وہ تباہ ہونے کو ہے۔ یٰوَیۡلَتَنَا مَالِ ہٰذَا الۡکِتٰبِ سے اس طرف اشارہ ہے۔ کہ تمام گزشتہ غلطیوں کی سزا ایک ایک کر کے ملنی شروع ہو جائے گی۔ اور ان کے دل محسوس کریں گے کہ اس دنیا کا حاکم خدا ہے۔ جو انسانی اعمال کو بغیر نتیجہ کے نہیں چھوڑتا اور وہ سب اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتیں گے۔

آخر میں یہ بتایا کہ گو انجام بڑا تلخ ہوگا۔ مگر یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ظلم نہ ہوگا۔ بلکہ اعمال کے مطابق جزا ہوگی۔

وَ اِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ

اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں کو کہا تھا (کہ) تم آدم کے ساتھ (ساتھ) سجدہ کرو تو انہوں نے

کَانَ مِنَ الۡجِنِّ فَفَسَقَ عَنۡ اَمۡرِ رَبِّہٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوۡنَہٗ

(تو اس حکم کے مطابق) سجدہ کیا۔ مگر ابلیس نے (نہ کیا) وہ جنوں میں سے تھا پھر اس نے اپنے رب کے حکم کی

وَ ذُرِّیَّتَہٗۤ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِیۡ وَ ہُمۡ لَکُمۡ عَدُوٌّ ؕ بِئۡسَ

نافرمانی کی۔ تو کیا تم مجھے چھوڑ کر اسے اور اس کی نسل کو (اپنے) دوست بناتے ہو۔ حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔

لِلظّٰلِمِیۡنَ بَدَلًا ﴿۵۱﴾

ظالموں کے لئے وہ (یعنی شیطان خدا تعالیٰ کا) بدل ہونے کے لحاظ سے بہت ہی بُرا ہے

حلّ لُغات۔ لِاٰدَمَ لِاٰدَمَ ل بمعنی مَعَ ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھو سورۂ بنی اسرائیل آیت نمبر ٦٢۔

سَجَدُوۡا سَجَدَ سے جمع کا صیغہ ہے۔ تشریح کے لئے دیکھو حجر آیت نمبر ۳۱۔

اَلسُّجُوۡدُ۔ اَلتَّذَلُّلُ سجود کے معنی تذلل اور ماتحتی کے ہیں۔ (مفردات) وَقَوۡلُہٗ اُسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ قِیۡلَ اُمِرُوۡا بِالتَّذَلُّلِ لَہٗ وَ الۡقِیَامِ بِمَصَالِحِہٖ وَ مَصَالِحِ اَوۡلَادِہٖ۔ آیت اُسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ میں فرشتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ آدم کے ماتحت چلیں۔ اور اس کی مدد کریں اور اس کی اولاد کے لئے ممدّ و معاون بنیں۔ وَقَوۡلُہٗ اُدۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا اَیۡ مُتَذَلِّلِیۡنَ مُنۡقَادِیۡنَ۔ اور قرآن کریم میں جو یہ آیا ہے کہ تم اس دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل

ہوجاؤ۔اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ تم فرمانبرداری کرتے ہوئے جاؤ۔(مفردات)

ابلیس اِبْلِیْسَ کے لئے دیکھو حجر آیت نمبر ۳۲ و بنی اسرائیل آیت نمبر ۶۲۔

اَلْجِنّ کے لئے دیکھو حجر آیت نمبر ۳۸۔

جَنَّ یَجُنُّ جَنًّا وَ جُنُوْنًا کے معنے ہیں ۔سَتَرَہٗ وَاَظْلَمَ عَلَیْہِ پردہ ڈال دیا اور اندھیرا کردیا جَنَّ اللَّیْلُ:اَظْلَمَ وَاخْتَلَطَتْ ظُلْمَتُہٗ۔رات کی تاریکی چھا گئی ۔وَجَنَّ الْجَنِیْنُ فِی الرَّحِمِ:اِسْتَتَرَ۔جنین رحم میں پوشیدہ ہوگیا۔وَالْجَانُّ اسم فاعل اور جانّ اسم فاعل ہے یعنی اندھیرا کردینے والا۔یا پوشیدہ ہوجانے والا۔وَاِسْمٌ جَمْعٍ لِلْجِنِّ۔اور یہ جنّ کی اسم جمع بھی ہے۔حُیَّۃٌ بَیْضَاءُ کَحَلَاءُ الْعَیْنِ لَا تُؤْذِیْ۔اور اس سفید سانپ کو بھی جو سرمگین آنکھوں والا ہو جانّ کہتے ہیں ۔ایسے سانپ میں زہر نہیں ہوتا اور وہ کاٹتا نہیں (اقرب) وَالْجَانُ اَبُو الْجِنِّ اور جنّوں کے مورث اعلیٰ کو بھی جانّ کہتے ہیں ۔(تاج)

فَسَقَ کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۳۴۔

فَسَقَ الرَّجُلُ فِسْقًا:تَرَكَ اَمْرَاللہِ۔ اللہ کی نافرمانی کی۔ عَصٰی نافرمان ہو گیا۔ جَارَعَنْ قَصْدِ السَّبِیْلِ۔ درست راہ سے روگردان ہوگیا۔فَجَرَ۔ بدکردار ہوگیا۔ خَرَجَ عَنْ طَرِیْقِ الْحَقِّ۔حق کی راہ سے الگ ہوگیا۔اَلرُّطَبَۃُ عَنْ قِشْرِھَا: خَرَجَتْ گابھا چھلکے سے باہر آ گیا۔(اقرب)

بدلًا اَلْبَدَلُ کے معنی ہیں اَلْعِوَضُ۔ بدلہ۔اَلْخَلَفُ۔قائمقام۔(اقرب)

تفسیر ۔ تباہی کے ذکر کے ساتھ آدم کے واقعہ کا ذکر قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر جہاں کسی ایسی تباہی کا ذکر ہو۔جو مامور کی معرفت دنیا پر آئی ہو۔وہاں آدم کے واقعہ کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔اس سے لوگوں کو اس طرف توجہ دلانا مقصود ہوتا ہے کہ اے لوگو تم سے پہلے آدم کا واقعہ گذر چکا ہے۔اس سے فائدہ حاصل کرو۔اور شیطان کو اپنا دوست نہ بناؤ۔

اس آیت کے ذریعہ گویا لوگوں کو ہوشیار کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو اور دوسری قوموں کو ہوشیار رہنا چاہیے کہ پہلے بھی شیطان نے آدم کو گمراہ کرنا چاہا تھا۔اور وہ شیطان کے پیچھے چل پڑے تھے۔مگر اے آدم کی ذریت تم ہوشیار رہنا اور شیطانی آواز کی اطاعت نہ کرنا۔

مَآ اَشۡهَدۡتُّهُمۡ خَلۡقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ لَا خَلۡقَ

میں نے انہیں نہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش (کے موقعہ) پر حاضر کیا تھا۔ اور نہ (خود) ان کی (اپنی) جانوں کی

اَنۡفُسِهِمۡ ۪ وَ مَا كُنۡتُ مُتَّخِذَ الۡمُضِلِّيۡنَ عَضُدًا ﴿۵۲﴾

پیدائش کے موقعہ پر اور نہ ہی میں گمراہ کرنے والوں کو (اپنا) مددگار بنا سکتا تھا۔

حلّ لُغَات۔ عَضُدٌ اَلۡعَضُدُ مَا بَيۡنَ الۡمِرۡفَقِ اِلَى الۡكَتِفِ کہنی سے کندھے تک بازو کے حصہ کو عضد کہتے ہیں۔ وَيُسۡتَعَارُ الۡعَضُدُ لِلۡمُعِيۡنِ۔ استعارۃً مددگار اور معاون کو بھی عضد کہتے ہیں۔ (مفردات)

تفسیر۔ **مَآ اَشۡهَدۡتُّهُمۡ میں هُمۡ کی ضمیر کا مرجع** مَآ اَشۡهَدۡتُّهُمۡ کی ضمیر شیطان اور اس کی ذریت کی طرف جاتی ہے اور اس میں یہ بتایا گیا ہے اے لوگو تم شیطان کو کیا اس لئے دوست بناتے ہو کہ اس سے ترقی حاصل کرلو گے۔ حالانکہ تمہاری پیدائش میں اس کا کوئی دخل نہ تھا۔ اور نہ اس کا کوئی حصہ زمین و آسمان کی پیدائش میں تھا۔ بلکہ انسان کی تمام قوتیں نیکی کی خاطر پیدا کی گئی تھیں۔ اور اللہ تعالیٰ گمراہ کرنے والوں کو اپنا ساتھی اور خدمت گزار نہیں بنا سکتا۔ پس دنیا میں اگر کوئی قوم جو خدا تعالیٰ سے دور ہو ترقی بھی کر جائے تو کبھی یہ نہ خیال کرنا چاہیے۔ کہ اللہ تعالیٰ اب دنیا کا کام اس کے ہاتھ میں دے دے گا۔ اللہ تعالیٰ تو دنیا کی حکومت اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور رکھے گا۔ ایسے لوگوں کی کامیابیاں تو محض عارضی ہوتی ہیں اور خدا تعالیٰ پھر انسان کو نیکی کی طرف لے جاتا ہے۔

اس آیت پر ذرا سا تدبّر کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اس میں ایک عظیم الشان مضمون بیان کیا گیا ہے گزشتہ مضمون بتا رہا ہے۔ کہ شیطان یا اس کی ذریت کو زمین و آسمان کے پیدا کرنے میں کوئی دخل حاصل ہونا تو الگ رہا ان کو اس سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ پس صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ کا اس آیت میں ذکر ہے۔ اس میں بعض آدم کے مخالف یا دین سے بے بہرہ لوگ ایک نئی دنیا کے بسانے کے مدعی ہوں گے اور کہیں گے کہ وہ اپنے زور سے ایک نئی دنیا بسائیں گے۔ اور ایک نیا نظام قائم کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتا ہے اور فرماتا ہے۔ کہ کیا کبھی پہلے ایسا ہوا ہے کہ نئی دنیا اور نیا نظام بنانے میں اللہ تعالیٰ نے شیطان اور اس کی ذریت سے مدد لی ہو۔ اگر پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ تو آئندہ کس طرح ممکن ہے ہمیشہ نئی دنیا اور نیا نظام اللہ تعالیٰ آدم اور فرشتوں کے ذریعہ سے

بنایا کرتا ہے۔ پس اب بھی اسی طرح ہوگا۔ نیا نظام اور نئی دنیا بھی آدم ہی کے ذریعہ سے بنائے جائیں گے۔ اور انسان کی تخلیق یعنی بنی نوع انسان کے اندر جو خرابیاں پیدا ہو جائیں گی۔ ان کی اصلاح کر کے انسان کو از سر نو درست کرنے کا کام بھی دنیاوی تدابیر سے نہ ہو سکے گا بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدیم سنت کے ماتحت ہوگا۔

قرآن کریم کا یہ کتنا بڑا معجزہ ہے۔ تیرہ سو سال پہلے اس نے ان اصطلاحات تک کو بیان کر دیا ہے جو آخری زمانہ میں استعمال ہونے والی تھی۔

New World اور New Order کا ذکر کن خوبصورت الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے کر دیا ہے۔ اور کس طرح اس کا بھی جواب دے دیا ہے۔ کہ آج تک نئی دنیا اور نیا نظام آدم کے مخالفوں کے ہاتھ سے خدا تعالیٰ نے تیار نہیں کروایا۔ بلکہ ہمیشہ آدم اور فرشتوں کے ہاتھ سے کروایا ہے۔ اسی طرح اب ہوگا۔

وَ يَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ

اور (اس دن کو بھی یاد کرو) جس دن وہ (یعنی خدائے برتر مشرکوں کو) کہے گا (کہ اب) تم میرے (ان) شریکوں

فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ

کو بلاؤ جن کے (شریک ہونے کے) متعلق تم دعویٰ کرتے تھے۔ جس پر وہ انہیں بلائیں گے مگر وہ انہیں (کوئی)

مَّوْبِقًا ﴿۵۳﴾

جواب نہیں دیں گے۔ اور ان کے (اور ان کے شریکوں کے) درمیان ہم ایک آڑ (حائل) کر دیں گے۔

حلّ لُغات۔ موبق مَوْبِقًا وَبِقَ يَوْبَقُ۔ کا مصدر یا اسم ظرف ہے۔ وَبَقَ کے معنی ہلاک ہونے کے ہیں۔ مَوْبِقٌ مصدر کے معنی کسی مصیبت میں پھنس کر ہلاک ہونے کے ہیں۔ اور اگر ظرف ہو تو اس کے مندرجہ ذیل معنی ہوں گے اَلْمَهْلِكُ۔ ہلاکت کی جگہ۔ اَلْمَوْعِدُ۔ وعدہ کی جگہ۔ اَلْمَحْبِسُ۔ قید خانہ۔ كُلُّ شَيْءٍ حَالَ بَيْنَ شَيْئَيْنِ ہر ایسی چیز جو دو چیزوں کے درمیان آڑ ہو جائے۔ وَقِيْلَ مُسَافَةٌ تَهْلُكُ فِيْهَا الْاَسْوَاطُ لِبُعْدِهَا۔ بعض نے اس کے معنی دشوار گزار سفر کے کئے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ یعنی اس وقت اپنے معبودان باطلہ کو بلائیں گے کبھی اپنے اولیاء کو پکاریں گے جن کو شفاعت

کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ کبھی حضرت مسیح کو پکاریں گے کبھی ان کی والدہ کو۔ لیکن ان میں سے کوئی ان کی دعا نہ سنے گا۔

موبق کے مختلف معنی وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا۔ موبق کے معنی علاوہ اور معنوں کے پردہ اور روک کے بھی ہوتے ہیں۔ اور ہلاکت کے بھی ہیں۔ پردہ کے لحاظ سے اس کے یہ معنی ہوں گے۔ کہ ان جنگوں میں وہ لوگ ایک دوسرے کا پورا پورا بائیکاٹ کریں گے اور ہلاکت کے معنوں کے لحاظ سے یہ معنی ہوں گے کہ ایک دوسرے کو ہلاک کریں گے اور اگر بَيْنَهُمْ کی ضمیر معبودان باطلہ اور پرستش کرنے والوں کی طرف پھیری جائے۔ تو اس میں پہلے مضمون کی تاکید سمجھی جائے گی۔ یعنی ایسے پردے درمیان میں آجائیں گے کہ ان کی کوئی آواز نہ سنی جائے گی۔ یا یہ کہ ان معبودان کی ارواح ہی ان کے خلاف دعاؤں میں لگ جائیں گی۔

وَ رَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَ لَمْ

اور مجرم اس آگ کو دیکھیں گے اور سمجھ جائیں گے کہ وہ اس میں پڑنے والے ہیں۔ اور وہ اس سے (پیچھے) ہٹنے کی

يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿۵۴﴾ ع ۷/۱۹

کوئی جگہ نہیں پائیں گے۔

حلّ لُغات۔ مُوَاقِعُوْهَا وَاقَعَ سے اسم فاعل مُوَاقِعٌ آتا ہے۔ اور مُوَاقِعُوْنَ اس کی جمع ہے۔ وَقَعَ (وُقُوْعًا) کے معنی ہیں سَقَطَ گر گیا۔ وَقَعَ فِي الشَّرَكِ جال میں پھنس گیا (اقرب) پس مُوَاقِعُوْهَا کے معنی ہوں گے اس میں پڑنے والے ہیں۔

مَصْرِفًا: مَصْرِفًا یہ صَرَفَ سے اسم ظرف ہے صَرَفَهٗ کے معنی ہیں رَدَّهٗ عَنْ وَجْهِهٖ اس کو اس کے قصد سے پھیر دیا۔ (اقرب) پس مَصْرِفٌ کے معنی ہوں گے پھرنے کی جگہ۔

تفسیر۔ **نار کے معنی جنگ کے** یعنی اس وقت انہیں ہلاکت نظر آئے گی نار کے معنی جنگ کے بھی ہوتے ہیں چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ (المائدۃ:۶۵) یعنی جب بھی یہود جنگ کی آگ بھڑکائیں گے اللہ تعالیٰ اسے بجھا دے گا۔ ان معنوں کے رو سے یہ مطلب ہوگا کہ جنگ کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اور انہیں یقین ہو جائے گا۔ کہ اب اس جنگ سے چھٹکارا نہیں۔ اور بہتیری تدبیریں اس جنگ کو روکنے

کی کریں گے۔ لیکن کوئی صورت بھی اس جنگ سے محفوظ رہنے کی نہ پیدا ہو سکے گی۔

ظَنُّوْا بمعنی یقین اس آیت میں ظَنُّوْا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی یقین کے ہیں خیال یا شک کے نہیں۔ ظنّ کا لفظ عربی میں اضداد میں سے ہے۔ یعنی اس کے معنی گمان کے بھی ہوتے ہیں اور یقین کے بھی ہیں۔

وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَ

اور ہم نے اس قرآن میں یقیناً ہر ایک (ضروری) بات کو مختلف پیرائیوں میں بیان کیا ہے اور (ایسا کیوں نہ کرتے

كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ۵۵

کہ) انسان سب سے بڑھ کر بحث کرنے والا ہے۔

حلّ لغات۔ الجدل اَلْجَدَلُ شِدَّةُ الْخُصُوْمَةِ سختی سے جھگڑنا۔ (اقرب)

تفسیر۔ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا کے دو معنی ہیں (۱) اَكْثَرَ شَيْءٍ يَتَأَتّٰى مِنْهُ الْجَدَلُ یعنی سمجھانے کی جو تدبیر بھی کی جائے اس کے نتیجہ میں اس کی طرف سے جھگڑے کا پہلو ہی پیدا کر لیا جاتا ہے۔ اطمینان حاصل کرنے کی وہ کوشش نہیں کرتا۔ (۲) جَدَلُ الْاِنْسَانِ اَكْثَرُ مِنْ كُلِّ مُجَادِلٍ (روح المعانی زیر آیت ھذا)۔ یعنی انسان سب مخلوق کی نسبت زیادہ جھگڑا کرتا ہے مطلب یہ کہ اسے تو ہم نے عقل اس لئے دی تھی۔ کہ روحانی ترقیات کرے۔ اور خدا تعالیٰ کا عرفان حاصل کرے۔ مگر وہ اس قوت کو جو اسے دوسرے حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ ایک بڑے امتیاز کا ذریعہ بنا لیتا ہے اور بجائے اس کے کہ اس کے ذریعہ سے دوسرے حیوانوں سے افضل بنے۔ وہ ان سے بھی ادنیٰ حالت میں چلا جاتا ہے۔

اس آیت میں الناس تمام انسانوں کے متعلق ہے۔ اور الانسان ان انسانوں کے متعلق جن کا اوپر ذکر آ چکا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے قرآن کریم میں تمام مسائل کو اچھی طرح سے اور مختلف پیراؤں میں بیان کیا ہے کہ بنی نوع انسان اس سے فائدہ اٹھائیں۔ مگر وہ قسم انسانوں کی جن کا ذکر اوپر گذرا ہے۔ اسے جھگڑنے کا ذریعہ بنا لیتی ہے۔ اور ان ہی تفصیلات کو جو ان کے فائدہ کے لئے ہیں۔ اعتراض کا موجب سمجھ لیتی ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ مسیحی لوگ شریعت کی تفصیلات کو لعنت قرار دے کر ان سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ حالانکہ وہ تفصیلات انسان کو ہلاکت سے بچانے کے لئے بیان کی گئی ہیں۔

وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَ

اور ان لوگوں کو جب ان کے پاس ہدایت آئی تو (اس پر) ایمان لانے اور اپنے رب سے

یَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِیَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ اَوْ

بخشش چاہنے سے صرف اس بات نے روکا کہ پہلے لوگوں کی سی حالت ان پر (بھی) آئے۔

یَاْتِیَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۶﴾

یا پھر عذاب ان کے سامنے آ کھڑا ہو۔

حلّ لُغات۔ السُّنَّةُ اَلسُّنَّةُ کے لئے دیکھو حجر آیت نمبر ۱۴۔

اَلسُّنَّةُ۔ اَلسِّیْرَةُ سنت کے معنی ہیں دستور۔ اَلطَّرِیْقَةُ۔ طریقہ۔ اَلطَّبِیْعَةُ۔ طبیعت عادت۔ (اقرب)

قُبُلًا اَلْقُبُلُ: نَقِیْضُ الدُّبُرِ۔ سامنے کا حصہ۔ (اقرب)

تفسیر۔ یعنی قرآن کریم میں ہدایت کا ایسا سامان موجود ہے کہ اس کے بعد ہدایت میں کوئی روک نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اور چاہیے تھا کہ اس کے مضامین کو سن کر یہ لوگ اپنے غلط عقائد سے تائب ہوتے لیکن یہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ گویا یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ ہم تو ضرور عذاب ہی لیں گے۔ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ اس سے مراد آخری ہلاکت ہے اور اَوْ یَاْتِیَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا سے مراد درمیانی عذاب ہیں یعنی دونوں قسم کے عذابوں کو یہ بلا رہا ہے۔

وَ مَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ ۚ وَ

اور ہم رسولوں کو صرف بشارت دینے والا اور (عذاب کی آمد سے) آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجتے ہیں۔ اور جن لوگوں

یُجَادِلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِیُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَ

نے انکار کیا ہے۔ وہ جھوٹ کے ذریعہ سے اس لئے جھگڑتے ہیں۔ کہ اس کے ذریعہ سے حق کو مٹا دیں۔ اور انہوں

اتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۷﴾

نے میرے نشانوں کو اور (میرے) انذار کو ہنسی کا نشانہ بنالیا ہے۔

حلّ لُغات۔ اَلْبَاطِلُ اَلْبَاطِلُ کے لئے دیکھو نحل آیت نمبر ۷۳۔

لِيُدْحِضُوْا بِهِ لِيُدْحِضُوا بِهِ أَدْحَضَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اَدْحَضَ الْقَدَمَ کے معنی ہیں اَزْلَقَهَا پاؤں کو پھسلا دیا۔ اَدْحَضَ الْحُجَّةَ: اَبْطَلَهَا وَاَزَالَهَا وَدَفَعَهَا دلیل کو پوری طرح رد کیا دور کیا مٹایا۔ (اقرب) پس لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ کے معنی ہوں گے۔ کہ وہ حق کو مٹا دیں۔ دور کردیں۔

تفسیر۔ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ کے معنی یہ ہوئے کہ کافر لوگ باطل کو لے کر جھگڑا اور بحث کرتے ہیں۔ تا کہ اس کے ساتھ حق کو دنیا سے نکال دیں، باطل کر دیں۔

وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا۔ یعنی ہم نشانات تو دکھاتے ہیں لیکن یہ ہنسی کرتے ہیں۔ اس وقت یورپ والوں کی یہی حالت ہے۔ نشانات کی طرف ان کی بالکل توجہ نہیں۔ بلکہ ان امور کو بیوقوفوں کے توہمات سمجھتے ہیں۔ اور عقلی ڈھکونسلوں کی طرف تو جاتے ہیں۔ مگر خدائی نشانوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَ

اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون (ہوسکتا) ہے۔ جسے اس کے رب کے نشانوں کے ذریعہ سے سمجھایا گیا۔ (لیکن)

نَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ

پھر (بھی) وہ ان سے روگردان ہوگیا۔ اور جو کچھ اس کے ہاتھوں نے (کما کر) آگے بھیجا تھا۔ اسے اس نے بھلا دیا

يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى

ان (لوگوں) کے دلوں پر ہم نے یقیناً کئی پردے ڈال دیئے ہیں کہ وہ اسے سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی

فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۸﴾

(پیدا کر دی ہے) اور اگر تو انہیں ہدایت کی طرف بلائے تو (وہ تجھ سے اس قدر حسد رکھتے ہیں کہ) اس صورت میں وہ ہدایت کو (بھی) کبھی قبول نہیں کریں گے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے اس سے زیادہ ظالم اور کون ہوسکتا ہے جسے اس کے رب کی باتیں سنائی جائیں تو وہ ان کو حقیر سمجھے اور ان سے اعراض کرے اور اس بات کو نہ سوچے کہ میں نے خود اپنی عقل سے جو کام کئے ہیں۔ وہ کس طرح فساد فتنہ اور جنگ کے موجبات بن رہے ہیں۔ پس باوجود اس تجربہ کے کہ وہ اپنی عقل سے امن پیدا نہیں کرسکا۔ پھر بھی خدائی امداد اور ہدایت کی طرف اس کا توجہ نہ کرنا گویا اپنے تجربہ کو ٹھکرا دینے کے مترادف ہے پھر وہ قوم جو تجربوں پر اپنے کاموں کی بنیاد رکھنے کی مدعی ہے وہ کس قدر مجرم اور غافل ہوتی ہے کہ جزئی تجربوں کو تو اس قدر قیمت دیتی ہے۔ مگر ساری قوم کے تجربہ اور اس کے نتیجہ سے فائدہ نہیں اٹھاتی۔

فرماتا ہے اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکل سکتا تھا۔ کہ جب انہوں نے سمجھ سے کام لینے سے انکار کر دیا ہے تو ہم بھی ان کو سمجھ سے محروم کر دیں۔ اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں کہ خواہ کوئی کتنی ہی انہیں نصیحت کرے یہ فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

وَ رَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا

اور تیرا رب بہت ہی بخشنے والا (اور بہت ہی) رحمت کرنے والا ہے۔ اگر وہ اس کی وجہ سے جو انہوں نے (اپنی جانوں

كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ

کے لئے) کمایا ہے۔ انہیں ہلاک کرنا چاہتا تو وہ ان پر فوراً عذاب نازل کر دیتا۔ (مگر وہ ایسا نہیں کرتا) بلکہ ان کے

لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ﴿۵۹﴾

لئے ایک میعاد (مقرر) ہے جس سے ورے (یعنی پیشتر اس کے کہ عذاب کو بھگتیں) ہرگز کوئی جائے پناہ نہ پائیں گے

تفسیر۔ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ۔ اگر ان کو خدا تعالیٰ ان کے اعمال کی وجہ سے

سزا دینے لگتا تو کبھی کا ہلاک کر دیتا۔ مگر خدا تعالیٰ ہوشیار کئے بغیر کسی قوم کو ہلاک نہیں کرتا۔ اس لئے وہ پہلے ان کو ہوشیار کرے گا۔ اور زمانہ کے مامور کے ذریعہ سے حجت پوری کر کے پھر پکڑے گا۔ بَلۡ لَّهُمۡ مَّوۡعِدٌ لَّنۡ يَّجِدُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖ مَوۡئِلًا۔ ان کے لئے وعدہ مقرر ہے۔ وہ ہرگز اس سے ہٹ کر کوئی پناہ کی جگہ نہ پائیں گے یعنی خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر اور کوئی بھی نجات کی جگہ ان کو نہ مل سکے گی۔

وَتِلۡكَ الۡقُرٰٓى اَهۡلَكۡنٰهُمۡ لَمَّا ظَلَمُوۡا وَجَعَلۡنَا لِمَهۡلِكِهِمۡ

اور وہ (گزشتہ نبیوں کے مخالفوں کی) بستیاں جو ہیں تو (ان کا واقعہ یوں ہے کہ) ہم نے اس وقت انہیں ہلاک کیا جب

مَّوۡعِدًا ؏ ۝۶۰

انہوں نے ظلم کیا۔ اور ان کی ہلاکت کے لئے (بھی) ہم نے ایک معیاد مقرر کر دی تھی۔ (تا وہ چاہیں تو توبہ کر لیں)

تفسیر۔ یعنی ہزاروں قومیں گذر چکی ہیں جب انہوں نے ظلم کیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے انذار کی قدر نہ کی تو ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ اور ان کی ہلاکت کی پہلے سے خبر دے دی جس کے مطابق وہ ہلاک ہو گئے۔ پس اس قوم کو بھی سوچنا چاہیے کہ ان کو خواہ کس قدر ترقیات ہی کیوں نہ ملی ہوں۔ پھر بھی وہ انسان ہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ جب پہلے انسان خدا تعالیٰ سے منہ پھیر کر ہلاک ہوئے تو یہ ہلاک نہ ہوں۔ آجکل قریباً ۹۹ فیصدی لوگوں کا خیال ہے کہ اب یورپ تباہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بیوقوفی کی بات ہے پہلی بادشاہتوں کے زمانوں میں کون کہتا تھا کہ وہ تباہ ہوں گی۔ مسلمانوں کے متعلق کون کہتا تھا کہ ان کی حکومت تباہ ہو گی۔ اسی طرح رومیوں کی حکومت اور ایرانیوں کی حکومت کے متعلق بھی کوئی اس وقت گمان نہ کرتا تھا۔ لیکن ساری تباہ ہو گئیں۔ اسی طرح ان کی بادشاہت کے تباہ ہونے کے متعلق بھی حیرانی اور تعجب خلاف عقل ہے۔

وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰى لِفَتٰٮهُ لَاۤ اَبۡرَحُ

اور (تم اس وقت کو بھی یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنے نوجوان (رفیق) سے کہا تھا (کہ) میں (جس راستے پر جا رہا

حَتّٰۤى اَبۡلُغَ مَجۡمَعَ الۡبَحۡرَيۡنِ اَوۡ

ہوں اس پر قائم رہنے سے) نہیں ٹلوں گا یہاں تک کہ ان دونوں سمندروں کے اکٹھے ہونے کے مقام پر پہنچ جاؤں

اَمۡضِیَ حُقُبًا ﴿۶۱﴾

یا صدیوں تک (آگے ہی آگے) چلتا چلا جاؤں۔

حلّ لُغَات۔ اَلۡفَتٰی اَلۡفَتٰی کے معنے نوجوان کے ہیں۔ اس کی جمع فِتۡیَانٌ آتی ہے۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو یوسف آیت نمبر ۶۳۔

فِتۡیَانٌ جَمۡعُ فَتٰی کی ہے اس کے معنے جوان کے ہیں لیکن جب کسی کی طرف مضاف ہو تو اس کے معنے بیٹے یا نوکر کے ہوتے ہیں جیسے فَتٰی زَیۡدٍ زید کا بیٹا یا نوکر۔

لَاۤ اَبۡرَحُ لَاۤ اَبۡرَحُ کے لئے دیکھو یوسف آیت نمبر ۸۱۔

مَابَرِحَ فُلَانٌ کَرِیۡمًا اَیۡ بَقِیَ عَلٰی کَرَمِهٖ۔ اَبۡرَحُ بَرِحَ سے مضارع متکلم کا صیغہ ہے اور مَا بَرِحَ فُلَانٌ کَرِیۡمًا کے معنے ہیں اپنی سخاوت پر قائم رہا۔ (اقرب) بَرِحَ وَزَالَ اِقۡتَضَیَا مَعۡنَی النَّفۡیِ وَلَا لِلنَّفۡیِ وَالنَّفۡیَانِ یَحۡصُلُ مِنۡ اِجۡتِمَاعِهِمَا اِثۡبَاتٌ۔ بَرِحَ اور زَالَ کے اندر نفی کے معنے پائے جاتے ہیں کیونکہ کسی جگہ سے چلے جانے کے مفہوم میں نہ موجود رہنا بھی داخل ہے جو نفی پر مشتمل ہے۔ پس جب ان پر مَا یا لَا وغیرہ کوئی کلمہ داخل ہوگا تو نفی پر نفی داخل ہونے کی وجہ سے ان میں اثبات کے معنے یعنی کسی جگہ پر موجود رہنے کے معنے پیدا ہو جاتے ہیں۔ (مفردات)

اَمۡضِیَ اَمۡضِیۡ مَضَی سے مضارع متکلم کا صیغہ ہے اور مَضَی الشَّیۡءُ (یَمۡضِیۡ وَیَمۡضُوۡ) کے معنے ہیں ذَھَبَ وَخَلَا۔ کوئی چیز گزر گئی اور چلی گئی۔ (اقرب) پس اَمۡضِیَ کے معنے ہوں گے کہ میں چلتا چلا جاؤں۔

حُقُبًا حُقُبٌ حُقُبٌ کی جمع ہے۔ اور اس کے معنے ہیں ثَمَانُوۡنَ سَنَةً۔ اسّی سال کا عرصہ۔ وَیُقَالُ اَکۡثَرُ مِنۡ ذَالِكَ اور بعض کہتے ہیں اس سے بھی زائد عرصہ کو حُقُبٌ کہتے ہیں۔ اَلدَّهۡرُ۔ زمانہ۔ اَلسَّنَةُ وَقِیۡلَ السُّنُوۡنَ مطلق ایک سال کے عرصہ کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کرتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ کئی سال کا عرصہ حقب کہلاتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ پہلے تو تمثیلوں سے اس امر کو بتایا کہ عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ گو کمزور اور طاقتور کا مقابلہ ہے لیکن غور کیا جائے تو طاقتور وہ ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرتا ہے، وہ نہیں جو دنیا کے کاموں میں مشغول ہے۔ اور اشارۃً یہ بھی بتایا کہ مسیحیت کی ترقی اس رنگ میں مقدر تھی کہ پہلے ایک دفعہ یہ قوم ترقی کرے۔ پھر رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہو۔ اور کچھ عرصہ اسلام ترقی کرے۔ پھر دوبارہ انہیں ترقی ملے۔ اب اس مضمون کو آسمانی کتب کے حوالہ سے ثابت فرماتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ جیسا کہ میں پہلے بتا آیا ہوں اسلام کے دشمنوں کا یہ اعتراض ہے کہ اس سورۃ میں بغیر تعلق کے واقعات جمع کر دیئے گئے ہیں اور خود مسلمانوں کے لئے بھی ان واقعات کا اجتماع حیرانی پیدا کرنے کا موجب بنا رہا ہے۔ اور انہوں نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دی ہے کہ یہود نے کچھ سوالات کئے تھے ان کا جواب اللہ تعالیٰ نے اکٹھا کر کے دے دیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ظاہر ہے یہ بات نہیں۔ کیونکہ اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق اگر کوئی سوال تھا بھی تو ان دونوں واقعات کے درمیان میں اوپر کی تمثیلات اور پھر حضرت موسیٰ کے اس واقعہ کو جو اس رکوع میں بیان ہوا ہے کیوں رکھ دیا گیا ہے۔ کم سے کم ان دونوں سوالوں کے جواب اکٹھے رکھے جاتے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ سب مضامین ترتیب سے بیان ہوئے ہیں۔ اور ہر واقعہ اور تمثیل کو خاص ضرورت سے اپنے اپنے مقام پر رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اصحاب کہف کے ذکر کے بعد ان تمثیلات کے رکھنے کی حکمت تو میں بتا آیا ہوں۔ اب میں حضرت موسیٰ کے اس واقعہ کو اس جگہ رکھنے کی وجہ بتاتا ہوں۔

میں ذکر کر چکا ہوں کہ عیسائیوں کی قومی زندگی میں ایک عجیب بات پائی جاتی ہے جس کی کوئی اور مثال کم سے کم مجھے معلوم نہیں۔ اور وہ یہ کہ انہیں حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد ایک ترقی کا دور ملا۔ درمیان میں ایک اور نبی پیدا ہوا اور اس کی قوم کو ترقی کا ایک دور ملا۔ اس کے بعد پھر مسیحی قوم کی ترقی شروع ہوگئی۔ اس واقعہ کی طرف پہلے تمثیل میں نہر کے لفظ سے اشارہ کیا گیا تھا۔ اب حضرت موسیٰ کے واقعہ کو اس جگہ رکھ کر اس مضمون کو واضح کیا گیا ہے اور وہ اس طرح کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مثیل موسیٰؑ تھے۔ جیسا کہ استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ میں پیشگوئی کی گئی تھی۔ کہ ''میں ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا۔ اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا''۔

آنحضرتؐ کی مشابہت حضرت موسیٰؑ سے قرآن کریم میں بھی اس پیشگوئی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (المزمل:۱۶) سو حضرت موسیٰ کے واقعہ کو مسیحیوں کی ترقی کے دونوں دوروں کے درمیان میں بیان کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مثیل موسیٰ ان دونوں دوروں کے درمیان میں پیدا ہونا ضروری تھا۔ تا اس شبہ کا ازالہ کیا جائے کہ اگر مسیحی ترقی کے پہلے دور کے بعد ایک سچا نبی آیا تھا تو کیوں مسیحی ترقی کا دور ختم نہیں ہوگیا۔ پس اس دور کا پھر پہلے سے بھی زیادہ زور سے شروع

ہو جانا بتاتا ہے کہ درمیانی نبی سچا نہ تھا۔ ورنہ وہ ان کی ترقیات کو روک دیتا۔

یہ بات ذوقی نہیں بلکہ حضرت موسیٰ کا جو واقعہ آگے بیان ہوا ہے۔اس کا مضمون بھی اسی کی تصدیق کرتا ہے۔ جس کی تشریح اگلی آیات میں کی جائے گی۔سردست میں نے اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ چونکہ مسیحی ترقی کے پہلے دور اور دوسرے دور کے درمیان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور مقدر تھا۔اس لئے مسیحی ترقی کے دونوں دوروں میں فاصلہ رکھا گیا ہے۔اور درمیان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کر دیا گیا ہے۔جن کے مثیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔تا جس طرح واقعات نے ظاہر ہونا تھا اسی طرح ان کا ذکر کیا جائے۔

یہ واقعہ جو اس رکوع میں بیان ہوا ہے۔اس کے بارہ میں مفسرین میں اختلاف ہے مفسرین اکثر اس طرف گئے ہیں اور بعض احادیث میں بھی اس کا ذکر آتا ہے کہ خضر نامی ایک شخص سے ملاقات کے لئے حضرت موسیٰؑ تشریف لے گئے تھے۔ان آیات میں اس سفر کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔

یہ سفر انہوں نے کیوں کیا تھا اس کے متعلق بھی اختلاف ہے۔بعض نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ نے خدا تعالیٰ سے پوچھا کہ کیا مجھ سے زیادہ علم والا بھی کوئی شخص ہے۔تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہاں ایک شخص ہے۔اور پھر اس شخص کا پتہ بتایا۔جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس شخص کو ملنے کے لئے گئے۔

ایک روایت میں یہ آتا ہے کہ بعض لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا کہ کیا آپ سے بڑھ کر بھی کوئی اور عالم ہے۔تو انہوں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی اور اس شخص کا پتہ دیا، جو ان سے بڑھ کر عالم تھا۔اور اس پر وہ اس سے ملنے کے لئے گئے (بخاری کتاب التفسیر سورۃ الکھف، کشاف، قرطبی ابن جریر زیر آیت ھذا)۔

ان پیشگوئیوں کی تفصیل جو سورہ کہف کے واقعات میں مضمر ہیں درحقیقت اس واقعہ کے سمجھنے میں لوگوں کو غلطی لگی ہے۔بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا واقعہ سورۂ بنی اسرائیل میں بیان کیا گیا تھا اور اس اسراء کے نتائج بیان کئے گئے تھے کہ آئندہ کیا کیا واقعات ظاہر ہوں گے اور مسلمانوں کو کس طرح ترقیات ملیں گی۔پھر اسراء کی بیان کردہ کامیابیوں میں مسلمانوں کے لئے جو خطرات پیش آنے والے تھے ان کا ذکر کیا تھا۔ یعنی یہود اور نصاریٰ کی مخالفتوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ان عظیم الشان خطرات میں سے ایک بڑا خطرہ یہ تھا کہ حضرت موسیٰ کی امت کا ایک گروہ جو عیسائی کہلاتے ہیں (اگرچہ وہ اپنے آپ کو حضرت موسیٰ کی امت نہ کہیں مگر خدا کے نزدیک وہ حضرت موسیٰ ہی کی امت میں شامل ہیں) مسلمانوں کو آخری زمانہ میں سخت صدمہ پہنچانے والا تھا۔اس لئے اللہ تعالیٰ

نے اس کی تشریح کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسراء کے علاوہ خود حضرت موسیٰ کے اسراء کو بھی اس جگہ بیان فرمایا ہے۔جس سے اس امر کی تصدیق مطلوب ہے کہ آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غالب آئیں گے اور آپ ؐ کی امت کو غلبہ دیا جائے گا۔اور موسوی امت کا بقیہ حصہ (عیسائی لوگ) غالب نہ ہو سکے گا۔یہ واقعہ حضرت موسیٰ ؑ کا ایک کشف ہے میرے نزدیک ظاہر جسم کے ساتھ ایسا کوئی واقعہ انہیں پیش نہیں آیا۔استاذی المکرم حضرت مولوی نورالدین صاحب ؓ کی یہی رائے تھی (حقائق الفرقان سورۃ الکہف زیر آیت واما الغلام۔۔۔)۔اور میں اس بارے میں غور کرکے اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان کی یہ رائے درست تھی۔اور میرے نزدیک بھی یہ کشف ہی ہے جس کے ثبوت مَیں ذیل میں بیان کرتا ہوں۔

حضرت موسیٰ کے سفر کے کشف ہونے کے ثبوت (١) پہلا ثبوت اس کا یہ ہے کہ اس قسم کے کسی سفر کے واقعہ کا ذکر بائیبل میں موجود نہیں۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ظاہری طور پر ظہور میں نہیں آیا۔یہ تو ہوسکتا ہے کہ اس کے طرز بیان میں کچھ اختلاف ہو جائے مگر سرے سے ہی اس واقعہ کا نہ پایا جانا ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔

بنی اسرائیل کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو بھی معراج ہوا تھا (جیوش انسائیکلوپیڈیا زیر لفظ Ascesion) (چنانچہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ عزیزم مولوی جلال الدین شمس صاحب نے یہودی روایات لندن میوزیم کی کتب دیکھ کر نکالی ہیں جن میں اس واقعہ کا ذکر ہے۔اور یہودی کتب میں اس سفر کو جسمانی سفر قرار دیا ہے۔ مگر ان کا یہ لکھنا ہم پر حجت نہیں۔مسلمانوں سے بعض نے بھی تو اسراء کو بلکہ معراج کو جسمانی قرار دے دیا ہے)

(٢) بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہونے سے پہلے حضرت موسیٰ کا ایک ہی سفر ثابت ہے جو مدین کی طرف ہوا۔قرآن کریم میں بھی متعدد بار اس کا ذکر آیا ہے۔اور قرآن اور بائیبل دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ اس سفر میں وہ اکیلے تھے۔لیکن زیر بحث واقعہ میں ان کے ساتھ ایک ساتھی کا بھی ذکر ہے۔جو ان کے ماتحت معلوم ہوتا ہے کیونکہ فَتٰی کے لفظ کو جب مضاف بنا کر استعمال کیا جائے۔اس کے معنی بیٹے کے یا ماتحت کے ہوتے ہیں۔پس سفر مدین پر یہ الفاظ چسپاں نہیں ہوسکتے۔اور اس کے سوا اور کوئی سفر ان کا بائیبل سے ثابت نہیں۔لہٰذا اسے کشف ہی ماننا پڑے گا۔

(٣) بعثت کے بعد بھی حضرت موسیٰ کا کوئی ایسا سفر ثابت نہیں جو انہوں نے اپنی قوم سے علیحدہ ہو کر کیا ہو۔ بائیبل میں شروع سے لے کر آخیر تک ان کے واقعات ترتیب کے ساتھ موجود ہیں۔لیکن اس سفر کا کہیں ذکر نہیں

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر کوئی مادی واقعہ نہ تھا۔

(۴) حضرت موسیٰ بنی اسرائیل سے چالیس دن کے لئے چند میل دور پہاڑ پر خدا کا کلام سننے کے لئے گئے تو اتنے ہی دنوں میں بنی اسرائیل نے بچھڑے کو معبود بنالیا۔ جب چالیس دن کی غیر حاضری نے یہ تباہی مچادی تھی تو اتنے لمبے سفر کی صورت میں کیا نتیجہ ہوا ہوگا۔ مگر اس موقعہ پر بنی اسرائیل کے اندر کوئی فساد نہیں ہوا۔ کیونکہ بائیبل میں اس فساد کے علاوہ اور کسی فساد کا ذکر نہیں۔ نیز اس فساد کے بعد یہ دانشمندی کے خلاف ہوتا کہ آپ اتنا لمبا سفر کرتے۔

(۵) چالیس دن کے سفر پر جاتے ہوئے حضرت موسیٰؑ اپنے بعد حضرت ہارون کو خلیفہ مقرر کر کے جاتے ہیں مگر اس ایک دفعہ کے واقعہ کے بعد کہیں بھی ثابت نہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارون یا کسی اور کو اپنا خلیفہ مقرر کیا ہو۔ اگر سفر کا ذکر نہیں تھا تو کم از کم اس نیابت کا ذکر تو ضرور تورات میں ہونا چاہیے تھا۔ مگر چونکہ ایسا کوئی ذکر بائیبل میں نہیں ہے۔ تو یہی ماننا پڑتا ہے کہ ایسا کوئی جسمانی سفر واقعہ نہیں ہوا۔ کیونکہ یہ تو ہرگز تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت موسیٰؑ سفر پر گئے ہوں اور اپنا جانشین مقرر نہ کر گئے ہوں۔

(۶) یہ امر انبیاء کی سنت کے خلاف معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کے بعد وہ اپنی قوم سے ایک لمبے عرصہ کے لئے الگ ہوئے ہوں۔ جن انبیاء کا تاریخ سے ہمیں پتہ چلتا ہے ان میں سے ایک کی سوانح میں بھی اس امر کا پتہ نہیں چلتا۔ بے شک ہمارے عقیدہ کی رو سے حضرت مسیح اپنی قوم سے الگ ہوئے۔ مگر وہ درحقیقت ایک حصۂ قوم سے جدا ہو کر دوسرے حصہ کی طرف گئے تھے۔ اور اس کی مثالیں بکثرت انبیاء میں پائی جاتی ہیں۔ کہ انہوں نے اپنی قوم کے اندر تبلیغی سفر کئے ہیں۔ مگر حضرت موسیٰ کا یہ سفر تبلیغی نہیں۔ نہ اپنی قوم کے علاقہ میں ہے۔ بلکہ وہ صرف یہ معلوم کرنے کے لئے اپنی امت کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں کہ ایک شخص مجھ سے بھی زیادہ عالم ہے۔

(۷) حضرت ابن عباسؓ نے اسی واقعہ کے اندر جو کنز کا ذکر ہے اس کی تعبیر میں فرمایا ہے۔ مَا كَانَ الْكَنْزُ اِلَّا عِلْمًا (ابن کثیر سورۃ الکھف قولہ تعالیٰ ذالک تأویل ما لم تستطع علیہ صبرا) یعنی اس واقعہ میں جو کنز کا ذکر ہے اس سے علم کے سوا اور کچھ مراد نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تعبیر ہے اور تعبیر کشف ہی کی ہوسکتی ہے۔ اگر وہ کنز علم تھا تو یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ دیوار جو حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھی نے بنائی وہ بھی مادی دیوار نہ تھی۔ اور کھانا طلب کرنے کا واقعہ بھی مادی نہ تھا۔ اور جب یہ حصہ کشف تھا تو ظاہر ہے کہ سارا واقعہ ہی کشف تھا۔

اس واقعہ کے کشف ہونے کا ثبوت اندرونی شہادتوں سے (۸) واقعہ کی اندرونی شہادت بھی یہی

ثابت کرتی ہے کہ یہ کوئی جسمانی واقعہ نہیں ۔مثلاً خرق سفینہ کے واقعہ کو لے لو۔اس میں جولکھا ہے کہ انہوں نے کشتی میں بڑا سوراخ کر دیا۔تا کہ بادشاہ اس کو چھین نہ لے ۔اس پر سوال یہ ہے کہ کیا اس شگاف سے وہ کشتی بے کار ہوگئی تھی ؟ اگر کہا جائے کہ نہیں ۔تو اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر بادشاہ نے اس کو کیوں نہ چھینا جبکہ وہ ابھی کار آمد تھی ۔ اور اگر کہو کہ بالکل نکمی ہوگئی تھی ۔تو پھر سوال ہوتا ہے کہ اس سوراخ کی وجہ سے وہ دریا میں غرق کیوں نہ ہوگئی ۔

ظاہری طور پر کوئی ایسی کشتی جس کا تختہ نکال کر اس کو بالکل بیکار کر دیا گیا ہو غرق ہونے سے بچ نہیں سکتی تھی ۔ہاں کشف میں یہ نظارہ دیکھنا خلاف عقل نہیں ہوتا کہ کوئی تختہ بھی نکال دیا جائے اور کشتی غرق بھی نہ ہو ۔

پھر قتل نفس کا واقعہ ہے ۔یہ بھی ظاہری واقعہ نہیں مانا جا سکتا ۔کیونکہ حضرت موسیٰ کو سبق سکھانے والا یا کوئی نبی ہوگا یا کوئی بڑا بزرگ ۔لیکن قتل نفس بغیر نفس تو کوئی ادنیٰ مومن بھی نہیں کر سکتا۔کجا یہ کہ ایک عظیم الشان نبی ایسے فعل کا ارتکاب کرے ۔

اس کے جواب میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس نوجوان نے چونکہ آئندہ قتل کرنے تھے ۔اس لئے اس کو قتل کر دیا ۔مگر ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی ظلم ہے اور خلاف شریعت ۔اگر ارتکاب جرم سے پہلے محض علم کی بناء پر سزا دینا جائز ہے تو پھر خدا تعالیٰ کو سب لوگوں کے گناہوں کا قبل از وقت علم ہے وہ کیوں سب کو سزا نہیں دیتا ۔

شریعت کا اصولی قانون یہی ہے کہ جب تک کوئی کسی گناہ کا مرتکب نہ ہو جائے ،اس کو سزا نہیں دی جا سکتی ۔اس اصل پر شرائع کا اختلاف اثر انداز نہیں ہو سکتا۔یعنی بعض کہتے ہیں کہ وہ عملاً قتل کیا کرتا تھا ۔مگر اس کا پتہ نہ لگتا تھا (تفسیر مظہری سورۃ الکہف زیر آیت حتی اذا لقیا ۔۔) ۔یہ جواب بھی نہایت بودا ہے ۔اگر یہ بات صحیح ہے ۔تو قرآن مجید کو چاہیے تھا کہ یہ وجہ بتاتا ۔تا کہ لوگوں کی تسلی ہو جاتی ۔اور انہیں معلوم ہو جاتا کہ بلا وجہ اس نوجوان کو قتل نہیں کیا گیا ۔

آخری واقعہ دیوار کا ہے ۔اس کو بھی ظاہری حالت میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا ۔بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اپنے ساتھی کے دیوار بنا دینے پر حضرت موسیٰ ؑ جیسا وسیع الحوصلہ اور عظیم الشان نبی اس لئے اعتراض کرے کہ شہر کے لوگوں نے ہمیں کھانا نہیں کھلایا ۔شہر والوں کے کھانا نہ کھلانے کا الزام ان پر تھا نہ کہ ان دو بیکس یتیموں پر جن کی وہ دیوار تھی ۔اور یوں بھی یہ بات حضرت موسیٰ ؑ کی شرافت نفس سے بہت بعید ہے کہ وہ دو یتیموں کی دیوار پر اجر نہ لینے پر اعتراض کریں ۔

غرض واقعہ کی اندرونی شہادت بھی ثابت کرتی ہے کہ یہ ایک کشف ہے نہ کوئی ظاہری واقعہ ۔

(۱۰) یہ سارا واقعہ بحیثیت مجموعی بھی ثابت کرتا ہے کہ یہ ایک کشف تھا ۔کیونکہ جو تین باتیں اس سفر میں بتائی

گئی ہیں۔ اگر وہ ظاہری لی جائیں تو وہ ایسی نہیں ہیں کہ ان کے لئے کوئی معمولی مومن بھی سفر کرے کجا یہ کہ حضرت موسیٰؑ کو ان باتوں کے سیکھنے کے لئے بھیجا جائے۔ کیا حضرت موسیٰؑ یہ سیکھنے گئے تھے۔ کہ کشتی کا تختہ کیسے توڑا جاتا ہے یا قتل کیونکر کیا جاتا ہے یا دیوار کے بنانے کی کیا ترکیب ہے یا اس پر اجر لینا چاہیے یا نہیں۔ ان باتوں کے سیکھنے کے لئے تو ایک جاہل گنوار بھی سفر نہیں کرے گا۔ غرض ان باتوں میں سے کوئی بھی تو ایسی بات نہیں کہ جس کو ظاہر صورت میں مان کر حضرت موسیٰؑ جیسے اولوالعزم اور ذی شان نبی کا سفر جائز اور معقول قرار دیا جا سکے۔

(۱۱) ماوردی نے روایت کی ہے کہ جس شخص کے پاس حضرت موسیٰؑ گئے تھے وہ ایک فرشتہ تھا (ابن کثیر)

پس یہ واقعہ کشف ہی ماننا پڑے گا ورنہ ظاہری سفر کر کے فرشتے کے پاس جانے کے کیا معنے ہوں گے۔ فرشتہ تو پل مارنے میں خود ان کے پاس آ سکتا تھا۔

(۱۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ’’وَدِدْنَا اَنَّ مُوْسٰى كَانَ صَبَرَ حَتّٰى يَقُصَّ اللهُ عَلَيْنَا مِنْ خَبَرِهِمَا (بخاری کتاب التفسیر باب قولہ تعالیٰ و اذ قال موسیٰ لفتہ) کاش موسیٰؑ صبر کرتے اور خاموش رہتے تا کہ خدا تعالیٰ ہمیں ان کی اور خبریں بھی بتا دیتا۔

اگر اس واقعہ کو ظاہری واقعہ سمجھا جائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو بہت ارفع ہے میں بھی اپنے ذہن میں ان امور کے معلوم کرنے کا کوئی شوق نہیں پاتا اور نہ ہی میرے نزدیک کوئی سمجھدار انسان ایسی سطحی باتوں کے متعلق زیادتی علم کی خواہش کر سکتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ آئندہ کی اخبار تھیں جو کشفی رنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ظاہر ہوئیں اور چونکہ وہ غیب پر مشتمل تھیں اور آئندہ امت محمدیہؐ کے حالات کو ظاہر کرتی تھیں اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواہش تھی کہ کاش موسیٰؑ خاموش رہتے اور اور بھی باتیں کھل جاتیں۔ ان دلائل سے ثابت ہے کہ یہ واقعہ کشف کا واقعہ ہے۔

اگرچہ مصدقہ بائیبل کا کوئی حوالہ ہمیں نہیں ملتا جس میں اس واقعہ کا کسی رنگ میں بھی ذکر ہو۔ مگر یہود کی روایات کی کتب میں ایسی رویات موجود ہیں اور مسلمانوں کی روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی ایام میں بھی یہود میں ضرور اس قسم کی روایات پائی جاتی تھیں ورنہ مسلمان انہیں کہاں سے لے سکتے تھے۔ مگر یہود کی روایات کا ہماری تحقیق پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ جب تک قرآن کریم عقل اور مشاہدہ ان کی تصدیق نہ کرے۔ ہم ان کو ماننے پر مجبور نہیں۔ بلکہ بغیر ان قیود کے ان کا ماننا خطرہ سے خالی نہیں۔

خلاصہ یہ کہ عقل و نقل اس واقعہ کو ایک کشف قرار دیتے ہیں۔

حضرت خلیفہ اول ؓ کے نزدیک عبد سے مراد آنحضرت ؐ تھے وہ شخص جس سے حضرت موسیٰؑ اسراء میں سبق لینے گئے تھے۔اس کے متعلق استاذی المکرم حضرت مولوی نورالدین صاحب ؓ کی رائے تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود متمثل ہوا تھا۔میں نے جب اس پر غور کیا۔تو میں بھی اس یقین پر پہنچا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی حضرت موسیٰؑ کو متمثل ہو کر نظر آئے تھے۔اور یہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواہش کی کہ کاش موسیٰ خاموش رہتے۔تو ہمیں اور حالات بھی معلوم ہو جاتے۔یعنی ہمیں پتہ لگ جاتا کہ ہمارے ساتھ کیا واقعات پیش آنے ہیں۔

آنحضرت ؐ کے زمانہ کے حالات حضرت موسیٰؑ پر کشفی طور پر ظاہر ہوئے میرا اپنا یہ خیال ہے۔گو یہ خیال ایک ذوقی نظریہ ہے کہ جس وقت کوہ سیناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت موسیٰؑ کو بشارت دی گئی (دیکھو استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸) اور انہیں معلوم ہوا کہ ایک عظیم الشان نبی میرے بعد پیدا ہونے والا ہے۔تو ان کے دل میں یہ معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔کہ وہ کونسی تجلّی ہوگی جو اس نبی پر ظاہر کی جائے گی۔جس پر انہوں نے عرض کیا۔''رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ۔'' ذرا مجھ پر بھی وہ محمدی تجلّی ظاہر فرما۔تا کہ میں بھی تو دیکھوں۔کہ اس پر تو کس شان سے ظاہر ہوگا۔اس کا انہیں یہ جواب دیا گیا۔کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ہر شخص اپنے مناسب حال ہی تجلی دیکھ سکتا ہے۔میرے اس بیان کی تائید اس سے بھی ہو جاتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ اس سے پیشتر روحانی تجلی دیکھ چکے تھے۔جیسا کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا'' اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى '' (طٰهٰ:۱۳)۔پھر جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کی تجلی دیکھ چکے تھے تو ان کے اس قول کے کیا معنے ہوئے کہ اے اللہ مجھے اپنا آپ دکھا۔اگر اس کے یہ معنے کئے جائیں کہ پہلے روحانی تجلی دیکھی تھی اب وہ اللہ تعالیٰ کو اس کی اصل صورت میں دیکھنا چاہتے تھے۔تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے برگزیدہ نبی کو بیوقوف قرار دیا جائے۔نعوذ باللہ من ذالک۔کیونکہ کسی کا یہ کہنا کہ اے خدا تو مجھے مجسم ہو کر نظر آ۔نادانی کی بات ہے۔اور یہ بات حضرت موسیٰ کی طرف ہر گز منسوب نہیں ہو سکتی۔پس یہ رؤیت کی درخواست روحانی ہی قرار دی جا سکتی ہے۔اور چونکہ موسوی تجلی پہلے ان پر ہو چکی تھی۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب جو خواہش انہوں نے کی تو وہ کسی اور رؤیت کے لئے تھی۔اور چونکہ اس درخواست سے معاً پہلے انہیں محمد رسول اللہ صلعم کی بشارت دی گئی تھی۔

حضرت موسیٰؑ خدا تعالیٰ کی اس تجلی کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکے جو آنحضرت ؐ پر ہوئی تھی مَیں یہی قیاس کرتا ہوں۔کہ یہ درخواست ان کی محمدی تجلی کے دیکھنے کے بارہ میں تھی۔جس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ

''لَنۡ تَرٰٮنِیۡ'' کہ تو مجھے اس صورت میں نہیں دیکھ سکتا۔ جس صورت میں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھنا ہے۔ کیونکہ اس کے دیکھنے کے لئے محمدی مرتبہ کی ضرورت ہے۔ جو تجھے حاصل نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ''لَنۡ تَرٰٮنِیۡ'' کہہ کر پھر اللہ تعالیٰ نے جلوہ دکھایا۔ چنانچہ موسیٰ نے دیکھ لیا کہ واقعہ میں وہ اس جلوہ کے مطابق ظرف نہ رکھتے تھے۔ اس وجہ سے وہ اس جلوہ کو دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رسول کریم صلعم کی شان اعلیٰ کے دکھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ کشف دکھایا اور اس کشف کا خضر میرا محمدؐ ہی ہے جس کے ساتھ چلنے کی موسیٰ علیہ السلام کو طاقت نہ تھی۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

حضرت موسیٰؑ کے ساتھ کا جوان حضرت عیسیٰؑ تھے وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِفَتٰٮہُ۔ فتی کے متعلق روایات میں لکھا ہے کہ وہ یوشع بن نون تھے (کشاف زیر آیت ھذا)۔ کوئی تعجب نہیں کہ کشف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو ہی ساتھ دیکھا ہو۔ لیکن میری اپنی رائے یہ ہے کہ یہ دوسرا شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ جنہوں نے موسوی سلسلہ کے سفر کے آخری دور میں قوم کی راہنمائی کرنی تھی۔ اور گویا موسوی سفر کا اختتام ان کی معیت میں ہونا تھا۔

اس کا ثبوت میرے نزدیک اس آیت سے بھی ملتا ہے کیونکہ اس آیت میں یہ ذکر نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام گھر سے ایک نوجون کو لے کر چلے۔ بلکہ خود ان کے چلنے کا بھی ذکر نہیں۔ ذکر ہے تو یہ کہ موسیٰ نے اپنے آپ کو سفر کی حالت میں دیکھا اور اس وقت ان کے ساتھ ایک نوجوان تھا۔ انہوں نے اس نوجوان سے کہا کہ جب تک میں مجمع البحرین تک نہ پہونچ جاؤں میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا۔ خواہ مجھے صدیوں تک ہی کیوں نہ سفر کرنا پڑے۔ زمانہ کے لئے جو لفظ اس آیت میں استعمال ہوا ہے۔ وہ حُقُب کا ہے۔ اور یہ لفظ حُقُبٌ کی جمع ہے۔ حُقُب کے معنے اسّی سال یا اس سے زیادہ سالوں کے ہوتے ہیں۔ درحقیقت یہ لفظ عربی میں صدی کا قائمقام ہے۔ پس حُقُبٌ جو جمع ہے۔ اس کے معنے ہوئے صدیاں۔ مگر بعض دفعہ اس لفظ کو ایک سال یا کئی سال کے لئے بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ اگر یہی معنے لئے جائیں تو بھی آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ سالوں چلتا جاؤں گا۔ یا یہ کہ دسیوں سال چلتا چلا جاؤں گا۔ ظاہر ہے کہ ایک نبی کا امت سے سالہا سال تک جدا رہنا عقل کے خلاف ہے۔ بلکہ خود نبوت کی ضرورت کو مشتبہ کر دیتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ ہجرت کرنی پڑی۔ تو آپؐ نے مکہ سے صحابہ کو وہاں بھجوا دیا اور پھر خود مدینہ میں بھی آپؐ پر ایمان لانے والے موجود تھے۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اگر سالہا سال کہا ہے۔ تب بھی یہ ثبوت ہے کہ یہ کشف تھا۔ اور اگر صدیوں کہا ہے اور میرے نزدیک یہی کہا ہے۔ تو پھر تو یہ قطعی طور پر ثابت ہے۔ کہ ان

الفاظ کو موسیٰ کے منہ سے نکلوا کر اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ موسیٰ کا روحانی سفر یعنی ان کی امت کا زمانہ صدیوں تک ممتدّ چلا جائے گا۔

مجمع البحرین سے مراد زمانہ اختتام موسیٰ میرے نزدیک اس فقرہ کے اس جگہ بیان کرنے کی بھی ایک حکمت ہے اور وہ یہ کہ موسوی سفر کی اس منزل میں جہاں کہ فتٰی آپ کے ساتھ شامل ہونا مقدر تھا۔ایک حصۂ قوم میں یہ خیال پیدا ہونے والا تھا کہ اب موسیٰ کا سفر ختم ہو گیا۔اب اس نوجوان یعنی حضرت عیسیٰ کا سفر شروع ہو گا۔یعنی بعض لوگوں میں یہ شبہ پیدا ہونے والا تھا۔کہ حضرت عیسیٰ کے آنے سے موسوی شریعت ختم ہو گئی۔اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نیا دین جاری کیا ہے۔ان الفاظ میں اس شبہ کا ازالہ کیا ہے اور موسیٰ ؑ کے منہ سے یہ کہلوایا ہے کہ اس نوجوان کے ملنے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سفر ختم نہیں ہوتا۔بلکہ مجمع البحرین پر یعنی ظہور محمد صلعم کے زمانہ پر جا کر ختم ہوگا۔گویا عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور پر کسی نئے دین کا اجراء نہیں ہوگا۔بلکہ وہ موسوی دین کی تائید کریں گے اور موسیٰ کے سفر کو ختم کرنے والے نہ ہوں گے۔بلکہ موسیٰ کی نیابت میں ان کے سفر کو پورا کریں گے۔خود حضرت مسیح نے بھی اس امر کی تصدیق کی ہے۔فرماتے ہیں۔

> ''یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں''۔(متی باب ۵ آیت ۱۷)

اس کشف سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو حضرت موسیٰ نے جب یہ کشف دیکھا تو اس کا شروع ہی یہ تھا کہ گویا وہ ایک راستہ پر ایک نوجوان کے ساتھ چل رہے ہیں۔اور منزل مقصود نہ ملنے پر حیران ہیں یا یہ کہ اس سے پہلے بھی حصہ کشف کا تھا۔جس میں لمبے سفر کا ذکر تھا مگر اس کو بے ضرورت سمجھ کر قرآن کریم نے چھوڑ دیا ہے۔کیونکہ وہی آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ جب تک مجمع البحرین تک نہ جا پہنچوں چلتا چلا جاؤں گا خواہ صدیاں چلنا پڑے جو ایک عرصہ تک راستہ تلاش کر کے حیران ہو رہا ہو کہ منزل مقصود کہاں گئی۔میرے نزدیک یہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ نوجوان حضرت مسیح تھے۔جو موسوی سفر کے اختتام کے قریب آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملے اور پھر اس روحانی سفر میں ان کے ہم کاب ہو گئے۔

مجمع البحرین کے ظاہراً کسی مقام پر چسپاں ہونے کی تردید اس آیت میں جو لفظ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ آیا ہے یہ بھی اس پر روشنی ڈالتا ہے کہ یہ کشفی واقعہ ہے۔کیونکہ مجمع البحرین کسی معروف جگہ کا نام نہیں۔اور سوائے اس کے کہ اس کے معنے دو سمندروں کے ملنے کی جگہ کے لئے جائیں اور کوئی معنے ظاہر میں نہیں کئے جا سکتے۔اور

موسیٰ علیہ السلام کی ہجرت کے بعد کی رہائش میں قریب ترین علاقے جہاں دوسمندر ملتے تھے یہ تین تھے۔ باب المندب۔ جہاں بحیرہ احمر اور بحرالہند ملتے ہیں۔دردانیال۔ جہاں بحیرہ روم اور بحیرہ مارمورہ ملتے ہیں یا پھر البحرین جہاں خلیج فارس کا سمندر بحرالہند سے ملتا ہے۔یہ تینوں علاقے قریباً ہزار ہزار میل دوران کے وطن سے تھے۔ اوراس زمانہ کے حالات کو مدنظر رکھ کر کوئی سال بھر کا سفر بنتا تھا۔لیکن چونکہ کشف سے معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کے کنارے کنارے آپ سفرکررہے تھے۔اس لئے دردانیال کا درہ ہی ظاہری سمندر بنتا ہے۔کیونکہ تینوں جگہوں میں سے صرف وہی جگہ ہے۔جس تک موسیٰؑ کی جائے رہائش ہے۔سمندر کے کنارے کنارے راستہ جاتا ہے۔مگر یہی وہ راستہ ہےجس میں کنعان پڑتا ہے۔اورجس کے متعلق بائیبل شاہد ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی میں وہاں نہیں جاسکے(استثناء باب ۳۴ آیت ۴،۵)۔پس یہ واقعہ بھی اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ ایک کشف تھا۔

مجمع البحرین کی تعبیر اور مجمع البحرین کسی جگہ کا نام نہیں بلکہ ایک تعبیر طلب نام ہے چنانچہ تعطیر الانام میں لکھا ہے۔ ’’بَحْرٌ فِی الْمَنَامِ یَدُلُّ عَلٰی مَلَکٍ قَوِیٍّ مَهَابٍ عَادِلٍ شَفِیْقٍ یَحْتَاجُ اِلَیْهِ الْخَلَائِقُ۔اور پھر لکھا ہے رُبَّمَا دَلَّ الْبَحْرُ عَلَی التَّسْبِیْحِ وَالتَّهْلِیْلِ (تعطیر الانام کلمة البحر) سمندر سے مراد زبردست بادشاہ جوعادل ہو، شفیق ہو،اوردنیااس کی محتاج ہو۔اورایسا ہی سمندر کے معنےتسبیح وتہلیل کے بھی ہوتے ہیں۔اوراس میں گویا’’سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ‘‘ کی طرف اشارہ ہے۔

پس مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ سے مراد درحقیقت وہ زمانہ تھا۔جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ ختم ہوا۔اورمحمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ شروع ہوا۔یعنی وہ گھڑی جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلا الہام نبوت ہوا۔مجمع البحرین تھی۔وہاں موسیٰ جوایک روحانی عادل،شفیق اوردنیا کے لئےضروری بادشاہ تھےان کا علاقہ ختم ہوتا تھا اورمحمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جواوربھی بڑے روحانی سمندر تھےان کا زمانہ شروع ہوتا تھا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کوکشف میں دوبڑے سمندروں کے ملنے کا مقام دکھا کر گویا یہ بتایا گیا کہ اس زمانہ تک آپ کی امت کا زمانہ ہے۔ آگے ایک اورسمندرشروع ہوتا ہے۔آپ کا زمانہ ختم ہوکراس نئے نبی کا کام شروع ہوگا۔اوروہی شخص روحانی زندگی کا سامان حاصل کرسکے گا جواس سمندر میں غوطہ لگائے گا۔

اس رؤیا میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ موسوی سلسلہ محمدی سلسلہ کے لئے بطورارہاص ہے۔اورآخر یہ سمندراس سمندر میں جاکرمل جائے گا۔اسی وجہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوجوکشف دکھایا گیا تھااس میں تو یہ نظارہ دکھایا گیا تھا کہ جبریل خودرسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔مگرحضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ

نظارہ دکھایا کہ وہ مجمع البحرین کی طرف اپنے ساتھی کو لے کر گئے اور وہاں جا کر ان کا سفر ختم ہوگیا (درمنثور زیر آیت بنی اسرائیل ۱تا۸)۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ

پس جب وہ (دونوں) ان (دونوں سمندروں کے) باہر ملنے کی جگہ پر پہنچے تو وہ اپنی مچھلی (وہاں) بھول گئے۔ جس

سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿۶۲﴾

پر اس نے تیزی سے بھاگتے ہوئے سمندر میں اپنی راہ لی۔

حلّ لُغات۔ اَلْحُوْتُ اَلْحُوْتُ کے معنے ہیں اَلسَّمَكُ وَقَدْ غَلَبَ فِي الْكَبِيْرِ۔ مچھلی اور زیادہ تر بڑی مچھلی پر بولا جاتا ہے۔ (اقرب)

اَلسَّرَبُ اَلسَّرَبُ: جُحْرُ الْوَحْشِيِ۔ وحشی جانور کے رہنے کی جگہ۔ اَلْحَفِيْرُ تَحْتَ الْاَرْضِ۔ زمین کے اندر گڑھا۔ اَلْقَنَاةُ۔ يَدْخُلُ مِنْهَا الْمَاءُ۔ پانی کی نالی۔ نیز سَرَبٌ مصدر بھی ہے جس کے معنی تیزی سے چلنے کے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ **حوت کی تعبیر** نَسِيَا حُوْتَهُمَا۔ حوت کے معنے علم التعبیر میں یہ لکھتے ہیں ''رُبَّمَا دَلَّتْ رُؤْيَتُهٗ عَلٰى مَعْبَدِ الصَّالِحِيْنَ وَمَسْجِدِ الْمُتَعَبِّدِيْنَ۔'' (تعطیر الانام کلمۃ حوت)

حوت یعنی مچھلی کا دیکھنا بہت نیک لوگوں کی عبادت کی جگہ اور عبادت گزاروں کی مسجد پر دلالت کرتا ہے۔

جیسا کہ اس آیت سے اور اگلی آیت کے بعد کی آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مجمع البحرین کے مقام کی شناخت یہ بتائی گئی تھی کہ وہاں مچھلی غائب ہوجائے گی۔ پس نَسِيَا حُوْتَهُمَا کے معنے یہ ہوئے۔ کہ جس مقام پر ان لوگوں کے ہاتھوں سے نیک لوگوں کی عبادت گاہیں اور عبادت گزاروں کی مساجد نکل جائیں گی۔ وہی مقام مجمع البحرین ہوگا۔ یعنی جہاں موسوی سلسلہ ختم ہوجائے گا اور محمدی سلسلہ شروع ہوگا۔

نَسِيَا حُوْتَهُمَا سے اشارہ ہے کہ موسیٰ اور ان کے فتی کی قوم سے عبادت کی قبولیت اٹھ جائے گی

یہ مضمون کس قدر واضح ہے۔ ایک نئے نبی کے آنے سے نیکی اور عبادت پہلی قوم سے چھین لی جاتی ہے۔ اور اس نبی کی قوم کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔ اسی کی طرف اس کشف میں اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ سلسلہ محمدیہ کے اجراء پر

بنی اسرائیل یعنی موسوی سلسلہ کے لوگوں کی عبادات خدا تعالیٰ کے حضور میں مقبول نہ رہیں گی۔ اور محمد رسول اللہ کی امت کی عبادتیں ہی مقبول ہوں گی اور عبادت اور صلاحیت کے جو آثار ہیں موسوی سلسلہ کے لوگوں سے غائب ہوجائیں گے اور نَسِيَا حُوْتَهُمَا کہہ کر یہ بتایا ہے کہ خالص اسرائیلی قوم تو اس وقت سے پہلے ہی صحیح عبادت اور تقویٰ کو کھو چکی ہوگی۔ صرف وہی قوم عبادت اور صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہوگی جو صرف موسیٰ کی قوم نہیں کہلا سکتی۔ بلکہ موسیٰ اور اس کے فتی کی قوم کہلا سکے گی یعنی حضرت مسیح کے آنے کے بعد مسیحیوں میں عبادت رہ جائے گی۔ بنی اسرائیل اس سے محروم ہوجائیں گے۔ لیکن چونکہ حضرت مسیح حضرت موسیٰ کے سلسلہ ہی کے نبی ہوں گے۔ اس لئے ان کی حوت بھی ایک رنگ میں موسیٰ کی حوت ہوگی۔ اس لئے وہ دونوں کی طرف منسوب ہوگی۔ مگر مجمع البحرین کا مقام آئے گا تو اس قوم کے ہاتھ سے بھی جن کے موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام مشترک طور پر معلم ہوں گے۔ عبادت اور صلاحیت جاتی رہے گی۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کشف تھا۔ کیونکہ ظاہر مجمع البحرین تو ایسی جگہ ہوتی ہے کہ اسے کوئی بھول ہی نہیں سکتا اور اس کے لئے کسی حوت کی علامت کی ضرورت نہیں۔ پس یہ روحانی مجمع البحرین ہے جو علامتوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ظاہر میں اس کی کوئی علامت نہیں ہوتی۔ بلکہ لوگ دوسرے بحر کے زمانے میں اس کی مخالفت کرتے اور اسے جھوٹا کہتے ہیں۔ اور یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ مجمع البحرین آ گیا ہے۔ یعنی پہلے نبی کا زمانہ ختم ہو گیا ہے اور دوسرے نبی کا زمانہ شروع ہو گیا ہے۔ اس کی علامت یہی ہوتی ہے کہ پہلے نبی کی قوم کی عبادات اور صلاحیت جاتی رہتی ہے۔ اور عقلمند لوگ اللہ تعالیٰ کے سلوک میں اس فرق کو دیکھ کر کہ اب وہ پہلی قوم کی عبادات کی کوئی قدر نہیں کرتا اور دوسری قوم کی عبادتوں کو قبول کرتا اور اس کی دعاؤں کو سنتا ہے سمجھ جاتے ہی کہ مجمع البحرین آ گیا ہے۔

اس مضمون کی طرف قرآن کریم کی ایک اور آیت میں کھلے لفظوں میں بھی اشارہ کیا گیا ہے فرماتا ہے۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ (الفتح: ۲۹) یعنی محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہی کفار کے مقابل پر بہت سخت ہیں۔ اور آپس میں بہت رحم کرنے والے ہیں۔ تو ان کو دیکھے گا کہ رکوعوں اور سجدوں میں لگے رہتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رضا کے متلاشی ہیں۔ ان کے مونہوں سے ان کے سجدوں کی قبولیت کے آثار ظاہر ہیں۔ یہ ان کی مثال تورات میں بیان ہو چکی ہے۔ اس آیت میں صاف

بتایا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے بتایا گیا تھا کہ محمد رسول اللہؐ اور ان کی جماعت کی سچائی کا ثبوت یہ ہوگا کہ ان کے چہروں سے یہ معلوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ نے ان کے سجدوں کو قبول کر لیا ہے۔ جبکہ ان کے مخالفوں کی عبادتیں رد کر دی جائیں گی۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضلوں کے آثار ان کے چہروں سے ظاہر نہ ہوں گے۔

اس کشف کو تورات سے تحریف کر کے یہود نے نکال دیا ہے میں اس آیت کو دیکھتے ہوئے سمجھتا ہوں کہ تورات میں اس کشف کا ذکر تھا۔ مگر یہود میں سے بعض نے جہاں اور تحریفیں تورات میں کیں وہاں اسے بھی نکال دیا۔ کیونکہ اس سے ان کی قوم پر ایک زد پڑتی تھی۔ لیکن ان کی زبانی روایات میں اس کشف کا ذکر باقی رہ گیا ہے۔ جیسا کہ یہود کے دوسرے لٹریچر میں اس کشف کا بگڑی ہوئی صورت میں وجود پایا جاتا ہے۔

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ موسوی سلسلہ محمدی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ کیونکہ مجمع البحرین کا ظاہر میں کوئی نشان نہ ہونا بتاتا ہے کہ یہ دونوں سمندر اس طرح آپس میں ملے تھے۔ کہ دو سمندر نہ معلوم ہوتے تھے بلکہ اگلا سمندر پہلے کا تسلسل ہی معلوم ہوتا تھا۔ گویا پہلے سمندر کا پانی دوسرے میں آملا تھا۔ ایک دوسرے کے مقابل کے سمندر نہ تھے کہ ان کے ملنے کی جگہ کا الگ نشان نظر آتا۔

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۫ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۳﴾

پھر جب وہ (اس جگہ سے) آگے نکل گئے تو اس نے اپنے نوجوان (رفیق) سے کہا (کہ) ہمارا صبح کا کھانا ہمیں دے ہمیں یقیناً اپنے اس سفر کی وجہ سے تکان ہوگئی ہے۔

حلّ لُغَات۔ غَدَاءَنَا اَلْغَدَاءُ کے معنے ہیں طَعَامُ الْغُدْوَةِ۔ صبح کا کھانا۔ (اقرب)

نصبًا نَصَبٌ کے معنے تھکان کے ہیں۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو حجر آیت نمبر ۴۹۔

نَصَبٌ نَصِبَ (يَنْصَبُ) کا مصدر ہے۔ اور نَصِبَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں اَعْيَا۔ تھک گیا (لازم) نَصِبَ فِي الْاَمْرِ: جَدَّ وَاجْتَهَدَ۔ کسی کام میں کوشش اور محنت کی۔ (اقرب) پس النَّصَبُ کے معنے ہوں گے تکان۔

تفسیر ۔ یہ ضروری نہیں کہ ان تمام واقعات کی تعبیر ہی کی جائے۔ کیونکہ بعض دفعہ کشف کی صورت میں بعض ایسے واقعات بھی ہوتے ہیں جو صرف رؤیا کو ایک مکمل نظارہ کی صورت دینے کے لئے شامل کئے جاتے ہیں۔

خود وہ تعبیر کے قابل امور کا حصہ نہیں ہوتے۔ مثلاً ایک شخص خواب میں ایک موت کا نظارہ دیکھتا ہے تو اس کے ساتھ کوئی مکان وغیرہ بھی دیکھ لیتا ہے۔ وہ مکان تعبیر طلب نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف وہ نظارہ جس سے کسی کی موت پر دلالت کی جاتی ہے۔ تعبیر طلب ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس واقعہ کی بھی تعبیر کی جائے تو مضمون میں وسعت ہی پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے میں اس کی بھی علم تعبیر کے مطابق تشریح کر دیتا ہوں۔

غداء کے معنے علم التعبیر میں یہ لکھے ہیں کہ جو اپنا غداء طلب کرے۔ اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ تھک جائے گا۔ (تعطیر الانام زیر لفظ غداء)

ان معنوں کے رو سے یہ مراد ہوگی کہ جب مجمع البحرین یعنی رسول کریم صلعم کا زمانہ آ جائے گا تو حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کی قوم اس سے فائدہ نہ اٹھائے گی (کیونکہ یقیناً اس کشف میں موسیٰ اور عیسیٰ علیھما السلام سے مراد ان کی قومیں ہیں نہ کہ وہ خود۔ کیونکہ انہوں نے محمد رسول اللہ کا زمانہ نہیں پایا۔ بلکہ ان کی قوم نے یہ زمانہ پایا) بلکہ ان کا انکار کر کے اپنے سفر کو جاری رکھے گی اور اپنے مذہب کے زمانہ کے ختم ہونے کو تسلیم نہ کرے گی۔ تب ایک لمبے سفر کے بعد وہ اپنے اندر تکان محسوس کرے گی حیران ہوگی کہ ہمیں جو کہا گیا تھا کہ ایک رسول کامل آنے والا ہے وہ کیوں نہیں آیا۔ اس وقت تھک کر وہ سوچ میں پڑ جائے گی کہ کہیں ہم سے غلطی تو نہیں ہوئی۔ کہیں وہ آ تو نہیں چکا۔ اور ہم اس کے ماننے سے محروم تو نہیں رہ گئے۔

قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ

اس نے کہا (کہ) بتایئے (اب کیا ہوگا) جب ہم (آرام کے لئے) اس چٹان پر ٹھیرے تو میں مچھلی (کا خیال) بھول

الْحُوْتَ ز وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ج وَاتَّخَذَ

گیا۔ اور مجھے یہ (بات) شیطان کے سوا کسی نے نہیں بھلائی۔ اور اس نے سمندر میں عجیب طرح

سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ﷺ عَجَبًا ﴿۶۴﴾

سے اپنی راہ لے لی۔

حلّ لُغَات۔ عَجَبًا اَلْعَجَبُ کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۳۔

اَلْعَجَبُ۔ اِنْکَارُ مَا يَرِدُ عَلَيْكَ یعنے جب کوئی ایسا امر پیش آئے کہ اس کے ماننے میں طبیعت کو انقباض اور انکار ہو تو اس حالت انکار کو عجب کہتے ہیں۔ اِسْتِطْرَافُهٗ۔ پیش آمدہ امر کو پسند کرنے کو بھی عجب کہتے ہیں۔ رَوْعَةٌ تَعْتَرِي الْاِنْسَانَ عِنْدَ اسْتِعْظَامِ الشَّيْءِ۔ یعنی اس حالت رعب کو بھی عجب کہتے ہیں جو انسان پر کسی چیز کو بہت ہی بڑا سمجھنے کے وقت طاری ہوتی ہے۔ وَمِنَ اللهِ: الرِّضٰی اور جب اللہ کی طرف اس لفظ کو منسوب کیا جاوے تو اس کے معنی پسندیدگی کے ہوتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ الصخرۃ کی تعبیر اور موسوی قوم کا فسق و فجور میں مبتلا ہونا

اَلصَّخْرَةُ: اَلْحَجَرُ الْعَظِيْمُ الصَّلْبُ (اقرب) یعنی عربی زبان میں بڑے اور سخت پتھر کو کہتے ہیں اور علم تعبیر میں صخرہ کے معنے لکھے ہیں۔ وَتَدُلُّ عَلَى الْقِحَةِ وَ الْفُجُوْرِ (تعطیر الانام المنام زیر لفظ صخرہ) یعنی خواب میں کوئی صخرہ دیکھے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ نہایت گندے فسق و فجور میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اس تعبیر کی رو سے اِذْ اَوَيْنَاۤ اِلَى الصَّخْرَةِ کے معنے یہ ہوں گے کہ جب ہم فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے اور میں بتا آیا ہوں کہ اس کشف میں موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰؑ سے مراد ان کی اقوام ہیں۔ کیونکہ محمد رسول اللہ صلعم کا زمانہ انہوں نے پایا تھا نہ کہ خود حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰؑ نے۔ پس یہ تعبیر ہمیں دھوکے میں نہیں ڈال سکتی۔ مراد یہ ہے کہ جب وہ قوم جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰ کی مشترکہ تھی۔ فسق و فجور میں مبتلا ہو جائے گی۔ وہی زمانہ مجمع البحرین کا ہو گا یعنی اس وقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوں گے اور یہ ظاہر ہے کہ نبی تبھی دنیا میں آتے ہیں جبکہ اس وقت کے لوگ فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

پس اس نظارہ کی تعبیر یہ ہوگی۔ کہ جب مسیحی قوم فسق و فجور میں مبتلا ہو گئی تھی وہی وقت محمد رسول اللہؐ کے ظہور کا تھا۔ اور یہ خیال مسیحیوں کو ایک لمبے عرصہ کے بعد اپنے سفر میں تھک جانے اور اپنی کوششوں میں ناکام رہنے کے بعد پیدا ہوگا اور وہ افسوس کریں گے کہ ہم نے اس زمانہ کو کیوں کھو دیا۔

وَمَاۤ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ نے اس مضمون کو اور بھی واضح کر دیا ہے یعنی محمد رسول اللہ کی پہچان سے ہم شیطانی وساوس کی وجہ سے محروم رہے۔ ورنہ جبکہ ہماری قوم کے ہاتھ سے عبادت کے ثمرات جاتے رہے تھے۔ اور ہم فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے تھے۔ تو کیوں ہم نے یہ نہ سمجھ لیا کہ اب مجمع البحرین کا مقام آ گیا ہے۔ اور ہماری قوم سے خدا تعالیٰ نے اپنی مدد ہٹا لی ہے۔ اور موعود نبی کا زمانہ آ چکا ہے۔ اور وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا۔ جو فرمایا اس میں وہ اپنی اس غلطی پر تعجب کرتے ہیں کہ حوت ہمارے ہاتھ سے نکل کر کس طرح دوسرے سمندر میں چلی گئی۔ یعنی عبادت کے ثمرات مسلمانوں کی طرف منتقل ہو گئے اور ہم خالی ہاتھ رہ گئے۔

یہ نظارہ بھی کشف پر دلالت کرتا ہے۔ ورنہ مجمع البحرین کے سمجھانے کے لئے کسی ظاہری مچھلی کے نشان کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اور اگر ظاہری طور پر مچھلی کو دیکھ کر وہ دونوں چل رہے تھے۔ تو پھر بھولنے کے معنے ہی کوئی نہیں۔ کیا کبھی اس دنیا میں ایسا ہوا ہے کہ مثلاً کوئی شخص موٹر میں سفر کر رہا ہو۔ پھر ایک لمبا سفر طے کرنے کے بعد وہ بھول جائے کہ میں موٹر میں سفر کر رہا تھا۔ اور پیدل سفر کرنے لگ جائے۔ اور کچھ دور جا کر اسے یہ بات یاد آئے۔ غرض جب مچھلی کے نشان پر وہ چل پڑے تھے تو وہ ایک قدم بھی مچھلی کے بغیر نہ چل نہیں سکتے تھے۔ اس میں بھولنے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔

قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿۶۵﴾

اس نے کہا (کہ) یہی وہ (مقام) ہے جس کی ہمیں تلاش تھی۔ پھر وہ اپنے پاؤں کے نشان دیکھتے ہوئے واپس لوٹے۔

حلّ لُغَات۔ نَبْغِ نَبْغِ بَغَاهُ کے معنے ہیں طَلَبَهٗ اسے چاہا (اقرب) نَبْغِ جمع متکلم کا صیغہ ہے اس کے معنے ہوں گے کہ ہم چاہتے ہیں۔

تفسیر۔ یعنی اس موقعہ پر وہ سمجھ جائیں گے کہ انہوں نے غلطی سے اپنا الگ سفر جاری رکھا۔ مجمع البحرین کو تو وہ پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ

تو انہوں نے ہمارے (برگزیدہ) بندوں میں سے ایک ایسا بندہ (وہاں) پایا جسے ہم نے اپنے حضور سے رحمت (کی

عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۶﴾

سیرت) بخشی تھی۔ اور اسے ہم نے اپنی جناب سے (خاص) علم (بھی) عطا کیا تھا۔

تفسیر۔ عَبْدًا سے مراد آنحضرتؐ ہیں عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عبدٌ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ سورۃ الجن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا۔ (الجن: ۲۰) کہ آپ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ تو لوگ آپ ہجوم

کر کے امڈ آتے ہیں۔صوفیاء نے تو یہاں تک بحث کی ہے کہ عبد کا مقام سب درجات سے بڑا درجہ اور بلند مقام ہے اور سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی کامل عبد نہیں ہے۔

اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا میں بھی آپ کے وجود کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔جیسا کہ فرماتا ہے وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء:۱۰۸) یعنی ہم نے تجھے جہان کے لئے رحمت ہی رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔یعنی اس کو خاص علم دیا گیا ہے جو پہلوں کو نہ ملا۔سورۃ نساء میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا (النساء: ۱۱۴) کہ اے رسول ہم نے تجھے وہ کچھ سکھایا ہے جو تو پہلے نہ جانتا تھا۔اور تجھ پر اس ذریعہ سے بڑا فضل کیا ہے۔اسی طرح فرماتا ہے۔وَ عُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَ لَآ اٰبَآؤُكُمْ (الانعام:۹۲) یعنی اس نبی کے ذریعہ سے تم کو وہ علم عطا کیا گیا ہے جو اس سے پہلے کسی کو نہیں دیا گیا۔اور پہلوں میں موسیٰ وعیسیٰ بھی شامل ہیں۔اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِیْمٍ عَلِیْمٍ (النمل:۷) یعنی تجھ کو قرآن حکیم اور علیم خدا کی طرف سے سکھایا جاتا ہے۔اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا سکھائی گئی ہے کہ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (طٰہٰ:۱۱۵) یعنی اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہا کر کہ الٰہی میرا علم اور بڑھا۔میرا علم اور بڑھا۔

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا

موسیٰ نے اس سے کہا (کہ) کیا میں اس (مقصد کے) لئے آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں۔کہ جو علم آپ کو عطا ہوا ہے

عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۷﴾

اس میں سے کچھ رشد (کی باتیں) مجھے بھی سکھائیں۔

حل لغات۔رُشْدٌ رُشْدٌ حق کے راستے پر استقامت اختیار کرنا رشد کہلاتا ہے۔(اقرب)

تفسیر۔اس آیت سے موسوی مقام اور محمدی مقام کا مقابلہ کر کے دکھایا گیا ہے اور بتایا ہے کہ موسوی مقام محمدی مقام کے تابع ہے اور جن امور کی تہ تک محمدی علوم پہنچے ہیں۔ان تک موسوی علوم نہیں پہنچے۔اور کشف میں اس لطیف مقابلہ کو ایک مکالمہ اور مصاحبت کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔

قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۶۸﴾

اس نے کہا (کہ) تو میرے ساتھ رہ کر ہرگز صبر نہیں کر سکے گا۔

تفسیر۔ محمدی کمالات کی بلندی اس آیت میں گویا لن ترانی والے مضمون کو بیان کیا گیا ہے کہ محمدی کمالات کی بلندی کو موسوی کمالات نہیں پہنچ سکتے۔ اور بتایا ہے کہ محمدی قوم کا صبر اور مرتبہ رکھتا ہے اور موسوی قوم کا صبر اور مرتبہ رکھتا ہے۔ جن ابتلاؤں اور مشکلات کا مسلمانوں نے مقابلہ کیا موسوی سلسلہ کے لوگ وہاں آ کر رہ گئے۔ اس میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ کہ گو مسیحی سلسلہ کے لوگوں نے ایک لمبے عرصہ تک مشکلات برداشت کیں مگر وہ مشکلات جسمانی تھیں۔ علمی آزمائشیں نہ تھیں۔ علمی مشکلات کا وہ مقابلہ نہیں کر سکے۔ چنانچہ خود حضرت مسیحؑ شاکی رہے کہ میرے مقام کو کوئی نہیں سمجھا۔ حتیٰ کہ انجیل میں تو یہاں تک لکھا ہے۔ کہ مسیحؑ نے اپنی فلسطینی زندگی کے آخری سال میں جبکہ صلیب کا واقعہ قریب تھا۔ اپنے سب سے مقرب شاگرد پطرس سے پوچھا کہ لوگ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ اور جب انہوں نے بتایا کہ مَیں تو آپ کو مسیح سمجھتا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے (متی باب ۱۶ آیت ۱۳۔۱۹) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اور تو اور حواری بھی ان کو مسیح ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ صرف ایک معمولی نبی سمجھتے تھے۔ پس پطرس کے ایمان کو دیکھ کر ان کو خوشی ہوئی۔

آنحضرتؐ کے صبر نفس کا مقابلہ موسوی قوم سے اس آیت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰؑ کی طبیعتوں کا بھی مقابلہ ہے۔ حضرت موسیٰؑ جلد سوال کرنے لگ جاتے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہتے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہی آپ پر ہر بات ظاہر کرتا۔ اور یہی فرق دونوں کی امتوں میں تھا۔

تورات پر نظر ڈالو۔ کہ بنی اسرائیل سوال پر سوال کر رہے ہیں۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قوم کا یہ حال ہے کہ صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم انتظار کیا کرتے تھے کہ کوئی اعرابی آوے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کوئی سوال پوچھے۔ تا ہم بھی سن لیں۔ گویا اس قدر وقار اور صبر نفس حاصل تھا۔ کہ خود نہ پوچھا کرتے تھے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ (البقرۃ:۱۰۹) کہ کیا تم سے بعض موسیٰ کی قوم کی طرح سوال کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا نہ کرنا۔ وہ لوگ انہیں بار بار خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے پر اور ہر بات کے متعلق سوال کرنے کے لئے مجبور کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس حکم پر عمل کرتے ہوئے صحابہؓ نے ادب کے طریق کو مضبوطی سے پکڑ لیا (بخاری کتاب العلم)۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ حال

تھا کہ جو خدا تعالیٰ بتاتا سن لیتے ورنہ صبر سے انتظار کرتے۔اور اس حکم پر عمل فرماتے کہ وَ لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰۤی اِلَیْكَ وَحْیُهٗ٘ وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (طٰہ:۱۱۵) یعنی قرآن کریم کو اپنے وقت پر نازل ہونے دو۔اور اس کی وحی کے آنے سے پہلے سوال نہ کیا کرو۔اور یہ دعا کرو کہ الٰہی میرے علم کو بڑھاتا رہ۔

وَ كَیْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۹﴾

اور جس بات کے علم کا تو نے احاطہ نہیں کیا اس پر تو صبر کر (بھی) کیونکر سکتا ہے۔

حلّ لُغات۔لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا کہتے ہیں اَحَاطَ بِهٖ عِلْمًا اَیْ اَحْدَقَ عِلْمُهٗ بِهٖ مِنْ جَمِیْعِ جِهَاتِهٖ وعَرَفَهٗ۔کسی بات کی خوب واقفیت اور آگاہی حاصل کی۔(اقرب) پس لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا کے معنے ہوں گے کہ جس بات کے علم کا تو نے احاطہ نہیں کیا۔

تفسیر۔یہود کے ہدایت سے محروم ہونے کی وجہ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ موسوی سلسلہ کے لوگوں کے لئے محمدی علوم کا سمجھنا واقعہ میں مشکل ہوگا۔کیونکہ اس دین میں بہت سے مسائل نئے بتائے جائیں گے۔اور اس شخص کے لئے جو اپنے آپ کو عالم سمجھتا ہو۔نئی بات کو ماننا مشکل ہوتا ہے۔چنانچہ کفار جن کے دل صاف تختی کی طرح تھے۔وہ تو بہت جلد آپ پر ایمان لے آئے۔مگر یہود و نصاریٰ جن کے پاس خدا کا کلام موجود تھا محروم رہے۔کیونکہ ہر بات جو اسلام میں ان کی کتب کے خلاف ہوتی تھی۔ان کے صبر کے پیمانہ کو چھلکا دیتی تھی۔اور وہ ابتلاء میں پڑ جاتے تھے۔حضرت مسیحؑ کے وقت میں بھی اسی وجہ سے یہود ہدایت سے محروم رہے۔اور غیر قومیں اصرار کر کے اس دین میں شامل ہونے لگیں۔

قَالَ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّ لَاۤ اَعْصِیْ لَكَ اَمْرًا ﴿۷۰﴾

اس نے کہا (کہ) اگر اللہ (تعالیٰ) نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔اور میں آپ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا۔

تفسیر۔موسیٰؑ نے کہا کہ تو مجھے صابر پائے گا۔اور میں تیرے حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا۔اس آیت سے

بھی ظاہر ہے۔ کہ یہ خواب تھی۔ کیونکہ حضرت موسیٰؑ جو مستقل نبی تھے دوسرے شخص سے خواہ وہ کوئی ہو، یہ نہ کہہ سکتے تھے کہ امور روحانیہ میں میں تیری فرمانبرداری کروں گا۔

اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ موسوی قوم میں سے جو لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کو پائیں ان کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطاعت فرض ہے۔ اور اسی طرف حدیث میں ان الفاظ میں اشارہ موجود ہے۔ کہ لَوْ کَانَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی حَیَّیْنِ لَمَا وَسِعَھُمَا اِلَّا اتِّبَاعِیْ۔ (ابن کثیر سورۃ آل عمران قولہ تعالیٰ و اذ اخذ اللہ میثاق) اگر موسیٰ اور عیسیٰ بھی زندہ ہوتے تو وہ بھی میری پیروی کرتے۔

قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِیْ فَلَا تَسْـَٔلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ حَتّٰٓی

اس نے کہا (کہ) اچھا اگر تو میرے ساتھ چلے تو تُو کسی چیز کے متعلق جب تک کہ میں اس کے متعلق تجھ سے ذکر کرنے

اُحْدِثَ لَکَ مِنْهُ ذِکْرًا ﴿۷۱﴾ ع

ع ۹/۲۱

میں پہل نہ کروں مجھ سے سوال مت کیجیو۔

حل لغات ۔ **اُحْدِثُ** اَحْدَثَهٗ کے معنے ہیں اِبْتَدَأَهٗ۔ اس کی ابتدا کی پہل کی (اقرب) پس حَتّٰٓی اُحْدِثَ کے معنے ہوں گے یہاں تک کہ میں پہل کروں۔

تفسیر ۔ یعنی اس عبد نے کہا۔ کہ بہت اچھا چلو میرے ساتھ مگر جب تک میں خود نہ بولوں تم نہ بولنا۔

یہ عجیب لطیفہ ہے۔ کہ موسیٰ سے پہلے سے اس قدر عہد لئے گئے۔ اور پھر بھی وہ پوچھتے چلے گئے۔ مگر محمد رسول اللہ صلعم کے اسراء میں ان سے جبریل نے کوئی عہد نہ لیا۔ مگر پھر بھی جب دنیا اور شیطان کے تمثیلی وجودوں کے کرنے کے موقعہ پر جبریل نے آپؐ کو سوال کرنے سے روکا تو آپؐ نے اس کی بات مان لی اور سوال نہ کیا (تفسیر ابن جریر سورۃ بنی اسرائیل)۔ حالانکہ آپ نے کوئی عہد نہ کیا تھا۔ اس سے بھی محمدی مقام اور موسوی مقام کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰۤى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ؕ

پھر وہ (دونوں وہاں سے) چل پڑے۔ یہاں تک کہ جب وہ کشتی میں سوار ہوئے۔ تو اس (خدا کے برگزیدہ) نے

قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ

اس میں شگاف کر دیا۔ اس نے کہا (کہ) کیا آپ نے اس لئے شگاف کیا ہے کہ آپ اس کے اندر (بیٹھ کر جانے)

شَيْئًا اِمْرًا ﴿۷۲﴾

والوں کو غرق کر دیں آپ نے یقیناً (یہ) ایک ناپسندیدہ کام کیا ہے

حلّ لُغات۔ **اِنْطَلَقَا** اِنْطَلَقَا اِنْطَلَقَ سے تثنیہ کا صیغہ ہے۔ اور اِنْطَلَقَ کے معنے ہیں۔ ذَھَبَ چلا گیا۔ (اقرب) پس اِنْطَلَقَا کے معنے ہوں گے وہ دونوں چل پڑے۔

خَرَقَهَا خَرَقَهَا خَرَقَ الثَّوبَ کے معنے ہیں مَزَّقَهٗ کپڑے کو پھاڑ دیا۔ (اقرب) اَلْخَرْقُ: قَطْعُ الشَّیْءِ عَلٰی سَبِیْلِ الْفَسَادِ مِنْ غَیْرِ تَدَبُّرٍ وَلَا تَفَکُّرٍ۔ کسی چیز کو خراب کرنے کے لئے۔ بغیر سوچے سمجھے کاٹ دینا۔ (مفردات)

اِمْرًا اَلْاِمْرُ کے معنے ہیں اَلْعَجِیْبُ۔ عجیب۔ اَلْمُنْکَرُ۔ اوپرا۔ ناپسندیدہ۔ (اقرب)

تفسیر۔ آنحضرت کے اسراء اور موسیٰ کے اسراء میں فرق اس مقام سے حضرت موسیٰ کے اسراء کا اصل واقعہ شروع ہوتا ہے۔ اور امت محمدیہ اور امت موسویہ کے حالات کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

استاذی المکرم حضرت مولوی نورالدین صاحب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسراء اور حضرت موسیٰ کے اسراء میں یہ فرق ہے کہ رسول کریم صلعم نے سوال سے پرہیز کیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام نے صبر نہ کیا۔ اس سے بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کی امت صبر سے دین پر قائم رہے گی۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت بے صبری کر کے دین کو چھوڑ بیٹھے گی۔ یہ ایک لطیف نکتہ ہے اور واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ اسی طرح آپ فرماتے تھے کہ آنحضرت صلعم کے اسراء میں بھی تین واقعات دکھائے گئے تھے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسراء میں بھی تین ہی واقعات دکھائے گئے ہیں۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس پر مزید علم یہ بخشا ہے۔ کہ صرف تین

واقعات میں ہی مشابہت نہیں بلکہ دونوں کے اسراء میں جو واقعات دکھائے گئے ہیں ۔ان کی تعبیر بھی وہی ہے ۔ اور صرف تمثیلی زبان میں فرق ہے ورنہ حقیقت ایک ہی ہے ۔اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا کیونکہ موسوی اسراء میں محمدی ظہور کی خبر دی گئی تھی ۔پس ضروری تھا کہ محمدی اسراء کے واقعات کی طرف اشارہ کیا جاتا ۔

مجھے یاد نہیں کہ حضرت مولوی صاحب سفینہ کے کیا معنے کیا کرتے تھے ۔میں جو اس کے معنے کرتا ہوں وہ مال کے ہیں ۔علم تعبیر الرؤیا میں سفینہ کی بہت سی تعبیریں لکھی ہیں ۔اور ان میں سے ایک تعبیر مال ہے (تعطیر الانام زیر لفظ سفینۃ) میرے نزدیک اس کشف میں یہی تعبیر مراد ہے اور قرآن کریم بھی اسی کی تصدیق کرتا ہے کیونکہ قرآن کریم میں آتا ہے رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۔ (بنی اسرائیل :۶۷) یعنی تمہارا رب وہ ہے جس نے تمہارے لئے سمندر میں کشتیاں چلائی ہیں تاکہ تم اللہ کے فضل کو یعنی مال ودولت کو حاصل کرو ۔وہ تم پر بہت مہربان ہے ۔پس میرے نزدیک سفینہ سے مراد دنیاوی مال ہیں ۔ اور کشتی میں دونوں کے سوار ہونے سے مراد یہ ہے کہ دونوں کی امتوں پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ انہیں دنیوی مال بافراغت ملے گا ۔

آگے لکھا ہے جب وہ دونوں کشتی میں سوار ہوئے تو اس ساتھی نے کشتی کو پھاڑ دیا ۔خَرَقَ الثَّوْبَ کے معنے ہوتے ہیں اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ۔خَرَقَهَا کے معنے ہوئے ۔اس کے تختے نکال کر کشتی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ۔اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یا دوسرے لفظوں میں ان کی قوم نے اعتراض کیا کہ کیا تیرا منشاء یہ ہے کہ کشتی کے سوار غرق ہو جائیں ۔تو نے یہ بہت بُرا کام کیا ہے ۔

خرق سفینہ سے مراد میرے نزدیک خرق سفینہ سے مراد یہ ہے ۔کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کی دنیا کو بہت سے شرعی احکام سے چھید ڈالا ہے ۔مثلاً اول زکوٰۃ کا حکم دیا ہے ۔جس سے مال کم ہوتا ہے پھر صدقات کا حکم دیا ہے پھر سود سے منع کر کے دولت کو نقصان پہنچایا ہے ۔پھر ورثہ کا حکم دے کر مال کو تقسیم کر دیا ہے ۔ اور دولت کو بڑھنے سے روک دیا ہے ۔گویا دنیاداروں کی نگاہوں میں اپنی قوم کی دنیاوی زندگی تباہ کر دی ہے اور نیکو کاروں کی نگہ میں قوم کو دنیا کی محبت کے بد اثرات سے اور قوم کو امراء کی غلامی سے بچا لیا ہے ۔یہ تعلیم موسوی سلسلہ کے لوگوں پر سخت گراں گزرتی ہے یہود پر بھی اور نصاریٰ پر بھی ۔کیونکہ گو نصاریٰ منہ سے تو یہی کہتے ہیں کہ سوئی کے ناکہ میں اونٹ کا گزر جانا آسان ہے لیکن دولت مند کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا بہت مشکل ہے (مرقس باب ۱۰ آیت ۲۵) لیکن عمل ان کا یہ ہے کہ ان کے ممالک کے سب قوانین دولت مندوں کے اموال بڑھانے میں مد ہیں ۔

زکوٰۃ کا کوئی حکم ان میں نہیں۔ سود کی کھلی اجازت ہے جوئے کی اجازت ہے جائیداد کو بہت سے ورثاء میں تقسیم کرنے کا کوئی حکم نہیں۔ بہت سے امراء اپنے بڑے بیٹوں کو دولت سپرد کر کے خاندان کی دولت کو بڑھاتے جاتے ہیں۔ اسی طرح ان کی شریعت میں مزدوروں کے حقوق کی حفاظت نہیں۔ حالانکہ اسلام نے اس کے لئے بھی قواعد مقرر کئے ہیں تا کہ چند امراء غرباء کو غلام بنا کر اپنے اموال نہ بڑھاتے رہیں۔ ان امتیازات کی وجہ سے یہود اور نصاریٰ اسلام میں داخل ہونے سے کتراتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسلام نے قوم کو غرق کرنے کی راہ کھول دی ہے۔

جس طرح یہ پہلا سبق ہے۔ جو اسراء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملا ہے بالکل اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسراء کے دن پہلے ایک بڑھیا دکھائی گئی۔ اور اس کے بعد جب پیالے پیش ہوئے تو ان میں سے پہلا پیالہ پانی کا تھا۔ اور حضرت جبریل نے عورت کی بھی یہی تعبیر کی۔ کہ یہ بڑھیا دنیا تھی اور پانی کی بھی یہی تعبیر کی۔ کہ یہ مال تھا۔ کیونکہ انہوں نے کہا کہ اگر تُو پانی پی لیتا تو تو بھی غرق ہو جاتا اور تیری امت بھی غرق ہو جاتی۔ یعنی دنیا کے کاموں میں منہمک ہو جاتی اور اللہ تعالیٰ سے تعلق کمزور پڑ جاتا۔

آنحضرتؐ کی قوم اور موسیٰ کی قوم کے خیالات میں فرق دیکھو حضرت موسیٰ کی قوم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خیالات میں کتنا فرق ہے۔ رسول کریم صلعم کو تو جبریل یہ کہتا ہے کہ اگر تو پانی پی لیتا تو تیری قوم غرق ہو جاتی۔ گویا وہ بے عیب سفینہ کو یعنی دنیاوی زندگی کو غرق ہونا قرار دیتے ہیں۔ لیکن حضرت موسیٰ یا دوسرے لفظوں میں ان کی قوم ٹوٹی ہوئی سفینہ کا یعنی زکوٰۃ وغیرہ قواعد سے دنیاوی اموال کے چند ہاتھوں میں جمع ہو جانے کو روکنے کا نام قوم کا غرق ہونا رکھتے ہیں۔ جہاں اس قدر اختلاف آراء ہو وہاں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کس طرح ہو سکتا ہے۔ اور ایک فریق دوسرے کی معیت پر کب تک صبر کر سکتا ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس کشف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عبداللہ پر اعتراض کیا ہے کہ کشتی کے پیندے میں سوراخ کیوں کیا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ کی قوم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کیا ہے کہ چندے وغیرہ لے کر قوم کو تباہ کیوں کرتے ہو۔ چنانچہ قرآن کریم میں یہود کا یہ اعتراض ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ (المائدۃ:۶۵) یعنی یہود چندوں وغیرہ کے مطالبات کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ خوامخواہ انہوں نے قوم پر بوجھ ڈال دیا ہے۔ کیا خدا تعالیٰ کے خزانوں میں کمی ہے کہ ہمارے محدود اموال کو وہ خرچ کرائے گا جس کو اس نے دینا ہو گا خود دے دے گا۔ دوسرے لوگوں سے غرباء کی خدمت کیوں کروائی جاتی ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہ کشتی والوں کی کشتی کو کیوں چھیدا جاتا ہے۔ اسی طرح عام کفار کے متعلق بھی قرآن میں آتا ہے۔ اور ان میں یہود و نصاریٰ سب

ہی شامل ہیں کہ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (یٰس : ۴۸) یعنی جب لوگوں کو محمد رسول اللہ یہ تعلیم دیتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو تم کو مال دیا ہے وہ صرف تمہارے لئے نہیں ہے سب دنیا کے لئے ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ کے غریب بندوں پر خرچ کرو۔ تو وہ آگے سے مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ کیا خدا تعالیٰ خود ان کو نہیں کھلا سکتا۔ پھر جب خدا نے باوجود بڑے خزانوں کے ان کو نہیں کھلایا۔ تو ہم کس طرح ان کو اپنے اموال میں سے حصہ دیں۔ اور پھر یہ کہ کفار مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم تو بڑے ہی بے راہ ہو کہ اس طرح اپنے اموال کو تباہ کرتے ہو۔ پس یہ اعتراضات اسلام کی تعلیم پر یہود اور دوسرے کفار کی طرف سے بکثرت ہوتے رہے ہیں اور آج تک ہو رہے ہیں۔ لیکن خدا کا عاشق ٹوٹی ہوئی کشتی میں ہی اس دنیا کا سفر کرنا زیادہ پسند کرتا ہے بہ نسبت اس سلامت کشتی کے جو اس کے دل سے خدا تعالیٰ کی یاد کو بھلا دے۔

نصاریٰ کے لئے مالی قربانی ابتلاء نصاریٰ کے لئے یہ ابتلاء سب سے زیادہ ہے کیونکہ وہ زیادہ مالدار ہیں۔ اس آیت سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ کشف ہے ورنہ جب کشتی میں چھید کیا تھا تو کشتی غرق کیوں نہ ہو جاتی۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا ﴿۷۳﴾

اس (برگزیدہِ خدا) نے کہا۔ (کہ) کیا میں نے (تجھے) کہا نہیں تھا (کہ) تو میرے ساتھ رہ کر ہرگز صبر نہیں کر سکے گا۔

تفسیر۔ یعنی میں نے تو پہلے سے ہی کہہ دیا تھا کہ میری تعلیم اور تمہاری تعلیم میں زمین و آسمان کا فرق ہے تم لوگ میرے ساتھ سفر نہیں کر سکتے جب تک اپنے نفوس کو بالکل مار نہ دو۔

قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ

اس نے کہا (کہ اس دفعہ) آپ مجھ پر گرفت نہ کریں کیونکہ میں (آپ کی ہدایت کو) بھول گیا تھا اور آپ میری

اَمْرِيْ عُسْرًا ﴿۷۴﴾

(اس) بات کی وجہ سے مجھ پر سختی نہ کریں۔

حلّ لُغَات ۔تُرْهِقْنِيْ اَرْهَقَهٗ عُسْرًا کے معنے ہیں كَلَّفَهٗ اِيَّاهُ۔اس پر سختی کی ۔(اقرب) پس لَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا کے معنے ہوں گے کہ آپ مجھ پر میری بات کی وجہ سے سختی نہ کریں۔(اقرب)

تفسیر ۔یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اچھا اس دفعہ معاف کرو۔ پھر ایسی بات نہ کروں گا۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ شروع شروع میں یہود و نصاریٰ محمد رسول اللہ صلعم سے صلح کریں گے مگر بعد میں اعتراضات شروع کر دیں گے اور آخر قطع تعلق ہو جائے گا۔ چنانچہ جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو پہلے یہود نے آپ سے صلح کی اور آپ کی پارٹی میں شامل ہوئے۔ مگر جب ان قربانیوں کو دیکھا جو آپ کے ساتھ مل کر کرنی پڑی تھیں تو جھگڑا شروع کر دیا چنانچہ بنوقینقاع نے آپ سے اس بات پر اختلاف کیا کہ ایک تاوان جو بعض مسلمانوں پر پڑا تھا اور جس میں حصہ لینا معاہدہ کے رو سے یہود پر بھی فرض تھا۔ اس میں حصہ لینے کے لئے یہود کو کیوں کہا جاتا ہے (السیرۃ الحلبیۃ غزوۃ بنی النضیر)۔

نصاریٰ کا بھی یہی حال تھا۔ شروع شروع میں وہ مسلمانوں سے اچھے تعلقات رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ آپؐ نے جب بادشاہوں کو خطوط لکھے تو قیصر نے شروع میں آپؐ کی تعریف کی (بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی)۔ لیکن بعد میں جب دیکھا کہ اسلامی سیاست مسیحی سیاست سے ٹکراتی ہے تو اسلام سے جنگ شروع کر دی۔ جس کا خمیازہ اس نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایسا بھگتا کہ صدیوں تک اس کا اثر نہ مٹا۔

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ

پھر وہ (دونوں وہاں سے) چل پڑے یہاں تک کہ وہ جب ایک لڑکے کو ملے تو اس (خدا کے بندہ) نے اسے مار ڈالا۔

نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ۭ لَقَدْ جِئْتَ

(اس پر) اس نے (یعنی موسیٰ نے) کہا (کہ) کیا (یہ سچ نہیں کہ) آپ نے (اس وقت) ایک پاکباز (اور بے گناہ)

شَيْـًٔا نُّكْرًا ﴿۷۵﴾

شخص کو کسی (کے خون) کے عوض کے بدوں (ناحق ہی) مار ڈالا ہے۔ آپ نے یقیناً (یہ) بہت برا کام کیا ہے۔

حلّ لغات ۔ نُكْرًا اَلنُّكْرُ : اَلْمُنْكَرُ ۔ ناپسندیدہ بات ۔ اَلْاَمْرُ الشَّدِيْدُ۔ مشکل کام ۔ اَلْقَبِيْحُ برا۔ (اقرب)

زَكِيَّةً۔ یہ زَكیٰ (يَزْكُوْ) سے فعیل کے وزن پر ہے۔ اور زَكَى الشَّيْءُ کے معنی ہیں ۔ نَمَا ۔ اس چیز نے نشوونما پائی ۔ زَكَى الرَّجُلُ۔ صَلُحَ وہ نیک و پاک ہو گیا۔ تَنَعَّمَ وَكَانَ فِيْ خِصْبٍ۔ خوب ناز و نعمت اور آسودگی میں ہو گیا۔ بیضاوی نے غُلَامًا زَكِيًّا کے معنے طَاهِرًا مِنَ الذُّنُوْبِ نَامِيًا عَلَى الْخَيْرِ کے کئے ہیں یعنے گناہوں سے پاک اور نیکی میں نشوونما پانے والا لڑکا۔ (اقرب)

تفسیر ۔ اس موقعہ پر بھی حضرت استاذی المکرم یہ توجہ دلاتے تھے کہ اسراء کی حدیث میں آنحضرت صلعم کو جب جبریل بار بار اِنْطَلِقْ اِنْطَلِقْ کا لفظ کہتے تھے (خصائص الکبریٰ جلد ا صفحہ ۱۵۴، ۱۵۵) موسیٰ کے واقعہ میں بھی اِنْطَلَقَ کا لفظ بار بار آیا ہے۔ پس یہ بھی دلیل ہے کہ یہ اسراء روحانی تھا۔

قتل سے مراد حضرت خلیفہ اول کے نزدیک حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ۔ جب ایک نوجوان کو ملے تو اسے اس ساتھی نے قتل کر دیا۔ حضرت استاذی المکرم فرماتے تھے ۔ اس جگہ ان اعتراضوں کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ جو موسوی امت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کرنے والی تھی ۔ کہ کعب بن اشرف وغیرہ کو انہوں نے کیوں قتل کروایا ہے اور اس کا جواب دیا ہے۔ میرے نزدیک یہ نظارہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے نظارہ کے مشابہ ہے اور اسی کے ہم معنی ہے ۔ رسول کریم صلعم نے واقعہ اسراء میں بڑھیا کے دیکھنے کے بعد دیکھا تھا کہ کوئی شخص آپؐ کو اپنی طرف بلاتا ہے مگر آپ نے اسے جواب نہ دیا۔ نیز اس نظارہ کی تشریح کے لئے آپ کے سامنے شراب کا پیالہ پیش کیا گیا۔ جس کے پینے سے آپؐ نے انکار کر دیا۔ اور جبریل نے اس آدمی کی تعبیر شیطان کی ۔ اور اس پیالہ کی تعبیر غوایۃ۔ جو شیطان کا کام ہے۔ اسی طرح دوسرا نظارہ حضرت موسیٰ کو غلام کا دکھایا گیا ہے ۔ جس کو محمدی

جمال نے قتل کر دیا۔

نوجوان کو خواب میں دیکھنے کی تعبیر اب ہم علم تعبیر رؤیا میں نوجوان آدمی کو خواب میں دیکھنے کی تعبیر دیکھتے ہیں۔ تو علاوہ اور تعبیروں کے ایک تعبیر یہ لکھی ہے ''تَدُلُّ عَلَى الْحَرَكَةِ وَالْقُوَّةِ وَالْجَهْلِ (تعطیر الانام زیر لفظ الشاب) یعنی خواب میں نوجوان مرد کو دیکھے تو اس کے معنے قوت نشاط اور جہالت کے ہوتے ہیں اور یہی امور انسان کو شیطان کے پیچھے چلانے والے ہوتے ہیں۔ یعنی ایک طرف طاقت ہو۔ دوسری طرف سیر تماشے دیکھنے کی خواہش ہو۔ اور تیسری طرف علم روحانی سے ناواقفیت ہو۔ یہ تین چیزیں جب جمع ہو جاتی ہیں تو انسان شیطان کے پیچھے چل پڑتا ہے۔ پس یہ دونوں نظارے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰؑ کے اسراء میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔

مسیحیوں کے نزدیک اسلام انسانی جذبات کا خون کرتا ہے اور یہ جو دکھایا گیا کہ اس عبد نے اس غلام کو مار دیا۔ اور اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کیا اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کی دوسری تعلیم جو نصاریٰ کے لئے قابل اعتراض ہوگی وہ اسلام کا لغو امور اور لہو ولعب اور شراب سے روکنا ہوگا۔ اس پر موسوی سلسلہ کے لوگ (یعنی خصوصاً مسیحی۔ کیونکہ میں بتا چکا ہوں کہ دوسرا ساتھی جو حضرت موسیٰ نے دیکھا ہے وہ حضرت مسیح ہیں۔ اور مجمع البحرین کے پاس حضرت موسیٰؑ کی وہی امت باقی تھی جو حضرت مسیح ناصری کے ذریعہ سے آپ کو ملی تھی۔ ہاں دوسرے درجہ پر یہود بھی اس میں شامل ہیں) یہ اعتراض کریں گے کہ اسلام جوانی کو مارتا ہے اور انسان کو زندگی کا لطف لینے نہیں دیتا۔ اور یہ ظلم ہے اللہ تعالیٰ نے یہ طاقتیں زندگی کا مزہ لینے کے لئے دی ہیں نہ اس لئے کہ ان کو تباہ کر دیا جائے۔ چنانچہ غور کر کے دیکھ لو کہ ان شیطانی اعمال کی وجہ سے بالعموم مسیحی لوگ اسلام سے متنفر ہیں کیونکہ اس میں انہیں ان شیطانی افعال سے روکا گیا ہے اور ان کے نزدیک گویا جوانی کا اسلام نے خون کر دیا ہے۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝۷۶

اس (خدا کے پیارے) نے کہا (کہ) کیا میں نے تجھے کہا نہیں تھا (کہ) تو میرے ساتھ رہ کر ہرگز صبر نہیں کر سکے گا۔

تفسیر ۔ یہ آیت بھی ثبوت ہے اس کا کہ یہ کشف ہے کیونکہ جاگتے ہوئے کسی کو بلاوجہ قتل کر دینا قطعاً حرام ہے۔

قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَیْءٍۭ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِیْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّیْ عُذْرًا ﴿۷۷﴾

اس نے کہا (کہ) اگر اس کے بعد میں نے کسی بات کے متعلق آپ سے پوچھا تو (بیشک) آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھئے گا (اس صورت میں) آپ یقیناً میری طرف سے معذور سمجھے جانے کی حد تک پہنچ چکے ہوں گے۔

تفسیر ۔یعنی اب کی دفعہ جانے دو اور تعلق نہ توڑو۔ پھر ایسا ہی کیا تو تعلق توڑ دینا۔ اس میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ بار بار مسلمانوں سے معاہدات کریں گے لیکن پھر ان کو توڑ دیں گے اور وہ عداوت جو انہیں اسلام سے ہے ان پر غالب آ جائے گی۔

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَتَیَاۤ اَهْلَ قَرْیَةِ ِۨ اسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ یُّضَیِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِیْهَا جِدَارًا یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَیْهِ اَجْرًا ﴿۷۸﴾

پھر وہ (وہاں سے بھی) چل پڑے یہاں تک کہ جب وہ ایک بستی کے لوگوں کے پاس پہنچے تو اس (بستی) کے باشندوں سے انہوں نے کھانا مانگا مگر انہوں نے انہیں (اپنے) مہمان بنانے سے انکار کر دیا پھر انہوں نے اس (بستی) میں ایک ایسی دیوار پائی جو گرنے کو تھی۔ اس (خدا کے بندہ) نے اسے درست کر دیا (اس پر) اس نے (یعنی موسیٰ نے) کہا (کہ) اگر آپ چاہتے تو یقیناً اس کی کچھ (نہ کچھ) اجرت لے سکتے تھے۔

تفسیر ۔اہل قریہ کے ضیافت سے انکار کی تعبیر اَهْلَ قَرْیَةٍ سے مراد قوم ہے کیونکہ قوم کو جب دکھایا جاتا ہے گاؤں کی شکل میں دکھایا جاتا ہے اور ضیافت کی تعبیر تعاون ہوتی ہے لکھا ہے ضَیَافَةٌ خواب میں

اِجۡتِمَاعٌ عَلٰی خَیۡرٍ کے معنے رکھتی ہے۔(تعطیر الانام زیر لفظ الضیافة)یعنی کسی نیک کام میں باہم تعاون کرنے کا فیصلہ ضیافت کی شکل میں دکھایا جاتا ہے پس ''دونوں نے کھانا مانگا'' کی تعبیر یہ ہوگی کہ دونوں نے تعاون کی درخواست کی۔ اور ضیافت کے انکار کے معنے ہوں گے کہ قوم نے دونوں کے سوال کے جواب میں تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔

دیوار بنانے کی تعبیر اور اس سے استدلال اس کے بعد لکھا ہے کہ انہوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرنے کو تھی۔ تعطیر الانام میں لکھا ہے کہ جب کوئی دیوار دیکھے جس میں خرابی ہوگئی ہو تو اس سے مراد کوئی عالم یا امام ہوتا ہے جس کا مال جاتا رہتا ہے۔ پھر اگر یہ دیکھے کہ اس کی مرمت کر دی گئی ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اس عالم کے کام کو درست کر دیا جائے گا۔اور اگر دیکھے کہ مرمت نہیں کی گئی تو اس کا کام تباہ ہو جائے گا اور نیز امام ابن سیرین کے تعبیر نامہ میں لکھا ہے کہ دیوار کے کچھ حصہ میں خرابی دیکھ کر اسے درست کرنے کی تعبیر اس جگہ کے والی کی بجائے دوسرے والی کا مقرر ہونا ہوتا ہے(زیر لفظ حائط)۔

ان تعبیروں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سارے نظارہ کا یہ مطلب ہوگا کہ حضرت موسیٰؑ اور وہ اللہ کا بندہ جس کے ساتھ وہ چلے تھے ایک جماعت سے تعاون چاہیں گے مگر وہ تعاون نہ کرے گی۔اور وہ کسی بزرگ کے کام کو خراب ہوتا دیکھیں گے۔اس پر موسیٰ علیہ السلام تو خاموش رہیں گے لیکن وہ عبداللہ اس کام کو درست کر دے گا یا یہ کہ اس قوم کے لئے دوسرا حاکم مقرر ہو جائے گا موسیٰ علیہ السلام اس امر کو دیکھ کر کہیں گے کہ اس پر کوئی اجر لیتے تو اچھا ہوتا مگر وہ اس بات کو سن کر ناراض ہو جائے گا اور کہے گا کہ بس اب ہمارا تمہارا تعلق ختم ہے۔

اس حصہ کی تعبیر حضرت استاذی المکرم مولوی نورالدین صاحب یہ فرمایا کرتے تھے کہ یا تو اوس اور خزرج مراد ہیں کہ دیر سے یہ قومیں ترقی سے محروم تھیں۔اللہ تعالیٰ رسول کریم صلعم کو مدینہ لے گیا۔اور ان کے لئے بھی ترقی کی راہیں کھل گئیں یا فرماتے تھے کہ مراد حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحاق کی اولاد ہے کہ ان کا کام خراب ہو رہا تھا ایک کے حق کی حفاظت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کر دی۔اور دوسرے کے حق کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

میری رائے میں اس نظارے کا پہلا حصہ بتاتا ہے کہ قریہ سے مراد عالم یہودیت اور نصرانیت ہے۔جب اس سے تعاون کی درخواست کی گئی تو اس نے انکار کر دیا۔اور دیوار سے یہود ونصاریٰ کے بزرگ مراد ہیں۔اور اس کے گرنے کے قریب پہنچنے سے مراد ان کے بزرگوں کا اثر زائل ہونا ہے اور مرمت کرنے کے یہ معنے ہیں کہ ان کی تعلیم کو پھر سے قائم کر دیا اور ان کے اندر ایک نیا والی یا حاکم مقرر کر دیا۔

اجرت نہ لینے پر اعتراض کرنے سے یہود کی تجارتی حرص کی طرف اشارہ ہے اور موسیٰ علیہ السلام نے جو کہا کہ اجر کیوں نہ لے لیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ موسوی قوم میں تجارتی حرص بہت بڑھ جائے گی اور وہ ہر اک کام کو اس کے دنیوی فائدہ کا اندازہ لگا کر کریں گے اور خالصۃً للہ کام کرنا ان کے لئے مشکل ہوگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ موسوی سلسلہ کی آخری کڑی یعنی مسیحیت کا یہ حال ہے کہ ان کی تعلیم بھی دنیوی اغراض سے ہوتی ہے۔ ان کی ہمدردی بھی دنیوی اغراض سے ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ تبلیغ کرتے ہیں تو اس میں بھی سیاسی اور دنیوی فوائد مدنظر ہوتے ہیں خالصۃً للہ کام جس میں کوئی دنیاوی خیال مدنظر نہ ہو۔ ان میں قریباً مفقود ہے۔

دعوت سے انکار میں یہود کے حضرت موسیٰ سے عدم تعاون کی طرف اشارہ ہے یہ جو فرمایا کہ اہل کتاب سے اپنے کاموں میں تعاون کی خواہش کی تو انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کی مثال حضرت موسیٰ کی زندگی میں تو یہ موجود ہے کہ جب وہ اپنی قوم کو کنعان کا ملک دیئے جانے کا وعدہ دے کر مصر سے لائے اور کئی چھوٹی اقوام سے جنگیں ہونے کے بعد ان کو اہل کنعان پر حملہ کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے حضرت موسیٰ کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کے جواب میں انہوں نے کہا۔ قَالُوْا یٰمُوْسٰٓی اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (المائدة: ۲۵) یعنی جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ دشمن پر حملہ کر کے موعود ملک کو لیا جائے تو انہوں نے جواب دیا کہ وعدہ یا خدا کا تھا یا تمہارا تھا ہم اس وعدہ کے پورا کرنے کے لئے کیوں اپنی جانیں گنوائیں۔ اے موسیٰ تم اور تمہارا خدا جا کر لڑو۔ اور اپنے وعدہ کو پورا کرو۔ ہم تو اپنی جگہ سے نہ ہلیں گے ہاں جب آپ دونوں اس ملک کو فتح کر لیں گے تو ہم بھی ملک میں داخل ہو جائیں گے اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے عین اس وقت جب اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہونے کو تھا ایک لغو عذر کی بناء پر حضرت موسیٰ ؑ سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے بعض وعدے اس کے بندوں کے ذریعہ سے پورے کرائے جاتے ہیں اور بندوں کا فرض ہوتا ہے کہ اس قسم کے وعدوں کے پورا کرانے میں انبیاء سے تعاون کریں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عدم تعاون کی مثال قرآن کریم نے یہ بیان فرمائی ہے قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (آل عمران: ۶۵) یعنے اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہود و نصاریٰ کو یہ دعوت دے کہ آؤ اپنی ضدیں چھوڑ کر ایک بات میں تو ہم سے مل کر کام کرو اور وہ یہ کہ ہم سب مل کر توحید کو قائم

کریں نہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی اَور کی عبادت کریں اور نہ عقیدۃً اس کا کسی کو شریک قرار دیں اور نہ ناواجب طور پر جتھا بندی کریں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق عدل اور انصاف سے دنیا میں کام کریں (گویا اللہ تعالیٰ اور بندوں سے صلح رکھنے کے بارہ میں اشتراک عمل کرنے کی ان سے درخواست کر) پھر فرماتا ہے کہ اگر یہ لوگ ایسی منصفانہ بات بھی نہ مانیں اور اس مشترک پروگرام پر عمل کرنے اور تعاون کرنے کے لئے تیار نہ ہوں تو اے مسلمانو! تم ہی ہمارے رسول کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ان یہود و نصاری سے کہہ دینا کہ جاؤ تم تعاون نہیں کرتے تو نہ کرو ہم اپنے خدا کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس کے رسولؐ سے تعاون کریں گے۔ اور عیسائیوں نے حضرت مسیح سے تعاون نہ کیا۔

عیسائیوں نے حضرت مسیح سے تعاون نہ کیا اگر غور سے دیکھا جائے تو مسیح کی قوم نے بھی ان سے تعاون نہیں کیا کیونکہ صلیب کے موقعہ پر سب لوگ حضرت مسیح کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔

قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَ بَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا

اس (خدا کے برگزیدہ) نے کہا (کہ) یہ میرے درمیان اور تمہارے درمیان جدائی (کا وقت) ہے۔ جس بات

لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۷۹﴾

پر تو صبر نہیں کر سکا میں ابھی تجھے اس کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہوں۔

تفسیر۔ یعنی عبداللہ نے جب یہ معاملہ دیکھا کہ برابر اعتراض ہوتے ہی چلے جاتے ہیں تو اس نے کہہ دیا کہ ہم آپس میں جدا ہوتے ہیں۔ اس میں اس طرف اشارہ کیا گیا کہ باوجود دعوتِ اشتراک اور توحید کے نقطہ پر جمع ہو جانے کی درخواست کے جب اہل کتاب باز نہ آئیں گے اور اپنے شرک کو نہ چھوڑیں گے تو محمد رسول اللہؐ یہود اور نصاریٰ سے قطع تعلق کر لیں گے اور آپس میں مقابلہ شروع ہو جائے گا۔

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ

کشتی تو چند مساکین کی تھی جو دریا میں کام کرتے ہیں اور ان کے سامنے (دریا پار)

فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَھَا وَ کَانَ وَرَآءَھُمْ مَّلِکٌ یَّاْخُذُ کُلَّ

ایک (ظالم) بادشاہ تھا جو ہر ایک کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔اس لئے میں

سَفِیْنَۃٍ غَصْبًا ﴿۸۰﴾

نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں ۔

تفسیر ۔اس آیت میں وہ تشریح بیان کی گئی ہے جو گزشتہ واقعات کی اس عبداللہ نے بیان کی ہے۔

بعض دفعہ خواب میں بتائی ہوئی تعبیر بھی تعبیر طلب ہوتی ہے اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیے کہ بعض دفعہ انسان خواب میں ہی تعبیر کرتا ہے کبھی وہ تعبیر واضح ہوتی ہے اور کبھی وہ جزئی انکشاف کرتی ہے اور یقظہ کی حالت میں پھر ایک دوسری تعبیر کی محتاج ہوتی ہے وہی معاملہ یہاں ہے جو تشریح عبداللہ نے کی ہے وہ کسی قدر اغلاق کو ضرور دور کرتی ہے مگر واضح تعبیر نہیں بلکہ اس امر کی محتاج ہے کہ مادی دنیا کے اصول کے مطابق اس کی دوبارہ تشریح کی جائے۔

سب سے پہلے عبداللہ نے سفینہ والا معاملہ لیا ہے اور اس کی تشریح یہ کرتے ہیں کہ یہ کشتی مسکینوں کی تھی جو اس سمندر میں کام کرتے تھے پس میں نے چاہا کہ میں اس کو عیب دار کر دوں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے پرے ایک اور بادشاہ ہے جو ہر درست کشتی کو جبراً چھین لیتا ہے پس اس بادشاہ کے ضرر سے بچانے کے لے میں نے کشتی کو توڑ دیا۔

مساکین کی تعبیر باقی سب امور کی تعبیر تو میں پہلے بتا آیا ہوں صرف مسکینوں اور بادشاہ کی تعبیر باقی ہے۔ سو مسکینوں کی تعبیر تو مسکین دل لوگ ہیں جن کو دنیا کے اموال اور ترقیاں غریبوں کی خبر گیری اور ان کی ہمدردی اور ان کے ساتھ مل کر رہنے سے نہیں روکتے۔

بادشاہ کی تعبیر اور بادشاہ سے مراد اس نظارہ میں دنیا پرستی کی روح ہے کیونکہ دنیوی بادشاہ دنیا کا ایک ظہور ہوتے ہیں اور چونکہ جبراً کشتیاں چھین لینے کا ذکر ہے اس لئے اس سے مراد دنیا کی محبت کی روح ہے اور مراد یہ ہے کہ جن کی دنیا میں دینی روح نہیں ہوتی اور جن کے مالوں کا کافی حصہ غرباء اور رفاہ عامہ کے کاموں کے لئے نہیں نکلتا۔ان کو دنیا کی محبت اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔اور ان کے مال شیطان کے قبضہ میں چلے جاتے ہیں۔اس لئے

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی امت کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی سفینہ میں سوراخ کر دیں یعنی ان کے مال دین کی خدمت اور بنی نوع انسان کی خدمت میں خرچ ہوتے رہیں تا کہ دنیا کی محبت ان کے دلوں پر قابو نہ پالے اور ان کے اموال خدا کے لئے ہونے کی بجائے ظالم دنیا کے لئے نہ ہو جائیں۔

آنحضرتؐ کو دنیا ایک عورت کی شکل میں دکھائے جانے میں حکمت اس جگہ یہ لطیفہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسراء میں دنیا ایک عورت کی شکل میں دکھائی گئی ہے۔لیکن موسیٰ علیہ السلام کو وہی دنیا ان کے اسراء میں ایک ظالم بادشاہ کی شکل میں دکھائی گئی ہے۔اس میں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا حملہ امت محمدیہ پر بہت کمزور ہوگا۔اور وہ ایک بڑھیا کی طاقت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کرے گی۔لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت پر اس کا حملہ شدید ہوگا اس لئے ان کی امت کو مدنظر رکھتے ہوئے دنیا انہیں ایک ظالم بادشاہ کی شکل میں دکھائی گئی۔

وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَیْنِ فَخَشِیْنَاۤ اَنْ

اور اس لڑکے (کے واقعہ کی حقیقت یہ ہے کہ اس) کے ماں باپ (دونوں) مومن تھے (اور وہ ایمان کا دشمن تھا) اس

یُّرْهِقَهُمَا طُغْیَانًا وَّ كُفْرًاۚ ﴿۸۱﴾

لئے ہم نے ناپسند کیا کہ وہ (اپنی) سرکشی اور کفر سے انہیں ایذا پہنچائے۔

تفسیر۔میں اوپر بتا آیا ہوں کہ غُلَامٌ کی تعبیر اَلْحَرَکَةِ وَالْقُوَّةِ وَالْجَهْلِ ہوتی ہے چنانچہ عبداللہ (یعنی اللہ کے بندے) نے جو تشریح فرمائی ہے وہ بھی اس کے مطابق ہے۔وہ کہتے ہیں کہ غلام دو نیک ماں باپ کا بچہ تھا۔ پس ہم ڈرے کہ اگر اسے زندہ رہنے دیا گیا تو وہ اپنے ماں باپ کے لئے سرکشی اور کفر کا موجب ہوگا۔

میں یہ تو بتا چکا ہوں کہ سرکش اولاد کو قتل کرنا بغیر کسی جرم کے ناجائز ہے پس یہ نظارہ بھی تعبیر طلب ہے اور جب کہ غلام کی تعبیر حرکت قوۃ اور جہالت کی ہے تو لازماً اس کے ماں باپ بھی اسی قسم کے ہونے چاہئیں کیونکہ حرکت قوت اور جہالت معنوی اشیاء ہیں مادی نہیں ہیں۔جب ہم دیکھتے ہیں کہ حرکت قوت اور جہالت کہاں سے پیدا ہوتی ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشیاء انسانی روح اور جسم سے پیدا ہوتی ہیں۔اللہ تعالیٰ نے روح اور جسم میں جوزوجین یعنی میاں اور بیوی کی حیثیت رکھتے ہیں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ مل کر انسان میں حرکت قوت اور جہالت یعنی

عواقب سے بے پرواہوکر کام کرنے کی طاقت پیدا کردیتے ہیں۔لیکن یہ تینوں چیزیں جہاں انسان کی کامیابی کے لئے ضروری ہیں وہاں ان کا حدود کے اندر رکھنا بھی ضروری ہے۔اگر ان کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو انسانی روح اور جسم طغیان اور کفر میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

کسی چیز کے جوش کو کم کردینا عربی زبان میں قتل کہلاتا ہے۔چنانچہ عربی کا محاورہ ہے قَتَلَ الشَّرابَ: مَزَّجَهٗ بِالْمَآءِ یعنی شراب میں پانی ملا کر اس کے جوش کو کم کردیا۔(اقرب)

قَتَلَ الْجُوْعَ وَالْبَرْدَ وَنَحْوَ ذَالِكَ: كَسَّرَ شِدَّتَهٗ یعنی جب قَتَلَ الْجُوْعَ وَالْبَرْدَ وغیرہ الفاظ بولیں تو مراد یہ ہوتی ہے کہ بھوک سردی وغیرہ کی تیزی کو کم کردیا (اقرب) قَتَلَ غَلِيْلَهٗ: سَقَاهُ فَزَالَ غَلِيْلُهٗ یعنے قَتَلَ غَلِيْلَهٗ کے معنے ہیں اسے پانی پلا کر پیاس کو بجھادیا۔(اقرب) غرض قتل کا لفظ صرف جاندار کے لئے ہی نہیں بولا جاتا۔بلکہ جذبات اور احساسات کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور اس سے مراد ان جذبات اور احساسات کی تیزی کو دور کرنا ہوتا ہے۔

عبداللہ کی تاویل کا مطلب پس عبداللہ کی تاویل کا یہ مطلب ہوا کہ حرکت قوت اور جہالت کے ماں باپ تو مومن ہیں یعنی ان میں احکام الٰہی کے ماننے کا مادہ ہے ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ اعمال کی قوت بخشی گئی ہے اور ان قوتوں کو عمل میں لانے کے لئے حرکت قوت اور جہالت کی طاقتیں ان میں سے پیدا کی گئی ہیں۔یعنی ایک تو روح اور دماغ انسانی میں آگے بڑھنے کا شدید مادہ ہے دوسرے بڑے بڑے کام کرنے کی طاقت ہے تیسرے بڑے بڑے خطرات برداشت کرنے کی ہمت ہے ان تینوں قوتوں سے جو روح اور جسم کے امتزاج سے انسان میں پیدا ہوتی ہیں وہ اپنی زندگی کے مقصد کو پورا کرسکتا ہے۔لیکن اگر ان قوتوں کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو یہی قوتیں انسانی روح اور انسانی جسم کو نافرمانی اور کفر کی طرف لے جاتی ہیں اور وہ ہلاک ہوجاتا ہے۔پس اللہ تعالیٰ نے پسند نہ فرمایا کہ انسانی روح اور انسانی جسم جیسے اعلیٰ اور کارآمد وجودوں کو طغیانی اور کفر میں مبتلا ہونے دے۔پس اس نے جلوۂ محمدی کے ذریعہ سے ان تین طاقتوں کو قتل کروادیا۔یعنی شریعت کے احکام کے ذریعہ سے ان کو سمو دیا اور ان کی شدت کو کم کردیا تاکہ اس کے بعد جو جذبات انسان میں کام کریں وہ نیکی کی قیود کے ماتحت اور اس کے حلقہ میں کام کریں۔

فَاَرَدْنَآ اَنْ یُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَیْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ﴿۸۲﴾

اس لئے ہم نے چاہا کہ ان کا رب انہیں پاکیزگی میں ان سے اچھا اور رحم (وشفقت) میں (اپنے ماں باپ سے) زیادہ قریب (لڑکا) بدل دے۔

تفسیر ۔یعنی یہ قیود اور پابندیاں اس لئے لگائی گئیں تا کہ انسان کے اندر آزاد جذبات کی بجائے پابند اخلاق جذبات پیدا ہوں گویا پہلے جذبات قتل ہو کر ایک نیا صالح بیٹا ان کو ملے جو انسان کا مطیع ہو اور بجائے اس کو کفر و طغیان کے گڑھے میں گرانے کے اس کو رحمت الٰہی کا مستحق بنائے۔

زَكٰوةً کے معنی زَكٰوةً کے معنے پاکیزگی اور ترقی کے ہوتے ہیں۔اور رحم کے معنے رقت اور تلطّف کے ہوتے ہیں (اقرب)۔پس معنے یہ ہوئے کہ جو نیا بیٹا ہوگا وہ ان کی ترقی اور پاکیزگی کا موجب اور ان کی باتیں ماننے والا اور ان کی اطاعت کرنے والا ہوگا یعنے جب آزاد قوائے انسانی کو شریعت کی تلوار سے قتل کر دیا جائے گا۔اور ان کی وحشیانہ آزادی کی شدت کو توڑ دیا جائے گا تو وہ ایسی شکل اختیار کر لیں گے کہ روح و جسم کی بات مانیں گے اور ان کی ترقی اور پاکیزگی کا موجب ہوں گے۔

مگر جیسا کہ بتایا جا چکا ہے موسوی قوم نے اس نکتہ کو نہ سمجھا اور عیش پرستی اور بے پردگی اور لہو و لعب میں مشغول ہو گئے۔جس کی وجہ سے ان کی حرکات میں تیزی ان کی قوتوں میں حدت اور ان کی بے باکانہ جرأت میں ایک شان تو ضرور نظر آتی ہے لیکن یہ طاقتیں انہیں طغیان و کفر میں بڑھا رہی ہیں اور نیکی اور تقویٰ سے دور کر رہی ہیں اور مذہب و عقل جو روح اور جسم کے نمائندے ہیں ان کی بات ماننے کے لئے جذبات تیار نہیں ہوتے۔

وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَیْنِ یَتِیْمَیْنِ فِی الْمَدِیْنَةِ وَ كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ

اور وہ دیوار اس شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اس کے نیچے ان کا کچھ خزانہ (گڑا ہوا) تھا۔اور ان کا باپ نیک (اور مناسب حال کام کرنے والا) تھا۔اس لئے تیرے رب نے چاہا۔کہ وہ اپنی مضبوطی کی عمر کو پہنچ جائیں

رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا وَ يَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً

اور (بڑے ہوکر) اپنا خزانہ (خود) نکالیں۔ تیرے رب کی طرف سے (ان پر خاص) رحم (ہوا) ہے اور

مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ؕ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا

یہ (کام) میں نے اپنے نفس کے حکم سے نہیں کیا۔ یہ اس بات کی حقیقت ہے

لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۸۳﴾

جس پر تو صبر نہیں کر سکا۔

حلّ لُغَات۔ الکنز اَلْکَنْزُ کے معنے ہیں اَلْمَالُ الْمَدْفُوْنُ فِی الْاَرْضِ۔ دفینہ۔ وَقِیْلَ اِسْمٌ لِلْمَالِ اِذَا اُحْرِزَ فِیْ وِعَاءٍ اور بعض اس مال کو کہتے ہیں جو تھیلے وغیرہ میں محفوظ رکھا جائے۔ اَلذَّھَبُ۔ سونا۔ اَلْفِضَّۃُ۔ چاندی۔ (اقرب)

تاویل تَأْوِیْلٌ کے معنوں کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۴۰۔

اَلتَّأْوِیْلُ: اَلظَّنُّ بِالْمُرَادِ۔ کسی کلام کے مطلب و مدعا کی نسبت ظن غالب بَیَانُ اَحَدِ مُحْتَمَلَاتِ اللَّفْظِ کسی لفظ کے کئی احتمالی معانی میں سے کسی ایک کی تعیین کرنا۔ اَلْعَاقِبَۃُ انجام۔ اَوَّلُ الشَّیْءَ: رَجَّعَہٗ لوٹایا۔ اَلْکَلَامَ دَبَّرَہٗ وَ قَدَّرَہٗ وَ فَسَّرَہٗ تدبر کیا اور اس کا صحیح مطلب نکالا۔ الرُّؤْیَا: عَبَّرَھَا تعبیر کی۔ (اقرب)

تفسیر۔ یعنی اب ایک سوال حل طلب رہ گیا ہے جس میں ہمارا تمہارا اختلاف ہے اور وہ یہ کہ تم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ بغیر کسی ذاتی غرض کے ہم نے ایک گرتی ہوئی دیوار کس طرح بنادی۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دیوار ایک خزانہ کی محافظ تھی اور یہ خزانہ دو یتیموں کا تھا جن کا باپ صالح تھا۔

پرانی دیوار سے مراد یہود و نصاریٰ کے بزرگ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں دیوار سے مراد یہود و نصاریٰ کے بزرگ ہیں یعنی خود موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام اور ان کے باپ حضرت ابراہیمؑ ہیں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ (النحل: ۱۲۳) اور کنز سے مراد وہ علمی خزانہ ہے جسے موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی تعلیم نے محفوظ کیا ہوا تھا۔ مگر یہود و نصاریٰ کی بے توجہی اور دین سے دوری کی وجہ سے موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کا تصرف جو ان خزانوں کی حفاظت کے لئے کام کر رہا تھا کمزور پڑ گیا تھا۔ محمد رسول اللہ صلعم نے پھر اس دیوار کو بنا دیا یعنی ایک نئے

قانون کے ذریعہ سے ان صداقتوں کو جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی تعلیم میں پائی جاتی تھیں محفوظ کر دیا یعنی جو سچائیاں ان میں تھیں خصوصاً وہ پیشگوئیاں جو اسلام اور محمد رسول اللہ صلعم کے ظہور کے متعلق تھیں ان کو قرآن کریم میں محفوظ کر دیا گیا تا کہ جب کبھی یہود و نصاریٰ کو عقل آئے وہ اپنے بزرگوں کی پیشگوئیوں سے ہدایت پا کر محمد رسول اللہ صلعم پر ایمان لا کر اپنی حالت درست کر سکیں۔

رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ۔ یعنی یہ سب کام اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہوا ہے۔ باوجود یہود و نصاریٰ کی سرکشیوں کے اللہ تعالیٰ نے ان کو چھوڑنا پسند نہیں کیا۔ چنانچہ قرآن کریم کے اندر ان خزانوں کو جو محفوظ رکھنے کے قابل ہیں جمع کر دیا گیا ہے تا کہ جب بھی یہود و نصاریٰ کو توجہ ہو اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

نئی دیوار سے مراد قرآنی تعلیم ہے وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ دیوار جو نئی بنائی گئی تھی قرآنی دیوار ہے اور قرآن کریم میں (جو خالصۃً اللہ تعالیٰ کے امر سے ہے میرا اس میں کوئی دخل نہیں جیسا کہ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی (النجم: ۴) میں فرمایا گیا ہے) وہ خزانہ جمع کر دیا گیا ہے۔ پھر اس عبداللہ کی زبانی یہ کہلوایا گیا ہے کہ اے موسیٰ یہ وہ حقیقت ہے جس کے متعلق تم صبر نہیں کر سکے۔

اسراء میں آنحضرتؐ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰ کے آنے کی وجہ

یہ آخری حصہ موسیٰ علیہ السلام کے کشف کا بھی رسول کریم صلعم کے اسراء کے مشابہ ہے کیونکہ آپؐ کے کشف کا آخری حصہ یہ تھا کہ آپ کو حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام نے سلام کیا جس کے یہ معنے ہیں۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کے کشف کے سب سے آخری نظارہ میں جو خدمت اولاد ابراہیمؑ اور امت موسیٰؑ اور اَتباع عیسیٰ کی آپؐ نے سرانجام دی تھی اس کا انکشاف چونکہ ان پر ہو گیا وہ آپ کے بیت المقدس تشریف لے جانے کے موقعہ پر اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے آگے آئے بیشک موسیٰؑ نے اپنے کشف میں اس کی حقیقت کو پوری طرح نہ سمجھا اور اس پر اعتراض کر دیا۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے ان پر حقیقت کھول دی تو نہ صرف وہ بلکہ ابراہیم اور عیسیٰ علیہما السلام بھی اظہار امتنان کے لئے رسول کریم صلعم کو ملے۔ ابراہیم اس لئے کہ ان کی دونوں اولادوں اسماعیل اور اسحاق کی نجات کے لئے آپ نے کوشش کی اور ایک نسل کی نجات کے لئے آپؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی اور دوسری نسل کی نجات کے لئے آپؐ کی قوم اصلی بیت المقدس کی طرف بڑھی۔ اور موسیٰ علیہ السلام جنہوں نے بغیر مزدوروں کے دیوار بنانے پر اعتراض کیا تھا یہ معلوم کر کے کہ یہ دیوار تو وہ خود تھے اور اس کے نیچے کا خزانہ انہی کی تعلیم تھی جسے آنحضرت صلعم نے محفوظ کیا اپنے اعتراض کا کفارہ ادا کرنے کے لئے حضرت مسیح کو ساتھ لے کر جو آنحضرت صلعم کے آپؐ سے کم

ممنون نہ تھے استقبال کے لئے آئے جس کے یہ معنی تھے کہ ہم نے پہلے آپ کی اس خدمت کو برا سمجھا تھا مگر اب اللہ تعالیٰ نے ہم پر حقیقت کھول دی ہے اس لئے اے محمدؐ آپ پر سلام ہو آیئے ہمارے گھروں کو برکت دیجئے۔ اور ہماری امتوں کو نجات دلایئے۔ اب دیکھو کہ یہ مضمون جو علم تعبیر الرویا سے نکلتا ہے یہ تو ایسا ضروری ہے کہ اس کے لئے رسول کریم صلعم فرماتے کہ کاش موسیٰ علیہ السلام خاموش رہتے تو امت محمدیہ اور میرے کاموں کی کچھ اور تفصیل ہمیں ان کے اسراء سے معلوم ہو جاتی (بخاری کتاب التفسیر سورۃ الکھف قولہ تعالیٰ واذقال موسیٰ۔۔۔) مگر کون عقلمند کہہ سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم نے یہ فرمایا کہ یہ سینما کچھ دیر اور ہوتا تو ہم بھی کشتیوں کے ٹوٹنے نوجوانوں کے قتل ہونے اور دیواروں کے تعمیر کا نظارہ دیکھتے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ مِنْ لَّدُنْهُ عِلْمًا رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا وَاِسْلَامًا۔ آمین

اسراء موسیٰ میں بیان کردہ امور کی حکمت اسراء موسیٰ ان واقعات اور ان تشریحات کو پڑھ لینے کے بعد جو میں نے اوپر بیان کی ہیں یہ آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ موسیٰ کے اسراء کو اس جگہ پر اس لئے بیان کیا گیا ہے تا یہ بتایا جائے کہ (۱) حضرت مسیح ناصری کی قوم جو امت موسویہ کا آخری حصہ ہے اس کے بگڑ جانے کے بعد بعثت محمدیہ مقدر تھی۔ (۲) پس جب دور توحید کے بعد مسیحی بگڑ گئے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ضروری تھا۔ (۳) اسلام کی تعلیم ایسے قوانین اور ایسے اصول پر مبنی ہے کہ موسوی تعلیم اس سے بعض جگہ شدید اختلاف رکھتی ہے۔ اس وجہ سے موسوی اور عیسوی امتوں کے لئے اس کے ساتھ تعاون کرنا مشکل ہے مگر اس تعلیم کے بغیر نجات بھی نہیں۔ (۴) یہودی اور مسیحی لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے دعویٰ کے وقوت نہیں مانیں گے بلکہ بحیثیت قوم ایک لمبے عرصہ کے بعد مانیں گے۔ اس عرصہ میں وہ اپنا روحانی سفر الگ طور پر جاری رکھیں گے (۵) آخر ایک لمبے عرصہ کے بعد وہ تھک جائیں گے اور ان کے دل اپنی کوششوں کے ذریعہ امن حاصل کرنے سے مایوس ہو جائیں گے تب وہ اپنی حالت کا جائزہ لیں گے اور سمجھ لیں گے کہ یہ سفر ہم نے بغیر کسی مقصد کے جاری رکھا۔ درحقیقت ہمارا اکیلا سفر بہت پیچھے ختم ہو چکا ہے۔ (۶) اس وقت وہ پیشگوئیاں جو قرآن کریم نے ان کی کتب سے محفوظ کر لی ہیں ان کی ہدایت کا موجب ہوں گی اور (۷) وہ ان قیود کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے جن کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور اپنے وحشی جذبات کو قتل کر کے اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار جذبات پیدا کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے تب اللہ تعالیٰ کا رحم ان پر نازل ہوگا اور وہ اس کی رحمت کے سمندر میں داخل ہو جائیں گے جس کا کوئی کنارہ نہیں جس کے بعد کوئی اور سمندر نہیں۔ سوائے اس کے جو اس کا حصہ ہو اور اسی میں سے ہو۔

وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنۡ ذِی الۡقَرۡنَیۡنِ ؕ قُلۡ سَاَتۡلُوۡا عَلَیۡکُمۡ مِّنۡہُ

اور وہ تجھ سے ذوالقرنین کے متعلق بھی سوال کرتے ہیں تو (انہیں) کہہ (کہ) میں ضرور اس کے متعلق کچھ

ذِکۡرًا ؕ﴿۸۴﴾

ذکر تمہارے سامنے کروں گا۔

حلّ لُغَات۔اَلۡقَرۡنَیۡنِ اَلۡقَرۡنُ کا تثنیہ ہے اور اَلۡقَرۡنُ کے معنے ہیں ۔اَلرَّوۡقُ مِنَ الۡحَیَوانِ ۔ جانور کا سینگ ۔اَلۡقَرۡنُ :مِائَۃُ سَنَۃٍ ۔سو سال ۔اَلۡقَرۡنَانِ کَنَایَۃٌ عَنۡ مَشۡرِقِ الۡاَرۡضِ وَمَغۡرِبِھَا یعنی قرنان کا لفظ بول کر کنایۃً مشرق اور مغرب کے مما لک مراد لیتے ہیں۔(اقرب)

تفسیر۔**ذوالقرنین کے واقعہ کی طرف راہنمائی کا فخر حضرت خلیفۃ المسیح اول ؓ کو** یہ ذوالقرنین کا واقعہ بھی ایسا ہے کہ خدا تعالیٰ نے استاذی المکرم حضرت مولوی نورالدین صاحب ؓ کو اس کی طرف راہنمائی کرنے کا فخر بخشا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے مضمون پر زمانہ حال کے بعض دوسرے مصنفوں نے بھی روشنی ڈالی ہے اور اس غلط خیال کی تردید کی ہے کہ اس سے مراد سکندر رومی ہے۔اور بعض نے ذوالقرنین کے یہ معنے کئے ہیں کہ ایک بادشاہ جس کی حکومت مشرقی اور مغربی مما لک میں پھیل گئی تھی ۔ بلکہ ایک جرمن ڈاکٹر ہر بیلاٹ مصنف ببلیا اورئینٹل نے تو یہ کہہ کر کہ اس سے مراد ایران کے ابتدائی بادشاہوں میں سے کوئی ہے قریباً صداقت پر ہاتھ جا مارا ہے۔(وہیریز کمنٹری آن قرآن) حضرت مولوی صاحب نے ذوالقرنین کے بارہ میں اپنی تحقیق کی بنیاد بائبل پر رکھی ہے۔آپ فرماتے ہیں۔دانیال نبی کی ایک خواب بائبل میں لکھی ہے اس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رویا میں ایک مینڈھا دیکھا جس کے دو سینگ تھے۔اور وہ پچھّم اتر دکن کی طرف سینگ مارتا تھا اور کوئی جانور اس کے سامنے نہ ٹھہر سکتا تھا اور وہ جو چاہتا تھا کرتا تھا۔(دانیال باب ۸ آیت ۳، ۴) پھر لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے مجھے اس کی تعبیر یہ بتائی کہ ’’وہ مینڈھا جسے تو نے دیکھا کہ اس کے دو سینگ ہیں سو وہ مادہ اور فارس کے بادشاہ ہیں‘‘ (باب ۸ آیت ۲۰)

اس خواب کی بناء پر جس میں مادہ اور فارس کے بادشاہوں کو دو سینگ والے مینڈھے کی شکل میں دکھایا گیا ہے آپ فرماتے تھے کہ ذوالقرنین سے مراد مادہ اور فارس کا کوئی بادشاہ ہے۔ نیز آپ کا یہ بھی خیال تھا کہ یہ بادشاہ کیقباد

تھا (فصل الخطاب صفحہ ۲۰۷، ۲۰۸)۔

ذوالقرنین کا واقعہ بیان کرنے کی حکمت

حضرت استاذی المکرم کا خیال بیان کرنے کے بعد اب میں اپنی تحقیق بیان کرتا ہوں۔مگر پیشتر اس کے کہ میں ذوالقرنین کے متعلق اپنی تحقیق بیان کروں میں یہ امر بیان کرنا چاہتا ہوں کہ ذوالقرنین کا واقعہ قرآن کریم میں کیوں بیان کیا گیا ہے اور اسے سورۃ کہف کے اس حصہ میں واقعہ اسراء کے بعد کیوں رکھا گیا ہے۔

میں اوپر بیان کر آیا ہوں کہ سورۃ کہف میں اسلام اور مسیحیت کے مقابلہ کا ذکر ہے خصوصاً اس حصہ کا مقابلہ جو نیم سیاسی کہلا سکتا ہے یعنی ہے تو مذہبی مگر دونوں مذہبوں کی سیاسیات سے وابستہ ہے۔

سورۃ کہف کے واقعات کی ترتیب حکمت کے ماتحت ہے سب سے پہلے اصحاب کہف کا واقعہ بیان کر کے بتایا کہ مسیحیت کی ابتداء کس طرح ہوئی اور وہ کس طرح بگڑے پھر موسیٰ علیہ السلام کے اسراء کے واقعہ کو بیان کر کے بتایا کہ اصحاب کہف کی نسلوں کی ترقی ایک حد تک جا کر رک گئی۔کیونکہ موسیٰ کے اسراء میں یہ بات بتائی گئی تھی کہ موسیٰؑ کی قوم ایک حد تک جا کر روحانی ترقی سے محروم ہو جائے گی اور اس وقت ایک اور نبی خدا تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہوگا اور یہ بھی بتایا گیا تھا۔کہ موسیٰ کی قوم سے مراد اس جگہ موسوی سلسلہ کا آخری حصہ ہے یعنی مسیحی۔ ورنہ خالص موسوی حصہ تو پہلے ہی مردہ ہو چکا ہے۔غرض اصحاب کہف کے واقعہ کے بعد اسراء موسیٰ کا واقعہ بیان کر کے بتایا کہ مسیحی قوم کی پہلی ترقی کا دور محمد رسول اللہ صلعم کی بعثت کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔چنانچہ بعد کے واقعات سے یہ پیشگوئی زبردست طور پر پوری ہوئی اور مومنوں کے ایمان کو اس سے بے انتہا تقویت ملی۔کیونکہ مکی زندگی میں یہ خبر دینا کہ مسلمان عیسائیوں کو زک دیں گے ایک ایسی زبردست پیشگوئی ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔اس کے بعد ذوالقرنین کا واقعہ مسیحی قوم کے ترقی کے دوسرے دور کی خبر دینے کے لئے بیان کیا گیا ہے۔

اگر کہا جائے کہ اس طریق کو اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی معمولی طور پر مسیحیت کی ساری ترقی کو اکٹھا بیان کر دیا جاتا۔تو اس کا یہ جواب ہے کہ دنیاداروں کی نگاہ میں بے شک یہ معمولی بات ہے لیکن جو شخص دین کی اہمیت کو سمجھتا ہو وہ اسے کسی صورت میں جائز نہیں کہے گا۔بلکہ قرآن کریم کے اختیار کئے ہوئے طریق کو ہی درست اور ضروری قرار دے گا۔

اقوام کی مذہبی اقسام تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ الٰہی قانون کے مطابق جو شروع زمانہ سے چلا آیا ہے اقوام کی مذہبی حالت چار قسم کی ہوتی ہے (۱) وہ قومیں جو نبی وقت پر ایمان لاتی ہیں اور اس ایمان پر ثابت قدم رہتے

ہوئے دینی دنیوی ترقیات حاصل کرتی ہیں (۲) وہ قومیں جو نبی وقت پر ایمان لاتی ہیں لیکن بدکاریوں اور شرارتوں میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔ یہ قومیں گو اللہ تعالیٰ کے غضب کے نیچے ہوتی ہیں لیکن اپنی قومی ہیئت تبدیل کئے بغیر اسی مذہب میں رہتے ہوئے اپنی اصلاح کر کے خدا تعالیٰ کے فضل کو دوبارہ جذب کرسکتی ہیں کیونکہ نبی وقت پر انہیں ایمان ہوتا ہے صرف عمل خراب ہوتے ہیں (۳) وہ قومیں جو نہ صرف بدعمل ہوجاتی ہیں بلکہ ان کی خرابی کے زمانہ میں دوسرا نبی آجاتا ہے اور وہ اس کے ماننے سے محروم رہ جاتی ہیں۔ اس وقت ان کی طرف سے کسی قسم کی اصلاح کی کوشش بھی خدا تعالیٰ کو راضی نہیں کرسکتی جب تک کہ وہ اپنی قومی ہیئت کو نہ بدلیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے آخری نبی کو قبول نہ کریں۔ (۴) وہ قومیں جو کسی نبی پر ایمان ہی نہیں رکھتیں اور ان کی سب ترقیات خالص دنیوی ہوتی ہیں۔ اور خدا تعالیٰ سے روحانی تعلق پیدا کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ وقت کے نبی پر ایمان لاکر اس کے احکام کے مطابق عمل کریں۔

ان چاروں حالتوں کے سمجھ لینے کے بعد یہ امر آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ مسیحی ترقی کے دور اول کا آخری حصہ اس قوم کو دوسری قسم کی اقوام میں شامل کرتا ہے یعنی اس وقت وہ دین سے دور تو جاچکے تھے۔ مگر اپنی ہیئت بدلے بغیر اللہ تعالیٰ سے صلح کرسکتے تھے کیونکہ وہ حضرت مسیح کو جو وقت کے نبی تھے مانتے تھے۔ مگر اس کے بعد اسراء موسیٰ کی پیشگوئی کے مطابق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوگئے۔ اور اب مسیحی قسم دوم سے نکل کر قسم سوم میں شامل ہوگئے۔ کیونکہ وہ مجمع البحرین کو بھول کر آگے نکل گئے یعنی ان کی عملی اور اعتقادی حالت ہی خراب نہ رہی بلکہ خدا تعالیٰ سے صلح کرنے کے لئے اب ضروری ہوگیا کہ وہ اپنی سیاست اور اپنے نظام کو بھی ترک کریں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر اسلامی نظام اور اسلامی سیاست میں شریک ہوجائیں۔

ظاہر ہے کہ جب یہ دونوں قسمیں اس قدر مختلف ہوں اور خصوصاً جبکہ گفتگو نیم سیاسی اثرات کے متعلق ہو تو اس عظیم الشان فرق کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور جبکہ اس طریق کلام سے مزید فائدہ یہ پہنچتا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مسیحی دنیا کے سامنے پیش کیا جائے تو یہ ترتیب نہ صرف ضروری معلوم ہوتی ہے بلکہ ایک معجزانہ ترتیب معلوم ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ پہلے اصحاب کہف کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ مسیحی یا تو نیک تھے یا بگڑ چکے تھے مگر نبی وقت کے ماننے والے تھے اور خدا تعالیٰ سے صلح کرنے کے لئے انہیں اپنی قوم اور اپنی سیاست کو چھوڑنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے بعد موسیٰ کی زبانی محمد رسول اللہؐ کے ظہور کی خبر دی اور بتایا کہ اس نبی کے پیدا ہونے کے بعد مسیحی قوم کی حالت

بدل جائے گی۔انہیں پھر بھی ترقی تو ملے گی لیکن اس ترقی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے صلح کرنی ناممکن ہوگی کیونکہ وقت کے نبی کو پیچھے چھوڑ کر وہ آگے نکل چکے ہوں گے۔جب تک وہ واپس آ کر اس نبی کے ہمرکاب نہ ہوں گے ان کی ترقیات خالص دنیوی ہوں گی اور آخرت کا اس میں کوئی بھی حصہ نہ ہوگا۔پس اس زمانہ کا حال الگ بیان کیا کیونکہ اس زمانہ کی مسیحی قوم نہ صرف سیاستاً بلکہ مذہباً بھی پہلے مسیحیوں سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔

مسیحی ترقی کے دو دوروں کا ذکر آسمانی کتب میں یہاں ایک اور بات قابل تشریح رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ذوالقرنین کا ذکر بیچ میں کیوں کیا۔جبکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کا تھا۔سو اس کا جواب یہ ہے کہ مسیحی ترقی کے دو دوروں کا نام آسمانی کتب میں الگ الگ رکھا گیا ہے۔ایک دور اصحاب کہف کا دور ہے۔یعنی جبکہ اصحاب کہف والی کیفیت ان میں پیدا تھی۔یا وہ اصحاب کہف کی طرح نیک بننے کی قابلیت رکھتے تھے گو عملاً نیک نہ ہوں۔دوسرا دور آسمانی کتابوں میں دور یاجوج ماجوج کہلاتا ہے یعنی وہ دور جس میں نیک بننے کی قابلیت ہی ان سے جاتی رہے گی اور ایک نئے نبی کے ظہور کی وجہ سے وہ اپنی ہیئت قومی چھوڑ کر ہی خدا تعالیٰ کو پا سکیں گے۔اس نئے دور کے ساتھ ذوالقرنین کا تعلق ہے اور ذوالقرنین کے بعض اعمال اس دور کے پیدا ہونے کا موجب ہوئے ہیں۔

یاجوج ماجوج اقوام کی تشریح اور وہ اس طرح کہ یاجوج و ماجوج ان قوموں کا نام ہے جو شمالی ایشیا اور مشرقی یورپ کے علاقوں میں رہتی تھیں۔ایشیا کی زرخیزی کی وجہ سے وہ اس پر حملے کرتی تھیں (جیوش انسائیکلو پیڈیا زیر لفظ Gog and Mogog)۔اگر ان حملوں میں وہ کامیاب ہو جاتیں تو جس طرح آریہ قوم ہندوستان میں بس کر دوسری پرانی قوموں میں مل جل گئی ہے یہ قومیں بھی ایشیا کے مختلف ممالک میں پھیل کر دوسری اقوام کے ساتھ مل جاتیں اور ہر ملک کے مطابق مذاہب اختیار کر لیتیں اور کسی ایک مذہب پر جمع نہ ہوتیں۔لیکن خدا تعالیٰ کی قدرت سے ہوا یہ کہ ذوالقرنین (جس کے متعلق تفصیل آگے آئے گی) نے ان اقوام کے حملوں کو بڑی سختی سے روک دیا۔اور یہ اقوام ایشیا کے انتہائی شمال مغرب اور یوروپ کے مشرق میں گھر گئیں اور ذوالقرنین نے اس امر کا انتظام کیا کہ ان اقوام کے ایشیا میں آنے کی صورت ہی نہ رہے اور گویا ایک قسم کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اقوام یورپ میں پھیلنی شروع ہوئیں۔اور چونکہ یورپ میں مذاہب میں سے صرف مسیحی مذہب تھا باقی بت پرستی ہی بت پرستی تھی۔اس لئے دنیا کے پرانے مذاہب میں سے ان اقوام کو صرف مسیحیت سے واسطہ پڑا اور یہ اقوام آہستہ آہستہ سب کی سب مسیحی ہوگئیں اور ساری قومیں ایک ہی مذہب میں شامل ہو کر دوسری دنیا کے مقابلہ میں ایک زبردست جتھا بن گئیں۔اس طرح مذہبی عداوت کا بیج بویا گیا۔اس کے علاوہ چونکہ ذوالقرنین کے ماتحت اور اس کی پالیسی پر عمل کر کے سب ایشیا

نے ان کو شمال کی طرف دھکیل دیا جو اس زمانہ کے لحاظ سے سب سے ردّی اور سب سے حقیر علاقہ تھا۔ ان قوموں کے اندر ایشیا اور مشرق کی طرف آنے کی ایک زبردست خواہش پیدا ہو گئی جو اپنی شدت کی وجہ سے ہر نسل سے دوسری نسل کی طرف وراثۃً منتقل ہوتی چلی گئی اور اس طرح سیاسی عداوت کا بیج بو یا گیا۔

غرض ذوالقرنین ایک لحاظ سے یاجوج ماجوج یا دجالی فتنہ کے پیدا کرنے کا موجب ہوا۔ پس اللہ تعالیٰ نے مسیحی ترقی کے اس دور کا ذکر کرنے سے پہلے ذوالقرنین کا ذکر کیا اور خصوصاً اس کے اس فعل کا جس کی وجہ سے یاجوج ماجوج کی ایک علیحدہ قومی اور سیاسی بنیاد پڑی۔

ذوالقرنین فارسی الاصل تھا ذوالقرنین کے ذکر میں ایک اور حکمت بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ ذوالقرنین مادہ اور فارس کا بادشاہ تھا۔ پس اس لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ یاجوج ماجوج کی پیدائش ایک فارسی نسل کے انسان کے ذریعہ سے ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ جو اس کے نیک بندے ہوں جب ان کے کسی نیک فعل کے ثانوی ردّعمل کے طور پر کوئی بدی پیدا ہو تو وہ انہی کی اولاد یا ہم وطن یا مثیل کے ذریعہ سے اس بدی کو دور کرواتا ہے کہ اس کے نیک بندے کے نام سے ایک دور کا عیب بھی منسوب نہ ہو۔

حضرت مسیح موعود اور ذوالقرنین کے فارسی الاصل ہونے میں مشابہت پس ذوالقرنین کا ذکر اس جگہ اس لئے کیا گیا۔ تا اس خبر کو بطور پیشگوئی بیان کر کے ایک دوسرے ذوالقرنین کی خبر دی جا سکے جو فارسی الاصل ہوگا اور یاجوج ماجوج کا مقابلہ کر کے اس کے زور کو توڑے گا اور اس طرح پہلے ذوالقرنین پر سے الزام کو دور کرے گا اور ذوالقرنین کا نام اس وجہ سے پائے گا۔ کہ اللہ تعالیٰ اسے دو قوتوں کا وارث بنائے گا۔ ایک مہدویت کی قوت اور ایک مسیحیت کی قوت۔ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کا وارث ہونے کی وجہ سے مہدی کہلائے گا اور حضرت مسیحؑ کی صفات کو اخذ کرنے کی وجہ مسیح کہلائے گا۔ جیسا کہ حدیثوں میں ہے کہ لَا مَهْدِيَّ اِلَّا عِيْسٰى۔ پس ان دونوں قوتوں کے حاصل ہونے کے سبب اس کا نام ذوالقرنین ہوگا۔ نیز اس وجہ سے بھی کہ وہ بعض پیشگوئیوں کے مطابق دو صدیوں کو پائے گا۔ یعنی ایک صدی کے خاتمہ پر وہ خدا تعالیٰ سے الہام پائے گا اور دوسری صدی کے شروع ہونے پر اپنا کام ختم کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف اٹھایا جائے گا۔ اسی کی طرف حدیث ابن ماجہ میں اشارہ ہے کہ لَا مَهْدِيَ اِلَّا عِيْسٰى (باب شدۃ الزمان) یعنی آنے والا موعود ذوالقرنین ہوگا من جہت مہدی اور من جہت عیسیٰ ہوگا۔

احادیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ یہ جو قرآن کریم میں آتا ہے کہ ایک اور جماعت بھی ہوگی جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پھر قرآن پڑھائیں گے اس

سے کیا مراد ہے۔یعنی اگر آپ فوت ہو چکے ہوں گے تو یہ کام کس طرح کریں گے اس کے جواب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمان فارسیؓ کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ فرمایا کہ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوْ کَانَ الْاِیْمَانُ بِالثُّرَیَّا لَنَالَہٗ رِجَالٌ مِّنْ هٰٓؤُلَآءِ (الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور سورۃ الجمعۃ زیر آیت وآخرین منھم لما ـــ) اور ابن مردویہ نے سعد ابن عبادہ سے جو روایت کی ہے۔اس میں لکھا ہے رِجَالٌ مِّنْ فَارِسَ کہ فارسی لوگ ایمان کو پھر واپس لے آئیں گے۔اور بعض روایات میں رجُلٌ کا لفظ بھی آتا ہے (بخاری) یعنی ایک خاص موعود کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ان سب روایات کو ملا کر معلوم ہوتا ہے کہ ایک خاص موعود شخص جو فارسی الاصل ہوگا آخری زمانہ میں ایمان کے اٹھ جانے کے بعد پھر ایمان کو واپس لائے گا۔اور اس کے اس کام میں بعض اور فارسی الاصل لوگ بھی اس کے مؤید ہوں گے۔اب رہا یہ سوال کہ اس کا یاجوج ماجوج کے زمانہ سے کیا تعلق ہے؟

یاجوج ماجوج، دجال ایک ہی مذہب والوں کے نام ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم اور احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی یہ حالت آخری زمانہ میں ہوگی جبکہ یاجوج ماجوج اور دجال کا ظہور ہوگا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نام ایک ہی مذہب والوں کے ہیں۔فرق یہ ہے کہ یاجوج ماجوج کا لفظ سیاسی فتنہ پر دلالت کرتا ہے اور دجال کا مذہبی فتنہ پر۔پس دونوں قسم کی روایات کو ملا کر یہ حقیقت ظاہر ہوجاتی ہے کہ یاجوج ماجوج کے زمانہ میں جو اشاعت کفر ہوگی اس کا مقابلہ ایک فارسی مرد کرے گا۔اور اس کے اس کام میں معاون بعض اور فارسی مرد بھی ہوں گے۔پس فارسی الاصل ذوالقرنین کے فعل پر جو اعتراض پڑتا تھا۔اس کا بھی اس کے تفصیلی حالات بیان کر کے ازالہ کر دیا اور اس واقعہ کو قرآن کریم میں بطور پیشگوئی کے بیان کر کے یہ بھی بتا دیا کہ اگر ایک ذوالقرنین نے دنیوی طور پر یاجوج ماجوج کے حملوں کی روک تھام کی تھی تو ایک اور ذوالقرنین ان کے مذہبی حملوں کی جو آئندہ زمانہ میں ہونے والے ہیں روک تھام کرے گا۔

ذوالقرنین پر بھی اعتراض ہوا کہ فارسی الاصل نہیں (صاحبان ذوق کے لئے یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح دوسرے ذوالقرنین پر اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ اصل میں فارسی الاصل نہیں کیونکہ اس کے آباء فارسی ہونے سے پہلے چینی علاقہ کے رہنے والے تھے۔اسی طرح ذوالقرنین اول کی نسبت تاریخ میں آتا ہے کہ وہ اصل میں مادہ کا تھا فارسی صرف عارضی تعلقات کی وجہ سے کہلاتا ہے)

رَجُلٌ مِّنْ فَارِسَ کی صفات بہاء اللہ میں نہیں پائی جاتیں میں اس جگہ ایک اور شبہ کا ازالہ بھی کر دینا چاہتا ہوں کہ بعض بہائی لوگ ان پیشگوئیوں کو بہاء اللہ پر چسپاں کرتے ہیں کہ وہ فارسی الاصل تھے۔مگر یہ

درست نہیں ۔ کیونکہ احادیث سے صاف ظاہر ہے کہ جس موعود کا ذکر ہے وہ قرآن کریم کی تعلیم دے گا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہوگا ۔ کیونکہ سورۂ جمعہ کی جس آیت کے متعلق آپؐ نے جو کچھ فرمایا ۔ اس کا تو مضمون ہی یہ ہے کہ ایک دفعہ تو اب قرآن کی تعلیم محمد رسول اللہ صلعم نے عربوں کو دی ہے اور ایک دفعہ پھر وہ ایک اور قوم کو جو ابھی تک پیدا نہیں ہوئی یہی تعلیم دیں گے ۔ پس وہی شخص اس پیشگوئی کو پورا کرنے والا ہو سکتا ہے جو (۱) فارسی الاصل ہو (۲) دوسرے محمد رسول اللہ کے شاگرد ہونے کا مدعی اور قرآن کریم کی تعلیم دینے والا ہو (۳) آیات قرآنیہ کو ساتھ ملا لیا جائے تو یہ شرطیں بھی شامل کرنی پڑیں گی کہ وہ ذوالقرنین ہو یعنی دو صدیوں کو پانے والا ہو (۴) وہ یاجوج ماجوج کے فتنہ کو جس کا جزو اعظم بندوں کو خدائی صفات دینا ہے تباہ کرے ۔

ان میں سے فارسی الاصل ہونے کے سوا کوئی بات بہاء اللہ میں نہیں پائی جاتی ۔ نہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگرد ہیں نہ قرآن کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں نہ انہوں نے دو صدیاں پائیں اور نہ انہوں نے یاجوج ماجوج کے فتنہ کو توڑا بلکہ انہوں نے تو اپنے آپ کو خدا کہہ کے اس فتنہ کی آگ میں تیل چھڑکا ہے اور اسے اور بھی بھڑکا دیا ہے ۔

ذوالقرنین کے متعلق اپنی تحقیق ان تمہیدوں اور ترتیب مضمون کو بیان کرنے کے بعد اب میں ذوالقرنین کے متعلق اپنی تحقیق بیان کرتا ہوں ۔

میں اوپر بتا چکا ہوں کہ جیسا کہ سابق مفسروں اور یورپین محققین کا خیال ہے اور جیسا کہ حضرت مولوی نورالدین صاحبؓ خلیفہ اول جماعت احمدیہ نے بیان کیا ہے ۔ میرے نزدیک بھی ذوالقرنین ایرانی بادشاہوں میں سے کسی ایک بادشاہ کا نام ہے ۔ حضرت مولوی صاحب رضی اللہ عنہ اس کا نام کیقباد بتاتے تھے ۔

ذوالقرنین کی علامات قرآن کریم سے بعض نے آپ کی تحقیق میں یہ فرق کر دیا ہے کہ اس بادشاہ کو دارائے اول قرار دیا ہے (بیان القرآن زیر آیت ھذا) ۔ مگر میرے نزدیک ہمیں سب سے اول ان شرائط کو دیکھنا چاہیے کہ جو قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں اور پھر اس بادشاہ کی تعیین کرنی چاہیے ۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ (۱) ذوالقرنین کو الہام یا خوابیں آتی تھیں (۲) وہ اپنے علاقہ سے تو ملک فتح کرتے ہوئے مغرب کی طرف چلا گیا جہاں ایک سیاہ چشمہ میں سورج ڈوب رہا تھا (۳) اس کے بعد وہ مشرق کی طرف متوجہ ہوا اور مشرقی ممالک کو فتح کیا (۴) پھر وہ ایک درمیانی علاقہ کی طرف گیا ۔ جہاں سے یاجوج ماجوج حملہ کر رہے تھے اور اس نے وہاں دیوار بنائی ۔

ہمیں ذوالقرنین کی تعیین کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جو شخص ہمارے ذہن میں مشارٌ الیہ

ذوالقرنین کہلانے کا مستحق ہے اس میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں یا نہیں ۔خصوصاً اس امر کو کہ وہ صاحب الہام اور خدا تعالیٰ کا مقبول بھی ہے یا نہیں۔

یہ امر تو پہلے طے ہو چکا ہے کہ میدا اور فارس کے بادشاہوں میں سے ہی کوئی بادشاہ یہاں مراد ہے کیونکہ دانیال کی رؤیا نے ان ہی کو ذوالقرنین کا نام دیا ہے ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ ان میں سے کونسا بادشاہ یہ صفات اپنے اندر رکھتا ہے۔

ذوالقرنین سے مراد خورس شاہ ایران ہے سب سے اول اور اہم صفت الہام کی صفت ہے۔اس بارہ میں ہم تاریخ کو دیکھتے ہیں تو فارس کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ ہم کو ایسا ملتا ہے کہ جسے الہام ہوتا تھا اور جس کی نیکی اور تقویٰ کی تعریف ہم کو دوسرے انبیاء کے کلام سے بھی ملتی ہے اور یہ بادشاہ خورس ہے جسے انگریزی میں Cyrus لکھتے ہیں۔یسعیاہ نبی اس بارہ میں لکھتے ہیں:۔

خورس ملہم تھا ''خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اس کے قابو میں کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں اور دہرائے ہوئے دروازے اس کے لئے کھول دوں اور وہ دروازے بند نہ کئے جائیں گے میں تیرے آگے چلوں گا اور ٹیڑھی جگہوں کو سیدھا کروں گا میں پیتل کے دروازوں کے جدا جدا پلّوں کو ٹکڑے ٹکڑے کروں گا اور لوہے کے بینڈوں کو کاٹ ڈالوں گا اور میں گڑے ہوئے خزانے اور پوشیدہ مکانوں کے گنج تجھے دوں گا تا کہ تو جانے کہ میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں جس نے تیرا نام لے کے بلایا ہے میں نے اپنے بندے یعقوب اور اپنے برگزیدے اسرائیل کے لئے تجھے تیرا نام صاف صاف لے کے بلایا۔ میں نے تجھے مہربانی سے پکارا گو کہ تو مجھ کو نہیں جانتا۔'' (یسعیاہ باب ۴۵ آیت ۱ تا ۴)

یسعیاہ نبی کے اس کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ خورس نامی میدا اور فارس کا بادشاہ خدا تعالیٰ کی طرف سے برکت دیا گیا کیونکہ اسے مسیح کہا گیا ہے (یہ حقیقت یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خورس کو جو ذوالقرنین تھا مسیح کہا گیا ہے اور مسیح موعود کو ذوالقرنین) پھر لکھا ہے کہ اسے حکومت اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے دی تھی۔یہی قرآن کریم ذوالقرنین کی نسبت فرماتا ہے اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَ اٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا۔ہم نے اسے بادشاہت دی تھی اور ہر ضروری امر کو حاصل کرنے کے ذرائع بخشے تھے اسی طرح لکھا ہے کہ میں تیرے آگے چلوں گا اور تیری ٹیڑھی جگہوں کو سیدھا کروں گا۔جس سے اشارہ ہے کہ وہ بہت سفر کرے گا۔یعنی قرآن کریم سے ظاہر ہوتا ہے۔پھر یسعیاہ کے الہام میں ہے کہ میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں جس نے تجھے نام لے کے بلایا ہے۔قرآن کریم میں بھی آتا ہے

قُلْنَا یٰذَاالْقَرْنَیْنِ ہم نے ذوالقرنین کو نام لے کر پکارا ہے۔ پھر لکھا ہے میں نے تجھے مہربانی سے پکارا ہے پھر لکھا ہے کہ گوتو مجھے نہیں جانتا۔ اور یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی پرستش تورات کے ناموں سے نہیں کرتا تھا بلکہ دوسرے ناموں سے۔ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ زردشت نبی کا پیرو تھا۔

خورس کی بزرگی کا ثبوت تاریخوں سے خورس کی بزرگی کا ثبوت تمام تاریخوں سے ملتا ہے۔ اس کے بارہ میں لکھا ہے کہ اس کے دشمن بھی اس سے محبت کرتے تھے۔ بلکہ جب وہ کسی حکومت پر حملہ کرتا تو اس کی نیکی اور اس کے انصاف کی وجہ سے شہر والے دروازے کھول کر اس سے جا کر مل جاتے اور اپنے بادشاہ کو چھوڑ دیتے۔ یسعیاہ نبی نے بھی اپنا الہام اس بارہ میں لکھا ہے جس کے یہ الفاظ ہیں۔ ''خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ یہ میرا چرواہا ہے وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا۔'' (باب ۴۴ آیت ۲۸) اس کی نیکی اور اس کے اخلاق کے متعلق مؤرخین نے جو آراء ظاہر کی ہیں وہ یہ ہیں:۔ ہسٹوریز ہسٹری آف دی ورلڈ دی ہسٹری آف پرشیا جلد ۲ ص۵۹۶ (Historians History of the world) میں مشہور مورخ ڈینوفین کی رائے لکھی ہے کہ:۔

''میں نے ایک دفعہ انسانی فطرت پر غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ انسان کے لئے اپنی فطرت کے مطابق دوسرے جانوروں پر حکومت کرنا آسان ہے، مگر انسان پر حکومت کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ میں نے غور کیا کہ کتنے ہی آقا ہیں جن کے گھر میں تھوڑے یا زیادہ نوکر ہیں مگر وہ اپنے نوکروں سے بھی اطاعت نہیں کروا سکتے۔ پس اس سے میرا یہی خیال ہوا کہ ایسا ایک بھی آدمی نہیں جو انسان پر حکومت کر سکتا ہو۔ دوسرے جانداروں پر حکومت کرنے والے کئی ہیں۔ مگر یہ سوچتے سوچتے مجھے خورس بادشاہ کا خیال آیا جس نے میری رائے بدل دی اور میں نے کہا کہ انسانوں پر حکومت کرنی مشکل نہیں۔ میں نے دیکھا کہ بعض ایسے لوگ تھے جنہوں نے خوشی سے سائرس کی ماتحتی اختیار کی۔ حالانکہ بعض ان میں سے ایسے تھے جو اس سے دو مہینے کی راہ پر بعض چار مہینے کی راہ پر تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے کبھی اسے دیکھا ہی نہ تھا اور ایسے بھی تھے جنہیں اسے دیکھنے کی توقع بھی نہ ہو سکتی تھی۔''

پھر لکھا ہے ''اس نے لوگوں کے دل میں ایک پرزور خواہش پیدا کر دی تھی کہ وہ اسے خوش رکھیں اور کہ وہ ہمیشہ ان پر حکومت کرتا رہے اس نے اتنی قوموں پر حکومت کی کہ ان کی تعداد کا شمار مشکل ہے مشرق سے مغرب تک اس کی حکومت پھیلی ہوئی تھی۔''

پھر اسی کتاب میں موجودہ زمانہ کے مؤرخین کی رائے کا یہ خلاصہ لکھا ہے۔

''اگر بڑائی انصاف کے لئے لڑنے بلکہ اس کے لئے جان دینے کے لئے تیار رہنے کا نام ہے تو وہ (یعنی

خورس) بڑا بادشاہ تھا۔"

پھر لکھا ہے:۔

"وہ محض اپنی ذات کے لئے کچھ نہ کرتا تھا۔ وہ ایسا تھا کہ جب میڈیا کی حکومت، بابل کی حکومت اور مصر والوں نے اتفاق کر کے اس پر حملہ کیا تو اس نے محض دفاع کی خاطر تلوار اٹھائی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ رحم مجسم تھا۔ اس کی ڈھال پر ناجائز خون کا قطرہ نہ گرا تھا۔ نہ بھیانک انتقام یا ظلم سے اُس نے ہاتھ رنگے۔ اس نے مقدونیہ والے بادشاہ کی طرح کبھی شہر نہیں جلائے۔ اس نے دیگر بادشاہوں کی طرح مغلوب بادشاہوں کے ہاتھ پاؤں نہیں توڑے اس نے یہودی بادشاہوں کی طرح کبھی دیواروں پر ان کو نہیں گھسیٹا نہ اس نے رومیوں کی طرح مغلوب بادشاہوں کو پھانسی دی۔ نہ اس نے یونانیوں کے پاگل خدا سکندر کی طرح خونریزی کی۔ وہ بے شک ایشیائی تھا مگر وہ ایسے لوگوں میں سے تھا جو اپنے زمانہ سے بہت پہلے پیدا ہو جاتے ہیں۔

وہ دوسرے انسانوں سے بہت نرم دل تھا۔ وہ اپنی قوم کے رواج اور دستور سے بہت آگے نکلا ہوا تھا انسانی نسل کی انتہائی ترقی جو آئندہ ہونے والی تھی اس پر وہ قائم تھا۔ اس نے اپنی زبردست حکومت کی بنیاد اس پر رکھی تھی کہ ملکوں کو فتح کر کے ان کے درجہ کو بڑھایا جائے اور مفتوحوں کو مساوی حقوق دیئے جائیں۔ ٹائر کا وہ شہر جس نے نبوکدنضر اور سکندر کے آگے بڑے بڑے محاصروں کے بعد اپنے آپ کو سپرد کیا اس شہر نے اس کے جاتے ہی اپنی مرضی سے اپنے دروازے کھول دیئے۔" پھر لکھا ہے کہ:۔

"سب سے بڑھ کر وہ چھوٹی قوم جو یہودی کہلاتی ہے اس نے بابل کے دریا پر اس کا اس طرح استقبال کیا کہ کسی فانی انسان کا استقبال اس نے اس جوش سے کبھی نہیں کیا۔"

پھر لکھا ہے:۔

"وہ اپنے زمانہ کی پیداوار نہ تھا۔ بلکہ اس نے زمانہ کو پیدا کیا اور وہ اس کا باپ تھا۔ وہ تاریخ انسانی میں ایک منفرد اور بے مثل بادشاہ تھا۔" (ہسٹوریز ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۲ ص ۵۹۷ تا ۶۰۰)

اب میں اس مضمون کو لیتا ہوں کہ وہ خدا تعالیٰ سے سچی خوابیں پانے کا مدعی تھا۔

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ وہ ایک دفعہ ایک مہم پر جا رہا تھا کہ اس نے خواب دیکھا۔ کہ دارا جو اس کا رشتہ میں بھتیجا تھا۔ اس کے دو پر نکلے ہیں ایک یورپ پر پھیلا ہوا ہے اور دوسرا ایشیا پر۔ اس نے صبح اس کے باپ کو بلایا جو اس کے ساتھ تھا اور اسے کہا تمہارا لڑکا معلوم ہوتا ہے میرے خلاف سازش کر رہا ہے۔ پھر اس نے کہا کہ میں اس یقین کی

وجہ بھی بتادیتا ہوں اور وہ یہ کہ آج میں نے ایسا ایسا خواب دیکھا ہے اور خدا تعالیٰ کا میرے ساتھ اس محبت کی وجہ سے جو وہ مجھ سے رکھتا ہے یہ سلوک ہے کہ ایسے تمام اہم امور جو میری ذات پر گہرا اثر ڈالنے والے ہوں وہ مجھے بتادیا کرتا ہے۔ (جلد ۲ ص ۵۹۵)

اس خواب کی تعبیر میں گو اس نے غلطی کھائی اور سمجھا ہے کہ شائد دارا اس کے خلاف کوئی سازش کر رہا ہے۔ لیکن جو اس کی تعبیر تھی وہ اپنے وقت پر شاندار طور پر پوری ہوئی۔ اور وہ اس طرح کہ خورس کے بعد اس کا بیٹا بادشاہ ہوا اور اسے لوگوں نے قتل کر دیا۔ اس پر دارا نے چند شہزادوں کے ساتھ مل کر اس غاصب کو قتل کر دیا اور آخر متفقہ فیصلہ سے دارا کو بادشاہ بنایا گیا۔ جس نے یورپ اور ایشیا کے بڑے حصے کو فتح کر کے ایرانی حکومت کو بہت بڑھا دیا۔ (ایضاً)

خورس پر الہام ہونے کا ثبوت بائیبل سے بائبل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسے الہام ہوتا تھا۔ کیونکہ بائبل میں لکھا ہے:۔

''اور شاہ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے منہ سے نکلا تھا پورا ہو۔ خداوند نے شاہ فارس خورس کا دل اُبھارا کہ اس نے اپنی تمام مملکت میں منادی کرائی اور اسے قلمبند بھی کر کے یوں فرمایا۔ شاہ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہوواہ میں ہے اس کے لئے ایک مسکن بناؤں۔ پس اس کی ساری قوم میں سے تمہارے درمیان کون کون ہے اس کا خدا اس کے ساتھ ہو اور وہ یروشلم کو جو شہر یہوواہ ہے جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے جو یروشلم میں ہے''۔ (عزرا باب ۱ آیت ۱ تا ۳) گویا خدا تعالیٰ نے اسے برگزیدہ کر کے اسے مملکتیں اور حکومتیں بخشیں پھر اسے الہام کر کے یروشلم کا مقدس گھر بنانے اور یہودیوں کے قید سے رہا کرنے کا حکم دیا۔

خورس کی ذوالقرنین سے مشابہت از روئے فتوحات دوسری علامت قرآن کریم سے ذوالقرنین کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کی فتوحات پہلے مغرب کی طرف شروع ہوئیں اور وہ ملک پر ملک فتح کرتے کرتے ایسے مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں اس نے سورج کو ایک ایسے چشمہ میں ڈوبتے ہوئے دیکھا جس میں سیاہ مٹی ملی ہوئی تھی (یعنی اس کے پانی کا رنگ سیاہ تھا اس سے مراد بحیرہ اسود ہے جسے انگریزی میں Black Sea کہتے ہیں) چنانچہ خورس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ گذرا ہے۔ جب اسے اللہ تعالیٰ نے طاقت بخشی تو مغربی ممالک کے باشاہوں نے ایکا کر کے اس پر حملہ کر دیا اور اس طرح اس کی فتوحات اپنے ملک سے باہر مغربی طرف شروع ہوئیں اور بابل۔ نینوا اور یونانی نوآبادیات جو ایشیائے کوچک کے شمال میں بحیرہ مارمورا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ خورس نے فتح کر لیں اور اس طرح اس

چشمہ تک پہنچا۔ جو اس کے ملک کی مغرب کی طرف تھا اور جس کا پانی سیاہ تھا (یہ تمام علاقے تاریخ سے ثابت ہے کہ اس نے فتح کئے تھے)۔ (دیکھو ہسٹوریز ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۲ صفحہ ۶۰۷۔۶۰۹ نیز جیوئش انسائیکلوپیڈیا زیر لفظ Cyrus)

تیسری علامت قرآن کریم نے یہ بیان فرمائی ہے کہ مغربی علاقوں کو فتح کرنے کے بعد ذوالقرنین نے مشرق کی طرف توجہ کی اور تاریخ سے اس امر کا بھی پتہ ملتا ہے کہ مغربی علاقوں کی فتح کے بعد خورس نے مشرقی ممالک کو فتح کیا اور افغانستان تک اور بخارا اور ثمر قند تک اس کی حکومت پھیل گئی (ہسٹوریز ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۲ ص ۵۹۳)

خورس کی جنگ یاجوج ماجوج سے ہوئی چوتھی علامت قرآن کریم بتاتا ہے کہ اس نے ان کے درمیان بعض علاقوں کی طرف توجہ کی۔ اور وہاں ایک دیوار بنائی۔ کیونکہ یاجوج ماجوج وہاں سے حملے کرتے تھے تاریخ سے مندرجہ ذیل امور کا ثبوت ملتا ہے۔

اول۔ خورس کی جنگ یاجوج ماجوج سے ہوئی ہے اور اس نے ان کے حملوں سے اپنی مملکت کے بعض علاقوں کو بچایا ہے۔

یاجوج ماجوج کا مسکن از روئے بائیبل اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ یاجوج ماجوج کن قبائل کو کہتے ہیں۔ اس کے لئے بھی ہم کو بائبل سے مدد ملتی ہے بائبل میں یاجوج ماجوج کی نسبت لکھا ہے۔

''اے آدم زاد تو جوج کے مقابل جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روس اور مسک اور ٹوبالسک کا سردار ہے اپنا منہ کر اور اس کے برخلاف نبوت کر۔'' (حزقیل باب ۳۸ آیت ۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بائبل جس نے سب سے پہلے ہمیں یاجوج وماجوج سے روشناس کرایا ہے شمالی علاقہ کے رہنے والے لوگوں کو یاجوج ماجوج کہتی ہے اور ان کا مقام روس، ماسکو اور ٹوبالسک بتاتی ہے جو سارا علاقہ شمالی ہے۔ اس کے بعد بائبل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقابلہ فارس کا کوئی بادشاہ کرے گا کیونکہ لکھا ہے کہ وہ فارس پر قابض ہو گئے ہوئے ہیں چنانچہ لکھا ہے۔

''اور ان کے ساتھ فارس اور کوش اور فوط (ہیں)۔'' (حزقیل باب ۳۸ آیت ۵)

یعنی جب یہ پیشگوئی کی گئی ہے۔ یاجوج کے ماتحت فارس کا علاقہ تھا۔

اب ہم تاریخوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ یاجوج وماجوج کی نسبت کیا رائے ظاہر کرتی ہیں۔ پرانے مؤرخوں میں سے جوزیفس کا بیان ہے کہ یہ سیدین (Seythians) قبائل کا نام ہے۔ تورات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ کیونکہ پیدائش باب ۱۰ آیت ۲ میں لکھا ہے کہ ''یافث کے بیٹے یہ ہیں۔ جمر اور ماجوج اور مادی'' جمر سمّیر ِ یَنُز

(Cimmerians) کا نام ہے جو ایشیائے کوچک کے مشرقی طرف رہتے تھے۔ اور مادی میدیا والوں کا نام ہے ان دونوں کے درمیان کا علاقہ میدیز ہی کا علاقہ ہے۔ جیروم لکھتا ہے کہ ماجوج کوہ قاف کے اوپر بحیرہ اخضر کے اوپر رہتے ہیں یہ بھی وہی شمالی علاقہ ہے جس میں سیدین رہتے تھے۔ (جیوش انسائیکلو پیڈیا زیر لفظ Gog and Magog)

اس تحقیق کے بعد اب ہم دیکھتے ہیں کہ جیسا کہ بائبل نے لکھا ہے کہ یاجوج ماجوج اس زمانہ میں فارس پر حاکم ہوگئے تھے۔ کیا سیدینز کے بارہ میں یہ امر ثابت ہے سو اس کے متعلق ہم تاریخ میں یہ لکھا پاتے ہیں۔ ’’تب جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں فارس سیدینز کے ہاتھوں میں آ گیا یا دوسرے لفظوں میں مادیوں کے بادشاہ کے ہاتھوں میں آ گیا (مادیا پر اس وقت سیدینز حکومت کر رہے تھے) جس بادشاہ کا پائیہ تخت اس وقت اکباتانا (Ecbatana) میں تھا جس کے ہاتھ سے فارس کو خورس اعظم نے چھڑوایا‘‘۔ (ہسٹوریز ہسٹری آف دی ورلڈ ہسٹری آف پرشیا جلد ۲ ص ۵۸۰) اس واقعہ سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج ماجوج کا قبضہ فارس پر رہ چکا تھا بلکہ یہ بھی کہ خورس نے یاجوج ماجوج کو شکست دے کر فارس کو ان کے قبضہ سے آزاد کرایا تھا۔ ان کا بار بار حملہ کر کے جنوبی اقوام کو تکلیف دینا بھی تاریخ سے ثابت ہے۔ چنانچہ ہیروڈیٹس لکھتا ہے کہ سیدینز کوہ قاف اور بحیرہ اخضر کے درمیان سے درّہ دربند کے راستے شمالی ممالک کی طرف سے جنوبی ممالک پر حملے کیا کرتے تھے۔ (ایضاً)

دربند کی دیوار ہی یاجوج ماجوج کی دیوار ہے دوسری شق آخری علامت کی قرآن کریم سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ذوالقرنین نے یاجوج ماجوج کے حملوں سے بچانے کے لئے ایک دیوار بنائی تھی۔

پہلے تو ہم دیکھتے ہیں کہ کیا اس علاقہ میں کسی دیوار کا پتہ ملتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں عین اسی مقام پر جسے ہیروڈویس نے سیدینز کے حملہ کا راستہ بتایا ہے دیوار بنی ہوئی تھی۔ وہ دربند کی دیوار کے نام سے مشہور ہے اور غالباً دربند اسی وجہ سے اس جگہ کا نام پڑا ہے کہ اس جگہ دیوار کھینچ کر سیدینز کو روکھا گیا تھا۔ چنانچہ دربند کے متعلق انسائیکلو پیڈیا برٹینکا میں لکھا ہے کہ اس جگہ ایک دیوار تھی جو اپنی تعمیر کے وقت ۲۹ فٹ اونچی تھی اور دس فٹ چوڑی تھی اس میں لوہے کے دروازے تھے اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر نگرانوں کے لئے مینار بنے ہوئے تھے تاکہ وہاں سے نگرانی کر سکیں یہ پچاس میل لمبی ہے اور بحیرہ اخضر سے کوہ قاف تک چلی گئی ہے پھر انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں لکھا ہے کہ یہ دیوار سکندر کی دیوار ہے۔ مگر اسے قبادؔ نے جو ساسانی بادشاہ تھا دوبارہ مرمت کروایا تھا۔ (زیر لفظ Derbent)

سکندر کا اس دیوار کو بنانا خلاف عقل ہے ان بیانات سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ یہاں کوئی دیوار موجود تھی۔

مگر یہ کہ اس دیوار کو خورس نے بنایا تھا۔ اس کا ثبوت تاریخ سے اس وقت تک مجھے نہیں مل سکا۔ ہاں میں سمجھتا ہوں کہ سکندر کا اس دیوار کو بنانا بالکل خلاف عقل ہے۔ سکندر کے متعلق تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳۳۰ ؁ قبل مسیح کی گرمی کے موسم میں اس نے دارا کو آخری شکست دی ہے اور دارا مارا گیا ہے۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹینکا زیر لفظ Alexander the Great) لیکن اس فتح سے اسے ایران پر قبضہ حاصل نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے مقابل پر کئی صوبوں کے لشکر ابھی موجود تھے اس لئے وہ بغیر دم لئے آگے بڑھتا گیا۔ لیکن جونہی وہ آگے بڑھا پچھلے علاقہ میں بغاوت ہوگئی اور اسے واپس آنا پڑا۔ بغاوت کو فرو کر کے سکندر کابل کی طرف بڑھا جہاں اس کی فوج میں بغاوت شروع ہوگئی۔ اور مورخین کے نزدیک ۳۲۹ ؁ قبل مسیح کی سردی کے موسم میں وہ ہندوستان کی طرف بڑھا۔ یہ سفر اس قدر سرعت سے طے ہوا ہے کہ بعض مورخ اس کے متعلق شک ظاہر کرتے ہیں۔ بہرحال یہ امر ثابت ہے کہ سکندر راستہ میں کہیں ٹھہرا نہیں۔ بلکہ لڑتا بھڑتا ہندوستان کی طرف چلا گیا ہے۔ جہاں سے وہ جہازوں کے راستہ واپس لوٹا۔ اور ۳۲۴ ؁ قبل مسیح میں ایران پہنچا وہاں تھوڑا سا عرصہ رہنے کے بعد جس میں اسے اپنی فوجوں کی بغاوت فرو کرنے کی پھر ضرورت پیش آئی وہ گھر کو روانہ ہوا۔ اور ۱۳ ؍ جون ۳۲۳ ؁ قبل مسیح راستہ ہی میں مرگیا (ایضاً)۔ ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے اتنی بڑی دیوار بنانے کا ہرگز موقع نہ مل سکتا تھا۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھوکا اس امر سے لگا ہے کہ بعض مسلمان مفسرین کا خیال تھا کہ سکندر ذوالقرنین تھا (کشاف والقرطبی زیر آیت ھذا)۔ پس اس سے مسیحی مصنفوں نے دھوکا کھا کر اس دیوار کو سکندر کی دیوار سمجھ لیا۔

مگر صرف اتنا ثابت کرنا کافی نہیں کہ سکندر نے یہ دیوار نہیں بنائی بلکہ اس سے زیادہ ایسے ثبوت کی ضرورت ہے جس سے معلوم ہو کہ یہ دیوار اگر یقیناً نہیں تو غالباً خورس نے بنائی تھی چونکہ تاریخ سے اس وقت تک کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا جس سے قطعی طور پر ثابت ہو کہ یہ دیوار خورس نے بنائی ہے۔ ہم قیاس سے ہی کام لے سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے تاریخی واقعات کی بناء پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ دیوار خورس ہی نے بنائی ہے اور میرے دلائل یہ ہیں۔

دلائل کہ یہ دیوار خورس نے بنائی (۱) تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ دارا نے جو خورس کے بیٹے کے بعد بادشاہ ہوا اور جس کے متعلق خورس نے خواب دیکھی تھی کہ مشرق و مغرب میں اس کی حکومت ہوگی۔ سیدینز کا زور توڑنے کے لئے یونان میں سے گزر کر یوروپ کی طرف سے جا کر سیدینز پر حملہ کیا تھا (ہسٹوریز ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۲ صفحہ ۶۱۰)۔ اب یہ بات خلاف عقل معلوم ہوتی ہے کہ جبکہ سیدینز اس کے شمالی جانب اس کے ملک کے پاس ہی بستے تھے وہ ان پر حملہ کرنے کے لئے یورپ سے گیا ہو۔ پس اس واقعہ سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ خورس نے دربند کے پاس

دیوار بنادی تھی اور ایک بڑی فوج کو لے کر ان کے ملک پر صرف چند چھوٹے چھوٹے دروازوں سے حملہ کرنا خالی از خطرہ نہ تھا۔اور دیوار کو توڑنا اور بھی پُر خطر تھا۔پس دارا نے سیدینز کا زور توڑنے کے لئے یوروپ کی طرف سے جا کر حملہ کیا۔تا کہ ایک طرف سے دیوار ان کو روک رہی ہو اور دوسری طرف سے اس کی فوجیں ان پر حملہ آور ہو جائیں۔

(۲) دوسرا امر جس سے اس بارہ میں قیاس کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ اگر درّہ دربند میں دارا سے پہلے دیوار موجود نہ تھی تو دارائے اول جیسے عقل مند بادشاہ کی نسبت یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے ملک کو ننگا چھوڑ کر ہزار میل کا چکر کاٹ کر سیدینز پر حملہ کرنے کے لئے گیا تھا۔کیونکہ اس صورت میں یہ صریح خطرہ موجود تھا کہ اس کے جانے کے بعد سیدینز بغل میں سے نکل کر اس کے ملک پر حملہ کر دیتے اور نہ وہ اپنے ملک کو ہی بچا سکتا۔نہ اس کا ملک اس کی ضرورت پر مزید کمک بھجوا سکتا۔پس اس کا اطمینان سے یورپ کی طرف سے جا کر حملہ کرنا بتاتا ہے کہ دربند کی طرف سے اس سے پہلے دیوار موجود تھی اور وہ اس امر سے مطمئن تھا کہ سیدینز اس کے ملک پر دیوار کی وجہ سے اس طرف سے حملہ نہیں کر سکتے۔

<u>دربند کے پاس دیوار بنانے والا خورس ہی تھا</u> میں سمجھتا ہوں کہ اب میں چاروں علامتوں کو سوائے دیوار والے حصہ کے یقینی طور پر خورس کے حق میں ثابت کر چکا ہوں۔اور دیوار والے حصہ کے متعلق بھی اس قدر ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں کہ جہاں تک اس زمانہ کے واقعات سے (جو درحقیقت بہت کم ہم تک پہنچے ہیں) قیاس کیا جا سکتا ہے کہ خورس ہی دربند کے پاس دیوار بنانے والا تھا۔خصوصاً جبکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ یاجوج ماجوج خورس کے برسراقتدار آنے سے پہلے اس کے اپنے ملک پر قابض تھے اور ان کے حملے فارس پر اور اس کی وسیع سلطنت پر برابر جاری تھے۔اور جبکہ ہم کو تاریخ سے یہ مزید ثبوت ملتا ہے کہ دربند کی طرف سے سیدینز کے حملے خورس کے زمانہ کے بعد رک گئے تھے۔(ہسٹوریز ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۲ صفحہ ۵۸۹)

خلاصہ یہ کہ یہ امر ایک ثابت شدہ حقیقت معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین بادشاہ سے مراد قرآن کریم میں خورس بادشاہ ہی ہے اور اس امر کے ثابت کر چکنے کے بعد میں قرآن کریم کی آیات کی تفسیر الگ الگ بیان کرتا ہوں۔

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۵﴾

ہم نے یقیناً اسے زمین میں حکومت بخشی تھی۔ اور ہم نے اسے ہر ایک چیز (کے حصول) کا ذریعہ عطا کیا تھا۔

حلّ لُغات ۔مَكَّنَّا مَكَّنَّا مَكَّنَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور مَكَّنَهٗ مِنَ الشَّيْءِ کے معنے ہیں جَعَلَ لَهٗ عَلَيْهِ سُلْطَانًا وَّقُدْرَةً۔ اس کو کسی بات پر طاقت قدرت اور غلبہ بخشا۔ (اقرب) پس مَكَّنَّا کے معنے ہوں گے۔ ہم نے اسے حکومت وغلبہ دیا تھا۔

سَبَبًا سَبَبًا مَا يُتَوَصَّلُ بِهٖ اِلٰى غَيْرِهٖ۔ کسی چیز کے حصول کے ذریعہ کو سبب کہتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر ۔یعنی ہم نے ذوالقرنین کو دنیا میں بڑی طاقت بخشی تھی۔ اور ہر قسم کے سامان اسے بخشے تھے یہ اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ خورس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے خاص طاقت دی تھی۔ جیسا کہ بائبل اور اس کے اپنے بیانات سے ثابت کیا جا چکا ہے۔ دیکھو نوٹ نمبر ا

فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۶﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا

تب وہ ایک راستہ پر چل پڑا۔ یہاں تک کہ وہ سورج ڈوبنے کے مقام پر پہنچا تو اس نے ایسا پایا کہ (گویا) وہ ایک گدلے

تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۬ؕ قُلْنَا يٰذَا

چشمے میں ڈوب رہا ہے اور اس نے اس کے پاس کچھ لوگ (آباد) پائے (اس پر) ہم نے (اسے) کہا (کہ)

الْقَرْنَيْنِ اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ﴿۸۷﴾

اے ذوالقرنین تجھے اجازت ہے کہ ان کو عذاب دے یا ان کے بارہ میں حسن سلوک سے کام لے

حلّ لُغات ۔حَمِئَةٌ اَلْحَمِئَةُ کے معنے ہیں ذَاتُ الْحَمْأَةِ۔ کیچڑ والا (اقرب) پس عَيْنٍ حَمِئَةٍ کے معنے گدلا۔ کیچڑ والا چشمہ۔

تفسیر ۔مَغْرِبَ الشَّمْسِ سے یہ مراد نہیں کہ دنیا کے آخری سرے پر پہنچا۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اپنی فتوحات کی مغربی حد تک جا پہنچا اور مراد ایشاء کو چک کی شمالی اور مغربی حد ہے۔

عَیۡنٍ حَمِئَةٍ سے مراد بحیرہ کیسپین عَیۡنٍ حَمِئَةٍ کے معنے مٹی ملے ہوئے پانی کے ہیں۔اور مراد بحیرہ اسود سے ہے۔کیونکہ مٹی سے پانی کا رنگ گدلا اور سیاہی مائل ہوجاتا ہے اور اس سمندر کا پانی بوجہ عمیق گہرائی کے سیاہی مائل ہے۔مٹی ملے ہوئے کے الفاظ لفظاً بھی اس سمندر پر صادق آتے ہیں۔کیونکہ یہ سمندر سارے سمندروں سے اس امر میں نرالا ہے کہ اس میں باقی سمندروں کی نسبت نمکین پانی کم شامل ہوتا ہے اور اس کے پانیوں کا بڑا حصہ زمینی دریاؤں کے پانی سے بنتا ہے۔جو روس آرمینیا اور بلغاریہ کے ملکوں سے آکر اس میں گرتے ہیں (انسائیکلو پیڈیا برٹینکا زیر لفظ بلیک سی) پس چونکہ اکثر پانی اس کا دریاؤں سے آتا ہے اس میں دوسرے سمندروں کی نسبت مٹی کی آمیزش زیادہ ہے اور نمک سب سمندروں سے کم ہے۔

یہ جو فرمایا کہ اس میں سورج ڈوبتا ہوا پایا۔اس سے مراد یہ ہے کہ چشمہ کے لفظ سے دھوکا نہ کھاؤ۔چشمہ سے صرف یہ مراد ہے کہ اس کا پانی گہرا ہے اور سطح زمین کے اندر سے نکل کر بھی اس میں پانی ملتا رہتا ہے ورنہ چھوٹا چشمہ مراد نہیں۔بلکہ وہ اس قدر وسیع ہے کہ اس کے کنارہ پر کھڑے ہوں تو یوں معلوم ہوگا کہ گویا سورج اسی میں ڈوب رہا ہے۔

وَجَدَ عِنۡدَهَا قَوۡمًا سے مراد وہ حکومت ہے جو ایشائے کوچک کے مشرقی ساحل پر حکومت کر رہی تھی اور جس نے بابل کی فتح کے بعد دوسری حکومتوں سے مل کر بلاوجہ خورس پر حملہ کر دیا تھا۔

اس قوم کے متعلق فرماتا ہے کہ ہم نے اسے کہا کہ خواہ اس کی شرارت کی اسے سزا دو خواہ ان پر احسان کر کے اپنا گرویدہ بنالو۔

قَالَ اَمَّا مَنۡ ظَلَمَ فَسَوۡفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ یُرَدُّ اِلٰی رَبِّهٖ

اس نے کہا (ہاں میں ایسا ہی کروں گا اور) جو ظلم کرے گا اسے تو ہم ضرور سزا دیں گے پھر وہ اپنے رب کی طرف

فَیُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّکۡرًا ﴿۸۸﴾

لوٹایا جائے گا اور وہ اسے سخت عذاب دے گا

تفسیر۔یعنی خورس نے اس الہام کے جواب میں یہ عرض کی کہ میرا یہ منشاء ہے کہ اگر یہ دوبارہ شرارت کریں تو ان کو سزا دوں ورنہ نہیں۔

یہ جو فرمایا ثُمَّ یُرَدُّ اِلٰی رَبِّهٖ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خورس کا ایک ایسے مذہب سے تعلق تھا جو قیامت پر خاص

طور پر ایمان رکھتا تھا۔ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ خورس زردشتی مذہب کا مخلص پیرو تھا۔ جو مذہب کہ اسلام کے بعد سب مذاہب سے زیادہ بعث بعد الموت پر زور دیتا ہے (جیوئش انسائیکلو پیڈیا زیر لفظ Cyrus) اس میں لکھا ہے کہ یہ امر یقینی طور پر ثابت ہے کہ خورس خالص زردشتی مذہب کا پیرو تھا۔

وَ اَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰى ۚ وَ

اور جو ایمان لائے گا اور نیک (اور مناسب حال) عمل کرے گا تو اس کے لئے (خدا تعالیٰ کے ہاں اس کے اعمال

سَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ﴿۸۹﴾ؕ

کے) بدلہ میں اچھا انجام (مقدر) ہے اور ہم (بھی) ضرور اس کے لئے اپنے معاملہ میں آسانی والی بات کہیں گے۔

تفسیر۔ ذوالقرنین کے اخلاق اس آیت سے ذوالقرنین کے اخلاق کا پتہ چلتا ہے اور جیسا کہ نوٹ نمبر (۱) میں بتایا جا چکا ہے۔ خورس بہت رحم دل تھا اور مفتوح اقوام سے نہایت محبت اور رحم کا سلوک کرتا تھا۔

اس جگہ اگر کوئی اعتراض کرے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں کہا کہ چاہو تو سزا دو چاہو تو رحم کرو۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک لطیف طریق رحم کی تعلیم دینے کا ہے پہلے عذاب کا ذکر کیا کہ اس قوم نے شرارت تو کی ہے اور تمہارا حق ہے کہ ان کو سزا دو۔ پھر یہ فرمادیا کہ اگر چاہو تو ان پر رحم بھی کر سکتے ہو۔ یعنی ایک راستہ رحم کا بھی کھلا ہے۔ اس طرح رحم کی طرف ایک لطیف اشارہ کر کے ذوالقرنین کو خالص نیکی کا موقعہ عطا کیا۔ اگر حکماً رحم کرنے کو کہا جاتا تو ذوالقرنین کے طبعی نیکی کے اظہار کا موقعہ نہ ملتا۔ لیکن اس حکم کے بعد جو اس نے نیکی کی یہ اس کا ذاتی فعل تھا اور اسے زیادہ ثواب کا مستحق بناتا تھا۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۰﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا

پھر وہ ایک اور راستہ پر چل پڑا۔ یہاں تک کہ جب وہ سورج کے نکلنے کے مقام پر پہنچا تو اس نے اسے ایسے لوگوں پر

تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿۹۱﴾ۙ

چڑھتا پایا۔ جن کے لئے ہم نے (ان کے اور) اس کے درمیان کوئی پردہ نہیں بنایا تھا۔

تفسیر۔ ذوالقرنین کے مشرقی سفر کے حالات اس میں ذوالقرنین کے مشرقی سفر کا ذکر فرمایا

ہے جو افغانستان تک ہوا۔ لَمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا سے یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ وہ قوم ایسی مہذب نہ تھی اور مکان وغیرہ ان میں کم تھے۔ بلکہ جھونپڑوں یا خیموں میں رہتے تھے۔ افغانی قبائل کی اس وقت یہی حالت تھی۔ وہ تہذیب کے اعلیٰ مقام پر نہ تھے۔ مگر میرے نزدیک الفاظ قرآن پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بلوچستان کا علاقہ تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا۔ کہ اس نے سورج کو دیکھا کہ وہ ایسی قوم پر چڑھتا ہے جس کے اور سورج کے درمیان ہم نے کوئی پردہ نہیں بنایا یعنی اوٹ کوئی نہیں۔ سیدھی شعاعیں اس پر پڑتی ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ علاقہ چٹیل میدان ہے۔ درخت وغیرہ یا اونچے پہاڑ اس علاقہ میں نہیں۔ عام طور پر مورخین یونانی ہی ہیں اس لئے انہوں نے اپنی طرف کے علاقوں کی فتوحات کا ہی ذکر کیا ہے۔ مشرقی طرف کی فتوحات کا ذکر بالتفصیل نہیں کیا۔ ہاں اختصاراً وہ یہ لکھتے ہیں کہ خورس نے مشرق کی طرف افغانستان کے نواح میں حملہ کیا تھا اور اس علاقہ کو فتح کرلیا تھا۔ مگر چونکہ سیستان بھی فارسی حکومت میں شامل تھا۔ میرے نزدیک یہ بلوچستان کے علاقہ کا ذکر معلوم ہوتا ہے جہاں ریت کا صحرا اور ٹیلے وغیرہ ہیں۔ لیکن اگر تاریخ کے بیان کو کافی سمجھا جائے تو پھر لَمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا سے اس صحرا اور میدان میں بسنے والی قوم مراد لی جائے گی جو سیستان اور ہرات کے مغربی جانب اور دُزداب سے شمالی جانب کو مشہد تک کئی سو میل تک لمبا چلا گیا ہے۔

كَذٰلِكَ ؕ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۲﴾

(یہ واقعہ ٹھیک) اسی طرح تھا اور جو کچھ اس کے پاس تھا اس کا ہم نے (اپنے) علم سے احاطہ کیا (ہوا) تھا۔

تفسیر۔ یعنی جس طرح ہم نے بتایا ہے ایسا ہی ہوا تھا یعنی اس کا ان علاقوں کو فتح کرنا ایک یقینی بات ہے وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا سے مراد یہ ہے کہ ہم اس کی ہر سفر میں حفاظت کرتے تھے کیونکہ اس کی ہر بات کی خبر رکھنے کے یہی معنے ہیں کہ اس کے حالات کی نگرانی کرتے تھے۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۳﴾

پھر وہ ایک راستہ پر چل پڑا۔

تفسیر۔ اس تیسرے اَتْبَعَ سَبَبًا میں خورس بادشاہ کے اس سفر کا ذکر ہے جو اس نے ایران سے شمالی

جانب بحیرہ کیسپین اور کوہ قاف کے درمیانی علاقہ کی جانب کیا۔(انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Cyrus)

حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ بَیۡنَ السَّدَّیۡنِ وَجَدَ مِنۡ دُوۡنِهِمَا قَوۡمًا ۙ لَّا

یہاں تک کہ جب وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو اس نے ان کے ورے کچھ ایسے لوگ پائے جو بمشکل اس

یَکَادُوۡنَ یَفۡقَهُوۡنَ قَوۡلًا ﴿۹۴﴾

کی بات سمجھتے تھے۔

حل لغات۔ السَّدَّیۡنِ السَّدَّیۡنِ اَلسَّدُّ سے تثنیہ ہے اور اَلسَّدُّ کے معنے ہیں۔ اَلْجَبَلُ پہاڑ۔ اَلْحَاجِزُ بَیْنَ الشَّیْئَیْنِ۔ دو چیزوں کے درمیان روک۔(اقرب)

تفسیر۔ اس جگہ کے بسنے والوں کی نسبت فرماتا ہے کہ وہ بمشکل ذوالقرنین کے لوگوں کی باتیں سمجھتے تھے یہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ کَادَ سے پہلے نفی آئے تو اس کے معنے مثبت کے ہوتے ہیں اور مثبت کا لفظ آئے تو اس کے معنے نفی کے ہوتے ہیں۔ پس اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ بمشکل ذوالقرنین اور اس کی قوم کی بات سمجھتے تھے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی نکلتا ہے کہ وہ بات کسی حد تک سمجھ جاتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ فارس کے لوگوں کے ہمسائے اور ان کے ساتھ میل ملاپ رکھنے والے تھے۔ پس گو ان کی زبان اور تھی مگر ہمسائگت اور کثرت سے میل جول رکھنے کی وجہ سے فارس اور میدیا والوں کی کچھ کچھ بات وہ سمجھ لیتے تھے۔

جغرافیہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دربند کا علاقہ جس کی نسبت بتایا جاچکا ہے کہ وہاں دیوار بنائی گئی تھی ایسا ہی علاقہ ہے یہ علاقہ مادہ اور فارس کے ساتھ لگتا ہے بلکہ بعد کے زمانہ میں تو فارس کا حصہ ہی بن گیا تھا۔ گو اب روس والوں نے اس علاقہ کو لے کر اپنی حکومت میں شامل کرلیا ہے۔

یہ جو فرمایا ہے کہ بَیۡنَ السَّدَّیۡنِ پہنچا اس سے مراد یہ ہے کہ اس راستہ کے ایک طرف بحیرہ اخضر ہے اور دوسری طرف کوہ قاف۔ اور یہ دونوں چیزیں دونوں طرف سے سدّ یعنی روک کا کام دے رہی تھیں۔ صرف درمیانی درّہ غیر محفوظ تھا۔

قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي

انہوں نے کہا (کہ) اے ذوالقرنین یاجوج ماجوج یقیناً اس ملک میں فساد پھیلا رہے ہیں

الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَ

پس کیا ہم (لوگ) آپ کے لئے کچھ خراج اس شرط پر مقرر کر دیں کہ آپ ہمارے درمیان اور ان کے درمیان

بَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۵﴾

ایک روک بنا دیں۔

حلّ لُغات ۔خَرْجًا اَلْخَرْجُ ۔اَلْخَرَاجُ خَرْجٌ کے معنے خراج یعنی لگان کے ہیں۔(اقرب)

تفسیر ۔یعنی چونکہ یہ لوگ یاجوج وماجوج کے دروازہ پر تھے وہ کثرت سے ان کے حملوں کا شکار ہوتے رہتے تھے۔اس لئے اس علاقہ کے لوگوں نے خورس سے خواہش کی کہ ان کے حملوں سے بچنے کے لئے ایک دیوار بنا دی جائے اور اس کا خرچ ہم دیں گے۔

قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ

اس نے کہا (کہ) اس (قسم کے کاموں) کے متعلق میرے رب نے جو طاقت مجھے بخشی ہے وہ (دشمنوں کے

بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ رَدْمًا ۙ﴿۹۶﴾

سامانوں سے) بہت بہتر ہے اس لئے تم مجھے (اپنے) مقدور بھر مدد دو تا کہ میں تمہارے درمیان اور ان کے درمیان ایک روک بنا دوں

حل لغات ۔رَدْمًا اَلرَّدْمُ مَا يَسْقُطُ مِنَ الْجِدَارِ الْمُهْدَمِ ۔گری ہوئی دیوار کا ڈھیر۔(اقرب)

تفسیر ۔یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے ان کاموں کا خوب علم دیا ہے اور میں اس کام کو خوب اچھی طرح کر سکتا ہوں اس لئے تم مزدوری کے ذریعہ سے میری مدد کرو تا کہ میں یہ دیوار بنا دوں۔

قُوَّةٌ سے مراد مزدوری ہے یعنی تم لوگ اس جگہ بستے ہو۔مزدوری کا کام تم ہی کر سکتے ہو۔پس میں سکیم تجویز

کرتا ہوں تم اس کے پورا کرنے میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔

اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ

تم مجھے لوہے کے ٹکڑے دو (چنانچہ وہ روک تیار ہونے لگی) یہاں تک کہ جب اس نے (پہاڑی کی) ان (دونوں)

قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِیْۤ اُفْرِغْ

چوٹیوں کے درمیان برابری پیدا کردی تو اس نے (ان سے) کہا (کہ اب اس پر آگ) دھونکو۔ حتی کہ جب اس

عَلَیْهِ قِطْرًا ؕ﴿۹۷﴾

نے اسے (بالکل) آگ (کی طرح) کردیا تو (ان سے) کہا (کہ اب) مجھے (گلا ہوا) تانبا (لا) دو تا کہ میں

(اسے) اس پر ڈال دوں۔

حلّ لُغات۔ زبر الحدید: زُبُرٌ۔ زبرۃٌ کی جمع ہے اور اَلزُّبْرَۃُ کے معنے ہیں اَلْقِطْعَةُ الضَّخْمَةُ بڑا ٹکڑا۔ (اقرب) پس زُبَرَ الْحَدِیْدِ کے معنے ہوں گے لوہے کے ٹکڑے۔

سَاوٰی سَاوَی الشَّیْئَیْنِ وَسَاوٰی بَیْنَهُمَا کے معنے ہیں سَوّٰی دونوں کے درمیان برابری کردی۔ (اقرب)

اَلصَّدَفَیْنِ اَلصَّدَفَیْنِ اَلصَّدَفُ سے تثنیہ ہے اور اَلصَّدَفُ کے معنے ہیں کُلُّ شَیْءٍ مُرْتَفِعٍ عَظِیْمٍ۔ ہر اونچی بلند چیز۔ اَلْجَبَلُ۔ پہاڑ سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ اَیْ بَیْنَ رَأْسَیِ الْجَبَلِ الْمُتَقَابِلَیْنِ۔ آمنے سامنے کے دونوں پہاڑوں کی چوٹیوں کے درمیان برابری پیدا کردی۔ (اقرب)

اُفْرِغْ اَفْرَغَ الْمَاءَ کے معنے ہیں: صَبَّهٗ اس نے پانی کو ڈالا۔ اَفْرَغَ الدِّمَاءَ: اَرَاقَهَا۔ خون بہایا۔ اَفْرَغَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ: صَبَّهَا فِی قَالِبٍ سونے اور چاندی کو کسی سانچے میں ڈال کر ڈھالا۔ (اقرب)

اَلْقِطْرُ اَلنُّحَاسُ الذَّائِبُ پگھلا ہوا تانبا (اقرب) اٰتُوْنِیْۤ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا کے معنے ہوں گے تم مجھے تانبا لا دو کہ میں اس پر ڈالوں۔

تفسیر۔ یعنی علاوہ مزدوری کے تم یہ مدد بھی دو کہ لوہا اور تانبا مہیا کرو۔ کیونکہ گو دیوار بنانا حفاظت کے لئے ضروری تھا مگر اس کے ساتھ دیوار میں دروازے بنانے بھی ضروری تھے۔ تا کہ تجارت کو نقصان نہ پہنچے اور تجارتی

قافلوں کے آنے جانے کا راستہ کھلا رہے۔ پس مضبوط دروازے بنانے کے لئے لوہے کی اور ان کو زنگ سے بچانے کے لئے تانبے کی ضرورت تھی جو ان سے طلب کیا گیا۔

فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۸﴾

پس (جب وہ دیوار تیار ہو گئی تو) وہ (یعنی یاجوج ماجوج) اس پر چڑھ نہ سکے اور نہ اس میں کوئی سوراخ کر سکے۔

تفسیر ۔ یعنی جب دیوار بن گئی۔ تو یاجوج و ماجوج کے حملے رک گئے۔ وہ دیوار اس قدر اونچی تھی کہ وہ اس پر چڑھ بھی نہیں سکتے تھے اور اتنی موٹی تھی کہ اس میں نقب بھی نہیں لگا سکتے تھے۔

یہ مراد نہیں کہ دیوار اس قسم کی تھی کہ اس پر چڑھنا یا اس میں نقب لگانا ناممکن تھا۔ بلکہ چونکہ اس میں بُرج اور قلعے تعمیر کئے گئے تھے جہاں سپاہی پہرہ کے لئے مقرر رہتے تھے اس لئے دیوار پر چڑھنا یا نقب لگانا ناممکن تھا۔ کیونکہ پہرہ دار ہر اس شخص کو جو چڑھنے کی کوشش کرے یا نقب لگائے مار سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو دیوار پر چڑھنے میں یا نقب لگانے میں مشغول ہو وہ لڑ نہیں سکتا۔ او دیوار کے اوپر بیٹھے ہوئے سپاہی اس کا آسانی سے مقابلہ کر سکتے ہیں اور اسے روک سکتے ہیں۔

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ ۚ فَاِذَا جَآءَ

(اس پر) اس نے کہا (کہ) یہ (کام محض) میرے رب کے خاص احسان سے (ہوا) ہے۔ پھر جب (عالمگیر

وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَ كَانَ وَعْدُ

عذاب کے متعلق) میرے رب کا وعدہ (پورا ہونے پر) آئے گا تو وہ اسے (توڑ کر) ایک زمین سے پیوست شدہ

رَبِّیْ حَقًّا ﴿۹۹﴾ؕ

ٹیلا بنا دے گا اور میرے رب کا وعدہ (ضرور) پورا ہو کر رہنے والا ہے۔

تفسیر ۔ مومنوں کو تکبر سے بچنے کی نصیحت یہ فقرہ اس کے ایمان کے اظہار کے لئے بیان

کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ مومن بڑے سے بڑا کام کر کے بھی متکبر نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنے کاموں کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے۔

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ الہام خورس کو بتا دیا تھا کہ ایک دن یہ قومیں پھر جنوب مشرق کی طرف بڑھیں گی اور یہ دیوار بیکار ہوجائے گی۔ کیونکہ دیوار ٹوٹنے سے یہی مراد ہے جس کا ثبوت انبیاء ع ۷ کی آیات سے ملتا ہے۔ کیونکہ وہاں صاف لکھا ہے کہ یہ قومیں سمندر کے ذریعہ سے دنیا میں پھیلیں گی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دیوار ٹوٹنے سے مراد مسلمانوں کی حکومت کا زوال ہو۔

وَ تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّ نُفِخَ فِي

اور (جب اس کے پورا ہونے کا وقت آئے گا تو) اس وقت ہم انہیں ایک دوسرے کے خلاف جوش سے حملہ

الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ۙ﴿۱۰۰﴾

آور ہوتے ہوئے چھوڑ دیں گے اور بگل بجایا جائے گا تب ہم ان (سب) کو بالکل اکٹھا کر دیں گے۔

تفسیر۔ یہاں سے اللہ تعالیٰ کا کلام شروع ہوتا ہے۔ اور بتایا ہے کہ جب اس وعدہ کا وقت آئے گا جس کا ذکر ذوالقرنین نے کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان اقوام کو پھر ترقی دے گا اور مختلف اقوام عالم آپس میں لڑیں گی اور شمالی اور مغربی اقوام، جنوبی اور مشرقی اقوام سے مل جائیں گی اور اللہ تعالیٰ سب دنیا کو جمع کر دے گا یعنی وہ ایسا زمانہ ہوگا کہ سفر آسان ہوں گے اور ساری دنیا ایک ملک کی طرح ہوجائے گی چنانچہ موجودہ زمانہ ایسا ہی ہے۔

قرآن کریم میں دوسری جگہ یاجوج و ماجوج کے پھیلنے کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ۔ وَ اقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ۔ (الانبیاء: ۹۸،۹۷) یعنی جب یاجوج ماجوج کی روک کو ہم دور کر دیں گے اور وہ سمندر کی لہروں پر سے تیزی سے سفر کرتے ہوئے سب دنیا میں پھیل جائیں گے اس کے بعد ہمارا وعدہ ان کی تباہی کے متعلق پورا ہوگا اور عذاب آئے گا تب وہ حیران ہوکر کہیں گے کہ ہمیں تو اس عذاب کا خیال تک نہ تھا اور ہم تو دنیا پر ظلم کرتے رہے۔ اب ہماری تباہی میں کیا شک ہے۔ اس آیت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یاجوج ماجوج مشرق کی طرف کسی دیوار کے رخنہ میں سے نہیں بلکہ سمندر کے راستہ سے آئیں گے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان

کا سمندروں پر قبضہ ہوگا۔اور سب دنیا کے سمندروں پر ان کے جہاز چلیں گے۔کیونکہ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ کے الفاظ آیت میں استعمال ہوئے ہیں جن کے معنے ہیں کہ سمندر کی سب لہروں پر سے وہ آئیں گے۔نیز اس آیت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کے یہ سفر بڑی جلدی سے طے ہوں گے۔اس سے دخانی جہازوں کی ایجاد کی طرف اشارہ ہے چنانچہ دیکھ لو یہ پیشگوئی کس طرح حرف بہ حرف پوری ہوئی۔سمندر ہی کے ذریعہ سے یہ اقوام مشرق میں پھیلیں۔اور سمندری سفر جس طرح ان کے زمانہ میں جلدی طے ہونے لگا ہے اس کی نظیر پہلے نہیں ملتی۔

وَّ عَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا ۙ﴿۱۰۱﴾

اور ہم اس دن جہنم کو کافروں کے بالکل سامنے لے آئیں گے

تفسیر۔وہ دن جہنم کے سے ہوں گے ایک دوسرے سے دشمنی بڑھ جائے گی اور ملک ملک پر غلبہ پانے کی کوشش کرے گا اور یہ بھی مراد ہے کہ یہ اقوام سخت بے دین ہوں گی اور اللہ تعالیٰ سے غافل۔اور ایسے کام کریں گی جو انسان کو جہنم کا مستحق بنا دیتے ہیں۔

الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَ كَانُوْا لَا

جن کی آنکھیں میرے ذکر (یعنی قرآن کریم) کی طرف سے (غفلت کے) پردہ میں تھیں اور وہ سننے کی طاقت

يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ﴿۱۰۲﴾ ع

(بھی) نہیں رکھتے تھے

ع ۱۱/۲

تفسیر۔اس میں بتایا ہے کہ عبادت اس قوم سے بالکل اٹھ جائے گی اور یا تو شروع زمانہء ترقی میں خدا تعالیٰ کے لئے انہوں نے بڑی بڑی تکالیف اٹھائی تھیں اور یا اس زمانہ میں یہ حال ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا نام مٹ جائے گا اور یہ لوگ ہر کام کو اپنے کمال کی طرف منسوب کریں گے۔

وَ كَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا میں بتایا ہے کہ اس قدر زنگ دل پر لگ جائے گا کہ خدا کا کلام سننے کی طاقت اور رغبت بالکل دلوں سے جاتی رہے گی۔چنانچہ اس وقت مغربی اقوام کا یہی حال ہے خدا کے نئے کلام کا سننا تو الگ

بات ہے۔ وہ اس کلام کی بھی دھجیاں اڑا رہے ہیں جس کو ظاہر میں تسلیم کرتے ہیں اور آئے دن ان میں کتب لکھی جاتی ہیں۔ جن میں کبھی تو حضرت مسیحؑ کو ایک خیالی وجود ثابت کیا جاتا ہے۔ کبھی بائیبل پر جرح کر کے اسے انسانی کلام ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

رکوع پر اجمالی نظر

اوپر کی آیات میں مسیحی اقوام کی آخری زمانہ کی ترقی اور دنیا میں پھیل جانے اور دین سے بے پرواہ ہو جانے اور خدا تعالیٰ کو بھول جانے کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ اس ترقی کے بعد اللہ تعالیٰ غیب سے سامان پیدا کرے گا اور ان کی ترقی تنزل سے بدل جائے گی۔ تب مایوس ہو کر موسیٰؑ کے کشف کے مطابق ان کو دین کی طرف توجہ ہو گی اور وہ اپنی غلطی کو محسوس کر کے پھر مجمع البحرین کی طرف لوٹیں گے اور اسلام کی طرف رجوع کریں گے۔

میں اس جگہ یاجوج و ماجوج کے انجام کے متعلق جو پیشگوئیاں بائبل میں ہیں ان کو بھی لکھ دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

مکاشفات باب ۲۰ آیات ۷، ۸ میں لکھا ہے کہ ’’جب ہزار برس پورے ہو چکیں گے تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائے گا اور ان قوموں کو جو زمین کے چاروں طرف ہوں گی یعنی یاجوج ماجوج کو گمراہ کر کے لڑائی کے لئے جمع کرنے کو نکلے گا۔‘‘ یہاں پر ہزار برس سے مراد سنہ ہجری کے ہزار برس ہیں۔ یعنی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہزار سال بعد شیطان اپنی قید سے چھوٹے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ۱۶۱۱ء میں ہندوستان میں مغربی اقوام کے قدم جم گئے اور یاجوج کی ترقی کا زمانہ شروع ہوا۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ India)

حزقیل باب ۳۸ و ۳۹ اور مکاشفات کو ملا کر پڑھا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کی ترقی تو سولہویں صدی میں شروع ہو گی (مکاشفات) اور تمام دنیا پر غالب ہو جانا اور تمام ملکوں پر چھا جانا آخری دنوں میں ہو گا (حزقیل باب ۳۸ آیت ۸۔۱۶)

میں اوپر اشارہ کر آیا ہوں کہ ذوالقرنین کے حالات کے مشابہ حالات آخری زمانہ میں بھی ایک مثیل ذوالقرنین کے لئے مقدر ہیں اور اس واقعہ کو قرآن کریم میں بطور پیشگوئی بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس تفصیلات کے لئے دیکھو بانی سلسلہ احمدیہ کی کتاب۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۹۰ تا ۹۷ طبع اول)

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ

(تو) کیا (یہ سب کچھ دیکھ کر) پھر (بھی) وہ لوگ جنہوں نے کفر (کا طریق) اختیار کیا ہے (یہ) سمجھتے ہیں کہ وہ مجھے

اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۳﴾

چھوڑ کر میرے بندوں کو مددگار بنا سکیں گے ہم نے (تو) کافروں کی ضیافت کے لئے جہنم کو تیار کر رکھا ہے

حلّ لُغات۔ نُزُلًا اَلنُّزُلُ: مَا هُيِّئَ لِلضَّيْفِ۔ مہمانی۔ (اقرب)

تفسیر۔ یہ ان ہی لوگوں کا ذکر ہے جو حضرت مسیحؑ کو نجات دہندہ اور خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ جن کا ابتدائے سورۃ میں ذکر آیا تھا۔ اور اس آیت سے ظاہر ہو گیا کہ اوپر کی آیات میں مسیحیوں کا ہی ذکر تھا نہ کہ کسی اور قوم کا۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۴﴾ۭ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ

تو (انہیں) کہہ (کہ) کیا ہم تمہیں ان لوگوں سے آگاہ کریں جو اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ گھاٹا پانے

سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ

والے ہیں۔ (یہ وہ لوگ ہیں) جن کی (تمام تر) کوشش اس ورلی زندگی میں ہی غائب ہو گئی ہے۔ اور (اس کے

يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۵﴾

ساتھ) وہ (یہ بھی) سمجھتے ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔

حلّ لُغات۔ صُنْعًا اَلصُّنْعُ کے معنے ہیں اَلْعَمَلُ۔ کام۔ اَلْاِحْسَانُ۔ احسان۔ اِيْجَادُ شَيْءٍ مَسْبُوْقٍ بِالْعَدَمِ۔ غیر موجود چیز کی ایجاد کی۔ (اقرب)

تفسیر۔ یعنی دنیا کو نفع پہنچانے کے لئے ایجادات کرنا ہی اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں دین کی طرف توجہ نہیں۔ بلکہ اُسے فضول سمجھتے ہیں۔

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کے نشانوں کا اور اس سے ملنے کا انکار کر دیا ہے۔ اس لئے ان کے (تمام)

اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿۱۰۶﴾

اعمال گر کر (اسی دنیا میں) رہ گئے ہیں۔ چنانچہ قیامت کے دن ہم انہیں کچھ بھی وقعت نہیں دیں گے۔

تفسیر ۔ یعنی ان کی بنائی ہوئی چیزوں کا نام ونشان باقی نہ رہے گا اور ہم قیامت کے دن ان کے لئے کوئی وزن قائم نہ کریں گے۔ کیونکہ ان کے تمام اعمال دنیا کے لئے تھے نہ کہ آخرت کے لئے۔

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ

یہ ان کا بدلہ یعنی جہنم اس وجہ سے ہوگا کہ انہوں نے کفر (کا طریق) اختیار کیا اور میرے نشانوں اور میرے رسولوں

وَ رُسُلِيْ هُزُوًا ﴿۱۰۷﴾

کو (اپنی) ہنسی کا نشانہ بنالیا۔

تفسیر ۔ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ ۔ یعنی ان کے کاموں کا اُخروی بدلہ نہ ملنا کوئی سزا نہیں بلکہ ان کی مناسب جزا ہے۔ جب وہ خدا تعالیٰ کی خاطر کوئی کام نہ کرتے تھے تو اخروی جزاء یا دینی بدلہ کی امید انہیں کس طرح ہوسکتی ہے۔

جَهَنَّمُ جَزَآؤُهُمْ کا عطف بیان ہے اور مراد یہ ہے کہ جزاء سے ہماری مراد جہنم ہے اور یہ جزاء ان کے کفر اور اللہ تعالیٰ کے نشانات اور اس کے رسولوں سے ہنسی ٹھٹھے کی وجہ سے ہوگی۔ یعنی ان قوموں کی نگاہ میں الٰہی کلام اور اس کے رسولوں کی کوئی عزت نہ ہوگی ایک انسان کو خدا بنا کر سب نبیوں پر ہنسی اور تمسخر کریں گے۔ چنانچہ دیکھ لو کہ مسیحی لوگ مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دینے کی وجہ سے سب انبیاء کی سخت ہتک کرتے ہیں اور ان کے وجود کو لغو اور فضول قرار دیتے ہیں اور شریعت کو لعنت بتاتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَانَتۡ لَهُمۡ جَنّٰتُ

جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک (اور مناسب حال) عمل کئے ہیں ان کا ٹھکانا یقیناً فردوس کے بہشت

الۡفِرۡدَوۡسِ نُزُلًا ﴿۱۰۸﴾ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا لَا یَبۡغُوۡنَ عَنۡهَا حِوَلًا ﴿۱۰۹﴾

ہوں گے (وہ) ان (ہی) میں رہا کریں گے (اور) ان سے الگ ہونا نہیں چاہیں گے۔

حلّ لُغَات۔ فِرۡدَوۡس فِرۡدَوۡسٌ کے معنے ہیں اَلۡجَنَّةُ الَّتِیۡ تَنۡبُتُ ضُرُوۡبًا مِنَ النَّبۡتِ۔ وہ باغ جو کئی قسم کی نباتات اُگاتا ہے۔ اَلۡبُسۡتَانُ یَجۡمَعُ کُلَّ مَایَکُوۡنُ فِی الۡبَسَاتِیۡنَ۔ وہ باغ جس میں تمام وہ اشیاء ہوں جو باغوں میں ہوسکتی ہیں۔ (اقرب)

حِوَلًا اَلۡحِوَلُ۔ اَلزَّوَالُ وَالۡاِنۡتِقَالُ۔ علیحدہ ہونا۔ الگ ہونا۔ (اقرب) پس لَا یَبۡغُوۡنَ عَنۡهَا حِوَلًا کے معنے ہوں گے۔ کہ وہ اس سے علیحدہ ہونا نہیں چاہیں گے۔

تفسیر۔ جب ان پر عذاب آئے گا تو مومنوں کی ترقی کا وقت شروع ہوگا اور ان کے صبر کا بدلہ ان کو مل جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے لئے اور اس کے دین کے لئے قربانیوں میں ان کو ایسی لذت محسوس ہوگی کہ باوجود مال اور جان کی قربانیوں کے وہ اپنی حالت کو بدلنا پسند نہ کریں گے بلکہ اس ''ٹوٹی ہوئی سفینہ'' میں ہی سفر کرنے میں ساری لذت محسوس کریں گے اور اسے چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔

قُلۡ لَّوۡ کَانَ الۡبَحۡرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیۡ لَنَفِدَ الۡبَحۡرُ قَبۡلَ

تو (انہیں) کہہ (کہ) اگر (ہر ایک) سمندر میرے رب کی باتوں (کے لکھنے) کے لئے روشنائی بن جاتا تو میرے

اَنۡ تَنۡفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیۡ وَ لَوۡ جِئۡنَا

رب کی باتوں کے ختم ہونے سے پہلے (ہر ایک) سمندر (کا پانی) ختم ہو جاتا۔ گو (اسے) زیادہ کرنے کے لئے ہم

بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۱۰﴾

اتنا (ہی) اور (پانی سمندر میں) لا ڈالتے۔

حل لغات۔ مِدَادًا مِدَادًا کے معنے ہیں اَلنِّقْسُ۔ سیاہی۔ روشنائی۔ (اقرب)

تفسیر۔ یعنی وہ لوگ دعوے کرتے ہیں کہ ہم نے یہ یہ ایجادات کی ہیں اور اتنے علوم دریافت کئے ہیں اور کائنات کا راز دریافت کرنے کے قریب ہیں۔ فرماتا ہے۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو ان سے کہہ دے (یعنی اس زمانہ کے محمد رسول اللہ صلعم کے اتباع ان سے یوں کہہ دیں) کہ تمہارا راز کائنات کو دریافت کرنے کی کوشش کرنا ہمیشہ روز اول ہی رہے گا اور باوجود اس قدر کوششوں کے تم کولہو کے بیل کی طرح وہیں کے وہیں کھڑے رہو گے اور وہ قوتیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں پیدا کی ہیں۔ ان میں سے اس قدر بھی دریافت نہ کرسکو گے کہ جس قدر سمندر کے مقابل پر ایک قطرہ کی حیثیت ہوتی ہے۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ تصانیف کا زمانہ ہوگا اور یہ قومیں سائنس پر کثرت سے کتابیں لکھیں گی۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ

تو (انہیں) کہہ (کہ) میں صرف تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں (فرق صرف یہ ہے کہ) میری طرف (یہ) وحی

وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا

(نازل) کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی (حقیقی) معبود ہے۔ پس جو شخص اپنے رب سے ملنے کی امید رکھتا ہو

وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ﴿۱۱۱﴾ ع

اسے چاہیے کہ نیک (اور مناسب حال) کام کرے۔ اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو (بھی) شریک نہ کرے

تفسیر۔ ان سب پیشگوئیوں اور علوم غیبیہ کے بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ان سے کہہ دے کہ میں تو اس قدر علوم سماویہ کے بتانے کے بعد بھی نہیں کہتا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں یا خدائی صفات

میرے اندر ہیں۔ میں تو صرف ایک بَشَر ہوں جس کی ساری خوبی یہ ہے کہ اس پر اس کے رب نے اپنا کلام نازل فرمایا ہے۔ پس اگر تم بھی ان انعامات کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو آؤ میری طرح موحد ہو جاؤ۔ اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق عمل کرو۔ اور شرک چھوڑ دو۔ پھر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کس طرح تم پر فضل کرتا ہے۔ اور غیب کے خزانے تمہارے لئے کھولتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کہف کی آخری دس آیات پڑھتا ہے دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا (مسند احمد بن حنبل مسند بقية حديث ابی الدرداء)۔ یہ بھی اس امر کا ثبوت ہے کہ دجّال اور یاجوج ماجوج سے مراد مسیحی فتنہ ہے۔ کیونکہ ان آیات میں اسی قوم کا ذکر ہے۔ جیسا کہ ہر انسان جو ان آیتوں کو سمجھ کر پڑھے معلوم کر سکتا ہے۔

تَمَّتْ بِالْخَیْر

انڈیکس

جلد ششم

۞۞۞۞۞۞

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

اشاریہ کلید مضامین

آ

ا

ب

پ

ت

ث

ج

و

ہ

ی

اسماء

جغرافیائی مقامات

حل اللغات

کلیدِ مضامین

مرتبہ: سید عبدالحیؑ ایم۔اے

آ

اسقاطِ حمل

اسلام

صداقت

تعلیم

اصحاب الرقیم

پ

پیدائش

پیشگوئی

بنیادی اُصول

اسلام کی فتح اور کفر کی شکست کی پیشگوئیاں

آخری زمانہ کے متعلق قرآن کریم کی پیشگوئیاں

تسبیح

تسخیر

تصوف

تعبیر

تعلیم

حرمت

حروفِ مقطعات

حساب

حسد

خ

دعوۃ الی الحق

دفاع

دماغ

دنیا

<u>عیسائیت کے متعلق پیشگوئیاں</u>

<u>اسلام پر اعتراضات</u>

<u>متفرق</u>

غ

ف

جہاد بالقرآن

قربِ الٰہی

قسم

قصاص

قلب

قوم/اقوام

ک

کافر رکفار

کامیابی

کائنات

کتاب (نیز دیکھئے قرآن کریم اور کلام الٰہی)

کشف

کفارہ (نیز دیکھئے عیسائیت)

کلام الٰہی (نیز دیکھئے الہام۔ قرآن مجید اور وحی)

ضرورت

بنی اسرائیل سے مشابہت

حقیقی دشمن

مستقبل

نصیحت و تلقین

منطق

موعظۂ حسنہ

مومن

مہدی

مہمان نوازی

ن

نامہ اعمال

نباتات

نبوت

نبوت کا مقصد

ضرورت

نبی کب آتا ہے

خصائص

صفات

تعلیم

نبوت کی اقسام

ہر قوم میں نبی ہوئے ہیں

نبوت محمدیہ

نبوت پر ایمان

و

عقاید

یہود کی دو تباہیاں

یہود کے ملعون ہونے کی وجوہات

یہود اور اسلام

یہود کے متعلق پیشگوئیاں

یہود کی سازشیں

☆☆☆☆☆

اسماء

آ

ا

پ

ت

ذ

ر

ز

س

غ

ف

م

ن

☆☆☆☆☆

مقامات

آ ـ ا

ب

پ

ت

ٹ

ج

چ

☆☆☆☆☆

حلّ اللّغات

ا

☆☆☆☆☆

کتابیات

BIBLIOGRAPHY

تفاسیر

جامع البیان للطبری

تفسیر ابن کثیر

تفسیر البحر المحیط

تفسیر البیضاوی

الدر المنثور

روح المعانی

فتح البیان

تفسیر الکشاف

حاشیۃ القونوی علی البیضاوی

- A Comprehensive Commentary on the Holy Quran by Wherry

تفسیر البغوی

تفسیر القرطبی

التفسیر الکبیر للامام الفخر الرازی

تفسیر المظھری

تفسیر بیان القرآن

مجمع البیان للطبرسی

حدیث

صحیح البخاری

فتح الباری لشرح صحیح البخاری

صحیح مسلم

سنن الترمذی

سنن ابی داؤد

سنن ابن ماجه

سنن النسائی

مشکاۃ المصابیح

مسند الامام احمد بن حنبل

مسند الفردوس وھو الفردوس بمأثور الخطاب

فردوس الاخبار

مجمع البحار

کنز العمال

کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام و خلفاء سلسلہ

براہین احمدیہ

حقائق الفرقان

تاریخ وسیرت

الطبقات الکبریٰ

تاریخ الطبری

السیرۃ النبویۃ لابن ھشام

الخصائص الکبریٰ

زادالمعاد

شرح العلامۃ الزرقانی علی المواھب اللدنیۃ

- Life of Muhammad
- Historian`s History of the World
- History of the Decline & Fall of Roman Empire

سٹوری آف روم مصنفہ نارووڈ نیگ

- The Catacombs at Rome by Scott Benjamin
- The Crucifixion by An Eye Witness

تاریخ الاسلام السیاسی

تاریخ الخلفاء

محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ

تاریخ الخمیس

اسلامیات

تعطیر الانام

مرتد کی سزا اسلامی قانون میں

کلیات آریہ مسافر تکذیب براہین احمدیہ

التبیان فی مسائل السلوك والاحسان

المعروف بدلائل السلوك

کتب اہل کتاب

قرآن العظیم

اعراب القرآن

بائبل (عہد نامہ قدیم وجدید)

- The Daily Bible Illustrations by Dr. Kitto
- The Text & Cannon of the New Testament by Dr. Alexender Souter

ستیارتھ پرکاش

رگ وید

ادب ونحو

مغنی اللبیب

درّۃ الغواص

اساس البلاغۃ

متفرق

پتنجلی کا یوگ شاستر

ینابیع الاسلام

خزائن الادویہ

- The Vitamins by H.C Sherman
- March of Man Published by Encyclopaedia Britanica Society London
- Lake and Rastall`s Text Book of Geology
- Arabian Students Vol-1
- The Heavens vol-1
- The Book of Knowledge

لغات وانسائیکلو پیڈیا

اقرب الموارد

لسان العرب

المفردات فی غریب القرآن

تاج العروس

القاموس العنصری

الکلیات لابی البقاء

- Encyclopaedia Britannica

انسائیکلو پیڈیا بریٹینکا

- Encyclopaedia Biblica

انسائیکلو پیڈیا ببلیکا

- Jewish Encyclopaedia

جیوش انسائیکلو پیڈیا

انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنز

اخبارات ورسائل

الحکم

☆☆☆☆☆